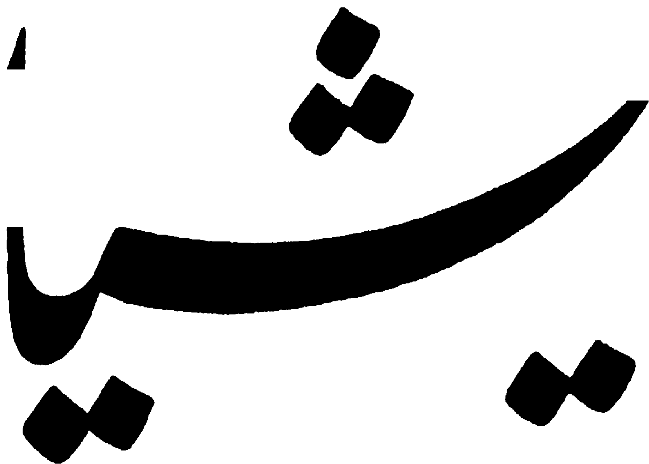
U.9607



(۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومتِ صوبۂ متحدہ

محکمۂ تعلیمات حکومتِ صوبۂ بہار

زیرِ سرپرستی ڈاکٹر سید محمود

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

(جملہ حقوق محفوظ)

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستانی)

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)

اُردو دُنیا کی طرف سے ہندی سنسار کیلئے بہترین تحفہ

رَس ساگر

بادۂ مشرق کا نیا رُوپ

ہندوستانی ادب میں یہ پہلی مکمل کوشش ہے جس کی بُنیاد میں لسانی اتحاد۔ قومی ملاپ اور ہندوستان کی ایک لنگوا فرینکا وضع کرنے کے خیال کی طرف قدم اُٹھایا گیا ہے۔ یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ساغر کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کی منتخب نظمیں اور نیا کلام ناگری حروف میں ایک مرتب مجموعہ کی شکل میں چھاپا گیا ہے اور حواشی میں ان تمام الفاظ کے معنی آسان زبان میں دیدیئے گئے ہیں جن کو ہندی دُنیا بالوجود آسانی سے نہیں سمجھتی۔

کتاب کے لئے خاص طور پر ہلا اینٹک پیپر مل سے بنوایا گیا ہے اور چھپائی ہندوستان ٹائمز پریس دہلی میں ہوئی ہے۔

"رَس ساگر" مجموعی طور پر نہایت حسین اور اعلیٰ سامانوں کے ساتھ شائع ہوا ہے اور اُردو دُنیا کی طرف سے ہندی سنسار کے لئے بہترین تحفہ ہے آپ اپنے ہندی جاننے والے دوستوں کو نہایت فخر و مسرّت کے ساتھ اس تحفہ کی نذر دے سکتے ہیں۔

مینیجر ادبی مرکز میرٹھ (یو پی)

فہرستِ مضامینِ ”ایشیا“ دسمبر ۱۹۴۰ء

تصحیح

عیدِ نظّارہ (مطبوعہ اکتوبر نومبر نمبر ۱۹۴۰ء)

اکتوبر نومبر نمبر میں صفحہ ۵۴ پر عزیز جہاں بیگم آدا صاحبہ کی نظم "عید نظّارہ" شائع ہوئی تھی۔ نہایت افسوس ہے کہ اس میں کئی جگہ کتابت کی غلطیاں رہ گئیں براہِ کرم اس طرح تصحیح فرما لیجئے۔

(دوسرے شعر کا دوسرا مصرع)

غلط۔ سو طرح غمکدے کو اپنے سجاؤں میں

صحیح

اس طرح غمکدے کو اب اپنے سجاؤں میں

(چوتھے شعر کا دوسرا مصرع)

غلط قوسِ قزح کے رنگ سے محفل رچاؤں میں

صحیح

قوس قزح کا رنگِ عروسی رچاؤں میں

دسویں شعر کا پہلا مصرع

ظلمت میں ہوتہ نور فشاں ماہِ نیم ماہ

صحیح

ظلمت میں ہوگا نور فشاں ماہِ نیم ماہ

اڈیٹر

ایشیا

جلد ۶ | ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء | نمبر ۵

ہندی ساہتیہ سمیلن کے اُنتیسویں[۲۹] اجلاسِ پونہ کا خطبۂ صدارت

اور اُس پر ایک طائرانہ نظر

میں یہ تو نہیں کہتا کہ زندگی اور ادب کا مجھے ایسا خاص تجربہ حاصل ہے جس کی بنا پر میں پھیلے ہوئے مسئلوں پر کوئی حکم لگا سکوں، ملک میں بہت سے بزرگ ایسے موجود ہیں جو زبان کے مسئلے پر کامل فیصلہ صادر کر سکتے ہیں لیکن اِن بزرگوں اور ناچیز میں نقطۂ نگاہ کا جو امتیازی فرق ہے وہ فیصلہ کرنے والوں کے تین اسکول قائم کرتا ہے۔

(۱) ملک میں ایک وہ جماعت ہے جو ہندی والوں سے سیاسی اختلاف کی بنا پر لسانی اختلاف رکھتی ہے، اور کانگریس کو متہم کرنے کے لیے اُردو کے مسئلے اور اُس کے سلسلے میں اختلاف سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے۔

(۲) دوسری جماعت ایسی جماعت ہے جو ہندوستان کی آزادی کو پہلا فرض سمجھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی لسانی اتحاد چاہتی ہے۔ سیاسی طور پر یہ جماعت ملک کی ترقی کی راہ میں روڑا نہیں بلکہ آزادی کی جدوجہد میں دل و جان سے شریک ہے اور وہ ملک میں ایک قوم، ایک زبان، ایک آزاد حکومت، اور ایک ادب کی بنیادی کوشش پر یقین رکھتی ہے۔

(۳) تیسری جماعت مسلمانوں میں ایسی ہے جو وقت کے تمام تقاضوں سے آزاد ہو کر محض اُردو، اُردو پکارتی ہے اور وہ کوئی ایسی درمیانی راہ یا میل ملاپ کی قائل نہیں، جو جماعت نمبر ۲ چاہتی ہے۔

میں جماعت نمبر ۲ کے عقیدوں سے متفق ہوں، اور اِس اتفاق کے سلسلے میں زیادہ نہیں لیکن کچھ تجربہ گرد و پیش کے حالات اور تقاضوں کا رکھتا ہوں اُردو دنیا کے مقابلے میں کم سہی، لیکن مجھے ہندی سنسار، ہندی مصنفین، ہندی جرنلزم، ہندی جرنلسٹ، ہندی افسانہ نگار، ہندی کویوں، ہندی نقادوں اور ان کے پس منظر میں ہندو جنتا میں بولی جانے والی زبان، ادنیٰ اور اعلیٰ نیچے اور اونچے، درمیانی، اور درمیانی سے کچھ کم درجے کے ہندو گھرانوں کے بچوں، بچیوں، کماریوں، بیویوں، بوڑھی عورتوں اور نوجوان و بوڑھے مردوں کی بولی کو میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔

اور —— اِن کانوں نے صرف شہر کے باسیوں ہی کی بولی نہیں سُنی گلمرگ (کشمیر) کی چوٹیوں پر گھوڑے کی لگام پکڑنے والے… کشمیری کی بولی بھی سُنی ہے۔ تمام شمالی ہند کے گاؤں کے بھائیوں سے بھی باتیں کی ہیں اور بہار میں گنگا کے کنارے کُٹی میں پڑے ہوئے سادھوؤں اور دہقانیوں کی بھی بولی سُنی ہے۔

یہی نہیں، بلکہ مجھے ہندی ادب سے محبت ہے اور میں ہندی کے مدھر اور گاتے ہوئے شبد اپنی نظموں میں آزادی سے استعمال کرتا ہوں، میں نے

اپنے منتخب کلام کو ناگری رسم الخط میں مرتب کیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ
دو شاندار قوموں کو زبان کے مسئلے پر اس درجہ اُلجھا دیا جائے کہ آنے والی
زندگی میں اُن کے سیاسی تعلقات کبھی اچھے ہی نہ ہو سکیں، صرف یہی نہیں،
بلکہ میں ہندوستان کے تمام فرقوں کو ایک قوم کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہوں
اور کسی ستر پر بھی تیسری طاقت کی طرف ہاتھ بڑھانے کا پاپ کرنے کے
لئے تیار نہیں

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میں واحد طور پر ادب اور زبان کے مسئلے
پر حقیقت کی روشنی میں اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق رکھتا ہوں اور اُن لوگوں
کو جو قومی ایکتائی کی ریڑھ کی ہڈی پر کاری ضرب لگانا چاہتے ہیں بتا سکتا ہوں
کہ وہ مسئلے کو اپنی اصلی صورت میں سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ اور اُن کی اُلٹی
سیدھی منترانیاں ملک کو سخت نقصان پہونچا رہی ہیں۔

۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کو پونا میں آل انڈیا ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا
اس کی صدارت یو۔ پی کے سابق وزیر تعلیم سمپورنا نند صاحب کرنے والے تھے لیکن
وہ ستیہ گرہ کے سلسلے میں جیل چلے گئے اور اُن کا وہ خطبہ صدارت
پڑھا گیا جو غلط بیانی، ناعاقبت اندیشی اور ادبی نفاق انگیزی کا شاہکار ہے
یہ تمام کمال اپنی اصلی صورت میں میرے سامنے نہیں ہے
انگریزی اور اردو اخبارات میں اس کے جس قدر اقتباسات آئے ہیں
انھیں پر میں رائے زنی کر سکتا ہوں ۔

میں سمپورنا نند جی کو ایک سوشلسٹ خیال کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا
کہ وہ زندگی اور ادب میں اک ترقی پسند انسان ہوں گے لیکن اس تقریر
نے اُن کا سارا بھرم کھول دیا اور معلوم ہوا کہ وہ ہندوؤں کے اُسی رجعت
پسند گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی میں آگے جانے کا قائل نہیں اور زندگی
کو صدیوں کے پیچھے دقیانوسی اور دیمک لگے ہوئے تمدنی روایات اور فلسفوں
میں لپیٹ کر قدیم مصریوں کے "ممی سسٹم" کو جاری کرنا چاہتا ہے ۔

میں یقین کرتا تھا کہ سمپورنا نند جی میرے محترم پنڈت پیارے لال
شرما سابق وزیر تعلیم (میرٹھ) کی طرح سنجیدہ، سچے اور وسیع المطالعہ بزرگ ہوں
گے لیکن، جب میں نے اُن کے خطبہ صدارت کا وہ حصہ پڑھا جس میں انہوں
نے موجودہ ہندی شاعری اور اردو شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے اُردو
شاعری کو شاہد و شراب اور قورمہ کباب کے آدرش سے تعبیر کیا ہے اور ایک

ایک ڈربے تک محدود ظاہر فرمایا ہے تو مجھے دلی دکھ ہوا۔ اس لئے اور بھی دکھ ہوا کہ
ایسے خود ساختہ ترقی کرنے والے بزرگ کے لئے جس نے ڈسٹرکٹ بورڈ
کے کلرک کے درجہ سے اُٹھ کر وزارتِ تعلیم کی کرسی حاصل کی اور قومی لڑائیوں
میں ایک بہادر سپاہی کی طرح حکومت کے مقابلے میں ڈٹا رہا مجھے اپنی اچھی
رائے بدلتی پڑی اور ایسی رائے قائم کرنی پڑی جو میری گذشتہ اچھی رائے
کے مقابلے میں نہایت بُری اور گری ہوئی ہے۔

سمپورنا نند جی شاعر کی سیرت ذکر تو یہ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ :-

"ہمیں بجا طور پر اپنے شاعروں پر فخر ہے ۔ ہندی نثر تو
مقابلۃً نئی ہے لیکن ہندی شاعری اپنی روایت کے
اعتبار سے صدیوں کا سلسلہ رکھتی ہے، زمانہ کے ساتھ ساتھ
اس روایت میں بھی فرق آیا ہے ۔ ہندوستان کی آخری
عظمت کا سورج ڈوب گیا۔ آریہ اور انا ریہ (غیر آریہ سنسکرتی
تہذیب) کا تصادم ہوا، ان روایتوں کو اُن درباروں میں
جگہ ملی جہاں بدعنوانیوں اور عیاشیوں نے لوگوں کو اُن
کے ماضی سے بے خبر کر دیا۔ لیکن آج وہی روایت پھر ہندوستان
کی آزادی کی جدوجہد اور دنیا کے ایک نئے نظام کے قیام
کو دیکھ رہی ہے " (ترجمہ)

آریہ اور انا ریہ یعنی آریہ (ہندو) اور غیر ہندو تہذیبوں میں تصادم ہوا،
جہاں تک میں سمجھتا ہوں مقرر کا مقصد یہ ہے کہ ہندی ادب کو مسلم درباروں میں
جگہ ملی، (صرف شاہجہاں کے دربار سے ۸۰۰ ہندی کویوں کو وظائف ملتے تھے)
اور یہ وہ دربار تھے "جہاں بدعنوانیوں اور عیاشیوں نے لوگوں کو ماضی سے بے
خبر کر دیا تھا"

تاریخ و ادب پر یہ وہ آنکھ بند کر کے تبصرہ ہے جو سمپورنا نند جی کی تاریخی
اور ادبی معلومات کا بھانڈا پھوڑتا ہے۔

اگر یہ عمرانی و تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے خود
ہندوستان کے آریہ اپنے اخلاق و تہذیب کا جنازہ نکال چکے تھے اور
اپنی زندگی کی ساری شگفتگیاں اور تازہ دمی، بدعنوانیوں اور تعیش کے نذر
کر چکے تھے تو "انا ریہ" درباروں کی عیاشیوں اور بدعنوانیوں کو آپ کو متہم
کرنے کا کس نے حق دیا ہے ! ؟

میں تو ہندی ادب سے آپ کی برابر واقف نہیں، مگر آپ کی ساری قدیم ہندی شاعری یا تیاگ کا راگ ہے یا شرنگار رس، کوئی شک نہیں کہ اس میں تیاگی جذبات اور (Lyrical Poetry) عشقیہ شاعری کے عناصر گہرے فلسفیانہ رنگ میں گھلے ہوئے نہیں لیکن وہ انسانی جذبات میں کوئی ایسی زندگی نہیں پیدا کرتے جسکو ہم (Action) عمل سے تعبیر کرسکیں۔ ہندی ادب کا یہ حال مسلمانوں سے پہلے تھا لہذا "انارمیہ" درباروں پر یہ اتہام کہ ان میں بیٹھنے کی وجہ سے لوگ اپنے ماحنی سے بے خبر ہوگئے تھے، محض بہتان اور تاریخ ادب سے قطعاً ناواقفیت کی دلیل ہے۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :-

"ہمارا کوی دلتوں کی آواز سنتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ایک جانب کروڑوں مصیبت زدہ، ننگے بھوکے انسان ہیں، دوسری جانب فیکٹریاں اور کارخانے ہیں، یہ تضاد اس کے دل میں گھر کر جاتا ہے، وہ اسے محسوس کرتا ہے، ایک سچا شاعر جدوجہد سے جی نہیں چراتا وہ ان آنسوؤں کے آگے آشا کی جھلک دیکھتا ہے، اس کا پیمبرانہ تصور مستقبل کی تصویر کھینچتا ہے، چاہے وہ رشی نہ ہو، لیکن اُسے سچائی کی وہ جھلک نظر آجاتی ہے جو حواسوں کے ذریعہ محسوس نہیں کی جاسکتی، وہ کوتا (شاعری) اس لئے لکھتا ہے کہ اُسے حقیقت نظر آجاتی ہے اور وہی حقیقت حسن ہے، سچا شاعر آرٹ کو زندگی سے الگ تھلگ نہیں رکھتا۔ سچائی محض خوبصورتی ہی نہیں بلکہ نیکی بھی ہے، شاعر کی آواز میں انسانیت کے لئے ایک پیغام ہونا چاہئے"

(ترجمہ)

نہایت خوب، یہ وہ تمام حقائق ہیں جنھیں سمپورنانندجی سے پہلے ہزاروں زبانوں نے ہم تک پہونچایا ہے، ان میں سے کوئی ایک ایسی نئی حقیقت نہیں جو آجکل کے اُردو ہندی شعراء ازخود نہ جانتے ہوں۔

موجودہ زمانے میں جس قدر ہندی شعراء ہیں اُن میں سے اکثر دوستوں سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں اور اُن کے کلام و زندگی کو پاس سے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے۔

(یو، پی کے چند مشہور ہندی شعراء)

(۱) نرالاجی	(لکھنو)
(۲) اومادیوی جی ورما	(الہ آباد)
(۳) متھیلی شرن گپت	(جھانسی)
(۴) بچن جی	(الہ آباد)
(۵) سنیہی جی	(کانپور)
(۶) شرما	

(نوجوانوں میں)

(۷) ہردیش	(کانپور)
(۸) نرنکار	(بریلی)

نرالاجی کی شاعرانہ خصوصیات

اومادیوی جی کی شاعرانہ خصوصیت مسٹیسزم (تصوف) (Mysticism) اور المناکی (Pessimism) ہے۔

متھیلی شرن گپت ان تمام سے بوڑھے اور مستند کوی ہیں ان میں وہ ساری ماہرانہ اور اُستادانہ خصوصیات ہیں جو کسی بڑے مہاکوی میں ہوتی ہیں، لیکن ان کی شاعری کے تمام عناصر وہی دیدانت اور بھگتی کا سازوسامان ہے۔ جو پُرانے کویوں کی خصوصیت تھا۔

بچن نئے زمانے کے شاعر ہیں، مگر ان کی شاعری بھی المناکی اور مسٹیسزم (Mysticism) تصوف کی آئینہ دار ہے یہی تحت تر اشاوادی ہیں۔

سنیہی جی پُرانے ہندی شاعر ہیں ایک اسکول کے بانی ہیں مگر جہاں تک میں جانتا ہوں یہ کسی خاص بات پر زور نہیں دیتے مہاکوی ہیں اور ہر چیز کو شاعرانہ طور پر بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

ہردیش کانپور کے نوجوان شاعر ہیں اور بہت اچھے گیت کہتے ہیں ان کے گیتوں کا پس منظر (Back Ground) اک روحانیت ہے یا وہی ویدانتک اور کرشن بھگتی کے خیالات ہیں۔

البتہ بریلی کے نرنکار جی جو ابھی بہت نوجوان ہیں ان کے خیالوں میں نے ایک طوفان ضرور دیکھا مگر جو کچھ وہ سوچ رہے ہیں اور جس منزل پر ہیں

اُس کو مکمل طور پر بیان نہیں کر سکے ہیں۔

(بہار کے چند مشہور شاعر)

(۱) نیپالی جی

(۲) دنکر صاحب

میں بہار میں انہی کو جانتا ہوں، نیپالی کی شاعری خوب ہے۔ مگر وہ ہمیں کوئی پیغام نہیں دیتے۔

دنکر کے کلام میں جوش ہے اور اس کے کلام کی خصوصیت مغل عہد کی تمام تر روایات کی قصیدہ خوانی ہے۔ بھارتیہ پریم (حبِ وطن) کے جذبات بھی اس کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے سارے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُردو شعراء سے سخت متاثر ہیں، ان کی زبان بھی سخت ہندی نہیں ہوتی۔

بچن جی نے پہلے "مدہ شالہ" (میخانہ) ہندی میں لکھی، یہ رباعی کے وزن کی چیز نہیں، مگر رباعی کی طرح چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور اس میں "خمریات" شراب و شباب اور اُس سے تعلق رکھنے والی باتوں کو نظم کیا!

اس سلسلے میں اُردو فارسی شاعروں کی جس قدر رباعیات ہو سکتی ہیں، سب کو ہندی شعراء نے ہندی میں اپنی مہر لگا کر پیش کر دیا۔ نہ خیام کی روح کچھ کر سکی نہ ریاض کی، نہ ہم کچھ بنا سکے نہ جوش، اسی طرح مولانا خیر بھوروی نے گذشتہ ماہ مجھ سے کہا کہ دنکر صاحب نے تقریباً سارا "بادہ مشرق" ہندی میں اپنا لیا ہے!

کسی دوست کو متہم کرنا مقصود نہیں، نہ کسی کا دل دکھانا مقصود ہے اُردو شاعر ہوں یا ہندی مہاکوی سب کا مقصد کسی نہ کسی طرح جنتا کی خدمت کرنا ہے اور اپنے آرٹ سے گری ہوئی انسانیت کو اُٹھانا ہے لیکن میں جیل کی سلاخوں میں بیٹھے ہوئے سمپورنا نند جی سے ادب کے ساتھ یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے "اپنے" اُس ایک کوی کا نام بتا دیں جو دلتوں کی آواز سنتا ہے"!؟

مقابلہ کا سوال نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار کرنا ہے کہ کیا جدید ہندی شاعری اقبال جیسا شاعر پیش کر سکتی ہے؟

اُردو زبان کے نئے دور نے جو زبردست اُردو شاعر پیدا کئے کیا ان کے مقابلے کا ایک شاعر بھی ہندی شاعری پیش کر سکتی ہے!؟

آگے چل کر سمپورنا نند جی فرماتے ہیں :-

جب میں موجودہ ہندی شاعری پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دور کی نمائندہ ہونے کی کوشش کر رہی ہے اس میں تلاش، تجربہ، غلطی، بغاوت، بندش، تصادم، مصیبت اور وہ تمام جذبات پائے جاتے ہیں جو ہزاروں ہندوستانی مرد عورتوں کے دلوں میں ہیجان برپا کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس میں وہ شکتی نہیں پائی جاتی جو آشا سے پیدا ہوئی ہو۔

جو کچھ میں نے ہندی شاعروں کے نراشا وادی) الم پرست (Pessimistic) ہونے کے متعلق لکھا۔ سمپورنا نند جی اس کو مانتے ہیں

" اور اس میں پیغام نہیں پایا جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کمی بھی جلد پوری ہو جائے گی اور کوئی نئے یگ کا مشعل بردار ثابت ہوگا"

آگے چل کر اس طرح اُپدیش دیا جاتا ہے :-

" لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر رنگ رلیوں سے پرہیز کرے اور محنت کی زندگی بسر کرے، سچائی کا راستہ پھولوں میں سے ہو کر نہیں ہے پوترتا (پاکیزگی) کے ساتھ تیاگ بھی ہونا چاہئے۔ ویاس اور والمیکی کے راستہ پر وہی لوگ چل سکتے ہیں جن میں ہمت ہے، اور آتم تیاگی (روح کو تج دینے والے) ہوں جو ایسا کر سکے وہ دوسروں کی رہنمائی کرے گا اور اس کی آواز گیتوں میں لافانی رہے گی"

اِن سطور میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن کی صداقت سے انکار نہیں، لیکن تین متضاد باتیں اِن سطور میں ملتی ہیں رنگ رلیوں پر دفعہ ۱۴۴۔ عام محنت کا مطالبہ (روٹی کے لئے) اور (۳) آتم تیاگی

ہر عہد کا شاعر، شاعر کیا لیڈر تک اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہوتا ہے۔ اقتصادی ماحول کی سمپورنا نند جی سوشلسٹ ہیں اس لئے وہ اچھی طرح اِس اشارے کو سمجھ سکتے ہیں۔ اگر انقلاب ناقص ہے تو پیداوار ناقص ہوگی اور شاعر انقلاب بھی ناقص پیدا ہوگا یعنی اُس کے کلام اور اُس کی زندگی میں کوئی مطابقت نہ ہوگی۔ لیکن جس وقت انقلاب مکمل ہو گیا۔ شاعر بھی کامل پیدا ہوگا۔ یعنی اُس کی زندگی اور شاعری ایک ہوگی

اُردو شاعری پر بہتان

آگے چل کر اُردو شاعری کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :۔

"اُردو شاعری نے کنول اور بھونرے کی جانب سے تو بے رُخی برتی اور ایران کے گل و بلبل کو قبول کیا۔ حالانکہ نہ انھوں نے اور نہ اُن کے سننے والوں نے کبھی انھیں دیکھا ہے"

"ہندوستان میں جہاں گوشت کی غذا کوئی لعنت خیال نہیں کی جاتی اور جہاں لوگوں نے اپنے بزرگوں کا سوم رس پینا چھوڑ دیا اور شراب کی مذمّت کی وہاں شاعروں نے شاہد و شراب اور قورمہ و کباب کے آدرش کو اپنے سامنے رکھا ہے"

"ایسی شاعری کتنی ہی میٹھی کیوں نہ ہو ہماری سوشل زندگی کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے وہ وسیع پیمانے پر ہر دلعزیز نہیں ہے بلکہ ایک ڈربے تک محدود ہے"

ان سطور کو جو شخص بھی پڑھے گا، اس کے دل کو تکلیف ہو گی ایک تو اس لئے کہ سمپورنانندجی کے الفاظ اور اسلوب ان کے شایانِ شان نہیں، دوسرے انھوں نے شدید غلط بیانی اور دل نفرت انگیزی سے کام لیا ہے، تیسرے اس لئے کہ وہ اُردو شاعری کی اُس شاندار ترقی سے ناواقف محض معلوم ہوتے ہیں جو تھوڑے عرصہ ہی میں ہوئی ہے؛

جو شخص اُردو شاعری کے بالپن سے واقف ہے، وہ اس تاریخی حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ پہلے پہل اردو شاعری اور اردو نثر پر بھاشا کا اثر پڑا، اور میر تک اس کے اثرات گہرے پائے جاتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ مسلم سلاطین کے دورانِ حکومت میں ایران اور ہندوستان کی سماجی آمیزش اور روز افزوں ربط و ضبط کی وجہ سے ایرانی کلچر کے اثرات اُردو شاعری پر زیادہ پڑے، لیکن جس عہد میں سمپورنانندجی اسکو ہم کر رہے ہیں اس عہد میں ممکن طور پر مقامی رنگ اُردو شاعری میں آچکا ہے۔ اور جہاں اُردو شاعری نے فلسفۂ و حکمت کی اونچی منزلوں پر اپنا آشیاں بنایا ہے وہیں سرسوتی بن کر چمپا اور کنول کے پھولوں سے کھیلتی ہوئی گنگنا رہی ہے ؎

دلِ مایوس کا عالم نہ پوچھو — کنول اک صبحدم مرجھا رہا ہے

کانوں میں بیلے کے جھمکے آنکھیں مد کے کٹورے — گورے رُخ پر تل ہیں یا ہیں پھاگن کے دو بھونرے

کومل کومل اسکی کلائی جیسے کنول کے ڈنٹھل — نورِ سحر مستی میں اٹھائے جس کا بھیگا آنچل

فطرت کے میخانے کی وہ چلتی پھرتی بوتل!

آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی

طوالت کے خوف سے کم کم مثالیں ہی دوں گا، ورنہ اُردو شاعری میں کنول کے "استعمال" پر بجائے خود ایک اچھا خاصہ رسالہ لکھا جا سکتا ہے۔

میں سمپورنانندجی کو بتانا چاہتا ہوں کہ اگر میں اردو شاعری کا تمام خزانہ اُن کے سامنے رکھدوں تو اس کے جواہر کی جوت سے ان کی آنکھیں چندھیا جائیں۔ یہ حیرت ناک بات ہے کہ اردو زبان کی خود بخود ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی اعلیٰ درجہ کی عشقیہ (شرنگار رس)، اور حکیمانہ شاعری پیدا ہوتی چلی گئی، جو بننے والی ہندی زبان صدیوں پیدا کرنے سے معذور رہیگی، اس ثبوت کے لئے میں اس صحبت میں قدیم و جدید شعرائے کے وہ اشعار پیش کروں گا۔ اور اُن نظموں اور کتابوں کا ذکر کروں گا جن کے ذکر سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہو جائیگا "کہ اردو شاعری قورمہ و کباب کا آدرش" نہیں ہے اور جس ڈربے تک محدود ہے وہ اس درجہ یونیورسل ہے کہ خود اس میں سمپورنانندجی اور کل وہ متعصب دنیا سما سکتی ہے جو اسکو "قورمہ و کباب کا آدرش سمجھتی ہے"

اس حیثیت میں کہ مجھے اس تمام ہندو جنتا کا جس کے کان میں پجارن۔ جمنا۔ وطن، اور میرے ٹوٹے پھوٹے گیتوں کی بھنک پڑی ہے پریم حاصل ہے اس لئے میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو شاعری کے بارے میں یہ سمپورنانندجی کا اپنا ذاتی خیال ہے ورنہ ہندو قوم ہرگز اُردو شاعری کو قورمہ و کباب کا آدرش نہیں سمجھتی۔

کیوں کر سمجھ سکتی ہے ــــ! کیا اُس نے سمپورنانندجی کی طرح اپنی بُدھی انڈین نیشن میں غرق کر دی ہے۔ وہ جانتی ہے اُردو شاعری نے امیر خسرو کو پیدا کیا، نظیر اکبرآبادی اور میر و غالب پیدا کئے، آتش و مومن پیدا کئے، امیر و داغ پیدا کئے آتش و ناسخ پیدا کئے نسیم پیدا کیا حالی و اسمٰعیل پیدا کئے۔ اکبر و ریاض، و چکبست پیدا کئے اقبال و جوش

پیدا کیے، اصغر و جگر پیدا کیے، سیماب و عزیز پیدا کیے ظفر علی خان و محروم پیدا کیے، حسرت و فانی پیدا کیے، اختر و حفیظ پیدا کیے، روش و احسان پیدا کیے اور مجاز و ملا پیدا کیے ——— !؟

اس غیر مرتب فہرست میں پرانے اور نئے، جوان اور بوڑھے، سب شریک ہیں، ان میں سے اکثر شعراء کے کلام کی مثالیں دے کر میں یہاں بتاؤں گا۔ کہ اردو شاعری قورمہ وکباب کا آدرش نہیں، بلکہ زندگی، انقلاب، آزادی، روحانیت اور اونچے سے اونچے آدرش کا آئینہ ہے اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اردو شاعروں نے اتنا ہی کام کیا ہے جس قدر کہ یہاں کے سیاسی لیڈروں نے۔

کیا یہ شاعری قورمہ وکباب کا آدرش (پیغام)، ہے۔!؟

غالب:۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

ہماری زبان میں مرزا غالب سمپورنانند جی سے شکایت کرتے ہیں ؂

آج کیوں پروا نہیں اپنی اسیری کی تجھے
کل تلک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اسیرانِ وطن کی نمائندگی (یعنی سمپورنانند جی کی نمائندگی) قورمہ وکباب کا آدرش دینے والا شاعر اس طرح کرتا ہے ؂

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ چند شعر ادھر ادھر سے مجھے یاد تھے لیکن اردو فارسی میں غالبِ اعظم کا جو شاعرانہ مرتبہ ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ "شاہد و شراب" کے کس قدر اشعار غالب نے کہے تو میں عرض کروں گا کہ قورمہ و کباب زندگی کی ضروریات میں سے ہے اور خود شراب ہر قوم کی اعلیٰ سماج کے اجزائے تہذیبی میں سے ایک جزوِ لاینفک رہی ہے۔ لہذا غالب جس ماحول کی مخلوق ہے۔ اس کے لحاظ سے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا جس طرح پرانے زمانے کے ہندی شعراء کے کلام میں اس قسم کی باتوں کو ہم کھوٹ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اگر سمپورنانند جی کے کانوں تک میری آواز پہونچ سکے تو میں اُن کے اس غیر ادبی اعتراض کا جواب غالب کے ہی الفاظ میں دونگا۔ کہتا ہے ؂

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سمپورنانند جی قورمہ وکباب وشراب، کا طعنہ دے کر شاید علم کلام کے مشہور و معروف اصول کو ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ سنسکرت اور ہندی کی دیومالا، شاعری کے دامن کو ان بُرائیوں سے کیسے پاک کریں گے یا گیتا میں کرشن جی کی تعلیمات کا وہ مفہوم ہمیں باور کرانے کیلئے کس طرح مجبور کر سکتے ہیں جو وہ اور بڑے بڑے گیتا کے مفسّرین پیش کرتے ہیں، کیا لفظوں کو ان کی رُوح سے جدا کر کے گیتا کی تعلیم خود غرضی، اور قتل و غارت گری کی محرک نہیں سمجھی جائے گی۔!؟ ظاہر ہے

—— ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

کہ گیتا کی روح کو سمجھنے کیلئے تشبیہاتی اور استعاراتی لوازمات کو تسلیم کرنا پڑیگا۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

حالی :۔

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو — ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

اقبال کی بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، شکوہ و جوابِ شکوہ اور ڈاکٹر سر اقبال کی تمام شاعری کی موجودگی میں کیا کسی معقول و منصف انسان کو ہمت بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اُردو شاعری کی اس درجہ توہین کرے جتنی سمپورنانند جی نے کی ہے۔ جو زبان ان جواہرات سے لبریز ہو کہ ؎

آ تجھکو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے — شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا — یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں — کہ شاہیں کیلئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ — جہاں وہ چاہئے مجھکو کہ ہو ابھی نو خیز

گو اُسکی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ — دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند

جو لوگ اُردو شاعری کو قورمہ و کباب کا آدرش سمجھتے ہیں ان کو اقبال جواب دیتا ہے کہ ؎

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مےِ گلگوں — مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا — اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی — خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں

اقبال محض ان چند اشعار سے نہیں سمجھا جا سکتا جو از بر تھے وہ لکھ دیئے وہ تو بڑی ہستی ہے۔ میں اگر اُردو شاعری کے کسی نوجوان نمائندہ ہی کو پیش کردوں تو سمپورنانند جی لاجواب ہو سکتے ہیں؛ میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ اُردو شاعری آج جس بلند مقام پر پہونچ چکی ہے اس مقام تک تو تعمیر ہندی شاعری کو پہونچنے میں کم از کم ایک صدی صرف کرنا پڑے گی؛

ہم نے تقریباً ڈھائی صدی میں زبان کا ایک سانچہ بنایا اس کے بعد اُردو زبان میں وہ لوگ پیدا ہوئے جن کو اُردو شاعری کا جنم داتا کہا جا سکتا ہے۔ اور اُن کے بعد ہم اسی طرح ہندی کو بھی پہلے تجربے، اور اسلوب بنانے کی منزلوں سے گذریں گے۔ اول ہندی زبان بنے گی پھر دہ برسوں میں ہندوستانی جنتا میں پھیلے گی۔ پھر لوگ اس کو بولیں گے۔ پھر اس کا ایک کلچر بنے گا؛ اس کے بعد اس کا ایک ایسا پیمانہ بنے گا جس میں نازک شاعرانہ خیالات نظم کئے جا سکیں۔

اس دوران میں عمل (Action) اور ردِّ عمل (Reaction) ۔۔۔۔ کیا تاریخ بناتا ہے یہ دیکھنا ہے یعنی جس طرح ہم فارسیت اور عربیت کو کامل طور پر ترک کر کے صاف اور آسان اسالیب اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور سارے اجنبی تصورات اور غیر ملکی روایات کو چھوڑ کر ہمارا اُردو ادب اب خالص ہندوستانی ہو گیا ہے[1] اسی طرح میرا غالب خیال یہ ہے کہ سنسکرت آمیز ہندی زبان اور اس کی شاعری میں بھی (Reaction) ردِّ عمل ہوگا؛ اس ردِ عمل کے بعد ہیں ایک ایسا سانچہ بن سکے گا جس میں خیالوں اور آکانکشاؤں [illegible] مورتی اپنے سچے خدوخال کے ساتھ ڈھل سکے۔ اس ردِ عمل کے بعد جو سانچہ بن سکے گا وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا تو اُردو [illegible] سانچہ ہے۔ [illegible]

موجودہ ہندی شاعری جس کے بارے میں ہمارے صوبے کے [illegible] ذہنی تعلیم و تربیت کے سابق مجازی خدا۔ یہ الہامی فیصلہ فرماتے [illegible] موجودہ یگ کی نمائندہ ہونے کی کوشش کر رہی [illegible] کہ اس نے کیا نمائندگی کی، مگر قورمہ و کباب کا آدرش دینے [illegible]

---

[1] "ہندوستانی روایات اور اُردو شاعری"۔ اس عنوان پر میں انشاءاللہ فرصت جنوری ہی میں ایک مضمون پیش کرنے کی سعی کرونگا — ستّو

ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

بلاشبہ نیشلزم اور انقلاب کی نمائندگی کی ہے ۔ سنیئے ؎

جوش

چہرۂ امروز ہے میرے لئے ماہِ تمام   خوفِ فردا ہے مری رنگین شریعت میں حرام
ڈال دوں گا طرح نوراجمیر اور پریاگ میں   پھونک دوں گا کفر و ایماں کو دہکتی آگ میں
کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کیلئے   اک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کیلئے
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں   ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستاں

(نعرۂ شباب)

جوش نے اردو شاعری میں جس قدر نئے اور شاہکار نمونے پیش کئے ۔ ان کی تعداد اتنی عظیم الشان ہے کہ اس مختصر مضمون میں اس کا ذکر نہیں کیا جاسکتا ؛ لیکن مختلف اور لاتعداد شاندار نظموں میں اس کی ایک نظم کسان ہی ایسی کلاسیکل آئیڈل اور غیر فانی نظم ہے جس کے متعلق سمپورنانند جی کو چیلنج کیا جاسکتا ہے کہ وہ والمیک اور کالیداس سے لیکر موجودہ زمانے کے تمام ہندی لٹریچر سے ایسی ایک نظم دنیا کے سامنے پیش کردیں ورنہ قورمہ وکباب کا آدرش رکھنے والی شاعری کی عظمت کے قائل ہوجائیں ۔

زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود   مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود

یہ اور دوسرے اشعار میں غروبِ آفتاب کی نہایت باریک اور لطیف نقاشی کے بعد وہ اپنے موضوع کو اس شان سے پیش کرتا ہے ؎

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار   ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عزّ و وقار   کرتی ہے دریوزۂ تابش، کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی   جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ   جس کی ظلمت کی ہتیلی پر، تمدن کا چراغ
جس کی بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

شاعرانہ تعبیرات کے علاوہ وہ اس کے مقدس کاندھوں پر رکھے ہوئے ہل کے ۳۲ نام رکھتا ہے ؎

کون ہل ظلمت شکن، قندیلِ بزمِ آب و گل   قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوشنما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ   خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ
دہار جسکی چمن پرور شگوفوں کا نظام   شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا   مضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جانے ہی سے مثلِ نازنینِ مہ جبیں   کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے البیلا زمیں
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی   خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی
طفلِ باراں تاجدارِ خاک امیرِ بوستاں   ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو گلشن پناہ   نازپرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم   محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشیدِ زر افشاں کا علَم   محنتِ پیہم کا پیماں، سخت کوشی کی قسم
جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ   ماہ کا دل، مہرِ عالمتاب کا نورِ نگاہ
خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار   جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جسکی محنت کا عرق طیار کرتا ہے شراب   اڑ کے جسکا رنگ بن جاتا ہے جانِ پردۂ گلاب
قلبِ آہن جسکے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق   شعلہ خو جھونکوں کا ہمدم، تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں   لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جسکا مَس خاشاک میں بنتا ہے اک چادرِ مہین
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمین

"کسان"

اس فن کارانہ کمال کے بعد کسان کو جاتا ہوا دکھا کر سرمایہ دارانہ نظام کی ہیبتناکیوں کو بیان کرتا ہے ؎

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر   جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے   دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ   فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پہ ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار   گھر کی ناامید دیوی کا شبابِ سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائیگا   بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا
سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

دلسوز و دردناک مصوری کرنے کے بعد وہ سرمایہ داری کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار   جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
دیکھ کر تیرے ستم اے حامیٔ امن و اماں   گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
ادعا پیروئی دین و ایمان اور تو   دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بیتاب ہیں
"کسان"

کالج کے سپوتوں کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎
مرد کہتے ہیں اُسے اے مانگ چوٹی کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام

بغاوت، ہوشیار ایک شہید وطن کی یاد میں، مستقبل کے غلام، زمانہ بدلنے والا ہے، مستقبل، شکستِ زندان کا خواب، علی گڑھ سے خطاب، مقتلِ کانپور، غدار سے خطاب، خریدار نہ بن، زندہ مردے، رعبِ حکومت، دام فریب، ناخدا کہاں ہے، ضعیفہ، بوالعجبی، حیف اے ہندوستاں، بھوکا ہندوستان، بہتے ہوئے خون کی برادری، پیاسی ندی، بادشاہ کی سواری، سجاد سے دھمکی، بیدار کر، مردِ انقلاب کی آواز، شاعرِ ہندوستان، غرورِ ادب، دردِ مشترک یہ اور ایسی سینکڑوں نظمیں اپنے اندر، نیشنلزم، انقلاب، زندگی، تعمیرِ قوم اور بیداری کی وہ روح رکھتی ہیں جنھوں نے قومی ارتقاء کی کامیابی میں شاندار امداد کی ہے۔

اُردو کے تمام شاعر، لیعنی قورمہ وکباب کا آدرش دینے والے تمام دشٹ کوی ایک ایک ہندو مسلم، عیسائی سکھ، پارسی، گھر میں اپنا وہ آدرش پہونچا چکے ہیں جو جاگرتی اور کرانتی کا آدرش ہے۔ وہ جدت، نئی زندگی، اور انقلاب کے پیغامبر ہیں، ایک کہتا ہے ؎

کلاہِ خواجگیٔ کائنات کج کرکے
نیا زمانہ، نیا روزگار پیدا کر   جوش

دوسرا کہتا ہے ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ   جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر ہو نہ روزی   اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
اقبال

تیسرا کہتا ہے ؎

انگیٹھیاں ہوں بدستِ نسیم و نکہتِ گُل   کچھ اس طرح روشِ گلستاں بدل ڈالو
حیات کوئی کہانی نہیں حقیقت ہے   اس ایک لفظ سے کل داستاں بدل ڈالو
ساغر

یہی قورمہ وکباب کا آدرش پہونچانے والا اپنے بیٹے سجاد کو وصیت کرتا ہے کہ ؎

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کیلئے
سر کٹانا ہند کو آزاد کرنے کیلئے
باپ کی سوتی ہوئی قسمت جگانے کیلئے   قبر پر دو پھول لے آنا چڑھانے کیلئے
باغِ ہستی کے نہ وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
مژدۂ آزادیٔ ہندوستاں کے پھول ہوں   جوش

جن لوگوں کو سمپورنانند جی قورمہ وکباب کا پیامی کہتے ہیں، وہ اُن منافق وطن پرستوں سے بہت بلند ہیں جو دیش پریم کو بھی اپنی جاگیر خیال کرتے ہیں۔ اور اپنا من مانا ملک بنانا چاہتے ہیں، جو تنگ دل ہیں، تنگ نظر ہیں۔ اپنی لیڈری کے زعم میں ہر شخص کو کچل کر گذرنے کیلئے پُل بنانا چاہتے ہیں۔ جو مُردہ اور دفن شدہ روایات کی ہڈیوں کو نکال کر ایک نیا، تہذیب کا عجائب خانہ سجانا چاہتے ہیں، مگر ہم ہر بات سے آزاد ہو کر ایک نو تعمیر آزاد بھارت کی خاطر اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہیں کہ ہند کو آزاد کرانے کیلئے سر کٹا دینا۔ ہم مرنے کے بعد بھی جنت کو ٹھکرا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

نغمۂ ہندوستاں گونجے گا سازِ عرش تک
چوٹیاں ہونگی ہمالہ کی فرازِ عرش تک   ساغر

اس شعر میں وہ لامحدود جرأت ہے جو سمپورنانند جی کی تنگ دلی کے جواب میں پیش کی جا سکتی ہے۔

موجودہ اُردو شاعری حکیمانہ خیالات، اعلیٰ اور پاکیزہ جذبات، گہرے تاثرات، اونچے محسوسات، کومل اور مدھر تصورات اور دہکتی ہوئی انقلابی روح کا ایک بھڑکتا ہوا امر شعلہ ہے، اب اس درجہ پر نہیں کہ آپ اس کے اثرات کو دبا دیں۔

وہ گرم دوپہر کا سورج ہے، وہ پورن ماشی کا چاند ہے، جس کی کرنوں سے بچ نکلنا انسانی بس کی بات نہیں۔ وہ ایک جھپکتی ہوئی تقدیر ہے، جو ہر سوتی کے ماتھے پر سورج بن کر چمک رہی ہے۔

کرانتی اور جوش کا سیلاب اگر نہ دیکھا ہو تو دیکھئے ؎
شاعر کی محبوبہ شاعر سے کہتی ہے۔

ایشیا بمبو ۱۹۴۰ء

تمہارے دل پہ تحیّر کی کیوں حکومت ہے
تمہارے دل پہ تجسّس کی کیوں حکومت ہے
تمہارے دل پہ تفکّر کی کیوں حکومت ہے
تمہارے دل پہ تغیّر کی کیوں حکومت ہے

تمہارے دل پہ مراراج کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر جواب دیتا ہے :-
یہ شہر پاپ کے بازار اور یہ جنسِ لطیف
بسورتے ہوئے چہرے یہ جسم ہائے نحیف
کوئی بنی ٹھنی بیٹھی ہے اور کوئی کثیف
وہ ذیل جنکو سمجھتے ہیں عاشقانِ شریف

سیاہ کار و مدتیغ سماج کی مخلوق
یہ فتنہ کار و دنی سامراج کی مخلوق
ساغر

سماج اور سامراج یہ دونوں سنسکرت کے الفاظ ہیں، لیکن سنسکرت نہیں معلوم ہوتے، یہ ہندوستانی کے اُس اسٹائل کا کمال ہے جس کے متعلق سمپورنا نند جی "ریڈیو سے شاکی ہیں کہ" ہندو تہواروں تک کے موقع پر ایسی زبان کو سُننا پڑتا ہے جو عربی اور فارسی کے لفظوں سے بھری ہوئی ہوتی ہے" اور سنیئے ؎

محبوبہ کو جواب دیتے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎
یہ دوپہر، یہ کڑی دھوپ اور یہ سناٹا
ہتوڑی ہاتھ میں ہے اور اجیر دوشیزہ
ہے ڈھیر چاروں طرف پتھروں کے ٹکڑوں کا
خمارِ خواب سے کھاتے ہیں ہاتھ جب جھونکا

نگاہِ قہر وہیں آنکھ کھولدیتی ہے
غریب نیند میں موتی سے رولدیتی ہے

یہ راہ راہ یتیم اور گلی گلی بیوہ ؎
یہ موڑ موڑ پہ بوڑھی بھکارنوں کی صدا
یہ بام بام جوانی و حسن کا سودا
یہ ہر قدم پہ جنازہ وقارِ عورت کا

یہ دل گداز مناظر مٹا گئے مجھ کو
تمام رازِ محبّت بتا گئے مجھ کو
ساغر

میں اُردو زبان کا ایک معمولی شاعر ہوں لیکن "قورمہ وکباب کا اس طرح آدرش دیتا ہوں :-
محبوبہ کہتی ہے ؎
مدام سایہ فگن تھا جو نوجوانوں پر
جو برق بن کے چمکتا تھا گلستانوں پر
نقوش ثبت ہیں جسکے ابھی زمانوں پر
ستارے جس سے سلگتے تھے آسمانوں پر

وہ تند شعلۂ آواز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر جواب دیتا ہے ؎
حیاتِ بے بس و تنہا مری نظر میں نہ تھی　　نحیف آہِ شرر زا مری نظر میں نہ تھی
کراہتی ہوئی دنیا مری نظر میں نہ تھی　　یہ پیرِ زال، یہ بیوہ مری نظر میں نہ تھی
سُنے نہ تھے کبھی مزدور حسن کے نغمے!
مرے خیال میں بھی فاقہ کش کے گیت نہ تھے
کہیں ہے بارشِ دولت کہیں غموں کی اوس　　یہ عشرتیں یہ مسرت یہ قصر جنت بوس
یہ جھونپڑوں میں کسانوں کی انتڑیوں کی سوس　　یہ ہے نظامِ جہاں میں خدا نہیں افسوس
نہیں ستارے نہیں خاک ہی کو بھڑکا دے
مری نوا سے امیروں کے دل ہی سلگا دے　　ساغر
جب طلائی رنگ سکّوں کو نچایا جائیگا　　جب مری غیرت کو دولت سے لڑایا جائیگا
جب رگِ افلاس کو میری دبایا جائیگا
اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤنگا
اور اپنے پاؤں سے انبارِ زر ٹھکراؤنگا

(۲)

حکمِ آخر قتل گہ میں جب سنایا جائیگا　　جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائیگا
جب یکایک تختۂ خونیں ہٹایا جائیگا
اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤنگا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھپر فدا ہو جاؤنگا　　ساغر

— ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

قورمہ وللباب کا آدرش دینے والی شاعری اس طرح انقلاب کا فرمان جاری کرتی ہے:-

اٹھو اور اُٹھ کے نظامِ جہاں بدل ڈالو   یہ آسماں، یہ زمیں یہ مکاں بدل ڈالو
انگیٹھیاں ہوں بدستِ شمیم و نکہتِ گل   کچھ اس طرح روشِ گلستاں بدل ڈالو
حیات کوئی کہانی نہیں حقیقت ہے   اس ایک لفظ سے کل داستاں بدل ڈالو
بگڑ کے شیب کی رگ میں بھر و شباب کا خون   دلِ ضعیف سے قلبِ جواں بدل ڈالو
نظامِ قافلہ بدلا تو کیا کمال کیا   مزاجِ راہبرِ کارواں بدل ڈالو
ہر ایک ذرّہ سے پیدا کرو نئی دُنیا
نئے جہاں سے پُرانا جہاں بدل ڈالو   ساغر

"نیا پجاری"

وطن وہ وطن وہ مہکتا شوالہ   وہ راحت کا مندر محبت کا کعبہ
خطیبِ ہمالہ کا زرکار منبر   وہ گنگا کی گودی، وہ جمنا کا جھولا
وہ مندر ہے میرا وطن جس کے اندر   ہزاروں خدا ہیں تو لاکھوں کلیسا
مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری   ساغر

حکیمانہ تصورات اور خیالات کے اظہار میں اُس نے جو کمال حاصل کیا ہے اس کی مثال ذیل کی رباعیات سے کیجئے ؎

جوش کہتا ہے ؎

یہ بزمِ گہِ عمل ہے بے نغمہ و صوت   اس دائرہ میں ولولۂ روح ہے فوت
یک رنگی[1] و یکسانی اسلوبِ حیات   دراصل ہے ایک سانس لیتی ہوئی موت

وجودِ باری تعالیٰ (ایشور) کے متعلق کہتا ہے ؎

ہنسنا بھی عجیب شے ہے رونا بھی عجیب   پانا بھی ہے طرفہ بات کھونا بھی عجیب
ایک قادرِ مطلق کا بہ اوصافِ حسن   ہونا بھی عجیب ہے، نہ ہونا بھی عجیب

نومیدیٔ نظارۂ انوار بھی جہل   اُمیدِ شہود و شوقِ دیدار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تک ہے سوال   انکار بھی جہل ہے اور اقرار بھی جہل

---

[1] (Monotony of Life.)

ان حقائق کو مہاتما گوتم بدھ نے بھی اس طرح نہیں کہا تھا جس طرح جوش نے بیان کیا؛ وہ اپنی "تشکیک" ([illegible]) کو جبل سے تعبیر نہ کر سکے، بھگوان تھے نا!؟

ہر عہد کا ادب اپنے ماحول کا عکس ہوتا ہے اور ہر ادیب و شاعر اپنے زمانہ کے اخلاق و روایات کی تصویر؛ چنانچہ قدیم غزل کی شاعری میں اگر شعراء الم پرست (نراشاوادی) تھے تو اُس کی بنا اسلام اور اسلامی تمدن و حکومت کی پستی و تباہی تھی اور اس تباہی کی اصل وجہ وہ منفعل روحانی تخیل جو تصوّف کے نام پر صوفیاء نے مسلمانوں پر منڈھ دیا تھا یہ سادہو سنت بھی دراصل (Feudalism. جاگیردارانہ نظام کا ردِ عمل تھے؛ اور مسلمانوں کی عام یاس پرستی انکی تعلیمات کا نتیجہ

لیکن اقبال اور دوسرے شعراءِ حالیہ نے اُردو شاعری کو یاس انگیز داخلیت سے یکسر آزاد کر دیا؛ ذیل کی مثالوں سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے ؎

ہر بات پہ منہ ترا اُتر تا کیوں ہے؟   جینے کیلئے بنا ہے مرتا کیوں ہے؟
کونین کے ساتھ کھیل اے طفلِ حیات!   کونین خود اک کھیل ہے ڈرتا کیوں ہے؟
جوش

اُردو شعراء نے ہندوستانی قوم کو موت سے دست و گریبان ہونے کی تعلیم دے کر ان کی نڈھال اور نراش زندگی کو طاقت اور شگفتگی دی ہے جو سیاست دانوں کے بس کی بات نہ تھی۔

ہاں مرگ و حیات کے سمجھتا ہوں میں راز   آغاز انجام ہے تو انجام آغاز
دیتا ہے زمانہ جب اجل کی دھمکی   دل سے آتی ہے قہقہوں کی آواز
جوش

ہندوستانی ذہنیت کو تبدیل کرنے میں اُردو زبان کے مشہور اور اعلیٰ شاعروں نے جو خدمات انجام دی ہیں، سمپورنانند جی ان سے انکار نہیں کر سکتے۔ اُردو شاعری نے ہندوستانی سماج کے بنانے میں وہی حصہ لیا ہے جو کسی ترقی کرنے والے ملک کا ساہتیہ (ادب) لیا کرتا ہے۔

جس ڈربہ تک بقول سمپورنانند جی یہ محدود ہے اس ڈربے کی لمبائی چوڑائی جوش کے ان چار مصرعوں میں ملاحظہ فرمایئے ؎

پھولوں کی اگر ہوس ہے خاروں کو نہ دیکھ   عشرت کی ہے دُھن تو سوگواروں کو نہ دیکھ
تعمیرِ حیات ہے اگر پیشِ نظر   مڑ کر بھی مٹے ہوئے مزاروں کو نہ دیکھ
(جوش)

تعبیر نہیں ہے عصر سے تو — ہے تیرے وجود سے زمانہ
بجلی جو گری تو غم نہ کیجئے — سو بار بنے گا آشیانہ
پرواز کرلے اسیرِ گلشن — ہر شاخ ہے تیرا آشیانہ

ساغر

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا — دنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور مولیٰ بن جا — معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا

یہ دور باختشار آدمیت) سے شروع ہوکر معبودیت (ایشورتا،
تک وسیع ہے، اردو شاعری نے انسان کی "خودی" کو لامحدود کردیا ہے
اس پر بھی اگر ہمارے سوشلسٹ لیڈر کو یہ شاعری قورمہ کباب والی
شاعری نظر آتی ہے تو یہ ان کا انتہائی خطرناک تعصب ہے۔ جو ان کے
ترقی یافتہ اور سوشلسٹ ہونے کی تردید کرتا ہے۔

ایک خاص نکتہ

اصل میں اردو شاعری نے انہیں اجزا اور عناصر کو قبول یا اختیار کیا جو ترقی یافتہ اور زندہ زبانوں یا اُن السنہ کے ترقی یافتہ ادب کی جان تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سمپورنا نند جی اور ان کے ہم خیال ہندوستانی شاعری اور واحد قومی زبان میں سنسکرت عناصر کی بھرمار چاہتے ہیں کیا اس بھرمار سے کوئی ترقی یافتہ زبان پیدا ہوسکتی ہے! ؟

میرا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ جس زبان کو ہندی کے بجا ری رائج کرنا چاہتے ہیں اس میں ہرگز وہ وسعتیں پیدا نہیں کی جاسکتی جو زندہ اور کارآمد زبان کے لئے لازمی اور ضروری ہیں۔ ہندی کے لئے سنسکرت کو سرچشمہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ خود سنسکرت ہزارہا سال سے مردہ زبان چلی آرہی ہے۔ اس دوران میں انسانی سماج نے جو کچھ ترقی کی ہے اور زبانوں میں جن ذخیروں کا اضافہ ہوا ہے اُن سے سنسکرت یکسر محروم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی زبان کو سرچشمہ بناکر جس کی ناداری کسی دلیل کی محتاج نہیں کیوں کر کوئی اچھی کارآمد اور قابلِ قبول زبان کہی جاسکتی ہے۔

پہلے سنسکرت کو آپ اس معیار تک پہونچانے کی کوشش کیجئے جو دورِ حاضر کی ضرورت کے مطابق ہو۔ اس کے بعد کہیں آپکو یہ حق ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کی زبان کی تعمیر سنسکرت کے ستونوں پر قائم کی جائے۔

انقلابی تصورات اور اُردو شاعری

کیا سمپورنا نند جی یہ بتا سکتے ہیں کہ جنگ کے سلسلے میں حکومتِ ہند نے کتنے ہندی شعراء کی کتابیں اور نظمیں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے سلسلے میں ضبط کیں ــــــ ! ؟ کیا وہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ہندی شاعروں میں سے کسی ایک شخص نے بھی کوئی ایسی نظم کہی جو نیشلزم اور دُنیا کی ادبی تاریخ میں یادگار رہیگی۔ اگر مذکورہ نظم کی پیشگوئی کے مطابق اس جنگ کا خاتمہ ہوا تو اس نسل کے نہیں لیکن دوسری نسل کے ہندوستانی جس شخص کا اسٹیچو گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے بنائیں گے۔ وہ ایک اُردو شاعر ہی ہوگا اور آج بھی وہ نظم اگر "جنتا" کے کھلے جلسے میں پڑھی جائے تو میں چیلنج کرتا ہوں کہ اس کے تیز اور دہکے ہوئے انگارے ہر آتما کی انگیٹھی کو دہکا کر جہنم بنا دے سکتے ہیں۔ اسوقت میں سمپورنا نند جی کو بتا سکتا ہوں کہ اُردو شاعری کو کیا ہر دلعزیزی حاصل ہے۔

شہروں اور تحصیلوں ہی میں نہیں، ہم اپنی انقلابی اسپرٹ، کسانوں اور مزدوروں کے سنسان اور ستم رسیدہ دلوں تک پہونچا چکے ہیں آج کشمیر کی پہاڑیوں سے راس کماری تک اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس کی ہر دلعزیزی کی گونج ملک کے گوشہ گوشہ اور کونے کونے میں اپنا جھنڈا گاڑ چکی ہے۔

سید مطلبی فریدآبادی کی دیہاتی بولی کی کوتائیں جس شخص نے سُنی یا پڑھی ہیں، وہ تسلیم کریگا کہ یہ کام بھی ہم نے ہی کیا ہے۔ اور اس کا سہرا بھی کہ دیہات میں انقلاب اور دیش پریم کا پیغام پہونچائیں ہمارے ہی سر رہے گا۔

اس نظم "کسان بکھا" کے دیباچہ میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"پوری کتاب خالص دیہاتی زبان میں ہے، نئی ہندی کے حامی جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے یہ زبان اس لئے اختیار کی ہے کہ ہماری آواز دیہاتیوں تک پہونچے وہ اسے پڑھیں اور دیکھیں کہ ان کی ہندی نہ دیہاتیوں کی زبان ہے نہ شہریوں کی۔" (باقی)

ساغر

[illegible]

ایشیا

پہلا باب

ادبیات سیاسیات

ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء

متحدہ آزاد ہندوستان کا دستور

سوال نامۂ آل پارٹیز آزاد مسلم کانفرنس اور اُس کے جوابات

از۔ ساغر

سوالات

نمبر ۱۔ اس لحاظ سے کہ ہندو مسلمان اور ہندوستان کے دوسرے باشندے زاید از ایک ہزار سال ایک دوسرے کے ساتھ مختلف حالات میں رہتے چلے آئے ہیں، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام ملک کے لئے ایک ایسا طرز حکومت تشکیل پا ئے جس کے تحت ملک کو وہی آزادی اور کامل اقتدار حاصل ہو جو دنیا کے دوسرے آزاد ممالک کو حاصل ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمام باشندگان ہند خواہ اُن کے سیاسی اور مذہبی معتقدات کچھ بھی ہوں ملک کے تمام ذرائع و وسائل میں برابر کے حقدار ہوں گے، اور زندگی کے ہر شعبے میں انہیں شہریت کے مساویانہ اور مکمل حقوق حاصل ہوں ؟

نمبر ۲۔ کیا آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ دستور اساسی میں مساوی حقوق کے سلسلے میں مذہبی جماعتوں کے مخصوص حقوق کا جداگانہ باب شامل کیا جائے خواہ ان حقوق کا تعلق کل ہندوستان یا اُس کے کسی حصہ میں بسنے والی اقلیت کے ساتھ ہو یا اکثریت کے ؟

نمبر ۳ (الف) آپ کی نزدیک بنیادی حقوق میں مسلمانوں کے لئے کس قسم کے مذہبی حقوق شامل کئے جائیں۔

(ب) اس قسم کے حقوق کے (۱) تعین اور (۲) ان کے منصفانہ فیصلہ کے لئے آپ کی رائے میں کس قسم کا سیاسی عدالتی انتظام ہونا چاہیئے۔

جوابات

نمبر ۱ یقیناً ایک ایسا طرزِ حکومت ہی نہیں، بلکہ ہم ایک ایسی کامل آزاد ریاست کا قیام ضروری سمجھتے ہیں جس میں ملک کے سکھ، پارسی عیسائی اور ہندو مسلم عوام کو مکمل آزادی اور اقتدار حاصل ہو۔

سوال کے دیگر اجزا سے اتفاق ہے۔

نمبر ۲ "بنیادی حقوق" کی نمبر ۲ واضح شقوں کے بعد مساوی حقوق کے سلسلے میں مذہبی جماعتوں کے مخصوص حقوق کا جداگانہ باب شامل کرنے کی میرے نزدیک کوئی ضرورت نہیں، جب تک کہ مذہبی حقوق کی وضاحت نہ ہو لیکن مخصوص حقوق سے اگر آپ کی مراد بعض ایسے نزاعی مسائل مثلاً گائے کی قربانی یا عام شاہراہوں پر ذبیحۂ گاؤ کا انسداد، مسجد کے آگے باجہ بجانے کا استرداد، مذہبی جلوس نکالنے کی آزادی، یعنی رواجی و رسمی تقریبات نہیں اور اسی قسم کے مسائل سے ہے تو خیر، محض احتیاطی، دراندازی طور پر مخصوص حقوق کے جداگانہ باب شامل کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ مگر یقیناً یہ بات ہر اقلیت اور اکثریت کے مخصوص حقوق سے مساوی طور پر متعلق ہونا چاہیئے۔

نمبر ۳ (الف) بنیادی حقوق نمبر ۳ اور نمبر ۴ میں وہ تمام مذہبی حقوق ضبطِ تحریر میں آگئے ہیں۔ جو مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے تمام جزئیات پر حاوی ہیں۔ یہاں تک کہ اوقاف اور خیراتی اداروں کی حفاظت کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن اوقاف اور خیراتی اداروں کے تجزیہ اور حسابات

سوالات

نمبر ۴ (الف) عام شہریت کے سلسلے میں فرقوں اور افراد کے بنیادی حقوق میں آپ کیا سیاسی، اقتصادی، تمدنی (کلچرل) اور معاشرتی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

(ب) آپ کے نزدیک ان حقوق کے تحفظ کے لئے کیا آئینی یا عملی ذریعہ یا کارروائی اختیار کی جائے؟

نمبر ۵ ۔ مثلاً کیا آپ مذکورہ بالا تمام مسائل کے سلسلہ میں حسب ذیل امور کو شامل کریں گے؟

(الف) کسی فرقہ، گروہ یا جماعت کو حق نہ ہوگا کہ وہ تمام ملک یا اُس کے کسی حصہ یا وسائل کو اپنی خصوصی ملکیت بنائے، اور ملک کا دستور اساسی وفاقی ہوگا نہ کہ وحدانی، اور صوبہ یا وفاقی حصہ یا ریاستیں تمام معاملات میں مکمل طور پر خود مختار رہیں گی، اور وفاقی مرکز خود مختار صوبوں کی طرف سے صرف اُن اختیارات کا حامل ہوگا جو سب صوبوں کے مشترکہ مفاد سے تعلق رکھتے ہوں، اور یہ کہ اُن وفاقی مضامین کی ایک فہرست طے شدہ تیار ہونی چاہئے۔ مثلاً امورِ خارجہ مواصلات، محاصل بحری، بندرگاہیں، ساحلی علاقوں کا محفوظ علاقہ، روشنی کے رہنما مینار وغیرہ وغیرہ کی۔

(ب) نہ تو وفاقی حکومت کا اور نہ صوبوں کی حکومت کا کوئی مذہب بہ حیثیت حکومت کے ہوگا، اور نہ حکومت کی طرف سے کسی خاص فرقے کی جماعتوں یا ملتوں کو سرکاری خزانے سے کوئی امداد یا وظیفہ دیا جائیگا لیکن اگر کسی فرقہ کے نمائندوں کی ۵۰ فی صدی کی اکثریت اپنے فرقے کے کسی خاص مذہبی جماعت یا تحریک کی امداد یا انتظام کے لئے کوئی خاص ٹیکس لگانا چاہے تو وفاقی یا صوبوں کی حکومت اس فرقے کے لئے ایک قانونی وقف کی تشکیل کے لئے قانون بنا سکتی ہے اور وقف کے لئے ٹیکس وصول کرنے میں امداد بھی دے سکتی ہے یا آپ اس کے علاوہ کوئی اور دوسری صورت تجویز کرتے ہیں؟

(ج) بنیادی حقوق کی نشارکی تکمیل کے لئے تمام ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، خواہ اُن کی اپنی اندرونی تقسیم کسی قسم کی ہو، ان میں سے ہر ایک، ایک ہی مذہبی فرقہ شمار ہوں گے، اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ اپنے بنیادی مذہبی اعتقاد کی مناسبت سے

جوابات

کی سخت ضرورت ہے، برٹش حکومت کوئی اسلامی یا قومی حکومت نہیں ہے، وہ صاحبانِ وقف اور اجارہ ہائے خیراتی کے کارکنوں کے طرزِ عمل پر نگاہِ احتساب نہیں ڈال سکی۔ چنانچہ بہ آسانی یہ بتایا جاسکتا ہے کہ صاحبانِ وقف وغیرہ اوقاف کی آمدنیوں سے ذاتی کاروبار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ناجائز ذاتی صرف سے بھی گریز نہیں کرتے لیکن بہرحال اِس سوال کے پس منظر میں اگر یہ اشارہ پوشیدہ ہے مسلمانوں کے مذہبی حقوق:۔

(۱) وراثت (۲) نکاح وخلع (۳) زکوٰۃ (۴) اوقاف وغیرہ کو "مخصوص مذہبی حقوق" کی حیثیت دی جائے اور اس قسم کے حقوق کے

(ب) (۱) تعین کا حق علمائے مذہب کے سپرد کیا جائے (جیساکہ دینی طور پر اب بھی اِن امور پر علمائے کرام ہی کا کنٹرول ہے) تو غالباً ایک حد تک یہ کوئی غلط اقدام نہ ہوگا۔ لیکن

(۲) اِن مخصوص حقوق کے منصفانہ فیصلے کے لئے اگر مذہبی عدالتیں قائم کی جائیں گی تو یہ عجیب قسم کا تضاد ہوگا۔ اِس لئے کہ تعین کے عامل بھی علماء ہوں گے اور قاضی بھی علماء!؟ دراصل تعین کا حق ان علماء کے ایک بورڈ کو ہونا چاہئے جن کو قومی حکومت متعین کرے اور فیصلہ کا حق عام قومی عدالتوں کو۔

اس قسم کے حقوق متعین کرنے کا حق اُن علمائے مذہب کو ہونا چاہئے جو اسلامی شریعت کے ماہر بھی ہوں اور جن کا سیاسی شعور بھی مکمل ہو۔

نمبر ۴ (الف) گو بنیادی حقوق میں زبان، تعلیم اور رسم الخط کی گارنٹی موجود ہے لیکن اُردو زبان کا مسئلہ مسلمانوں میں شدید اہمیت اختیار کرچکا ہے، اگرچہ عوام کے دعووں میں غیر منطقی عناصر زیادہ ہیں لیکن مسلمانوں کی عام رائے یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط کے تحفظ کی دستور میں زبردست گارنٹی موجود ہو۔

(ب) میرے نزدیک ہندوستان کے ہر اقلیتی و اکثریتی صوبہ میں عدالت اور جملہ صوبائی حکومتوں کے کاغذات و دفاتر قانونی طور پر علاوہ مقامی زبان کے اُردو رسم الخط میں بھی ہونے چاہئیں۔ ہندوستان اپنی وسعت مختلف النسل، مختلف العقیدہ اور مختلف آب وہوا اور صوبوں کی تقسیم کے لحاظ سے ایک شاندار انٹرنیشنل اجتماع کے مماثل ہے تو جس طرح ایک

سوالات

علیحدہ فرقے شمار ہوں گے۔

(د) بنیادی حقوق میں حسبِ ذیل امور شامل ہوں گے۔

(۱) اجتماع اور انجمن بنانے کی آزادی۔

(۲) تقریر و تحریر اور صحافت کی آزادی۔

(۳) ضمیر کی آزادی اور مذہبی معتقدات اور ان پر عمل کرنے کی آزادی

(۴) پرسنل لاز، تمدن، زبان، تعلیم، رسم الخط، معابد، قبرستان، اوقاف اور خیراتی اداروں کی حفاظت۔

(۵) بلا امتیاز صنف تمام شہریوں کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوں گی۔

(۶) کسی شہری کو اس کے مذہب، فرقہ، معتقدات یا صنف کی وجہ سے سرکاری ملازمت، اقتدار یا اعزازی عہدے کے لئے کسی تجارت اور پیشہ میں کام کرنے میں کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔

(۷) تمام شہریوں کو پبلک سڑکوں، کنوؤں، مدرسوں، تمام تفریح گاہوں اور دوسرے پبلک اداروں کے استعمال کے لئے مساویانہ حقوق حاصل ہوں گے۔

(۸) خاص قواعد و ضوابط کے ماتحت جو شہریوں کے لئے یکساں ہونگے ہر شخص کو اسلحہ رکھنے اور لے کر چلنے پھرنے کا حق ہوگا

(۹) کسی حالت میں کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم نہ کیا جائے گا نہ اس کے مکان یا جائداد میں مداخلت کی جائے گی نہ اس کو اس سے بیدخل کیا جائیگا اور نہ اسے ضبط کیا جا سکے گا (بجز اس کے کہ قانون اس کی اجازت دیتا ہو)

(۱۰) ہر بالغ کو حقِ رائے دہی حاصل ہوگا۔

(۱۱) ابتدائی تعلیم مفت ہوگی۔

(۱۲) ہر قسم کے مزدوروں کے لئے کم از کم مقررہ مزدوری جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہے، کارخانوں میں کم کام کے مقررہ گھنٹے۔ کام کرنے کے لئے اچھا ماحول، بوڑھاپا، بیماری اور بیکاری کے اقتصادی نتائج سے بچنے کی صورتیں۔

(۱۳) حکومت اس امر کی ضامن ہوگی کہ کوئی شہری بے روزگار نہیں رہیگا لیکن اگر وہ بے کار رہے (بجز اس صورت کے کہ وہ خود کام کرنے سے

جوابات

بین الاقوامی زبان (انگریزی) ملک کے ہر گوشے میں اظہار و بیان اور تقریر و تحریر کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے نمبر پر صرف اُردو (ہندوستانی) ہی ایک ایسی زبان ہے جو کشمیر سے لے کر راس کماری تک کسی نہ کسی شکل میں اظہار و بیان کی بین الاقوامی ضرورتیں پوری کرتی ہے اور اس میں قومی ضرورت کو پورا کرنے کی زیادہ اہلیت موجود ہے۔

کلچرل حقوق کے سلسلے میں میں تجویز کروں گا کہ ہر صوبائی زبان کے ساتھ ہندوستانی کو لازمی قرار دیا جائے اور آزاد ہندوستان کی زبان اُردو (ہندوستانی) ہی قرار دی جائے مرکزی وفاقی حکومت کا محکمۂ خارجہ کا کام تو انگریزی زبان میں ہو سکتا ہے لیکن مجوزہ داخلی تمام تر اُردو زبان میں طے پانے چاہئیں۔

تشریح :- (اُردو زبان سے میری مراد وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں ہر فرقہ کی مادری زبان ہے اور بول چال کا ذریعہ بنی ہوئی ہے) صوبوں اور مرکزی حکومتوں کی سرپرستی زبان کے مسئلے کے حل کا باعث ہو سکتی ہے، لازمی طور پر اس سرپرستی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپس میں زبان کے جو جھگڑے پیدا ہو گئے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔ اور ایک مشترک زبان تمام ہندوستان میں ترویج پا جائے گی۔

سینٹرل گورنمنٹ کو مستقل طور پر اظہار و بیان کا ذریعہ (ہندوستانی) اور رسم الخط میں فارسی اور ناگری رسم الخط کو بنانا چاہئے اور صوبائی حکومتوں کو اپنی اپنی زبان کی سرپرستی کرنی چاہئے اور ساتھ ہی اُردو (ہندوستانی) کی سرپرستی کا فرض ادا کرنا چاہئے۔

نمبر ۵ **(الف)** بلاشک میں مندرجہ ذیل امور کو مندرجہ بالا امور میں شامل کرنے کے حق میں ہوں اور مجھے کلی طور پر ان سے اتفاق ہے، لیکن وفاقی دستور میں حکومت پاکستان خالصستان۔ دراوڑ استان کے تخیل سے بالکل پاک و صاف ہونی چاہئے۔

(ب) بلاشک متصورہ قومی حکومت کا بہ حیثیت حکومت کوئی مذہب نہیں ہونا چاہئے۔ ہر قسم کی فرقہ پرستی سے اس حکومت کو محفوظ ہونا چاہئے وظائف ہی نہیں، کوئی ایسا جزئیہ، معرض عمل میں نہیں آنا چاہئے جس میں قدیم روایتی جھلک پائی جاتی ہو۔

سوالات

انکار کرے) تو اس کو حکومت کی جانب سے بقدرِ کفاف گذارہ دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ حکومت اس امر کی بھی ضامن ہوگی کہ وہ تمام شہریوں کو جو بوجہ ضعیفی یا قدرتی معذوری کام کرنے کے ناقابل ہوں بقدرِ کفاف گذارہ دے۔

(ہ) ایمان، مذہبی معتقدات اور مذہبی اعمال، پرسنل لاز، زبان، رسم الخط، تمدن (کلچرل) اور تبلیغ کے سلسلے میں تمام فرقے آزاد اور خود مختار ہوں گے اور افراد کو مذہب بدلنے اور اس کا اعلان کرنے کی ممانعت نہ ہوگی اور کسی شخص کو اس کی سزا نہ دی جائے گی کہ اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا ہے، اور کسی شخص کو خاص مذہبی عمل اور مخصوص طریقِ معاشرت اختیار کرنے پر ناجائز دباؤ ڈال کر مجبور نہ کیا جائیگا۔

(و) وفاقی یا صوبائی حکومتوں یا مقامی نیم حکومتی اداروں مثلاً میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، پورٹ ٹرسٹ وغیرہ کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ کسی مذہبی ادارے یا عبادت گاہ یا قبرستان، یا مرگھٹ کے قائم شدہ معاملات میں دخل اندازی کرے (خواہ ان کا انتظام حکومت کے زیرِ نگرانی ہو یا نجی طور پر) نہ مذہبی حوائد و رسوم میں حکومتی اداروں کو دخل اندازی کا حق ہوگا۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ ہر شخص اپنے حقوق کو بغیر کسی مداخلت اور مزاحمت استعمال کر سکے۔

(ز) کوئی جائداد موقوفہ یا جو الیشور دیوتا دس کے نام پر دھرم ارتھ کی گئی ہو، کسی حالت میں بھی (باوجود کسی قانونِ انتقال، قانونِ تمادی، قانونِ ضبطی یا اور کسی وجہ کے) کسی ایسی غرض کے لئے استعمال نہ کی جائے گی جس کے لئے وہ وقف یا دھرم ارتھ نہ کی گئی ہو مگر یہ دفعہ ماضی پر اثر انداز نہ ہوگی۔

(ح) کسی شخص کو اپنے عقیدہ کی بنا پر اپنے لئے خوراک منتخب کرنے اور اس کے لئے استعمال کرنے یا کسی پیشہ اور تجارت کو اختیار کرنے سے کسی قانون، دفتری حکم یا معاشرتی دباؤ کے ذریعہ محروم نہیں کیا جائیگا۔

(ط) کوئی شہری محض صنف مذہب یا عقیدہ کی بنا پر کسی پبلک ملازمت سے محروم نہیں کیا جا سکیگا۔ پبلک ملازمت میں سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی ملازمتیں از روئے قانون قائم شدہ اداروں، اور سرکاری وظیفہ یا امداد پانے والے اداروں کی ملازمتیں شامل ہوں گی۔

جوابات

قانونی وقف کی تشکیل کے سلسلے میں میری ایک ترمیم ہے۔ یعنی مذہبی مباحث ہی نہیں بلکہ ہر اس مفید تحریک کے انتظام کے قانون بنانے کا جواز ہونا چاہیے جو کسی فرقہ کے نمائندوں کی ۷۵ فی صدی کی اکثریت سے پیش ہو اور جو اس کی اصلاح و ترقی میں موثر ثابت ہوتی ہو۔

(ج) مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ اس سوال میں فرقہ در فرقہ احساس کو فنا کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو مختلف سمتوں میں منتشر اور پراگندہ کرنے کی ذمہ داری ان گروہ بندانِ مذہب پر عائد ہوتی ہے جو مسلمانوں کو ۷۲ فرقوں میں تقسیم کر کے کمزور کرتے ہیں اور پھر بھی اسلامی اخوت اور مساوات کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ !؟ یا جدید سیاسی شعور کی رو پر محض ذرا سے اختلافِ عقائد کی بنا پر مسلمانوں میں علیحدہ سیاسی نمائندگی چاہتے ہیں۔ !؟

میرے خیال سے یہ اتحادِ دین اور اخوتِ اسلامی کے قطعی منافی ہے، میرے نزدیک مذہبی طور پر مسلمانوں میں صرف ایک فرقہ ہے جس کا وجود مکمل ہے اور جس کا نام "مسلمان" ہے۔ میری رائے میں بلا کسی اختلاف و تقسیم کے صرف مسلمانوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ خواہ وہ سنی ہو یا شیعہ، قادیانی ہو یا اہلِ حدیث، حنفی ہو یا وہابی یا کوئی اور مسلم فرقہ کے۔

بنیادی حقوق اور اس سے متعلقہ امور اپنی جگہ قطعی مکمل ہیں۔ شق نمبر ۱۲ میں مزدوروں کے حقوق کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی لازمی طور پر ہونی چاہیے کہ مزدور حاملہ عورتوں کو زچگی کے دوران میں تین تین ماہ کی (Maternity leave) رخصت دی جائے۔

اسی طرح شق نمبر ۱۱ میں ابتدائی تعلیم کے مفت ہونے کے ساتھ "جبریہ" کے الفاظ کا اضافہ کیا جانا نہایت ضروری ہے۔

مذہب کے ترک و اختیار کی مکمل آزادی، ایمان، معتقدات، مذہبی اعمال، پرسنل لاز، زبان، رسم الخط، تمدن (کلچر) کے سلسلے میں تمام فرقوں کی آزادی اور خود مختاری ہر قومی حکومت کے مسلمہ فرائض ہونے چاہیئیں لیکن تبلیغ کی آزادی ہر فرقہ کو ایک دوسرے سے متصادم کر دے سکتی ہے یہ خدشہ کوئی نیا خدشہ نہیں ہے۔ ملک میں [illegible] کے بعد فرقہ پرستی کی نیو جن تحریکوں نے ڈالی، ان تحریکوں میں سے شدھی اور سنگٹھن، تبلیغ اور تنظیم کی تحریکیں بھی تھیں۔

سوالات

(دی) (۱) دستورِ اساسی کی کوئی دفعہ جس کا تعلق مختلف مذہبی جماعتوں کے حقوق و مفاد سے ہو جائز نہ ہوگی۔ تاوقتیکہ اسی فرقہ کے نمائندوں نے اس کو وضع نہ کیا ہو، بلکہ اس طریقے سے جو دفعہ وضع کی جائیگی وہی دستور میں داخل کی جائے گی۔ مزید برآں دستور کی کسی ایسی دفعہ میں بغیر متعلقہ فرقہ کے نمائندوں کی منظوری کوئی اضافہ، ترمیم یا تنسیخ نہ ہو سکے گی۔

(۲) کسی مجلس وضع قوانین میں کوئی ایسا مسودہ قانون پیش نہ ہوسکیگا جو کسی مذہبی فرقہ کے بنیادی حقوق پر مخالفانہ اثر ڈالتا ہو، تاوقتیکہ اس فرقے کے نمائندے اس کے حق میں نہ ہوں۔

(۳) ہر معاشرتی یا مذہبی یا پرسنل لاز سے متعلق قانون جو کسی دوسرے مذہبی فرقے پر اثر انداز نہ ہو، اگر متعلقہ فرقے کے کل نمائندوں کی اکثریت اسے منظور کرانا چاہے تو وہ مجلس میں پاس کرایا جائیگا۔

(۴) کسی شہری کی نقل و حرکت پر خواہ وہ ہندوستان کے کسی حصہ سے کسی حصے کی طرف ہو، کوئی پابندی عائد نہ کی جائے گی، بلکہ سب شہریوں کو یکساں اور مساویانہ شہری حقوق حاصل ہوں گے۔

(۵) قانون سازی میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کیا جائیگا۔

(ل) تمام اُن شکایتوں کا حق سماعت جو بنیادی حقوق یا دستورِ اساسی کی خلاف ورزی کی وجہ سے پیدا ہوں، متعلقہ صوبوں کی ہائی کورٹوں کے بنچ کو ہوگا۔ اور اس کے اپیل کا حق سماعت فیڈرل کورٹ یا سپریم کورٹ کو حسب ضرورت ہوگا۔

نمبر ۶ (الف) کیا آپ کی رائے میں تناسب ملازمت آل انڈیا ملازمتوں میں وہی قائم رہے جو مرکزی حکومت کی جانب سے سنہ ۱۹۴۳ء میں بھی منظور شدہ ہے یا آپ کے خیال میں کوئی دوسری تجویز ہے؟

(ب) صوبائی حکومتوں، میونسپلٹیوں اور نیم حکومتی اداروں کی ملازمتوں میں آپ کیا تناسب ملازمت تجویز کرتے ہیں؟

نمبر ۷ - مہربانی فرما کر یہ تجویز فرمائیں کہ تمام انتخابی اداروں میں طریقِ انتخاب کیا اور کس قسم کا ہو اور آیا نشستیں محفوظ ہوں یا اور کیا ہوں؟

نمبر ۸ امورِ ذیل کے متعلق آپ کی تجویز کیا ہیں؟

(۱) صوبہ جات کے حدود میں تغیر و تبدل اگر ضروری ہو۔

جوابات

اس بدبخت ملک میں اہلِ مذاہب نے (خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں) مذہبی احساسات کو نہایت غلط طور پر استعمال کیا ہے اور اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شدید قسم کی بے معنی مذہبی منافرت آپس میں پھیل گئی ہے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے باقاعدہ تبلیغی مراکز اور مشنریز ہیں جو نہایت اہتمام و سلیقے کے ساتھ اس کاروبار کو کرتے ہیں۔ لیکن تمام ہندوستان میں (جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں) مسلمانوں کا کوئی ایسا انسٹی ٹیوشن موجود نہیں ہے جس میں نومسلم افراد کی تعلیم و تربیت اور گذر اوقات کا انتظام ہو۔ یا معمولی نومسلم عوام کو ان کے ادنیٰ سوشل رتبے سے بلند کرنے کے ذرائع و سامان موجود ہوں۔

اِن حالات میں عام مسلمانوں یا کسی خاص مسلم جماعت کا یہ اصرار کرنا کہ بنیادی حقوق میں تبلیغ کی آزادی بھی تسلیم کی جائے خود مسلمانوں کا شدید نقصان کرنا ہے۔ تبلیغ کی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں اس کے ذریعے ہر وقت قومی حکومت کی راہ میں کانٹے بچھائے جاسکتے ہیں۔ مسلمان تبلیغ کے سلسلے میں تحریص سے کام نہیں لیتے۔ خاصکر عیسائی مشنریوں کے مقابلہ میں جن میں سے بعض کی سرپرستی غیر ممالک اور بعض کی پشت پناہی برٹش حکومت کی اخلاقی امداد کرتی ہے، مسلمان تبلیغی سرگرمیوں کو شروع و جاری بھی کیا کر سکتے ہیں۔ اِس کا بیّن ثبوت گذشتہ تحریکِ تبلیغ کی کھلی ہوئی ناکامی ہے۔

(۲) لیکن ناکامی نفس تبلیغ کی نفی کے مترادف نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک فریضہ ہے اور اس کے سلسلے میں حکومت رائے عامہ سے مجبور ہوسکتی ہے لیکن

ج - (۶) بنیادی حقوق کے آخری الفاظ میں آپنے دریردہ تبلیغ کی آزادی دے دی ہے اور میرے خیال سے وہ کافی ہے۔ میری رائے میں تبلیغ کی آزادی پر حدود و قیود قائم ہونے لازمی ہیں جو واقعات تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے میں روزانہ ملک میں ہونے آگے ہیں اُن میں زیادہ تر تعداد عورتوں اور ایک خاص ٹائپ کے افراد کی ہوتی ہے۔ مختلف المذاہب فرقوں میں نفسِ دین کی بنیاد پر تبدیلیٔ مذہب بہت کم دیکھی گئی ہے۔ بلکہ اِس کی بہت بڑی وجہ سیاسی و اقتصادی و حریفانہ جذبات ہیں۔

اگر کوئی اکثریت محض اِس لئے کسی معمولی اقلیت کو آزاد و بلند کردینا

سوالات

(۲) کابینہ کی ہیئت ترکیبی کا تعین۔

(۳) دفاعی محکمہ میں ملازمتوں کی ترتیب

(۴) صوبائی محکمۂ عدلیہ کی تشکیل اور ساخت

(۵) پبلک سروس کمیشن کی ہیئت ترکیبی

نمبر ۹۔ آپ کی رائے میں وفاقی اور اہم صوبہ جاتی تعلقات اور رسل و رسائل کے لئے سرکاری زبان کونسی ہوسکتی ہے؟ کیا آپ کے خیال میں زبان ہندوستانی نہیں ہے جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں عام طور پر سمجھی جاتی ہے؟

نمبر ۱۰۔ حسب ذیل مسائل کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

(۱) قرضداروں کو قرضہ کی مصیبت سے نجات دلانے کی صورتیں۔

(۲) سود اور ربوا پر پابندی کی صورتیں؟

نمبر ۱۱۔ کیا براہِ مہربانی آپ شراب خوری کے عام انسداد اور منشیات کے رواج کو بند کرنے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے؟ اور یہ کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہتر طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟

نمبر ۱۲۔ جن صوبوں میں زرعی شرح لگان بہت زیادہ ہے اور کسی نہ کسی صورت میں بیگار کا رواج اب تک قائم ہے ان کے انسداد کے لئے آپ کیا تجویز پیش فرماتے ہیں؟

نمبر ۱۳۔ کیا آپ کے علم میں مسلمانوں کے کچھ ایسے طبقے ہیں جو بعض معاشرتی حقوق سے محروم کئے جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان کو منصفانہ مساوات کی سطح پر لانے کے لئے آپ کیا تجاویز مناسب سمجھتے ہیں؟

نمبر ۱۴۔ اور آخر میں آپ کے خیال میں اور بھی جو تجاویز ایسی ہوں جنھیں آپ فرقہ وارانہ مسائل کے منصفانہ حل کے لئے ضروری سمجھتے ہوں، مہربانی فرماکر تحریر فرمائیں، نیز جو دوسرے متعلقہ مسائل آپ کے خیال میں ہوں، ان کے متعلق بھی اظہار خیال فرمائیں۔

جوابات

چاہتی ہے کہ خود کو اور بھی کثیر کرلے تو میں اس کو قومی لوٹ کھسوٹ کہونگا اور اگر کوئی اقلیت دینی تبلیغ پر محض اس لئے زور دیتی ہے کہ وہ دوسری اقلیتوں کو ملا کر ایک بڑی اکثریت میں تبدیل ہو جائے تو یہ اس جماعت کے سیاسی مقصد کی تکمیل ہوئی ——— خدمتِ دین سے اس کو کیا واسطہ!؟

ہر مذہب کی بہترین تبلیغ اس کے ماننے والوں کے اعمال و اخلاق ہیں۔ اس لئے جو فرقہ ملک میں تبلیغ کو ناگزیر خیال کرتے ہیں وہ خود دین واخلاق کا مجسمہ بنیں۔ کسی دین کے بنیادی معتقدات کے بعد اگر کوئی مرکز کشش ہے تو محض اس دین کے ماننے والے! اور ان کا اخلاق۔ مطلب یہ ہے کہ انفرادی طور پر تو ہر شہری کو اپنے اصول کی تبلیغ کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ لیکن منظم تبلیغی جماعتوں کو ممنوع قرار دیا جانا اقوامِ ہند کے لئے ضروری ولازمی ہے۔

(و) کامل اتفاق ہے۔

(ز) مجھے اس سے جزوی طور پر اتفاق ہے لیکن "کسی حالت میں بھی" کے فقرے سے آخر کیا مراد لی جائے!؟ فرض کیجئے کہ جاندار و موقوفہ یا جو ایشور دیوتاؤں کو دھرم ارتھ کی گئی ہو، مقصدِ وقف یا آسمانی دیوتاؤں کے بجائے خود ارضی دیوتاؤں پر صرف ہو رہی ہو اور متعلق فرقے کی اکثریت بھی اس کے خلاف ہو تو کیا قومی حکومت اس کا احتساب نہ کرے گی ——!؟

اگر دستور بالوجوہ حکومت کو یہ ذمہ داری تفویض نہیں کرنا چاہتا تو اسے ایسی دفعہ اس باب میں رکھنی چاہئے جو پیدا ہونے والے مسائل کا حل کرسکے اور جو متعلقہ فرقہ کی کسی کمیٹی کا فرض قرار دے دیا جائے۔

بنیادی حقوق کی شق نمبر ۴ میں اوقاف اور خیراتی اداروں پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔ ملک میں اکثر اوقاف اور خیراتی اداروں کی نہایت سقیم حالت ہے، اوقاف پر انفرادی جبریہ اقتدار جما ہوا ہے بعض بڑے اوقاف کی کمیٹیاں ہیں پھر بھی ان کے امور تدین اور فرض شناسی کے ساتھ سرانجام نہیں پاتے بعض جگہ یہ اوقاف اور ان کی آمدنی مقصدِ وقف کی ضرورتوں سے زیادہ ہے لیکن اس زیادہ روپیہ کا کوئی مفید استعمال نہیں ہوتا۔

اسی طرح خیراتی اداروں کا انتظام بھی عام طور پر ردّی پایا جاتا ہے اور وہ بھی افراد اور بعض جگہ جماعتوں کے جلبِ منفعت کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اِن حالات میں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اُن کا انتظام خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن یہ انصرام لازمی طور پر ہونا چاہئے کہ ضرورت کے مطابق آمدنی مقصدِ وقف پر صرف ہو اور باقی آمدنی فرقۂ متعلقہ کی کسی ذمّہ دار جماعت کے سپرد کردی جائے جو حکومت کے زیرِ نگرانی فرقۂ متعلقہ کی ترقی و فلاح کے لئے صرف کر سکے مثلاً تعلیم وغیرہ پر صرف کرنے کی مجاز ہو۔

(ح) یہ ممکن گارنٹی ہے جو دی جاسکتی ہے اور مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں۔

(ط) یہ ممکن گارنٹی ہے جو دی جاسکتی ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے

(ی) (۱) — یہ ممکن گارنٹی ہے جو مذہبی جماعتوں کے حقوق و مفاد کے سلسلے میں دی جاسکتی ہے اور بحیثیت مسلمان میں اس کو حقوق کی کامل آزادی کے مترادف یقین کرتا ہوں۔ مجھے اس سے کامل اتفاق ہے

(۲) مجھے اس سے کامل اتفاق ہے۔

(۳) مجھے اس سے اتفاق ہے

17

(۴) مساویانہ شہری حقوق اور اُن کی وسیع آزادی سے قومی دستور کی نہایت اور وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہونا چاہئے کہ ملک کا کوئی حصّہ کسی قوم کا خاص وطن نہیں ہوگا۔ بلکہ ہندو مسلم عیسائی سکھ پارسی، انگریز اور راجپوت تمام فرقے اپنی زندگی شہریوں کے مساوی حقوق کے ساتھ بسر کریں گے۔ یہ آزادی یقیناً ہندوستانیوں کے تصوّر و خیال کے عین مطابق ہوگی اور میں بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان اس سے کامل اتفاق کرتا ہوں۔

(ک) افراد اور افراد، جماعت اور جماعت کے درمیان کسی ترجیحی سلوک کی یقیناً کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

(ل) اتفاق ہے۔

نمبر ۶۔ (الف) میری رائے میں فیڈرل گورنمنٹ میں مسلمانوں کی ملازمتوں کا تناسب ۳۳ فی صدی ہونا چاہئے۔

تشریح۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فیڈرل گورنمنٹ کے ہر محکمہ میں اور ہر

جوابات

منصب پر مسلمانوں کا ۳۳ فی صدی تناسبِ ملازمت قائم رہے۔

(ب) صوبہ جاتی حکومتوں میں تناسبِ ملازمت کے سلسلے میں بنیادی اصول یہ ہونے چاہئیں کہ کوئی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہونے پائے۔ اقلیتوں کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک سمجھوتہ کے ذریعہ اقلیتوں کو مناسب اور معقول (Weightage) پاسنگ دیا جانا ضروری ہے۔

نمبر ۷۔ جملہ انتخابی اداروں میں فی الحال بلاواسطہ مخلوط طریقۂ انتخاب رائج کیا جائے، جس میں مسلمانوں کی نشستیں محفوظ ہوں، اور اگر دوسری اقلیتیں اپنی نشستیں محفوظ کرانا چاہیں تو مخلوط انتخاب کے ساتھ ان کی نشستیں بھی محفوظ کردی جائیں۔

نمبر ۸۔ اگر جغرافیائی، لسانی یا دیگر ضروری یکسانیتوں کی بنا پر صوبوں کے حدود میں تغیر و تبدل کی ضرورت پڑے تو یقیناً تغیر و تبدل کی گنجائش ہونی چاہیے۔

(۱) کسی صوبائی یا مرکزی حکومت کی وزارت ایسی نہیں ہونی چاہیے جس میں مسلمان وزیر نہ ہو۔

(۲) مرکزی کابینہ میں مسلمان وزراء کی تعداد کا تناسب ۴۰ فیصدی ہونا چاہیے۔

مخلوط انتخاب کے نفاذ کے بعد مجالسِ قانون ساز میں فرقہ دارانہ بنیادوں پر پارٹیاں بننے کا بہت کم امکان باقی رہے گا اور پارٹیوں کی تشکیل سیاسی نظریات پر مبنی ہوگی۔ ایسی حالت میں جمہوری اصول کو مدِنظر رکھ کر خالص سیاسی اکثریت کی پارٹی کابینہ کا تعین کریگی اور اس کی ہیئت ترکیبی میں مسلمان وزراء کا معقول تناسب ہونا ضروری ہوگا وزارت کی ذمہ داری مشترک ہوگی۔

(۳) ایک عارضی دفاعی محکمہ کی بنیاد قومی اصول پر ہونی چاہیے۔ تاہم اس وقت تک کے لئے جب تک قومیت کا صحیح احساس ہندوستانیوں میں پیدا نہ ہو جائے۔ ایسی ترتیب قائم کرنی پڑے گی جس میں مسلمانوں کا تناسب فوج اور اس کے تمام متعلقہ محکموں اور مختلف مناصب پر کم از کم ۴۰ فی صدی ہو۔

(۴) عدالت محکمۂ تنفیذی (Executive) سے بالکل علیحدہ ہوگی۔ اس کی بنیاد قطعی قومی نہ ہوگی نہ کہ فرقہ دارانہ، تاہم مسلمانوں کے

سوالات

جوابات

حقوق کے تحفظ کی خاطر جو تناسب عام ملازمتوں کے سلسلے میں ہوگا اسی کا لحاظ محکمۂ عدلیہ کی ملازمتوں میں بھی رکھا جائے۔
پبلک سروس کمیشن میں ملازمتوں کا تناسب دیگر صوبائی ملازمتوں کی طرح ہونا چاہیئے۔ مرکز اور تمام صوبوں [illegible] علیحدہ پبلک سروس کمیشن ہونے ضروری ہیں۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا تقرر صدر جمہوریۂ ہند کرے گا اور اسی طرح صوبائی سروس کمیشن کا تقرر صوبائی صدر جمہوریہ کریں گے۔

نمبر ۹۔ ہندوستانی زبان
بے شک یہ ہندوستانی زبان ہے۔

نمبر ۱۰۔ کسی صورت میں زرِ اصل کا ڈیڑھ گنا ادا کر دینے کے بعد مقروض کے خلاف کوئی ڈگری نہیں ہونی چاہیئے۔ سو روپیہ اور اس سے کم کی آمدنی رکھنے والے مقروضین سے ۵ فی صدی سے زیادہ قرض بذریعۂ اقساط وصول نہ کیا جائے۔
حکومت کی کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ ایسی صورتِ حال پیدا کر سکے جس میں سوائے مین دین کے کوئی گنجائش باقی نہ رہ سکے۔
(۱) اس لئے مندرجۂ بالا تجاویز محض وقتی اور عارضی ہونی چاہیئیں ورنہ دراصل سود، جمہوریۂ ہندوستان میں قطعاً ممنوع ہونا ضروری ہے۔ قرض دینے اور قرض وصول کرنے کا کام بالآخر خود حکومت کو کرنا ہوگا
(۲) ۱۱ میں جو اصول پیش کیا گیا ہے اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوگا۔

نمبر ۱۱۔ کسی پچھلی دفعہ میں اکل و شرب کے متعلق پابندیاں عائد کرنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، یہ ایک عام اصول ہے تاہم اقتصادی اور حفظانِ صحت کے نقطۂ نگاہ سے بعض مروجۃ الوقت اشیاء ایسی ہیں کہ جن پر پابندیاں عائد کرنی ہوں گی وہ مسکرات جو طبی نقطۂ نگاہ سے قوم کی خرابیٔ صحت کا باعث ہیں وہ قانوناً ممنوع ہونی چاہیئیں۔
اس کے علاوہ قانون کی دخل اندازی زیادتی ہوگی، یہ کام مذہبی مصلحین پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

نمبر ۱۲۔ کسی صورت میں بھی کاشتکاروں یا چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو ایسے محاصل ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جو ان کی پیداوار میں سے اتنا حصہ چھین لیں

سوالات

جوابات

کہ جس کے بعد کاشتکار یا زمیندار آرام کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکیں،
اس بنیاد پر حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ایسا قانون بنائے جس کی رو سے
بے کار کرنے والا اپنی پیداوار سے پورا پورا نفع حاصل کر سکے اور اس کو بھاری
بھاری محاصل ادا نہ کرنے پڑیں۔

(۲) کسی کاشتکار یا زمیندار یا کسی بھی فرد یا جماعت یا گورنمنٹ کو یہ
حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ زراعتی مزدوروں یا کسی قسم کے بھی مزدوروں
سے کوئی بیگار لے سکیں، اس سلسلے میں صاف اور واضح قانون حکومت
کی طرف سے بنایا جائے اور اس میں زراعتی مزدوروں کی اجرتیں واضح
کر دی جائیں، خلاف ورزی کی صورت میں سخت تعزیرات قانون میں رکھی
جائیں، بیگار، از روئے قانون مطلق ممنوع ہونی چاہیئے۔

نمبر ۱۳ بے شک ——— مثلاً حجام، ندّاف، نجار اور نور باف وغیرہ ——!
ہندوستان کی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ طرز معاشرت نے ماحول
سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں بھی اپنے مذہب کے خلاف یہ طبقے پیدا کر دیئے ہیں،
جن کو ایسے مواقع میسر نہیں کہ وہ زندگی کے کل شعبوں میں برابر کے حصہ دار
بن سکیں۔ یہ طبقاتی تقسیم آزاد جمہوری ہندوستان میں ختم ہونی چاہیئے،
موجودہ حالات میں مسلمانوں کے ان پسماندہ طبقوں کو تعلیم اور دوسرے
ضروری شعبوں میں ترقی کرنے کے لئے خاص حقوق دیئے جائیں تاکہ سوسائٹی
کی بلند ترین سطح تک پہنچ سکیں اور حکومت کے نظم و نسق میں برابر کے
شریک ہوں۔

(اس جگہ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ دوسرے فرقوں کے طبقات پر بھی یہی
اصول لازماً نافذ ہونا چاہیئے)

نمبر ۱۴ ۔ فرقہ دارانہ مسائل کے حل کے لئے مخلوط انتخاب ایک بنیادی شے ہے
جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

(۱) لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ قومی نقطۂ نظر کی نشو و نما اور مشترک سیاسی
و اقتصادی مسائل کے تیقن کے لئے جب تک ذہنی تعلیم و تربیت نہ ہوگی
اُس وقت تک قومی رجحان مستحکم بنیادوں پر پیدا نہیں کیا جا سکتا اس لئے
نہایت ضروری ہے کہ قومی پروپگنڈا ڈیپارٹمنٹ کو زیادہ وسیع اور مضبوط
کیا جائے۔
ایک وسیع التخیل اور وسیع العمل پبلسٹی ڈپارٹمنٹ مستقل حیثیت میں کھولا جائے

جوابات

جس میں محنتی، مخلص، ماہر قومی نقطۂ نگاہ رکھنے والے افراد کی خدمات حاصل کی جائیں اور انھیں معقول مشاہرہ دیا جائے تاکہ وہ ضروریات زندگی کی طرف سے یکسو ہو کر اس نہایت اہم کام کو بہ احسن الوجوہ انجام دے سکیں۔

(۲) پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں ہر زبان کے ماہر ہونے لازمی ہیں۔

نمبر ۱۷۔ دوسرے متعلقہ مسائل کے سلسلے میں ایک امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ حکومت کی تشکیل، بلا شبہ جمہوری ہونی چاہئے، لیکن یہ جمہوریت، سرمایہ دارانہ جمہوریت نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ تمام فرقہ دارانہ اور طبقاتی مسائل کی جڑ طبقاتی نا انصافی ہے۔ جو اقتصادی ناانصافی پر مبنی ہے، کوئی جمہوری حکومت جو عامۃ الناس (مزدور و کسان) کو چند اصلاحی قوانین پاس کر کے مطمئن کرنا چاہتی ہے وہ عوام کے مرض کا مستقل علاج نہیں کر سکتی۔ محض مزدوروں کی اجرتیں اور بیکاروں کے لئے دستور ساسی کے بنیادی حقوق متعین کرنا، اقتصادی ناانصافی کا علاج نہیں ہے۔ اس لئے کہ بہت سی جمہوریتیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں جو سرمایہ دارانہ اصولوں پر چلائی جا رہی ہیں اور مزدور کو محض پہلی حالت کے مقابلے میں ذرا اچھی حالت تک پہونچا کر یا اس کی بہتر حالت کا احساس کرا کے بڑی عیاری کے ساتھ لوٹ کھسوٹ کی جا رہی ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ حکومت کی تشکیل اس طرح کی جائے کہ سرمایہ دارانہ مفاد کو محفوظ رکھنے اور اس کو ترقی دینے میں مدد کرنا حکومت کے لئے ناممکن ہو جائے۔

۲۱

مجملاً یہ کہ حکومت عوام کے مفاد کی خاطر ہونی چاہیے۔
اور اس میں کوئی چور دروازہ نہیں ہونا چاہئے۔

ساغر نظامی

حالی مُسدّس کے آئینہ میں

ادب اور انسانی زندگی کا تعلق نہایت گہرا اور اہم ہے! اتنا اہم کہ بغیر انسانی زندگی کا مطالعہ کئے ہوئے کسی خاص عہد کے ادب کو سمجھ لینا اور اُس پر عبور حاصل کر لینا قریب قریب ناممکن ہے۔ ادب پر زندگی کے ہر رُخ کا اثر پڑتا ہے۔ ادب زندگی کی تمام تر پوشیدہ و ظاہر تفصیلات کو کسی نہ کسی طرح منعکس کر ہی دیتا ہے۔ ادب اس لحاظ سے ایک آئینہ ہے جس میں کسی نہ کسی زاویہ سے زندگی کا ہر رُخ دکھائی پڑتا ہے۔ یہی عکس عموماً قوم کی ذہنیت کا ہوتا ہے۔ جب کسی قوم میں جو ایک عرصہ تک محکوم و غلام رہ چکی ہو آزادی کے جذبات رونما ہوتے ہیں تو سب سے پہلے اس کی جھلک ادب ہی میں نظر آتی ہے اور عملی قوتیں انہی جذبات کے ذریعہ سے بیدار ہوتی اور اُبھرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح مگر اس کے برخلاف جب کسی فاتح حکمران قوم کی عظمت کا ستارہ پستی کی طرف مائل ہوتا ہے اور وہ اپنی شوکت و عظمت کھونے لگتی ہے تو تنزل کے آثار سب سے پہلے ادب ہی میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ ذہنیتوں کی پستی سب سے پہلے ادب اور وہ بھی خصوصاً شاعری میں جھلکنے لگتی ہے اور اس کے بعد تمام قوم پر تباہی اور ادبار کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔

شاعری اس حیثیت سے ایک "آلۂ موسم نما" ہے کہ جس میں قومی ادبار کے طوفان کا اثر سب سے پہلے دکھائی پڑنے لگتا ہے۔ انحطاط کا سیلاب اس کے بعد آتا ہے اور قوم کی خودداری و آزادی اس کی رَو میں خس و خاشاک کی مانند بہ جاتی ہے۔

تاریخ ادب شاہد ہے کہ جب اُردو شاعری نے دکن اور گجرات میں ہوش سنبھالا اس وقت وہ اسلامی تمدن جس کی ابتدا ہندوستان میں محمود غزنوی کے حملوں سے ہوئی تھی اور جس کو مغلوں نے فروغ دے کر اس درجہ تک پہونچا دیا تھا کہ آج بھی اس کی داستان دلِ گیتی پر نشتر کا کام کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ مٹ رہا تھا۔ انحطاط کے ان آثار میں قوم اور افراد کی ذہنیت پستی پذیر ہو چکی تھی۔ ادبار نحوست اور زوال کی کالی گھٹاؤں نے ملک میں اندھیرا کر رکھا تھا۔ معاشرت کی جڑ کھوکھلی ہو چکی تھی۔

اس زوال و ادبار کی نمایاں تصویر جعفر زٹلی کا کلام ہے جو اس کا شاہد ہے کہ لوگ بے حیائی، نمائش اور گندگی کو اُچھال اُچھال کر دکھاتے اور داد پاتے تھے۔ مرثیہ گوئی خواہ بیجاپور کی ہو خواہ اودھ کی، اسی انحطاط کا سبب معلوم ہوتی ہے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ زوال آمادہ قوم میں ذہنیتیں اور طبیعتیں غم و الم کی طرف زیادہ مائل تھیں۔ دکن میں مرثیہ گوئی کو اس وقت فروغ ہوا جب کوئی سرپرست سلطنت تباہ ہوئی۔

اُردو شاعری مرثیے کے لئے براہِ راست عربی شاعری کی مرہونِ منت ہو یعنی اُردو میں مرثیے کی ابتداء عربی شاعری کے اثر سے ہوئی۔ مرثیے سے آجکل عوام یہ مطلب لیتے ہیں کہ جو اشعار خواہ وہ مثنوی کی شکل میں ہوں خواہ مسدس کی شکل میں خواہ کسی اور شکل میں، شہداء کربلا کے دل ہلا دینے والے واقعات اور خون رُلانے والے حالات پر لکھے جائیں، مرثیہ کہلاتے ہیں، حالانکہ ایسا سمجھنا غلط ہے اِس سے اُردو شاعری میں "مرثیے" کا دائرہ تنگ ہو کر رہ گیا ہے۔ اصلاً مرثیہ بالکل وہی چیز ہے جو انگریزی میں (elegy) کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اس لئے مرثیہ کی صحیح مگر مجمل تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اشعار جس میں کسی قلبی رنج و غم کا اظہار ہو مرثیہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ خواہ اس قلبی رنج و غم کی وجہ کسی عزیز کی موت ہو خواہ کسی قبرستان یا کسی ایسے ہی دردناک منظر کو دیکھ کر دل میں رنج و غم کے جذبات پیدا ہو جائیں خواہ وہ کسی فرقہ کی بداعمالیوں اور بدچلنیوں کو دیکھ کر دل میں یہ جذبات عود کر آئیں۔ یہ جذبات ایک قوم کے زوال پر بھی دل میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک جذبۂ قومی سے لبریز دل ان حالاتِ قومی کو دیکھ کر کہ جن سے اس کی وہ محبوب قوم جسے "اپنی قوم" کے نام سے موسوم کرتا ہے جس کا وہ خود ایک رُکن ہے، عروج سے زوال کی طرف جا رہی ہے، پیدا ہو سکتے ہیں۔ انہی جذبات کو لباسِ شعر میں پیش کرنا مرثیہ کہلاتا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ایسے اشعار میں صرف واقعہ نگاری ہی نہیں کرتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا شاعر خود بھی اس رنج و غم میں ماتم کناں ہے اور جذبات کا اظہار اس کی دلی تکلیف کا شاہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ موثر مرثیہ یا نوحے وہی ہوتے ہیں جن کا تعلق خود اس شاعر کے عزیز و قریب سے

ہوتا ہے۔ قدما اور متوسطین کے ادوار میں مرثیہ صرف واقعات کربلا کے بیان تک محدود ہو کر رہ گئے، اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت کم لوگ اچھے اچھے مرثیوں کو تنقید کہنے کے لئے تیار ہوں گے۔ کوئی ہرج نہ تھا اگر انیس اور اُن کے دیگر معاصرین و متقدّمین بھی اس مرثیئے سے وہ کام لے سکتے جبکہ واقعی ایک مرثیہ کا ہونا چاہئے۔ مگر ان کا تو خیال اور عقیدہ ہی کچھ اور تھا۔ آج ہم میر انیس کے معتقد ہونے کی حیثیت سے اُن کے مراثی کو خواہ کچھ ہی رنگ کیوں نہ دے لیں مگر ذرا انصاف شرط ہے۔ کیا ایسے مرثیئے سے مسلمانوں کو کوئی فیض پہونچ سکتا ہے؟ کیا وہ اس سے کوئی قابل عمل سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ آج ہم دل میں یہ کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں کہ مرثیہ اخلاقیات و شاعرانہ جذبات کے بہترین مرقعے پیش کرتا ہے۔ مگر کیا کوئی بھی ایسا ہے جو اس نصب العین کو سامنے رکھ کر اس پر عمل پیرا ہو سکے۔ خود میر انیس ہی سے پوچھ لیجئے کہ وہ اپنے مراثی سے کیا سبق دیتے تھے۔ اُن کا مطلب صرف یہ تھا کہ مرثیہ پڑھ کر لوگ رونے لگیں اور اسی کو وہ اپنے کلام کی معراج خیال کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ذکرِ حسینؑ پر رونے دھونے سے دلوں کو چین آجاتا ہے۔ اگر صرف آنسو بہانے سے دل کو چین آگیا تو اصلاحی و تعمیری شان کہاں رہی اور پھر رونے سے کیا اثر ہوا اور پھر اگر اثر ہو بھی تو کیوں؟ جب کہ رونا ہی فرضِ عین ہو تب پڑھنے والوں میں قوتِ عمل پیدا بھی کیونکر ہو سکتی ہے۔ میر انیس نے صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ میرے مرثیے کا مقصد صرف رونا رُلانا ہے اور صرف رونے سے دل کی لگی بجھ سکتی ہے [1]

جس جا ذکرِ حسین ہو جاتا ہے — رونے سے دلوں کو چین ہو جاتا ہے
آکر بزمِ عزائے شہ میں رونا — ہر شخص پہ فرض عین ہو جاتا ہے

اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ انیس کے کلام میں درد و اثر نہیں ہے یہ سب کچھ ہے مگر ہندستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے والی چیز اس میں نہیں، خیر اس وقت تو زیرِ بحث مسدس حالی ہے۔ یہاں تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ نظم بھی جس میں کسی قوم کے عروج و زوال کی داستان پُراثر طریقے پر بیان کی جائے۔ اور زوال کا نوحہ کیا جائے۔ مرثیہ ہے اس حیثیت سے اگر ہم مسدس کے جزر مد اسلام پر نگاہ ڈالیں تو ہم بلا کسی خاص اعتراض کے ماننے کو تیار ہو جائیں گے کہ مسدس ایک مرثیہ ہے۔

مسدس سے امانت نے واسوخت کا کام لیا پھر سودا نے اس صنفِ سخن میں اہلبیت کے مرثیے لکھنا شروع کئے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے تو گویا اس صنفِ سخن کو بالکل اسی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ حالی سب سے پہلے اردو شاعر ہیں، جنھوں نے مسدس کو قومی مرثیوں کا ذریعہ بنایا اور اپنا دردِ دل قوم کو سُنایا۔ اس حقیقت سے بھی حالی کے مسدس میں تعمیری شان پائی جاتی ہے کہ شاعری کی ایک خاص صنف جو کہ صرف ایک چیز یعنی مرثیۂ اہلبیت کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی اور اس طرح اس کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا تھا اسے سیاسی اعتبار سے ایک زیادہ مفید کام کے لئے منتخب کر لیا اور اس طرح اردو شاعری میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔

اب ہم براہِ راست اُن خدمات کا ذکر کرتے ہیں جو حالی نے مسدس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی کیں: "مسدس" شہرت سے بے نیاز، نہ کسی تعریف کا محتاج ہے نہ تعارف کا نہ کسی نئی مدح و توصیف کا، نہ کسی جدید نقد و تبصرہ کا ایک داستانِ درد شروع سے آخر تک ہے۔ شاعر مسلمان ہے اور اس حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستانِ غم بیان کر رہا ہے۔ یہ نظم شروع سے آخر تک سراسر اخلاص اور یکسر درد سے بھری ہوئی ہے لفظ لفظ سے دل پر چوٹ لگتی ہے۔

مولانا حالی نے قوم کی تباہی ذلت اور رسوائی کے نظارے دیکھے، قوم کا ماضی اُن کی بار یک بیں نگاہوں کے سامنے تھا۔ دل بھر آیا۔ قوم کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے اور غفلت کی نیند سونے والوں کو بیدار کرنے کے لئے مسدس کی بنا ڈالی اور قوم کی آنکھوں کے آگے اسلام کے زوال کی داستانِ غم کھول کر رکھ دی

کوئی قرطبا کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے — خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

کونسا دل ہے جو ان اشعار پر گداز نہ ہو جائے۔ کون شخص ہے جسے اپنی موجودہ حالت پر ان حالات کا تخیّل کر کے شرم نہ آئے۔ اُردو شاعری کی شاہراہ میں مسدس کی حیثیت ایک بلند مینار جیسی ہے جو اس راستہ پر چلنے والوں کو ایک پُرفضا میدان دکھا رہا ہے۔ جہاں دلبستگی اور شگفتگی طبیعت کے سامان راہرو کو متوجہ کرنے کے لئے

[1] مرثیہ یا قدیم شاعری کی کسی صنف کو "ادب برائے زندگی" کے نظریّہ کی روشنی میں دیکھنا غلطی ہے۔ یہ نظریّہ ہمارے زمانے کی پیداوار ہے اور ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے عہد کی شاعری کو اس نظریہ کی کسوٹی پر کسیں۔ انیس کے مراثی فن اور جذبات آفرینی کے لحاظ سے اعلیٰ ترین شاعری کے نمونے ہیں۔ ساغر

بکثرت موجود ہیں، مولانا حالی نے اپنے مخصوص انداز میں قوم کی ترقی، قوم کے اسلاف کی شان و شوکت، دبدبہ، وصولت کا مرقع پیش نظر کیا ہے۔ پھر دوسری قوموں کے تنزل کا بیان کرکے اُن کے دل کو گداز کیا ہے اور پھر اس پر اپنی قوم کے زوال کی داستان دل پر نشتر کا کام کر رہی ہے۔ ناکارہ غفلت شعار مسلمانوں کو ایک دلگداز مگر ساتھ ہی ساتھ دل افروز انداز میں بتایا ہے کہ ان کے بزرگ کون تھے۔ کیا تھے؟ اُنھوں نے دنیا میں کیا کیا کیا؟ ایک عالم اُن کے علم و ہنر کا ممنون اور ایک دنیا اُن کی تہذیب کی مرہون ہے۔ اُن کی شان و شوکت، اُن کی سطوت و جبروت، اُن کی عدالت و شجاعت تاریخ میں زرّیں الفاظ میں لکھی گئی ہے۔

اندھیرا تو ادنیٰ پر چھا رہا تھا ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا
ولایت کے سورج پہ ابر آ رہا تھا شہادت کا میدان دھندلا رہا تھا

سر رہ چراغ اک عرب نے جلایا
ہر اک قافلے کا نشاں جس سے پایا

وہ بتلاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف شعر و ادب میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے

ادب میں پڑی جان اُن کی زباں سے جلا دین نے پائی اُن کے بیاں سے
بتاں کے لئے کام اُنھوں نے لساں سے زبانوں کے کوچے تھے جھکر نساں سے

ہوئے اُن کے شعروں سے اخلاق صیقل
پڑی اُن کے خطبوں سے دنیا میں ہل چل

اِن دل افروز واقعات کے بیان کرنے کے بعد وہ ہمیں تبلاتے ہیں کہ ہم اب کیا ہیں۔ مگر ہماری موجودہ حالت کا خاکہ صرف ہمیں عبرت دلانے کے لئے صرف ہماری رگِ حمیت کو جوش میں لانے کے لئے کھینچا ہے۔ یہاں کہیں وہ ہماری بد مذاقی، ہمارے افلاس، ہماری نکبت اور ہماری بداطواریوں کا ذکر کرتے ہیں اور کہیں ہماری حرماں نصیبی اور شقاوت و غفلت سے گہرا رنگ بھرتے ہیں ایک ذرا علم و ادب ہی میں دیکھ لو کہ ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے۔

خلف اُن کے ہاں جو کہ جادو بیاں ہیں فصاحت میں مقبولِ پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہور ہندوستاں ہیں وہ کچھ ہیں ------ لیکن یہاں ہیں

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ اُن کے اشعار محفل میں گائیں

حالی کا خیال ہے کہ ایک شخص اگر بلندی سے دنیا کو دیکھے تو اس میں شک نہیں کہ وہ بہت سی قوموں کو تباہ و پریشان دیکھے گا۔ بہت سے ملکوں کو ویران دیکھے گا۔

مگر اسے ایک باغ سب سے علیحدہ نظر آئے گا جس کی حالت یہ ہوگی۔

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں جہاں آ کے دیتا ہے رو ابر نیساں
تر و تازہ ہے جو اور ہوتا ہے ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

حالی کا مقصد اور مدعا یہی تھا کہ مسلمان یہ سب کچھ دیکھے سمجھے اور غیرت و حمیت سے کام لے اور اپنی بگڑی حالت کو کسی طرح سنبھالے۔ حالی نے قوم کی ذلت اور اُس کے ادبار کی گہرائیوں میں یاس و حرماں کی تاریکیاں دیکھی ہیں اور اس ظلمت کدے کے ڈراونے اور تباہ کن اثرات سے قوم کو بچانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

یہ جو کچھ ہوا ایک شمّہ ہے اس کا کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانے نے اونچے سے جس کو گرایا وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

حالی ہمیں تبلاتے ہیں کہ ہمارے مذہب کو، ہمارے تمدن کو، ہمارے دبدبہ شان و شوکت کو جو نقصان پہونچا وہ ہندوستان میں آکر پہونچا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ہی اس کے ذمّہ دار ہیں۔

وہ دینِ حجازی کا بے باک بیڑا نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہونچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا نہ عماں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا

کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر [1]

[1] اس کے ساتھ ہی آپ کو اقبال کا یہ شعر نہیں بھولنا چاہئے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ذمہ داری فاضل مقالہ نگار عائد فرماتے ہیں وہی اندلس کے مسلمانوں پر بھی عائد ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ قومیں بدویّت اور تازگی کی گود میں آنکھ کھولتی اور بڑھتی ہیں اور تہذیب تمدّن کے ارتقا کی آغوش میں دم توڑ دیتی ہیں، جو بھی اسباب ہوئے ہوں لیکن مسلمانوں کی تباہی کا آغاز تو اُسی وقت سے شروع ہوگیا تھا جب روح اسلام کے خلاف جناب معاویہ نے خلافت کے اصول انتخاب کے خلاف یزید کو ولی عہد مقرر کیا۔ جب اسلامی جمہوریت کی بنیاد ہل گئی اور شہنشاہیت کو مسلمانوں نے اختیار کر لیا، تباہ ہو گئے۔

ساغر

ایشیا دسمبر ۱۹۴۲ء

حالی نے کوئی اصلاحی پہلو چھوڑا نہیں ہے جس پر روشنی نہ ڈالی ہو۔ اُنھوں نے اس میں شکایتاً کہ قوم کے متوسط طبقے سے خطاب کیا ہے جس کی وجہ اُنھوں نے خود ہی بتا دی ہے وہ جانتے تھے اور بجا جانتے تھے کہ اگر ہماری قوم سُدھرے گی تو متوسط طبقے کے ہاتھوں سے اور تباہ ہوئی ہے تو متوسط طبقہ بڑی حد تک اس کا ذمہ دار ہے۔ شریف آدمیوں کے بچے اور لڑکے جس طرح تباہ ہوئے ہیں ذرا وہ بھی سُن لیجئے۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے　　تباہ ان کی حالت بُری اُنکی گت ہے
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لَت ہے　　کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے

چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی

اس میں شک نہیں کہ حالی نے مشکل ترین صنفِ سخن مشکل ترین مقاصد کے حل کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ مگر یہ صرف حالی کے "خلوص" کا نتیجہ ہے کہ تائید غیبی سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ مسدس ہماری شاعری میں ایسی چیز ہے کہ جس کا نباہنا آسان کام نہیں۔ باوجود کوشش و کاوش کے ایک آدھ شعر بھرتی کا آ ہی جاتا ہے، اور اگر بھرتی کا مصرع نہ داخل کیا جائے تو مسدس کی چُول نہیں بیٹھتی۔ خود میر انیس کے ہاں دیکھ لیجئے۔ مرثیہ اگرچہ اُن کی موروثی ملکیت ہو گیا تھا مگر پھر بھی جگہ جگہ بھرتی کے اشعار سے چُول بٹھا کر سلسلہ کو قائم رکھا ہے[1]۔ مگر حالی کا مسدس بلا شبہ اس عیب سے یکسر پاک ہے کہیں بھی ایک شعر یا ایک مصرع بھرتی کا موجود نہیں، سب مصرعے ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ایک جان اور ایک قالب معلوم ہوتے ہیں۔ مسدس کے اعلیٰ مقاصد دھیان میں رکھ کر ہمیں شعر کی اس تعریف پر پورا پورا یقین آ جاتا ہے کہ اسے حقیقت اور زندگی سے وابستہ ہونا چاہئے۔ مسدس ایک ایسی نظم ہے جس میں ہماری قوم کے خط و خال صاف صاف نظر آتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا ایک کامیاب مرقع ہے جسنِ بیان نے اس کی شہرت اور اثر میں کافی اضافہ کیا ہے۔ جہاں اس میں اخوت، ایثار، ہمدردی، وفا، محبت، الفت، شجاعت، ہمت، عالی حوصلگی، فراخ دلی، سخاوت، قربانی، بہادری، رحم، انصاف اور بے تعصبی

---

[1] انیس تو انیس دبیر کے لئے بھی آپ ایسا نہیں فرما سکتے۔ میر انیس فادر الکلامی اور آرٹ کے لحاظ سے دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں میں سے ایک منفرد شاعر ہیں، یہ ایک نہایت ہی دلیرانہ اتہام ہے کہ انیس بھرتی کے شعار سے سلسلے کی چُول بٹھاتے ہیں اُن کے کلام میں ثبات اور ترقی تاثیر اور سادگی کے ساتھ ہی ایک "آہنگ" ہے جو دوسرے شعرا میں کم پائی جاتی ہے۔ — مدیر

کے سبق دیئے گئے ہیں وہاں ہماری قوم کے ادبار، ہوس، لالچ، ریاکاری، مکاری، دغا، فریب، حق تلفی وغیرہ کے تیز نشتر بھی پوشیدہ ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں اور جن کی تیز نوکیں رگِ جاں کو چھیڑتی ہیں۔ مگر ان نشتروں میں بھی ایک مصلحانہ شان ہے، اور یہ وہی تاثیر رکھتے ہیں جو کہ ایک کامل جرّاح کے نشتر، جو زخم کے اندرونی حالات تک سے واقف ہوتا ہے۔ ہم مولوی عبدالحق صاحب کے قول سے بالکل اتفاق کرتے ہیں کہ "یہ تیز نشتر غمگسار سرجن کے ہیں نہ کہ بے درد بد اندیش کے"

مسدس کے زندۂ جاوید ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ بھلا جو نظم ایسے جواہرات سے مالا مال ہو جن کی چمک دمک میں کبھی کمی نہ آسکے بلکہ جس میں اضافہ ہی ہو اُس کی مقبولیت کا کیا کہنا ہے وہ تو ہر زمانہ ہر عہد میں ایسی ہی تازہ رہے گی۔ گویا خضر نے اسے آبِ حیات سے سینچا ہے۔ قومی لیڈروں کے لئے اس میں رہنمائی کے گُر ہیں۔ اور ادب کے چاہنے والے ہمیشہ اس میں ادب کی چاشنی اور تازگی پائیں گے مسلمان قوم اس وقت تک اسے پڑھ کر آنسو بہاتی رہے گی جب تک کہ وہ اپنی تباہی سے نہ نکل جائے گی۔

ڈاکٹر راس مسعود کا قول ہے "میرا عقیدہ ہے کہ اگر مولانا حالی مرحوم بیش بہا ادبی خدمت اُردو کی نہ کرتے جو اُنھوں نے کی تو جہاں تک ہماری شاعری کا تعلق ہے وہ ختم ہو جاتی اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہوتی جس کو پیش کر کے ہم یورپ کی شاعری کا مقابلہ کرتے۔ مسدس میں چند بند ایسے ہیں جن سے بہتر یورپ کی کسی قوم کے ادب میں آج تک کوئی چیز نہیں لکھی گئی۔ میرا اشارہ اُس حصہ کی طرف ہے جہاں بغداد کے عروج کو بیان کر کے اُس کا زوال دکھلایا گیا ہے۔ جب تک اس دنیا میں ہماری مادری زبان رائج ہے۔ الطاف حسین حالی کا نام نہیں مٹ سکتا اور نہ اس اثر میں کمی واقع ہو سکتی ہے جو اُن کے ذریعہ سے ہمارے ادب پر پڑا ہے۔ مولانا مرحوم کی نثر بھی لاجواب ہے اور نظم میں بھی وہ سادگی پائی جاتی ہے جو ہمیشہ سچے جذبات کی بہترین نشانی ہے"

مسدس کی یہ مقبولیت کہ اس کے بہت سے بند لوں پر نقش ہو گئے ہیں اور زبانوں پر چڑھ گئے ہیں لوگ انھیں پڑھ کر سر دھنتے ہیں کچھ تو اس وجہ سے کہ مسلمانوں کو اندلس کے مسلمانوں کے عروج و زوال سے واقفیت تو انھیں بندوں کے ذریعے ہوئی اور وہ بھی ایسی داستان غم سے، اس جادو اثر کلام کی بدولت واقف ہوئے اور کچھ اس میں حالی کا اخلاص بھی پوشیدہ ہے۔ آمدہ۔ ایک بڑے ادیب کا قول ہے کہ ادب اور شاعری میں اخلاص و صداقت کا رنگ ادیب یا شاعر ... سے پیدا ہوتا ہے یہ حالی کی بہترین

ہے کہ مسدس اس قدر مقبول ہو۔

مسدس میں صرف یہی نہیں ہے کہ قوم کے زوال کی داستان پُر درد طریقے میں بیان کر دی ہو بلکہ اس میں وہ طریقے بھی بتائے گئے ہیں جن سے یہ زوال آمادہ قوم پھر راہِ ترقی پر گامزن ہو سکتی ہے۔ اس قوم کا ستارہ پھر چمک سکتا ہے اس کی دلچسپی کی مثال ایسی ہے کہ جب کسی شخص کا کوئی قریبی عزیز مر جاتا ہو اور وہ مکان پر واپس آ کر اس کی بیماری، اُس کی موت کا کل قصہ سُنتا ہے تو اس قصے سے اسے تسکین ہوتی ہے۔ یہی حالت مسدس کی بھی ہے کہ اس میں قوم کی کیفیات درج ہیں جو ابھی حال ہی میں "مری" ہے۔ حالی نے مسدس میں جن ناخوشگوار واقعات کا ذکر کیا ہے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کو اپنی قوم کی موت پر نہیں بلکہ اُس کی زندگی پر سخت حیرت ہے۔

اقبال نے اسلام پر نوحہ کرنے والوں پر حالی کا نام نہیں لیا وہ کہتے ہیں

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر ۔۔۔ داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی ۔۔۔ ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

خود اُنھوں نے اپنے آپ کو مسلی کا محرمِ غم کیا ہے اور اس کے زوال پہ آنسو بہائے ہیں۔ مگر ہم حالی کو اس موقع پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی نے شیراز کی تباہی پر نوحہ کیا اور اندلس کی بربادی پر ابن بدرون نے اپنا دل دوز نوحہ سُنا کر مردہ قوم کے تازہ زخموں پر نمک پاشی کی۔ کیا ہم حالی کو اس موقع پر بھول جائیں۔ حالی نے ان سب سے بلند کام کیا۔ اُنھوں نے صرف اپنے ملک کی بربادی پر ہی ماتم نہیں کیا۔ بلکہ سارے اسلامی ممالک کے زوال پر روتے روتے ہوئے خون بہا دی۔ عرب، ہند، اندلس، شام و دیلم غرض ہر جگہ کی تصویر حالی نے مسدس کے پردۂ سیمیں پر پیش کر کے قوم کے دل کو گداز کر دیا۔ اس تصویر میں اُنھوں نے بغداد کا حریم خلافت اندلس کا بیت الحمرہ غرناطہ کی شوکت بلنیہ کی اشبیلیہ کے محراب و در اور قرطبہ کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر منجار اور کوفہ کے میدان سمرقند و مراغہ اور رفافیلون کے رصد خانے سب کے بعد دیگرے دکھائے اور دیکھنے والے پر عجب کیفیت طاری کر دی۔ یہ سب کچھ قوم کی رگِ حمیت کو جوش میں لانے کے لئے کیا گیا۔ ساری قومی تاریخ ایک جگہ موثر پیرائے میں بیان کر دی۔ رونے کے علاوہ ذرا خودداری و فخر و غرور کی چاشنی بھی تھی۔ عرب کی حالت، رحمتِ عالم کی بعثت، قرآن کریم کی تاثیر اسلام کا شکوہ، فتوحات کی وسعت، علوم و فنون کی ترقی، علماء اور حکماء کا کمال، تعمیر بلاد، سیر و سیاحت، اور بغداد و اندلس کے قابلِ فخر

آثار اس خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ نظم کئے کہ مسلمانوں کو فقیری میں بادشاہی کا مزہ آ گیا۔ یہ مسدس ہی تھا جس نے اُن کے جھکے ہوئے سر غرور سے بلند کر دیئے اور ان کی ماضی کی عظمت اس موجودہ نکبت و ادبار میں بھی تسکین کا باعث ہو گئی، یہ صرف حالی پیرائیہ بیان کا نتیجہ تھا۔ ورنہ حالی جیسے شاعر و مصلح کے ہاں کہ جن کا ہاتھ سینہ کوبی میں مشغول اور جن کی آنکھ سے جوئے خون رواں تھی ایسے زوال و پستی کی داستان میں سرمایۂ تسلی کہاں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو حالی کے کلام میں بھی صاف صاف اُمید کی جھلک ملتی ہے۔ ورنہ حالی کی شاعری صرف اس کی مصداق ہوتی۔

سینہ کوبی میں رہے جتبک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

مگر غم و فخر کے سرمایہ کے ساتھ اس عجیب و غریب تصنیف میں موجودہ حالات کا احساس دلا کر آئندہ کی فکر کا سامان بھی موجود ہے "شامِ غم" صبحِ اُمید کی خبر دیتی ہے۔ اور ظلمتِ شب میں اُمید کی کرن بھی نظر آ جاتی ہے۔ صرف کمزوریوں کا راز ہی فاش نہیں کیا گیا بلکہ انھیں سُدھارنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں اور وہ سب کے سب قابلِ عمل ہیں، صرف احساس کے نشتر چبھو کر فاسد خون ہی باہر نہیں نکالا گیا ہے، بلکہ ان زخموں کی مرہم پٹی بھی کر دی گئی ہے جن دماغوں کو اپنے تنزل کا احساس ہو جاتا ہے انھیں اپنی ترقی کے آثار بھی نظر آ جاتے ہیں۔ حالی نے ضمیمہ میں صاف صاف وہ شاہراہ دکھائی ہے جو مسلمانوں کی آمد کے لئے بے قرار ہے اور جس پر چل کر مسلمان اپنے اعلیٰ مقاصد کو پھر حاصل کر سکتے ہیں۔

سب سے آخر میں حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں عرض کر کے قوم کے لئے موثر الفاظ میں دعا کی ہے۔ حالی صاف صاف بتاتے ہیں کہ دعا میں بڑی تاثیر ہے اور یہی تدبیر مسلمانوں کے سنبھلنے کی ہے۔

تدبیر سنبھلنے کی نہیں کوئی ہمارے
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو دین کی فکر ہے۔

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں ۔۔۔ پر فکر ترے دین کی عزت سے سوا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں عزت ہے ہماری ۔۔۔ اُمت تری ہر حال میں راضی بہ رضا ہے

زندگی اسی کلام کو نصیب ہوئی ہے اور یہ الغیب ہوئی۔ اس کی شہرت اور زندگی ہم فانیوں کے تخیل کی پرواز سے بلند و بالا ہے میرا خیال ہے کہ اگر اردو شاعری میں سے

مسدس حالی کے اور کوئی چیز نہ ہوتی تو بھی آج دنیا کی بڑی سے بڑی زبانوں سے مقابلہ کر سکتی تھی۔ حالی اگر مسدس کے سوا کچھ اور نہ لکھتے تو یہ ان کی شہرت کے لئے دنیا میں اور بخشش کے لئے عقبیٰ میں کافی تھی۔ پھر سرسیدؒ کا یہ قول کہ قیامت میں جب خدا مجھ سے سوال کرے گا کہ دنیا سے کیا لایا تو کہہ دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں کسی حیثیت سے بھی قابل تردید ہے؟ کہیں بھی گنجائش ہے کہ اس پر قلم لگایا جا سکے؟ اردو شاعری میں، اگر مسدس کو چھوڑ کر کل قومی شاعری میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دی جائے اور مسدس دوسرے میں تب بھی مسدس کا پلہ بھاری رہے گا۔ اور اگر بلحاظ مقبولیت دیکھا جائے تو ابھی تک کسی ایک نظم کو کسی ادب میں اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ بچوں سے لے کر بوڑھے تک اسے پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ مسدس پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مرثیہ ہے۔ مگر پھر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس مرثیہ میں ایک تعمیری شان ہے" اور یہ اس کے لطف و دلچسپی کا باعث ہے جو روز افزوں ترقی پر رہے گا۔

حالی نے ایک جگہ مقدمۂ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ مثنوی سے ابھی تک وہ کام نہیں لیا گیا ہے جس کام کے لئے کہ وہ موزوں ہے۔ مگر آج ہم بلا تکلف اور بلا تردد کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ اردو شاعری میں مثنوی سے وہ کام نہیں لیا گیا ہے جس کام کے لئے کہ وہ بنی ہے مگر مسدس سے وہ کام لے لیا گیا اور یہ صرف حالی کی بدولت ہے۔ مسدس واقعی اپنا منشا پورا کر چکا۔

مسدس حالی نے صرف اسلامی چمن کی آبیاری ہی نہیں کی بلکہ اردو شاعری کے روئے زیبا سے ایسے بدنما دھبے دھوئے جو تا قیامت مٹنے والے نہ تھے اور میرا خیال ہے کہ بلاشک بجائے میر انیس[1] کے کلام کے یہ اشعار حالی کے مسدس پر زیادہ چسپاں ہیں

مری قدر کر اے زمین سخن	تجھے بات میں آسماں کر دیا
سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر	مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

ابو مسلم صدیقی، بی، اے (علیگ)

۲۷

[1] اس مضمون کا موضوع "حالی مسدس کے آئینے میں" ہے اور وہی فرسودہ باتیں مسدس کے متعلق لکھی گئی ہیں جو بارہا کہی گئی ہیں۔ لیکن ایک بات... قطعی نئی ہے۔ یعنی مقالہ نگار نے کئی جگہ حالی اور انیس کا مقابلہ کر کے حالی کو انیس سے بہتر اور بڑا شاعر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دعویٰ اسی نظم کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کیا گیا ہے جس کو برسوں عوام و خواص میں مقبولیت حاصل رہی ہے لیکن اس نفسیاتی نکتے کے باوجود صدیقی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حالی اور انیس کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ جذبات کو ابھارنے کے علاوہ انیس کی فن کارانہ حیثیت حالی سے کہیں ارفع اور بلند ہے اور انیس میں بہت زیادہ شعریت پائی جاتی ہے۔ حالی خطابت کے بھنور میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ انیس مرثیہ میں بھی شاعر ہی رہتا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں حالی اور انیس کا مقابلہ کرنے ہی کی کیا ضرورت ہے؟ [illegible]

مشرق میں عورت کا مرتبہ

چین کی عورتیں

چین ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کی عورتوں کو یہ ناز ہے کہ انھوں نے کبھی غیر ملکی تہذیب و تمدّن کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔ چین کی عورتوں کی تہذیب و تمدّن اور معاشرت و زبان ہمیشہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے ممیّز رہی، اس کی وجہ ان کی قوم پرستی میں مضمر ہے۔ اُن کے خمیر میں وطن کا احساس ہے۔ اُن کی طبیعت میں یہ میلان نہیں ہے کہ جہاں کسی ملک کی تہذیب یا کسی اور طرز کو دیکھا اور قبول کر لیا۔ وہ اپنے اصولوں پر بڑی سختی سے کاربند ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کی حالت دنیا کے دوسرے ملکوں سے جدا ہے چینی عورتوں کی معاشرت اس میں بہت ابتر رہی ہے چینی مذہب کے ناخدا کنفیوشس نے عورتوں کو گھر کی دیگر چیزوں میں شمار کیا ہے اس کا خیال ہے " عورت صرف بقائے نسل کے لئے ہے اور اس کی پیدائش کا واحد مقصد مرد کی لطف اندوزی ہے۔ انھیں عقائد سے ایک چینی خاتون مان ہو دی مان جو ملکہ کی ہمعصر تھی، لکھتی ہے، " ہم بشریت کی آخری صنف میں ہیں۔ دنیا کی کمزور ضعیف ترین صنف ہم ہیں، وہ افعال و اعمال جو سب سے کمتر ہیں، ہمارا حصّہ ہیں ——— ہم زندہ ہیں لیکن مُردوں سے گئے گزرے ——— ہم انسان ہیں لیکن انسان سمجھے نہیں جاتے۔ گھر کے پالتو کتے بلّی جانوروں سے بھی بدتر، ہماری کوئی قیمت نہیں" ان متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں ہر انسان سوچ اور سمجھ سکتا ہے کہ عہد قدیم میں چینی عورتوں کی کیا قدر و منزلت تھی اور تہذیب و تمدّن میں چینی عورت کی خانگی زندگی کیا تھی، اس زمانے میں چینی عورت صرف لونڈی سمجھی جاتی تھی اور اُس کا فرض یہ ہوتا تھا کہ گھر کا کھانا پکائے کپڑے دھوئے اور نہ صرف شوہر بلکہ پورے خاندان کی خدمت کو عبادت تصوّر کرے۔ یہ تھی آخری حد عہد قدیم کی، چینی عورتوں کی گھریلو اور خانہ دارانہ زندگی کی قدیم زمانہ میں نیو ہیم شو کے قول کے مطابق چینی عورتیں ایک سایہ یا آواز بازگشت کی وقعت و حیثیت رکھتی تھیں، یہ تھی اُن بیچاری عورتوں کی کس مپرسی اور بے بسی۔

جس طرح انسان کے جسم کی حرکت کے ساتھ ساتھ سایہ حرکت کرتا ہے یا اصلی آواز کے ساتھ آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے اسی طرح چینی عورتوں کو اپنے مردوں کے اشاروں پر چلنا پڑتا تھا

ایک چینی عورت نے اپنے بچّے کو مخاطب کر کے ایک نظم لکھی تھی جس کا مفہوم یہ ہے :-

" میرے بچّے! میں عورت ہوں اور تیری ماں! گھر کی ظلمت ہوں اور قانون اور شوہر کی نظر میں حقیر۔ میں عورت ہوں اور تیری داد طلب شکوہ کرنے والی ماں! یہ دنیا اور دنیا والے میرے وجود کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ میرے وجود کا مقصد محض تفریح ہے۔

میرے زندگی کے تاروں میں غمگین نغمے لرزاں ہیں، پھر بھی میں ایثار و محبت کا ایک سبق ہوں، مبارک مجسّمہ ہوں، میری ہی گود میں یہ قوم کے بہادر سورما پیدا ہوئے۔ میں نے ہی ان قومی ناخداؤں کو پالا، میری ہی آغوش میں پل کر، بڑھ کر مجھے یہ بھول گئے، میں عورت ہوں، محبت ہوں، اور پیارے بچّے تیری ماں، میرے خون کے قطروں سے دودھ بنا اور دودھ کے قطروں سے پھر خون بنا، تمھارے جسم کو طاقتور بنا کر میں خود کمزور ہو گئی! بڑے ہو کر کہیں میرے خون کی قیمت نہ گرا دینا۔ میرے بچّے! میری اُمیدیں تجھ پر لگی ہیں ــ میں تیری ماں ہوں، تم بڑھو، پھولو۔ پھلو، اور بڑے ہو کر احسان فراموش نہ بنو، میری ہستی کو پہچانو، میری مظلومیت کو سمجھو، اور انصاف کو نہ بھولو، مانو یا نہ مانو میں قربان ہی ہوتی رہوں گی، میں تیری ماں ہوں، تمھیں سہارا دیتے دیتے تمھیں بڑا

کرکے خود بے سہارے ہو جاؤں گی، تمہارے ننھے مُنّے دماغ کو عقل سکھا کر خود بے عقل اور کمزور ہو جاؤں گی، تم آج بے زبان معصوم ہو کل اپنی زبان سے تیر لئے قاعدے بناتا، تم کو میں نے انسان بنایا ہے۔ گوشت کے بے جان ناتواں جسم کو میں نے روح بخشی ہے، میرے لختِ جگر! میرے بچّے بڑے ہو کر بھول مت جانا میرے حقوق کو کسی نے نہیں سوچا۔ تمہارا فرض ہوگا کہ ماں کی لاج رکھو، اپنی مظلوم ماں کی عزت کرنا تم، ویسے نہ بن جانا جیسے کہ اور قوم کے سپوت ہیں، میں آس رکھتی ہوں کہ تم ماں کے وقار کو دنیا میں قائم رکھو گے، میرے سہارے اپنے محسن سے دھوکا نہیں کرتے، میں تیری ماں ہوں! تمہارے جسم کے ہر حصّے میں جو خون گردش کرتا ہے وہ میرے ہی جسم کا ٹکڑا ہے۔ خون ہے روح کا جو ہر ہے جو بہت سی امیدوں پر لُٹا رہی ہوں اور لٹاتی رہونگی، میں وطن پرست ہوں، قوم پرست ہوں۔ تم بڑے ہو کر وطن پرست بننا! میری خوشی، میری تمنّا، میری زندگی کا مفہوم بس تمہارے خیالات پر مبنی ہے، میں چینی عورت ہوں یا ایثار کا زندہ ثبوت ہے۔

میرے پیارے بچّے! میں تیری ماں ہوں!!"

اس چینی عورت کی یہ نظم کس درجہ پُر معنی تھی اور اس کا مفہوم کتنا موثّر، ظاہر ہے کہ یہ ایک قسم کا شکوہ ہے اور وہ بھی اپنے بچّے سے

چین کی عورتیں دستکاری میں بھی بہت ماہر ہیں اور ہر قسم کی دستکاری میں کمال کرتی ہیں۔ معمولی معمولی ٹکڑوں سے وہ نہایت بیش قیمت بیڈ کور۔ ٹی کوزی۔ ٹیبل کلاتھ اور نائٹ گون تیار کرتی ہیں جو ہندوستان میں کافی قیمت میں فروخت ہوتے ہیں۔ اُون کا کام بھی بڑی صفائی سے کرتی ہیں، بچّوں کی فراکیں، موزے اور بنیائن نہایت خوبصورت تیار کرکے اپنے مردوں کے ہاتھ ہندوستان میں ہر سال فروخت کے لئے بھیجتی ہیں ہر ٹانکہ اتنا خوبصورت اور صاف ہوتا ہے کہ اُن کا ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے خصوصاً کڑھائی اور کتائی کا کام تو بہت ہی محنت سے بناتی ہیں۔ صحت اور تندرستی خاصی اچھی ہوتی ہے، البتہ پاؤں بہت چھوٹے ہوتے ہیں، بمشکل چل سکتی ہیں یہ بھی عہدِ قدیم کا رواجی سلوک یا قانون اُن کے لئے ہے اور وہ اس پہ بھی خاموشی سے کاربند ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ چینی عورت کی مظلومیت قابلِ رحم ہے اور اس کا صبر قابلِ تحسین ہے۔

مصرِ قدیم کی عورتیں

مصر کی قدیم تہذیب کو تمام تہذیبوں پر فوقیت حاصل ہے۔ بابلی، اسامری آشوری، عامری، اور دیگر قدیم اقوام کی طرح اہلِ مصر کے حالات بھی تاریک تھے۔ فرانس نے نپولین کے دور سے اس کی تحقیق شروع کی۔ اسی زمانے کے شمپولون (Shampollion) نامی ایک طالبِ علم نے خطِ رمزی یعنی اہلِ مصر کے قدیم رسم الخط کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی اور اس علم کو حاصل کرنے کے شوق میں اُس نے اپنی عمر کا کافی حصّہ صرف کر دیا سب سے پہلے اُس نے قبطی زبان کا علم صرف و نحو لکھا، یہ زبان قدیم مصری زبانوں سے نکلی تھی اور اہلِ یورپ اس کو ہیروگلیف Hairoglyphe یعنی متبرک زبان کہتے تھے۔ بعد میں اس زبان کو بہت ترقی ہوئی۔ بعد میں یہی زبان ہیراٹک (einaigoe) مقدس سمجھی گئی۔ مجھے اس زبان سے اور بحث سے صرف اُس زمانے کی عورتوں پر روشنی ڈالنی ہے اس لئے ان انکشافات سے جو نتائج اخذ کئے اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ دیگر قدیم قوموں کے مقابلہ میں مصری خواتین کا درجہ بہت بلند تھا، اس ملک کی عورتوں کو قوم کے افرادِ خاندان کا بانی کہتے اور سمجھتے تھے، ترکہ بھی مصر کی عورتوں کو زیادہ ملتا تھا۔

کھانا پکانا۔ کپڑا بُننا۔ بچّوں کی پرورش کرنا۔ آٹا پیسنا۔ اور اس کے علاوہ بازار میں تمام خرید و فروخت کرنا بھی مصری عورتوں کے فرائض میں داخل تھا۔

محققین نے مصرِ قدیم کے مشہور شہر طیبہ (Thebes) کا جو منظر کھینچا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو انتہائی فضیلت حاصل تھی۔ تاریخ و قصص میں جابجا مصری عورتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

عہدِ قدیم میں مصر میں خانہ داری کا نظام بہت زیادہ زبردست تھا مصری عورتوں نے سیاسیات میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت مسیح کی پیدائش سے تین ہزار پانچسو سال قبل مصر میں ایک مشہور ملکہ گذری ہے جس کا نام حتشپوت تھا اُس کے بنائے ہوئے قوانین دو ہزار سال تک تقریباً مصری عورتوں میں اور ملک میں رائج رہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس دور میں عورتوں کو جو درجہ مصر میں حاصل تھا وہ آجکل ترقی یافتہ خواتین کے لئے قابلِ رشک اور حیرت انگیز ہے۔

مصر کی عورتیں حسن میں بھی اور ملکوں سے کم نہیں ہیں کافی خوبصورت ہیں۔

مسرِ جدید کی عورت، سماج میں بالکل آزاد ہے اور مغربی اثرات سے متاثر ہے۔ لباس و معاشرت کے لحاظ سے اس میں اور ایک یوروپین لڑکی میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

ہندوستان کی عورتیں

قدیم ہندوستان میں عورت کو خانہ داری کے ضروری کاموں کے علاوہ اعلیٰ خاندانوں میں تعلیم اور فنونِ سپہ گری بھی سکھائے جاتے تھے، راجہ وکرما جیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں جب ہر طرف امن کا دور دورہ تھا، عورتیں فنونِ لطیفہ کی تعلیم بھی حاصل کرتی تھیں اور گھریلو کاموں میں بھی ماہر تھیں، کونکن کے علاقہ میں عام طور پر مرد سپاہیانہ زندگی بسر کرتے اور عورتیں ضروریاتِ زندگی کے دیگر فرائض انجام دیتی تھیں۔

مسلمان مغل شہنشاہوں کے زمانے میں شہزادیوں شہزادوں کی طرح تمام کرتب اور اعلیٰ علم و ہنر، نیزہ بازی، بندوق چلانے اور دوسرے علوم فنون میں ماہر بنائی جاتی تھیں۔

مصوری اور موسیقی کو ان کی زندگی میں خاص دخل تھا۔ شعر و سخن سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ دستکاری میں شاید ہی کوئی کام ہو جو نہ آتا ہو۔ ذہانت قابلِ رشک تھی، اور تہذیب کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ، موجودہ وقت میں بھی مغل خاندان میں اس کے نشانات باقی ہیں اور انسانیت، اخلاق، مروّت، ہمدردی کے جذبات قدرت نے نہایت فیاضی سے عطا کئے ہیں۔ گو سلطنت نہیں رہی، لیکن طبیعتوں میں آن بان وہی باقی ہے۔ زبان پہ عبور حاصل ہے باتیں کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا منھ سے پھول جھڑ رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ صحیح اردو بولنا اور سمجھنا صرف مغل خاندان کا حصہ ہے، ورنہ یوں تو سب ہی کہتے ہیں کہ اُردو ہماری زبان ہے، عہدِ قدیم میں ہندوستانی عورتیں نہایت تندرست اور محنتی اور اپنے گھریلو کاموں میں ہوشیار تھیں، گھر کا کام بچوں کی پرورش اور خاندان کی خدمت، سب کچھ کرتی تھیں، اور کنبہ کے ساتھ تمام زندگی گذارتی تھیں بہادر بھی تھیں۔

تاریخ میں ہندوستانی عورتوں کے کارنامے بھرے پڑے ہیں، رضیہ سلطانہ کی بہادری، عقلمندی۔ نورجہاں کی ذہانت اور وقار، سیتاجی کی وفاداریاں اور ضبط و استقلال، اور بھی مختلف عورتوں کا حال تاریخ میں ستاروں کی طرح درخشاں ہے۔ پڑھنے سے حیرت ہوتی ہے، یہ تو رہا عہدِ ماضی کا حال —

اب موجودہ حال سنئے۔ ہندوستانی عورت درحقیقت ایک "معجون مرکب" یا مختلف دواؤں کا مکسچر بن چکی ہے اور یہ سلسلہ چل رہا ہے نہیں معلوم یہ کب تک چلتا رہیگا اور کبھی منزل بھی سامنے آئے گی یا یوں ہی تھک کر منزل کے سامنے رہ جائینگی

اس وقت ہندوستانی عورتوں کے تین فرقے ہیں ایک وہ جو ترقی تعلیم تہذیب و اخلاق کے تمام مدارج طے کر چکی ہیں اور ان کا گھر اور لباس اور طرزِ معاشرت دیکھ کر یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ ہندوستان کی باشندہ یا ابھی ابھی ولایت سے واپس آئی ہیں۔ خدانخواستہ اگر نوکر کو بھی آواز دیں گی تو اسی انداز سے "بوائے" — ایسا کانوں کو محسوس ہوگا گویا پپیہا بولا۔ اردو زبان بولنا تو ان کے مذہب میں جائز نہیں، اخبار، رسالے جو دفتر والے بیچارے کن کن امیدوں سے "بخدمت شریف" بھیجتے ہیں وہ ان کے ہاں تو بیرا خانساماں وغیرہ ملاحظہ کرتے رہتے ہیں یا پھر ردّی کے بطور الماریوں میں بچھائے جاتے ہیں اور اس کے بعد نذرِ آتش۔ کھانا خواہ مزے دار ہو یا بدمزہ لیکن کھایا جاتا ہے انگریزی، پھر خواہ تکلیف دہ ہو لیکن ہر وقت مکمل لباس انگریزی کیسی ہی اشد ضرورت ہو لیکن مجال نہیں کہ اردو میں بولیں خواہ گرامر بھی غلط ہو لیکن بولیں گی ہر وقت انگریزی۔ گھر میں شوہروں سے خواہ ہر وقت جوتا ہی چلتا رہتا ہو لیکن شام کو جب موٹر میں یا پیدل گھومنے جائیں گی تو نہایت شان سے ہاتھ میں ہاتھ ہوگا۔ اس طبقہ میں اگر کبھی شامت زدہ ہندوستانی بہنیں پہونچ جاتی ہیں تو حیران رہ جاتی ہیں۔

میں نام لینا مناسب نہیں سمجھتی یو۔ پی کے ایک نہایت معزز گھرانے کی بہو بیوی کو میں نے ڈانس میں شریک ہوتے دیکھا اور عام پبلک کے ساتھ اسکیٹنگ کرتے دیکھا (نہایت خوب مشاہدہ تھا۔ اس میں حیرت کی کونسی بات ہے!؟ مباغر)

یوروپ کی باتیں یوروپ جانے، یہ تو بد قسمت ملک ایشیا ہے۔

دوسرا طبقہ ہندوستانی عورتوں کا وہ ہے جس نے تعلیم کا غلط مقصد سمجھ لیا ہے۔ بڑی تیزی سے وہ ترقی کے راستوں پر دوڑ رہی ہیں۔ لیکن کس طرح؟ انھیں یہ تک نہیں معلوم کہ ہمیں کن کن کاموں میں حصہ لینا چاہئے اور کس طرح؟ کچھ امیر دولتمند بہنوں نے انجمنیں قائم کر رکھی ہیں۔ کچھ محترم بہنوں نے اسکول کھول رکھے ہیں۔ لیکن اُن کے اصول بالکل غلط، مثلاً ایک دس بارہ لڑکیوں کو جمع کر لیا اور طوطے کی طرح اپنا خود ساختہ کورس رٹا دیا اور ہر آئے گئے سے یہ کہدیا

کریں نے قوم کے لئے یہ قربانی کی ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ سچ مچ کوئی قوم کی یتیم بچی بچہ اُن کے سامنے آجائے تو یہ کہہ کر منہ پھیر لیتی ہیں کہ "کہاں تک قومی کاموں میں صرف کریں، آگے بڑھو ——— اِن بہنوں کے گھر کی طرزِ معاشرت آدھا تیتر آدھا بٹیر" والا مضمون ہے اور شہرت پسند ہیں، مضمون نگار ہوں یا نہ ہوں شاعر ہوں یا نہ ہوں لیکن اخباروں میں رسالوں میں نام دیکھ لیجئے۔ کچھ امیر بہنیں نذرانہ دیکر شاعروں کے خونِ جگر کی لکھی نظمیں، غزلیں حاصل کر لیتی ہیں، کچھ اپنے باپ، بھائی، شوہر کی مدد سے نامور بن جاتی ہیں۔

میں سمجھتی ہوں یہ تو کوئی بڑی بات نہیں کہ ہمارے پاس سرمایہ کم ہو
لیکن ہاں یہ بڑی بات ہے کہ جو کچھ ادبی سرمایہ ہو وہ دوسروں کا ہو
اور اپنی قابلیت بالکل صفر ہی ہو

تیسرے طبقے کی حالت یہ ہے کہ وہ "راہِ نجات" اور چند کتابوں سے آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھتیں اور جمعہ جمعہ آٹھویں دن نہانا کافی سمجھتی ہیں، بچوں کو مار پیٹ کر پرورش کر لیا، شوہر کو چیخ چیخ کر خاموش کر لیا۔ دن پھر چھالیہ پان کھاتی رہیں، دن کب نکلا، رات کب آئی؟ موسم کب شروع ہوا اور کب ختم، دنیا میں آجکل کیا ہو رہا ہے، سیاست کس چڑیا کا نام ہے، تاریخ کسے کہتے ہیں، جغرافیہ کیا بلا ہے، دنیا میں اُن کے پیدا ہونے کا کیا مقصد ہے؟ اس سے انھیں دُور کا بھی واسطہ نہیں، یہ بیچاریاں اگر کبھی کسی پڑھی لکھی عورت کو اچانک دیکھ لیں تو جھٹ مکان کے کسی کمرے میں چھپنے کی کوشش کرتی ہیں، مرد بھی خوش ہیں اور یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ پڑھنے لکھنے سے فیشن بڑھ جاتا ہے۔ "دیکھو نا وہ فلانے تعلقدار کی لڑکی فلاں یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھ پڑھ کر خراب ہو گئی یا پڑوس میں دیکھو ڈپٹی کی بیوی کو ——— پڑھی ہوئی بہت ہے تو ہر وقت جگھٹا لگا رہتا ہے بعض وقت تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ کوئی شریف زادی کا مکان ہے یا ..... کا ——— اور میاں ہیں کہ بس غلام بنے ہوئے ہیں
توبہ توبہ میں ہوتا تو جان لے لیتا یا زہر کھا لیتا وغیرہ وغیرہ

یہ ہے ہندوستان کے موجودہ طبقوں کا نمونہ اور ذہنیت پہلے طبقے میں تو خانہ داری کا کچھ کام ہی نہیں، دوسرے طبقے میں خانہ داری کا کام طوعاً و کرہاً کیا جاتا ہے اور وہ بھی بے دلی سے۔ تیسرے طبقے میں چونکہ پیسہ کم ہے اس لئے خانہ داری کے جھگڑے بھی کم ہیں اور لے دے کر ایک سالن روٹی کا پکانا۔ سو وہ دو وقت پکا لیا، کھایا پیا آرام سے سو گئیں۔

موجودہ وقت کی ہندوستانی عورتیں اس بات کو بھول چکی ہیں کہ عہدِ گزشتہ میں ہر طبقے کی عورتوں میں صنعت و حرفت کا زور تھا دستکاریوں میں کوئی کام ایسا نہ تھا کہ نہ آتا ہو۔ آج اگر ہم نمونہ کے لئے وہ تمام کام دیکھنا چاہیں تو مفقود ہیں، ہاں کہیں کہیں شاہی خاندانوں میں آنکھوں کی عبرت کے لئے وہ دستکاریاں موجود ہیں۔ یہ میں نے بہت مختصر لکھا ورنہ ابھی بہت سے مسئلے باقی ہیں۔

فرائض کی تفریق، حقوقِ نسواں پر بحث، طرزِ معاشرت، خانہ داری وغیرہ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میرے یہ آخری فیصلہ کن الفاظ ہیں کہ موجودہ ہندوستانی عورت قوم کے لئے ایک بوجھ ہے گھر والوں کے لئے ایک زندہ لاش ہے۔ اپنی ہم جنس کے لئے بجائے سبق کے ایک زحمت ہے۔ کبھی ہندوستانی عورتوں کے لئے مشہور فلاسفروں کا قلم اٹھتا تھا۔ ادیب افسانے لکھتے تھے۔ اُن کی ہمت ذہنیت، جانفشانی کے کارنامے وردِ زباں تھے۔ آج وہ تمام خوبیوں کے سرِ یہ سر پیٹ رہے ہیں۔ مٹے ہوئے نقش ہندوستانی عورت کی خصلت دُہرا رہے ہیں کہ کیا تھیں اور کیا ہو گئیں۔

شفیق بانو بیگم

برما کی عورتیں

(از ادارہ)

برمی عورتوں کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ سماجی اور اقتصادی حیثیتوں سے قطعی آزاد ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ سوائے سوئٹ یونین دنیا کے کسی کلب میں بھی عورتوں کو اس قدر آزادی میسّر نہیں ہے جس قدر کہ برما میں۔

جب ہم لوگ ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے تو ہم سے برما کی عورتوں کے متعلق سوالات کئے گئے ہم نے اُن سوالات کے جوابات حتی الامکان دیئے، مگر وہ جوابات غیر یقینی تھے، کیونکہ باوجود سیاسی جدوجہد کے ہم برما کی عورتوں کے متعلق بہت کم علم رکھتے تھے۔

نیشنل پلاننگ کمیٹی کی ویمن کمیٹی۔ (Women Sub Comm-ittee of National Planning Committee.)

کے ممبروں سے جب عورتوں کے مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا اور اس سلسلے میں جو
کچھ معلومات فراہم ہوئیں اُن سے یہ پتہ چلا کہ عورتوں کے مسائل کو سمجھنا تو درکنار
ہم خود عورتوں کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتے۔

بہرحال ہندوستان کے عوام کو برما کی عورتوں کے صحیح حالات سے
آگاہ کرنے اور برمی عورتوں کے متعلق خود اپنے علم کو وسیع کرنے کے لئے میں
کوشش کروں گا کہ جو مسائل اب تک ہمارے لئے پس پردہ تھے اُن کو ظاہر کردیا
جائے۔

سماجی حیثیت سے برمی عورتیں قطعی آزاد ہیں۔ اُن کے لئے پردہ ہی نہیں،
بلکہ اور بھی کوئی ایسی سماجی پابندی نہیں ہے۔ سماج میں اس کی حیثیت بالکل مساوی
ہے، وہ مرد کے ساتھ ساتھ آزادانہ چل پھر سکتی ہے، باہمی حسد بہت کم پایا جاتا ہے،
اور اگر کہیں ہے بھی تو وہ قدیم سماج یا شاید ہند و تہذیب کی بوسیدہ یادگار ہے،
اور وہ بھی خیالات کے امتزاج اور برمی نسائیت میں سماجی بیداری کی ترقی کے
ہاتھوں ختم ہوتا جا رہا ہے۔

خاندانی زندگی میں باپ برائے نام گھر کا مالک ہوتا ہے، حقیقت میں
ماں ہی حکمرانی کرتی ہے، وہی تمام خاندانی زندگی کی تنظیم کرتی ہے اور خاندانی
روایتوں کو قائم رکھتی ہے۔

برمی عورت ملکیت کا حق رکھتی ہے، یہ حق ایک بیوہ عورت کو بھی ہوتا ہے
ایک بیوہ کو دوسری شادی کرنے کا حق ہوتا ہے، بلکہ شادی کے سلسلے میں بعض وقت
کنواری لڑکیوں پر بیوہ عورتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ اپنی ملکیت پر پورا
قبضہ ہوتا ہے۔ برما میں شادی کو مذہبی یا روحانی معاہدہ کے بجائے کاروباری
معاملہ سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی قاعدہ ہے کہ چاہے لڑکی اور لڑکا
دونوں اپنی خوشی سے شادی کریں مگر خاندان کے بزرگوں کا فرض ہے کہ وہ ان
کی خوشحالی کا خیال رکھیں۔

گذشتہ چند سالوں میں ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں جنسے "آزاد محبت"
اور "معاہدے کی شادی" کی مخالفت اور اس پر اعتراضات کا ہونا پایا جاتا ہے ایسا
ہوتا ہے کہ مالی مشکلات کی وجہ سے والدین اپنی لڑکی کی شادی زبردستی ایک
ایسے شخص سے کر دیتے ہیں جس سے لڑکی کو کوئی تعلق خاطر نہیں ہوتا اور ایسا بھی ہوتا
ہے کہ ایک لڑکی کسی مرد کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور اس وجہ سے اُس کو حقوق
سے محروم کردیا جاتا ہے۔ مگر آخر کار والدین اور لڑکیوں میں صلح ہو جاتی ہے۔

مستثنیات کو چھوڑ کر شادی کے معاملہ میں زیادہ تر لڑکے اور لڑکیاں
آزاد ہی ہوتے ہیں۔

برما میں بچپن کی شادی کا رواج بالکل نہیں ہے۔ ایک فرقہ "ارکان"
ایسا ضرور ہے جس میں شادی کی رسم عجیب سی ہے۔ اس فرقہ میں ایک لڑکی کی
کی منگنی ایک لڑکے سے بچپن میں ہو سکتی ہے لیکن لڑکی اور لڑکے کو ساتھ رہنے کی
اجازت اُسی وقت ہوتی ہے جب لڑکی بالغ ہو جاتی ہے۔

شادی کے لئے لڑکی کی عمر کم از کم بیس سال اور لڑکے کی عمر
پچیس سال ہونا ضروری ہے لیکن اب عمر کی کمی کو دیکھتے ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ یہ
صرف رسمی سی بات ہے برما والے اس سے کم عمر میں شادی کرنے کی طرف رجوع
کرتے ہیں، اس قدر پختہ عمر میں شادی ہونے کے باوجود برما میں بچوں کی شرح
اموات اتنی زیادہ ہیں کہ ہندوستان کے کسی صوبہ میں اتنی نہ ہوں گی اس کی
وجوہ غالباً یہی ہو سکتی ہیں کہ مناسب ڈاکٹر کی امداد نہیں ملتی۔ زچہ گیری کے پرانے
اصول اب تک جاری ہیں اور مزید یہ کہ خاندانوں کے اقتصادی حالات بھی بہت
خراب ہیں۔

برما کے مختلف فرقوں میں آپس کی شادیوں پر اعتراض کرنے کے بجائے
انھیں مبارک سمجھا جاتا ہے، اس سے متحدہ قومیت کی تعمیر ہوتی ہے، لیکن دوسری
قوموں کے افراد سے شادیوں پر سخت نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ
خیال کیا جاتا ہے کہ ان نسلوں کی تباہی اور قومی تنزل ہوتا ہے، ایک اور تعجب
خیز بات یہ ہے کہ یوروپین اقوام اور چینیوں کے ساتھ شادیاں ہونے پر اس قدر
اعتراضات نہیں ہوتے ہیں جس قدر ہندوستان والوں کے ساتھ شادیاں کرنے پر
ہوتے ہیں کسی یوروپین کے ساتھ شادی کر کے ایک برمی عورت نئی زندگی اختیار کر
سکتی ہے کسی چینی کے ساتھ شادی کر کے بھی برمی عورت کی زندگی۔ اس کے سماجی
اصول اور اس کا مذہب سب قریب قریب اُسی طرح قائم رہتے ہیں لیکن کسی ہندوستانی
کے ساتھ شادی کر کے برمی عورت کو سماجی زندگی اور مذہب کے اعتبار سے بالکل مختلف
ماحول ملتا ہے اس کے علاوہ برمی عورتوں کا Personal Law
ہندوستانی مردوں کے Personal Law سے متصادم ہو جاتا ہے مجموعی
طور پر دوسری قوموں سے شادیاں قابل اعتراض سمجھی جاتی ہیں۔ جہاں تک برمی
عورتوں کی تعلیم کا تعلق ہے وہ کافی ترقی یافتہ ہیں، قدیم زمانے میں مذہبی اسکولوں
کے ذریعہ عوام کو تعلیم دی جاتی تھی، ان اسکولوں میں تعلیم کے واسطے لڑکیاں نہیں جاتی

تھیں - اس کے بجائے لڑکیاں اپنے گھروں پر یا توان فقیروں (بودھ مذہب کے علماء) سے تعلیم پاتی تھیں جو روزانہ خیرات لینے آتے تھے یا اپنے خاندان کے بڑوں اور بزرگوں سے پڑھتی تھیں، ان کو ابتدائی تعلیم اور گھریلو صنعت وحرفت سکھائی جاتی تھی - جب لڑکیاں بڑی ہو جاتی تھیں توان کو نہ تو مزید تعلیم ہی دی جاتی ہے اور نہ گھر کے کاموں سے اُنھیں اتنی فرصت ملتی تھی کہ وہ اپنا مطالعہ جاری رکھ سکیں برما کی لڑکیاں عام اسکولوں میں مذہبی طریقۂ تعلیم کی خرابی ہوتے ہوئے تعلیم پاتی ہیں، اُن کی تعلیم یا تو ابتدائی ہوتی ہے یا ثانوی - عام طور پر اعلیٰ تعلیم کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی ہے - کیونکہ سب کا یہ خیال ہے کہ لڑکی چاہے کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو جائے اُس کا کام گھر کی دیکھ بھال ہوگا اور اُس کا خاوند اُس کے لئے کمائے گا اور اگر اسے اپنے گذارے کے لئے خود بھی کمانا پڑے، تب بھی اسے زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہے -

تعلیم یافتہ لڑکیاں یا تو تعلیم دینے کا پیشہ اختیار کرتی ہیں یا نرسیں (nurses) بن جاتی ہیں - ان میں زیادہ تر ایسی ہوتی ہیں جو شادی کے بعد اپنے کام کو خیرباد کہہ دیتی ہیں - موجودہ زمانے میں بیکاری اور افلاس کی زیادتی کی وجہ سے بہت سے جوان شادی کو ایک قسم کا اقتصادی بار سمجھتے ہیں اور وہ شادی کے لئے اس قدر جلد تیار نہیں ہوتے جیسے پہلے ہو جاتے تھے - اِس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں تعلیم دینے اور نرس بننے کے علاوہ دوسرے کاروبار بھی اختیار کر لیتی ہیں اور ان میں سے اکثر شادی کے بعد بھی اپنا کاروبار نہیں چھوڑتیں؛ اِس لئے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے - اگر متوسط طبقے کی برمی عورتیں اچھی کمانے والی ہوتی ہیں؛ رنگون سے باہر اور رنگون میں بھی تقریباً تمام دوکانوں اور کارخانوں کا کاروبار عورتیں چلاتی ہیں - برما کی عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ عملی اور کاروباری ہوتی ہیں؛ وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ منتظم بھی ہوتی ہیں، وہ کاروبار کو ترقی دینے اور حسابات کو صحیح رکھنے کے طریقوں سے واقف ہوتی ہیں، چنانچہ قدرتی طور پر وہ کاروبار جن کی منتظم عورتیں ہوتی ہیں اُن سے زیادہ بہتر ہوتے ہیں جن کا انتظام مردوں کے سپرد ہوتا ہے، برمایں. متوسط طبقے کے مرد کاروباری لحاظ سے اس قدر نااہل ہوتے ہیں کہ اُن کے کاروبار یا تو ناکام ہو جاتے ہیں یا پھر اتنی ترقی نہیں کر سکتے جتنی کرنی چاہیے؛ مزدوروں میں بھی برمی عورتوں کا جوش و خروش اور محنت کم نہیں ہے - وہ مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں - برمی مزدور عورتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - ایک صنعت وحرفت کا کام کرنے والی اور دوسری زراعت پیشہ صنعت پیشہ مزدوروں میں عورتوں کی تعداد کم پائی جاتی ہے - بڑی بڑی صنعتوں میں عورتوں کو کم مقرر کیا جاتا ہے - عام طور پر چاولوں کے کارخانوں اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں عورتیں کام کرتی ہیں -

---

آزادی

انھیں ویرانیوں کو جنّتِ مسرور کردوں گا
یہی غمگیں فضا نغمات سے معمور کردوں گا

خداوندانِ زر کو بندۂ مجبور کردوں گا
نگاہِ تیز سے ساغر دلوں کے چُور کردوں گا

وطن کی خاک کے ذرّوں کو رشکِ طور کردوں گا
حجاباتِ غلامی بڑھ کے یکسر دُور کردوں گا

طلسمِ بزمِ عشرت ایک دم میں ٹوٹ جائیگا
لرز کر ہاتھ سے دامانِ ہستی چھُوٹ جائیگا

اُلٹ دوں گا نقابِ شاہدِ رعنائے آزادی
نظر آئے گا بے پردہ رُخِ زیبائے آزادی

شہیدوں کا لہو ہوگا جمال آرائے آزادی
بہار افروز ہوگا جلوۂ لیلائے آزادی

محیطِ دہر ہوگی وسعتِ پہنائے آزادی
دماغِ بندگی ہو جائیگا شیدائے آزادی

انھیں تاریکیوں سے ہوگا وہ نُورِ سحر پیدا
جو ذرّوں میں کریگا مہرِ تاباں کی نظر پیدا

فسونِ ساحرانِ مغربی کم ہوتا جائے گا
رہا زنجیرِ زرداری سے عالم ہوتا جائے گا

ربابِ عیش، سازِ نغمۂ غم ہوتا جائے گا
طرب افزا ترانہ، شورِ ماتم ہوتا جائے گا

نظامِ کائناتِ جَور برہم ہوتا جائے گا
یہی وحشت کدہ خُلدِ مجسّم ہوتا جائے گا

بہارِ تازہ پیدا ہوگی خونِ لالہ افشاں سے
طلوعِ صبحِ نَو ہوگا ہر اِک چاکِ گریباں سے

شرقی الٰہ آبادی

رُوس کا نظامِ تعلیم

(اشتمالی تعلیم کے اصول علمی نقطہ نگاہ سے)

(ترجمہ)

ذہنی آزادی

یہ اصول فطری ہے کہ کسی چیز کی بے پناہ تبلیغ ہی انسان کو اُس کام کے کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور جب کسی سیاسی یا انقلابی تحریک کی تبلیغ اسی نقطۂ نگاہ سے کی جائے تو انسان میں انقلابی اور سیاسی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ جذبہ بڑھ کر ایک ایسی شکل اختیار کرتا ہے کہ حکومت یا جماعت انسان کی ذہنی آزادی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں کہ وہ مجبور ہی ہو جاتی ہے بلکہ اسے جدید آزادی حکومت طلب آدم کو یا جماعت کی طرف سے ذہنی آزادی کا درجہ عطا کرنا پڑتا ہے۔ اسی سیاسی تبلیغی مطمح نظر کا انقلاب ممالکِ روس میں سخت اور کٹر اشتمالیت کا باعث بنا۔ اور باشندگانِ روس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ذہنی آزادی کا جذبہ دوڑ گیا۔ انسان کو اُس کے مادہ عقل و فہم اور سوچ وچار کی حد تک انفرادی حیثیت سے ذہنی آزادی عطا کی گئی۔ اُسے عقلی حدود اور منظم طریقے پر "جہدی طریقے" کو کامیاب بنانے کی آزادی دی گئی اور اُس کی کامیابیوں پر حوصلہ افزائیاں بھی کی گئیں۔ لیکن ایسے ذریعے جن میں انسان دوسروں کے سہارے اپنے سوچ بچار اور عقل و فہم کی گاڑی چلا سکے، مسمار کر دیا گیا۔ آئیے اب دیکھیں کہ اس نقطۂ نگاہ کے بموجب فلسفۂ اشتمالیت نے اپنے بچوں، اساتذۂ مدارس و جامعہ کو کس قدر ذہنی آزادی عطا کی

ظاہر ہے کہ ذہنی آزادی کے بغیر تو فلسفۂ اشتمالیت کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی تھی پھر بڑی عمر کے لوگوں کو یک بیک مکمل ذہنی آزادی بغیر کسی تربیت کے دے دینا فلسفۂ سیاست کے لحاظ سے مضرت رساں ہے یہ پڑھ کر سوال کرنے والا بغیر یہ دریافت کئے نہیں رہ سکتا کہ اشتمالی حکومت نے اشتمالی عوام کو کس طرح ذہنی آزادی عطا کی، وہ کیا تھی اور کس حد تک تھی۔ یہی تو مجھے اس وقت بتانا ہے۔ اشتمالی حکومت نے سب سے پہلے اپنے بچوں، اساتذۂ مدارس، علمائے جامعہ و عوام کو غیر متعصب اور غیر فرقہ وارانہ مسائل پر اُن کی عقل و فہم کے مطابق سوچ وچار کرنے کی مکمل آزادی دی۔ پروفیسر لاسکی (Laski) کو اشتراکی جمہوریہ کے دار القانون میں ایک تقریر "نمایندہ حکومت" پر کرنے کی دعوت دی گئی۔ اور راس تقریر کے ذریعہ حکومت نے لاسکی کے ذریعہ اپنے بچوں اور اساتذہ پر اپنی ذہنی آزادی کے نقطۂ نگاہ کو واضح کیا۔ لاسکی نے نہایت صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ حکومت عوام میں کس قدر ذہنی آزادی چاہتی ہے۔ اس نے کہا:۔

"ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر ایک شخص میں یہ جذبہ اور سمجھ پیدا ہو جائے کہ ہر فرد اور جماعت اپنے جائز مطالبات صاف طور پر ہم سے کہہ سکے، ملک کی تمام قانونی انجمنوں، اداروں اور خود حکومتی اداروں میں ہم بغیر کسی خوف کے نہایت آزادانہ طور پر اپنی ملکی، اور سماجی حالت کے

ہر پہلو پر سوچ وچار کرسکیں۔ آج دُنیا کے ممالک میں جس طرح طلبا اور عوام وغیرہ کے جذبات اور خیالات کچلے جارہے ہیں ہم اُس سے واقف ہیں لیکن ہم دُنیا پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے نظریئے دُنیا سے کس قدر مختلف ہیں۔ ہم یہ دُنیا کو دکھا دینا چاہتے ہیں کہ عوام اور طلباء کو ذہنی آزادی دینے سے ملک و قوم کس قدر ترقی کرتی ہے اور کس درجہ ... پہنچ جاتی ہے۔ ... " اسی ذہنی آزادی کے فلسفہ کو پیش نظر رکھ کر جمہوریت اشتراکیہ نے سرمایہ دارانہ معاشیات کو روسی سکولوں میں پڑھانا بند کردیا ہے۔ اعتراض ہوسکتا ہے، یہ کیا ذہنی آزادی ہے طلبا کو تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ معترض کا یہ اعتراض کسی حد تک بجا ہو لیکن میں معترض سے یہ عرض کرنے کی جرأت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالے پھر ایسے اعتراض کرے۔ کیا معترض اس بات کا جواب دے سکے گا کہ آج دُنیا میں کہاں تصویر کے دونوں رُخ بتائے جاتے ہیں جو روس ہی بتائے۔ پھر سوئیٹ روس کو دونوں رُخ بتانے کی ضرورت۔ اُس کی تو تصویر کا ایک ہی رُخ ایسا ہے کہ انسان پر یہ راز کھُل جاتا ہے کہ درونِ پردہ کیا ہوگا۔ پھر آپ خود ہی بتائیے کہ ایسی صورت میں دونوں رُخ پر روشنی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے آپ خود ہی دیکھئے کہ آج جہاں اس کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ جس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں وہاں کی حالت کیا ہے؟ ایسے مقامات کی حالت یہ ہے کہ طلبا کے دارالتفریح کی بندش صرف اس وجہ سے عمل میں لائی جاتی ہے کہ وہاں وہ انقلابی اور سیاسی گفتگو بحث ومباحثہ اور سوچ وچار نہ کرسکیں اور اُن کے جلسے منتشر کردئے جاتے ہیں تاکہ اُن میں ایسے جذبات وخیالات نہ پیدا ہوں جو حکومت پر نکتہ چینی کرسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی بات چیت اور سوچ وچار ہمیشہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ حکومت کے اُس بے لاگ اور سرمایہ دارانہ نظام پر جو شب و روز وہ عمل میں لاتی رہتی ہے۔ آج ہم اُنہیں ممالک میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کس طرح ذہنی آزادی اور معاشیات بلکہ کو نظر انداز کیا جارہا ہے یا کیا جاتا ہے اور کس کس طرح سے ان دونوں کا خون ہوتا ہے۔ یاد رکھئے کہ جبتک روئے زمین پر معاشیاتی تحفظ نہیں ہوتا اُس وقت تک تمام دُنیا میں انسانوں کا ایک طبقہ ہمیشہ ایسا رہے گا جو اپنی دولت وثروت کے بل بوتے پر اور اسکے زعم ناقص میں دوسرے طبقے کو اپنے سے حقیر اور ذلیل سمجھتا رہیگا اور اس کا علاج وہ طبقہ کریگا جو آج حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا ہے جس کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور کاروبار کرنا معیوب گردانا جاتا ہے اُس وقت جب تمام عالمِ انسانی میں اقتصادیات ومعاشیات کے مسئلہ کا حل درپیش ہوگا اور جس وقت ایک معاشی انقلاب کی لہر اُٹھے گی تب اس اہم حقیقت کو سمجھ سکے گا ذہنی آزادی کے سلسلے میں اسٹالن کی پیشین گوئی جو اُس نے اشتمالی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کی تھی آج جمہوریۂ اشتراکیہ کی حالت پر حرف بحرف صادق آرہی ہے کہ "مابہ الامتیاز شے کی منزل بسا اوقات اپنے جبر کی پوری اہمیت رکھتی ہے جو سابقہ غیر روشن خیالی جذبات کے منافی ہے۔" اُس وقت سے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں سوویٹ روس کی حالت "قابل رشک" حد تک پہنچ گئی ہے۔ اسی نے جمہوریۂ روس کو اُس بلند بامِ عروج پر پہنچا دیا جس کی بنا پر آج دُنیا کی نگاہیں روس کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں اور اکثر قومیں اُس اشتمالی آندھی کے خطرے کو محسوس کررہی ہیں جو سوویٹ روس سے بہت جلد اُٹھنے والی ہے لیکن یہ خوف وخطر فضول ہیں آنے والی بات ہو کے رہے گی۔ اس لئے بہتر ہو تاکہ وہ حفظِ ماتقدم کے فلسفۂ حیات کو پیش نظر رکھ کر ابھی سے سنبھل جائیں ورنہ وہ وقت دور نہیں جب وہ یہ کہتی ہونگی کہ اب کیا ہوگا۔ ؟!

ذہنی آزادی پر بحث کرنے والے سے یہ بھی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ ذہنی آزادی۔ روشن خیالی — آخر ہیں کیا بلائیں!؟ آئیے اس نکتہ کو بھی واضح کریں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ یہ کیا بلا ہے؟ اس وقت سوویٹ روس میں ذہنی آزادی و روشن خیالی سے جو مراد لی جاتی ہے اور جن معنوں اور اصطلاحوں میں یہ سمجھی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ہر فرد وبشر نہایت آزاد اور صائب طور پر اپنی رائے کا اظہار کرسکے اپنی آزادانہ رائے بموقع انتخابات نہایت آزادانہ طور پر بلا کسی اثر یا سہارے کے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق دے سکے۔ آج ہم

جب اسکے تحت سوویٹ روس کی ملکی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں نہ تو بھوکے ادیب و شاعر اور مصور رہیں اور نہ بھوکے ماہرانِ موسیقی و اداکار۔ آج اسی ذہنی آزادی کے جذبہ نے اُن کی معاشی حالت کو سُدھار کر زندگی کو محفوظ کر دیا ہے۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جو ہر اشتمالی و اشتراکی کی رگ و پے میں اپنی ملکی ترقی اور فلاح و بہبودی کی روح بنا ہوا ہے۔ اور ہر فرد ملک بلا امتیاز قوم دل و جان سے ملکی تعمیر میں لگا ہے۔ آج وہ ممالک جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کو ذہنی آزادی کا مرتبہ حاصل ہے وہ مجھے یہ بتائیں کہ اُنہوں نے اپنے دماغی کام کرنے والوں کو کیا آزادی دے رکھی ہے اور اُن کے آرام و سکون حاصل کرنے کے لئے کیا انتظام کر رکھا ہے غالبًا مجھے اس سوال کا جواب نفی میں ملے گا۔ مگر دوسری طرف سوویٹ روس کے ایسے دار التفریح کو بلاحظہ فرمایئے جو مخصوص ہیں دماغی کام کرنیوالوں کے لئے۔ ان میں آپ اُن کی تفریح اور دلبستگی کی ہر چیز پائینگے تو دوسری طرف کتاب خانے، جن میں تقریبًا دُنیا کی بہترین اور مقبول ترین زبانوں کی مختلف عنوان اور موضوع کی کتابیں، رسلے اور اخبار ملیں گے۔ ساتھ ہی ان تفریحی اداروں میں جن کا دوسرا نام دار الطبیعیات بھی ہے، کمرۂ ملاقات، کھانے کا کمرہ، اور دار المطالعہ اور دوسرے کمرہ آرام کے لئے بھی ملیں گے۔ ان دار الطبیعیات کا ممبر ہونے کے لئے کوئی خاص شرط بھی نہیں . . . .

ان کا ممبر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو دماغی کام کرتا ہے۔ اشتمالی ہے یا سیاسیات کے کسی شعبے سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مُفت تعلیم

تم جاہل عوام سے اشتمالی حکومت کی بُنیاد نہیں رکھ سکتے۔ یہ ہے وہ نعرہ جو دُنیا کے سب سے بڑے مفکر (Thinker) لینن نے بارہا ہر جلسے اور ہر موقع پر بلند کیا۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ کسی ملک کی بہتری اُس کے پڑھے لکھے عوام ہی پر مبنی ہے۔ جبتک ملک کے عوام کو اتنا نہ پڑھا دیا جائے کہ اہلِ ملک اپنے ملکی معاملات دُنیا کی سیاست اور سیاسی چالوں کو سمجھ سکیں اُس وقت تک اُس ملک کی حالت نہیں سدھر سکتی۔ اور اس حالت کو سُدھارنے کے لئے ایک قومی اور جمہوری حکومت کو تعلیم مفت دلوانا ہوگا۔ تاکہ وہ طبقہ جو حکومت اور غلط نظام انسانی کی بنا پر جاہل ہے تعلیم حاصل کر سکے۔ اور زیورِ علم سے مالامال ہو سکے۔ اپنے ملک کی سچی اور ہمدردانہ خدمت کر سکے، اپنے ملک کی اہمیت کو سمجھ سکے اور دُنیا کو سمجھا سکے۔ انہی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اشتمالی رہبروں نے اپنے ملک میں بھی تعلیمی کام کو جاری و ساری کیا۔ شروع شروع میں انہیں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں۔ ان دقتوں کا اندازہ حقیقۃً وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں ایسے موقعوں پر مندرجۂ بالا قسم کی مشکلات پیش آئی ہیں سب سے بڑی مشکل تو سرمایہ کی کمی تھی، پھر مدرسوں کی کمی۔ روس جیسے بڑے ملک کے لئے زار کی حکومت نے جس قدر مدرسے ملک میں قائم کئے تھے ناکافی تھے۔ انقلاب کے آنے کے بعد سے نئے مدرسے اس لئے نہیں قائم کئے جا سکتے تھے کہ ان مدرسوں کے نظامِ تعلیم کی تبدیلی وغیرہ پر کافی خرچ ہو رہا تھا۔ سرمایہ کم، کام زیادہ، پھر بھلا آپ ہی بتائیے کہ ایسی صورت میں سوویٹ روس کس طرح نئے مدارس کا مزید اضافہ کرتی۔ انقلاب کے آغاز میں شہری متوسط طبقہ (Bourgeois) کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ یہ طبقہ تمام ملک کی بہتری کو سوچنے کے بجائے اپنے ہی بچّوں کی تعلیم پر خودغرضانہ طور سے روپیہ پانی کی طرح بہاتا تھا اور جو بیچارے لاچار و مجبور تھے وہ اپنے نونہالوں کو جاہل رکھ کر قسمت پر قناعت کرتے تھے۔ حکومت نے اسے محسوس کیا اور تعلیم کو لازمی اور مفت سارے ملک میں جاری کر دیا۔ نئے دار الصبیان قائم کئے گئے اور سارے ملک میں مفت تعلیم کا دور دورہ شروع ہوا۔ اب بچّے ان دار الصبیانوں میں رہ کر اُس وقت تک تعلیم حاصل کرتے تھے جبتک کہ وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کرلیں۔ یہی نہیں کہ اشتمالی حکومت نے صرف مدرسوں ہی کی تعلیم کو مفت کیا ہو۔ بلکہ طلبا یونیورسٹی نیز ہر تعلیم گاہ تحقیقی ادارے، اور موسیقی، آرٹ و تمثیلی اکاڈمیوں، رات کی تعلیم گاہوں، دار التفریحوں وغیرہ میں ہر قسم کی تعلیم بڑا ہو یا چھوٹا، بوڑھا ہو یا بچّہ مفت حاصل کر سکتا تھا۔ یہ رعایت کسی خاص طبقہ کے بڑے بوڑھوں، جوانوں اور بچّوں کے لئے نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ یہ رعایت عام تھی۔ جاہل اور معمولی پڑھے لکھے کسان اور کارخانوں کے مزدور نیز عام مزدور بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اور آپ تعجب کرینگے کہ شروع میں جب تعلیم مفت کی گئی ہے تو

اُس وقت لوگوں کے تعلیمی ذوق وشوق کا یہ حال تھا کہ کارخانوں اور کھیتوں کو چھوڑ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اب بھی جامعہ میں طلبا کی زیادہ تعداد کارخانوں ہی کے کام کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ آج اس مفت تعلیم کی برکت نے سوویٹ روس میں کسی کو بھی جاہل نہیں چھوڑا سوویٹ روس کے محکمہ تعلیم کے اعداد و شمار یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ طلبا کی ۸۰ فی صدی تعداد یونیورسٹیوں میں آج اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہے اور تقریباً اتنی ہی یا اس سے کچھ زیادہ تعداد بغیر اپنے ماں باپ کی کسی امداد کے نہایت آرام اور چین کی زندگی گزار رہی ہے اور دن رات اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں نہایت بے فکری کے ساتھ موجود ہے ہمارے ملک میں ماں باپ مالی کمزوری کی وجہ سے اپنے بچّوں کی شادیاں تعلیم کے زمانے ہی میں کر دیتے ہیں۔ اور جس طرح خاندانی جھگڑوں کی بنا پر ان غریب قابلِ رحم نونہالوں کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں یا بیوی ہی کا ہو کر رہ جانے سے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں سب پر ظاہر ہے۔ اسی طرح روس میں بھی عموماً طلبا اپنی شادیاں خود اپنے زمانۂ تعلیم ہی میں کر لیتے ہیں۔ ایک متمدن اور مہذب ملک کے ہونے کی وجہ سے وہاں کسی خاندانی جھگڑے کے ہونے کا تو انہیں اندیشہ لاحق نہیں رہتا بلکہ میں اسکے کہنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ ان اشتمالی طلبا کی شادیاں یورپ کے دوسرے ملکوں اور خود ہمارے ملک کی گھریلو شادیوں کے مقابلوں میں زیادہ کامیاب رہتی ہیں اور اشتمالی ہم سے زیادہ خوش اور پُرسکون زندگی اپنی اس نئی زندگی میں گزارتے ہیں۔ لیکن اربابِ حکومت اس کو سمجھتے ہیں کہ جبتک طالبِ علم کے اور اُس کی ہونے والی اولادوں اور اُس کی بیوی کے اخراجات وغیرہ کا معقول انتظام نہ کر دیا جائے گا وہ اپنی اس نئی زندگی کو کبھی کامیاب نہ بنا سکے گا اور نہ اپنی تعلیم کو مکمل کر سکیگا۔ اس لئے جب کوئی طالبِ علم شادی کرتا ہے تو اُس کو اُس کی بیوی کو اور اُس کی ہر اولاد کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے اور ان بچّوں کا جبتک وہ اپنی ماں کے پاس رہتے ہیں اُس کے بعد سے جب وہ ماں سے الگ ہوتے ہیں معقول تعلیمی انتظام خود حکومت کرتی ہے۔ یہیں پر اس کا تذکرہ بھی کرنا ضروری ہے کہ انقلاب کے بعد سوویٹ روس کے ایک طبقہ کو

حقوق تعلیم ہی سے محروم کر دیا گیا تھا یہ طبقہ (Kulaks) کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی وہ لوگ جو زار کی زندگی کے محافظ، مذاہب کے پیشوا وغیرہ تھے اس طبقہ کی تعداد تقریباً دو تین لاکھ ہے۔ (سوویٹ روس کے ممالک کی کل آبادی تقریباً ایک سو ستر لاکھ یا اس سے کچھ زائد ہے) حکومت کے اس حکم اور بندش کا یہ مطلب بھی نہ سمجھنا چاہئیے کہ انہیں بالکل ہی تعلیم حاصل کرنے کی مناہی تھی نہیں بلکہ ایسا نہیں تھا۔ اس طبقہ کو صرف یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیمات کے حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس مسئلہ نے کہ اس طبقہ کو ہمیشہ کے لئے اعلیٰ تعلیمات سے محروم کر دیا جائے یا اعلیٰ تعلیمات حاصل کرنے کی اب اجازت دے دی جائے۔ آج سے چند سال پہلے بہت نازک سوال کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اشتراکی و اشتمالی نوجوانوں کا یہ کہنا کہ اس میں اُن بچّوں کا کیا قصور ہے جو (Kulaks) کی اولاد ــــ میں سے ہیں، یہ تو اُن کے والدین کا قصور تھا کہ اُنہوں نے اہلِ ملک کے ساتھ دشمنی کی اور ملک کے ساتھ ہمیشہ غدّاری کرتے تھے۔ بہرحال اس سوال نے چند ہی سال کے بعد اتنی نازک صورت اختیار کر لی کہ مشہور و معروف جریدہ (Komsomolskaya Pravda) جو اشتمالی اور اشتراکی طلبا کے خیالات کا زبردست ترجمان اور آرگن ہے نے اپنے ایک شذرہ میں اس مسئلہ پر نہایت غیر جانبدارانہ اور زوردار الفاظ میں اُن بچّوں کی حمایت و ترجمانی کی جو اپنے والدین کے قصوروں کی بنا پر اعلیٰ تعلیم سے محروم کر دئے گئے تھے اور حکومت سے درخواست کی کہ یہ پابندی اُٹھالی جائے۔ کیونکہ اس سے ایک اشتمالی حکومت کے نظام پر اور فلسفۂ اشتمالیت اور...... نئے نظامِ انسانی پر ایک بدنما دھبہ عائد ہوتا ہے۔ "کیا سوشلزم کا یہ اصول ہے کہ باپ کا قصور دوسری جگہوں کی طرح سے بیٹے پر عائد کر دیا جائے اور بیٹے کا باپ پر۔ حالانکہ سوشلزم اس کو کبھی جائز نہیں قرار دے سکتا"۔

اس کے اس شذرہ، طلبا کے شور و شغب اور تعلیمی رہبروں کے جلسوں اور تقریروں نے بالآخر حکومت کو چند سال بعد

مجبور کر دیا کہ وہ ایسی پابندیوں کو فورًا اُٹھا لے[1]

آپ میں سے بعض اصحاب یہ فرمائینگے کہ بھئی ہمارے یہاں بھی تو مُفت تعلیم دی جاتی ہے ۔ آخر غریب بچّوں کو وظیفہ دے کر جو تعلیم دلائی جاتی ہے روس کے نظامِ تعلیم سے ملتی جُلتی ہے ۔ مگر یہ چیز ہرگز نہیں ہے ۔ سوویٹ روس کے مفت تعلیم کے اصول میں اور آپ کے یہاں کی خیراتی تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ دیکھیے اوّل تو ہمارے یہاں کی وظیفہ دے کر تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ وظیفہ دو طبقے قرار دے کر دئے جاتے ہیں ۔ اور یہ وظیفے طبقۂ غریب کے لئے مخصوص ہوتے ہیں ۔ پھر ان وظیفہ پانے والے طلبا کی اس قدر دل شکنیاں کی جاتی ہیں کہ اُن کی اعلیٰ دماغی قابلیت فنا ہو جاتی ہے ۔ اور اُن کے کام کرنے کے جذبات مُردہ ہو جاتے ہیں ۔ میں اسے

---

[1] ۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو مرکزی انتظامیہ مجلس عوامی کونسل کے کمشنروں کی طرف سے ایک اعلان جاری ہوا جس پر کیلنن (Kalinin) مالٹو، اور اکلاؤ (Akylov) کے دستخط تھے ۔ اس نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیا ۔ اعلامیہ کے ذریعہ یہ حکم نافذ ہوا کہ شہری متوسط طبقہ یعنی (Kulaks) کے علاوہ تعلیمی حقوق جن سے اُن کو محروم کر دیا گیا تھا اُن پر سے یہ پابندیاں اُٹھائی جاتی ہیں ۔ اور اب اُن کے بچّے اعلیٰ تعلیمات حاصل کر سکینگے اور ان لوگوں کو ملکی و شہری حقوق حاصل ہو سکینگے آئندہ وہ تمام بچّے جنھوں نے امتحان میٹرک پاس کر لیا ہے ۔ اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں وغیرہ میں داخل کئے جا سکتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں ۔ اعلیٰ تعلیماتی صنعتی کمیٹی کو نیز دوسرے تعلیماتی کمشنروں کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ اس حکم کو فورًا عملی جامہ پہنائیں ۔ اور آئندہ سے مدارس کے اُستاد، اور ثانوی درسگاہوں کے اساتذہ اور یونیورسٹی کے علما، اس کا خیال رکھیں کہ طلبا، کے داخلہ کے وقت اُن کے والدین کی سوشل حالت اور اُن کی حیثیت وغیرہ کا جو خیال رکھا جاتا تھا وہ اس حکم کے بعد سے ترک کر دیا جائے ۔"

[2] جی نہیں، سب سے پہلے ایران میں مزدک نے اس فلسفے کی مبادیات پیش کیں ۔ ساغر

تسلیم کرتا ہوں کہ انہیں میں بعض بہت بلند ہستیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں ۔ مگر آپ خود ہی بتائیے کہ سو میں کتنے ایسے ہوتے ہیں ۔ شاید جواب آپ ایک یا دو دینگے ۔ درست ۔ لیکن دوسری طرف سوویٹ روس کے حالات پر نظر ڈالئے تو زیادہ تعداد طلبا کی ایسی ملے گی جو زندگی کے اُس بامِ عروج پر ہوں گے جس پر انسان کبھی نہ کبھی پہنچتا ہے ۔ وجہ صاف ظاہر ہے ۔ وہاں تعلیم میں کوئی طبقاتی خصوصیت نہیں رکھی گئی ہے ۔ پھر انسان کتنے ہی بامِ عروج پر پہنچ جائے لیکن اُس کا تعلق طبقۂ مزدور (Worker class) ہی سے رہتا ہے ۔ آج دُنیا میں صرف سوویٹ روس ہی میں ایسا نظام ہے جہاں کسی طبقۂ انسانی کو انفرادیت کا درجہ نہیں دیا گیا ہے گو اس فلسفہ اور اصول کا پہلا علمبردار "اسلام"[2] ہے لیکن افسوس کہ اسلام کے فلسفہ اور اصول کے ماننے والوں نے اپنی اُن چیزوں کو چھوڑ کر جنکا تعلّق حیاتِ انسانی سے تھا جزئیات کو اسلام قرار دیدیا جس کی وجہ سے سوشلزم منظرِ عام پر آیا، ورنہ آج شاید اسی اسلام (میں اسلام کو مذہب نہیں سمجھتا بلکہ اشتمالیت و اشتراکیت کی طرح سے حیاتِ انسانی کے شکستہ ڈھانچے کو درست کرنے اور جوڑنے کا ایک نظام)، کا نام اشتمالیت و اشتراکیت ہوتا ۔ ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ... سوویٹ روس میں انسان کو طبقاتی انفرادیت کا درجہ نہیں عطا کیا ہے بلکہ تمام طبقوں کو ایک سطح پر لا کر سب کی حیثیتیں بلند کر دی گئی ہیں ۔ اس تعلیمی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی ہے یعنی اہلِ جمہوریہ اشتراکیہ کو جو طبقاتی بلندی اور مساوات کا درجہ عطا کیا گیا اُس سے اُن میں مُلکی تعمیری کام کرنے کا جذبہ اور تعلیم حاصل کرنے کا خیال عملی جامہ پہن گیا ۔ آج آپ جمہوریۂ اشتراکیہ میں یہی نہیں کہ ملک کے کسی مسئلہ پر تبادلۂ خیال اُس مسئلہ ہی کے ماہر سے کریں بلکہ آپ ہر مسئلہ پر خصوصًا مسئلہ تعلیم پر ہر پڑھے لکھے (اور وہاں تقریبًا ۹۹ فی صدی آبادی پڑھی لکھی ہے) انسان سے گفتگو کر سکتے ہیں اور وہ شخص اپنی رائے کو اس صائب طریقہ پر پیش کریگا کہ آپ دنگ رہ جائیں گے اور دل ہی دل میں کہیں گے کہ یہ کس بلا کا انسان ہے کہ ماہرِ تعلیم نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بہت بڑا ماہرِ تعلیم ہے ۔ جو کسی

جو کسی گدیہ پر پورے بھروسے کے ساتھ اپنے خیالات پیش کر رہا ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُس کا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔

آئیے معت تعلیم کے فوائد کے تحت دو حقیقی کہانیاں آپ کو سناؤں۔ ان میں سے ایک سوویٹ روس کے جامعہ حکومت لین گراڈ (Leningrad State University) سے متعلق ہے اور دوسری ادارہ تعلیمی قزاقستان (Kazakstan) سے ——— انقلاب کے چند سال ہی بعد دو بچے ایک دار الصبیان میں داخل کئے گئے۔ یہ بچے حقیقی معنوں میں بد قسمت تھے یعنی ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور یہ سٹرکوں ہندی بچوں کی طرح بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرتے تھے۔ انہوں نے کچھ دنوں تک تو ایسی زندگی گزاری لیکن اس کے بعد وہ حکومت کے پرورش گاہ بچگان میں داخل کر دئے گئے اور ان کی تعلیم و تربیت بجانب حکومت جاری ہو گئی جب وہ ذرا بڑے ہوئے تو تعلیم کے ساتھ رفتہ رفتہ تھوڑی بہت تجارتی تربیت بھی دی جانے لگی جب اُنہوں نے یہ ابتدائی تعلیمی و تجارتی تربیت ختم کر لی تو حکومت ہی کی طرف سے اُن کا ایک کارخانے میں تقرر کر دیا گیا۔ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ سوویٹ روس کے ایام آغاز میں جس کو ذرا سا بھی تعلیم کا مزاج جاتا تھا وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کی فکر میں شب و روز رہتا تھا۔ یہی ان بچوں کا حال ہوا۔ زیادہ سے زیادہ تعلیم کا ذوق شوق تو سارے ملک میں روز افزوں ترقی کر رہا تھا پھر بھلا یہ بچے کیسے "معمولی پڑھے لکھے" رہتے۔ انہوں نے حکومت سے درخواست کی کہ اُنہیں اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ اُن کے کہنے کی دیر تھی۔ ادھر اُنہوں نے یہ درخواست حکومت کے سامنے پیش کی اور اُدھر اُن کا داخلہ ثانوی درسگاہ میں ہو گیا۔ کیونکہ ابتدائی تعلیم تو وہ مکمل کر چکے تھے۔ جب اُنہوں نے ثانوی تعلیم بھی مقرر کر لی تو قدرتی طور پر جامعہ میں داخل ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ بہرحال اُن کا داخلہ لین گراڈ کی جامعہ میں ہو گیا۔ جامعہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے دو علم طبیعیاتِ برقی (Electro - physics) کے شعبہ میں اس فن کی مہارت حاصل کرنے کی درخواست کی اور اس شعبہ میں بھی داخلہ لیا۔ اُنہوں نے اس شعبہ میں اس قدر دل لگا کر اور محنت سے کام کیا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دونوں طلبا کو اس کے "دائرہ طبیعیاتِ برقی" کا بالترتیب صدر و نائب صدر (Chairman and Vice chairman of the Electro physic's Sector) مقرر کر دیا گیا۔ اور اس طرح سے ان کی محنتوں اور تعلیمی ذوق و شوق کی حوصلہ افزائیاں کی گئیں۔ نیز دوسرے طلبا سے اسی دائرہ کے ایک جلسے میں ایک پروفیسر نے اپنے دورانِ تقریر میں کہا کہ ان بچوں کی تعلیمی جد و جہد اور محنت سے سبق لے کر اپنے ملک و قوم کو بامِ عروج پر پہنچاؤ۔"

دوسرا واقعہ جیسا کہ میں سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں ادارہ تعلیمی جمہوریہ اشتراکیہ قزاقستان (Pelagogical institute of U. S. S. R. Kazakstan) کا ہے۔ اس ادارہ کے ایک مقرر نفسیات تھے (Lecturer of Psychology) جو ایک گڈریے کی اولاد تھے اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں اور محنت کی بنا پر اس عہدہ پر پہنچ گئے تھے اور اب پروفیسری کی تعلیم و تربیت پا رہے تھے۔ ان پروفیسر صاحب کی بیوی بھی کسی تعلیمی ہی شعبے میں تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ وہ بھی پروفیسری کی تعلیم و تربیت پا رہی تھیں ان میاں بیوی کو ایک ملازمہ کی ضرورت پڑی۔ اتفاق سے ایک نوجوان کسان لڑکی اُن کی خدمت کو مل گئی۔ یہ لڑکی جاہلِ مطلق تھی۔ پروفیسر موصوف کی بیوی نے اُسے پڑھانا لکھانا شروع کیا۔ اور اُس میں جذبۂ تعلیم کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ اور یہ جذبہ اُس کا اس قدر ترقی کر گیا کہ موصوف کی بیوی سے اجازت لیکر اُس نے ایک مدرسہ شبانہ میں داخلہ لے لیا۔ کچھ دن مدرسہ میں پڑھنے لکھنے کے بعد اپنے اساتذہ کے کہنے سُننے سے اُس نے شعبہ صنعت و حرفت میں بھی داخلہ لے لیا۔ اور اب پہلے سے زیادہ زور و شور کے ساتھ محنت شروع کر دی۔ اتفاق سے پروفیسر صاحب کو حکومت نے کسی سرکاری مشن پر امریکہ بھیج دیا۔ لیکن پروفیسر صاحب نے اپنے جانے سے پہلے لڑکی کو ایک کارخانہ

میں ملازم رکھا دیا۔ پروفیسر موصوف کے جانے کے بعد اُس نے اور زیادہ محنت شروع کردی۔ ادھر تو وہ شب و روز تعلیمی ترقی کررہا تھی اور اُدھر اُس کے کارخانے کے مالکان اُس کے کام سے اس قدر خوش تھے کہ اُسے برابر ترقی کررہے تھے۔ ابھی وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کرپائی تھی کہ اُسے اُس کارخانہ کی ایک رکن (Director) بنادیا گیا۔ لیکن اُس نے رکنِ کارخانہ ہونے کے بعد بھی اپنی تعلیم کو نہ چھوڑا۔ اور بالآخر اپنی تعلیم کو مکمل کیا اور میدانِ صنعت و حرفت میں زندگی کے بامِ عروج پر پہنچی اور آج اپنی زندگی آرام و چین سے گزار رہی ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب سُننے کے لئے غالباً آپ سب بے چین ہونگے۔

سوال یہ ہے کہ تعلیم کے اوپر جو اس قدر روپیہ بہایا جارہا ہے اور ایسی حالت میں سوویٹ روس کی معاشی حالت اور مالی حالت اپنی سطح پر نہیں پہنچی تو یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے یہ سوال معقول ہے۔ لیکن اس کا جواب میں صرف چند سطروں میں دیکر اشتمالی تعلیم کے اصولوں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ یعنی ملک کی تمام اشیا مثلاً تجارت وغیرہ (ذاتی تجارت یا صنعت و حرفت یا کسی قسم کا ذاتی کاروبار کوئی شخص سوویٹ روس میں نہیں کرسکتا) ملکیت ہوتی ہے حکومت کی۔ اور ان تمام سے جو آمدنی ہوتی ہے اُسے سوویٹ روس مختلف طور پر برابر اپنے عوام میں تقسیم کرتی ہے۔ اور انہیں طریقوں میں ایک طریقہ رقم کے ادا کرنے کا تعلیم کے ذریعہ بھی ہے۔

سعدی جعفری

افکار

کچھ دور نہیں ہے وہ زمانہ — بجلی ہوگی نہ آشیانہ
پھر نغمہ ہو کوئی دلبرانہ — دل کے لئے موت ہے زمانہ
تخریب مِری جنونِ تعمیر — تعمیر مِری مدافعانہ
بنیادِ حیات رکھ رہا ہوں — تخریب تو ہے فقط بہانہ
پرواز کر اے اسیرِ گلشن — ہر شاخ ہے تیرا آشیانہ
بجلی جو گرے تو غم نہ کیجئے — سو بار بنے گا آشیانہ
سوتا مجھے دیکھ کر مسلسل — چُپکے سے گزر گیا زمانہ

جودت مِری بُت شکن ہے ساغر
فطرت مِری صرف آذرانہ

ساغر

"ضمیر" اور "مذہب"

آپ کو معلوم ہے کہ ایشیا میں کبھی مذہبی مباحث پر مباحثہ نہیں ہوتا، اس کی سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں مذہبی تحقیق و تجسس کا جذبہ نہیں، جیسا پنڈتوں اور ملاؤں نے بتا دیا اسی کو سچ سمجھ لیا۔ "عبادت" عبد اور معبود کے درمیان گویا ایک تجارت ہے، تاکہ دوسری دُنیا میں موتی کے محل، دودھ کی نہریں، اور .... مل سکیں!

ان مسائل پر اگر ذرا دماغی کاوش کیجئے۔ ذرا آزاد ہو کر سوچئے، تو "متشکک" اور "ملحد" ـــــ اور اس کے بعد کسی کا چمکدار چُھرا۔!! "چھرا" اور "....." ـــــ ہم قافیہ سہی، لیکن پہلا قافیہ انسان کا قافیہ تنگ کرتا ہے اور دوسرا بیچارہ تو محض "قافیہ" ہے!

خیر یہ فقرے یونہی --- ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نسلِ حاضر کے نزدیک دوسرے سیاسی و اقتصادی اور علمی و ادبی مسائل اس قدر ہیں کہ انہیں سے --- عہدہ برا ہونا تقریباً ناممکن ہے اسی لئے ایشیا میں عمداً میں مذہبی مسائل کو نہیں چھیڑتا۔ کیونکہ اس قسم کے مباحثہ میں تعمیر سے زیادہ تخریب کا امکان ہے اور تخریب، اس نہج سے مجھے منظور نہیں!

لیکن محترمہ جاوید صاحبہ کا مضمون جن کی عزت میں بواجی کی طرح کرتا ہوں اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے! ہر چند کہ یہ نہایت مدلّل و مبسوط ہے، تاہم یہ نئی بحثوں کا آغاز کر سکتا تھا۔ لیکن نئی بحثوں کا آغاز نہیں کیا گیا۔

ساغرؔ

آج کل اکثر رسائل میں شکوک سے لبریز اور ملحدانہ خیالات سے مملو مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک مضمون "ہمایوں" اکتوبر نمبر ۳۹ء (برٹرینڈ رسل کے ایک مضمون کا ترجمہ) بعنوان "گناہ کا احساس"، اور ایک مضمون "اخلاق اور مذہب" کے عنوان سے میرٹھ کے رسالہ "ایشیا" کے جنوری، فروری، اور مارچ ۳۹ء کے سہ ماہی نمبر میں میری نظر سے گزرا، ـــ مجھے ان مضامین کے بعض حصوں سے اصولاً اختلاف ہے۔ بہت اچھا ہو کہ ناظرین کرام مطالعہ کے وقت مذکورہ مضامین کو سامنے رکھیں۔

رسل کے نزدیک "ہر وہ آواز جو انسان کے باطن سے بلند ہوتی ہے ضمیر کی آواز ہے" اور علاوہ اسکے اسی مضمون میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر ملکے و ہر رسمے کی طرح ہر ملک کے انسانوں کے ضمیر کی آواز بھی مختلف ہوا کرتی ہے۔ میرے نزدیک رسل کے یہ دونوں مفروضہ نظریے غلط ہیں، حقیقت یہ ہے کہ انسان کے باطن سے آنے والی ہر آواز ضمیر کی آواز نہیں ہوا کرتی، دوسرے ضمیر جس شے کا نام ہے اس کے اصول ہمیشہ اور ہر حالت میں اٹل ہیں، تمدّنی ضوابط، انسانی خواہشات اور اختلافِ ماحول سے متاثر ہو کر تبدیل نہیں ہو سکتے، دراصل ضمیر کے اصول کیا ہیں، اور اس کی آواز مخصوصہ کے پرکھنے کا معیار کیا ہو سکتا ہے؟ ان امور پر روشنی ڈالنے سے پیشتر ہم ضمیر کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کرینگے۔

ـــ ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

بہرحال و بہر صورت یہ امر تسلیم شدہ ہے، انسان اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ بغیر اپنے ایما، کے پیدا ہوا یا کیا گیا ہے، اور اسی طرح اس کی صنفی عظمت بھی غیب کی عطا ہے، گویا حاصل کلام یہ کہ انسان اپنے خلق ہونے کی حد تک اصول جبر کے ماتحت تھا، منکرین ہستیٔ باری تعالیٰ کا کہنا ہے، یہ کسی ارادے کی کارفرمائی نہیں بلکہ طاقت اور مادّے کے اتفاقیہ باہمی امتزاج کا نتیجہ ہے تھوڑی دیر کے لئے ہم ان کے اصول کو مانے لیتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس ان سوالات کا کیا جواب ہے، جبکہ طاقت اور مادّہ دونوں بے ارادہ تھے اور ازل سے ان کا باہمی امتزاج ہی قسم قسم کی اشیاء پیدا کرتا چلا آتا تھا، تو کیا وجہ ہے کہ جنس انسانی کے خلق ہو جانے کے بعد طاقت اور مادّے کا یہ ترکیبی سلسلہ ختم ہو گیا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو آخر کیوں! اور اگر نفی میں ہے تو وہ کونسی نئی اشیاء اور نئی صورتیں ہیں، جن کو طاقت اور مادّے کا امتزاج اب پیدا کیا کرتا ہے؟ موجودات کی ہر شے کی افزائش کا طریقہ تو اب دوسرا ہے، وہ نہیں جو کسی شے کی پہلی آفرینش کے وقت استعمال میں آیا ہوگا، دوسرے یہ کہ جبکہ ارادہ، ادراک، ذہن اور شعور کا وجود تھا ہی نہیں تو انسانی جسم میں یہ عجوبۂ روزگار شے پیدا کس طرح ہوئی، آخر یہ کس بنا پر مان لیا جائے کہ ایک بے ارادہ شے ایک مدرک اور بالاشعور ہستی کی تخلیق کی متحمل بھی ہو سکتی ہے چنانچہ میں کہوں گی کہ نئی اشیاء کی پیدائش اور موجودہ اشیاء کی آفرینش کا ایک خاص نقطے اور وقت پر پہنچ کر مسدود ہو جانا، اور ایک اور محض ایک جنس میں ارادے اور ذہن وغیرہ کا پیدا ہو جانا بیّن دلیل ہے اس امر کی کہ اس نظام عالم کے پس منظر ایک زبردست ارادہ کارفرما ہے، اور اس ارادے کو جو کچھ بھی طریق اوّلین پر پیدا کرنا مقصود تھا، جب ہو چکا تو آئندہ افزائش اور پیدائش اشیاء کائنات کیلئے وہ دوسرے طریقے رواج پائے جن کی سازگاری کا زیر ارادۂ طاقت مخفی پیشتر ہی سے انتظام ہو چکا تھا۔

اسکے علاوہ ایک گروہ وہ ہے جو وجود ہستیٔ پروردگار کا مع اس کی غیر فانی صفات و ذات کے قائل ہے، مگر حیات بعد الموت کا منکر، اور اسی کے ساتھ ساتھ دنیا کے مذاہب کے قوانین کو خدا کا ترتیب کردہ نہیں بلکہ دماغ انسانی کا ساختہ سمجھتا ہے۔ "ایشیا" کے مضمون حوالہ شدہ میں متشککانہ خیالات سے اسی موضوع پر بحث کی گئی ہے، چنانچہ اس جگہ سب سے پہلے ہمارا موضوع بحث حیات بعد الموت ہوگا، اس مسئلے کے ثبوت میں اگر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو وہ انسان ہی کی تخلیقی نوعیت ہے، غور کیجئے انسانی ہیولیٰ یعنی مادائی نفس کو اگر فانی مان لیا جائے، تو اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ موجودہ صورت میں آنے سے پیشتر فنا نہیں ہو گیا، جبکہ اس سفلی عالم میں اسکے اقدامِ ارتقار کی انتہا ہو چکی تھی! مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ بالعوض اسکے کہ وہ فنا ہو جاتا، اب وہ میدانِ علویت اور روحانیت میں گامزن ہے، اور ارتجاعِ علویت نے اسکے اندر جو تغیر پیدا کر دیا ہے اسکے اثر سے وہ ارادہ، ادراک، ذہن اور شعور رکھنے والی مافوق الکائنات شے بن چکی ہے، اور فی الحال میدانِ علویت میں یہ اس کا پہلا قدم ہے جو اس کے لئے محض ابتداء سفر کا حکم رکھتا ہے، چنانچہ بہ ایں صورت یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان جیسی اہم جنس فنا ہو سکے گی یا کر دی جائے گی، سیاق اور سباق کیا چاہتا ہے، یہ کہ اگر نفس لاشعور کو قدرت، عالمِ سفلیت کے تمام مراحل طے کرنے کی فرصت دے سکتی ہے تو اب نفس بالاشعور کو بھی علویت کے تمام مرحلے طے کرنے کی

....

.... اجازت اور فرصت دی جانی چاہیے۔ حاصل کلام یہ کہ انسانیت کم از کم اس وقت تک فنا نہیں ہو سکتی، تاآنکہ وہ تمام مراحل روحانی طے نہ کر لے، اور موت! موت محض جوہر نفس کو زیادہ روشن، واضح مستحکم اور ترقی یافتہ صورت میں تبدیل کرنے کیلئے طاری کی جاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح جیسے کہ تخم پودے کی صورت میں تبدیل ہونے سے پیشتر اپنی شکل و ہیئت معدوم کر دیا کرتا ہے۔

ماسوا اسکے آئیے! انسان کی تخلیقی نوعیت کو انضمادات کے آئینے میں میرے زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھئے، زندگی، خواہش نفس ناطق، پیدائش، اور فنائیت جیسے عینی واقعات، اور انسان کی ذہن، شعور اور ادراک، ارادے جیسی صنفی خصوصیات کو

۴۳

سامنے رکھتے ہوئے انتہائی غور وفکر کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچی ہوں وہ یہ ہے کہ فطرت اپنی صفت بے نیازی کی ضد کو منصۂ شہود پر لانے کے لئے مصروفِ عمل ہے، جو فی الحال غیر مکمل حالت میں ہے۔ آپ ثبوت چاہیں گے، دیکھئے میرا نظریہ جداگانہ مفہوم رکھنے والے دو فقروں پر مشتمل ہے، چنانچہ میں پہلے بجائے پہلے فقرے کے دوسرے فقرے کے ثبوت میں دلیل پیش کروں گی، اگر میں یہ سوال کروں کہ انسان! جو ماحصل ہے اپنے صانع حقیقی کے اس صنعتی پھیلاؤ کا، آیا خدا کی ہستی جس کو کہ ہم رحیم وکریم مانتے ہیں اس کی ہر خواہش اور آرزو کو پورا کر دیتی ہے؟ تو یقیناً میرے اس سوال کا جواب آپ کی جانب سے نفی میں ہوگا، پھر خدا کے اس فعل کو اگر ہم اسکے جذبات معبودیت اور حاکمیت پر مبنی سمجھ لیتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی دیکھنا ہے کہ آیا صانع مطلق وہ تمام چیزیں جو مکمل قدرت ہستی ہونے کی حیثیت سے اسکے شایان شان ہو سکتی تھیں پیدا کر چکا ہے! جواب یہاں بھی نفی ہی میں ہوگا۔ گویا موجودہ صورت میں قدرت کی صنعت گری، اور دوسری طرف اس کے تخلیقی ماحصل کے جذبات طلب اور خواہش دونوں تشنۂ تکمیل ہیں، چنانچہ فطرت کی صفت عطا اور اس کی تخلیقی خامی کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ قدرت موجودہ اشیاء سے بہتر چیزیں پیدا کرنے سے قاصر تھی، دوسرے یہ کہ خدا کی ہستی حریص ہے، اور اس حد تک حریص ہے کہ وہ اپنی صنعت گری اور بخشش کی تشنگی کو تو گوارا کر لیتی ہے مگر انسانی خواہشات کی آسودگی کو کسی نہج منظور نہیں کر سکتی، لیکن قطع نظر اسکے جب ہم یہ دیکھتے ہیں، وہ پس پردہ ہستی جو انسانی جنس کو بلا اس کی طلب کے اپنی یکتائے روزگار صفات کا حصے دار بنا لیتی ہے، حریص اور خسیس تو کسی طرح بھی نہیں کہی جا سکتی! تو ہم لاجواب ہو جاتے ہیں اور علاوہ اسکے ہم بمقابلہ اس عالم ہست کے نظامِ شمسی کی پائداری کو دیکھتے ہوئے نہیں کہہ سکتے کہ خدا موجودہ اشیاء سے بہتر اشیا خلق نہیں کر سکتا تھا۔ گویا سوال وہیں کا وہیں رہا۔ پھر آخر یہ تشنگیاں اور ناکامیاں بے سبب ہیں؟ نہیں! بلکہ ایک زبردست دلیل ہیں اس امر پر کہ قدرت بربنائے مصلحت تدریج سے کام لے رہی ہے۔ اور اس سے ثابت ہے کہ انسان اور کائنات کے متعلق خلاقِ عالم نے جو اسکیم ترتیب دی ہے، وہ فی الحال نامکمل حالت میں ہے۔

اب آپ میری رائے کے پہلے حصہ کو لیجئے، یہاں بھی میں بطور دلیل انسان ہی کی ہستی کو پیش کروں گی دیکھئے! انسان چند ایک ایسی صفات کا حامل ہے جو ہم کو دیگر جانداروں میں نظر نہیں آتیں اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ انسان کی مخصوص صفات ہماری مادی آنکھوں سے پنہاں اُس ہستی کی صفات کے مشابہ ہیں جو اس دنیا کا خالق و مالک ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کی مخصوص صفات اس کی اپنی حاصل کی ہوئی ہیں، یا اسکے خالق کی ارادتاً دی ہوئی! چنانچہ اگر ہم اکتسابی مانتے ہیں یعنی لازمۂ زندگی، تو زندگی رکھنے والے تو اور بھی ہزارہا جاندار موجود ہیں، مگر وہ ان صفات کا اکتساب کیوں نہیں کر سکے اس لئے ہم اس بات کے تسلیم کر لینے پر مجبور ہیں کہ کائنات سے مافوق الصفات خصوصیتیں انسان کی اکتساب کردہ نہیں بلکہ انسان کی صنف میں خدا کی ارادتاً ودیعت کی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ کنہ علویت کی اس مخصوص ودیعت نے کون کون سی خصوصیات انسان میں پیدا کر دی ہیں، چنانچہ اس حد تک جس حد تک کہ کثافت کی شرکت اجازت دے سکتی تھی، انسان مثل خدا کے سوچ سکتا ہے، یاد رکھ سکتا ہے، خلق کر سکتا ہے اور عزم وارادے پر بھی قابض ہے وغیرہ وغیرہ، پھر جبکہ حقیقت یہ کچھ ہے تو کیا انسان کو بھی خدا کی ہستی کا مثل مان لیا جائے؟ نہیں! اگرچہ خدا اور انسان میں ایک حد تک صفاتی یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن باوجود اسکے بھی انسان اور اسکے پروردگار میں بعد المشرقین موجود ہے، اگرچہ ربِّ کائنات ذہن رکھتا ہے اور ایک حد تک ذہنی صفات انسان میں بھی موجود ہیں، اسی طرح خدا سوچ سکتا ہے، اور انسان بھی، وہ خلق کر سکتا ہے، اور ایک نوعیت سے انسان بھی، وہ ذات ارادے کی مالک ہے اور ایک مقررہ حد تک انسان بھی، مگر! باوجود اس بنیادی مشابہت کے یہی بنیادی صفات ہم کو ہر دو جگہ بہ ضدین کی شکل میں کام کرتی نظر آتی ہیں، ایک جگہ یعنی حریم علویت پروردگار کی ہستی کے ساتھ اس کی ذہنی وشعوری استعداد نہ اپنے لئے کچھ سوچتی ہے نہ خلق کرتی ہے اور نہ ارادہ کرتی ہے، اور دوسری جگہ

یعنی قفس سفلیت میں ذہنی شعوری اور ارادے کی استعداد کے
افعال و فوائد سے انسان خود مستفیض ہوتا ہے، گویا خالقِ اکبر پیدا
کرتا ہے، لیکن ہر شے کے تصرف سے قطعی بے نیاز ہے، مگر انسان
کی ہستی اپنی ترتیب کردہ اشیاء کے علاوہ خدا کی کروڑوں پیدا کردہ چیزوں
کو بھی تمام و کمال صرف میں لانے کی اہل ہے، اور اب بھی تشنہ کام
و تشنہ آرزو، چنانچہ استعدادِ ذہن، شعور، ادراک اور ارادے
کے اس اختلاف کار۔ نے انسان کی ہستی کو مقابلۃً خالق اکبر کی ہستی
کے اضداد کی شکل میں لا کر کھڑا کر دیا ہے، وہ ہستی بے نیاز ہے اور
انسان مجسمۂ نیازمندی، وہ صانع محض ہے اور انسان خریدار مطلق
وہ ناز ہے انسان نیاز، وہ کنز ہے انسان امانت دار، وہ مطلوب ہے
اور انسان طالب، انسان کی یہی وہ صنفی، خلقی اور عملی حیثیت تھی
جو مجھے اپنی رائے کے ثبوت میں پیش کرنا تھی۔

اب اگر کوئی سوال اُٹھایا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے، خدا کو
اپنی کسی صفت کا تضاد پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بلاشبہ یہ
سوال ایک اہم سوال ہے۔ احدیت مآب خدا جمیع صفات اور بے مثیل
صانع تھا، لیکن خود قطعی طور پر بے نفس اور بے نیاز، ظاہر ہے کہ
اس صورت میں صانع حقیقی کی صنعتوں کا خریدار ہی نہیں، بلکہ اس
کی صفات دیگر کے بر ماد دینے والا بھی کوئی نہیں تھا، چنانچہ اس جمود
کے خلاف خدا کی صفتِ عطا و بخشش اس کی صفتِ خالقیت
پر ایک ایسی بالاشعور ہستی کے خلق کرنے کے لئے مقتضی ہوئی، جو
اپنے اندر صانع مطلق کی پیدا کردہ نعمتوں کو تمام و کمال صرف کرنے
کی اہلیت و صلاحیت رکھتی ہو، اس خلا کو اگر کوئی شے پُر کر سکتی تھی،
تو وہ خواہش اور طلب کی تخلیق تھی، چنانچہ حریم ذات یوں اپنی
بعض صفات کے تقاضوں پر تخلیقِ عالم کیلئے مجبور ہوئی۔ اور جنس خواہش
اور آرزو، نفس عرف یا زندگی کے نام سے پیدا کی گئی، یہ ابتدا تھی اس
شے کی جو صنفِ انسانی میں تکمیل کو پہنچنا تھی، اب چونکہ ایک بے شعور
یا محدود شعور رکھنے والا نفس خواہش بالصنفت کے محدود دائرے
کے اندر رہتے ہوئے محض چند ایک معمولی قسم کی اشیاء سے بہرہ اندوز
ہو سکتا تھا۔ اس لئے لازم ہوا کہ حدودِ نفس یا خواہش کا دائرہ وسیع
سے وسیع تر کر دیا جائے اور اس کی تشکیل کے لئے ضروری تھا کہ
ربِّ اکبر اپنی خصوصیات کے مثل صفات سے کسی صنف کو متصف
فرمائے، چنانچہ وہ تکمیل شدہ جنس بشکل انسان پیدا ہے، اور ہم
بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ انسان! بلحاظ اپنی بعض صفاتی خصوصیات
کے ہستیٔ پروردگار کے مشابہ، اور بلحاظ اپنی اضدادی خصوصیات
کے حریم ذات کی ضد کا حکم رکھتا ہے اور اس طرح انسانی ہستی کو ایک
اہم حیثیت حاصل ہو گئی ہے، چنانچہ اس مشہودہ اور عملی دُنیا میں
ایک طرف انسان کی ہستی حریم ذات کے نمو کی ذمہ دار اور آئینہ دار
ہے اور دوسری جانب اُس بے مثل صانع کی صنعتوں کی خریدار اور
صرف میں لانے کی واحد اجارے دار ہے، اور یہی وہ حقیقت آفریں
نقطہ ہے، جو ہم پر اس رازہائے سربستہ کا انکشاف کر دیتا ہے، انسان
کی ہستی اپنے خالق کی ہستی کے لئے شئے لازم کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے،
خدا کی ہستی غیر فانی ہے، چنانچہ انسان کو اس کی ہستی کا لازمہ مان لیجئے
فطرت نما آئینہ تصور کر لیجئے، خدا کی ہستی کا تضاد جان لیجئے اور [illegible]
فطرت کو بر مانے اور مصروف رکھنے کا اجارے دار سمجھ لیجئے بہ حال و
بہر صورت اس جنس کو بھی غیر فانی ماننا پڑے گا، یوں وہ ہستی جو خلق کنندہ
ہے ہر شئے مشہودہ اور غیر مشہودہ کی اس امر کی مختار اور مجاز ہے کہ [illegible]
نقطے سے یا جس طریقے سے اس نے یہ بھید پھیلایا ہے اسی طرح
سمیٹ کر ہر شے کو معدوم کر ڈالے، لیکن ایک وہ ہستی جو عالم اسباب
ہوا ایسا ارادہ کر ہی نہیں سکتی تھی جس کی تنسیخ کی ضرورت پیش آ سکتی،
اس لئے حقیقت یہ ہے کہ جو بن چکا ہے، وہ اب مٹ نہیں سکتا۔

یہاں قدرتی طور پر ایک سوال اور پیدا ہو جاتا ہے، اگر خدا کی ہستی
کامل القدرت تھی تو تدریج سے کام لینے کے کیا معنی یعنی انسان ایک
ہی دفعہ میں مکمل ترین صورت میں کیوں پیدا نہیں کیا گیا! دیکھئے جنس
خواہش کی تخلیق کیلئے مکان، زمان اور شہود کا خلق کرنا لازمی تھا اور اسی طرح ہر مکان و
زمان اور شہود کیلئے متضاد الطرفہ ہونا لابدی، چنانچہ انسان جس شکل میں بھی پیدا کیا جاتا، اس اعمال و
خیال سے بہر صورت یہی صورت حال پیدا ہوتی تھی۔ جواب پیدا ہے
اس لئے اجسام طلب بالاشعور کو تبدیلِ ہیئت یعنی موت سے مستثنیٰ
کر دینے، اور ان کی ہر خواہش کی تکمیل کا ذمہ لینے سے پیشتر قدرت پر

فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ انسانوں کو ایک فانی دُنیا میں پیدا کر کے اپنی اپنی اخلاقی اور علمی قدریں قائم کرنے کا موقع عطا فرمائے، ورنہ دوسری صورت کرو ڑہا.... انفاس کے مفاد، اور سکون قلب کے سخت منافی ثابت ہوتی اور ظاہر ہے کہ یہ امر قدرت کے اصول عدل و انصاف کے خلاف تھا، اسی وجہ سے اس مرتبہ محض طلب و خواہش کا دائرہ وسیع کرنے پر اکتفا کی گئی، دوسرے یہ کہ خدا کی ہستی اپنے اصول کے مطابق ہر نفس کو مساویانہ طریقے پر مستفید اور فیضیاب کرنے کی خواہشمند ہے، اس لئے بجائے اسکے کہ وہ خود انسانوں کے مراتب مقرر کرتی اس نے اس امر کا انحصار خود انسان کی پسند اور کوشش پر رکھ دیا ہے، ورنہ بصورت دیگر جنس انسانی خالق اکبر پر اپنے مراتب کے بارے میں معترض ہو سکتی تھی، اور بصورت موجودہ اس قسم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور ہاں! خدا پر انسان کے مستقبل کے بارے میں جو فرض عائد ہوتا تھا اس کا بدرجۂ احسن انتظام کر دیا گیا ہے، جس کی تفصیل ذیل میں کسی دوسری جگہ آئیگی۔

سطور بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو اصل بحث کی تمہید سمجھنا چاہیئے۔ اصل مضمون یہاں سے شروع ہوتا ہے، اگر مجسمۂ انسانی کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی ہستی میں مادّی جسم، زندگی، یعنی جان کے علاوہ ایک اور لطیف عنصر بھی شامل ہے جس کو "روح" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، چنانچہ انسان کے دونوں مذکورہ بالا عنصر تو ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔ ہم اس وقت صرف روح کے متعلق بحث کرینگے، روح کیا ہے محض صفات اربعہ کا مجموعہ، ادراک، ذہن، ارادہ اور شعور، اس جگہ ایک حقیقت کا انکشاف بھی ضروری ہے، قاعدۂ کلیہ کے مطابق ہر شے موجود اور مشہود محتاج اور دو رخوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے، اسی طرح اگرچہ روح انسانی کلیہ کے مطابق چند لا احتیاج صفاتِ غیر مرئی پر مشتمل ہے، لیکن چونکہ قالبِ روح شئے مشہودہ ہے، اس لئے روح اپنے فعل کی حیثیت سے اس جگہ یعنی اپنی عنصری عمل گاہ میں دو رُخی ہو جاتی ہے، یعنی ایک روح کا خِلقی اور مخرجی رُخ ہے اور دوسرا منزلی اور عملی، ......

.... اسی طرح روح کا مخرجی رُخ اس کا رُخ اوّلین ہے، اور منزلی رُخ، رُخ ثانی، چنانچہ انسان کی روح کے رُخِ اوّلین کی وہ طاقت جو انسان کی روحانی قدر و قیمت اور اسکے توازن اور عدم توازن کے احساس کو انسان کے شعور میں لانے کی ذمہ دار ہے، اس کا نام ضمیر ہے، یا پھر یوں سمجھ لیجئے کہ ضمیر نام ہے اُس مشیتی برقی سلسلے کا، جو حریم ذات اور اسکے حکم سے ترکیب پانے والی روح کی اس شعوری استعداد کے درمیان قائم ہے جو انسانوں کو تقسیم ہے۔

یہ ضمیر کی صنفی تعریف تھی، اب ہم یہ دیکھیں گے، ضمیر کے اصول کیا ہیں، اور کیا ہو سکتے ہیں، صانع حقیقی کی مشیت کم از کم اس دُنیا کے لئے آجتک وہی ہے جو روز اوّل اس عالم اور اس میں پیدا کی جانے والی اشیاء کے لئے اس نے مقرر کر لی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شے کا مذہب اور اس کا کلیہ کبھی تبدیل نہیں ہوتا اور نہ کوئی دنیوی طاقت ایسا کرنے کی مجاز ہے، مثلاً آپ پھٹکری کی خاصیت کو پھٹکری سے جدا نہیں کر سکتے، بعینہٖ اسی طرح روح انسانی کے اصول یا دوسرے لفظوں میں مشیتِ پرور دگار انسان کیلئے قطعی طور پر لاتبدیل چیز ہے اب خواہ ماحول جُدا ہو، قومیت دوسری ہو، تہذیب و تمدن میں فرق ہو لیکن انسان ہر جگہ انسان ہے۔ اسی روح کا حامل! جو جنس انسان کے لئے ایک مرتبہ ترکیب پا چکی ہے، میرے اس دعوے کا ثبوت آپ انسانیت کے عمرانی آئینے میں دیکھئے، ابتداء آفرینش سے آجتک ہر زمانہ ہر ملک اور ہر طبقہ کے انسانوں کے اصول تسلیمیہ آپ کو وہی نظر آئیں گے، تہذیب، تمدن، زبان، ذوق ہر شے عموماً تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن انسانیت کے اصول تسلیمیہ وہی ہیں، وہ تفریق قبائلی رسمیات سے متاثر ہو کر بحیثیت مجموعی یا انفرادی کبھی تبدیل نہیں ہو سکے مثلاً رحم و کرم، محبت، شفقت، ہمدردی، عدل، انصاف، جذبات مساوات اور حق گوئی جیسے اصول اپنے مخصوص اوزان کے ساتھ ہر جگہ انسانیت کے سچے اصول تسلیم کئے جاتے ہیں اور کئے جاتے رہے ہیں، تاریخ کسی ایسے زمانے کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، جس میں انسانوں نے اجتماعی حیثیت میں برخلاف ان حقائق کے نفس کی گمراہیوں کو حق تسلیم کیا ہو، ایک بدکردار سے بدکردار نفس کے نزدیک بھی یہ حقائق، حقائق ہی کی صورت میں تسلیم ہیں، عملی صورت خواہ اس کی کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر وہ فطرۃً خود کے مقابلے میں دوسروں کی جانب سے افعال علویہ ہی کے مظاہرے کا خواہشمند ہوتا ہے، علاوہ

اس کے معصوم بچوں کو آپ ہمیشہ افعال علویہ کا عامل پائینگے، واقعات
کی یہ کسوٹی ساغر صاحب نظامی کے اس قول کو غلط ثابت کرتی ہے
"برائی اور بھلائی میں تمیز کرنے والا ضمیر بھی بچپن ہی سے ایک خاص
ماحول میں پرورش پاتا ہے، اور اس کی بری اور بھلی سیرت بھی اسی
ماحول سے بنتی ہے" لیکن آخر معصوم بچے کس تربیت کے زیر اثر سچ
بولا کرتے ہیں؟ جبکہ گندے سے گندے ماحول میں پرورش پانے
والے بچوں کو بھی ہم سچ بولتا ہوا پاتے ہیں،" چنانچہ برخلاف اسکے
واقعات اور مشاہدات جو ثبوت لاتے ہیں وہ اس حقیقت پر مبنی
ہیں، روح انسانی کا رخ اولین ان حقیقت آفریں صفاتِ علویہ سے
تعمیر ہے، جو صفات حریم ذات کا حصہ ہیں، اور اسی طرح وہ صفاتِ
عالیہ جو دنیا بھر کے انسانوں کے نزدیک اجتماعی اور انفرادی ہردو
حیثیت سے مستند ہیں اور انسان کی دنیائے عمل میں جن کا استعمال
زریں اصولوں کے نام سے کیا جاتا ہے، وہ اصول روحِ انسانی
کے اصول صحیحہ ہیں۔

چنانچہ انسانیت کا ہر نمونہ طبعاً اور خلقاً استعدادات و
خصوصیات روحانی کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، خارجی اثر سے
نہ کوئی استعداد پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ مٹائی ہی جا سکتی ہے، تربیت
اور ماحول ایک حد تک اثر انداز ضرور ہو سکتے ہیں، مثلاً ایک اچھا
ماحول عارضی طور پر صفات عالیہ کے اظہار کے مواقع پیدا کر دیتا ہے
اور اچھی تربیت بھی! لیکن تاوقتیکہ انسانیت کا ہر نو عمر نمونہ ذاتی
غور و فکر کے ذریعے کسی امر کی معنوی حیثیت سمجھ لینے، اور اپنی فطرت
کے حقائق کی روشنی میں آپ اپنی اخلاقی دنیا بنا لینے کے قابل نہیں ہو جاتا،
خارجی اثرات کمزور رہتے ہیں۔ اکثر اور بیشتر تربیت اور ماحول کے نقوش
مٹ کر دوسری شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم بعض نیک سے نیک
والدین کی اولاد کو بدکردار، اور بعض بدخصائل والدین کی اولاد کو نیک
دیکھتے ہیں۔ میں اگرچہ تربیت کے خلاف نہیں لیکن یہ ضرور کہونگی کہ تربیتِ
صحیحہ وہی ہو سکتی ہے جو بچے کو عادتاً نیک بنا دینے کے بجائے اس کے
ضمیر کی طاقت کو فروغ دے سکے، اور ہر امر کی حقیقت بچے کے ذہن
نشین کر سکے، چنانچہ تربیت کو ہم خارجی اثر کہہ سکتے ہیں، لیکن نیکی کی اصل

وہی خاصۂ مشیت ایزدی ہے، جو انسان کی ہستی میں اس کی روح کے ذریعے
شامل ہے، اب آپ انسان کی اس طبعی استعداد کو فطرت کی تربیت کہئے

. . . .

. . . . مشیتِ
خالق سمجھئے، اور یا پھر انسانیت کے اجتماعی یا انفرادی مذہب پر محمول کیجئے
بہر حال یہی وہ انسان کا حقیقی اور فطری مذہب ہے جس کے اصولوں
کی شرح کو انسان کے شعور میں لانے کے لئے ضمیر کی طاقت مقرر ہے۔
چنانچہ حقائق کی خلاف ورزی یعنی بر موقع عدم قیام توازنِ صفاتِ
روحانی، مجانب ضمیری طاقت تنبیہ کا احساس ہونا، اور مابعد ان
روحانی اوزان کے فقدان کے تدارک کیلئے سچائی اور حقیقت کی جانب
مراجعت کی ترغیب دینا ایک امر جبری ہے۔ گناہ کا احساس کیجئے یا نہ
کیجئے، بے اختیارانہ طور پر اس کا احساس ہوگا[1]۔ انسان کے رخ ثانی یعنی
اس کی نفسانی طاقت ضمیر کی آواز کی اس پیدائش کے انسداد سے
قطعی قاصر ہے، جس طرح خواہش کرنا انسان کے رخ ثانی کی خصوصیت ہے
اور ضمیر آرزو اور طلب کی پیدائش کو روکنے کا مجاز نہیں، بعینہ اسی طرح
شعور کے ہر فیصلے کے درست اور نادرست ہونے کے متعلق عادلانہ اور
منصفانہ طریقے پر احساس پیدا کر دینا ضمیر کی خصوصیت ہے۔

اگرچہ ضمیری اور نفسانی دو برابر کی زبردست طاقتیں ہیں، مگر
انسان کے ادارۂ شعور سے اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرنے کی مجاز نہیں، ہر
امر کے متعلق فیصلہ صادر کرنا انسان کی شعوری طاقت کا کام ہے، اور
انسان کے شعور کا یہ مختارانہ تصرف ہی وہ چیز ہے جو اس کو اپنے ہر فعل
کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے، ہاں! ان ہر دو طاقتوں کی طرف سے اپنے مشوروں
اور ضرورتوں کے خلاف فیصلے کی صورت میں، بطور تنبیہ، احتجاج اور

---

[1] اس کی وجہ ضمیر کو کیوں مانا جائے — !؟ گناہ کا احساس ماحول کے
خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ ماحول ہمیں یہ بتاتا رہا ہے کہ گناہ خلافِ اخلاق
عمل ہے اس لئے ہم اس کی خرابی کا احساس کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں کوئی
ماحول ایک صدی تک گناہ کی تائید میں تربیت دے تو ہم حسن گناہ کا احساس
کرنے لگیں گے۔ اس لئے ضمیر ماحول کی مخلوق ہے۔ نہ کہ کوئی دوسری طاقت
ساغر

انتقام ومکافات فیصلہ یا عمل کا سلسلہ ضرور شروع ہو جاتا ہے۔ میں یہاں
ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعہ اس امر پر مزید روشنی ڈال دینا چاہتی ہوں
مثلاً نفس، فقدانِ طاقت کے خوف سے بطور حفظ ما تقدم ضرورتِ خوراک
کے احساس سے شعور کو خبردار کرتا ہے، اب اگر شعور اس احساس کے حق
میں فیصلہ نہیں کرتا، اور قالب کو خوراک نہیں پہنچتی تو انسان کی جسمانی
طاقت جواب دینا شروع کر دیتی ہے، اور نفسی طاقت کوفت اور بے چینی
کا اظہار کرتی ہے، یہ گویا انسان کی نفسانی خودی یا نفسی قوتِ ارادی
کا اپنے مشورے پر متوجہ نہ ہونے کے خلاف احتجاج یا شعور کے طرز
عمل کی سزا ہو گی، اسی طرح جب انسان اپنی روحانی صفات کا غلط
استعمال کرتا ہے تو ضمیر یا بہ الفاظ دیگر اس کی روحانی خودی کے
احتجاج یا تنبیہ کا احساس انسان کے سینے میں ایک زبردست دھکے
کی صورت میں ہوتا ہے اور انسان کے رُخ اوّلین کا حسّی ادارہ اضطراب
اور بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔ اور یہ حالت اس وقت تک طاری رہتی ہے
تاوقتیکہ انسان کا شعور اپنے مجرمانہ فعل پر متاسف نہیں ہوتا، اور آئندہ
کے لئے محتاط رہنے کا عزم نہیں کر لیتا، انسان کے اس روحانی مدوجزر
کو زہد اور مذہب کی زبان میں احساس گناہ، ندامت، اور توبہ کے نام
سے پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ میرے اس بیان سے رسل کے اس قول کی تردید
ہو جاتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں "گناہ کا احساس بہتر زندگی پیدا کرنے کی بجائے
آدمی سے اس کی خوشی کو چھین لیتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو ذلیل سمجھنے
لگتا ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر کہوں گی، گناہ کے احساس کا پیدا ہونا ایک امر
جبری ہے اختیاری نہیں، کہ انسان اسکے احساس کو روک سکے، بقول رسل
"اگر کوئی آدمی مضطرب ہے، یا وہ اپنی نظروں میں ذلیل ہے تو اس کے
یہ معنی نہیں کہ اس نے خود ذلالت کا احساس پیدا کر لیا ہے" بلکہ یہ ثبوت
ہے اس امر کا کہ اس کے کسی قول وفعل سے اس کی روح کے رُخ اوّلین
کا توازن خراب ہو گیا ہے، اور ودیعت شدہ قدرتی طاقت ترغیب دے رہی
ہے کہ وہ اپنے افعال کا جائزہ لے کر اپنے صفاتی توازن کو درست کر سکے
پھر جس طرح چند روز غذا نہ کھانے سے بھوک معدوم ہو جایا کرتی ہے بعینہٖ
اسی طرح ضمیر کی آواز پر پیہم عدم توجہی، ضمیر کی آواز کو بھی کمزور اور پژمردہ
کر دیا کرتی ہے، نتیجۃً جبکہ غذا کے عدم استعمال سے ایک دن جسدِ انسانی پر

موت کا طاری ہو جانا یقینی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلسل گناہگارانہ
زندگی بسر کرنے سے انسان کا جوہرِ روحانی قریب المرگ نہ ہو جائے
لیکن! تاہم جبتک انسان زندہ رہتا ہے اس کے افعال کی ہیئت کے
تبدیل ہو جانے کا احتمال اور امکان باقی رہتا ہے، چنانچہ اس قسم کی
صدہا مثالیں دُنیا میں موجود ہیں۔

سطور بالا میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ ضمیر کے اصول ہر جگہ ایک
اور ہر حالت میں نہ تبدیل ہو جانے والے ہیں اور اسی طرح اس کی آواز
بھی اپنے اٹل اصولوں کی بنا پر ایک ہے۔ رسل لکھتا ہے "مختلف ملکوں
میں ضمیر کا حکم بھی مختلف ہوتا ہے" لیکن! اختلاف رکھنے والے احکام
اور آواز ضمیر کی نہیں، بلکہ یہ جداگانہ ماحول رکھنے والی اقوام کے نفس کی
آواز ہوا کرتی ہے جو بر بنائے اختلاف رسمیات، تہذیب و تمدن اور آب
ہوا کے بعض فروعی معاملات میں مختلف خواہشات اور آرزوئیں رکھنے
پر مجبور ہیں۔ ورنہ انسان تو بالآخر ہر حالت میں ایک ہی وزن کی روح
اور نفس رکھنے والے مجسمے کا نام ہے، اس لئے بُنیادی اختلاف غیر ممکن!
ضمیر کی آواز کو متمیّز کرنے کے بارے میں، میں یہاں دو عالمگیر اصول بیان
کروں گی۔ اوّل وہ آواز ضمیر کی آواز ہو سکتی ہے، جو انسان کی راہبری
افعال علویّہ کی جانب کرتی ہو، اور افعال علویّہ وہ ہیں، جو دُنیا کے ہر طبقے
اور ہر قوم کے انسانوں کے نزدیک مستند طور پر افضل ترین مانے جاتے ہوں
دوسرے کثیر التعداد نفوس کیلئے یکساں نفع رساں اور سود مند ہو سکتے
ہوں، اور دوسرے ضمیر کی آواز وہ ہے جو انسان کی توجہ اپنے رُخ اوّلین
کے عرفان کی جانب مبذول کرتی ہو، اور عرفان رُخ اولین نام ہے اس مرتبے
کی پہچان کا، جو بمقابلہ خدا اور اپنے ہمجنسوں کے انسان کو حاصل ہے،
اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں، بقول رسل ایک شرابی قوم کے فرد کے
باطن سے اسکے شراب نہ پینے پر اگر ملامت آمیز آواز بلند ہوتی ہے، وہ
اسکے ضمیر کی آواز ہو سکتی ہے یا اس کے نفس کی!

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے محض اس حقیقت کا واضح کرنا
مقصود تھا، انسانیت اور بشریّت سے رُخ اوّلین کے اصول اور اس کا
مذہب، اجتماعی، اور انفرادی ہر دو صورتوں میں ایک واحد اور مشترک
شے ہے، اور اس حالت میں یہ ایک ظاہر سی بات ہے کہ بشریّت کی

اس عالمگیر مشترک چیز کو ہم انسان ساختہ کسی حالت اور کسی صورت
میں بھی نہیں کہہ سکتے، بلکہ وہ قدرت کی عنایت اور ودیعت ہے،
اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔ دستور ہائے
مذاہب عالم کا مخرج اصلی دماغ انسانی نہیں، بلکہ ذہنِ اعظم ہے، اور یہ
محض ہماری حقیقت ہی کے اصولوں کی شرح بھی جو علاوہ حسّی (راہبر ضمیر)
کی موجودگی کے ایک دوسرے خارجی طریقے سے یعنی بذریعۂ وحی و الہام
کے ہم تک پہنچائی جاتی رہی ہے۔ ساغر صاحب نظامی کا قول ہے "مگر
میں سمجھتا ہوں کہ ایسے مذاہب جن میں اصولی اختلافات موجود ہوں کسی
ایک خدا سے منسوب نہیں کئے جا سکتے"، بلاشبہ لیکن جبکہ خدا کی مشیّت
دُنیا کی ہر شے اور انسان کے لئے ہمیشہ سے ایک چلی آتی ہے تو یہ کیونکر
ممکن ہے کہ اسی مشیّت کی خارجی شرح میں اصولی یا کوئی فروعی اختلاف
ہوتا! اگر اختلاف نظر آتے ہیں تو وہ مقننِ ازلی کے یا ان ہستیوں کے
پیدا کردہ نہیں جو ان دستوروں کے شارح تھے، بلکہ یہ نتیجہ ہے اُس
تحریف کا جو عام انسانوں کے ہاتھوں دستورِ مذاہب میں کر دی جایا
کرتی تھی، دوسرے اس وقت جبکہ انسان کی عقلی ترقیات کا دائرہ
محدود تھا، اصولِ مذہب بھی سادہ تھے، کیونکہ صرف ضبطِ نفس مقصود
تھا، اور ہے، اور پھر جوں جوں انسان کے تخیلات اور تصوّرات
نازک سے نازک صورت اختیار کرتے چلے گئے، اور عقل و ایجادات
کی فراوانیاں انسان کی بسر اوقات کو پیچ بیچ بناتی گئیں، اسی مناسبت
سے دستورِ مذہب کی شرح بھی مفصّل اور باریک سے باریک کی جاتی
رہی اور جب ضرورت باقی نہ رہی وہ سلسلہ ہی مسدود کر دیا گیا۔
تیسرے خدا نے کسی قوم کی اُن رسومات، تہذیب و تمدّن، اور شعائر
کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی جن کی بالواسطہ یا بلاواسطہ زد، انسان
کی حقیقت اور حق العباد پر نہیں پڑتی تھی اور اس طرح اس قوم کی جب
میں کوئی نبی مبعوث ہوتا تھا) بعض دنیوی رسوم بھی بعد میں شعائر
اور دستورِ مذہب کے ساتھ مربوط ہو جایا کرتی تھیں، مثلاً جس طرح عرب
قوم کی رسمِ نکاح، تقطیع لباس، بعض قیودِ تمدّن، اور افراد قوم کے
اسم وغیرہ دستورِ اسلام کے ساتھ مربوط ہو کر رہ گئے ہیں، ورنہ ان
فروعات کا دراصل نفسِ مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، درحقیقت
مذہب انسانی جس شے کا نام ہے وہ انسانوں میں ان کے بشریت
کے جوہر کے ساتھ جاری اور ساری ہے! اور اسی شے کو "وجودی
صورت" صحائف آسمانی کی شکل میں دی گئی ہے۔

فطرت کا اوّلین اصول عدل ہے جو کائنات کی ہر شے میں بصورت
ہر شے کے ترکیبی توازن کے موجود ہے۔ بلکہ یوں کہئے تو بیجا نہیں،
کہ ہر شے کا توازن ہی اسکے وجود کے قیام کا ذمہ دار ہے، چنانچہ جس
شے کے توازن میں اختلال پیدا ہو جائیگا۔ اسکے وجود کا مجروح یا
معدوم ہو جانا ایک امر مسلّم ہے، ظاہر ہے کہ انسان کی ہستی ایک ایسے
جہانگیر اصول سے جس کی قدرت خود بھی پابند نظر آتی ہے مستثنے نہیں
ہو سکتی تھی، چنانچہ ہر ہوشمند ہستی سمجھ سکتی ہے، کہ بدکردار اور مجرمانہ خیالات
رکھنے والے انسان کی روح میں پیدا ہو جانے والا اختلال کیا نتیجہ پیدا
کر سکتا ہے؟ اصولاً اس کی ہر لغزش اس کی روح کے وجود کو زخم پر
زخم پہنچاتی رہے گی اور اگر اس جراحت کے اندمال کا ذریعہ بھی مسدود
ہے تو بالآخر اس کی روح کے رُخِ اوّل پر موت کا طاری ہو جانا یقینی ہے
اور نتیجۂ ایسا آدمی خدا کی مشیّت کے اس معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا
جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، کسی شے کو ہم اس کے صحیح توازنِ
ترکیبی کی موجودگی ہی میں اس کی جنس کے نام سے پکار سکتے ہیں کوئی
چوپایہ درندوں کی شکل و اوصاف اختیار کر کے چوپایہ نہیں کہلایا
جا سکتا۔ پانی اپنی مائع شکل میں پانی ہے، منجمد شکل میں برف، ابر
اور ژالہ کہلاتا ہے، بعینہٖ اسی طرح توازن روحانی کا ضائع کر دینے والا
انسان معنوی حیثیت میں انسان کہلانے کا مستحق نہیں، قدرت مجبور
نہیں تھی، وہ انسان کو بھی خاص اصولوں کا پابند بنا سکتی تھی جیسا کہ
دیگر اشیائے کائنات کی حالت سے عیاں ہے، لیکن خدا کو عجُب پسند،
ندرت آگیں، اور آزاد ترآرزو اور طلب کی تخلیق منظور تھی، اسکی صفتِ
بے نیازی کے تضاد کی تکمیل اسی طرح ممکن تھی۔

علاوہ اسکے متشککین کے نزدیک عبادت کا مسئلہ سخت قابل اعتراض
ہے، دراصل یہ اس خودداری کا مظاہرہ ہے جو ارتجاع علویت کے
اثر سے سفلیت میں پیدا ہے، چنانچہ اصولاً بھی ایک ایسی ہستی کا
جس کے خمیر میں علویت کا اثر موجود ہو، کسی شئے مشہودہ اور غیر مشہودہ

کے روبرو سربسجدہ ہونے پر مجبور کیا جانا، اسکے وقارِ خلقی کی انتہائی توہین اور ذلت کے مرادف ہے، مگر! باوجود اس قدر وقیمت رکھنے کے ہم انسانوں کو علاوہ خدا کی ہستی کے، ایسی چیزوں کی پرستش کرتا ہوا بھی دیکھتے ہیں، جو خود اس کی ذات سے بدرجہا ہیچ اور فروتر ہیں۔ آخروہ کونسا جذبہ ہے جو اس کو اپنی فطرت کے خلاف عمل پیرا ہونے پر مجبور کرتا ہے! وہ اس کی غایتِ آفرینش ہے، وہ اس کا ذوقِ آرزو ہے اور اس کی خواہشات کی نیرنگیاں اور فراوانیاں ہیں جو اس کو اس کی فطرت کے خلاف نیازمندانہ شعار برتنے پر مجبور کرتی ہیں، پروردگار عالم الغیب ہے اس کو اس جنس کی نوعیت کے لحاظ سے اس کے جذبات کا تمام وکمال علم تھا۔ چنانچہ خالق اکبر نے انسان کے جذباتِ پرستش کی آسودگی کے لحاظ سے خود اپنی ہستی کو اس کے سامنے رکھا، یہ عبادت کی حقیقت ہے اور میرے خیال میں انسان کے نیازمندانہ جذبات کی آسودگی کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ ممکن ہی نہیں تھا۔

بقول ساغر صاحب اگر بلا دستورِ مذہب کی پابندی کے بعض انسان افضل ترین اخلاقِ اعمال کے حامل ہیں تو یقینی طور پر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ضمیر کے معتمد ہوا کرتے ہیں، ایسے انسان اپنے ہر ارادے کو عملی قالب میں ڈھالنے سے پیشتر انسانیت کے عالمگیر ضمیر کے آئینے میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں، دستورِ مذاہب بھی انسانوں میں یہی چیز پیدا کرنے کے لئے ترتیب دئے جاتے رہے ہیں سلسلۂ الہامیہ کی تجدید قدرت اسی وقت کرتی تھی جبکہ انسانیت من حیث النوع غور وفکر سے عاری ہو جایا کرتی تھی، میں کہوں گی اگر انسانیت بحیثیت مجموعی اپنی قیمت اور مرتبے کو سمجھ لیتی ہے، اور ایسے دستور مرتب کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جن کی رو سے اس کی قدر کی تذلیل اور مفاد غیر کے نقصان کا قطعی انسداد ہو سکے تو ایسی صورت میں دستورِ مذہب کی پابندی اور عدم پابندی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن چونکہ ایسا ہونا ناممکنات سے ہے اس لئے دستورِ مذہب کی موجودگی ایک ضروری اور لازمی چیز ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر ذی شعور فرد پر اسکے امر ونواہی کی پابندی لازمی، تاکہ عوام الناس کیلئے راہِ عمل وار ہے اور سرکش طبیعتیں

سربرآوردہ انسانوں کی گمراہی کی آڑ نہ لے سکیں، دستورِ مذہب جبر کا مجاز نہیں، اسی طرح ضمیر بھی! محض مشعلِ راہ اور انسان کے فہم تمیزی کو ہر امر کے متعلق ایک اچھا فیصلہ دینے کے قابل بنا دینے کا معاون ہے دنیا بمنزلہ ایک یونیورسٹی کے ہے، جہاں انسان ڈگری حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں، چنانچہ بہتر سے بہتر ڈگری حاصل کر لینا اس کی اپنی کوشش پر منحصر ہے، اور ہر نفس کی موت! اسکے فردنامۂ زندگی کی تکمیل کی دلیل، اور ثبوت ہوتا ہے اس امر کا کہ اس ہستی کا زمانۂ کوشش، اور اپنے فردنامۂ زندگی میں ردوبدل ترمیم وتنسیخ کا وقت ختم ہو چکا، اور اس کی حیات آئندہ اسی ریکارڈ سے تعمیر ہوگی، اس کے خالق کی خوشی اسی میں ہے، ہر وہ انسان جو پیدا ہوا ہے، خود کو اس ابدی دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہونے کا اہل ثابت کرے یہی وجہ تھی کہ اس شدومد کے ساتھ راہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا گیا بتایا گیا ہے کہ وہ انسان آئندہ زندگی میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کا اہل ہوگا، جو خود سے فروتر اشیاء، یا کسی مساوی الدرجہ اور مساوی القدرت ہستی کے روبرو سربسجدہ ہو کر اپنے مرتبے کی بصورت قول وفعل تذلیل کا مرتکب نہ ہوا ہوگا۔ دوسرے اس کی ہستی اپنے ہمجنسوں کے لئے خیر ثابت ہوئی ہوگی، غور کیجئے، آپ تمام تعلیمات مذہبی کا لب لباب اوپر لکھے ہوئے خط کشیدہ فقروں میں موجود پائینگے، ظاہر ہے کہ وہ شر انگیز، تنگ چشم، حاسد اور ظالم انسان جس کے قول وفعل سے اس کے ہمجنسوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ان عالی مرتبہ انسانوں کی دنیا میں رہنے کا مجاز نہیں ہو سکتا، جن کی زندگیاں ایک دوسرے کے لئے خیر ہی خیر ثابت ہوئی ہونگی، لامحالہ اس کو کسی فروترین جگہ پر رہتے ہوئے ناکامیاب اور غیر مطمئن زندگی بسر کرنا ہوگی اور اس طرح وہ انسان جو وہاں اپنی کسی خواہش اور آرزو کی آسودگی کا سامان نہ پائینگے۔ جنہوں نے اس دنیا کی فروترین اور خود کے مساوی المرتبت ہستیوں کو اپنا حاجت روا تسلیم کیا ہوگا سوائے خدا کی واحد ہستی کے نہ کوئی اس دنیا میں حاجت روائی کا اہل ہے اور نہ وہاں ہوگا، لیکن ایسے لوگ فریب نفس میں مبتلا رہکر اپنے قول وفعل سے ایک لاتبدیل نقشۂ زندگی بنا چکے ہونگے اور وہاں ہمیشہ انہیں اپنے معبودانِ باطل کی تلاش میں سرگرداں رہینگے، یہی وہ صورتیں ہیں جن کو اصطلاح مذہب اور زہد میں جزا وسزا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ورنہ اس معاملے

سوویٹ نقدِ ادب

لفظ تنقید کا مفہوم سوویٹ روس میں اس سے کچھ مختلف ہے، جو مغربی یورپ میں سمجھا جاتا ہے۔ سوویٹ لوگوں کے لئے اِس سے مراد نہ تو دقیقہ رسی اور خوردہ بینی ہے اور نہ آرٹ کی پارلیمنٹ میں متخالف رایوں کی زورگری جنگ۔ سوویٹ یونین میں تنقید کا مفہوم ان کروروں انسانوں کی کوششوں اور مشقتوں سے وابستہ ہے جو اشتراکی بنیادوں پر دنیا کی نئی تعمیر پر تُل گئے ہیں۔

سوویٹ یونین کی زندگی جو پُرانے سماج کی عمارت کا گوشہ گوشہ کھود ڈال رہی ہے، بجائے خود پُرانے سماج پر ایک قطعی اور مستقل تنقید ہے۔

اس انقلابی تنقید کو جگانے والی جنگی جہاز اروراؔ[1] کے لوگوں کی وہ گرج تھی جو (Winter Palace) پر برسے۔ اور پچھلے سترہ سال کی مدت میں تنقید کا یہ نیا عنصر، جو پُرانے روس کے لئے بالکل اجنبی چیز تھا سوویٹ زندگی کا ضروری جزو بن گیا ہے۔ باپ گھر میں اگر نشے کی حالت میں داخل ہوتا ہے تو اسکو کا طالب علم بیٹا اس کی تنقید کرتا ہے، کارخانے میں اگر کوئی بات اشتراکیت کی تعمیر کے خلاف نظر آتی ہے تو ایک مزدور اس پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ غرض تنقید اور اپنی تنقید سوویٹ روس کی سانسیں بنگئی ہیں، اور سوویٹ روس کو اگر سمجھا جاسکتا ہے تو اسی پس منظر کے ساتھ ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔

سوویٹ روس کی تنقید میں دو باتیں سب پر چھائی ہوئی نظر آئیں گی۔ ایک تو انقلاب کا دباؤ یا اثر اور دوسری کلچری ورثے کا تحفظ اور اس کا تنقیدی استعمال! انقلاب کے اثر یا دباؤ سے مراد یہ ہے کہ محنت کش عوام نے انقلاب کو بروئے کار لاکر نئی تعمیر شروع کردی ہے اور وہ ایک ایسا سماج بنا رہے ہیں جس کی بنیادیں اصولِ اقتصاد پر قائم ہیں۔ اور کلچری ورثے کے تحفظ و استعمال کی تصریح یہ ہے، غلامی کی بیڑیوں کو کاٹ کر کروروں انسان اب کلچر، علم اور صنعت کے مدعی و مستحق بن رہے ہیں!

سوویٹ نقدِ ادب نے ادب اور ادیبوں کی زندگی میں اہم کام انجام دیا اور دے رہا ہے، اور سوویٹ مصنف کے ذہن و شعور میں انتقاد کی جگہ اس سے مختلف ہے جو دوسرے ملکوں کے مصنف کے ذہن و شعور میں ہوسکتی ہے۔

سرمایہ دارانہ سماج میں جس طرح اور ہر چیز مالِ تجارت بن جاتی ہے اسی طرح چھپی ہوئی رائے اور فکر بھی مالِ تجارت بن گئی ہے۔ اناطول فرانس مدعی ہے کہ اس نے اپنے متعلق ایک بھی تنقیدی مضمون نہیں پڑھا، کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی، اس کے معنی یہ ہیں کہ اناطول فرانس قسم کی سی جودت و ذہانت ایک ایسی ہانڈی ہے جو گھر میں روزمرہ پکتی ہے، چنانچہ مغربی ملکوں میں تنقید، تمسخر یا تحقیر، توجہ نہ دینا ہی ایک خوددار انسان یا مصنف کے شایانِ شان ہے لیکن ایسے ملک میں جہاں ہر ادبی پیداوار ایک "سماجی واقعہ" کی حیثیت رکھتی ہو نقدِ ادب ایک جدا ہی چیز ہوگی۔ اس لئے کہ اس سے کروروں آدمیوں کو لگاؤ اور دلچسپی ہے انقلاب کے وہ مسئلے جو سوویٹ ادب سوویٹ پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے، اِن مسائل کی گونج سوویٹ تنقید کے اندر بھی سُنائی دیتی ہے۔ اسی بنا پر سوویٹ نقدِ ادب ایک مختلف شے بنجاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ وہ تمام مسائل جو پچھلے پندرہ سال میں سوویٹ زندگی کا جزو رہ چکے اور اس زندگی میں ہلچل پیدا کرچکے ہیں، ادب میں

[1] زار کے فوجی بیڑے کا وہ جہاز جس پر سب سے پہلے بغاوت ہوئی اور جس نے انقلاب کی ابتدا کی

ادبی تنقید کا تاریخی موضوع بن گئے ہیں ـــــ ادبی تنقید جن نقادوں کا مشغلہ ہے ان کے علاوہ سوویٹ مصنف اور سوویٹ پبلک بھی ادبی تنقید اور صناعت کی بحثوں میں دلچسپی لیتی ہے یا ان کے حصّہ لینے کی بنا بھی یہی ہے۔

نقدِ ادب، سوویٹ روس میں دراصل ایک محاذ ہے۔ جہاں انقلاب ادب سے ہم کلام ہوتا ہے!

انقلابِ روس کے پیدا کردہ نقادِ ادب کون تھے؟ سوویٹ تنقیدی ادب کیونکر وجود میں آیا؟ اور سوویٹ ادب کے مسائل، اس کے کارنامے، اور اس کی ناکامیاں کیا ہیں؟

کسی کو یہ مغالطہ نہ ہونا چاہیے کہ یونانی اصنامیات میں جس طرح علم و فضل کی دیوی خدائے خدایان زیوس کے دماغ سے تکمیلی صورت میں پیدا ہوئی ویسے ہی انقلاب کے دماغ میں سے سوویٹ تنقید مکمل شکل میں نمودار ہوگئی۔ سوویٹ تنقید نے خود انقلاب کے انقلابات کے ساتھ ترقی کی ہے، اور مختلف منزلوں میں اس کے سامنے مختلف قسم کے سوال آتے رہے ہیں، لیکن تقریباً تمام سوالوں کی جڑ "مارکسیت" (Marksism) اور صناعت کا باہمی رشتہ تھا۔ ان بحثوں میں بنیادی سوال یہ تھا کہ صناعت کو "مارکسیت" سے کس طرح مطابقت کیا جاسکتا ہے۔ سوویٹ نقاد اسی مسئلے کے حل میں لگے رہے ہیں۔

فلسفہ، اقتصادیات اور سیاسیات کا صناعت سے رشتہ و تعلق قائم کرنے کے متعلق مارکس نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اس رشتہ و تعلق کو پورا ابروز ہونے دیا ہے۔ لینن اور اسٹالن نے اس کو متمول بھی بنادیا لیکن مارکس کے اخلاقیات اور نقدِ ادب کے باب میں انقلاب کے بنیادی سوالوں میں منہمک رہنے کے سبب سے زیادہ چھان بین نہ کی جاسکی تھی اس لئے یہ مسئلے سوویٹ ادبی تنقید کے لئے تیز و گرم بحثوں کا سبب بن گئے۔ ان بحثوں سے ان مسئلوں کو پورا ابروز حاصل ہوا اور ان میں باریکیاں اور نزاکتیں آگئیں۔

سوویٹ تنقید نے ان مسائل کو جس طرح حل کیا ہے اس کا مکمل تصور قائم کرنے کے لئے اسے تاریخی نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ سوویٹ تنقید کو تین دوروں میں بانٹا جاسکتا ہے پہلا دور رسالہ (Karanaya Nou) ۲۶-۱۹۲۱ء کا دور ہے دوسرا رسالہ (Na Literaturnom Postu) اور نقادوں کی اس جماعت کی مشغولیت کا دور ہے جو پرولتاریا اہلِ قلم کی ایسوسی ایشن (Rapp) کے لیڈر تھے۔ اور تیسرا دور اس وقت سے شروع ہوا ہے

جب بولشویک پارٹی کی سنٹرل کمیٹی نے طے کردیا کہ اہلِ قلم کے مختلف ادارے اور پارٹیاں ختم ہوکر سوویٹ مصنفین کی صرف ایک انجمن بننا چاہیے۔

ان تینوں دور کی خصوصیات سمجھنے کے لئے یہ جان لینا چاہیے کہ سوویٹ تنقید کی بنا کن اصول پر ہوئی تھی۔ سوویٹ تنقید کا پہلا قدم یہ تھا کہ اس نے قبل انقلاب کے بورژوا طرزِ انتقاد کے اصول اور طریقوں کو یکسر ترک کردیا۔ (اگرچہ افسانے کے اندر یہ ترک شروع شروع واضح نہ تھا)

اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ سوویٹ تنقید انقلابی ورثہ یا روایات اور اصلاً مارکس کی تعلیمات پر قائم ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں وہ انیسویں صدی کے سلسلۂ ادبی نقاد Belinsky Dobrolubo اور Chernyshevsky کے نظریات و کلیات پر مبنی ہے۔

"مارکسیت" اور آرٹ کے رشتے پر اگرچہ بہت زیادہ جرح و بحث نہیں ہوئی لیکن اس کی بعض ایسی مثالیں موجود ہیں جنکو کلاسکی ہونے کا درجہ حاصل ہے Plekhnov نے جس کی تصانیف لینن کی رائے میں مارکسی ادب کا بہترین نمونہ ہیں، سب سے زیادہ سیر حاصل بحث کی ہے۔ پلاخنوف نے جو اصولِ نقد وضع کیا ہے اسے وہ "خارجی نسلی" Objective Genetic نام دیتا ہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ صناعت پارے کو انجام کار میں عمرانی اقتصادیات (Socio - ecnomic) کے ماحصل کی حیثیت سے جانچا جائے۔

سوویٹ تنقید نے لینن اینگلس فرافسکی اور مہرنگ کے انفرادی تنقیدی خیالات سے بہت کچھ استفادہ کیا اور کررہی ہے۔ لینن نے لیوٹالسٹائی پر تین مقالے لکھے جو مشہور عام ہیں اور جو استدلالی مادیت Dialectic materialism) کے اصول و طریق کو ایک زبردست صنّاع کے صناعت پاروں سے مطابقت دینے کا عدیم المثال کارنامہ ہیں اس کے علاوہ اسٹالن کے عندیات (Idealogy) سائنس کلچری Function) انقلاب بولشوک خود تنقیدی کے تاریخی تفاعل (اور سوویٹ ادبی تنقید کے باب میں بیش قیمت خزانہ ہیں۔ سوویٹ تنقید انقلاب کے ابتدائی سالوں (۲۲-۱۹۲۱ء) سے شروع ہوتی ہے جس وقت ہر طرف خانہ جنگی (سول وار) کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ جب ریلوں کے انجن کوئلہ نہ ملنے کے سبب جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے تھے۔ جب غلّہ کی قلت کے سبب سے لوگ دانے دانے کا شمار کررہے تھے۔

ایسے محشر خیز وقت میں پرولتاریا طبقۂ ادب کی طرف کوئی خاص توجہ ظاہر ہے

کہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت تک جو کچھ ادبی سرمایہ تھا وہ قبل انقلاب کے ادیبوں کی تصانیف پر مشتمل اور پیٹرو گراڈ اور ماسکو میں محدود تھا اور تنقید کا جو انداز اس وقت تک عام تھا وہ بس "قواعد پرستی" اور "آئین نوازی" پر زور دیتا تھا۔ یہ ادبی سرمایہ تعلیم یافتہ طبقے کی بھی ایک مخصوص جماعت کا کارنامہ تھا، جو مقابلتاً کم عمر اہل قلم کی تھی اور اس جماعت کی ادب پسندی لے دے کے اس پر ختم تھی کہ انقلاب سے بچے رہیں، ان کے ادبی اندازنے ادب کو ایک قسم کی "شنگھائی" یعنی (Foriegn Settlement) بنا دیا تھا۔ جس کا خاص ضابطہ زندگی سے بے نیاز ہوتا تھا۔

سب سے ممتاز "قواعد پرست" (Formalist) مصنف (W. Shklovsky) تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ :-

"صناعت ہمیشہ زندگی سے بے نیاز رہی ہے، صناعت کے اندر قلعوں پر اڑنے والے پھریروں کے رنگ منعکس نہیں ہوتے"

اس قواعد پرستی کے ان ادیبوں نے بعض ایسی کتابیں تصنیف کرائیں جو بتاتی ہیں کہ صناعت چند ایسے طریقوں کا مجموعہ ہے جو ایک محدود طبقے میں بروئے کار آنے اور باہم گر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایسی تصانیف میں Shklovsky کی B. Eichenbaum 'Theory of Prose' کی Poetic — کی 'Tynyanov' اور On Tolstoy کی Language. ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ اس جماعت نے مختلف کتابوں پر مضامین بھی لکھے ہیں اس اسکول کی عمر دس سال سے آگے نہ بڑھی، بہرحال اسکو سوویٹ تنقید کا جزو قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس جماعت کا نظریہ صناعت بورژوا نظریہ تھا۔

بعد انقلاب کے شروع سالوں میں اس جماعت کے ساتھ ساتھ ایک اور جماعت بھی تنقید کے میدان میں اتری جو اپنے آپ کو "مستقبلی" (Futurists) کہتی تھی۔ یعنی Left Front والے اس جماعت میں Mayakovsky ' Chuzhak Brik اور Arvatov شامل تھے ان "لیفٹ فرنٹ" والے "مستقبل پرستوں" نے جو تنقیدی ادب پیدا کیا اسے سوویٹ تنقید کا ایک جزو کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر قطعی طور سے انقلابی رجحانات تھے مگر ساتھ ہی، اس جماعت کے تنقیدی ادب میں انقلاب سے متعلق "اپنی بورژوا" کے اس

حصے کے متعلق بھی اظہار خیال ہوا ہے جسے انقلاب کے اندر سوائے تخریب کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ فرانسوی ضرب المثل کے مطابق یہ "مستقبلی" نقاد "جہاں پناہ" سے زیادہ "شاہ پرست" تھے۔ ان کا نظریہ صناعت یہ تھا کہ صناعت ایک مستعار چیز ہے اور پرولتاریا کے لئے بالکل غیر ضروری" ان کا محبوب فقرہ تھا کہ "صناعت عوام کے لئے افیم کی گولی ہے!" یہ فقرہ مارکس کے اس مشہور فقرے سے ماخوذ ہے کہ "مذہب عوام کے لئے افیم کے مترادف ہے"

چنانچہ مایاکوفسکی نے روسی شعراء کو ایک نظم لکھ کر تنبیہ کی ہے کہ شعر کہنا ترک کر دیں۔

اس موقع پر (Lunacharsky) نمودار ہوا۔ اس کے جو مضامین ان دنوں میں شائع ہوتے، سوویٹ تنقید کی پہلی آواز تھی اور ایک ایسے آدمی کی آواز تھی جو صناعت کو حقیقتاً سمجھتا تھا۔ لوناچارسکی کو اصل میں سوویٹ تنقید کا باوا آدم سمجھنا چاہیے۔

چونکہ سول وار کا ہنگامہ بجائے خود ناموافق تھا اس پر کاغذ کا قحط اس لئے اس زمانے میں کوئی وقیع ادبی رسالہ وجود میں نہ آسکا خود سوویٹ تنقید آگے نہ بڑھی تاوقتیکہ سوویٹ ادب نے ترقی نہ کی اور سوویٹ ادب کی ترقی کا زمانہ A. Fronsky کی ادبی مصروفیت سے وابستہ ہے جو ایک اعلیٰ نقاد اور رسالہ Karansyanov کا ایڈیٹر تھا۔ فرانسکی کے تنقیدی خیالات کی خصوصیت "ارادۂ عوام" Peoples Will ہے۔ اس سے اس کی مراد تعلیم یافتہ طبقے کے میلان سے تھی۔ اس کے تنقیدی مضامین نے انقلاب کے حامیوں کو بڑی تقویت پہونچائی۔ لیکن اس کے آخر تاتی خیالات جنھیں اس نے Art of Seeing the world میں مکمل کیا ہے، انقلاب کی بڑھتی رو سے پرسر حیت تھے۔

فرانسکی ایک اعتبار سے پلاخناف سے بڑھ گیا تھا پلاخناف آرٹ کو جماعتی مفاد کا اظہار کہتا تھا، اور فرانسکی اسے بس ایک پرسکون مشغلہ سمجھتا تھا جو "جنگ کی حالت میں جاری نہیں رہ سکتا"

فرانسکی صناعت میں جو پہلی بات دیکھنا چاہتا تھا وہ اس کا بالواسطہ اثر یعنی تجرد مشاہدے کا پہلو تھا اور اس کا صناعتی تخیل ٹالسٹائی اور پراؤسٹ کی تصانیف پر مبنی تھا۔ جن کے اندر براہ راست مشاہدہ بہت

۵۳

نمایاں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فرانسکی کے نظریہ میں مارکس کے ادبی تخیل
کی جان یعنی طبقاتی تحریک کا وجود نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فرانسکی اور ٹراٹسکی
کی ہم خیالی کوئی اتفاقی امر نہ تھا۔

نقادوں کی ایک خاص جماعت فرانسکی کے ہم خیال اور اس کے
نظریوں کی موید ہوگئی (D. Grobov اور A. Lezhnev)
وغیرہ اور اس تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتی تھی جو جنگجو اور انقلابی پرولتاریا
کو دور ہی سے دیکھ رہا تھا۔

مگر فرانسکی کے اس انتقادی دستے پر رسالہ (Na. Postu)
کے ذریعہ سے اشتراکی نقادوں Roskolnikov اور Rodovolin
وغیرہ نے زبردست حملہ کر دیا۔ اس گروہ نے ادب کے اندر اشتراکی
عسکریت کو بھی داخل کیا کیونکہ اس میں وہ نوجوان انشاء پرداز شامل تھے جو
سول وار کے محاذوں سے حال میں پلٹے تھے۔ Na Postu کے اس حلقے
نے یہ نظریہ پیش کیا کہ صناع کے اندر کامل عندیاتی استقامت و یکسانی۔
Consistancy لازمی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ لکڑی کو حد سے
زیادہ جھکانے کا مترادف تھا۔ یہ شرط اتنی سخت تھی کہ اس کے اندر صناع
کے شعور کو تشکیل پا لینے کے مدارج کی بھی رعایت نہ تھی۔

لیکن اس حلقے کے نقادوں کی بھی باری آئی Rapp (پرولتاریا
انشاپردازوں کی ایسوسی ایشن) کے ممبروں نے Na Postu والوں
پر سخت حملہ کر دیا۔

اور پھر ایک عرصے (۱۹۳۲) تک سوویٹ تنقید Rapp ہی کے
ہاتھوں میں رہی۔ رسالہ Na Postu کا نام بدل کر Na Lit
Literaturnom Postu رکھا گیا۔ اس جماعت میں زیادہ تر ایسے لوگ
شامل تھے جو یا تو Komsomol کے ممبر تھے یا چند سرخ فوج کے
رنگروٹ یا سپاہی Auerbach، Ermilov اور Serebryansky
وغیرہ بالترتیب اس جماعت کے لیڈر ہوتے رہے۔

اب وہ وقت آیا کہ تنقیدی ادب کا میدان سخت قسم کی عندیاتی جنگ
کا میدان بن گیا۔ یہ جنگ اصل میں اس جنگ کا عکس یا ضمیمہ تھی جو اس وقت
سارے ملک میں بڑے شد و مد سے جاری تھی، اور جس نے اس وقت بہت زور
باندھا جب پرولتاریہ نے تمام محاذوں سے حملہ شروع کیا Kulak (زمیندار)

جماعت کو فنا کر دینے کا جہاد یا کارخانوں میں کام کرنے والے تعلیم یافتہ بورژوا
کی انفرادی رجعتی سازشیں، ان کی تباہ کارانہ مصروفیتیں، کاشتکار کا "سب کچھ"
کھیتی کے کام میں مکمل طور پر بدل جاتا، ان تمام باتوں نے سماجی کشاکش اور
دباؤ کی فضا پیدا کر دی تھی جو حد درجہ حساس تھی، اور اس کا اظہار ادبی تنقید
کی بساط پر ہو رہا تھا۔ Rapp کے عہد کی تنقید کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ
اصلاً صحافتی نوعیت رکھتی تھی۔ ان نقادوں کا طریق کار تھا کہ صناعتی پہلو کو
نظر انداز کر کے، سب سے پہلے اسے طبقاتی (Class) نظریوں پر جانچا جاتا تھا۔
تاہم، یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ Rapp حلقے کے نقاد تین پہلوؤں سے مقابلہ
کر رہے تھے جن کے نتائج کو مارکسی تنقید کے فوائد میں سمجھنا پڑے گا۔ اس کے تین مقابلے
میں ایک تو فرانسکی اسکول کی غلطیوں کو آشکار کرنا تھا، دوسرے Pereversey
اسکول کی "مارکسیت" دشمنی کو واشگاف کرنا اور تیسرے ادبی محاذ
(Lit-fronts) محاذ کے خلاف جہاد کرنا تھا۔

پرافرسیف کی جماعت نے ادبی تنقید کی تمام توجہ اور مصروفیت کو دو
عنصروں پر منحصر کر دیا تھا۔ ایک طرز (Style) اور دوسری نقش (Image)
یہ دونوں عنصر بلا واسطہ یا مشینی (Machnicaly) طور پر طرز کی طاقت
کو قطعی ثابت کرنے کے لئے طبقاتی حلقوں (Classes) سے اخذ کئے جاتے تھے
ان کا استدلال یہ تھا کہ مصنف کے تصورات کی دنیا محدود و معین ہوتی ہے وہ
اگر ادب میں اس دنیا سے باہر نہیں نکل سکتا تو ادب میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور
طبقاتی جد و جہد بالکل الگ رہ جاتی ہے پرافرسیف نے "مینشویت" پر بھی نقد و جرح
کی، مگر اس کے معاملات کی فہم اور واقعات تک رسائی کا طریقہ غلط تھا۔ اور
Rapp حلقے کے نقادوں نے ان کے ان نظریوں کی پول کھول دی۔

اسی دوران میں Leftist رجحان ترقی پا کر وہ جماعت رونما
ہو گئی تھی جس کا نام "ادبی محاذ" تھا۔ اس جماعت کا نظریہ یہ تھا کہ Lef کی
غلطیاں ان نئے اور بدلے ہوئے حالات میں اسی طرح جاری رہنا چاہئیں مگر
جب لیف خود ۱۹۲۸ء میں اپنی غلطیوں پر آگاہ ہو کر صحیح راستہ پر آگیا تو "ادبی محاذ"
والوں نے اپنے خیال و رجحان کو تعمیری زمانے میں پھر ایک حد تک زندہ کیا،
اس جماعت کے خیال میں ادب کے اندر کوئی تصوری پہلو تھا ہی نہیں وہ ادب
کو صرف تعمیری دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے "میکانکی" صحافت پر زور دیتے تھے اور اسی
کو پرولتاریا کی معراج سمجھتے تھے۔ لیکن بالآخر Rapp والوں نے ان کے

نظریوں کا کھوکھلا پن بھی ثابت کر دیا اور "ادبی محاذ" کے اصول شکست کھا گئے۔

مگر دوسری نظریاتی اور سیاسی غلطیوں کے علاوہ Rapp جماعت کی ایک غلطی یہ تھی کہ وہ پرولتاریا اور اشتراکی کلچر کا موازنہ کرتے اور وجہتی و صحافتی سطح پر اتر آتے تھے۔ جہاں کسی کام کے صناعتی پہلو کا نظر انداز ہو جانا لابدی ہے۔ اس طرح فن تنقید ایک محدود حلقے کے جماعتی مفاد کا آلہ کار بن کر رہ گیا۔

لیکن سنٹرل کمیٹی کے ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء فیصلے نے کہ تمام سوویٹ مصنفین کی صرف ایک انجمن ہو، Rapp کو بھی ختم کر دیا۔ یہ فیصلہ کسی تنظیمی ضرورت کا فیصلہ نہ تھا۔ بلکہ اس کی تہ میں تنقید کے لئے گہرے سیاسی اور نظریاتی نتائج چھپے ہوئے تھے۔ اس فیصلے نے ایک اور اہم بات یہ کی کہ نقاد بننے کا معیار بدل گیا اور ادبی تنقید کے مسائل میں ایک نیا اور سنجیدہ زاویہ نکل آیا، اس لئے کہ اب تنقید کے میدان میں ایسے لوگ آنے لگے تھے جنہوں نے حکمت و فلسفہ کی باقاعدہ تعلیم سوویٹ عہد سے پہلے حاصل کی تھی۔

تنقید کے مرکزی آرگن کو Literary Critic کی ادارت Yadin کے ہاتھ میں آئی جو کلاسکی انسٹیٹوٹ کا ڈائریکٹر بھی تھا Yadin کے مددگار بھی ایسے ہی لوگ تھے جن کی فلسفہ کی تعلیم باقاعدہ ہوئی تھی

آج سوویٹ تنقید کی خصوصیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سوویٹ نقد ادب کے مسائل وہی ہیں جو سوویٹ ادب کے سامنے عام طور پر آتے رہتے ہیں۔ اب ایسے طبقاتی رجحان جو اصل مقصد کے لئے مضر رساں ہوں، مناسب کم یا زیادہ توجہ حاصل نہیں کر پاتے۔ اہل قلم کی بہت بڑی اکثریت عرصہ ہوا کہ اشتراکی نظام قائم کرنے کے مقصد سے متفق ہو کر اس میں شامل ہو چکی ہے چنانچہ اب تنقید کا اصل مقصود ذہنی تعلیم و تربیت بن گیا ہے۔ یعنی اپنے شعور میں سرمایہ داری نظام کے اثرات اور توارث سے جد و جہد کرنا اور اسے صناعت کے اندر دکھانا، اور چونکہ اب ادبی تنقید میں پرولتاریا کے صناعتی وسائل کو نشو و نما دینے والے مسائل پیش ہوتے ہیں اس لئے صناعانہ دستکاری اور صناعتی قدر سوویٹ تنقید کی مخصوص اہمیت ہے اور اس کا مرکزی و نظریاتی مسئلہ اشتراکی واقعیت ہے۔

"اشتراکی واقعیت" کیا ہے؟ اس اصطلاح سے مراد صناعت کا وہ تصور ہے جس کی پہلی ضرورت زندگی کو اس کے عمومی اور جوہری رجحانات کے ساتھ پیش کرنا ہے۔

"زندگی کے اصلی خط و خال سچائی کے ساتھ پیش کرو۔"

یہ ہے وہ مطالبہ جو سوویٹ تنقید اپنے اہل قلم سے کرتی ہے، اور یہ مطالبہ دراصل سوویٹ پڑھنے والے عوام کا ہے۔ کیونکہ ادب لطیف (Bells Letters) اب سوویٹ عام کی روزمرہ کی کلچری زندگی کا ایک جزو ہو گیا ہے۔

اس کے باوجود، سوویٹ زندگی اس وقت جس منزل میں ہے سوویٹ پڑھنے والے عوام کا یہ مطالبہ اب زیادہ زور کے ساتھ پیش ہوگا، اور سوویٹ ادب میں اگر اب تک سوویٹ شعور کی تشکیل کرنے کے لئے تنقید کو اہمیت حاصل نہ تھی تو وہ اہمیت اسے اب مل جائے گی۔ اور وہ عام ادب کی وسیع دلچسپی کے نئے ادبی مسائل کو وسیع تر پیمانے پر جانچے گی۔

اس نوع کا پہلا مضمون گورکی کا وہ مقالہ ہے جو اس نے سوویٹ ادب کے عمومی صناعانہ خاصے اور زبان کے متعلق شائع کیا ہے۔ گورکی کے انتقادی مضامین کا مجموعہ (On Literature) مستقبل کی ادبی تنقید اور اس کے خاص میلان کو صاف اور واضح کر کے پیش کر دیتا ہے

۵۵

سوویٹ ادب اور سائنس

پچھلے دہ سال (سنہ ۱۹۳۱-۱۹۳۳ء) میں سوویٹ سائنس اور اس کا مسالا ادب کے نمایاں موضوع بن گئے ہیں اور یہ صورت حال کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ سوویٹ ادب کا ان مسائل سے دو چار ہونا ناگزیر تھا۔ اس لئے کہ سائنس کو سوویٹ یونین میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔

مختلف ادبی جماعتوں کا خاص مقصد یہ ہے کہ اہل سائنس اور اہل قلم میں تعاون و تعامل ہو، ان مختلف مسائل پر جو دونوں جماعتوں کے لئے مساوی طور پر دلچسپی کا باعث تھے، ادیبوں اور سائنس دانوں کے درمیان بحث و گفتگو نتیجہ خیز ثابت ہو چکی ہے اور ہوگی۔

اس باہمی رشتۂ تعلق کے بارے میں ایک نوجوان سوویٹ انشا پرداز کا خیال تھا کہ "اس قسم کی کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب سائنسی موضوعات پر ادبی تصنیف کا مسالا اور موضوع ادبی چاشنی کے بغیر خود اپنی جگہ بھی پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کی چیز ہو!"

یہ خیال تمام تر صحیح نہیں، کیونکہ ایسی کتاب تو خالص ریاضیات اور طبیعیات پر بھی

ایشیا دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

لکھی جا سکتی ہے جو عام پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی رکھتی ہو اور ادب کے لئے بھی اہم ہو، سائنسی ادبی تصنیف کی خاص ضرورت اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ اس کے اندر قوت اور زمانے کی علامات موجود ہوں، سوویٹ سائنس کو ترقی دینے والے مسائل لوگوں کو یقین دلانے کے انداز میں پیش کئے گئے ہوں، اور اس تحریک کا مقصد صاف طور پر ظاہر ہوتا ہو۔

ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کا ادب پیدا کرنا سوویٹ کے مصنفین ہی کا فرضِ منصبی کیوں قرار پائے؟ لیکن جب یہ امر مسلمہ ہے کہ سائنسی مقاصد کے باب میں سوویٹ یونین اور دوسرے ملکوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے بالکل اسی طرح جس طرح سوویٹ کے باشندوں کے اعمال و افعال اور دوسرے ملکوں کے باشندوں کے افعال و اعمال کا نقطۂ نظر جدا ہے۔

سائنس اور سائنس دانوں کے متعلق سوویٹ ادب کو بھی دوسرے ملکوں کی تصانیف سے مختلف ہونا چاہئے چنانچہ سوویٹ ادب اس نوع کی سائنسی ادبی تصانیف سے جو دوسرے ملکوں میں لکھی گئی ہیں مستفید ہوتا ہے اور اسے ہونا چاہئے۔ ان تصانیف سے سوویٹ ادب کا آشنا ہونا یہ معلوم کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ سائنسی ادب کے لئے کتنا اہم مسالا اور وسیع امکانات بہم پہنچاتا ہے

سائنسی بروز کی تاریخ میں ادب کے لئے موضوع اور مسالے کے خزانے موجود ہیں V. Kaferin نے اسی مضمون میں مثال کے طور پر مشہور روسی ہندسی Labachefsky کے حالاتِ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتا ہے :-

لباچیفسکی کی سوانح عمری آپ کو ہر انسائیکلوپیڈیا میں ملے گی اس میں آپ کو کوئی دلچسپی نظر نہ آئے گی۔ بس اتنا علم ہو جائے گا کہ وہ قازان یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ ساری عمر میں صرف دو بار وہ بھی چند دنوں کے لئے قازان سے باہر گیا اور یہ کہ وہ ایک نئے سائنس کا موجد تھا جو اسی کے نام سے موسوم بھی ہوا۔ یعنی لباچیفسکی کی Pan - Geometry لیکن آپ ذرا غور سے کام لیں گے تو بہت سے دلچسپ پہلو سامنے آ جائیں گے۔ سب سے پہلے آپ کا ذہن سوال کرے گا کہ اس دور افتادہ ملک کی ایک یونیورسٹی میں ساری عمر پڑا رہنے والا انسان واقعی جری نفس اور کمال مستقل مزاج آدمی تھا کہ ایک ایسے مسئلے کی مخالفت کا اعلان کیا جو دو ہزار برس سے مصدقہ و مسلّم تھا۔ اور ایسی حالت میں اعلان کیا جبکہ اسی یونیورسٹی میں پروفیسر Nieolsky اپنا نظریہ صحیح ثابت کرنے کے لئے کہہ رہا تھا کہ

"خدا کے فضل سے یہ دو مثلث باہم مناسب موافق تسلیم کر لئے جائیں گے"

اگر اس طرح فکر کی تو آپ کو محسوس ہوگا کہ لباچیفسکی کے متعلق آپ کے تمام تصورات غلط تھے۔ کیونکہ آپ دیکھیں اور سمجھیں گے کہ اس کی بظاہر خوش اور پُرسکون زندگی المناک اور یاس انگیز واقعات کا مجموعہ ہے اور اس کی واقعی زندگی سے اس کی سوانح عمری بالکل ہمنوا نہیں ہوتی۔

پھر آپ کو نظر آئے گا کہ حیرتناک حد تک متضاد معاملات سے لبریز زندگی سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی اس بڑے مفکر کی اختراع کی داستان بیحد دلچسپ ہے، ۱۸۲۶ء میں اپنی دریافت مکمل کر لینے کے بعد لباچیفسکی عمر بھر اس کوشش میں رہا کہ کوئی امتیاز نہ سہی، توجہ تو حاصل ہو۔ اس نے اپنی تحقیقات کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مختلف اوقات میں اور مختلف زبانوں میں سات مقالے شائع کرائے۔ لیکن کسی سے بہتر نام نہ پا سکا۔ بدتر کی تو حد نہ تھی۔ گالیاں اور استہزا ایک ہوا۔ آپ اگر وہ تمام تبصرے اور ریویو پڑھیں تو غصے کو ضبط کرنا مشکل ہو جائیگا۔ لباچیفسکی نے صرف ایک مرتبہ اپنی توہین کرنے والوں کا جواب لکھا وہ بھی ایک "فٹ نوٹ" میں۔

لباچیفسکی کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی کہ اس کو ایک فہین شاگرد مل جائے جس کو وہ اپنا سرمایۂ تحقیق سونپ جائے، اس زمانے میں جبکہ اس کی بینائی جاتی رہی تھی، وہ اسی تلاش میں یونیورسٹی کے امتحانوں میں جاتا تھا کہ ممکن ہو اس کی مراد پوری ہو جائے، مگر ہوتا کیونکر جبکہ خود اس کے شاگرد اسے کم سنکی فرد سمجھ رہے تھے، چنانچہ اس کے مرنے پر قبرستان میں جو اساتذہ و طلباء کی تقریریں ہوئیں تعریف کی کوئی ایسی بات اٹھا نہ رکھی گئی جو لباچیفسکی میں بیان نہ کی گئی ہو۔ لیکن اس کی دریافت اور اس کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کسی ایک متنفس نے بھولے سے بھی نہیں کیا۔ اس لئے کہ شاید اس مخالفت کرنے میں مروّت مانع تھی اور موافقت کرنے میں خود اپنی عقل و دانش کو رسوا کرنا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ لباچیفسکی اگر یہ دریافت نہ کرتا تو نہایت سکون و راحت کی زندگی گزارتا، بہرحال آپ اگر اس نظر سے مطالعہ کریں گے تو وہ مطالعہ لباچیفسکی کی موت پر ختم ہو جائے گا بلکہ آپ اس کی دوسری زندگی کا مطالعہ کریں گے۔

لباچیفسکی کی دوسری زندگی اس کے مرنے کے بعد شروع ہوئی اور وہ نہ صرف اس وقت بھی جی رہا ہے بلکہ نامعلوم مدت تک جیئے گا۔ اس دوسری زندگی میں لباچیفسکی ممتاز ہے، محترم ہے، مشہور ہے۔ وہی لوگ جو چند برس پہلے قبرستان میں لباچیفسکی کی دریافت کا حوالہ دیتے شرماتے تھے اب اس پر مفتخر ہیں کہ وہ اس

یونیورسٹی میں پڑھے ہیں۔ جس کا (لبا) حیقیکی پروفیسر تھا۔

غرض سائنسی موضوعات کو ادب کا مسالا بنانے کے لئے ایک انشا پرداز کو سائنس کی کتابوں کا مطالعہ لازم ہے۔ مگر نہ اس طرح جیسے سائنس داں پڑھتا ہے، ایک ادیب کا مطالعہ اس قسم کا ہونا چاہئے کہ وہ سائنس داں مصنّف کے خیالات کو از سرِ نو مرتّب کرے۔ سائنس کے خشک بیانات کے بین السطور میں سائنس داں کی زندگی اور مزاجی کیفیات کو پڑھے، اس جد و جہد کی تاریخ کو پڑھے اور اس کے معنی کو سمجھے جو اس سائنس داں کو اپنے مخالفوں اور موافقوں کے ساتھ کرنا پڑی۔ سائنسی تحقیقات میں مخالفوں کے علاوہ دوستوں کی مخالفت ناگزیر ہے ایک ادبی مصنّف کے لئے سائنسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ طریقہ اختیار کرنا اشد ضروری ہے۔

سائنس داں خود اپنے نفسیات کو ترک کر دیتا ہے مگر ادبی مصنّف کا فرض ہے کہ اس کے نفسیات کو خود محسوس کرے۔ اس لئے کہ سائنس داں اپنے کام کے نفسیات کو پیش کرنا بالکل غیر ضروری سمجھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے بیان کو زیادہ سے زیادہ مختصر اور خشک عبارت میں پیش کرنے ہی کو بہتر طریقہ سمجھتا ہے، جو ادبی مصنّف کے طریقے سے بالکل تضاد رکھتا ہے۔

یہاں تک کہ جو کچھ کہا گیا وہ اس نقطۂ نظر سے تھا کہ سائنس اور سائنس دانوں کی تاریخ میں ادب کے لئے موضوع اور مسالے کی افراط ہے لیکن حالیہ سائنس بھی اور خاص کر سوویٹ سائنس ادبی موضوع اور مسالے کے لازوال خزانے رکھتی ہے۔ ادبی موضوعات میں سائنسی فنتاسی (Scientific Fantastic) ناولوں نے ایک خاص جگہ حاصل کر لی ہے اور اس میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں کہ اس قسم کا مسالا ادبی کام کے لئے بہت بڑے امکان پیش کرتا ہے۔ دریافت و انکشاف کا یہ لاانتہا سلسلہ انسانوں کی طرز ماند و بود کو بدلے بغیر نہیں رہ سکتا اور ایسی دریافت و انکشافات کے متعلق ادیبانہ پیشگوئی کرنے میں کوئی بڑی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی، سب جانتے ہیں کہ برودت قوت (Energy) کا ذریعہ ہے، قوت سے ہوا حاصل ہو سکتی ہے اور ایسے مختلف طریق سے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں فوٹوگرافی کے عنصروں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ الحاصل سائنس ایسے ادبی موضوع اور مسالا بہم پہنچا دیتا ہے جس پر صناع ادب کو

کوئی بڑی کاوش نہیں کرنا پڑتی اور کوئی بڑا خطرہ بھی برداشت نہیں کرنا پڑتا۔

ان تمام آسانیوں کی موجودگی میں ایک بات البتہ ایسی ہے کہ کسی سائنسی فنتاسی ناول کے مصنّف کی کوششوں پر پانی پھر جائے یعنی پیش پا افتادہ واقعات کو سائنسی فنتاسی مسالے سے مطابقت دینا

سائنسی فنتاسی ناولوں کے ہیرو کو ژول ورل نے سب سے پہلے رومانی کردار بنانے کی ابتدا کی۔ ادب اور بالخصوص اطفالی ادب میں رومانیت ایسی دہل نفریں چیز نہیں جیسی کہ آجکل اُسے سمجھا جا رہا ہے بایں ہمہ سائنسی فنتاسی ناول کی بنا اُس سے مختلف ہونا چاہئے

سوویٹ سائنس داں اور اہلِ قلم کی مشترک کانفرنس میں جب ایک صاحب نے ایک نیا گیبوریب اکرنے کی تجویز پیش کی تو اس سے مدعا یہ تھا کہ زندگی کے اسباب کا یہ جو عظیم الشان پیمانہ تیار ہو رہا ہے اس کے اندر تضاد، نامطابقت یا عدم استقلال ضرور رونما ہوگا اور یہ نامطابقت، عدم استقلال اعلیٰ قسم کا ادبی مسالا بن سکتا ہے۔ ژوف کا یہ خیال عمل میں آجائے تو اعلیٰ مرتبہ کی ادبی تصانیف جو بن آ سکتی ہیں، اور چونکہ یہ ادبی تصانیف موجودہ انداز تصور سے وابستہ اور طرز تخیل سے ماخوذ نہ ہوں گی اس لئے ایسے ادب کی خصوصیت کبریٰ سائنسی ادب کی نئی شان ہونا ہوگی۔

۵۷

سوویٹ سائنس دانوں کی سماجی یعنی غیر علمی زندگی کے حالات نے سوویٹ مصنّفوں اور ڈراما نویسوں کی خاص توجہ جذب کر رکھی ہے۔ لیوناف کا مشہور ناول "اسکٹارھیکی" جس پر اہلِ فن نے سنجیدہ تبصرے کئے اس قسم کی اعلیٰ تصنیف ہے۔

لیوناف کا مقصد سائنس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے اندر سماجی اختلاف کو آشکار کرنا ہے اور اسکی خاص تصنیف ایک مشہور طبیعیاتی کی سوویٹ حکومت کا حامی بن جانا، یا کہئے کہ اُس عبوری حالت کو منظرِ عام پر لاتا ہے جو افسانے کی ابتدا کے وقت مکمل ہو چکی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ناول کا ہیرو فسانہ شروع ہونے سے پہلے، سوویٹ کا حامی بن چکا تھا لیکن اس تغیّر کو فسانے کے اندر برجستہ کار لایا گیا ہے

کفّ رن کی رائے میں لیوناف نے اس موضوع کو اُس زور آور اظہاریت کے ساتھ پیش نہیں کیا جس کا کہ وہ موضوع مستحق و متقاضی تھا۔ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ لیوناف ایسے سائنسداں کا کردار پیش کرتا ہے جس کے متعلق لیوناف کی رائے سے تو نہیں بلکہ قیاسی یا تعصب سے متاثر ہے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک حد تک ناول کا پلاٹ پُرانے ہی ڈھرّے پر چلتا ہے یعنی باپ ایک جماعت میں اور بیٹا مخالف گروہ کے ساتھ ہو ایک نئی

ہو جاتی ہے وغیرہ - ایسی صورتِ واقعہ اگرچہ "سوویٹ واقعیت" میں بھی ناممکن الوقوع نہیں، لیکن لیوناف کے ناول میں، واقعات کی یہ صورتیں مصنوعی معلوم ہوتی ہیں دوسری ممکن وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ناول کا مسالا رسمی طور پر تو نامناسب نہیں ہے لیکن اس کے اندر وہ قطعیت (Concreteness) مفقود ہے جو اُس مسالے کو پُرزور اور پڑھنے والے کی دلچسپی کا سبب بناتی ہے۔

لیوناف نے اگر روزمرہ کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ گہرا کیا ہوتا جن کے بغیر کوئی سائنس داں اپنے کام کا تصوّر ہی قائم نہیں کر سکتا، وہ اگر ایک سائنس داں کی زندگی کے مشاہدے میں اپنے تعصب و قیاس کو راہ نہ دیتا تو اسکٹار تغیکی کا کردار اور مجموعی حیثیت سے وہ ناول بہت بہتر ہوتا۔

"اپنا کر جیتا" میں ٹالسٹائی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک نقاش نقاشی کے تمام انداز (Forms) کا علم حاصل نہ کر سکے، کیونکہ حقیقی نقاشی کے اندر جس کا ملہم خود زندگی ہے، یہ علم نقاش کو از خود حاصل ہو جاتا ہے۔ لیوناف کا ناول ٹولسٹائی کے اس نظریئے کا ثبوت نہیں دیتا۔ اس کے ہیرو کی دریافت کا تعلق زمان و مکان سے معلوم ہی نہیں ہوتا، اور پڑھنے والا بالکل نہیں سمجھ سکتا کہ ہیرو کی اس دریافت کا درجہ تاریخ سائنس میں کیا ہے۔

اس کے برخلاف Zoshchenkov نے اپنی تازہ تصنیف Youth Returned میں لیوناف کے طریقے سے جدا راہ اختیار کی ہے لیوناف ایک ایسے سائنس داں کو پیش کرتا ہے مگر زوشچنیکوف نے ایک سائنسی ناول لکھنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔

(Youthreturned) ایک کامیاب کتاب ہے اور اس کو کامیاب بنانے والی خصوصیات معمولی غور سے روشن ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو مصنف کی جراَتِ انشا ہے، اس لئے کہ عام طور پر سوویٹ مصنف کبھی اپنی تصنیف میں اپنی ذات کو داخل نہیں کرتے۔ زوشچنیکوف نے اس کتاب میں جہاں تہاں اپنے متعلق اشارے کئے ہیں، یہ اشارے اسی لئے قابل قدر ہیں کہ وہ "ذاتی" ہیں۔ اس سے پہلے Derzhavin کے سوا کسی سوویٹ مصنف نے اپنے متعلق کسی ادبی تصنیف میں ایسی دلیری نہیں دکھائی مگر زوشچنیکوف کے یہ اشارے سائنٹیفک ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ان اشاروں کو سائنٹیفک نہ مانے لیکن مصنف کی ذاتی انہماک و دلچسپی کے بارے میں کسی کو شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ زوشچنیکوف ایک جگہ لکھتا ہے "وہ کتّا جس پر تجربہ کیا گیا میں تھا" یقیناً کوئی سوویٹ مصنف اِس صاف گوئی کو اپنی ادبی تصنیف میں روا نہ رکھتا۔

اس کتاب کے کامیاب ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس نے ایک ایسے سائنس کو بروز دینے کی کوشش کی ہے جو عام پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کی چیز ہے۔ اگرچہ بعض ماہرین طبیعیات نے اس پر اعتراض کئے ہیں اور ممکن ہے کہ جو طبی نسخے اس کتاب میں درج ہیں صحیح ہوں لیکن غور کی بات یہ ہے کہ مصنف نے یہ کتاب پڑھنے والے کی جگہ پر لکھی ہے —— ایسے پڑھنے والے کی طرف سے جو پینتیس سال کی عمر میں حیران ہے کہ اس کے اعصاب میں انتشار کیوں ہے؟ اس کی آنکھوں کی چمک کیا ہوئی؟ اس کا چہرہ پھیکا اور پیٹ مختل کیوں ہے؟ اور اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایسی کتاب لکھ لینا جس کا وہ پڑھنے والا جس میں یہ علامتیں موجود ہوں، یہ سمجھنے لگے کہ یہ کتاب خود میں نے لکھی ہے، آسان کام نہیں۔

تیسری دلیل کہ یہ ناول کامیاب ہے یہ ہے کہ اس کی طرز جدید اور انداز مناسب ہے۔ زوشچنیکوف نے اپنی مستقل ذکاوت اور ذہانت سے اپنی طرز کو سائنس کی طرز سے ملا دیا ہے۔

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ سائنسی ادبی تصنیف میں مصنف کے ذاتی واقعات شامل ہو جانے سے کوئی حیرت انگیز نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے مگر یہ امر واقعہ ہے کہ زوشچنیکوف کسی اختراع کا موجد ہو یا نہ ہو، لیکن اس کی یہ تصنیف ادب کا ایک نادر نمونہ ضرور ہے۔

آخر میں یہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تبصرے میں جو تنقیدی اشارے کئے گئے ہیں ان کو سائنسی ادب کا نمونہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ نظریاتی مقالوں میں یہ سوال حل نہیں کیا جا سکتا وہ تو خود ادب ہی کے اندر حل ہوگا اور سوویٹ ادب میں سائنسی ادب کا سوال پیدا ہو چکا اور اس پر کافی توجہ صرف کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جس چیز کو سائنسی ادب کا مسالا کہا جا سکتا ہے یعنی سوویٹ سائنس کے اعلیٰ دماغوں کے گہرے علمی خیالات، وہ اہم واقعات جو سوویٹ نفسیات کو از سر نو ڈھال رہے ہیں، اور سوویٹ لوگوں کا عالمگیر نقطۂ نظر، یہ سب باتیں سوویٹ ادب میں جھلکیں گی!

ل - احمد

نیاراگ

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

تا ۵ دسمبر ۱۹۴۰ء

پریم بندھن

نوجوان جوگی وندھیاچل کی پہاڑی پر کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ایک حسرت و مایوسی تھی۔ گرو کے حکم کے مطابق اسے کل ان تمام سرسبز میدانوں، دلفریب جھیلوں، ان خوش آیند مناظر کو، جہاں اس نے بچپن سے جوانی تک اپنی زندگی بسر کی تھی ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا تھا۔ گرو کے حکم میں دم زدن کی مجال نہ تھی۔ نوجوان جوگی نے اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا، لیکن وہ اس وقت بھی کھڑا ہوا ان مناظر کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

دوسرے دن رخصت کے وقت تمام گاؤں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ انہیں جوگی سے انسیت تھی۔ وہ جوگی کو جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ مجمع سے ایک ضعیف آدمی آگے بڑھا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں عقیدت کے آنسوؤں سے تر تھیں اس نے کہا:—

"جوگی نہ جاؤ ہمارا گاؤں ویران ہو جائیگا۔ ہم بوڑھوں کی کون دیکھ بھال کرے گا"

ایک بیوہ عورت آگے بڑھی اور بولی:—

"جوگی تو ہمارا سہارا ہے، کیا اب یہ سہارا بھی ٹوٹ جائیگا۔ کیا تو ہمیں چھوڑ کر چلا جائیگا۔ تیرے بعد ہمارا کون ہے؟"

ایک بچہ بھیڑ میں سے دوڑ کر جوگی کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا:—

"میں تمہیں نہیں جانے دونگا"

جوگی نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مجمع پر ایک محبت بھری نظر ڈالی اور کہنے لگا:—

"مگر مجھے جانا ہی ہوگا"

مجمع سے آواز آئی،

"آخر کیوں؟"

جوگی بولا،

"یہ گرو جی کا حکم ہے۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے، یہاں سنسار اور سنسار کا بوجھ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ گرو جی کا خیال ہے کہ میں یہاں رہا تو میری آتما شکتی نہیں پا سکے گی، میں تباہ ہو جاؤنگا، تم مجھ سے دور سہی مگر تمہاری یاد میرے دل میں رہے گی۔ میں اپنے محبوب نظروں، اپنے محسنوں کو نہیں بھول سکتا"

لیکن جوگی کی نظروں میں کچھ اضطراب و بےچینی تھی، وہ چاروں طرف بیتابی سے نظریں ڈال رہا تھا۔ آخر مایوس ہو کر اس نے حسرت سے گردن جھکا لی۔

جوگی کو حکم تھا کہ آج ہی رات کو گاؤں سے چلا جائے۔ شام ہو چکی تھی، اندھیرا چھا رہا تھا، جوگی مجمع میں ایک ایک سے ملا، لیکن اس کی نظروں کا اضطراب، اسکے دل کی بیقراری ویسی ہی رہی۔ اب اندھیرا چھا چکا تھا، جوگی سب سے ملکر چلا اور ایک طرف تاریکی میں غائب ہو گیا۔

چندرا گاؤں کی ایک خوبصورت مگر غریب لڑکی تھی۔ وہ کھیت میں کام کر کے اپنا پیٹ پالتی تھی۔ باپ اور ماں دونوں مر چکے تھے اس کی صرف ایک خالہ تھی جو دوسرے گاؤں میں بیاہی گئی تھی او۔

وہیں رہتی تھی۔ چندرا کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی گاؤں کے ایک کنارے پر
تھی جہاں وہ تنہا ہی رہتی تھی۔ یہ اس کو ماں اور باپ کے بعد ترکہ میں
ملی تھی۔

اب رات ہو چکی تھی۔ جھونپڑی کے دروازہ پر کسی نے آہستہ سے
آواز دی۔

"چندرا"

پھر چند لمحوں کے وقفہ کے بعد کسی نے کہا،

"چندرا"

اور پھر بغیر کسی جواب کا انتظار کئے ہوئے دروازہ کھولکر
اندر داخل ہو گیا۔

چندرا بیہوش پڑی تھی،

جوگی یہ دیکھ کر گھبرا گیا، چندرا کے چہرے پر پانی چھڑکا، اسکا
سر اُٹھا کر گود میں رکھا اور دامن ہلا کر ہوا دینے کی کوشش کرتے ہوئے
ایک اضطراب انگیز لہجہ میں پکارنے لگا،

"چندرا، چندرا"

تھوڑی دیر کے بعد چندرا کے جسم میں کچھ حرکت ہوئی اس نے
آہستہ آہستہ پلک اُٹھائی اور آنکھ کھولدی۔

جوگی بولا،

"چندرا۔ دیکھو میں وداع ہونے آیا ہوں۔ سب لوگ مجھ سے
ملنے آئے تھے۔ تم نہیں آئیں چندرا، میں تم سے ملے بغیر کیسے جا سکتا تھا
میں خود ہی چلا آیا"

چندرا کے بے اختیار آنسو بہنے لگے، بولی،

"میں جانتی ہوں، میری وجہ سے تمہیں دیس نکالا مل رہا ہے،
میری وجہ سے تمہیں اپنا گھر، اپنا گاؤں، اپنا سب کچھ چھوڑ دینا پڑ رہا ہے
میری وجہ سے بھگوان تم سے خفا ہو جانے والے ہیں، میری وجہ سے، مگر
شاید اب اس کی ضرورت نہ ہو گی، جوگی تم نے ٹھیک کہا ہے۔ تم وداع
ہونے کے لئے آئے ہو، اپنی شانتا سے وداع ہونے کے لئے۔ میں تمہارے
لئے اس قدر مصیبتوں کا باعث نہیں بنوں گی۔ میں وداع ہو جاؤں گی جوگی
سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اب سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا"

"چندرا۔ چندرا تم کیا کہہ رہی ہو"

"ہاں میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں جوگی سب کچھ جلد ہی ختم ہو جائیگا
اب سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ اب گرو جی تم سے ناراض نہیں ہونگے،
تم گاؤں سے اب نہیں نکالے جاؤ گے"

"مگر چندرا میں تو گرو جی سے رخصت ہو آیا ہوں۔ بعض دفعہ
انسان خود بھی تو نہیں سمجھتا کہ کیا کر رہا ہے۔ دیکھو نا۔ گرو جی مجھے رخصت
کرنے آئے تھے۔ میں ان سے رخصت ہو گیا۔ تم مجھے رخصت کرنے
نہیں آئی تھیں، میں خود آکر تم سے مل گیا"

"آہ یہ تم نے کیا کہدیا جوگی، تم نے کیا کہدیا۔ بھگوان! کیا یہ بھی
میرے بھاگ میں تھا، کیا اتنا ہی کافی نہ تھا۔ بھگوان! یہ کیسے شعلے سے
بھڑک اُٹھے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا، جوگی یہ تم نے کیا کہدیا"

"چندرا، میں سچ کہہ رہا ہوں، یقین کرو چندرا"

"جوگی! ..... مگر اب یہ سب بے سود ہے۔ اب سب کچھ جلد
ہی ختم ہو جائے گا۔ میں نے زہر کھا لیا ہے۔ اب سب کچھ جلد ہی ختم
ہو جائے گا"

"چندرا یہ تم نے کیا کیا!"

"کچھ نہیں جوگی، پریم پر ایک چھوٹی سی بھینٹ چڑھائی ہے اور کچھ
نہیں۔ یہی تو زندگی ہے، جو ہم چاہیں وہ پاکر بھی نہ پا سکیں، یہی تو جیون
ہے، تم نے بہت اچھا کیا جوگی تم آ گئے، مجھے سب کچھ مل گیا، شکتی،
شانتی، میں سوچ رہی تھی میرے دیوتا مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے، میں
سوچ رہی تھی، اب میں کس کے قدموں میں جان دوں گی، یہ سوچ کر مجھے
مرنے سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ مگر تم بڑے دیالو ہو۔ تم آ گئے، مجھے سب کچھ
مل گیا، مجھے سہارا دو جوگی مجھے سہارا دو کہ اُٹھ کر ایک دفعہ آخری دفعہ
ان قدموں کو چھو لوں جوگی، میری دنیا مجھے مل گئی۔ مجھے سہارا دو کہ
اُٹھ کر ان چرنوں میں اپنا سر رکھ دوں اور ہمیشہ کی نیند سو جاؤں"

ایک بجھا ہوا سا تبسم چندرا کے لبوں پر دم توڑ رہا ہے۔ اسکی آنکھوں
میں آنسو جھلک رہے تھے۔ ان میں نشہ کا سا خمار چھایا ہوا تھا۔ اس نے
اُٹھ کر اپنا سر جوگی کے قدموں میں رکھ دیا اور دو ہچکیاں لیکر خاموش
ہو گئی، جوگی بالکل ایک بت کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت تھا!

دوسرے دن صبح، تمام گاؤں کے لوگ چندرا کی جھونپڑی پر جمع تھے۔ جوگی خودکشی کر چکا تھا۔ دونوں لاشیں اندر پڑی تھیں، گرو کھڑا ہوا اپنے کئے پر آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا جو جوگی نے مرتے وقت اپنے دوست رامو کو لکھا تھا۔ پرچہ میں تحریر تھا:۔

"رامو بھیا! گرو جی کے پاس جانا اور کہنا، جوگی نے آپ کو پرنام کہا ہے، ان سے کہنا چندرا محبت کی قربان گاہ پر نثار ہو چکی، اب میری باری ہے۔ ان سے کہنا آپ کا جوگی زندگی کی طرح موت میں بھی ہار گیا اسکے جیون کو آپ نے ٹھکرا دیا تھا۔ اور اس کی موت کو چندرا نے ٹھکرا دیا وہ بازی لے گئی۔ میں ایک ہاری ہوئی موت مر رہا ہوں اس لئے —— اس لئے کہ اب شاید کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا ہے، رامو بھیا! گرو جی سے کہنا آپ نے میرے جیون کو توڑ ڈالا، چور چور کر دیا۔ مگر آپ میرے پریم کو نہ توڑ سکے —— شاید —— شاید اس لئے کہ میرا پریم آپ کے دھرم سے بھی زیادہ پکا۔ زیادہ مضبوط تھا۔ رامو بھیا! گرو جی سے کہنا کہ جوگی نے مرتے وقت ایک بات سمجھی ہے —— بہت بڑی بات، —— سارے دھرموں کا خلاصہ —— کہ جیون اور آتما کی مکتی بگاڑ اور جدائی میں نہیں، ملاپ اور پریم میں ہے۔"

جمیل احمد بی، اے، بریلوی

صرف اک پرواز

یہ ادائے خرام و مستیٔ ناز — گردشِ ماہ بھی ہے پا انداز
کیا لبھائے انہیں مری آواز — ساز ہے، ساز بھی شکستہ ساز
وہ ہیں نازک سماعت و نازک — سن نہ لیں دکھ بھری مری آواز
نگۂ غور سے نہ دیکھ مجھے — خود بخود کھل رہا ہے دل کا راز
دل کا انجام دیکھئے کیا ہو — ہو رہا ہے شباب کا آغاز
میری ہستی کو مست کر ڈالا — حسنِ رنگیں ہو تیری عمر دراز

ارض کو آسماں بنا ڈالو
زندگی کیا ہے صرف اک پرواز

پرواز مچھلی شہری

سایہ نما قاتل

مسلسل

(دوسری قسط)

چاندنی اب ذرا اور تیز ہوگئی تھی اور چاروں طرف نور پاشیاں شروع ہوگئی تھیں۔ آنے والوں میں سے دو کے ہاتھ میں برقی مشعل تھے ناکمبھ کو فانڈا محل کے معزز مکینوں کا علم پہلے سے تھا۔ اس نے تین آدمیوں کو فوراً ہی پہچان لیا اک تو تھا خاندانی وکیل، دوسرا اینیل ڈاکٹر تھا خاندانی طبیب اور تیسرا مارس دین تھا جس نے حال ہی میں راجہ صاحب کی لڑکی سے شادی کی تھی "خیریت تو ہے؟" مارس دین نے تیزی سے پوچھا اور ٹھیک اسی وقت مشعل کی روشنی ناکمبھ اور انسپکٹر پر ڈالی۔

"تم پولیس والے ہو؟ تم کون ہو۔؟" وہ یکایک سکڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اس کی نگاہ ایک اچانک مردے پر پڑ گئی تھی۔ پناہ! یہ تو ہمارا بڑا مالی ہے۔ کیا وہ مر چکا ہے؟"

ہاں ناکمبھ کا لہجہ سنجیدہ تھا، نظریں مشین تھیں "اب کوئی ضرورت نہیں ڈاکٹر صاحب آپ کا شکریہ۔ ڈاکٹر اینیل لاش کی طرف بڑھ کر رک گئے۔ "مہربانی کر کے آپ سب لوگ یہیں رہیے ابھی ہم ——"

کسی نے کان بھی نہ ٹیکا مارس دین کی رہبری میں سب نے مقتول کو گھیر لیا۔ ناکمبھ کے لبوں پر ایک لعنت آتے آتے جذب ہوگئی۔ جمہوری جذبے نے نشانِ قدم کے سوراخ کو اپنی روا روی سے پاش پاش کر دیا تھا طویل مرتعش لمحے گزرتے رہے جسم کشادہ، خوفزدہ لوگ کھڑے ہوئے مقتول مالی کو دیکھ رہے تھے۔ وحشت تھی۔ پھر بھی اچانک اور تیز موت کی موجودگی جاذبِ نگاہ تھی۔

مارس دین سب سے پہلے پیچھے ہٹا اور اپنی نگاہ بلند کی۔

"کیونکر —— کیسے ——؟"

ناکمبھ کو کچھ چھپانا نہ تھا اس نے صاف صاف کہدیا۔

اس نے تمہیں فون پر اطلاع کی تم لوگ عین موقعہ پر پہنچ گئے۔ تم نے سایہ نما قاتل کو دیکھا پھر بھی تم مالی کو نہ بچا سکے۔ مارس دین نے غصہ میں بھر کر کہا تم تو اس قابل ہو کہ ——"

"طعن تشنیع سے ہمیں فائدہ نہ پہنچے گا،" ناکمبھ نے بات کاٹ کر کہا واقعات جس طرح میں نے بتایا ہے اسی طرح ظہور پذیر ہوئے مجھے یقین ہے کہ قاتل بھاگ کر گھر میں گھس گیا میں ہر شخص سے باری باری جرح کے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ مارس دین صاحب برائے مہربانی اس کا انتظام کرد یجئیے کہ خاندان کے ارا کین، نوکر و مہمان سب کے سب کتب خانہ میں آکر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔

"بیشک مارس دین نے جواب دیا، مگر آخر غریب مالی کے قتل کرنے کی وجہ بھی تو ہو"

ظاہر ہے کہ قاتل کی ترکیب یہ بھی تھی،" ناکمبھ نے کہا اب آپ لوگ مہربانی کر کے سب کے سب اندر چلے جائیں۔ سب لوگ محل کی طرف مڑے۔ انسپکٹر آبادے نے مڑ کر اپنا رومال مقتول کے ڈراونے چہرے پر پھیلا دیا۔ پھر وہ اور جاسوس دونوں محل کی طرف شانہ بشانہ روانہ ہوئے۔ ناکمبھ کے داہنے ہاتھ میں رومال میں لپٹا ہوا چاقو تھا۔

— الیشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

"بہتر ہوگا کہ مجھے یہ چاقو دیدو" انسپکٹر نے ناکمبھ کے ہاتھ سے چلتے وقت وہ چاقو لے لیا "تم جبتک لوگوں سے پوچھ گچھ کروگے میں ماتسن کو بلالوں گا تاکہ وہ نشانات کی تحقیق کرسکے۔ لاش فانڈا محل کے رہنے والوں کے حوالہ کردی جائیگی۔ یہ بڑا مالی تھا۔ غالباً اس کی تجہیز وتکفین محل والے کرینگے پنچایت نامہ کل صبح مرتب ہوجائیگا۔

ناکمبھ نے بے خیالی میں اپنے سر کو اک تکان دی متردد زبان سے پردہ اُٹھایا۔ سب لوگ صدر دروازے سے داخل ہوئے آدھی دہلیز میں پہنچکر انسپکٹر آبادفون کی طرف مُڑے ناکمبھ نے وحشت زدہ زبان سے پوچھا کتب خانہ کدھر ہے۔ دربان نے چپکے سے کہا اوپر والی منزل پر داہنے ہاتھ۔

ناکمبھ نے اقراری جنبش سر کو دی اور دبیز قالینوں سے منڈھے ہوئے زینہ پر چڑھنے لگا۔

وہ کتاب خانہ کی طرف مُڑنے والا ہی تھا کہ پہلو والے کمرہ کی ذراسی کھُلی ہوئی درج سے ایک سفید پوش نرس دکھائی دی۔

ناکمبھ نے دو قدم بڑھ کر پوچھا "اس کمرہ میں کون ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا راجہ صاحب فانڈا ہیں اس کی بڑی اور وحشی آنکھیں کچھ اور کھُل گئیں۔ براہِ کرم اندر تشریف نہ لائیے گا مگر یہ تو بتائیے کہ قصّہ کیا ہے۔

"قتل ہوا ہے قتل" ناکمبھ نے بے ساختہ جواب دیا بڑا مالی چھُری سے ہلاک کیا گیا ہے۔ میں اس کمرے کو بھی اندر سے دیکھونگا۔

جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کمرے میں داخل ہوگیا مگر وہ دو ہی قدم اندر چل کر ٹھٹھک گیا۔ اس کی نگاہیں ایک پُرانی وضع کی نفیس مسہری پر جم کر رہ گئیں۔ مریض بہت سے تکیوں کے سہارے لیٹا تھا، سر ذرا سا اُٹھا ہوا تھا۔ اسکے چہرے پر جھریوں کے جال پڑے ہوئے تھے مگر اب بھی خود داری اور استقلال کی جھلک چہرے سے صاف ہویدا تھی۔ ناکمبھ نے اس مریض کو فوراً پہچان لیا یہ کروڑپتی راجہ صاحب فانڈا تھے۔

براہِ کرم میری مداخلت کو معاف فرمائیے میں سارجنٹ جاسوس ہوں ایک قتل کی تفتیش کررہا ہوں۔ آپ کے مالی کو کسی شخص نے چھُری سے ہلاک کردیا ہے جو کالے کپڑے پہنے ہوئے تھا اسکے ہاتھ میں ایک روشن مگر بھیانک نقاب تھا۔ مجھ کو یقین واثق ہے کہ قاتل اسی خاندان کا ایک رکن ہے اور وہ اس وقت بھی یہیں کہیں موجود ہے۔

راجہ صاحب بُت بنے رہے مگر ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہوئی جس سے بے بسی اور غصّے کا اظہار ہورہا تھا مگر ٹھیک اسی وقت نوجوان نرس ناکمبھ کے شانے پر ٹھوکے دے رہی تھی۔

جناب سارجنٹ صاحب آپ راجہ صاحب سے ایسی وحشتناک خبریں نہ بیان کیجئے۔ وہ بہت زیادہ بیمار ہیں وہ اپنے جسم کے کسی حصّے کو آنکھوں کے سوا جنبش نہیں دے سکتے نہ بول سکتے ہیں۔

"مجھے یہ سُن کر بڑا رنج ہوا" ناکمبھ نے مسہری کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔ سیاہ آنکھوں نے زبان بے زبانی سے شکریہ ادا کیا اور پھر ناکمبھ کی آنکھوں میں گڑ گئیں گویا وہ انتہائی کوشش میں تھیں کہ وہ اپنا پیام سارجنٹ تک پہنچا دیں اس گھورنے نے ناکمبھ کو مجبور کردیا کہ وہ نرس سے پوچھے "کیا راجہ صاحب سُن اور سمجھ سکتے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں لڑکی نے فوراً کہا اور آپ کو ان کی آنکھوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آپ کی خبر نے انہیں حواس باختہ کردیا۔ مہربانی کرکے آپ چلے جائیے ورنہ ان کی حالت اور بگڑ جائے گی۔

ناکمبھ مذبذب سا ہوگیا اور مسہری کی طرف گھورتا رہا کالی آنکھیں شعلہ افشاں رہیں۔ سارجنٹ کے چھٹے حواس نے بتایا کہ مریض اپنا مفہوم کہنے کے لئے بیتاب ہے ناکمبھ نرس کی طرف بڑھا۔ "تم کہتی ہو کہ راجہ صاحب دیکھ سکتے ہیں، سُن سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں مگر بول نہیں سکتے تو پھر ان سے تبادلۂ خیالات کس طرح ہوتا ہے؟"

کیوں نہیں لڑکی کی آنکھیں اور بڑی ہوگئیں۔ ہم لوگ مریض سے سوال کرتے ہیں وہ اگر ایک مرتبہ آنکھیں جھپکا دے تو نہیں ہے اور دو مرتبہ پلکیں جھپک جائیں تو ہاں ہے۔

ناکمبھ مُڑ کر دو قدم اور مسہری کی طرف بڑھا۔

"کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

کالی آنکھیں دو مرتبہ جھپکیں۔

"شائد" ناکمبھ کہتا گیا "آپ نقاب پوش سایہ نما قاتل کو جانتے ہیں؟"

مریض کی آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں اور پلکیں دو مرتبہ جھپکیں۔

ناکمبھ یہ سوال کرتے وقت کانپ سا اُٹھا "آپ کو یقین ہے کہ قاتل آپ ہی کے خاندان کا ایک رکن ہے؟"

فوراً شعلہ ور سیاہ آنکھوں نے اثباتی اشارہ کیا۔ "تو پھر" ناکمبھ نے شوق آمیز لہجہ میں کہا "میں تمام ممبرانِ خاندان کی ایک فہرست مرتب کردوں گا اور آپ کے پاس آکر باری باری ایک ایک کا نام پڑھتا جاؤں گا آپ کو جس پر شبہ ہوگا اس کے نام پر دو مرتبہ پلکیں جھپکا دیجئے گا۔

راجہ صاحب کی آنکھیں قبالی طور پر جھپکیں۔ یکایک نیم وا دروازے پر آہٹ ہوئی اور مارس دین داخل ہوا۔ میں نے سب کو جمع کرلیا ہے سوا میرے خسر اوران کی نرس کے۔ سارجنٹ صاحب ادھر تشریف لائیے اور جرح قدح شروع کردیجئے۔

ناکمبھ نے سر ہلایا اور مارس دین کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں اس نے کہا خوش قسمتی سے ایک سبیل نکل آئی ہے۔ راجہ صاحب میری رہنمائی کرسکیں گے۔

"ہاں" مارس دین نے کہا میں نے آپ کی باتیں سُن لی ہیں مگر سارجنٹ صاحب آپ کو یہ نکتہ کبھی بھولنا نہ چاہئے کہ امیر آدمی کی نگاہ میں اسکے خاندان کا ہر رکن مشتبہ ہوتا ہے۔

ناکمبھ نے کتب خانہ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا راجہ صاحب ایسے کم ظرف نہیں ہوسکتے۔ مارس دین نے ہنس کر اور ایک طرف مڑتے ہوئے کہا خیر آپ ان سب کی خبر لیجئے۔

(۵)

ناکمبھ نے دروازہ میں داخل ہوتے ہی ان پر ایک گہری نگاہ ڈالی دو مائیں ہچکیاں بھر رہی تھیں اور گہری خاموشی تھی، سنگین اور روح فرسا سکوت کمرہ میں چھایا ہوا تھا۔ الماریاں اور میز کرسی بھی متین، مغموم اور لرزاں نظر آرہی تھیں، اس نے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور دو قدم آگے بڑھا

اس کی آنکھیں ایک سے دوسرے کی طرف ایسے جارہی تھیں جیسے وہ تصویر کھینچنے کے کیمرا ہوں اور زد میں آجانے والے تمام نقوش محفوظ ہوں۔

اس نے باری باری ہر ایک کو غور سے دیکھا سہولت اور احتیاط تھی جلد بازی نہ تھی۔ اسے احساس تھا کہ ان میں سے کوئی بھی قاتل ہوسکتا ہے اور وہ شخص یقیناً دماغی ہیجان میں مبتلا ہوگا پولیس کی ایک سرد اور دل میں اُتر جانے والی نگاہیں ضرور اس ہیجان میں اور تموّج پیدا کردیں گی ممکن ہے کہ کسی کی آنکھوں میں بےچینی اور لبوں میں حرکت پیدا ہوجائے۔

اس مجمع کے خارجی حاشیہ پر قب صاحب خاندانی مشیر قانون لانبا قد، اکہرا جسم، چالیس کے لگ بھگ، ہاتھ پاؤں سے فولادی قوت اور صلاحیت معلوم ہورہی تھی، باز کی سی ناک، پتلے پیوستہ ہونٹ جو دونوں باچھوں کی طرح ذرا سے جھکے ہوئے تھے اور بے رنگ تیز آنکھیں جنہوں نے ناکمبھ کی پوری نگاہ کا پورا جواب دیا۔ وکیل کی بغل میں ڈاکٹر اینل صاحب تھے، جوانی تھی اور وہ تیس کے قریب تھے چھ فٹ لمبے تھے اور اعضا میں تناسب تھا، ان کی ہر حرکت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سیکھے سکھائے پہلوان ہیں۔ ڈاکٹر اینل کی آنکھیں ناکمبھ کی نگاہوں کے سامنے ذرا بھی نہیں جھپکیں مگر جیسے ہی ڈاکٹر نے اپنی آنکھیں ذرا سی جھکائیں ناکمبھ اُچھلتے اُچھلتے رُک گیا۔

ڈاکٹر کالا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور کالی واسکٹ تھی۔ پتلون بھی سیاہ گوں کپڑے کا تھا۔ مگر ناکمبھ کی آنکھیں کوٹ میں سل گئی تھیں۔ ٹھیک بیچ والے بٹن کے پاس کوٹ میں ایک ہلکی سی سلوٹ تھی۔ بجلی کی طرح ناکمبھ آنکھوں کے سامنے لان کی دھینگا مشتی سایہ نما قاتل کی لپا ڈگی اور اسی سلسلہ میں چاقو کی نوک سے کوٹ کی خراش! یہ سب تصویریں پھر گئیں۔

آنکھوں میں چمک ہونٹوں میں سختی اس طور سے دوسرے کی طرف مُڑا۔ مارس دین کے قریب ایک بے رنگ عورت اسی کی ہمسن بیٹھی ہوئی تھی، مارس دین نے کہا یہ میری بیوی ہیں۔ سارجنٹ صاحب کی آنکھیں ایک لمحہ تک اس سر بہ گریباں اور جھکے ہوئے شانوں کی عورت پر جمی رہیں۔

ناکمبھ نے سر ہلایا اور اس کی نگاہیں دوبارہ مارس دین کی

طرف مڑ گئیں۔

مارس دین کی عمر قریب چالیس کے تھی۔ بلند قد، سخت اور ورزشی بدن تھا۔ دونوں پانوں میں متوازن فاصلہ تھا، وہ ناکمبھ سے اپنی فولادی برنجی آنکھیں ملائے ہوئے تھا۔ اس کے نفیس کھڑے ہونے کے انداز نے ناکمبھ کو یاد دلا دیا کہ مارس دین کو دبھاند میں بہت مشتاق تھا اور چاروں طرف شہرت تھی۔

سارجنٹ کو اس کی سخت اور بیداغ نگاہوں نے بتا دیا کہ وہ امریکن تھا اور راجہ صاحب فانڈا کی بڑی لڑکی سے پہلے وہ ایک جہاز پر جاسوس کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا جو جزائر برطانیہ کے قریب نذر طوفان ہو گیا تھا

حقیقت یہ ہے کہ تمام باتیں ایک لمحہ میں ناکمبھ کو یاد آ گئیں مارس دین نے ایک مرتبہ راجکمار فانڈا کو ایک بحری سفر میں تاش کے پھکیتوں کے ہاتھ سے بچا لیا تھا۔ اسی وجہ سے مارس دین کی بڑی آؤ بھگت راجہ صاحب کے یہاں ہوئی اور طرہ کامیابی یہ تھا کہ جین فانڈا کے ساتھ شادی ہو گئی۔

ناکمبھ نے دماغی طور پر فیصلہ کر لیا کہ مارسدین کی حالت بہت نازک ہے یکایک تنخواہ دار جاسوس سے بڑی شاہزادی کا شوہر بن جانا غضب کی خوش بختی تھی۔

ناکمبھ کی نگاہوں میں اب بھی شدید فکر کی جھلک تھی۔ اس نے سمٹے سمٹائے نوکروں پر چھچھلتی سی نظر ڈالی اور پھر جارج فانڈا اور کلوداکو دیکھنے لگا۔ نوجوان مشکل سے ۳۰ کا ہوگا لڑکی دو تین برس اور کم کی تھی۔ مارس دین کی بیوی اور یہ مل کر فانڈا محل کے پورے مکین تھے اور بس۔

جارج فانڈا پتلا دبلا تھا گویا مریض ہو۔ چہرے سے ضعف اور شیطنت برستی تھی۔ ناکمبھ کی تیز نگاہوں کے زیر اثر اس نے دو تین مرتبہ طرز نشست بدلی .... دم سکڑ گیا۔

"یہ تو اتنا بھی نہیں کہ کسی بلی کو مار سکے" ناکمبھ نے ذہنی فیصلہ کیا اور کلوداکی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بڑی حسین تھی، اوسط سے زیادہ لمبی، اکہرے جسم کی تھی، مگر اعضا میں بلا کا تناسب تھا

کی ہے اور ورزشی ہے" ناکمبھ نے طے کر لیا "جانے کون خوش نصیب منگیتر ہے" ناکمبھ حسینہ کی بیچ والی انگلی پر ہیرے کا بسنتی چھپا دیکھ کر حیران ہو گیا۔

اس نے اپنی آہستہ اور خاموش نظر بازی ختم کر کے غیر جانبدارانہ لہجہ میں کہا۔

(۶)

"میں جاسوس سارجنٹ ناکمبھ ہوں۔ تم میں سے کچھ لوگ مجھے جانتے ہوں گے مگر یہ سب کو معلوم ہے کہ فانڈا محل کا مالی ابھی ابھی چاقو سے مار ڈالا گیا ہے" اب اس نے پھر تیز نظر سے ایک ایک کو دیکھا اور وقفہ کے بعد کہنے لگا۔

"سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آدھی رات گئے شاہزادیاں اور راجکمار اور خاندانی وکیل اور ڈاکٹر پورے طور پر ملبوس یہاں کیوں جاگ رہے تھے اور کس کام سے اکٹھے تھے"

ف نے کہا "یہ ایک فطری سوال ہے، میں خاندانی وکیل کی حیثیت سے اس کا جواب دوں گا" اس کا لہجہ اسکے چہرے کی طرح خشک تھا "راجہ صاحب فانڈا بہت بیمار ہیں ان کی بیماری دنوں اور ہفتوں . . . . بلکہ مہینوں یا شائد سال بھر کھنچ سکتی ہے" اینسل نے معترض ہو کر کہا۔

"ہاں شائد سال بھر" مگر راجہ صاحب کو اندیشہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کس وقت دم اکھڑ جائے۔ لہذا انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کا آخری وصیت نامہ تمام ورثار کے سامنے پڑھ کر مصدق ہو جائے اور چونکہ راجہ صاحب ... .. چیرا نہوں نے آج آدھی رات کا وقت اس امر کیلئے مقرر کر دیا تھا۔ صرف یہی وجہ تھی کہ ہم سب یہاں تیار بیٹھے تھے۔

"شکریہ" ناکمبھ نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا "مگر جس وقت مہلوک مالی چیخ رہا تھا اور میرا پستول زناٹے سے چل رہا تھا اس وقت آپ لوگ کہاں تھے، سب اکٹھے تھے یا الگ الگ۔

جواب انفرادی طور پر ملے بعض آہستہ بعض لرزہ اور عجلت کے ساتھ معلوم نہ ہوا کہ چیخ اور پستول ماری کے وقت کوئی دو آدمی

ایک ساتھ نہ تھے۔

ناکمبھ نے کوئی تنقید نہیں کی اس کی خاموش نگاہیں ایک بار اور اینسل کے سیاہ کوٹ کی سلوٹ پر پڑیں۔ سب کہ چکے تو ناکمبھ نے کہا "نوکر جا سکتے ہیں اور لوگ ابھی رہیں تو بہتر ہے۔"

نوکر ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے۔ سارجنٹ نے دروازہ بند کر کے قفل بند کر دیا اور کنجی اپنی جیب میں ڈال لی۔ مارس دین نے تیز لہجہ میں پوچھا "سارجنٹ اس قید و بند کی کیا وجہ ہے؟"

ناکمبھ نے اطمینان سے کہا "وجہ یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ اسی کمرے میں سایہ نما قاتل موجود ہے۔"

ہر ایک نے دب دب کر سانس لی۔ ڈاکٹر کا چہرہ تمتما اٹھا، مشیر قانونی نے اپنے پتلے ہونٹوں پر زبان پھیری، مارس دین نے زیر لب زہرخند کیا۔ اس کی بیوی نے گویا سنا ہی نہیں۔ کلوداُبت بنی ہوئی گھورتی رہ گئی۔

ناکمبھ نے غور سے ردّ عمل دیکھا اور کہا۔

"مالی کے قتل سے پہلے فرش سبزہ پر مجھ سے اور سایہ نما قاتل سے ایک ایک جھوڑپ ہو گئی تھی۔ قاتل جو بھی ہو اس کے ہاتھ میں ایک چاقو تھا۔ اس کشمکش میں چاقو کی نوک میں نے دشمن کی طرف موڑ دی تھی، اور مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ کوٹ کے دامن سے الجھ گئی" ناکمبھ نے وقفہ دیا آنکھیں اور چمک گئیں پھر اس نے بہت آہستہ سے کہا۔

"اینسل تمہارے کوٹ پر اک سلوٹ ہے۔ یہ کیسے آئی؟"

سب کی نگاہیں ڈاکٹر کی طرف مڑ گئیں۔ اور آہ نما سانس نکل گئیں ڈاکٹر نے جھک کر اپنے کوٹ پر نگاہ کی۔ کامل سکوت چھا گیا ہر لحہ ایک عمر معلوم ہوتا تھا۔ نوجوان جارج ...... اور بھی لرزہ نصیب ہو گیا۔ ڈاکٹر امینل نے آنکھیں اٹھائیں چہرہ سفید تھا اور تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

"میں" (ہکلا کر) سارجنٹ کیا تم مجھ پر سایہ نما قاتل کا شبہ کرتے ہو؟

"میں نے تو یونہی پوچھا تھا" ناکمبھ نے کہا "کہ تمہارے کوٹ پر سلوٹ کیسی ہے؟"

جوان ڈاکٹر نے بڑی ہمت سے اپنے ہیجان پر قابو حاصل کیا۔

"میں اس کی وجہ بہت آسانی سے بتا سکتا ہوں۔ میں اپنے مریض کے کمرے میں تھا اور اپنا دستی بیگ ٹھیک کر رہا تھا، سامان رکھ ہی رہا تھا کہ چیخ کی صدائیں فضا میں بلند ہوئیں۔ میرا ہاتھ کانپ گیا اور تیز آلۂ شگاف کی نوک کوٹ سے الجھ گئی۔ میں اس کو بالکل بھول گیا تھا اب یاد آیا ہے۔"

"اس واقعہ میں امکانی جھلک تھی اور ڈاکٹر کا لہجہ بھی مطمئن تھا ——— مگر"

ناکمبھ نے پوچھا "کیا آپ کے دستی بیگ کا بھرنا دایہ کا کام نہ تھا؟"

ڈاکٹر کی گھگی بندھ گئی تھی

"ہاں یقیناً" مگر اتفاق سے اس وقت نرس وہاں نہ تھی باہر چلی گئی تھی۔"

ناکمبھ ڈاکٹر کی نگاہوں کا وزن ایک طویل لمحہ تک کرتا رہا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں ذرا بھی نہ جھپکیں۔ یا تو وہ سچ بول رہا تھا یا مشاق اداکار تھا۔

ناکمبھ اب قب کی طرف متوجّہ ہوا اور اس نے وکیل کے پتلے ہونٹوں پر اک مشکوک تبسّم کھیلتا ہوا پایا۔

"آخر کیا بات ہے" ناکمبھ نے پوچھا۔

"شاید کوئی بڑی بات نہیں" وکیل نے خشک لہجہ میں جواب دیا اور بڑی پر زور دیکر کہا "مگر آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کوٹ کی سلوٹ کی طرف ہماری توجہ مبذول کر دی ہے۔ اب مجھے بھی یاد پڑتا ہے کہ چیخ اور شور کے وقت جو لوگ گھر سے نکلے میں ان سب میں آخری نکلنے والا تھا یا شاید آخری سے پہلا، میں جیسے ہی صدر دروازے پر پہنچا میں نے مڑ کر دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے سے آرہے ہیں شائد وہ راہ راجہ صاحب کے کمرے سے راہِ مستقیم نہیں ہے۔

ڈاکٹر اینسل نے مشیر قانونی کو گھور کر دیکھا "کیا کہا؟ اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو سن لو کہ میں تو اس کے بعد پہلے شاگرد خانہ کی طرف گیا تھا میرا خیال تھا کہ یہ آواز بھی وہیں سے بلند ہوئی ہے۔

بے شک مشیر قانونی نے طعن اور شبہے سے ملے ہوئے لہجہ میں کہا۔
ڈاکٹر اینسل کی مٹھیاں بندھ گئیں اور ناکمبھ کو شبہ ہوا وہ وکیل پر حملہ کر دیگا غالبًا فب کے دل میں بھی یہی اندیشہ گزرا تھا وہ دو قدم پیچھے سرک گیا اور اس کی تنگ آنکھوں سے نفرت کے شیطانی شعلے نکل رہے تھے۔ اسی ایک سنگین لمحہ میں ناکمبھ کو معلوم ہو گیا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نفسیاتی طور پر کسی آدمی کو قتل کر دینے پر قادر ہے۔ سارجنٹ نے یہ بھی دیکھا کہ مارسدین آگے جھکا ہوا اس نظارہ سے لطف اٹھا رہا تھا اور اس کی آنکھیں اس ہوش ربا نظارہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر اینسل نے مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا اور وہ سارجنٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

"غالبًا کوٹ کی سلوٹ اور فب کے اشارات کی بنا پر میں شدید طور پر مشتبہ ہو گیا ہوں۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ مجھے گھر سے جانے کی اجازت نہیں؟"

اس گھر کا ہر شخص کم و بیش مشتبہ ہے ناکمبھ نے حاضر جوابی سے کہا مگر جہاں تک میرا تعلق ہے کسی کی راہ میں حائل نہیں ہوں جس کا جہاں جی چاہے چلا جائے مگر گیا جانے سے پہلے تم میں سے کوئی شخص ایسی کوئی بات نہ بتائے گا جس سے قاتل کا سراغ لگ سکے۔ ٹیلیفون پر اس کی آواز کافی بدلی ہوئی تھی اس لئے میں اسے پہچان نہیں سکتا چونکہ تم میں سے کوئی دو آدمی ایک جگہ نہیں تھے اس لئے صرف قاتل ہی بتا سکتا ہے کہ کتب خانہ سے کس نے فون کیا تھا۔ برائے کرم خوب سوچ کر بتاؤ۔ ممکن ہے کہ کوئی معمولی سی بات سراغ کیلئے کافی ہو سکے۔

آہستہ مگر سروں کی منفی جنبش نے اس بات کا جواب دیا۔

مگر یہ تو تم کو ضرور ہی معلوم ہو گا آخر قاتل کی غرض کیا ہے اور یاد رکھو قاتل نے مجھ سے فون میں کہا تھا کہ صرف ایک ہی نہیں متعدد قتل ہوں گے۔ ممکن ہے کہ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پانچ میں سے بعض قتل کئے جائیں اس لئے بھی ضروری ہے کہ تم پولیس کی مدد کرو ذاتی رنجشوں کو بالائے طاق رکھ کر اس مبدل قاتل کے پتہ لگانے میں پوری امداد دینا چاہیئے۔

"بڑی عمدہ درخواست ہے" فب نے جواب دیا غرض تو صاف ظاہر ہے یعنی فانڈاراج کی لاکھوں کی دولت مگر غریب بالی کے قتل کرنے کی غرض مجھے قطعًا معلوم نہیں ہوتی۔

مگر صرف ایک وجہ جو قاتل نے مجھے فون پر بتلائی تھی ناکمبھ نے جواب دیا مگر دوسرا شکار فانڈا محل کے مکینوں میں عظیم الشان ہستی ہو گی۔

پھر ایک لمحہ کے لئے سنگین سکوت ہو گیا۔ اینسل نے کہا ہمارے قیام کا اب کوئی حاصل نہیں ہے اگر آپ براہ کرم قفل کھولدیں۔"

ناکمبھ نے جاتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا "اگر مجھے ضرورت پڑی تو آپ کہاں ملیں گے"

ڈاکٹر نے گھڑی دیکھتے ہوئے لبوں کو سکوڑ کر کہا "رات زیادہ بھیگ چکی ہے۔ مگر سویرا ہے ۔ خدانخواستہ راجا صاحب کی طبیعت اس امتحان سے بگڑ گئی تو مجھے فورًا بلایا جا سکتا ہے میں بقیہ رات اپنے مطب میں گزاروں گا۔

ناکمبھ نے اوروں سے کہہ دیا کہ وہ بھی جا سکتے ہیں اور خود ڈاکٹر کے ساتھ دہلیز تک آیا۔ انسپکٹر آباد دور کھڑے تھے انہوں نے سارجنٹ کو اشارے سے بلا لیا اور سرگوشیوں میں پوچھا "کچھ پتہ لگا"

ناکمبھ نے منفی طور پر سر ہلایا "کچھ نہیں ۔ مبہم شبہات البتہ پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ کو کچھ سراغ ملا"

انسپکٹر نے بڑبڑا کر کہا "کوئی خاص بات نہیں روزمرہ والی کارروائی ہو گئی۔ لاش کو اس کمرۂ خواب میں منتقل کر لیا ہے اور مشین صاحب "نشانات" کا تجربہ فرما رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمام مکینوں کی علامتیں حاصل کر لیں۔ مشین کے ساتھ کولمبن بھی آئے ہیں۔ چار آدمی زریں نقاب کی تلاش میں محل کا گوشہ گوشہ چھان رہے ہیں۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہارے مبہم شبہات کیا ہیں۔

ناکمبھ نے کہا آپ نے نقاب کے تذکرے سے وہ شبہ اور بڑھا دیا ہے اب میں ڈاکٹر اینسل کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔ شاید

شاید نقاب زرّیں کا کچھ پتہ چل جائے ؟

انسپکٹر ۔کیوں ۔کس واسطے ۔ ؟؟

نائمیھ نے مقراض ہوکر کہا "آپ کو یاد ہوگا جب میں سایہ نما قاتل سے اُلجھا ہوا تھا تو چاقو کی نوک اس کے کوٹ میں در آئی تھی ۔ ڈاکٹر کے کوٹ میں اسی جگہ ایک سلوٹ پڑی ہوئی ہے "۔

"خدا کی پناہ" انسپکٹر نے کہا "تم نے ڈاکٹر سے پوچھا ضرور ہوگا"۔

نائمیھ نے ڈاکٹر کا جواب دُہرادیا۔

"قابل فہم ہے بلکہ قابلِ تسلیم ـــــ مگر" انسپکٹر نے کہا

نائمیھ نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نقاب زرّیں کو بھول سا گیا تھا۔ غالباً وہ کرخت اور باریک تاروں سے بُنا ہوا ہے جو آسانی سے توڑ مروڑ کر کسی دستی بیگ میں رکھا جاسکتا ہے ۔

انسپکٹر نے سانس لیتے ہوئے کہا "جیسا کہ ڈاکٹر کا دستی بیگ ہے "۔

"وہ ایسا بیگ جیسا ڈاکٹر ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے چلا گیا ہے ۔سارجنٹ نے یہ کہا اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ انسپکٹر صاحب ان دیکھی نگاہوں سے گھورتے رہ گئے ۔

(باقی آئندہ)

آزادیُ

حمید سُلطان احمد

ایک برفانی صبح تھی، گو دن کے دس بج چکے تھے لیکن آسمان پر گہرا ابر چھایا ہوا تھا۔ ٹھٹھرا دینے والی سرد ہوائیں ابھی تک چل رہی تھیں ۔سردی سے اعضا اکڑے جا رہے تھے۔ اس لئے میں نے کُرسی آتشدان کے قریب کھینچ لی۔ اور خیالوں میں کھوگئی۔ ساون کی رم جھم گھرے بادلوں کی موجودگی اور خاصکر جاڑوں میں تنہائی میں تیز آگ کا جلنا تخیّل کو تیز اور واہمہ آفریں کرہی دیتا ہے۔ میرا دماغ مکمل، نامکمل، نحیف، قوی، اور طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا آتشدان میں نہ جانے کیا شاعری ہے کہ انسانی دماغ میں تخیّلات کا ایک اتھاہ سمندر موجزن ہوجاتا ہے ۔اسی کاروان تخیّل میں یکایک میرے دماغ میں ایک خیال اس طرح آکر رُکا جیسے سڑک سے کٹ کر کوئی رہ گیر کھڑا ہو جائے ۔ اور اس خیال نے دوسرے خیالوں کی ساری بھیڑ چھانٹ دی ۔

اسی حلقۂ خیال میں گزری ہوئی شام تھی، ایک سیاسی کارکن تھے، میں تھی اور آزادی کے مسئلے پر ایک گرماگرم بحث ۔

"میں آپ سے کہتا ہوں کہ سیاسی رہنماؤں کا اچھوتوں کے ساتھ میل جول صدیوں کی دوری کو ختم کرسکتا ہے، سماج کی بندشیں رفتہ رفتہ کمزور ہوکر بالکل ڈھیلی پڑجائیں گی ۔خاص طبقوں کے خاص افراد کا اچھوتوں کے قریب ہونا اس بات کی ترغیب ہوگا کہ دوسرے خاص اور چھوت چھات کرنے والے اپنی فطرت کو نرم کریں "۔

"یہ ایک حد تک درست ہوسکتا ہے لیکن جب تک آپ سسٹم تبدیل نہ کریں اس وقت تک یہ تبدیلی کیونکر ہوسکتی ہے ۔ !؟

سرمایہ دارانہ نظام میں جو امیرانہ تمدّن چل رہا ہے، اس تمدّن نے امیر و غریب چھوٹے اور بڑے، بھوکوں اور پیٹ بھروں کے درمیان جو شدید تقسیم کی ہے جو گھناؤنی حالت پیدا کردی ہے محض جادو کی چھڑی

سے تو آپ اسے نہیں بدل سکتے۔

اس نظام کا ہلا دینا آسان کام نہیں، بچپن ہی سے اونچ نیچ کا فرق، ذات پات کی بندش اور اس مایوسانہ زنجیروں میں مذہبی تخیّل سے پُرفریب آسرا دماغوں کو ایک ماحول کے اثرات سے رچا دیتا ہے۔

ایک بچے کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی دھرم اور ریتی رواج کا پورا پورا احساس کرا دیا جاتا ہے اور "قسمت"، "بھاگ" کے ہمت شکن بندھنوں کے اندر وہ پروان چڑھتا ہے، آنکھ جو کھلتی ہے تو انسانیت ماحول کے مطابق بھنگی ہوتی ہے یا چمار، مالی ہوتی ہے یا کسان، مزدور ہوتی ہے یا اور کوئی!؟

اقتصادی لوٹ کھسوٹ نے طبقاتی تقسیم کی ہے اور طبقاتی تقسیم نے انسانی ترقی کو صدیوں سے روک دیا ہے۔

جب تک آپ سماجی آزادی ملک میں پیدا نہ کریں اس وقت تک ملکی آزادی کیونکر آسکتی ہے۔!؟

"آپ ایک زاویۂ نگاہ سے بحث کر رہی ہیں!؟"

"دو زاویۂ نگاہ سے تو بحث آپ ہی کر سکتے ہیں۔"

میرا مطلب یہ ہے کہ ——————

آپ کا مطلب کیا ہے —————— یعنی جو دلائل میں نے پیش کیے وہ لچر ہیں۔ کیا یہ غلط ہے کہ جب تک سسٹم تبدیل نہ ہو گا آپ ملک میں آزادی، امن اور مسرّت پیدا نہیں کر سکتے۔ فرض کیجیے کہ ایک ایسی جمہوریت قایم کرنے میں آپ کامیاب ہو گئے جو یہاں کے سرمایہ دار اور راجاؤں اور نوّابوں کے طبقہ پر مشتمل ہوئی تو آپ جملہ ۳۴ کروڑ ہندوستانیوں کو کیونکر ایک سطح پر لا سکیں گے!؟

"مگر ہوگا یہی کہ پہلے ہندوستان کو سرمایہ داری کی تکمیل کرنی ہوگی۔ پھر امپیریلزم کی۔ اس کے بعد صحیح جمہوریت ملک میں پیدا ہوگی —————!؟

"تو پھر آپ یوں کہیے کہ آپ سرمایہ داری کے نمایندے ہیں اور ساری قومی جد و جہد آپ کے بیان کے مطابق اس وقت آزادی کے لئے نہیں امپیریلزم کے لئے ہے ——!؟

"جی نہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ نظام کے طور پر ہر ملک کو ان مدارج سے گزرنا پڑتا ہی ہے۔ مثلاً۔"

"مثالوں سے مجھے چڑ ہے، میں خود بھی کوئی مثال نہیں دوں گی ایک طرف آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے طبقۂ بالادست سے حکومت چھین کر ہندوستانی طبقۂ بالادست کے ہاتھوں میں دینا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف کسانوں، مزدوروں اور اچھوتوں کی ترقی اور فلاح چاہتے ہیں۔ اچھوتوں کو شرفا کی برابری کرنے میں زمین و آسمان ایک کئے دے رہے ہیں۔ مذہب کو ڈھکوسلا بتا رہے ہیں اور ہندوستانی سماج ہے کہ اس کی مشینری کی ایک کل سیدھی نہیں، غلامی اور فرسودگی کا ایک سست رفتار چرخہ، ڈوریاں ہزار اور چکّر گھنٹوں میں دو تین۔!؟

رسم و رواج کے وہ بندھن کہ خدا کی پناہ، شادی جیسے اہم مسئلہ پر کسی کو غور و فیصلہ کا حق نہیں، یہاں شاید ہی کوئی شخص حسبِ مرضی شادی کر سکتا ہو، بیچاری عورتیں سو اُن کو تو بولنے کا بھی حق نہیں۔ انکا لب کھولنا عظیم گناہ ہے۔ رہے مرد، سو اُن کو بھی کیوں دوش دوں!؟ وہ بھی ذات پات کی بندشوں، طبقاتی اور خاندانی بڑائی اور پستی، اور سب سے زیادہ اقتصادی حیثیت کی کمی و بیشی، خوش حالی و بدحالی کی وجہ سے اپنی مرضی کے مطابق شادیاں کرنے میں برائے نام ہی کامیاب ہیں۔ سماج میں انسان اور انسانیت کی کوئی حیثیت نہیں، اس کی خوشنودی کے لئے سرمایہ دار ہونا ضروری ہے۔ حیوان نما انسان کی پشت پر اگر سونا کھنک رہا ہے تو بلا تامّل اس کو سر آنکھوں پر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو سرمایہ دار نہیں، مگر اخلاقی خوبیوں کی دولت رکھتا ہے، بلند فطرت انسان ہے، اگر اقتصادی لحاظ سے سوسائٹی میں نمایاں حیثیت نہیں رکھتا تو پھر وہ دیوتا ہی کیوں نہ ہو منہ لگانے کے بھی قابل نہیں۔ سماج کے نزدیک سب سے بڑا نقص غربت ہے، اور سچ ہے غربت ہی سب سے بڑا نقص ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نظامِ تمدّن کے ہوتے ہوئے ہندوستان آزاد ہونے کی خواہش کیسے کر سکتا ہے؟ قدم قدم پر فرسودہ معاشرت، نفس نفس میں رسم و رواج کی زنجیریں، یہ بندھن اتنا سخت ہے کہ باوجود مغربی نقّالی کے وہ آزادی جو انسان کو انسان کہلانے کا مستحق بنا دیتی ہے ہندوستان کو آزاد ہو کر بھی حاصل نہیں ہوگی۔

ہمارے دل و دماغ پر غلامی کی مہریں لگی ہوئی ہیں ہم چاہیں بھی تو اپنے ماحول سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ ان زنجیروں کو جو ہم کو جکڑے ہوئے ہیں ڈھیلا کرنے کی کوشش ہم کو قابل نفرت بنا دیتی ہے۔ اچھوت سدھار اور سب کو ایک نظر دیکھنے کا خیال خام ہے۔

تمام ہندوستان ذات پات، اونچ نیچ کی لعنت میں گرفتار ہے۔ ذہنیتیں بالکل تباہ ہو چکی ہیں۔ آزادی کا درخت بالکل کھوکھلا ہے اس کی جڑ میں دیمک لگی ہوئی ہے۔

اوپری باتوں سے فائدہ نہیں آپ لوگ اصل مرض کا علاج نہیں کرتے۔

جس ملک میں ذرا ذرا سی انسانی کمزوریوں کو معاف نہیں کیا جاتا ہو۔ جہاں شادی کو بھی تجارت سمجھکر جہیز و مہر کا سودا چکایا جاتا ہو۔ جس ملک میں نوجوان دلوں کو مرضی کے خلاف کچل کر رکھ دیا جاتا ہو، اور جہاں بچپن سے ہی جذبات کی کلیوں کو مرجھا کے رکھدیا جائے وہ خاک ترقی کرے گا۔ حقایق پر تخیل کے رنگین نقاب ڈالنے سے کیا حاصل ہے ؟

”میں سمجھا آپ ملکی آزادی سے پہلے سماجی آزادی کی تکمیل چاہتی ہیں۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“

ان کے لبوں پر پھیکی سی ہنسی آئی۔ ”آپ بہت متاثر معلوم ہوتی ہیں۔“

جی نہیں متاثر نہیں، از سرتاپا سلگ رہی ہوں۔

”مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔“

جائیے بھی۔

بہت اچھا، میں رخصت ہوتا ہوں، پھر تبادلۂ خیال ہوگا۔

یہ کہا اور چلے گئے۔

میرے حلقۂ خیال میں سورج کی ایک کرن نے داخل ہو کر اس کو تارِ عنکبوت کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ میں نے ایک لمبا سانس کھینچا اور دریچہ کھول دیا۔

(۲)

آسمان کی سنہری کرنوں نے کمرے کو منور کر دیا۔ ساتھ ہی میرے کانوں میں زیدی کی آواز آئی۔ یہ میری چھوٹی شریر بھانجی ہے چار سالہ ننھی فریب کار اس کا پورا نام تو زاہدہ ہے لیکن میں اس کو پیار سے زیدی ہی کہتی ہوں۔ مجھے اس کی معصوم شرارت بہت عزیز ہے میں نے دریچے سے باہر جھانکا۔ زیدی سُرخ گرم فراک اور گرم کوٹ پہنے ہوئے گیندے کے پھولوں کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے بال ہوا سے بکھر گئے تھے۔ چہرے پر شوخی و خوشی کا نور تھا۔ وہ تتلی پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر مہترانی کا چھ سالہ بچہ منّو شوق کی نظروں سے تتلی کو گھور رہا تھا۔ شاید اس کے ننھے دل میں بھی اس غبارِ رنگیں کو پکڑنے کا شوق تھا۔ لیکن غریب کو شروع سے اپنی تمناؤں کو دل میں دفن کر دینے کا سبق دیا گیا تھا اس لئے دور ہی سے بولا "بے بی اس طرح نہیں یوں تو وہ اُڑ جائے گی دھیرے دھیرے اس کے پاس جاؤ۔" منّو کی آواز سے طفلانہ شوق ٹپک رہا تھا۔

زیدی منّو کی ہدایت پر عمل کرنے کے لئے رُک گئی۔ اور تُتلا کر کہا میلے پاچ (میرے پاس) آکر بتیا منّو تتلی کیونکر پکلوں (پکڑوں)

منّو قریب آگیا۔ زیدی کے بُلانے سے خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھلی پڑتی تھیں۔ گویا قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی۔ اللہ رے فرق۔ دونوں بچے ننھے معصوم لڑکپن دونوں ہی کا تھا۔ لیکن ایک صاف ستھری قوم کے لحاظ سے آرام دہ لباس میں ملبوس۔ بچپن کی تازگی کا نور رخساروں میں لئے ہوئے ہنسی کی بولتی چالتی گڑیا۔ دوسرا غریب اس قیامت کی سردی میں کثیف پھٹا ہوا کرتا اور نہایت پُرانا سوئٹر پہنے ہوئے ٹانگوں سے ننگا۔ میلا کُچیلا، دُبلا پتلا، فاقہ زدہ، سہما ہوا۔

باوجود منّو اور زیدی کی کوشش کے تتلی اُڑ گئی، ان کے ہاتھ نہ آئی۔ تلافیٔ شکست کے طور پر زیدی نے پھول توڑنے شروع کر دئے اور ایک پھول منّو کو دیکر بولی لے تو اپنے گھر میں لگائیو۔

میں ہنس پڑی اور ہنسی کی آواز سے چونک کر زیدی نے مجھ کو دیکھا کچھ دیر تو وہ سہمی کھڑی رہی لیکن پھر بھاگ گئی گویا اُسکو خوف تھا کہ میں اس غریب بچے کے ساتھ کھیلنے سے اُس پر ناراض ہونگی۔

ادھر منّو نے ہاتھ جوڑ کر التجا آمیز لہجہ میں کہا " بیگم جی پھول میں نے نہیں لیا ہے بی بی نے دیا ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ڈر نہیں منّو! اور پھول لے گا۔

منّو ابھی جواب نہ دینے پایا تھا کہ اُس کی بڑی بہن بالو نے آکر اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا اور چیخ کر بولی کیوں رے تو یہاں کھیل رہا ہے۔ میں نے کہا تھا کیاری صاف کر دے۔ کام کرتے تو موت آتی ہے۔ بے چارا منّو تھپڑ کھا کر روتا ہوا گیندے کے پھول کو سینے سے لگائے کیاری کی طرف چلا گیا۔

میں نے بالو سے کہا اری تو بڑی ظالم ہے کیوں مارا بیچارے کو بچہ ہی تو ہے!؟ کھیلنے دیا ہوتا۔

بالو سرد آہ بھر کر بولی۔ بیگم جی یہ سب امیروں کی باتیں ہیں ہم غریبوں کے لئے بچپن، جوانی، بڑھاپا سب ایک ہے۔ آنکھ کھولتے ہی ہم کام کرتے ہیں اور آنکھ بند کرنے تک کام ہی کرتے رہیں گے کمبخت نکما ہے معلوم ہے ماں گھر میں بخار میں پڑی پھن رہی ہے جلدی سے کام ختم ہو جائے تو جا کر اس کی خبر لوں، یہ کہتی ہوئی وہ چلدی۔ اور میرے منہ سے نکلا اُف سماج کا ظلم۔ کیا منّو بچہ نہیں اس کو کھیلنے کا حق نہیں۔ اُس کی ضد کرنے کی عمر نہیں۔ زیدی کے خلاف مزاج اگر کوئی بات ہو جائے تو گھنٹوں روتی اور پٹخیاں کھاتی ہے۔ یہ غریب بچہ تھپڑ کھا کر بھی کام کرنے کے لئے مجبور ہے اُس کو اس کا احساس ہے تاکہ وہ غریب اور اچھوت بچہ ہے۔ لیکن آزاد منّو ہے نہ زیدی۔

ایک ذلت و فلاکت کے بندھن میں ہے دوسری جاہ و حکمت ثروت و حشمت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح امیروں کی دنیا الگ ہے غریبوں کی الگ۔

سُکھ کسی کو بھی نہیں۔ دکھ ہی دکھ ہر جانب بکھرا پڑا ہے کیا یہی آزادی ہے؟

حمیدہ سلطان احمد

مجبوری

"تو آپ معاف نہ کر دیں گے بابوجی، میں ایشور کی قسم کھا کر کہتی ہوں اَب کبھی دیر نہ کروں گی۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں، چھما کیجئے دیا کیجئے بابوجی۔ رکھیا پر ترس کھائیے۔" یہ چند الفاظ رکھیا کی تھرتھراتی ہوئی زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے اور وہ پھر زناٹے کی ایک بیت کھاتے ہی تلملا کر زمین پر گر پڑی، چند موتی کے دانے اسکے تمتمائے ہوئے سُرخ گالوں پر ڈھلک گئے، مگر ان موتی کے دانوں کی قیمت بابوجی کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی ! ——

رکھیا ایک بوڑھے ملاّح کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں دُنیا سے اُٹھ چکی تھی۔ بوڑھا باپ تھا۔ کمسن بھائی زندہ تھا —— "بوڑھا مانجھی اپنی روٹی حاصل کرنے کے لئے روزانہ اپنا پُرانا دقیانوسی جال کاندھے پر رکھ کر پو پھٹنے سے پہلے ہی گھاٹ پر چلا جاتا تھا اور جو مچھلی پھنستی اس کو بیچ کر زندگی بسر کرتا تھا۔ اور جو کئی کئی دن مچھلی نہ پھنستی تو یہ تینوں تین تین دن بھوکے ہی رہتے —— آج تین دن سے بوڑھا مانجھی بیمار پڑا ہوا ہے، اس کی کٹیا میں ایک دانہ تک نہیں ہے، اس کا تنہا بچہ "سوشیل" بھوک کے مارے تڑپ رہا ہے ...... رکھیا کی انتڑیوں میں سوس ہو رہی ہے۔ لیکن تینوں اپنی کٹیا میں پڑے ہیں جیٹھ کا مہینہ ہے۔ چلچلاتی دھوپ پڑ رہی ہے۔ دُور دُور انسان تو انسان حیوان تک کا نشان نہیں ہے، ہر طرف سناٹا ہے۔ کبھی کبھی صرف ایک بچے کی آواز "دی دی بھوک لگی ہے، کھانا لا دینے" اس خاموشی کو چیرتی ہوئی اس سُنسانی اور ویرانی کی تصویر میں درد کا رنگ بھر دیتی ہے —— رُکھیا پلٹ پلٹ کر اپنے اس بلبلاتے ہوئے ننھے بھائی کو دیکھتی اور ایک آہ بھر کر رہ جاتی ہے ! ——

اس نے کہا "گھبراؤ نہ سوشیل کل میں گاؤں والے بڑے بابوجی کے یہاں جاؤں گی —— اُن سے کہوں گی —— وہ ضرور ہم لوگوں کی سہایتا کریں گے" ——

سوشیل روتے روتے سو گیا، لیکن رکھیا کو نیند نہ آئی، اس نے رات آنکھوں میں کاٹ دی اور بھور ہوتے ہی سب کو سوتا چھوڑ کر بڑے بابوجی کے یہاں پہنچی —— بڑے بابو نے غور سے دیکھا پھر پوچھا "تو کون ہے کیا چاہتی ہے ؟" رکھیا نے اپنی ساری بپتا سُنائی لیکن بڑے بابوجی کی کڑکتی ہوئی بجلی کی طرح آواز نے فوراً اسے خاموش کر دیا، بڑے بابو نے کہا —— مُدعا مانگنے آئی ہے، جیسے ہاتھ پیر میں گھن لگ گیا ہے —— تو جوان ہے —— جا کام کر، پیسے ملیں گے۔" رکھیا دل برداشتہ ہو گئی، اسکی ساری امیدیں فنا ہو گئیں، اس نے ڈرتے ڈرتے بابوجی سے پوچھا "کونسا کام کروں بابوجی ؟" بابوجی نے پھر چلاّتے ہوئے کہا "کیا تو اندھی ہے۔ دیکھتی نہیں کہ ہمارا مکان بن رہا ہے، جا اینٹ ڈھو۔"

رکھیا نڈھال ہو گئی لیکن پھر اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا، اُس نے ٹھان لیا کہ جو کچھ بھی ہو اور جیسے بھی ہو، آج یہ اپنے بھائی کو ضرور کھلائیگی۔ اینٹ اٹھاتے اٹھاتے آدھے ہی دن میں اس کے ہاتھوں میں پھپھولے پڑ گئے۔ اس نے آج تک اتنی سخت اور کٹھن محنت کبھی نہ کی تھی۔ یہ تو صرف گھر کی پاسبانی کیا کرتی تھی —— وہی اپنی چھوٹی سی کٹیا کی !! —— دوپہر کے وقت کھانے کی چھٹی ہوئی،

—— ایشیا - دسمبر ۱۹۴۷ء

رکھیا بابوجی کے کمرے کے دروازہ کے پاس آکر ٹھٹھک گئی، بابوجی نے دیکھا اور تاؤ میں چار پیسے نکال کر پھینک دیئے ـــــــ سوکھے ہوئے دھان میں پانی پڑا ـــــــ رکھیا بہت خوش تھی۔ اس نے گویا چار اشرفی پالی تھیں ـــــــ اس نے بابوجی سے التجا کی" بابوجی! کل سے میں شام تک کام کرونگی، مجھے کام دوگے نا؟ ـــــــ

بابوجی نے کہا "جا کل سویرے ہی آنا" ـــــــ

رکھیا نے ساڑھے تین پیسے کے ستو اور ایک ادھیلے کا نمک لیا۔ اور مارے خوشی کے گرتے پڑتے اپنی کٹیا پر آئی، دیکھا کہ سوشیل بابو کے پاس ٹھنک رہا ہے اور کہہ رہا ہے" بابو کھائیلا دونا" رکھیا نے فرطِ مسرت سے چلّایا۔ لے سوشیل میں کھانا لائی ہوں، پھر اس نے کہا بابوجی! اُٹھو نا تم بھی کھالو، لیکن آہ! بڈھا مانجھی نیا منجدھار میں چھوڑ کر ابدی نیند سو رہا تھا، وہ کاہے کو کسی کے جگائے اُٹھ سکتا تھا ـــــــ؟

رکھیا نے بوڑھے باپ کو جھنجوڑا لیکن بابو کا بدن برف کی طرح بالکل سرد تھا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ سنبھلی مگر یہ نہ سمجھ سکی کہ کیا کرے؟ ـــــــ

گاؤں والوں نے لاش کو پاس کی ندی پر لیجا کر پھونک دیا ـــــــ

رکھیا پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب اس دنیا میں سوائے سوشیل کے اس کا کوئی اپنا نہ تھا۔

شام ہوئی، سوشیل نے پوچھا "دی دی بابو کہاں ہے"؟ رکھیا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ لیکن جی کڑا کیا اور بولی" تو سوجا نا سوشیل! بابو گھاٹ گئے ہوں گے اب آتے ہی ہوں گے" ـــــــ جب کبھی سوشیل بابو کو کھوجتا رکھیا اس کو باتوں میں پھسلا لیتی تھی۔ لیکن جب اس کا دل بابو کو ڈھونڈتا تو کوئی بھی بہلانے والا نہ تھا ـــــــ صبح ہوتے ہی رکھیا گاؤں والے بڑے بابو کے یہاں گئی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا" بابوجی! میرے پتا سورگ باش ہو گئے ہیں، اس لئے میں آج کام نہ کروں گی"

دوسرے دن رکھیا کام پر گئی۔ شام کو بڑے بابو نے اس کو دو آنے پیسے دئے ـــــــ دن بھر کی مزدوری صرف دو آنہ!! ـــــــ

اس نے ان پیسوں کو مٹھی میں دبایا اور بنئے کے یہاں پہنچی، چاول اور دال خریدی ـــــــ رات کے وقت دونوں بھائی بہن بھوکے ہی سو رہے۔ صبح کو آدھے چاولوں کی کھچڑی پکائی اور دونوں نے مل کر کھالی۔ رکھیا کی گزربسر اسی طرح ہونے لگی ـــــــ

سوشیل دن بھر مارا مارا پھرنے سے بیمار ہوگیا۔ رکھیا اسے بہت پیار کرتی تھی وہ بھی اسکی جان نہ چھوڑتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے ساتھ اُسے کام پر بھی لیجاتی تھی۔ گارے میں وہ دن بھر کیچڑ اور پانی میں کھیلتا پھرتا تھا ـــــــ

آج وہ اسے کام پر نہ لے گئی۔ گھر میں سویا ہوا چھوڑ کر چلی آئی کھانے کی فرصت پاتے ہی گھر آئی۔ دیکھا کہ سوشیل باہر سے آرہا ہے اس نے اس سے دریافت کیا تو سوشیل نے کہا کہ میں تو تجھے ہی ڈھونڈنے گیا تھا، ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلدیں کہیں کی!؟ ـــــــ

رُکھیا نے اُسے سمجھایا" بخار آرہا ہے چُپ چاپ سو جا مگر وہ ضد کرتا رہا کہ نہیں ہم بھی ساتھ چلیں گے ـــــــ آخر رُکھیا نے پھسلا کر اسے سُلا دیا۔ اور جلد جلد قدم اُٹھائے بابوجی کے یہاں آئی، بڑے بابو کے منجھلے لڑکے بابو سُکھدیو لال مزدوروں کی حاضری لے چکے تھے ـــــــ آج رُکھیا کو دیر ہوگئی تھی ـــــــ اس نے بابو سکھدیو لال کو دیکھا، اس کی نگاہیں طالبِ رحم تھیں ـــــــ سکھدیو نے اس نئی مزدورن کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ـــــــ رکھیا کی بڑی بڑی متوالی آنکھیں اور سڈول چہرہ، کامنی جیسا بدن ـــــــ

رُکھیا بڑے بابو کے پاس اپنی حاضری بنوانے کے لئے پہنچی ـــــــ بڑے بابو نے دیکھتے ہی دھتکار دیا اور کہا "حرامزادی! مفت کا پیسہ ہے نا!؟ ـــــــ جا دُور ہو جا ـــــــ میرے یہاں تیرا کام نہیں ہے" رکھیا نے منّتیں کیں، ہاتھ جوڑے، لیکن بڑے بابو نے معاف کرنے کے بدلے ہزار سُنائیں۔

رُکھیا نے مچلتے ہوئے کہا۔"بابوجی رحم کرو!! ـــــــ میرا بھائی مر رہا ہے۔ بخار میں پھنکا ہو رہا ہے۔ بچا لیجئے بابوجی! کیسے بچے گا اگر آپ کام نہ دوگے تو؟ ـــــــ؟

رکھیا بابوجی کی دُھتکاری ہوئی ـــــــ نڈھال ـــــــ

۵ے

نراش — چلی جا رہی تھی —

سکھدیو سنگھ دوسری طرف سے آیا — اس نے رکھیا کو دیکھا — اس کی باچھیں کھل گئیں — "کیا ہے ری! تو کہاں جا رہی ہے؟" سکھدیو نے پوچھا — رکھیا نے آنکھیں اٹھائیں اور سہم گئی — شاید اسے چلنے کی بھی اجازت نہیں ہے — اس نے پھر ایک نظر سکھدیو کو دیکھا — اس کی آنکھیں رحم کی خواستگار تھیں — سکھدیو کھڑا ہو گیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "دیکھ ری! میں سب جانت ہوں، تجھکے بابوجی مارِن ہیں، بابوجی بڑے ویسے ہیں، تو پھکر مت کر" — رکھیا چیخ اٹھی، آہ! میرا بھائی! بابوجی آپ بڑے بھلے آدمی ہیں!! آپ کی بڑی کرپا ہو گی بابوجی — میرا بھائی مر جائیگا سکھدیو بابو!!

سکھدیو بابو نے جواب دیا۔ "نہیں اب وہ نہیں مر سکتا آؤ" .... "نہیں سکھدیو بابو! اچھا کر دو .... مگر میرا سوشیل! چلو سکھدیو بابو..............."

رکھیا اب خوش تھی — اس کا بھائی سوشیل بھی اچھا ہو گیا تھا!!

عبدالرّشید عرفاںؔ

صدائے آتشیں

آہ مری ہے دلگداز، نالہ مرا ہے دلنشیں
عشق میں پھر بھی کامیاب میرا کوئی نفس نہیں

پرسشِ دل کا شکریہ، دل کو نہیں سکوں ہنوز
ٹیس سی ہے کبھی کبھی، درد سا ہے کہیں کہیں

جب کبھی درد بڑھ گیا، بن گئے خود ہی چارہ گر
اپنے سکون کے لئے حسن کو زحمتیں نہ دیں

سدِّ تعیّنات تک، حدِّ تصوّرات تک
میری نگاہ میں تمہیں، میرے خیال میں تمہیں

ہوں میں بقیدِ گلستاں، اپنی ہی آگ میں تپاں
بن گئی برقِ آشیاں میری صدائے آتشیں

تیرا ہی دَور آج ہے، تیرا دلوں پہ راج ہے
جلوۂ خواب تاجؔ ہے تیرا خیالِ مرمریں

تاجؔ زبیری

— ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

"ہم" اور "وہ"

(خواجہ محمد شفیع دہلوی)

(مسلسل)

اس لاجواب تنقیدی سلسلے کو جس میں ماضی اور حال کا موازنہ شخصیت اور اجتماعیت [illegible] کے احساس کا مقابلہ [illegible] کی زندگی اور چال چلن پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ملک میں بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایشیا کے اس شاندار سلسلے سے اثر لے کر کلکتہ کے مشہور روزنامہ "ہند" کے قابل اڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ایک لیڈر لکھا جس کا مفہوم یہ ہے:-

"وہ پرانے زمانے کے ہندوستانیوں میں آپس کی وضعداریاں اور دوستیاں فداکارانہ تو تھیں لیکن وہ انفرادی تھیں۔ اجتماعی قومیت و ملکیت کے احساس سے وہ سب محروم تھے اور اس میں کوئی شک نہیں، کہ انگریزوں نے جو تسلط ہندوستان میں بغیر کسی بڑی جنگ کے حاصل کیا اس میں ان کو کامیابی محض اس وجہ سے ہوئی کہ ہندوستانیوں میں قومیت اور ملکیت کا اجتماعی احساس نہیں تھا۔"

یہی نہیں، یہ موضوع تو ایک مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ "اردو مجلس دہلی" میں جو خود خواجہ شفیع صاحب کے مکان پر ہر اتوار کو منعقد ہوتی ہے کئی مضمون موافقت اور مخالفت میں پڑھے گئے، ان میں سے بعض ہم نے دیکھے۔ لیکن موافقت ہو یا مخالفت، کسی میں وہ لگاوٹ نہیں ہے، وہ لوچ نہیں جو خواجہ شفیع ہی کے طرزِ تحریر کی خصوصیت ہے۔

اب اس شاندار سلسلہ کو خواجہ شفیع صاحب نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ اس قسط میں مقابلہ کی شان بڑی دلدوز ہے آخری حصہ قدامت اور فرسودگی کی چھاتی پر جدت کا ناقابلِ برداشت گھونسہ ہے:-

ساغر

ماں اولاد کو بیچ رہی ہے راج کو۔ دھرم پتنی پتی کو دھوکا دے رہی ہے۔ بے وقوف عورت۔ بے وفا بیوی۔ رعایا کش ملکہ غلط صلاح کاروں کے ہاتھ میں پھنسی ہے۔ میاں سے دغا کر رہی ہے رعایا سے غداری۔ کیا زمانہ ہے بیوی کا ہاتھ اپنے سرتاج کے سر سے تاج اتار رہا ہے نام کی علامت ہے لئے تیمور کی ہڈیاں فروخت کی جا رہی ہیں۔

لال قلعہ پر گولا آ رہا ہے جا رہا ہے نمک حرام نمک خواروں نے انگریزوں کو بتا دیا ہے کہ رنگ محل پر زیادہ گولہ باری کی جائے مطلب پرست شوہر دشمن بیوی نے زمین آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ ماں سمجھ مچا رہی ہے۔

زینت محل [illegible] جا رہی ہے [illegible] بنائے کرمیاں
چاک پریشاں [illegible] کا [illegible]
[illegible] لال حویلی کو آگ [illegible]
[illegible] ہے۔ قلعہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
کیسے پھول [illegible]

ایشیا دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

77

حیا بیچنے والا میاں عورت کی باتوں میں دغا کی گھاتوں میں آگیا۔ تیمور کا وارث قلعہ چھوڑ قبروں پر جا پڑا۔ قلعہ دار مجاور بن بیٹھا۔ بادشاہ نے گدائی اختیار کی۔

اغیار کی بن آئی دشمنوں کا نقشہ جم گیا۔ چال چل گئی شاہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ قلعہ ٹوٹ گیا۔ وزیر مہروں[1] کے چکر میں آگیا۔ بازی نرغہ میں پڑ گئی۔

شاہزادے مارے گئے سلاطین سولی چڑھے۔ جاں نثار جانبحق ہوئے۔ بادشاہ گرفتار۔

غداروں کے ہاں گھی کے چراغ روشن ہوئے۔ خاندانِ تیموری کا چراغ جس نے عیش و عشرت سے لو لگائی تھی شمعِ محفل بن گیا تھا ایک پھونک سے گل کر دیا گیا۔

نہ وہ بزم رہی نہ وہ چراغ۔ نہ وہ محفل رہی نہ وہ شمع۔

اچھا ہوا نہ وہ بزم رہنے کے قابل تھی نہ وہ محفل۔ وہ چراغ گل گیر کو دعوت دے رہا تھا گل ہو گیا بُرا نہ ہوا۔ اس محفل میں اہلِ محفل مطلب آشنا مدعا دوست تھے۔ شمع عصمت فروش آبرو باختہ تھی پروانے مطلب کے دیوانے۔ اس بزم کے چراغ کا دیا غریب رعایا کے کاسۂ سر کا تھا۔ روغن ان کے سینوں کی چربی کا۔ بتی کی جگہ دست کاروں کی انگلیاں جلائی جا رہی تھیں۔ اس چراغ کی لو گھر پھونکنے کی فکر میں تھی۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔

اس بزم کے پھولوں میں غداری اور دغا کے کانٹے چھپے تھے محبت بھرے حسین ہاتھ آستینوں میں چھریاں چھپائے۔ جامِ لالہ سینہ میں سم سیاہ لئے۔ ساقی میخواروں کے خون کا پیاسا۔ کلیاں اپنے سینوں میں ہوس زر چھپائے تھیں۔ گلے ملنے والے گلا کاٹنے کی فکر میں تھے۔

نوجوان بڑے میاں کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

ابو ظفر بہادر شاہ مرثیہ خواں جیل خانہ چلا گیا۔ آلِ تیمور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ بدنما داغ چھوڑ مرا کہ **یافث اغلان** کا نام لیوا پنشن خوار ہوا گرفتار رہا دوسروں کا دست نگر ذلیل و خوار ہوا۔

بندہ پرور آفاتِ غلامی سے وہ نسل آشنا نہ تھی۔ لذتِ حکومت کام و دہن بھول چکے تھے۔ گھونگروؤں کی جھنکار دل میں بس رہی تھی تلواروں کی جھنکار کانوں پر گراں گزرنے لگی۔ نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ زمانہ نے سلاسلِ غلامی کی جھنکار کو ان کے خوابِ گراں کا مستقل خوابِ پریشاں بنا دیا۔

بادہ نوش بزمِ عیش میں گلرخوں سے ہم کنار گل تکیوں پر سر رکھ کر سو گئے تھے گھر میں چور گھس آئے۔ تمسکات سمیٹ لئے۔ اوّل تو نشہ مارے چھینے ہی نہیں اور چھینے تو بیکار۔ ابھی تک خمار تھا طبع عالی کسل مند۔ سرگرانی تھی۔ اعضا شکنی۔ ابھی چور گھر میں موجود تھا یہ متوالے لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے۔ معشوقوں کی باہیں گلوں میں پڑی تھیں۔ دُردِ تہِ جام ابھی باقی تھی ڈاکو لے گئے اور پھر پڑ رہے۔

وائے ناکامی۔

اب صفحۂ سفید کی طرف نظر ڈالی

ہندوستان میں ہل چل مچی ہے۔ حکومت کی بنیادیں ڈگمگا رہی ہیں۔ استبداد کی عمارت ڈھینے کو ہے۔ غلامی لرزہ براندام کھڑی ہے۔ غیر حکومت رختِ سفر باندھ رہی ہے غلام خوابِ گراں سے آزادی کی انگڑائی لے کر اُٹھا ہے۔ ذلت کی زنجیریں توڑ رہا ہے۔ بندھن دانتوں سے کاٹے ڈالتا ہے۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں کھڑا ہے اس پر رحمت کی پھوار پڑ رہی ہے۔

جنگ آزادی کے نہتے سپاہی سینہ سپر کھڑے ہیں۔ حکومت اپنے ہتھیار استعمال کر رہی ہے۔ یہ سر دے کر سلطنت لینے آئے ہیں۔ آزادی کی موت کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جیل خانہ بھر چکے ہیں قیدی چلے آ رہے ہیں۔ دس کی گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو بیس آن موجود ہوتے ہیں۔ ذاتی آزادی بیچ کر قوم اور ملک کی آزادی خریدنے والوں نے اپنی زندگی جیل خانوں کیلئے وقف کر دی ہے۔ زنداں کو دُلہن سمجھ رکھا ہے۔ سلاخوں کو سینوں سے لگا رہے ہیں۔

جو لاری قیدیوں کو لیکر جیل کے دروازہ پر پہنچتی ہے اس میں سے مقررہ تعداد سے زیادہ برآمد ہوتے ہیں۔ جیلر گھبرا اٹھے ہیں۔ حکومت کے ہاتھ پیر پھول گئے ہیں۔

ظلم کرنے والا ہاتھ شل ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ آزادی طلب کرنے والے

[1] مہر یعنی اشرفی۔

بازو مفلوج ہو اچاہتے ہیں --

ہندوستانی اپنا حق لینے اُٹھے ہیں۔ مادرِ وطن کے سپوت اپنے جوان خون کے غازہ سے مادرِ وطن کو سُرخ رو کرنے پر آمادہ ہیں دھرتی ماتا کی زنجیریں کاٹی جارہی ہیں اس میں ہاتھ بھی کٹ رہے ہیں اور سر بھی۔

چند اوباش چاوُڑی بازار کے ایک کوٹھے پر بیٹھے خوش گپیاں کررہے ہیں۔ بازار میں سے قومی نعرہ کی آواز آتی ہے رنڈی بیتابانہ برآمدہ میں جاتی ہے۔ تماشبین بھی اسکے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جوان۔ بوڑھے۔ بچے والنٹیر گذر رہے ہیں۔ طوائف ایک کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے یہ میرا بھائی ہے۔ اور ان الفاظ کے ساتھ ساتھ اسکے چہرہ پر ایک قابلِ پرستش سُرخی دوڑ جاتی ہے۔ مرد تماشائی اس مطعونِ خلائق عورت کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں تو نے اپنے بھائی کو کیوں بھینٹ چڑھا دیا۔ جواب ملتا ہے "آج وہ ننگ جوانی ہے جو زنداں میں نہیں" تماشائی والنٹیر والوں میں جا ملتے ہیں۔ جلوس گزر جاتا ہے۔ فضا میں آزادی کے نعرے گونج رہے ہیں۔

نوجوان کے چہرہ پر عجیب تبسّم ہے۔ آنکھوں میں ایک خاص روشنی بڑے میاں سے کہتا ہے۔ دیکھا آپ نے اُس دور میں محصنات غیر مصافحات کی وہ ذہنیت تھی اور اس دور میں فاحشہ اس مقام پر ہے۔

بڑے صاحب اس تند گفتاری کی تاب نہ لاسکے۔ بولے میاں اب بیٹھے باتیں بنا رہے ہو۔ اس وقت ہوتے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا۔ پھر ہم پوچھتے بے بسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تم امن و امان کے زمانہ میں بیٹھے زباں زوری دکھا رہے ہو۔ اس وقت کی حالت سے آگاہ نہیں قیامتِ صغرا بپا تھی۔ نفسا نفسی کا بازار گرم۔ غدر پڑ رہا تھا۔ لے دے مچی ہوئی تھی۔ باپ کو بیٹے کی خبر نہ تھی۔ بیٹے کو باپ کی۔ جس کا جہاں سینگ سمایا نکل گیا۔ جس کو جہاں پناہ ملی جا چھپا۔ رزق آگے آگے تھا اور خلقِ خدا پیچھے پیچھے۔ نہ تن کو کپڑا تھا نہ پیٹ کو روٹی۔ جان کے لالے پڑے تھے۔ زمین و آسمان دشمن ہو رہے تھے۔

نوجوان نے بڑے میاں کی طرف سخت نگاہ ڈالی اور کہا۔

زمین و آسمان دشمن ہوتے ہیں لیکن صرف اسکے جو اپنے ساتھ خود دشمنی کرتا ہے۔ زمین و آسمان ہلاک کرتے ہیں صرف اس کو جو اپنے پاؤں میں خود کلہاڑی مارتا ہے۔ زمین و آسمان دانہ دانہ کو محتاج کرتے ہیں مگر صرف اس کو جو ہاتھ پیر ہلا کر کھانا نہیں چاہتا۔ زمین و آسمان کو الاہنا مت دیجئے آپ خود اپنے دشمن تھے۔ آپ اپنے ہاتھ سے اپنے پیر میں کلہاڑی مار رہے تھے آپ خود اپنی بربادی کے درپے تھے۔ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔

بندہ نواز جب انہوں نے قفس قبول کیا اس وقت تک ان کے بال و پر موجود تھے اور صیاد کے ہاتھ میں قینچی نہ تھی۔ ان کے بازوؤں میں طاقت تھی اور پنجرہ کی تیلیاں کمزور۔ اس وقت تک اہلِ وطن کے پاس ہتھیار بھی تھے اور آزادی بھی۔ ایمان کی یہ ہے کہ ان کے پاس سب کچھ تھا ہاں خواہشِ پرواز نہ تھی۔ "ہمیں خواہش پرواز ہے پر پرواز نہیں" "اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے"۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم پیدا پنجرہ میں ہوئے ہیں بال و پر بریدہ بازو شکستہ۔ پھر بھی ان لنج بازوؤں کو پھڑپھڑا رہے ہیں اور پیش رفتگاں نے صحیح و سالم بال و پر ہلائے تک نہیں۔

ہم تو قیدی ماں باپ کے ہاں جیل خانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ موردِ الزام تو وہ باہمت بزرگ ہیں جنہوں نے آزادی عیش و عشرت کی بھینٹ چڑھا دی اور قید قبول کی۔

۷۹ محترم بندہ ایک باپ سوداوی امراض مول لیتا ہے اس کو خدا بیٹا دیتا ہے لیکن ہونے والے کے بدن پر بدنما گٹھلیاں ہیں۔ لڑکا جوان ہوتا ہے اور وہ گٹھلیاں جان کے ساتھ ہیں۔ باپ اس بدنصیب لڑکے کے سرہانے کھڑا کہ رہا ہے کہ ناشدنی تجھ جیسے بدہیئت کو مجھے ساتھ لیجاتے ہوئے اور اپنا بیٹا بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ تیرے بدنما داغ یہ مکروہ غدود میرے لئے باعثِ ننگ و عار ہیں۔

جس وقت اس باپ نے یہ مرض خریدا تھا اس کو خواہشات نے اندھا کر رکھا تھا اب خودستائی نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے، وہ غفلت پرست بھول گیا کہ یہ روگ اس کا ورثہ ہے جو بیٹے کو پہنچا ہے لڑکا غریب ناکردہ گناہ باپ کے گناہوں میں گرفتار ہے۔

حضور ہم کو غلامی پیش رفتگاں سے ورثہ میں ملی انہوں نے مول لی تھی۔ پھر بھی وہ اچھے اور ہم بُرے۔ اگر یہی آپ کا انصاف ہے تو ہمارا آپ کا انصاف اس دن ہوگا جس دن میزان کے پلڑے میں کچھ ڈالا جاسکے گا نہ نکالا جاسکے گا۔

یہ کہ نوجوان نے ایک اور ورق اُلٹا

غدر پڑ چکا ہے عیش کی راتیں گذر چکی ہیں۔ مصیبت کے دن کاٹے نہیں کٹتے۔ دلی آباد ایک افسانہ ہے دلی برباد ایک حقیقت۔ نازوں کے پالے ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ پھولوں میں تلنے والے خوار ہو گئے ہیں۔ جن برسانے والے ہاتھ مٹھی بھر اناج کو۔ تاج شاہزادے شارعِ عام پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ وارثِ تاج و تخت کشکولِ گدائی لئے پھر رہے ہیں اور وہ بھی خالی۔ راجہ نل بھیک مانگ رہا ہے اور اسے مانگے نہیں ملتی۔

دلی کا سہاگ اُجڑ چکا ہے۔ اس کا ساجن بچھڑ چکا ہے۔ عمر رسیدہ کم شکستہ دولہا حجلۂ عروسی سے اُتار دیا گیا ہے۔ نیا نوشاہ اس چھپر کھٹ کی آرائش پیروں تلے مل رہا ہے۔

نام کے بہادر شاہ کی عروسِ سلطنت غریب کی جورو سب کی بھابی بنی ہے۔ کالے لوٹ مار مچا رہے ہیں گورے اپنا سکہ جما رہے ہیں۔ ابوظفر بہادر شاہ عروسِ سلطنت کی آبرو نہ بچا سکا اسکی آبرو ریزی کی جا رہی ہے۔ دولت بھی لوٹی جا رہی ہے۔ عزت بھی اور عصمت بھی۔

شہر کربلا بنا ہے۔ ہر گھر ماتم کدہ۔ بازار بند پڑے ہیں۔ گلی کوچوں پر مُردنی چھائی ہے۔ گھر گھر سناؤنی آئی ہے۔

ایک گھر میں میاں تین وقت بعد ٹکڑا کھانے بیٹھا ہے۔ روٹی نصیب تھی پر طبیعت ٹھیک نہ تھی چاہنے والی بیوی نے کم مسالحہ پتلے شوروہ کا قلیہ اپنے ہاتھ سے پکایا تھا۔ ابھی اس نے نوالہ توڑا ہی تھا کہ باہر سے سگے سسرے تشریف لائے۔ نہایت موٹے۔ سیاہ فام لال لال دیدے جیسے دہکتے ہوئے انگارے۔ تیز بڑے بڑے سفید دانت۔ داماد نے سلام کیا۔ بیٹی ایک طرف کو ہو بیٹھی۔ سسرے نے داماد کو درازیٔ عمر کی دعا دی اور فرمایا میاں ذرا باہر جا کر دستخط کر آؤ سرکاری آدمی کھڑے ہیں۔ داماد اٹھنے کو تھا کہ بیٹی نے کہا یہ زراکی ذرا لقمہ تو کھالیں۔ آج تین وقت بعد نہ وہ چپاتی نصیب ہو سکی چاہنے والا باپ بولا۔ ایک منٹ میں آ کر کھائیں گے کھانا بھاگا نہیں جاتا وہ غریب بچہ کا باہر گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ بیٹی دسترخوان بچھائے بیٹھی رہی۔ پر میاں وہاں گیا تھا جہاں سے پھر آنا محال تھا۔ باپ کا ایک منٹ کچھ اس قیامت کا تھا کہ وہ ختم نہ ہوا اور دھولے ہو گئے کیں۔

سونا لینے پی گئے اور سونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی ملے مرے دھولے ہو گئے کیس

یہ منظر دیکھنے کے بعد نوجوان نے بڑے صاحب کی طرف دیکھا اور کہا خون سفید ہو گئے تھے قلب سیاہ۔ نقش وفا نقش باطل ہو گیا تھا محبت حرفِ غلط۔ مہر و لطف کی مہر دلوں پر ثبت تھی۔ ہوسِ زر نے اندھا کر دیا تھا غضب خدا کا حاکم کی خوشنودی کیلئے۔ تھوڑا سا روپیہ حاصل کرنے کو چار دن کی آسائش کے واسطے سگی بیٹی کا سہاگ اُجاڑ دیا۔ باپ نے بیٹی کی چوڑیاں اپنے ہاتھ سے توڑیں اور کچھ اس طرح کہ غریب کے ہاتھ زخمی اور پھر زخم سدا خون دیتے رہے۔ ان لوگوں کی محبت اشعار تک رہ گئی تھی۔ ماتا جا ؤ چونچلوں تک۔ وہ لوگ اس دور میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے تھے سیرتِ انسانی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ انسانوں کی چلتی پھرتی بولتی چالتی مورتیاں رہ گئی تھیں۔ انسانیت سے معرا۔ قالب تھے بے روح۔ جسد تھے بے جان کاغذ کے پھول تھے خوشبو سے خالی۔ یہ کہکر نوجوان نے صفحۂ سفید پر نگاہ ڈالی۔

جیل خانہ کی کوٹھریاں ہیں سیاسی قیدی بھوک ہڑتال کرتے ہیں۔ ایک بنگال کا ہے ایک پنجاب کا۔ ایک سندھ کا ہے ایک مدراس کا۔ نہ رشتہ ہے نہ ناتا۔ نہ جان نہ پہچان لیکن ہر ایک کو اس پر اصرار ہے کہ اگر دوسرا روٹی کھائیگا تو میں بھی کھاؤنگا ورنہ نہیں۔ بقائے حیات کیلئے ڈاکٹر مصنوعی طریقوں سے بزور و زبردستی غذا پہنچا رہے ہیں لیکن یہ جان دینے والے آن جانے نہیں دیتے۔ دم توڑ رہے ہیں پر نوالہ توڑنے کو راضی نہیں۔

نوجوان کے چہرہ پر خون دوڑا ہوا تھا اُس نے اُن بزرگ کی طرف دیکھا اور کہا۔ کہئے ایمان سے ان دونوں تصویروں میں کونسی انسانیت کی مکمل تصویر ہے اور کونسی حیوانیت کا مرقع۔

بڑے میاں سرنگوں بیٹھے تھے نوجوان نے ان کی طرف دیکھا اور کہا قسم ہے ملک اور قوم کی عزت کی۔ ہم ہیں ملک کے سپوت۔ ہم ہیں صفحۂ تاریخ کے زرّین حروف وہ تھے کلنک کے ٹیکے بدنامی کے بدنما داغ۔

(جملہ حقوق محفوظ)

ش۔ مہر محسن اشرفی۔

وداعِ آخر

قسطِ چہارم

(محمد جمیل احمد بی۔ اے بریلوی)

خلاصہ قسط اوّل و دوم وسوم

(ناول نگار، رحیق کو اپنی اڑتالیسویں سالگرہ کے دن دوسرے خطوط کے ساتھ ایک دبیز لفافہ ملا جو ایک اجنبی عورت نے لکھا تھا وہ صرف تیرہ برس کی لڑکی تھی۔ جب اس نے رحیق کی محبت کا نہ روکے جاسکنے والا ایک طوفان اپنے دل میں محسوس کیا ——— اور وہ اس میں بہ گئی،

اس وقت اس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی رحیق کی محبت کی یاد سے معمور تھی۔ عمر کے ساتھ اس کی محبت بھی ترقی کرتی رہی۔ اس کی بیوہ ماں نے ایک شخص سے شادی کرلی اور اس کو زبردستی اپنی ماں کے ایک دوسرے شہر کو جہاں اس کا سوتیلا باپ رہتا تھا، منتقل ہونا پڑا۔ جہاں اس نے دو سال تڑپ تڑپ کر گذارے۔ اب وہ اٹھارہ سال کی تھی اور اس میں عورت بیدار ہوچکی تھی۔ آخر کوشش کرکے وہ پھر واپس آئی اور ایک دوکان پر ملازمت کرلی۔ اب اس کا معمول تھا کہ دن بھر کے کام کے بعد سرما کی برفیلی ہواؤں میں رحیق کے مکان کے سامنے جاکر کھڑی ہوجاتی اور گھنٹوں اس کی کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کو دیکھتی رہتی۔ ایک دن اتفاقاً دونوں سڑک پر مل گئے مگر رحیق اسے بھول چکا تھا۔ ایک دن پھر سڑک پر ملاقات ہوئی اور رحیق نے اُسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ راضی ہوگئی اور وہ شب اس نے وہیں گزاری۔ کچھ عرصہ بعد [illegible] اس نے دو راتیں اور رحیق کے ساتھ کاٹیں۔ اس کے بعد رحیق کہیں باہر چلا گیا اور رفتہ رفتہ اسے بھول گیا۔ ان شبوں میں سے ایک کا حاصل ایک لڑکا تھا جو محبت، اخلاص، محبت اور ایثار کے سانچے میں پیدا ہوا تھا۔ اب یہی اس کی امید اور زندگی کا سہارا تھا جو اس وقت اس کے سامنے مردہ پڑا تھا۔)

"آپ نے اس بچے کو کبھی نہیں دیکھا۔ آج میں اس کو آپ سے پوشیدہ رکھنے کی وجہ سے اپنے آپ کو قابلِ الزام سمجھ رہی ہوں۔ کیونکہ آپ یقیناً اس سے محبت کرتے۔ آپ نے اس کو خواب سے بیدار ہوکر مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا! آپ نے اس کی سیاہ آنکھوں کو نہیں دیکھا جو آپ کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں جن سے وہ مجھے اور دنیا کو شادمانی و مسرت سے دیکھتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا، بہت پیارا تھا۔ آپ کی بشاشت اور متلون المزاجی سب اس میں موجود تھی ——

اس صورت میں کہ جس میں یہ صفات ایک بچہ میں ہوسکتی ہیں، وہ گھنٹوں عالمِ بے خودی میں چیزوں سے اسی طرح کھیلتا رہتا جیسے کہ آپ زندگی سے کھیلتے ہیں۔ اور پھر سنجیدہ ہوجاتا اور بہت دیر تک بیٹھا ہوا اپنی کتابیں پڑھتا تھا۔ وہ آپ تھے، دوسرے جنم میں آپ، خوش طبعی و سنجیدگی کا ارتباط و اشتراک جو آپ کے کردار کی اس قدر نمایاں خصوصیت ہے اس میں صاف نظر آسکتا تھا۔ اور جتنا زیادہ وہ آپ سے مشابہ ہوتا جاتا تھا اتنی ہی زیادہ میں اس سے محبت کرتی جاتی تھی۔ وہ پڑھنے میں تیز تھا اور فرانسیسی زبان میں مینا کی طرح باتیں کرتا۔ اس کی کاپیاں درجہ میں سب سے زیادہ صاف رہتیں۔ وہ کیسا خوبصورت چھوٹا سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ جب گرمی کے موسم میں گریڈو ([illegible]) کے مقام پر [illegible] ساحل پر لے جاتی تو عورتیں اسے روک لیتیں اور اس کے ساتھ بالو ریت کھیلتیں، سیمرنگ (Semmering) میں جب وہ برف پر پھسلنے والی گاڑی میں بیٹھ کر چلتا تو لوگ مڑ مڑ کر اس کو دیکھا کرتے۔ وہ بے حد خوبصورت، نحیف، شریف النفس، حد درجہ دلکش اور جاذبِ توجہ تھا۔ پچھلے سال جب وہ کالج میں داخل ہوا اور بورڈنگ ہوس میں رہنے لگا تو اس نے کالج کے پچھلی اٹھارہویں صدی کے لڑکے کی سی وردی پہننا شروع کی جس کی پیٹی میں ایک چھوٹی سی چھری آویزاں تھی اور اب وہ یہاں پڑا ہے اس کی آنکھیں بے رونق اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے ہیں۔

آپ کو حیرت ہو گی کہ میں اپنے لڑکے کو قیمتی تربیت کیسے دے سکی،
یہ میرے لئے کس طرح ممکن ہوا کہ میں آسودہ حال لوگوں کی مسرور و مسرور
زندگی میں اس کو داخل کرنے کے سامان فراہم کر سکوں میرے محبوب میں
آپ سے دور اندھیرے میں سے گفتگو کر رہی ہوں۔ بغیر کسی شرم و حجاب کے
میں آپ کو بتا دوں گی، مجھ سے نفرت نہ کیجئے، میں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا،
میں نے کسبی کا پیشہ نہیں کیا، میں ایک بازاری طوائف نہیں بنی۔ مگر میں نے
اپنے آپ کو بیچ ڈالا، میرے احباب، میرے عشاق دولتمند لوگ تھے، اوّل اوّل
میں نے انہیں ڈھونڈا اور پھر انھوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ چونکہ میں (کبھی آپ
نے غور فرمایا ہے) ایک خوبصورت عورت تھی جس کسی کو میں نے اپنے آپ کو دے دیا
وہ میرا ہو گیا، وہ سب میرے نیاز مند مداح تھے، وہ سب مجھ سے محبت کرتے تھے
سوائے آپ کے جنہیں میں محبت کرتی تھی۔

اب جبکہ میں آپ کو بتا چکی کہ میں نے کیا کیا۔ کیا آپ مجھ سے نفرت
کرنے لگیں گے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ
سب کچھ سمجھ سکیں گے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کی خاطر کیا، آپ کے دوسرے
وجود، دوسرے جسم کی خاطر کیا، آپ کے لڑکے کی خاطر، میں جانتی تھی کہ غریبوں
کی دنیا میں زیر دست ہمیشہ ہمیشہ مظلوم رہتے ہیں۔ میں اس خیال کو کبھی بھی برداشت
نہیں کر سکتی تھی۔ آپ کا لڑکا، آپ کا پیارا لڑکا ایسے ارذل اور اسفل عالم یا
عوام الناس کی بدچلنیوں اور بد اخلاقیوں میں، غریبوں کے محلوں کی گندی
تاریک گلیوں کی مسموم ہواؤں میں پرورش پائے۔ اس کے باریک و نازک
ہونٹوں کو لاداروں کی زبان نہیں سیکھنا چاہئے۔ اس کے خوبصورت سفید جسم کو
غربا کے سخت، موٹے جھوٹے کپڑوں سے خراب نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کے لڑکے
کو ہر چیز کا بہترین حصہ مل جانا چاہئے، تمام دنیا کی دولت، تمام دنیا کی خوش
طبعی حاصل ہونا چاہئے۔ زندگی میں اس کو آپ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے اس
کو اسی ماحول میں رہنا چاہئے جس میں آپ رہ چکے تھے۔

یہ وجہ تھی جس کی بنا پر میں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ یہ میرے لئے
کوئی ایثار نہ تھا۔ چونکہ جن چیزوں کا نام ہم نے رسمی طور پر "عزت"، اور
بے عزتی رکھ لیا ہے وہ میرے لئے بے معنی تھیں۔ صرف آپ ہی ایک وہ ہستی
تھے جو میرے جسم کے مالک تھے اور آپ کو مجھ سے محبت نہ تھی۔ پھر کیا یہ بالکل
غیر اہم، بالکل بے معنی نہ تھا کہ میں اپنے جسم کے ساتھ کیا کرتی ہوں؟ میرے احباب

الفت شعاریاں اور نازبرداریاں، حتیٰ کہ ان کے انتہائی پرجوش جذبے
بھی کبھی میرے دل کی گہرائیوں کو نہ چھو سکے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر ایسے
لوگ تھے جن کی میں دل سے عزت کرنے پر مجبور تھی اور حالانکہ خود اپنی قسمت
کا خیال مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں ان کے یک طرفہ جذبۂ محبت سے ہمدردی کروں
یہ سب لوگ مجھ پر مہربان تھے۔ ان سب نے مجھ سے الفت کی اور مجھے خراب کیا، وہ
میرا ہر ممکن پاس و لحاظ کرتے تھے۔ ان میں سے ایک باعزت معمر شخص نے
جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اپنے ہر ممکن اثر و کوشش سے کام لے کر
آپ کے لڑکے کا نام کالج میں درج کروا دیا۔ یہ شخص مجھ سے لڑکی کی طرح محبت
کرتا تھا۔ تین یا چار مرتبہ اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اس سے شادی کر لوں
آج میں ایک دولتمند بیگم ہوتی۔ شاٹرال ([illegible]) کے ایک عالیشان
محل کی مالکہ! میں فکروں اور پریشانیوں سے بری ہوتی، چونکہ پھر لڑکے کو
ایک حد درجہ مہربان باپ مل جاتا اور مجھے ایک سنجیدہ، ممتاز اور رحم دل شوہر،
مگر میں اپنے انکار پر اڑی رہی گو میں جانتی تھی کہ اس سے اس کو اذیت پہنچا
ہو سکتا ہے کہ یہ میری بے وقوفی و حماقت ہو۔ اگر میں مان جاتی تو آج میں ہمیشہ
کہیں محفوظ و پرسکون زندگی بسر کرتی ہوتی۔ اور میرا بچہ اب بھی میرے پاس
ہوتا۔ مگر میں آپ سے اپنے انکار کی وجہ کیوں چھپاؤں۔ میں اپنے ہاتھ باندھنا
نہیں چاہتی تھی، میں آزاد رہنا چاہتی تھی —— آپ کے لئے! اپنے قلب
کی عمیق ترین گہرائیوں میں، اپنے نفس کے اس حصہ میں جو شعور کی حد سے
باہر ہے۔ میں اپنے بچپن کی آرزوؤں کے خواب دیکھتی رہی، شاید کسی دن آپ مجھے
اپنے پاس بلائیں۔ چاہے صرف ایک ہی ساعت کے لئے۔ صرف ایک ہی ساعت
کے امکان کے خیال سے میں نے ہر دوسری چیز کو ٹھکرا دیا۔ صرف اس لئے کہ میں
آپ کی آواز پر آزادی کے ساتھ لبیک کہہ سکوں، اس وقت سے کہ جب سے مجھ میں
"عورت"، جاگ اٹھی تھی۔ میری زندگی صرف ایک انتظار تھی۔ آپ کے ایک ایما،
ایک اشارے کا انتظار!

آخرکار متوقع ساعت آئی پھر بھی آپ نے کبھی یہ نہیں جانا کہ یہ ساعت
آئی! جب یہ ساعت آئی آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں، میں
آپ سے اکثر ملی، تھیٹروں میں، نغمہ و سرود کی محفلوں میں، پریٹر ([illegible])
میں، اور اکثر دوسری جگہ، ہمیشہ میرا دل دھڑکا اور ہمیشہ آپ بغیر کسی توجہ کے
میرے قریب سے ہو ہو کر گزر گئے۔ میری ظاہری شکل و شباہت بہت کچھ بدل چکی

تھی، وہ سترگیں لڑکی اب ایک عورت تھی، لوگ کہتے تھے ـــــ ایک خوبصورت
عورت، میں نفیس پوشاک میں ملبوس تھی، اور میرے گرد قصیدہ خوانوں اور
مداحوں کا مجمع تھا۔ اب آپ مجھ میں اُس شرمیلی لڑکی کو کیسے پہچان
سکتے تھے جس کو آپ نے اپنے سونے کے کمرے کی دُھندلی روشنی میں دیکھا تھا؟
اکثر میرا ساتھی آپ کو سلام کرتا اور آپ مجھے دیکھتے ہوئے سلام کا جواب
دیتے، مگر آپ کی نگاہیں ہمیشہ ایک خلیق و مہذب اجنبی نگاہیں ہوتیں تعظیم و
تکریم کی نگاہیں، مگر وہ معرفت و شناخت کی نگاہیں نہ تھیں ـــــ آہ وہ نگاہیں
دُور تھیں، مایوسی کی حد تک دُور، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ یہ ناشناسی، گو میں
اب اس کی عادی ہو چکی تھی۔ ناقابل برداشت تھی۔ میں ایک دوست کے
ہمراہ تھیٹر کے ایک کوچ میں بیٹھی ہوئی تھی اور آپ دوسرے بکس میں تھے
جب تماشے کے پہلے نغمے کا آغاز ہوا تو روشنیاں کم کر دی گئی تھیں، میں آپ کا
چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مگر میں آپ کا تنفس اسی طرح محسوس کر رہی تھی جیسے کہ
میں نے آپ کے کمرے میں محسوس کیا تھا۔ آپ کا نازک ہاتھ مخمل سے ڈھکی ہوئی
درمیانی دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ میں اُس وقت اس بے پایاں خواہش سے معمور
تھی کہ جھک کر آپ کے اس ہاتھ کو بوسہ دوں، جس کا محبت آمیز لمس میں نے
ایک دفعہ محسوس کیا تھا۔ تماشہ کی آوازوں کے ہنگامے میں یہ خواہش تیز تر
شدید تر ہوتی گئی۔ میں بمشکل تمام لرزتے ہوئے اپنے آپ کو، آپ کے ہاتھ
کا بوسہ دینے سے روک سکی، پہلے ایکٹ کے اختتام کے بعد میں نے اپنے دوست
سے کہا کہ میں جانا چاہتی ہوں۔ میری قوتِ برداشت سے یہ باہر تھا کہ آپ تاریکی
میں میرے قریب بیٹھے رہیں ـــــ اس قدر قریب اور اس قدر بیگانہ، اس قدر
غیر۔ مگر یہ ساعت ایک دفعہ اور آئی۔ صرف ایک دفعہ اور، پھر ایک سال
پہلے کا آپ کی سالگرہ کے دن ہی کا قصہ ہے۔ میرے خیالات پہلے سے زیادہ
آپ پر مرکوز تھے، چونکہ میں آپ کی سالگرہ کو تہوار کی طرح منایا کرتی تھی میں
علی الصبح گلاب کے سفید پھول خریدنے کے لئے گئی جو میں ہر سال آپ کو اس
ایک ساعت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے بھیجتی تھی جس کو آپ فراموش کر چکے
تھے۔ سہ پہر کو میں اپنے بچے کو گاڑی میں سیر کرانے کو لئے جا رہی تھی اور ہم
نے ساتھ چائے پی، شام کو ہم تھیٹر گئے۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اس دن کو
اپنی جوانی کی ایک مخفی و پُر اسرار سالگرہ کی طرح منائے۔ حالانکہ اس کو
اس کا سبب معلوم نہ تھا۔ دوسرا دن میں نے اپنے اُس زمانے کے ایک گہرے

دوست کے ساتھ گذارا جو برن (Brunn) کا ایک دولتمند بازارتہ اجب کے
ساتھ میں دو برس سے رہ رہی تھی، وہ مجھ پر بُری طرح فریفتہ تھا اور وہ مجھ
سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ کوئی وجہ نہ سمجھ سکا
گو اس نے مجھے اور میرے بچے کو تحائف کے بارے لاد دیا اور اپنے خالص
جذبۂ محبت میں کافی حد تک قابلِ محبت تھا۔ ہم دونوں آخر دوسروں کی ایک
محفل میں گئے جہاں ہمیں بہت سے زندہ دل اور بشاش لوگ ملے۔
رنگس ٹراسی (Ringstrasse) کے ایک ریسٹورنٹ میں
ہم سب نے شام کو کھانا کھایا۔ ہنسی اور گفتگو کے درمیان میں، میں نے ایک کلب
چلنے کو کہا، عام طور پر میں ایسی جگہوں سے جہاں مسرت میں نیم مخموریت کا شر
ہو، حذر اور احتراز کرتی اور ایسی جگہ نہیں جاتی، مگر اس وقت کوئی زبردست
اندرونی قوت کام کرتی معلوم ہوتی تھی کہ میں نے خود یہ تجویز پیش کی جس کا خیر مقدم
بہت خوشی سے کیا گیا۔ میں ایک ناقابلِ تشریح خواہش سے معمور تھی، گویا کچھ
غیر معمولی تجربات میرے منتظر تھے۔ معمول کے مطابق اس وقت بھی ہر شخص
میری رائے سے ہم خیال ہونے کا خواہشمند تھا۔ ہم ایک گھر گئے۔ تھوڑی سی ارغوانی
شراب پی۔ اور دفعتاً مسرت کی ایک ایسی جنوں پرور کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی
جس سے اُس وقت سے پیشتر میں واقف نہ تھی۔ میں نے پے بہ پے شراب کے
کچھ جام اور پیئے اور کچھ گانے والوں کے ساتھ جو موقع و محل کے مناسب ایک گانا
گا رہے تھے، میں بھی شامل ہو گئی اور مجھ میں مسرت کے ساتھ رقص کرنے کی
ایک آمادگی پیدا ہو گئی۔ پھر یکایک میں نے محسوس کیا کہ جیسے کسی برف کی طرح خنک
یا جلتے ہوئے ہاتھ نے میرے دل کو پکڑ لیا ہو۔ آپ دوسری میز پر کچھ احباب کے ساتھ
بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے مدحت آمیز اور محبت پرور نگاہوں سے دیکھ رہے تھے
اُن نگاہوں سے جنہوں نے مجھے غیر قابلِ بیان طور پر جھنجوڑ ڈالا ہے۔ لرزہ براندام
کر کر دیا ہے۔ اپنی فطرت کے ایک نامعلوم جذبہ کے تحت میں اس دس برس کے
دوران میں آپ پہلی دفعہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں لرز اٹھی اور میرا ہاتھ اس
قدر زور سے کانپا کہ شراب کا پیالہ قریب قریب گر پڑا۔ خوش قسمتی سے میرے
ساتھیوں نے میری یہ حالت نہیں دیکھی۔ چونکہ اُن کے حواس موسیقی او قہقہوں
کی آواز سے منتشر اور پریشان تھے۔
آپ کی نگاہیں رفتہ رفتہ زیادہ پُر جوش ہوتی گئیں اور انہوں نے
میرے جذبات کو بھڑکا دیا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ آیا بالآخر آپ نے مجھے پہچان

لیا تھا یا آپ کی خواہشات اُس عورت نے برانگیختہ کر دی تھیں جو آپ کی نگاہوں میں بالکل بیگانہ نہ اجنبی تھی۔ میرے رخسار سُرخ ہوگئے تھے، اور میں اپنے ربطی سے انکل پچّو بات کر رہی تھی۔ آپ نے اپنی نگاہوں کے اثر کو [illegible] کرلیا تھا۔ آپ نے محقق کر سکے میں مجھے ایسا [illegible] کو سر کی ایک [illegible] سے ایک خفیف سا اشارہ کیا اور پھر [illegible] کر کے آپ اپنے دوستوں [illegible] اور میز کے پاس چلے گئے۔ [illegible] مجھے یہ اشارے سے بتاتے گئے [illegible] میرے منتظر رہیں گے۔ میں ایک ایسے مریض کی [illegible] اُٹھی جس کو بخار [illegible] میں مخاطب کی گئی تو جواب دینے کے قابل نہ تھی۔ میں اپنے [illegible] نہیں کرسکتی تھی اس وقت محض اتفاق سے دو نیگرو نسل کے لوگوں نے اپنی چیخ و پکار کے ساتھ ایک وحشیانہ رقص شروع کیا۔ ہر شخص اُن کی طرف متوجہ ہوگیا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ میں کھڑی ہوگئی اپنے دوست سے کہا کہ میں ایک منٹ میں واپس آجاؤں گی اور پھر آپ کے پیچھے آئی۔ آپ برآمدہ میں میرے منتظر تھے اور جب میں آئی آپ کا چہرہ چمک اُٹھا، ایک تبسم کے ساتھ آپ مجھ سے ملنے کے لیے آگے بڑھے۔ یہ ظاہر تھا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا، نہ پچھلے زمانے کی اُس بچّی کو، نہ لڑکی کو، پھر میں آپ کے لیے ایک نئی ملاقاتی تھی: کیا واقعی آپ کے پاس ایک گھنٹہ میرے ساتھ گزارنے کے لیے ہے؟ آپ نے ایک مطمئن لہجے میں پوچھا جس سے ظاہر تھا کہ آپ مجھے ایک ایسی عورت تصوّر کر رہے ہیں جس کو کوئی بھی ایک رات کے لئے قیمت ادا کر کے خرید سکتا ہے، "ہاں،" میں نے جواب دیا وہی کانپتی ہوئی اثباتی "ہاں" جو آپ نے تقریباً دس برس پہلے ایک تاریک سڑک پر مجھ سے میری دوشیزگی کے زمانہ میں سُنی تھی "آپ کب مل سکیں گی" آپ نے دریافت کیا۔ "جب آپ چاہیں"، میں نے جواب دیا، چونکہ جہاں آپ کا تعلق تھا وہاں میں کوئی شرم و حجاب نہیں جانتی تھی۔ آپ نے مجھے کچھ حیرت سے دیکھا، ایسی حیرت سے کہ جس میں شک اور رازجویانہ شوق شامل تھے، اور جس کا اظہار آپ نے اس سے پیشتر اس وقت بھی کیا تھا جب آپ میری آمادگی پر متعجب ہوگئے تھے۔ "ابھی"؟ ایک لمحہ کے پس و پیش کے بعد آپ نے پوچھا "ہاں" "چلئے" میں کپڑوں کے کمرے سے اپنی چادر لانے کو ہوئی کہ مجھے یاد آیا کہ میرے برن (Brunn) دوست نے اپنے اور میرے کپڑے ایک ساتھ داخل کئے تھے اور ٹکٹ اسی کے پاس تھا۔ اس کے پاس جانا اور مانگنا غیر ممکن تھا اور آپ کے ساتھ رہنے کو اس

موقع کو چھوڑ دینا جس کی میں برسوں سے منتظر تھی اور بھی زیادہ غیر ممکن تھا۔ میں نے اپنی شال سنبھالی اور آپ کے ہمراہ اس شبنم آلود رات میں چل دی۔ فر چادر رہی سے بے پروا ہو کر نہیں۔ بلکہ اس نیک طینت شریف مزاج آدمی سے بھی بے نیاز ہو کر جس کے ساتھ میں برسوں سے رہ رہی تھی، ——— اس حقیقت سے بھی بے نیاز ہو کر کہ ان سب لوگوں کے سامنے اسے چھوڑ کر چلے جانے میں اس کو اس کے دوستوں کی نظروں میں ایسا ایسے شخص کی سی مضحکہ خیز اور نفرت انگیز حالت میں پیش کر رہی ہوں جس کی بیوی ایک اجنبی شخص کا اشارہ پا کر اسے چھوڑ دے۔ اپنے دل میں، میں خوب اچھی طرح واقف تھی کہ میں ایک شریف دوست کے ساتھ کس قدر کمینہ پن اکس قدر ناشکری کس قدر احسان فراموشی کا برتاؤ کر رہی ہوں۔ میں یہ جانتی تھی کہ میری یہ شدید جذباتی غلطی اسے ہمیشہ کے لئے مجھ سے بیگانہ بنادے گی۔ میں جانتی تھی کہ میں اپنی زندگی پر مصیبتوں کو دعوتیں دے رہی ہوں، مگر میرے لیے اس کی دوستی کیا تھی؟ خود میری زندگی کیا تھی، ؟ اس اتفاقیہ موقع کے مقابلہ میں کیا تھی۔ جب میں پھر آپ کے لبوں کا لمس اپنے لبوں پر محسوس کروں گی جب میں آپ کی آواز کے بولوں کو پھر سُن سکوں گی، اب جبکہ سب کچھ ختم ہوچکا ہے میں آپ کو بتا سکتی ہوں کہ مجھے آپ سے کس قدر محبت تھی، مجھے یقین ہے کہ اگر آپ مجھے بستر مرگ سے بھی بلائیں تو مجھ میں اتنی طاقت آجائے گی کہ میں اُٹھ کر آپ کی دعوت پر لبیک کہوں!

دروازہ پر ایک کرایہ کی موٹر کھڑی تھی اور ہم اس میں بیٹھ کر آپ کے مکان کو روانہ ہوئے۔ ایک دفعہ پھر میں آپ کی آواز سن سکتی تھی۔ ایک دفعہ پھر میں نے آپ کے قرب کی وجدانی مسرت محسوس کی اور بہت عرصہ پہلے کی طرح اس وقت بھی مسرت و پریشانی کی کثرت سے مجھ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ میں اچھی طرح بیان نہیں کرسکتی کہ جب ہم اس مانوس زینہ پر چڑھ رہے تھے تو کس طرح میں نے وہ تمام جذبات پھر محسوس کئے جو دس برس پہلے محسوس کر چکی تھی۔ کس طرح میں بیک وقت ماضی و حال دونوں زمانوں میں زندگی بسر کر رہی تھی میری تمام ہستی گویا آپ کی ہستی میں پیوست ہوگئی تھی۔ آپ کے کمروں میں بجز خفیف سی تبدیلی ہوئی تھی۔ تصویریں کچھ بڑھ گئی تھیں، کتابیں کچھ زیادہ ہوگئی تھیں۔ فرنیچر میں ایک یا دو چیزوں کا اضافہ مگر سب ملا کر پہلے ہی کی طرح مانوس معلوم ہوتا تھا۔ لکھنے کی میز پر گلدان رکھا تھا اور اس میں سفید گلاب کے پھول تھے وہ پھول جو میں نے ایک دن پہلے اُس عورت کی یادگار کے طور بھیجے تھے جس کو آپ بھول گئے تھے جس کو آپ نے نہیں پہچانا تھا۔ اب

بھی نہیں، جب وہ آپ کے بالکل قریب تھی، جب آپ اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، اور آپ کے لب اس کے لبوں پر ثبت تھے، مجھے یہ دیکھ کر گونہ راحت ہوئی کہ میرے فرستادہ پھول وہاں رکھے تھے۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ نے ایک اس چیز کی قدر کی تھی جو میری پیش کش تھی، جو آپ سے وابستہ میری محبت کی زندگی کا سانس تھی؟

آپ نے مجھے اپنی آغوش میں لیا، اور میں آپ کے ساتھ قیام پذیر رہی مگر پھر بھی آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ جب میں آپ کی شفقت آمیز تھپکیوں اور محبت نواز بوسوں سے کانپ رہی تھی تو یہ ظاہر تھا کہ آپ کے جذبات ایک محبت کرنے والی محبوبہ اور ایک بازاری عشوہ فروش میں کوئی امتیاز نہیں کرتے، یہ ظاہر تھا کہ آپ کے بے پناہ اور فضول خرچی سے صرف کئے ہوئے جذباتِ الفت کو صرف اپنے ہی اظہار سے سروکار تھا، مجھ پر، ایک اجنبی پر، جس کو آپ نے رقص گھر سے پکڑ لیا تھا۔ آپ اس قدر مہربان، اس قدر شفیق بن گئے تھے، آپ مجھ سے بے عزتی کا سخیفانہ برتاؤ کرنا نہیں چاہتے تھے، اور پھر بھی آپ چھا جانے والے، مغلوب کر لینے والے جذبے سے معمور تھے۔ مسرت گذشتہ سے سرشار ہو کر میں پھر آپ کی فطرت کے دونوں رخوں سے واقف تھی، آپ کے دماغی و جنسی جذبات کی اس حیرتناک آمیزش سے واقف تھی۔ جس نے بچپن ہی میں مجھے آپ کا غلام بنا دیا تھا۔ میں نے کسی دوسرے شخص کو اس لمحے کے کیف سے اس قدر مکمل طور سے مغلوب ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے کسی شخص کو اس قدر زیادہ مسحور، اس قدر زیادہ بیخود ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جس قدر کہ آپ کو، —— آپ کو، کہ جن پر اس ساعت کے گذر جانے کے بعد ایک غیر مختتم اور سنگدلانہ فراموشی طاری ہو جاتی، مگر میں بھی اپنے آپ کو بھول گئی۔ میں جو وہاں تاریکی میں لیٹی تھی، کون تھی؟ کیا میں ایّام گذشتہ کی جذبات برانگیختہ بچی تھی؟ کیا میں آپ کے بچے کی ماں تھی؟ کیا میں بالکل بیگانہ و اجنبی تھی؟ اس حیرتناک رات کو بہت باتیں مل کر ایک ہو گئی تھیں اور یہ ایک جذبہ، سرشاری کی حد تک مانوس، مسرتی کی حد تک نیا تھا، میری خواہش تھی کہ یہ مسرت ہمیشہ تک باقی رہے

مگر صبح ہو گئی، ہم دیر میں اُٹھے اور آپ نے مجھ سے ناشتہ پر رُکنے کے لئے کہا۔ کھانے کے کمرے میں جہاں انتظام کسی غیر مرئی ہاتھ نے کیا تھا ہم چاء پر خاموشی سے گفتگو کرتے رہے، پہلے کی طرح آپ نے ایک پرجوش اور مخلصانہ بے تکلفی کا اظہار کیا اور پہلے کی طرح پھر کوئی بے تکے سوالات نہ تھے، میری بابتہ رازجوئی کا کوئی شوق نہ تھا۔ آپ نے مجھ سے نام دریافت نہیں کیا، میرا پتہ نہیں پوچھا، پہلے کی طرح اب بھی میں آپ کے لئے ایک اتفاقیہ شکار تھی، ایک گمنام عورت تھی، ایک پرجوش ساعت تھی، جو گذر جانے کے بعد اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑتی۔ آپ نے بتایا کہ آپ ایک لمبے سفر پر شمالی افریقہ میں دو تین مہینے رہنے کے لئے جا رہے ہیں۔ اِن الفاظ نے میری مسرت کو چور چور کر ڈالا " ماضی، ماضی، ماضی، فراموشی" میں آپ کے قدموں پر گر کر یہ استدعا کرنا چاہتی تھی کہ مجھے اپنے ہمراہ لیتے چلئے تاکہ بالآخر اس تمام زمانے کے گذر جانے کے باوجود بھی آپ مجھے پہچان لیں، مگر میں کم ہمت تھی، بزدل تھی، کمزور تھی میں صرف اتنا کہہ سکی "افسوس"، آپ نے تبسم ریز آنکھوں سے مجھے دیکھ کر پوچھا "کیا تمھیں واقعی افسوس ہے"؟

ایک لمحہ تک میں ایک بیخودی کے عالم میں تھی، میں کھڑی ہو گئی اور آپ کو ٹکٹکی باندھے تکتی رہی، پھر میں نے کہا۔ "جس شخص سے میں محبت کرتی ہوں وہ ہمیشہ سفر ہی میں رہا ہے" میں آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی، میں نے سوچا "اب ہاں، اب یہ مجھے پہچان لیں گے"، آپ صرف مسکرائے اور تسلی دیتے ہوئے کہا "کچھ عرصہ کے بعد واپس آ جاتا ہے" میں نے کہا "ہاں آ جاتا ہے مگر اس وقت تک وہ سب کچھ فراموش کر چکتا ہے"

۸۵

میں نے مزید ایک گہرے جذبے کے تحت میں یہ الفاظ ادا کئے ہونگے چونکہ میرے لہجے کا آپ پر اثر ہوا۔ آپ بھی کھڑے ہو گئے اور مجھے لطف و حیرت سے دیکھنے لگے۔ آپ نے اپنے ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھ دئے " اچھی چیزیں فراموش نہیں کی جاتیں اور میں تمھیں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ آپ مجھے بغور دیکھ رہے تھے گویا آپ اپنے دل میں میرا ایک باقی رہنے والا عکس قائم کر رہے ہیں۔ جب میں نے آپ کی ان پیوست ہو جانے والی نگاہوں کو اپنی ہستی کے اس جائزہ کو دیکھا تو میں یہ خیال کئے بغیر نہ رہ سکی کہ اب آپ کی بے بصری کا طلسم بالآخر ٹوٹ جائے گا " وہ مجھے پہچان لیں گے، پہچان لیں گے، میں انتظار و امید میں لرز رہی تھی، مگر آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ ہاں آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں آپ کی نظروں میں اس وقت سے زیادہ اجنبی و بیگانہ کبھی نہ تھی۔ چونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ ایسا نہیں کر سکتے تھے جو آپ نے چند لمحوں کے بعد کیا، آپ نے مجھے پھر بوسہ، ایک پُرجوش بوسہ دیا۔ میرے بال بکھر گئے تھے اور ایک دفعہ پھر مجھے ان کو سنوارنا پڑا۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے دیکھا —— اور جیسے ہی میں نے دیکھا، میں شرم و نفرت کے جذبات سے بے تابو ہو گئی —— کہ آپ چپکے سے میرے دستانوں میں دو نوٹ

رکھ رہے تھے، میں بمشکل اپنے آپ کو چیخ اُٹھنے سے روک سکی۔ میں بمشکل اپنے آپ کو آپ کے رخسار پر طمانچہ مارنے سے روک سکی، آپ مجھے اس رات کی قیمت ادا کر رہے تھے، جو میں نے آپ کے ساتھ گذاری تھی۔ مجھے جو بچپن سے آپ کے عشق میں گرفتار تھی، مجھے جو آپ کے بچے کی ماں تھی۔ آپ کے نزدیک میں صرف ایک بازاری عشوہ فروش تھی، جو آپ کو رقص گھر میں مل گئی تھی، صرف یہ کافی نہ تھا کہ آپ مجھے بھول جائیں، آپ کو مجھے میری قیمت ادا کرنے اور مجھے ذلیل و خوار کرنے کی بھی ضرورت تھی!

میں نے جلدی سے اپنی چیزیں اُٹھالیں، تاکہ جتنا جلد ممکن ہو، میں نکل جاؤں، میں ایک شدید کرب محسوس کر رہی تھی۔ میں نے مڑکر اپنا ہیٹ دیکھا وہ لکھنے کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ سفید گلاب کے گلدان کے پاس، میرے پھولوں کے پاس بے اختیار جی چاہا کہ میں ایک آخری کوشش آپ کی یاد کو تازہ کرنے کی اور کردوں، کیا آپ مجھے ایک گلاب کا پھول دینگے؟ "ہاں ہاں" آپ نے سب پھول گلدان سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مگر شاید کسی عورت کے بھیجے ہوئے ہیں، کسی عورت کے جو آپ سے محبت کرتی ہے؟" "ممکن ہے" آپ نے جواب دیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ میرے پاس بطور تحفے کے آئے تھے مگر مجھے نہیں معلوم کس نے بھیجے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے مرغوب ہیں" میں نے آپ کو غور سے دیکھا۔ "غالبًا یہ پھول آپ کو کسی عورت نے بھیجے ہیں جس کو آپ فراموش کر چکے ہیں"۔

آپ کو تعجب ہوا۔ میں نے آپ کو اور بھی زیادہ غور سے دیکھا میری آنکھیں ملتجی تھیں "پہچانئے" "ہاں اب تو مجھے آخری مرتبہ پہچان ہی لیجئے"، مگر آپ کے تبسم میں دلدوزی تھی، پہچان نہ تھی، آپ نے پھر ایک دفعہ مجھے بوسہ دیا۔ مگر آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔

میں تیزی سے چلی گئی، چونکہ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ انھیں دیکھیں، کمرے سے تیزی کے ساتھ جانے میں دروازے پر میں آپ کے ملازم جان سے ادھیم کے ایک گولے کی طرح گر پڑتی۔ اس کو حیرت ہوئی اور ساتھ ہی مجھ میں ایک پُرشوق انہماک پیدا ہو گیا تھا۔ وہ میری سامنے سے ہٹ گیا اور میرے لئے سامنے کا دروازہ کھول دیا اور جب میں اس تیزی سی گذر جانے والے لمحے میں جس نے اپنے آنسوؤں میں اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک روشنی سی دوڑ گئی۔ ہاں میں آپ سے کہتی ہوں کہ اس تیزی سے گزر جانے والے لمحے میں اس نے مجھے پہچان لیا جس نے بچپن کے بعد پھر مجھے نہیں دیکھا تھا۔

میں اُس کی اس قدر ممنون تھی کہ یہی چاہتا تھا کہ میں جھکوں اور اس کے ہاتھ چوم لوں، میں نے اپنے دستانے سے وہ نوٹ گھسیٹ لئے جس سے آپ نے مجھے عذاب پہونچایا تھا اور اُس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ اُس نے حیرت آمیز انداز میں مجھے غور سے دیکھا —— چونکہ وہ اس ایک لمحے میں مجھے اتنا سمجھ گیا تھا۔ جتنا کبھی آپ عمر بھر نہیں سمجھے۔ ہر شخص ہر شخص میری تخریب کے پیچھے پڑ گیا۔ ہر شخص نے مجھے اپنی مہربانیوں کے بار سے داب دیا۔ آپ نے، صرف آپ نے مجھے کبھی نہیں پہچانا۔

میرا بچہ، ہمارا بچہ مر گیا، اب کوئی نہیں ہے جس سے میں محبت کر سکوں دنیا میں آپ کے سوا اب کوئی نہیں، مگر آپ میرے لئے کیا ہیں؟ —— آپ جنھوں نے مجھے کبھی، کبھی نہیں پہچانا۔ آپ جو مجھ سے اس طرح گذر گئے جیسے آپ ایک آبشار سے گذر جاتے، آپ مجھے اس طرح روندتے ہوئے چلے گئے جیسے ایک پتھر کو روند کر چلے جاتے، آپ مجھے ایک ابدی انتظار میں چھوڑ کر بغیر کسی خیال، بغیر کسی التفات کے اپنے راستہ پر چلے گئے۔ ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ اب میں نے آپ کو پالیا ہے، آپ کو، اس نہ پائی جا سکنے والی ہستی کو، اس بچے کو پالیا ہے، مگر وہ آپ کا بچہ تھا! رات کو وہ بے رحمی سے چپکے سے سفر کو چلا گیا، وہ مجھے بھول گیا ہے اور اب کبھی واپس نہ آئے گا۔ میرے پاس آپ کی کوئی چیز نہیں، کوئی بچہ نہیں، کوئی لفظ نہیں تحریر کی کوئی سطر نہیں، آپ کے حافظہ و یاد میں میری کوئی جگہ نہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کی موجودگی میں میرا نام لے تو آپ کے نزدیک وہ بالکل ایک اجنبی اور بیگانے کا نام ہوگا۔ کیوں مجھے مرنے کی خوشی نہ ہو جب میں آپ کے نزدیک مُردہ ہوں؟ کیوں مجھے جانے کی خوشی نہ ہو جب آپ میرے پاس سے چلے گئے۔

میرے محبوب! میں آپ کو الزام نہیں دیتی، میں اپنے سوز و غم اپنے پاس و حرماں کو آپ کی پُرمسرت زندگی میں داخل کرنا نہیں چاہتی، آپ ڈریں نہیں میں آپ کو کوئی مزید تکلیف نہیں دوں گی، اپنی اس خواہش کی پیروی پر کہ آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔ مجھے معاف کر دیجئے، جب میرا بچہ مُردہ پڑا ہے صرف اسی ایک مرتبہ میں آپ سے گفتگو کروں گی۔ میں پھر پوشیدگی کی تاریکی میں لوٹ جاؤں گی میں پھر خاموش ہو جاؤں گی، جیسے کہ ہمیشہ رہی ہوں، جب تک میں زندہ ہوں گی آپ میری آہ بھی نہیں سنیں گے۔ صرف میری موت کے بعد ہی آپ کو یہ ترکہ پہونچے گا، اس کا ترکہ جس نے آپ کو تمام چاہنے والوں سے زیادہ چاہا ہے۔ اس کا ترکہ جس کو آپ نے کبھی نہیں پہچانا۔ اس کا ترکہ جو ہمیشہ آپ کے بلاوے کی منتظر رہی۔ اس کا ترکہ جس کو آپ نے

کبھی نہیں بلایا۔ غالباً، غالباً جب آپ کو یہ میراث ملیگی تو آپ مجھے بلائیں گے اور وہ پہلا موقع ہوگا۔ جب میں آپ سے بے وفائی کروں گی۔ چونکہ میں آپ کی آواز موت کی نیند میں نہ سن سکوں گی۔ میں اپنی کوئی تصویر، کوئی نشانی نہیں چھوڑ رہی ہوں، جیسے کہ آپ نے کچھ نہیں چھوڑا، چونکہ اب کبھی آپ مجھے نہیں پہچانیں گے، زندگی میں یہی میری قسمت میں تھا اور موت میں بھی یہی میری قسمت میں ہوگا۔ میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں آپ کو نہیں بلاؤں گی، میں بغیر آپ کو اپنے نام وصورت سے واقف کئے ہوئے چلی جاؤں گی، موت مجھ پر آسان ہوگی۔ چونکہ دور سے آپ اس کو محسوس کر سکیں گے۔ اگر میری موت سے آپ کو تکلیف ہوتی تو میں کبھی نہ مرسکتی،

میں اور زیادہ نہیں لکھ سکتی۔ میرے سر میں بہت گرانی ہے۔ میرے اعضا میں درد ہے، مجھے بخار آنے کو ہے، مجھے لیٹ جانا پڑے گا۔ غالباً سب کچھ جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ غالباً اس مرتبہ تقدیر مجھ پر مہربان ہوگی اور مجھے اپنے بچے کا جنازہ نکلتے ہوئے دیکھنا نہ پڑے گا۔

میں اور کچھ نہیں لکھ سکتی، الوداع، پیاری الوداع! میں آپ کی بے انتہا ممنون ہوں گی۔ میں بے حد مسرور ہوں کہ میں نے آپ کو سب کچھ بتایا۔ اب آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ گو آپ کبھی یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ میں آپ سے کس قدر محبت کرتی تھی، مگر با ایں ہمہ میری محبت آپ پر بار نہیں ہوگی۔ میں آپ سے وابستہ ہوں گی، یہی میری تسکین ہے، کہ آپ کی شادماں، درخشاں زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ مجھے، میری موت آپ کے لئے تکلیف و گزند کا باعث نہ ہوگی، اس خیال سے مجھے راحت ہے۔

مگر کون، آہ کون اب سالگرہ کے موقع پر آپ کو سفید گلاب کے پھول بھیجا کرے گا؟ "گلدان خالی رہے گا" میری زندگی کی وہ مہک، وہ سانس، جو میں ہر سال آپ کے کمرے میں پھونک دیا کرتی تھی، اب آئے گی، میری آخری خواہش ہے، پہلی و آخری خواہش، اس کو میرے واسطے پورا کر دیجئے۔ ہمیشہ سالگرہ کے موقع پر ——— اس دن جب آدمی کو اپنا خیال آتا ہے ——— گلاب کے کچھ پھول لے کر گلدان میں رکھ دیا کیجئے، اس کو اسی طرح کیجئے جیسے اور لوگ ہر سال مردوں کی برسی کرتے ہیں۔ میرا اب خدا میں یقین نہیں رہا ہے، اور اس وجہ سے اب میں برسی کی فاتحہ نہیں چاہتی، میں صرف آپ میں یقین رکھتی ہوں، میں سوائے آپ کے اور کسی سے محبت نہیں کرتی، میں صرف آپ ہی میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ——— صرف سال میں ایک دن، سکون و خاموشی کے ساتھ، جیسے کہ میں ہمیشہ آپ کے قریب رہی ہوں، براہ کرم ایسا کیجئے جمی! براہ کرم ایسا کیجئے، . . . میری پہلی اور آخری تمنا . . . . شکریہ، شکریہ، مجھے آپ سے محبت ہے، مجھے آپ سے محبت ہے، . . الوداع .

اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط گر پڑا۔ وہ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ ہاں اس کے دل میں ایک بھولی بسری دھندلی سی یاد تھی، ایک ہمسایہ کی بچی کی، ایک لڑکی کی، رقص گھر میں ایک عورت کی، ایک تیز بہنے والے چشمے کی تہ میں پڑے ہوئے ایک سنگریزے کی غیر مشکل اور دھیمی جھلملاہٹ کی طرح، دھندلی منتشر پریشان یاد! اس کے ذہن میں بہت سے سائے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے گذرے مگر وہ تحلیل و منتشر ہو کر اس کے دماغ میں کوئی ایک تصویر پیش نہیں کر سکے، دنیائے احساسات میں بھولی ہوئی یاد کی کچھ متحرک جنبشیں تھیں، مگر اس کے باوجود وہ اچھی طرح کچھ یاد نہیں کر سکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے ان سب باتوں کو خواب میں دیکھا ہے، ہاں بڑی وضاحت کے ساتھ، اور اکثر وہ بیکھلیت، پھر بھی یہ سب خواب کے واہمے تھے، خیالی صورتیں تھیں، سیمیا کی نمود تھی، اس کی نظر اس لکھنے کی میز پر رکھے ہوئے نیلگوں گلدان پر گئیں وہ خالی تھا برسوں سے وہ اس کی سالگرہ کے موقع پر خالی ہی رہتا تھا۔ وہ کانپ اٹھا، اسے محسوس ہوا گویا ایک غیر مرئی دروازہ دفعتاً کھل گیا ہے، ایک دروازہ، جس میں سے دوسری دنیا کی ایک کپکپی پیدا کر دینے والی ٹھنڈی ہوا، اس کے محفوظ کمرہ میں آرہی ہے۔ اس نے موت کی آمد محسوس کی، اور محبت کا ایک لافانی جذبہ۔ اس کے دل ہی دل میں کچھ ابل رہا تھا اور اس مرحوم کا خیال اس کے دماغ میں مضطرب تھا، دور سے آنے والی صدائے موسیقی کی طرح غمگین و پُرجوش!

وداعِ آخر

جرمنی کے زبردست ناول نگار اسٹیفان زویگ کے افسانوی شاہکار کا ترجمہ
(Stefan zweig)

مترجمہ - محمد جمیل احمد بی اے بریلوی

اس غیر فانی شاہکار کو آپ اگست سنہ ۱۹۴۰ء سے لے کر دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء تک ملاحظہ کرتے رہے ہیں، اس نمبر میں اس کی آخری قسط شائع کی جا رہی ہے، اب ادارہ ادبی مرکز نے طے کیا ہے کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے اور اس کی ادبی اہمیت کے لحاظ سے اس کو اعلیٰ اور حسین صورت میں پیش کیا جائے، تیاری شروع ہو گئی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس کی خریداری کے لئے اپنا نام محفوظ کرا دیں، قیمت اندازاً ایک روپیہ سے زیادہ نہ ہوگی -

ناظم مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

چوڑی والا

ماتی دیوی جی، "ہندی دنیا" کی مشہور افسانہ نگار دیوی ہیں، ہم اس نمبر میں ان کا ایک چھوٹا سا شاہکار "چوڑی والا" پیش کرنے کی مسرّت حاصل کرتے ہیں۔ اس میں بظاہر کچھ نہیں ہے مگر ایک ایک حرف اُس تعلق کی داستان ہے جو انسانی روح کو جوڑتا ہے، یہ کہانی اُسی "لاگ کی آگ" کو پیش کرتی ہے۔

ساغر

"چولی والے! او چولی والے! لکو ہم چولی پہنیں گے!!"

"اماں او اماں بولو ہم پہن لیں!" چوڑی والے نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کواڑ کھول کر چھوٹی سی ایک بچّی نکل آئی اور اپنی تپلی تپلی گوری باہیں پھیلا کر بولی "پہناؤ نا چولی۔ ہم اچھّی اچھّی پہنیں گے!"

چوڑی والے نے خوبصورت خوبصورت چوڑیاں چھانٹ کر بچّی کی کلائی بھر دی۔ "جاؤ پیسے لے آؤ" وہ بولا۔ "دو پیسے کی ہیں چولی والے!؟"

. . . . بچّی نے سوال کیا۔ چوڑی والے نے ہنس کر کہا

"نہیں جاؤ چار آنے لے آؤ" بچّی نے جیب سے دو پیسے نکال کر کہا "دو پیسے لے لو چولی والے!" چوڑی والے نے سنجیدگی کے لہجہ میں کہا "جاؤ اندر سے لے آؤ" ننھّی سی بچّی اندر گئی، چوڑی والے نے بچّی کو اندر سے بولتے سُنا، "اماں کہتی ہے دو آنے لو گے"؟ چوڑی والے نے کہا "نہیں ساڑھے تین آنے ہی دیدو" "اماں کہتی ہے دو آنے دینگے نہیں تو چولی اُتال لو" نا امیدی کے لہجے میں بچّی نے جواب دیا۔ پھر اپنے آپ ہی کہا۔ "دو پیسے لو نا چولی والے" چق کے اندر سے جھانکتی ہوئی ننھی ننھی آنکھیں اُمید سے چمک اُٹھیں "لاؤ دو ہی آنے دیدو دیر ہو رہی ہے" مجبور ہو کر چوڑی والا بولا، اور پیسے لے کر چلا گیا۔

اب اُس گلی میں چوڑی والے کی آواز اکثر سنائی دیا کرتی تھی۔ گلی کے دوسرے سرے پر سے ہی اُس کی آواز سُن کر ننھی سی تارا دوڑی آتی "چولی والے! او چولی والے"! پاس آکر اور ہنس کر کہتی "تم آگئے"؟ چوڑی والا اُسے گود میں اُٹھا کر کہتا "کیا تجھے اب بھی میرے آنے میں شک ہے"؟ دونوں ہنستے۔ وہ اس کی ایک ایک چوڑی کھولتی "ارے یہ دو پیسے کی ہے۔ یہ چمکیلی بھی دو پیسے کی ہے چولی والے تمھاری سب چولیاں دو پیسے کی ہیں لال بھی" چوڑی والا قہقہہ لگا کر کہتا "کیوں ری تیرا سسر تخیا ہوگا دو پیسے کی" "ہت" کہہ کر بچّی بھاگ جاتی۔ چوڑی والے کو اُس ننھی بچّی سے محبت سی ہوگئی، اُس سارے شہر میں ایک وہی تھی جو اُس کی چوڑیوں کی اتنی تعریف کرتی تھی۔ بچّی چوڑیاں پہن کر خوش ہوتی تھی۔ خوب ناچتی تھی۔ چوڑی والا سوچتا تھا کہ اُس کی زندگی کامیاب ہوگئی۔ چوڑی کے ساتھ ساتھ بچّی خوش ہو کر چوڑی والے کی بھی تعریف کرتی تھی، "تم بڑے اچھے ہو۔ چولی والے جیسی یہ لال چولی ہے" لال چوڑیوں کے ہار کو چھو کر کہتی۔ پھر پوچھتی "چولی والے تم چولیاں کیسے بناتے ہو مجھے بنانا بتا دو گے، میں بھی بناؤں گی بیچوں گی، دو پیسے کی، خوب پہنوں گی تمھیں بھی پہناؤں گی"۔ ایک سانس میں نہ معلوم وہ کتنی باتیں کر جاتی بچّی، ساکت ہو کر سوال کرتی "لیکن تم کیوں نہیں پہنتے ہو چولیاں" اس سوال کا جواب بتانا چوڑی والے کو مشکل ہو جاتا۔ وہ پھر پوچھتی "چولی والے! تُوا چولی نہیں پہنتی کیوں؟ کیا وہ بڑی ہو گئی ہے؟" چوڑی والا چپ رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ تُوا چوڑی کیوں نہیں پہنتی ہے وہ بیچاری بیوہ ہے، بچّی جواب کا انتظار کئے بغیر ہی سلسلہ کہہ جاتی "میں چولی جلول پہنوں گی تُوا کی طرح بلی ہونے پل بھی" - چولی والے - - وہ اپنا مُنہ چوڑی والے کے کان سے لگا کر کہتی "تُوا کالی ہے نا اس لئے چولی نہیں پہنتی ہے چولی والے"، بچّی آہستہ سے نانی دادیوں کی طرح کہتی، تاکہ تُوا ان -

اسی طرح بھولی تارا بچپن کے کھیلوں میں مصروف رہتی - چوڑی والے کے دل میں بھی گدگدی سی پیدا ہونے لگی وہ سوچا کیا میں تارا کو ہی چوڑی پہنانے کے لئے چوڑی والا بنا ہوں۔

تارا بڑی ہو رہی تھی۔ لیکن چوڑی والا اُسے ننھی منی سی بچی ہی سمجھتا تھا اُس دن جب تارا کی ماں نے آڑ میں کھڑے ہو کر کہا "چوڑی والے ! ایک مہینے میں تارا کی شادی ہو گی" - تب وہ ہنس پڑا۔ اُسے سخت تعجب تھا۔ "ارے ذرا سی بچی کی شادی ؟ !" "ہمارے تمہارے لئے وہ بچی ہے مگر دنیا کی آنکھوں میں وہ شادی کے قابل ہو چکی ہے" مہینے بھر تک دُور دُور سے تلاش کر کے چوڑی والے نے تارا کو چوڑیاں پہنائیں، آخری دن ماں نے کہا کہ اب تارا بیاہ کی چوڑیاں پہنے گی۔ اس دن چوڑی والا چوڑی بیچنے کہیں بھی نہ گیا، وہ تو تارا کو پہنانے کے بعد ہی کسی اور کو چوڑیاں پہناتا تھا۔

ساون میں تارا نے ہری ساری باندھی، ماں نے پھولوں سے سجا دیا اور چوڑی والے نے آکر ہرن بری چوڑیاں پہنائیں، تارا کے پاس چوڑیوں کا ڈھیر لگ گیا تھا، صندوق بھر گئے تھے، لوگ پوچھتے "یہ چوڑیاں کہاں سے منگائیں" سہیلیاں رشک کرتیں۔ تارا ناز کے ساتھ بھرے ہاتھ کی چوڑیاں جھنجھنا کر کہتی "بڑی دُور دُور کی ہیں" - اسی طرح کئی سال گزر گئے۔

چوڑی والے نے سُنا تارا سسرال سے آگئی ہے۔ اُس نے رنگ برنگی چوڑیاں چھانٹیں اور تارا کے گھر کی طرف چلا - دہلیز پر بلی نے راستہ کاٹ دیا تھوڑی دیر رُک کر، پھر آگے بڑھا۔ چند ہی قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک بڑھیا نے چھینک دیا - چوڑی والے کو غصہ آگیا۔ کمبخت کو اسی وقت چھینکنا بھی تھا اُس نے

چوڑیوں کا ڈبہ اس بغل سے نکال کر دوسری بغل میں دبا لیا اور گلی کی طرف تیزی سے لپکا۔ کچھ دیویاں گنگا جی سے نہا کر آ رہی تھیں اُنھوں نے چوڑی والے کو پہچان کر کہا۔ "چوڑی والے یہ چوڑیاں کسے پہنانے جا رہے ہو تم جسے چوڑیاں پہناتے تھے، اب وہ چوڑیاں کبھی نہ پہنے گی" عورتیں آگے بڑھ گئیں۔

کیا - - - کیا - - - کیا کہا ؟ چوڑی والا جلدی سے تارا کے آنگن میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ تارا آگے بڑھی "چوڑی والے" چوڑی والے نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا ــــ سفید ساری پہنے، بغیر چوڑیوں کا لمبا ہاتھ پھیلائے تارا کھڑی ہے، بال کھلے ہوئے تھے اور مانگ میں سیندور کا دیا بجھ چکا تھا۔

چوڑی والا ڈر سا گیا اُس کا گلا سوکھنے لگا ــــ ودھوا ! تارا ودھوا آنکھوں سے آنسو نکل کر اُس کے جھرّی دار چہرے پر رُک گئے۔ تارا نے چوڑیوں کا بکس بڑھا کر کہا "لو چوڑی والے ! یہ چوڑیاں بیچ دینا - یہ سب میرے لئے بیکار ہیں،" چوڑی والے کو وہ اُٹھا ہوا لبِ سونا سا خالی ہاتھ بہت بھدّا معلوم ہوا دونوں کے ہاتھ میں چوڑیوں کے ڈبے تھے، ایک لوٹانے کے لئے آ رہی تھی اور دوسرا دینے کو جا رہا تھا دونوں آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے، دونوں کے ہاتھ کانپے اور کھلے ہوئے بکس گر پڑے چوڑیاں جھنجھنا کر بکھر گئیں کچھ ٹوٹیں کچھ ویسے ہی پڑی رہیں۔

اس کے بعد بوڑھے چوڑی والے کو کبھی کسی نے چوڑیاں پہناتے نہیں دیکھا۔ شاید تارا کے سہاگ کے ساتھ ہی اُس کا پیشہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

مالتی دیوی

نصیب کا بیوپار

ایک کہانی

سیّد فرید جعفری

برجیس، نئے زمانے کی لڑکی، ترقی یافتہ بیوی، ہر صبح بلا ناغہ تفریح کو جاتی، سمندر کی ہوا کے نمکین جھونکوں سے منہ دھوتی، فرحت حاصل کرتی اور گھر واپس آجاتی، مگر گھر پہونچنے سے پہلے وہ کسی نہ کسی بھکاری پر چند پیسے ضرور نچھاور کرتی، اس میں کبھی فرق نہیں پڑا، یہ بھی اُس کی عادت سی ہوگئی تھی، وہ کہا کرتی کہ صبح کے وقت اگر چند پیسے کسی لاچار کو دیدیئے جائیں اور وہ اُس کو اپنے مرجھائے ہوئے ہونٹوں کا ذرا سا رقص دکھادے سارے دن نصیب مسکرایا کرے گا۔ برجیس کا شوہر اکثر اُسے جھڑکتا اور کہتا کہ اس طرح پیسے دینے سے بھلا نہیں بلکہ بُرا ہوتا ہے اس لئے کہ صبح صبح بھکاری کو پیسے بغیر اُنگلی ہلائے مل جائیں گے، وہ کام کاج کے لئے کیوں دوڑ دھوپ کرے گا۔ برجیس جواب میں کہتی کہ راتوں کو سڑکوں کے کنارے سونے والی مخلوق جس کا گھر نہ بار، بھلا اتنی سکت ہی کہاں رکھتی ہے کہ کام کاج کے لئے دوڑے دھوپے پھر کیا کام کاج اس زمانے میں دوڑنے دھوپنے سے مل جاتا ہے۔ خود اُس کے شوہر نے کام چاہنے والوں کو کتنی بار ٹکا سا جواب دیا تھا کہ کام کیا کھونٹی میں بندھا ہے۔ برجیس اپنے شوہر کو سمجھاتی کہ ملک میں کام کا کال ہے۔ کام ڈھونڈے سے نہیں ملتا، اور خدا کی مخلوق ایڑیاں رگڑ رگڑ جان دے رہی ہے۔ دم توڑ رہی ہے، سڑکوں پر اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مُرجھائے بچے کھلائی ہوئی ماؤں کی گود میں بلبلا رہے ہیں۔ دودھ، ذرا سے دودھ کے لئے ہڑکا رہے ہیں، ماں کسی آتے جاتے سیٹھ، بابو، میاں کی طرف حسرت کی نظر پھینکتی ہے التجا کرتی ہے خدا کا واسطہ دیتی ہے۔ اُن کو ان کے اپنے بچوں کی یاد دلاتی ہے، دودھ ذرا سے دودھ کے لئے پیسے مانگتی ہے۔ مگر راہ چلتے اُسے ٹھکرا دیتے ہیں وہ اُن کے قدموں پر سر رکھتی ہے، ساری انسانیت لرز جائے، پر راہ چلتے سیٹھ صاحب، بابوجی اور میاں ماتا کو کچلتے ہوئے کھتی ڈکاریں نکالتے، شوخ ٹائی پر ہاتھ پھیرتے یا ڈاڑھی کھجلاتے گزر جاتے ہیں، ہر شخص جس کے سامنے وہ ہاتھ پھیلاتی ہے یہی کہتا ہے کہ جوان ہے، ہاتھ پیر کی مضبوط ہے، کام کر سکتی ہے، پھر کام کیوں نہیں کرتی، وہ اکثر اپنا جواب دہراتی تو بابو تمھیں کام دیدو۔ میں کام کروں گی، میرے بچے بھوکے ہیں، سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں، میں اِن کی خاطر سب کچھ کروں گی، اس پر بابوجی گھبرا جاتے ہیں اور کترا کر نکل بھاگنا چاہتے ہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ "پھر تو نے بچے پیدا ہی کیوں کئے۔ تو آوارہ ہے اور اپنے کئے کی سزا بھگت رہی ہے بھلا ان پیٹ بھرے، محلوں کے رہنے والوں کو کیا معلوم کہ بچے اگر آوارگی کی نشانی ہیں تو اس کی ذمہ داری بھی تلملاتی ہوئی انتڑیوں پر ہے۔ جب دولت اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتی تو بیچاری دُکھیا اپنے تن من پر کس طرح قابو حاصل کرے اور اگر وہ بچے آوارگی کی نشانی ہیں تو کوئی اُس بیوہ کے دل سے پوچھے۔ نہ معلوم کس بدنفس افسر نے اُس کے شوہر کو کچل کر دنیا سے ناپید کر دیا تھا یا کس موسم نے اُسے اپنی گرمی سردی یا سیلاب کا شکار کر دیا تھا بچوں کی پیدائش روکنے کے لئے بھی پیسے چاہئیں، غریبوں کے لئے نہ اسپتال ہیں نہ ایسے گھر جہاں انھیں یہ نئی باتیں، نئے زمانے کی ترقی یافتہ باتیں، بتائی جائیں۔

مگر برجیس کا شوہر کچھ نہ سنتا بس اُس کی ایک رٹ ہوتی جسے اُس نے طوطے کی طرح رٹ لیا تھا۔ سب جھوٹ۔ سب غلط۔ بہت کام ہے۔ کیا بمبئی میں کام کی کمی ہے؟ برجیس کچھ دیر بحث کرتی پھر یہ کہہ کر چُپ ہو جاتی کہ جب تک "ورک ہاؤس" کام گھر نہیں بنتے وہ اپنی عادت سے باز نہیں آئے گی۔ برجیس کا شوہر بیوی کی ترقی یافتہ باتوں کا اکثر مضحکہ اُڑاتا اور جب وہ کام گھر کا نام لیتی تو کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ بات آئی گئی ہوتی۔

ایک دن برجیس حسبِ معمول سیر کو نکلی۔ اس کو ایسا بھکاری نہ ملا جسکو وہ دوسرے پر ترجیح دے کر پیسے دیتی وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ ایک نوجوان نے اُسے روکا۔ نوجوان کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ برجیس انتظار کرنے لگی، کہ وہ کچھ کہے گا۔ مگر اُس کے ہونٹ کئی مرتبہ کھُلے اور بند ہو گئے۔ برجیس نے دیکھا کہ اُس کی پھٹی ہوئی مٹیالی گاندھی کیپ بوسیدہ سیاہ سرج کا کوٹ، قمیص کے کالر میں بٹنوں کے بجائے دھاگے، بے انتہا پہنی ہوئی دھوتی، گِھسا ہوا سفید کینوس کا جُوتا جس میں سے اُس کی اُنگلیاں نکلی پڑتی تھیں، اُس کا آپ اپنا اشتہار تھے۔ وہ سمجھ گئی۔ نوجوان پھولوں کا گلدستہ بیچنا چاہتا ہے مگر یہ اُس کا پیشہ نہیں ہے اُس کی پیلی پیلی پیشانی پر شرافت اور مٹی ہوئی شوکت لہریں مار رہی تھی۔ برجیس نے بات کرنے کے طور پر کہا۔

"تم پھول بیچتے ہو مگر تم مالی نہیں معلوم ہوتے اور میرے گھر میں تو خود ہی چمن ہے اور پھول ہیں"

"آپ کے چمن میں پھول ہیں، مگر میرے نصیب میں فاقہ ہے۔ خیر معاف کیجیے گا"

"نہیں۔ نہیں مایوس نہ ہو۔ تم نے یہ نہ بتایا کہ تم پھول کیوں بیچتے ہو؟"

"بائی جی! یہ کوئی کیسے بتا سکتا ہے کہ وہ فلاں کام کیوں کرتا ہے کرنا پڑتا ہے اس لئے کرتا ہوں"

"مگر بہت سارے کام ہیں، یہ تمھارا پیشہ نہیں۔ تم اس میں کیسے کامیاب ہو گئے؟ وہ کام کرو، جو تم جانتے ہو"

"تجربہ حاصل ہونے سے کام آیا کرتا ہے، یُوں میرے پیشے کو پوچھتی ہیں تو میرا پیشہ کتابیں پڑھنا، رٹنا اور امتحان دینا ہے۔ کالج باپ کی موت پر چھوڑا، نوکریاں تلاش کیں، ہر جگہ "نو ویکینسی"، "نو ویکینسی"۔ بیوہ ماں، شادی کی عمر کی بہنیں، دو برس کی بے روزگاری، گھریلو تجارت شروع کی، بہنیں چپ رہیں بناتیں، میں گھر گھر جا کر بیچتا۔ اس میں گالیاں سُنیں ٹھوکریں کھائیں، دھکے دے دے کر گھروں سے نکالا گیا۔ مگر کام چھوڑا اُس وقت جب نفع رنگ رنگیک کر بھی امیروں کے گھر سے نہ نکلا، دو روپیہ کی چیز کی قیمت سونے اور چاندی میں لپٹی ہوئی دیویوں نے بہرے شروع کی اور ۸ سے آگے بات نہ کی۔ انتہا پر بدمعاش، بے ایمان کہا گیا۔ آخر میں تنگ آ کر وہ کام چھوڑا۔ ماں اور بہنوں کے زیور بیچے اور ایک چھوٹی سی دکان لے کر بیٹھا مگر اس دوکان کو بھی بڑی دوکانوں نے صاف نگل لیا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ صبح اور شام کو پھول بیچتا ہوں، دن بھر کام کی تلاش میں گھومتا ہوں"

برجیس نے سوچا۔ بولی۔ "ٹیوشن کرو گے؟ میرا بھانجہ میرے ساتھ رہتا ہے، چوتھے درجہ میں پڑھتا ہے۔ تم اُسے پڑھا سکو گے؟

"میں نے ایف۔ اے تک پڑھا ہے۔ آپ سمجھ سکتی ہیں"

"میرے ساتھ چلو" اور برجیس اُسے گھر لے گئی۔

برجیس کا شوہر اُسی وقت اُٹھا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔ برجیس نے اُس سے ساری کہانی کہی، اور نوجوان سے بات کرنے کو کہا۔ برجیس کا شوہر ہنسا۔ اور اُس نے انکار کر دیا۔

"اب تمھارا دماغ چل نکلا ہے، راہ چلتوں کو پکڑ لاتی ہو، پھول بیچنے والا ٹیوشن کرے گا؟ ایف اے تک پڑھا ہے، نہ سرٹیفکیٹ نہ کوئی اور نشانی، بات کیا کروں، بی۔ اے۔ ایم۔ اے دس دس روپے میں ملتے ہیں جنھیں پڑھانے کا تجربہ بھی ہوتا ہے"

"مگر باتیں کرنے میں کیا ہرج ہے، شاید پڑھا سکے۔ بیوہ ماں، شادی کی عمر کی بہنیں، تمھیں ترس نہیں آتا؟"

"حد ہو گئی ہے، کوئی انتہا ہے، چور اُچکا ہو گا، بہانہ بنا کر گھروں میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ نہیں نہیں، اُس سے کہو کہ چلا جائے میں ایسے آدمیوں کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں"

"خیر جیسی تمھاری مرضی، مگر تمھیں مستقبل سے ڈرنا چاہیئے، کیا معلوم کل ہم کس رنگ میں ہوں، یہ کہتی ہوئی برجیس باہر نکلی اور جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اُس نے نوجوان سے معذرت کی "میرے شوہر تجربہ کار آدمی چاہتے ہیں۔ مگر لو میں تمھیں پانچ روپیہ دیتی ہوں، اس سے اپنے کاروبار کو بڑھاؤ کاش میں تمھیں کام دے سکتی۔ نوجوان نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا "بائی جی کام کہاں ہے۔ کام کوئی نہیں دیتا۔ خیرات اکثر دیتے ہیں، آپ یہ گلدستہ لے لیجیے، میں سمجھوں گا کہ بڑی قیمت پر بیچا ہے۔ برجیس نے گلدستہ لے لیا اور اُلٹے پاؤں واپس مڑی، اُس سے آنسو ضبط نہیں ہو رہے تھے۔

دن گزرے۔ تیز تیز۔ جلدی جلدی، ہنسی خوشی کے دن اسی طرح

گزر جاتے ہیں۔ برجیس اور اُس کے شوہر کے تعلقات بدستور رہے، اُکھڑے اُکھڑے۔ بکھرے بکھرے۔ شوہر دیر کو اُٹھتا، دس بجے کام پر جاتا۔ دن ڈھلتے واپس آجاتا۔ شام کو دوستوں کا قافلہ آتا۔ ہلکی پھلکی شام بھاری بھرکم تماشوں میں گزر جاتی، رات دیر کو شروع ہوتی اور دیر میں ختم ہوتی برجیس معمول کے مطابق صبح سیر کو جاتی، واپس آتی تو شوہر کے ناشتہ اور کھانے کو دیکھتی، کپڑے سنبھالتی۔ شوہر کام پر چلا جاتا تو گھر کی صفائی کرتی کچھ سینا پرونا کرتی، کچھ دیر اخبار اور کتاب پڑھتی، شام ہو جاتی، شوہر کے دوستوں کی مہمان داری کرتی، چڑھتی رات تک اونگھتی رہتی، سب کے ساتھ جاگتی، رفاقت کے گُن دکھاتی پھر مطمئن رفیقِ حیات کے ساتھ میٹھی نیند سو جاتی۔

لیکن اُس نے خود ہی کہا تھا کہ مستقبل سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے نہ معلوم کل ہم کس رنگ میں ہوں، اُس نے سچ کہا تھا۔ نئے زمانے کی گاڑی کو انجن گھسیٹتا ہے پھر بھی وہ ٹھوکر کھا جاتی ہے، وقت کا پہیہ چلتے چلتے رک جاتا ہے، کبھی کوئی پُرزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کبھی زنگ اُسے حرکت سے روکتا ہے ایک دن برجیس کا شوہر دیر تک گھر نہ لوٹا۔ لمحات گزرے۔ منٹوں کا قافلہ چلا، گھنٹے بجے، سورج کی سواری کا دھندلا نظارہ بھی ختم ہوا سیاہی پھیلی اور رات نے ڈیرا ڈالا۔ برجیس اب پریشان ہونے لگی۔ اُس کے شوہر نے کبھی اس قدر دیر نہیں کی تھی۔ آخر بڑی دیر کے بعد اُس کا شوہر لڑکھڑاتا ہوا، نشہ میں چور آیا۔ برجیس کو دھکا سا لگا۔ اُس کا شوہر اور نشے میں، وہ بھی بے ہوش، مگر اُس نے ایسے موقع پر جھگڑنا مناسب نہ سمجھا، پیار سے پوچھا۔ کہاں رہ گئے تھے پیارے! تمھارے انتظار میں میری بُری کیفیت تھی؟"

اُس کے شوہر نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہوں۔"

"کیوں؟ سبب؟"

"کمپنی کو سیٹھ کرم چند نے خرید لیا ہے وہ منیجری کے عہدہ پر کسی اپنے آدمی کو رکھنا چاہتا ہے۔"

"تو پھر علیحدہ کر دیا"۔ حسین تارے اُس کے گلابی رخساروں پر ٹوٹے۔ آنکھوں سے ایک موٹا قطرہ نکلا اور اُس کے شوہر کے کھلے ہوئے منھ میں جا کر ٹوٹ گیا۔ وہ اُسے بلا ارادے پی گیا، لیکن آنسو کا قطرہ مرچ کے عرق کی بوند تھی، وہ بے چین ہو گیا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا مگر برجیس دلاسے کے طور پر پہلے ہی بول پڑی

"تو گھبرانے کی کیا بات ہے، دوسری ملازمت مل جائے گی، تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ بمبئی میں بہت کام ہے۔ کام کی کمی نہیں ہے، کام کرنے والوں کی کمی ہے"

برجیس کے شوہر نے رُک رُک کر جیسے وہ کچھ یاد کر رہا ہو، سوچ رہا ہو کہا

"مجھے جواب صبح ہی ملا تھا۔ سارا دن میں نے کام کی تلاش میں گزارا۔ مگر ہر جگہ (No Vacancy) نو ویکینسی۔ نو ویکینسی۔ تم شاید ....

"نہیں نہیں، پچھلی باتوں کو یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمت نہ ہارو، آج نہیں تو کل کام مل جائے گا" برجیس نے شوہر کو پرانی یاد کی جلن میں نہ مبتلا ہونے دیا۔ وہ برابر دلاسا دیتی رہی۔

"ہم فاقہ کرنے سے رہے تمھاری اس ڈھائی سال کی ملازمت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے کچھ پس انداز نہیں کیا ہے۔ ہمت سے کام لو، پیارے اگر کام جلدی نہ بھی ملا، میں کام کروں گی، آخر میرا پڑھنا لکھنا ایسے موقع پر کام نہ آئے گا تو کب آئیگا، میں ٹیوشن کروں گی۔ کہیں نہ کہیں مجھے کام ضرور مل جائے گا۔"

برجیس کا شوہر ایک لفظ نہ بولا۔ وہ اپنے فلسفی دماغ کو ٹٹول رہا تھا وہ اس میں اپنی بڑی بڑی باتیں تلاش کر رہا تھا جس میں اُس نے نو سو بھکاریوں اور بے روزگاروں کا مضحکہ اُڑایا تھا، رات اسی طرح گزر گئی۔

دن کو جاتے دیر نہیں لگتی، زمانے کو گزرتے وقت نہیں لگتا لیکن اگر دن لولے ہوں اور زمانہ لنگڑا، پھر ایک ایک منٹ پہاڑ ہو جاتا ہے۔ کسی زمانے کا بڑھتا ہوا سیلاب بے روزگاروں میں روز ہزاروں کے اضافے کرتا یہ لولے لنگڑے اپنے ڈھانچے کو اپاہج زمانے کے ساتھ گھسیٹتے رہتے۔ ایک قدم چلنا دوبھر ہوتا۔ ایک ایک منٹ پہاڑ معلوم ہوتا پھر بیچارے برجیس کے شوہر شمار گنتی؟

کامل دو سال گزر گئے اور اُسے نوکری نہیں ملی۔ ساری جمع پونجی خرچ ہو گئی۔ تمام اثاثہ بک گیا۔ برجیس نے ملازمت کر لی، مگر اُس سے اتنے پیسے نہ آتے کہ سکھ سے گزر ہو سکتی، پھر مرے پر سو دُرے۔ دو سال میں دو بچے پیسوں کی کمی کے باعث جذبات پر قابو پانے کے لیے سائنس سے فائدہ نہ اٹھایا

جاسکا اور جذبات کا انسان سے چولی دامن کا ساتھ ہے نہ کبھی ختم ہیں اور نہ تھینگے۔ برجیس کا شوہر مایوسیوں کی چوٹ اور دوڑ دھوپ، گرمی سردی سے روگی ہو کر رہ گیا۔ اس کی بیماری دن بہ دن بڑھنے لگی۔ اُسے شراب کی مستقل عادت ہو گئی۔ بغیر شراب کے وہ گھر میں شیطان بنا رہتا اور شراب پی لیتا تو جان کے لالے پڑ جاتے، دماغ کا توازن کھو دیتا۔ برجیس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے۔ نوکر الگ کئے گئے، مکان تبدیل ہوا، پھر بھی گزر نہ ہو سکی۔ عزیزوں اور دوستوں نے ہمیشہ ٹکا سا جواب دیا۔

ایک دن صبح کے وقت برجیس حسب معمول سیر کی تیاریاں کرنے لگی اُس کے معمول میں، اب بھی فرق نہ آیا تھا۔ اُس نے ساری رات آنکھوں آنکھوں میں کاٹی، کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اُس نے بکس کھولا، گلاب کی چند سوکھی ہوئی پتیاں، ریزہ ریزہ ہو کر اُڑ گئیں، بھولی ہوئی کہانی یاد آگئی، وہ روز اُن پتیوں کو دیکھتی اور نظر انداز کر دیتی۔ مگر آج اُس نے اپنی زندگی کی اس پارینہ کہانی کی اچھی طرح یاد کی جس نے اُس کے مستقبل کی موجودہ صورت کی بنیاد ڈالی تھی، تھوڑی دیر تک وہ سر پکڑے بیٹھی رہی، پھر اٹھی کپڑے تبدیل کئے اور مکان سے نکلی۔ اُسے آج پھر ایک نوجوان ملا، یہ بھی پھولوں کا گلدستہ لئے ہاتھا۔ برجیس نے حسرت سے اپنے بیگ کی طرف دیکھا۔ پانچ آنے پیسے کُل جمع اور مہینے میں ابھی پورے پانچ دن باقی۔ برجیس نے اس نوجوان کو پہلے کی نسبت زیادہ خوش، زیادہ مطمئن پایا، اُس نے نیچی نگاہیں کر کے جیسے وہ حالت کو پوچھنا چاہتی ہو کہا:-

"بھائی مجھے نہیں چاہئے، میرے یہاں خود ہی پھول ہیں"

نوجوان نے پوری خود اعتمادی اور کاروباری انداز سے جواب دیا، کوئی بات نہیں باجی جی، مگر ہماری دوکان میں پھولوں کے بیج بھی بکتے ہیں، ہماری دوکان نئی ہے، اور ہم نے دنیا کے بہترین پھولوں کے بیج منگائے ہیں کسی دن ....

برجیس پوری بات سنے بغیر گزر جانا چاہتی تھی، نوجوان نے اسے محسوس کیا اور بات کاٹ کر ایک اشتہار اُسے تھما دیا۔

"پھولوں کی نئی دوکان، رنگ برنگ کے پھول، ہر جگہ کے پھول اور ہر قسم کے پھول"

چنمبئے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کی انجمن نے یہ کاروبار شروع کیا ہے ... وغیرہ وغیرہ۔ برجیس کی سمجھ میں آیا۔ دھند اُس کی آنکھوں سے چھٹا، اُس نے نوجوان کو آواز دی اور ۲ روپے کر پھولوں کا گلدستہ لے لیا۔

اب اُس میں نئی شکتی آگئی تھی۔ اُس کے فاقہ زدہ مرجھائے ہوئے ڈھانچے میں نئی زندگی دوڑ گئی تھی، اُس نے اشتہار پڑھا۔ دوکان کا پتہ معلوم کیا اور بس کی سواری پر ۲ روپے اور خرچ کر کے چل دی۔ دوکان کے پاس پہنچ کر وہ ذرا گھبرائی، زمانے نے کروٹ لی تھی۔ پہاڑ زمین پر آ رہا تھا۔ زمین سکڑ کر پہاڑ بن گئی تھی۔ مگر اُس نے ہمت کی اور دوکان میں داخل ہوئی، وہی نوجوان جسے اُس نے پانچ روپے کے نوٹ دئے تھے، پھولوں کی ایک انجمن میں بیٹھا ہوا تھا، دوکان عورت مرد سے بھری ہوئی تھی۔ برجیس نے ٹھنڈی سانس لی، اُس کی ٹھنڈی سانس نوجوان کے لئے ٹھنڈی بجلی تھی، اُس نے مڑ کر دیکھا

اوہ باجی جی۔ باجی جی۔ آپ۔ آپ۔ میرا نصیب۔ یہ بیوپار ....

برجیس نے اُسے نہ بولنے دیا۔ بھائی تم گھبراؤ نہیں، اب میں بڑے دل والی نہیں ہوں، میرا سر نیچا ہو چکا ہے، یہ اپنے اپنے نصیب کا بیوپار ہے میرا شوہر ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا، دو برس ہو گئے، تم نے اس دو برس میں اپنے نصیب کا بیوپار بڑھایا اور میرے شوہر نے اپنے نصیب کی ٹھوکریں کھائیں اور آج وہ دم توڑ رہا ہے، میں تمھارے پاس ......

نوجوان نے بات کاٹتے ہوئے کہا "ایسا نہ کہئے میں سمجھ گیا۔ سب سمجھ گیا، میں آپ کا احسان بھول نہیں سکتا۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں"

برجیس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ باہر نکلی، نوجوان اُس کے پیچھے تھا، اسی وقت ایک چھوٹا سا بچہ اُس کے پیروں سے لپٹ گیا "مائی بھوکا ہوں۔ بھوکا ہوں مائی" برجیس نے اب آشا کا ٹمٹماتا ہوا دیا دیکھ لیا تھا، آخری اکنی اُسے دیدی نوجوان بولا۔ نصیب کا بیوپار بہن!"

"ہاں نصیب کا بیوپار بھائی" برجیس بولی۔ اور دونوں برجیس کے گھر چل دیئے یہ نصیب کی کایا پلٹ تھی مستقبل کا انجام تھا کل کے خواب کی تعبیر تھی۔

بھکاری

(از محمد جمیل احمد بی-اے بریلوی)

ایک خوددار اور غیور بھکاری تھا، دینے والوں سے زیادہ اُسے قبول کرنے میں تکلیف ہوتی تھی، وہ اپنا کشکولِ گدائی نگوں کئے بڑھا چلا جا رہا تھا، لوگ پیسہ، روٹی، کپڑا لے کر بڑھے مگر وہ حقارت سے اِن پر مُسکراتا ہُوا اک ادائے بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ لوگ اور اور چیزیں لے کر آئے مگر اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی، جیسے کوئی شکار اپنے پیچھے شکاری کو آتا دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔

دنیا نے حیران ہو کر کہا،

یہ بھکاری آخر کیا مانگتا ہے؟ یہ کیا چاہتا ہے؟

بھکاری جا چکا تھا،

بھکاری خلوص کی بھیک مانگنے نکلا تھا، مگر اِن میں سے کسی کے پاس بھی یہ دولت نہ تھی،

بھکاری ہر جگہ گھوم کر ناکام واپس آ چکا تھا، ایک آستان بھی ایسا نہ ملا جہاں اُس کو بھیک مل سکتی۔ کشکول گدائی ویسے کا ویسا ہی خالی تھا، بھکاری کی آنکھوں میں حسرتیں ماتم کر رہی تھیں۔ خود بھکاری کے پاس خلوص کی ایک بڑی دولت تھی۔ مگر یہ اس کے لئے کافی نہ تھا، معلوم ہوتا تھا یہ دولت کسی اور کی امانت ہو۔ اس کی تمنا تھی کہ امانت والے کو اُس کی امانت سونپ دے اور اس سے خود اپنے لئے خلوص کی بھیک مانگے۔

بھکاری نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کے دروازوں پر دستک دی، وہ تبسم چہروں کے ساتھ آئے اور اُس کو لے گئے۔ بھکاری نے خوش ہو کر وہ دولت ان پر نچھاور کر دی اور مسرت سے بیخود ہو کر اپنے آپ کو مقبول کیا،

مگر کچھ ہی عرصہ میں اُس نے محسوس کیا کہ وہ ہنوز پہلے کی طرح بلکہ اب سے بھی زیادہ بھوکا ہے، وہ خلوص ڈھونڈتا رہا اور خلوص اُس کو نہ ملا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی پیشکش بھی بیکار گئی، وہ ٹھکرا دی گئی، اُس کے خلوص کا جواب فریب اور دنیاداری کی مکروہ نمائش سے دیا گیا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا، اُس نے کشکولِ گدائی اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اُس کے آنسو ٹپکے اور اس کا خالی دامن اُن سے تر ہو گیا،

اُس کے عزیزوں نے کہا،

اس کو کیا ہوا ہے،

اس کے دوستوں نے کہا،

یہ شاید پاگل ہو گیا ہے، ہم نے تو وہی کیا جو دنیا میں ہوتا ہے،

وہ اِن سب سے کنارہ کش ہو گیا، وہ اِن سب کو چھوڑ کر نکل آیا —— اور اپنی قسمت کا نوحہ کرتا رہا۔ خلوص کی جو دولت بھکاری کے پاس تھی وہ اسی طرح [illegible] بار لُٹتی رہی، مگر پھر بھی کم نہ ہوئی، وہ ہنوز ایک امانت تھی!

دُنیا کی دولت اور خلوص میں اتنا ہی فرق ہے:

دُنیا کی دولت اپنے لئے ہوتی ہے اور خلوص کی دولت دوسروں کے لئے،

دُنیا کی دولت بہ مشکل ہاتھ آتی ہے اور بہ آسانی برباد ہو جاتی ہے۔ خلوص کی دولت سعی و کوشش کی دسترس سے باہر، قدرت کا ایک عطیہ ہے جو بار بار لُٹنے کے بعد بھی اتنا ہی رہتا ہے:

بھکاری اِس عطیۂ قدرت کا امین تھا، مالک نہ تھا!

عرصہ گذر گیا اور بھکاری ٹھوکریں کھاتا رہا۔ آخر قدرت کو اس پر ترس آیا، [illegible] راستہ میں اتفاقاً اُس کی نظریں ایک ہستی پر پڑ گئیں [illegible] کو خیال ہوا کہ شاید یہ امانت دوسرے کو سپرد کر دینے کا اب وقت آ گیا ہے۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی چادر سے وہ دولت کھول کر اس کے قدموں میں

ڈال دی اس نے اپنا کشکول اُٹھانے کے لئے ایک لمحہ کو سر جھکایا —
مگر وہ ہستی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ کچھ نہ ملنے پر بھی بھکاری خوش
تھا اُس نے وہ آنکھیں دیکھی تھیں اور ان میں خلوص کا نور دیکھا تھا ایک
بجلی کی سی رو بھکاری کے دل میں پیدا ہوئی، یہ اُمید کی جھلک تھی
آخر بھکاری نے آستانہ پالیا تھا۔

بھکاری اب دونوں وقت آستانے پر جانے لگا۔ یہ تو نہیں کہا جا
سکتا کہ اُس کو اس در سے خلوص کی بھیک ملتی بھی تھی یا نہیں، مگر ہاں یہ ضرور
تھا کہ اُس کی پیشانی ٹھکرائی نہیں گئی۔ چونکہ صاحبِ خانہ صاحب خلوص بھی تھا
بھکاری کے لئے اتنا ہی بہت تھا، اُس نے سب عزیزوں و بیگانوں، سب
دوستوں اور آشناؤں کو کھو کر یہ آستانہ پایا تھا۔
دنیا والوں نے اِس بھکاری اور آستانے کے بیچ میں آجانا چاہا
اُنھوں نے کہا،
یہ یہاں کیوں آتا ہے۔
وہ لوگ جو خلوص سے کوسوں دور تھے، ایک بندہ خلوص پر معترض
تھے۔ دنیا میں یہ ہوتا آیا ہے، مگر شاید وہ بھول گئے کہ اگر بھکاری کسی اور
آستانے پر جاتا یا کوئی اور بھکاری اِس آستانے پر آتا تب بھی وہ بغیر ایک
حرف کی تبدیلی کے یہی کہتے،
یہ یہاں کیوں آتا ہے؟
اِس لئے بھکاری نے اِن کے کہنے کا کچھ خیال نہیں کیا مگر ہاں
اِس کی خودداری نے اِس آستانے کو ضرور غور سے دیکھا۔ دروازہ اس کے
لئے پہلے ہی کی طرح کھلا ہوا تھا وہ حسبِ معمول دونوں وقت جاتا رہا — اور
اِس طرح اس کے دن گزرتے رہے۔

عرصے تک وہ آستانہ خالی رہا۔ اور صاحبِ خانہ بیرونِ خانہ،

بھکاری حسرت بھری نگاہوں سے اُس کو دیکھتا اور خاموش ہو جاتا۔
اب بھکاری کے دن نہیں کٹتے تھے۔ وہ سوچتا تھا نہ معلوم اب یہ آستانہ
کب آباد ہو، صاحب خانہ کب واپس آئے، وہ خوابوں میں دیکھتا کہ پہلے
کی طرح اب بھی وہ دونوں وقت اِس آستانے پر جا رہا ہے۔ لیکن اس کو
خوابوں کی ضرورت نہیں؛ خوابوں کی تعبیر کی تلاش تھی!

آخر صاحب خانہ آیا، بھکاری خوشی سے پھولا نہیں سمایا، بھکاری
شوق سے اس دروازے کی طرف بڑھا، مسرت نے اُس کی رفتار میں ایک
لغزش آمیز تیزی پیدا کر دی تھی، وہ جانتا تھا کہ دروازہ اُس کے
لئے کھلا ہوا ہے۔ وہ شوق سے بیخود، مسرت سے مسرور بڑھا چلا گیا مگر
یکایک — ایک دھماکا ہوا، دروازہ اس کے لئے بند تھا اور اس سے
ٹکرا کر بھکاری نیم جاں ہو کر گر چکا تھا، کشکولِ گدائی ٹوٹ چکا تھا، بھکاری
کی آنکھوں سے خون بہ رہا تھا۔ ایک جاں گُسل کرب میں اس کی زبان سے
ایک چیخ نکلی، دروازے میں بھری ہوئی وہی آنکھیں جو بھکاری نے
کبھی رہگذر پر اور پھر اکثر اِسی آستان پر دیکھی تھیں پھر دکھائی دیں،
مگر آج ان میں خلوص کا نور نہیں، بے تعلقی کی وحشت تھی۔ اِس کے
بعد دروازہ پھر بند ہو گیا!
بھکاری نے اپنے قلب کے ٹکڑے اس آستان پر نچھاور
کر دیئے، اور ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔



ایشیا

دوسرا باب

افسانے و ڈرامے

ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء

صنفِ نازک کا ایک یادگار مشاعرہ

مرتبہ: ۔ حمیدہ سلطان، احمد دہلوی

(گزشتہ سے پیوستہ)

حمیدہ سلطان

محبت بھی ہی جرأت آزما کیا!؟ — غمِ دل ان سے کہہ دوں برملا کیا؟
بقا کیا ہے محبت میں فنا کیا — ترے کشتوں سے اس کا پوچھنا کیا
اشاروں میں یہ کیوں عہدِ محبت؟ — نگاہوں سے یہ پیمانِ وفا کیا
تصور میں یہ مبہم سی محبت! — ہے یہ بھی کوئی اندازِ جفا کیا
تمہیں دیکھیں گے چشمِ روح سے ہم — ان آنکھوں سے تمہارا دیکھنا کیا
سب اسکی راہ تکتے ہیں چمن میں — شمیمِ لالہ و گل کیا، صبا کیا
جنونِ بندگی کا عکس ہیں سب — خودی کیا، بیخودی کیا اور خدا کیا
شکستِ آرزو ہے اور مسلسل — ہماری زندگی کا پوچھنا کیا

غمِ آغازِ الفت ہی مرن ہے
حمیدہ شوقِ مرگِ انتہا کیا

بدر جہاں قریشی بدر

فنا کیا۔ زیست کیا۔ رازِ بقا کیا؟ — جب اُس کے ہیں۔ پھر اس کا پوچھنا کیا؟
نہیں منت کشِ سحرِ مسیحا — دیا ہے اُس نے دردِ لادوا کیا!
ہوئی مدہوش اک ساغر میں محفل — یہ مے شیشے میں تھی۔ نورِ خدا کیا!

نہیں دُنیا میں کوئی محرمِ راز — سُناؤں حالِ دل اپنا بھلا کیا!
سمجھ لو دولتِ کونین پا لی — مِلا ہے یہ دلِ درد آشنا کیا
نگاہیں لڑ رہی ہیں رازِ دل فاش — ترے خاموش رہنے سے ہوا کیا
فنا میں ہے بقا کا رازِ پنہاں — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
وفا ہی اُٹھ گئی دُنیا سے جب بدرؔ
بھلا اپنے اور پرائے کا گلہ کیا!

آمنہ عفت

صلہ پائے گی آہِ نارسا کیا — اٹھے گا پردۂ عرشِ علا کیا
میں ہر ذرّہ میں تجھ کو پا رہا ہوں — مجھے دیر و حرم سے واسطہ کیا؟
جو غنچے سے جدا جو گل انوکھا — یہ ہے نیرنگیوں کی انتہا کیا
جھلک اُن کی کہیں دیکھی تھی دل نے — اسی دن سے نہ جانے ہو گیا کیا
جبل اور دشت اک جلوہ نے پھونکے — کرے چشمِ طلب پھر حوصلہ کیا؟
مرے اعمال نے کشتی ڈبو دی — شکایت ہائے دستِ ناخدا کیا؟
ہر اک آنسو ہے روحِ عشق عفتؔ
دُر و گوہر سے اس کو واسطہ کیا

بلقیس جمال

اُسے پاتی بھلا عقلِ رسا کیا — ہماری فہم و ادراک و ذکا کیا؟
گریباں چاک اور پلکوں پہ آنسو — سحر ہوتے ہی پھولوں کو ہوا کیا؟
معاذ اللہ یہ دزدیدہ نظریں!؟ — نظر کے سامنے دل کی خطا کیا
یہاں تو نذر کر دی جان سی شے — وہاں سے دیکھئے اب ہو عطا کیا
بجھا جاتا ہے میرے دل کی صورت — چراغِ شامِ غم تجھکو ہوا کیا
نہیں ہے جو اُسی کو ڈھونڈتی ہو
جمالہ اس جنوں سے فائدہ کیا؟

رابعہ پنہاں

مری مجبوریوں کی ہے خطا کیا — نباہا تم نے بھی عہدِ وفا کیا
نیاز و ناز نامقبول دونوں — نہ سمجھی میں کہ ہے تیری رضا کیا

ایشیا دسمبر ۱۹۴۲ء

مری جیب میں ہیں سو رازِ تمنا — کروں تمہیدِ شرحِ مدعا کیا
جبینِ حسن پر سُرخی سی دوڑی — نگاہِ آرزو نے کہہ دیا کیا
نہ جانے کیا سمجھ کر ہنس پڑے ہیں — یہ ہے تمہیدِ ذوقِ اعتنا کیا
ہوتا بھی بقدرِ یک نفس ہے — ہماری ابتدا کیا ۔ انتہا کیا
شرارِ زیست ہے جہدِ عمل میں — سبق دیتا ہے دورِ آسیا کیا
ہے لرزاں صبحدم بابِ اجابت — اُٹھایا دل نے پھر دستِ دعا کیا
جفا و ناز کی خوگر ہوں پنہاں
خدا معلوم ہے رسمِ وفا کیا

نظم

"اُردو مری زباں ہے"

ہاں باغ پُر خزاں ہے — ہاں دل میں غم نہاں ہے
ہاں ہر طرف زیاں ہے — امید ابھی جواں ہے
اُردو مری زباں ہے

بدلے گا پھر زمانہ — کہدینگے پھر فسانہ
گونجے گا پھر ترانہ — اُردو ابھی جواں ہے
اُردو مری زباں ہے

آئے گی پھر مسرت — جائے گی پھر مصیبت
چھائے گی پھر محبت — ہر ذرہ شادماں ہے
اُردو مری زباں ہے

اب ہے ہراس تو کیا — ہے دل کو یاس تو کیا
میں ہوں اُداس تو کیا — موسم تو کامراں ہے
اُردو مری زباں ہے

ہمت سے کام لوں گی — اُردو کا نام لوں گی
گرتوں کو تھام لوں گی — جرأت ابھی جواں ہے
اُردو مری زباں ہے

بدلیں گی پھر ہوائیں — پلٹیں گی پھر فضائیں
برسیں گی پھر گھٹائیں — اللہ مہرباں ہے

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء

اُردو مری زباں ہے

دل شاد ہے اثر کا — روشن ہے مُنہ سحر کا

جائے گا غم قمر کا — میرا بیاں۔ بیاں ہے

اُردو مری زباں ہے

قمر سلطان بیگم دہلوی

اُردو زبان

دلربائے ہند اے اُردو زباں — نغمۂ شعر میں ہوا رطب اللساں

یادگارِ سطوتِ اسلامیاں — نورِ چشم مادرِ ہندوستاں

بادۂ مے خانۂ جنت نشاں — بادۂ رنگین جانِ مے کشاں

حاصلِ شیریں کلامیٔ زباں — مایۂ صد نازشِ اہلِ جہاں

تجھ سے ہے آباد اپنا بوستاں

تجھ میں دلآویزیٔ گلزار ہے — تجھ میں رنگینیٔ لالہ زار ہے

ہر گل جو عنبر بار ہے — اس لئے گلشن ترا تاتار ہے

تیرا ہر غنچہ دہانِ یار ہے — تیرا جو گل ہے گُل بے خار ہے

تیرا دامن بحرِ گوہر بار ہے — تیرا سینہ معدنِ اسرار ہے

قبلۂ ہر شاعر و نثار ہے

ہے سراپا کیف تیرا ہر سخن — باعثِ وارفتگیٔ انجمن

نازشِ نغمہ سرایانِ چمن — یعنی فخرِ نکتہ سنجانِ وطن

روح پرور قاطعِ رنج و محن — شاہدِ اربابِ علم و اہلِ فن

تیرا ہر نکتہ عروسِ سیم تن — ماہ وش، حجلہ نشیں غنچہ دہن

اور تو اُس کا مناسب پیرہن

روشن آرا دہلوی

چشمہ

آکاش کے نیلے دامن کے — تاریک و منوّر سایوں میں

سرسبز زمیں کے سینے پر — قدرت کے حسیں کہساروں میں

پھولوں کی رنگین بستی ہے — کھیتوں کے حسین میدانوں میں

فطرت کے حسین ایوانوں میں
میں چھپکے چھپکے بہتا ہوں

کہسار کے سنگین سینے کا — بے چین سا رازِ سربستہ
رخسار پہ کوہی میدان کے — اک اشک ہوں چشمِ فطرت کا
قدرت کے دوش پہ گیسو ہوں — بکھرا سا اور بکھرایا سا

فطرت کے حسین ایوانوں میں
میں چھپکے چھپکے بہتا ہوں

کل دُنیا سپنوں میں گم ہے — اور سانس کی بھی آواز نہیں
سوتے ہیں نواسنجانِ چمن — مصروفیتِ پرواز نہیں
کچھ محفل سونی سونی ہے — وہ نغمہ نہیں، وہ ساز نہیں

میں چپکے چپکے بہتا ہوں
تاروں کی چپ چپ چھاؤں میں

اس وقت فضا کی مدہوشی — پُرکیف ہوا کے جھونکوں سے
مہتاب کی زرّیں کشتی کو — تاروں کی چمکتی آنکھوں سے
پوشیدہ زمیں پر لائی ہے — کہنے کو سنہری کرنوں سے

ہر ذرّہ رشک سے تکتا ہے
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

عائشہ حسین ثریا کاکوروی

خزاں (کشمیر میں)

ہرطرف پیلے پڑے ہیں لالہ زار — شعلۂ جوالا ہے ہر اک چنار
یہ خزاں ہے یا کہ تکفینِ بہار؟

پتّوں کے آنچل پھنسے کانٹوں میں ہیں — اور چمن کا پیرہن ہے تارتار
کس قدر ظالم ہیں یہ لیل ونہار؟

بوڑھے بوڑھے پیڑ دولھا کی طرح — پہنے بیٹھے ہیں قبائے زرنگار
ہائے پیری میں جوانی کی بہار؟

سرفروشی کا یہ عالم باغ میں — ایک جھونکا لاکھ پتّے گُل ہزار
کر رہے ہیں اپنا اپنا سر نثار

برگِ لرزاں ہیں درختوں پہ کہ گل — موت کی آغوش میں ہیں بے قرار

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء

اوڑھ کر پیلا کفن ہے سبزہ زار
مردہ پھولوں سے چمن دامن بھرے جیسے ماں کی گود میں بیٹا مرے
کیوں نہ ہو بجلی فلک پر بے قرار
ہے سفیدہ دور ہی سمٹا ہوا زرد ہے .... ہیں وہ بے قرار
بزمِ یاراں پہ ہے ماتم کا مدار
آسماں پر ہیں صدائیں بے قرار اور زمیں پر خامشی ہے اشکبار
مر رہا ہے ایک ، اک زیرِ مزار
میٹھے میٹھے گیت گائے آبشار یا سُنائے قصہ ہائے دل فگار
ہم بھی روئیں وہ بھی روئے زار زار
ایسے روئیں رونے میں کھو جائیں ہم رواں رواں ہو ہمارا اشکبار
ہائے دل کو کس طرح آئے قرار
ایک جھولا آنسوؤں کا ڈال کر سسکیاں لے لے کے جھولیں بار بار
نالہ آئے گیت میں لب پہ یوں
برقرار اے بے قراری برقرار

منور ماکول غمخوار - دہلوی

غفلت کا خواب

سنہری کرن نیلگوں آسماں پر ہویدا ہوا نور سارے جہاں پر
ہوا فرش گسترده اب سیم و زر کا کہ شبنم پہ ہوتا ہے دھوکا گہر کا
وہ کوئل درختوں پہ کرتی ہے کوکو ہے قمری بھی گلشن میں کہتی تو ہی تو
اذانوں کا ہے شور اب مسجدوں میں اُٹھا شورِ ناقوس بھی مندروں میں
وہ دیکھو چلے مسجدوں کو نمازی جگاتا ہے دیوی کو ان کا پجاری
سُہانا سماں صبح کا تو نے کھویا بہاریں مناظر کا بھی لطف کھویا
کہاں تک تجھے اظہری کہہ سُنائے
جو سوئے سو کھوئے جو جاگے سو پائے

اظہر سلطانہ معظم اظہری بھوپالی

دلّی لکھنؤ کا مِلاپ

(محترمہ دل آرا بانو صاحبہ)

یاد ہیں وہ دن کہ جب آپس میں اک سنجوگ تھا
کوئی صدمہ تھا نہ غم تھا اور نہ کوئی روگ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ تھی گلزارِ اُردو پر بہار
اور چلا کرتی تھی اترا کر نسیمِ مشکبار

یاد ہیں وہ دن کہ اُردو کی ترقی کیلئے
لکھنؤ اور شہ جہاں آباد دونوں ایک تھے

تھی انہیں دونوں کے دم سے جوئے اُردو کی بہار
اور انہیں دونوں سے تھا جادوئے اُردو کا نکھار

ان کے ہاتھوں ہی بنی سنوری تھی اُردو کی دلہن
ان کی کوشش سے ہی تھی آباد اس کی انجمن

لکھنؤ دلّی سے ہی اُردو کی آرائش ہوئی
متحد کوشش سے ہی اُردو کی افزائش ہوئی

ایک دو دن سے نہیں صدیوں سے تھا یہ میل جول
پر خدا جانے کہ بولے کس نے تھے بڑھ بڑھ کے بول

جن سے چرخِ فتنہ پرور کو بہانہ مل گیا
تیرِ فرقت کے لئے عمدہ نشانہ مل گیا

ہوگئی دونوں میں رنجش پڑگئی دونوں میں پھوٹ
چرخ نے دستِ خزاں سے کہدیا "گلشن کو لوٹ"

جاگ اُٹھے فتنے کرم پرور فرشتے سو گئے
لکھنؤ دلّی کے دل جو ایک تھے دو ہوگئے

لیلئِ اُردو تری زلفیں پریشاں ہوگئیں
ہاں تری رنگیں شعاعیں نذرِ زنداں ہوگئیں

دل فسُردہ ہوگیا چہرہ فسُردہ ہوگیا
ہائے وہ ایک رشکِ جنت پھول مُردہ ہوگیا

ہائے وہ صدیوں کا دلّی لکھنؤ میں اتحاد
ہائے وہ مدّت کا کیفِ رنگ و بو میں اتحاد

کیا خبر تھی حادثوں کے ہاتھ سے لُٹ جائیگا
ساتھ جو مدّت سے تھا وہ یک بیک چھُٹ جائیگا

لکھنؤ کو گھر سمجھ کر شاعرانِ دہلوی
جا کے رہتے اور بستے تھے بصد جوشِ دلی

متحد آپس میں تھے اک نیک مقصد کے لئے
ہو نہ سکتے تھے جُدا وہ ایک مقصد کے لئے

ہائے یہ کس کی فسوں سازی کا قابو چل گیا
کیا فلک تیری نگاہِ بد کا جادو چل گیا

ہے زباں بھی ایک رنگِ شاعری بھی ایک ہے
غور سے دیکھو تو طرزِ زندگی بھی ایک ہے

پھر بھی دونوں کے دلوں میں ہے جدائی ہائے ہائے
گلشنِ اُردو پہ کیسی آفت آئی ہائے ہائے

کاش اب پھر درمیاں سے رنگِ باطل دور ہو
کاش پھر دونوں دلوں سے حدِّ فاصل دور ہو

کاش صنفِ نازنیں کا دل ذرا جرأت کرے
مرد جس کو کر نہ سکتے ہوں اسے عورت کرے

یہ زنانہ شاعری کی محفلِ شعر و سخن
پھر بسا دے کوششِ پیہم سے اپنی انجمن

ہاں یہ بزمِ شاعری ہے نیک فالِ اتحاد
اب ہوئی حاصل ہمیں روحِ کمالِ اتحاد

ایک ہو جائیں گی دلّی لکھنؤ کی راحتیں
ایک ہو جائیں گی دونوں خلوتیں اور جلوتیں

ہاں یہی محفل ہے دلّی لکھنؤ کا وہ ملاپ
جس سے دونوں کے دلوں سے دور ہو جائیگا پاپ

ایشیا - دسمبر ۱۹۴۰ء

میری ماں دلّی کی ہیں، والد کا گھر تھا لکھنؤ حق نے ان دونوں کے صدقے میں مجھے دی آبرو
ہاں مرے نانا تھے دلی کے وہ خواجہ میر درد جن کے آگے شوخ رنگِ شاعری ہوتا تھا زرد
خوش نصیبی سے مری شادی بھی دلّی میں ہوئی کیوں نہ ہو جاتی جواں میری امیدوں کی کلی
لکھنؤ دلّی سے میری والدہ بیاہی گئیں جن سے ساری بیگماتِ لکھنؤ دل شاد تھیں
اور میں پھر لکھنؤ سے چل کے دلّی آگئی اس میں جو کچھ بھی کرامت تھی مری شادی کی تھی
خوش نصیبی سے وہاں ہے میرا سسرالی مکاں خانِ دوراں خاں کا دلکش پاک مرقد ہے جہاں
خاں صاحب تھے مرے نانا کے جدّ نا مدار اپنی رحمت سے مجھے بخشا ہے حق نے یہ وقار

کوئی بی بی اس کہانی کو نہ سمجھیں بے محل یہ نہ سمجھیں دب گیا قصے سے کیوں رنگِ غزل
بات یہ ہے میرا قصہ ہے مسرت کی دلیل میرا قصہ اتحادِ باہمی کی ہے سبیل
لکھنؤ دلی کے دل آپس میں پھر مل جائیں گے از سرِ نو غنچہ ہائے آرزو کھل جائیں گے
حق تعالیٰ سے دل آرا کی ہے روز و شب دعا دونوں مرکز ایک کر دے دونوں بچھڑوں کو ملا
پھر دلوں سے اے خدا زنگِ کدورت دور کر اب تا خوش ہیں انہیں پھر شاد کر مسرور کر

۱۰۶

عورت

(باجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

حلقۂ ظلمات میں شمعیں جلا سکتی ہے تو آرزوؤں کے خنک موتی لٹا سکتی ہے تو
اللہ اللہ تیرے حُسن و رنگ کی تابانیاں حاملانِ عرش کو حیراں بنا سکتی ہے تو
یاس کی شکلیں، الم کی صورتیں، آہوں کی آگ ایک ہلکی مسکراہٹ سے مٹا سکتی ہے تو
اہلِ ثروت کی کُلا ہیں سینکڑوں شاہوں کے تاج بارگاہِ حُسن میں اپنے جھکا سکتی ہے تو
اک تبسّم کی پلک سے اک نظر کے نور سے ساری دُنیا کو بہشتِ نو بنا سکتی ہے تو
اک عجب رنگیں کرشمہ اک انوکھی شے ہے تو کون ہے، اپنی حقیقت کیا بتا سکتی ہے تو؟
مسکراہٹ سے ستاروں کے اُڑا سکتی ہے ہوش قدسیوں کے عزم کی تعمیر ڈھا سکتی ہے تو
بجھ رہے ہیں دل شرر خانوں میں کچھ باقی نہیں آج بھی احساس کا خرمن جلا سکتی ہے تو
اک اشارے میں بدل سکتی ہے ماحول و نظام اک صدا سے ساری دُنیا کو جگا سکتی ہے تو
خون سے سینچا ہے تو نے اپنے ارجُن کا شباب آج بھی ہر فرد کو ارجُن بنا سکتی ہے تو
کانپ اُٹھیں آفاق کے دل تھرتھرا جائے زمیں عزمِ ہمّت سے کرشمے وہ دکھا سکتی ہے تو

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

کون کہتا ہے تجھے کمزور اے تکمیلِ زور — قصرِ استبداد کی بُنیاد ڈھا سکتی ہے تو

آہنی تیرے ارادے عزم طوفانی ترے — گود میں مایوسیوں کے مُسکرا سکتی ہے تو

نوجواں اکبر کی رَن میں بھینٹ دے سکتی ہے تو — طور قربانی کے دُنیا کو دکھا سکتی ہے تو

وقتِ شورش ایک طوفاں بن کے بل کھاتی ہے تو — راہِ ہمت میں بھلا کب ہچکچا سکتی ہے تو

دستِ نازک سے اُلٹ سکتی ہے دُنیا ظلم کی — دھجیاں سرمایہ داری کی اُڑا سکتی ہے تو

جو زمیں سے کوہساروں سے نہ ہرگز اُٹھ سکے — بوجھ وہ کمزور شانوں پر اُٹھا سکتی ہے تو

ماہِ حیدر جب تیری آغوش میں طالع ہوا — کیا کرشمہ پھر وہ دُنیا کو دکھا سکتی ہے تو

خاک میں فرسودہ رسموں کو ملا سکتی ہے تو
ہوش میں سوئی ہوئی دُنیا کو لا سکتی ہے تو

صفیہ شمیم ملیح آبادی

وعدہ

وہ شاہکار اور یادگار نظم جو ۲۳ نومبر ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے تاریخی اور عظیم الشان مشاعرہ میں "ساغر" نے براڈکاسٹ کی اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ نشان زدہ بند براڈکاسٹ کئے گئے۔

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

۴ نہ پھوٹ پھوٹ کے رو، لوٹ آؤں گا اِک دن
شرارِ عشق کو بجلی بناؤں گا اِک دن
چراغِ جبرِ مشیّت بُجھاؤں گا اِک دن
جہانِ عہدِ وفا جگمگاؤں گا اِک دن

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ص کبھی میں آؤں گا کلیوں کی آبرو بن کر
حجابِ گُل میں کبھی کاروانِ بُو بن کر
چمن کی خاک سے پھوٹوں گا میں نمو بن کر
ترے شباب کی نوخیز آرزو بن کر
نسیم و نکہت و شبنم پہ چھاؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

ص
سکوتِ شام میں اُمید و بیم بن کے کبھی
سکوتِ شب میں سحر کا ندیم بن کے کبھی
نمودِ صبح میں روحِ نسیم بن کے کبھی
گلوں سے پھوٹ پڑوں گا شمیم بن کے کبھی
ترے مشام کی جنّت بساؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

جگاؤں گا تجھے ہم رازِ خامشی بن کر
تمام رات محبت کی زندگی بن کر
سجاؤں گا تری راتوں کو چاندنی بن کر
برس پڑوں گا ستاروں سے روشنی بن کر
جمال و نور کے دریا بہاؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ص
عنانِ شوق کسی سمت موڑتی ہی نہیں
کسی سے رشتۂ جذبات جوڑتی ہی نہیں
تعلقات کے بندھن کو توڑتی ہی نہیں
تری نظر مرے دامن کو چھوڑتی ہی نہیں
یہ ضد، یہ جبر! ؟ میں کیوں کر نہ آؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ص
نہ دیکھ جابر و مجبور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ تشنہ و مخمور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ رشکِ صد انگور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ اپنی طرح چور انکھڑیوں سے مجھے
خود اپنے ہاتھ سے تجھ کو پلاؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

ص
جو تیرے لب میں ہے اس نطقِ بے زباں کی قسم
تری زباں میں جو ساکت ہے اُس بیاں کی قسم
تری نگاہ کی غمّاز داستاں کی قسم
جو تیری روح میں ہے اُس فسانہ خواں کی قسم
تمام رات کہانی سناؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

— ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

انھیں حسین کناروں کے سایہ میں شب بھر
انھیں جمیل نظاروں کے سایہ میں شب بھر
انھیں جوان بہاروں کے سایہ میں شب بھر
انھیں بلند چناروں کے سایہ میں شب بھر
بہارِ جشنِ شگوفہ مناؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دِن

۵

شعاعِ مہر جھجک کر نظر جُھکا دے گی
بہارِ طرّۂ گل ہائے تر جُھکا دے گی
نسیم دوڑ کے تاجِ سحر جُھکا دے گی
شگفتِ گل ترے قدموں پہ سر جُھکا دے گی
کنول کی اوٹ سے یوں مُسکراؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دِن

یہ کوہسار، یہ چشمے، یہ آبشارِ رواں
شگوفہ زار کا یہ عکس، یہ بہارِ رواں
یہ موج موج سرِ آبِ جو دیارِ رواں
یہ شاخسارِ مقیم اور یہ شاخسارِ رواں
اِسی ہجومِ بہاراں میں آؤں گا اِک دِن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ربابِ عشق ہے برسوں سے بے صدا ہرچند
ہے مدّتوں سے مرا ساز بے نوا ہرچند
بنا دیا ہے زمانہ نے بے وفا ہرچند
میں آج قدرت و آدم سے ہوں خفا ہرچند
نہ سوچ تجھ سے بھی آنکھیں چُراؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دِن

ترے قریب بہ ہر رنگ و طور آؤں گا
میں رات بن کے شبستاں میں بار پاؤں گا
میں خواب بن کے تری آنکھ میں سماؤں گا
لباس و رنگ کے پردے میں جگمگاؤں گا
ترے وجود کی خوشبو چُراؤں گا اِک دِن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

یہ شعلہ زارِ محبت ہے یا جمالِ فریب
ہوا ہے دل سے کئی بار اتصالِ فریب
جنونِ عشق کی دولت ہے یا وبالِ فریب
جنونِ عشق حقیقت ہے یا کمالِ فریب
جنونِ عشق کو پھر آزماؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

۳ جبیں پہ صبح لئے، بازوؤں پہ رات لئے
نظر نظر میں غمِ عشق کا ثبات لئے
جلو میں اپنے کرم ہائے کائنات لئے
کبھی یہ دیکھتا ہوں تو ہے شش جہات لئے
کبھی یہ سوچتا ہوں کچھ نہ پاؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

ص مدام بارِ محبت اُٹھا نہیں سکتا
وفا کا نغمۂ حیا وید گا نہیں سکتا
قریب و دور کا مدفن بتا نہیں سکتا
تجھے یہ ڈر ہے کہ میں جا کے آ نہیں سکتا
مجھے یہ خوف ہے تجھ کو نہ پاؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

ص نہ پوچھ لالہ رُخ وجنّتِ جمال نہ پوچھ
لرز نہ جائے ترا عالمِ خیال نہ پوچھ
میں جا رہا ہوں جہاں اُس جہاں کا حال نہ پوچھ
شروع بھوک ہے اور بھوک ہی مآل نہ پوچھ
فسانۂ غمِ آدم سناؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

ص شعاعِ تیز کو نکہت کچل نہیں سکتی
شمیم حجلۂ گل سے نکل نہیں سکتی
نزاکتوں سے یہ گاڑی سنبھل نہیں سکتی
حیات صرف محبت سے چل نہیں سکتی
عجیب راز ہے لیکن بتاؤں گا اِک دن

ساغر

(باجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

کیفیات

(دوسرا رُخ)

محبّت کا یہ انقلاب اللہ اللہ ۔۔۔ سزا دے رہے ہیں سزا پانے والے
زمانے کی گردش کا اعجاز دیکھو ۔۔۔ کہ خود یاد کرتے ہیں یاد آنے والے
مرے سامنے آج حیراں کھڑے ہیں ۔۔۔ وہ دامن بچا کر گذر جانے والے
قیامت ہے آنکھوں سے آنسو گرائیں ۔۔۔ نگاہوں سے انوار برسانے والے
اُنھیں التجاؤں سے فرصت نہیں ہے ۔۔۔ جو تھے التجاؤں کے ٹھکرانے والے
خرابِ محبّت بنے پھر رہے ہیں ۔۔۔ جنونِ محبّت سے گھبرانے والے
فریبِ محبّت سے بھی مطمئن ہیں ۔۔۔ حقیقی محبّت کو جھٹلانے والے

کیفؔ مراد آبادی

کلام

لفظ ——— معنی

مرزا نظام شاہ لبیب دہلوی

نہ رونق رنگ و بُو سے ہے نہ رتبہ ہے بہاروں سے
زمیں کو عزّتِ فکر و عمل ہے دل فگاروں سے
ہزاروں دل بہ شکلِ گل ہیں پیدا لالہ زاروں سے
روئی کے پھوّئے دست و گریباں ہیں شراروں سے
فلک پر پاؤں دھرتی ہے زمیں ان کردگاروں سے

کثافت برق کی مغز و غدود شحم بنتی ہے
مریض عشق بنتی ہے، بتِ بے رحم بنتی ہے
لطافت برق کی انساں میں عقل و فہم بنتی ہے
منقّش ہو کے ذہنوں میں خیال و وہم بنتی ہے
تڑپ اُٹھتی ہے جو بجلی لہو کے آبشاروں سے

ارادہ جنبشیں دیتا ہے اور ارماں مچلتے ہیں
نفس کی ڈور تھامے ہوش گرتے اور سنبھلتے ہیں
یکایک عالمِ بے لفظ کے چشمے اُبلتے ہیں
نہ جانے کس طرح لفظوں کے سانچے میں یہ ڈھلتے ہیں
برستے ہیں جو خطرے دل پہ قدرت کی پھواروں سے

زباں کیا ہے، نفس کی اونچ نیچ اور اس کا پیچ و خم
وگرنہ تھا جہانِ اسم و جسم اک کا کل برہم
نسیم جستجو ٹپکا رہی ہے دم بدم شبنم
بہارِ گل بداماں ہو گیا الفاظ کا عالم
برستے ہیں سماعت پر یہی گُل شاخساروں سے

ضمیر اک ایک کو تعلیم کوشش دیتی جاتی ہے
اُجالا صبحِ نورانی کا دانش دیتی جاتی ہے
نصیحت کرتی جاتی ہے، نکوہش دیتی جاتی ہے
اثیری موج اک اک دل کو جنبش دیتی جاتی ہے
بڑھاتی جا رہی ہے صورتوں کو برق پاروں سے

یہ سارا شکل کا عالم ہے سب پُتلے ہیں صورت کے
پُجاری ہیں حواس و ہوش کس نادیدہ لذّت کے
کہ گویا یہ بھی کوئی بول ہیں مطرب کی دُھرپت کے
فضا میں گونجتے جاتے ہیں نغمے سازِ فطرت کے

نوائیں جُوں کی تُوں لپٹی ہوئی ہیں پھر بھی تاروں سے

نہ ماہیّت میں معنی ہیں، نہ ہیں معنی حقیقت میں
۱۱۴
نہ ہیں حُسنِ تخیّل میں، نہ ہیں حُسنِ طبیعت میں
نہ ظاہر میں نہ باطن میں، نہ صورت میں نہ سیرت میں
اچھوتے ہیں معانی جُوں کے تُوں آغوشِ فطرت میں

زبان و دل مرقّع کھینچتے ہیں بس اشاروں سے

مگر معنی کے وہ سائے جو دل کے دل میں رہتے ہیں
وہ طوفاں ہیں کہ جو دریائے بے ساحل میں رہتے ہیں
ہمیشہ مستعد فرقِ حق و باطل میں رہتے ہیں
مثالِ تیغ چشمِ مردمِ کامل میں رہتے ہیں

یہی چشمے ہیں جاری لامکانی شہسواروں سے

نظر سے گفتگو

عقل کا اور مدعا عشق کی اور آرزو
اس کو شکیب کی تلاش اس کو تڑپ کی جستجو

گرمیٔ انجمن تری میرا مذاقِ ہائے ہو
خندۂ دل کشا ترا میرے چمن کی آبرو

جذب و کشش ہے زندگی پیکرِ کائنات کی
دعوتِ عشق شش جہت جلوۂ حسن چار سو

عرضِ نیازِ عشق سے نطق بھی آشنا نہیں
ہم نے حضورِ یار میں کی ہے نظر سے گفتگو

ٹوٹ چکے ہیں سلسلے گرچہ تعلقات کے
تجھ سے جدا ہوئے نہ ہم، ہم سے جدا ہوا نہ تو

کس کی بہارِ حسن کا مجھ کو خیال آگیا
آج مری نظر میں ہے ایک جہانِ رنگ و بو

میرا مذاق معصیت، تیرا کرم کا مشغلہ
میری سرشت میں گناہ، عفوِ گناہ تیری خو

عہدِ تعلقات کا دیکھئے کیا مآل ہو
فطرتِ عشق مضطرب، حسن کی طبع جنگجو

واقفِ کفر و دیں نہیں بیخبرانِ میکدہ
دیر و حرم سے پاک ہے مشربِ ساغر و سبو

گر کے رہے گی بزم پر برقِ جمال دیکھنا
اٹھ کے رہے گا ایک دن رخ سے نقابِ مشکبو

نازشِ زہد و معصیت کوئی بھی معتبر نہیں
تیرا عتاب بے سبب، تیرا کرم بہانہ جو

گرچہ امید و آرزو روح و روانِ عشق ہیں
کاش رہے نہ عشق میں کوئی امید و آرزو

تاباں دہلوی

آج تک

فراق گورکھپوری

کچھ مضطرب سی عشق کی دنیا ہے آج تک
جیسے کہ حسن کو نہیں دیکھا ہے آج تک

مدّت ہوئی کہ حسن سے مانوس ہو چکے
دل بے قرارِ عرضِ تمنّا ہے آج تک

افلاک سے دبے ہیں کب افتادگانِ عشق
پستی حریفِ اوجِ ثریا ہے آج تک

اُس ایک دورِ جام کو مدّت گذر گئی
دل کو تری نگاہ کا دھوکا ہے آج تک

یوں تو اُداس غمکدۂ عشق ہے، مگر
اس گھر میں اک چراغ سا جلتا ہے آج تک

تصدیق تو نہیں مگر افواہ سی ہے کچھ
تیری کسی سے رنجشِ بیجا ہے آج تک

مدّت ہوئی کہ عشق مٹا کوئے یار میں
رہ رہ کے کچھ غبار سا اٹھتا ہے آج تک

اس راز کی خود اہلِ وفا کو خبر نہیں
جس طرح تیرے غم نے نباہا ہے آج تک

ہم بیخودانِ عشق تو کچھ شادماں سے ہیں
سنتے ہیں دل میں درد سا اٹھتا ہے آج تک

پورا ابھی کرکے ہم جسے پورا نہ کر سکے
دل سے وہی نظر کا تقاضا ہے آج تک

ویرانیاں جہان کی آباد ہو چکیں
جز اک دیارِ عشق کہ سونا ہے آج تک

پرچھائیاں نشاط و الم کی ہیں درمیاں
اے دوست وصل و ہجر کا پردا ہے آج تک

ساری رگوں میں ہیں غمِ پنہاں کی کاوشیں
جاری کشاکشِ غمِ دنیا ہے آج تک

یہ عمر بھر فراق بجا دل گرفتگی
پہلو میں کیا وہ درد بھی رکھّا ہے آج تک

ایشیا

سب کچھ تھا پر نہ پلٹی رُوٹھی ہوئی جوانی!

ٹھہر ٹھہر، کہ دو عالم ہلائے دیتی ہے — ترے لبوں پہ نہیں تیرے اختیار کی لَے
نشاط میں کہیں سامانِ غم نہ ہو جائے — بدل گئی ترے نغمے سے آبشار کی لَے

*

کچھ یاد ہے کشمیر میں سبزے پہ لبِ جو — ساغر میں بھری تھی مے انگور بہا دی
اتنا کسی انساں نے پیا ہو گا نہ پانی — جتنی مجھے کافر تری آنکھوں نے پلا دی

*

۱۷.

کشمیر میں جمی تھی اک دوپہر کو محفل — احساسِ زندگی جب قسمت مٹا چکی تھی
سبزے کا فرش تھا اور پھولوں کا شامیانہ — چشمے کی بے قراری جذبے جگا چکی تھی
اک سُرخ سُرخ شے پر تھیں مضطرب نگاہیں — کچھ جام میں تھی اور کچھ آنکھوں میں آ چکی تھی
مسحور ہو رہی تھی دل کی طرح فضا بھی — اک مطربہ ستمگر نغمہ سُنا چکی تھی

سب کچھ تھا پر نہ پلٹی رُوٹھی ہوئی جوانی
ہم نے بہت پکارا وہ دُور جا چکی تھی

نجم آفندی اکبر آبادی

جوہی کی کلیاں

عزیز جہاں بیگم ادا بدایونی

بہارِ خلد منظر جلوہ گر ہے
ہجوم سبزہ تا حدِّ نظر ہے

ہوائے مست ہی بہکی ہوئی سی
فضائے عنبریں مہکی ہوئی سی

سکوتِ شب تحیّر آزما ہے
جمالِ ماہ کیفیّت فزا ہے

ہوائے نرم و نازک جیسے آہیں!
کہ خوابِ ناز کی بے ربط سانسیں

سپہرِ نیلگوں اور نورِ اختر
کہ اوڑھی ہو حسیں فطرت نے چادر

فلک سے مہ کی بے تابانہ کرنیں
وفورِ شوق سے مستانہ کرنیں

برائے سیرِ گل آئی ہوئی ہیں
زمیں تا آسماں چھائی ہوئی ہیں

ستارے آسماں سے گر پڑے ہیں
کہ جوہی کے شگوفے کھل رہے ہیں

نزاکت آفریں رعنا سمن بر
تخیّل کے نشاط انگیز پیکر

کتابِ حسن کا عنوانِ رنگیں
جوانِ فطرت کا ارمانِ بہاریں

جبینِ غنچہ پر شبنم نہیں ہے!
عرق آلود روئے نازنیں ہے

یہ کلیاں ہیں کہ ماضی کی وہ یادیں
جنھیں ہنگامہ ہائے غم بھلا دیں

بڑے نازوں کی یہ پالی ہوئی ہیں
مئے عشرت کی متوالی ہوئی ہیں

برائے نذرِ شاعر خونِ دل سے
یہ گلدستہ بنایا ہے زمیں نے

ایشیا

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء

کسوٹی

(چند نئے رسالے اور کتابوں پر رائے)

(مسلسل)

داستان (لاہور)

سائز ۳۰×۲۰ ایڈیٹر خلیل احمد بشیر ہندی۔ سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۶ر ۵ ہیٹیل روڈ لاہور

اِن حالات میں ہر اُس شخص کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے جو قلم یا زبان سے جنتا میں کچھ کہنا چاہتا ہے کچھ کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ جنتا کو اپنے کہنے کے مطابق بنانا چاہتا ہے۔

داستان میں مکتوب ابراہیم میں وہ نئے اخلاقی رجحانات ہیں جنکو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے اور جو واقعی نئی زندگی کے بنیادی اجزا، و عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، اِن اجزا کے ساتھ ساتھ ملّا صاحب ماہر القادری کا مضمون کوئی مناسبت نہیں رکھتا جنکو فلسفہ کے جھٹلانے کی ضرورت اس بیسویں صدی میں آپڑی ہے۔

اس سائنٹفک عہد میں وہ بدوی دور کے روایات کو زندہ کرنا چاہتے ہیں اور انقلابی لٹریچر کے خالقوں کو کوستے ہیں: یہی نہیں بلکہ وہ ذہ صنعات کا اقتباسی مضمون لکھ کر یہ یقین رکھتے ہیں کہ اُنھوں نے انقلاب کا ہنو باندھ دیا، اور اس کے بعد "رشد و ہدایت" کے سلسلے کو بذریعۂ خط و کتابت جاری کرنے کا اعلان فرماتے ہیں:۔

ہم ایسے لوگوں سے دریافت کرتے ہیں کہ کارواں کو لے کر رہبر کا منزل پر نہ پہونچنا، اِدھر اُدھر ویرانوں میں بھٹکتے رہنا کیا اس کی گمراہی پر کافی دلیل نہیں ہے!؟

اگر کافی دلیل ہے تو نسلِ آدم کا کارواں جن اصولوں کی رہبری میں صدیوں سے بھٹک رہا ہے کیا یہ مسلسل اور مستقل گمراہی اُن اصولوں کی تردید کے لئے ناکافی ہے۔

ماہر صاحب کے مضمون فلسفہ و مذہب کے ساتھ ہی بعض مضامین مثلاً میا کفکی "ادب میں نیا نقطۂ نظر" "افسانہ نگار کی نیت، افسانوں میں کمزوری" "لکھ داتا خوب میں" بشیر ہندی صاحب کا ناول ابھی نامکمل ہے اس کے متعلق رائے دینا قبل از وقت ہے

نظموں میں مائل لطیف، اس کی سہیلی: اچھی نظمیں ہیں لیکن اِن تمام اچھائیوں میں زیادہ کشش پیدا کرنے کا امکان باقی ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ بشیر اور خلیل کی مساعی داستان کو اس کے نام کی نسبت سے زیادہ بلند کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ موجودہ حالت میں کئی رسالہ ترقی یافتہ عناصر اپنے اندر رکھتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کے احساسات کا دُوربینی کے ساتھ مطالعہ، مشاہدہ کیا جائے اور داستان کے لفظ لفظ میں وہ حقیقت پیدا ہو جو ہزار کرب کے ساتھ واقعی ہندوستانی نوجوانوں کی رگ و پے میں تشنج پیدا کر رہی ہے

آخر میں ایک بات اور اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ نظموں کے ترنم کو "مفلوج رومانیت" سے محفوظ رکھیں اور آزاد نظموں کی بہتات سے بھی بچیں کیا "آزاد نظم" کی حیثیت محض تجربانی ہے اس کی تخلیق و ترویج کو خود اس کی اہلیت ہی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن ان نظموں میں بھی معیار قائم رکھنے کی اشد ضرورت ہو

ناظرینِ ایشیا داستان کو ضرور منگائیں اور دیکھیں، وہ پڑھنے اور دیکھنے کے قابل ہے۔

چہاند (سہارنپور)

مدیر اعزازی تاز صاحب انصاری
الک و مدیر: ایم اسلم غزالی
مدیر ذکیہ خاتون نکہت شاہجہانپوری
قیمت سالانہ (عہ)

۱۹۳۶ء میں جاری ہوا ... عوام کے پڑھنے کے لئے
... زمانہ ہے جب ... ترقی اور سنورنے کے جراثیم معلوم ہوتے ہیں ایسے
... تھیں، ... عوام کے دکھوں کے بارے میں بھی کچھ ہونا ضروری ہے اگر
اس کو محض "واقعیاتی رومانی ادب" ہی کا آرگن بنا دیا جائے تو یہ ادبی طور
پر مفید اور تجارتی طور پر کامیاب ہو سکتا ہے۔
نظموں اور افسانوں کا کوئی معیار نہیں ہے مگر اتنا معیار ضرور ہے کہ
... میں ... غلاط سے پُر ضرورت ہے کہ تاز صاحب اس
پر ... ذکیہ صاحبہ بھی توجہ دیں۔ آج مسلمانی دنیا میں زندگی
... ہوگئی ہے ... ان کا استعمال نہیں ہونا چاہئے!؟

سہیل (گیا) چندہ سالانہ ...
ادارہ: عارف ہسنوی ... قیوم عثمانی

صوبۂ بہار سے نکلنے والے رسالوں میں یہ بھی ایک رسالہ ہے جس کی خواہش
ہے کہ اُن اہلِ قلم اور شعراء کی پشت پناہی کرے جو اپنے اندر جوہر رکھتے ہیں اور
اُردو زبان کے لئے آگے چل کر بہت مفید ہو سکتے ہیں، مگر اپنے اس مقصد میں اسے
کو ابھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ ادبی
... معیار کے متعلق ادارہ ایک روشن راستہ اختیار کرے۔
ہر چند کہ سہیل کے کرتا دھرتا ترقی پسند ادب سے نا واقف معلوم نہیں
ہوتے مگر سہیل بھی اپنی شکل اور کام کے لحاظ سے یکسانیت کے ساتھ ترقی
پسند رسالہ معلوم ہونا چاہئے۔
اس کے سرورق کی مصوری کا کونسا "اسکول" ہے؟ کم از کم میں تو یہ
سمجھنے سے قطعی قاصر ہوں، اس سے تو زیادہ بہتر ہے کہ سرورق سادہ ہو۔ مضامین
اوسط درجہ کے ہیں لیکن آج جو شخص کسی ادارہ میں شریک ہوتا ہے اُس کے لئے
لازمی ہو کہ وہ وقت اور ماحول کے مطابق ادب پیش کرے، اب بے روح غزلوں
اور بے جان کہانیوں کا زمانہ نہیں رہا۔ بہار میں سہیل جیسے افسانہ نگار

حسین امام صاحب اور جمیل مظہری جیسے شاعر، اختر جیسے ادیب اور ترقی پسند
ادیبوں کا پورا ایک گروہ موجود ہے۔ صاحبانِ جرائد کو چاہئے کہ وہ اِن اصحاب
کی ہمدردیاں حاصل کریں اور اِن حضرات کو چاہئے کہ اگر کوئی گوشۂ عافیت سے
ان کو اٹھانے کے لئے نہیں آتا تو یہ از خود میدانِ عمل میں آئیں اور بہار کی
ادبی قیادت کا فرض پورا کریں۔
مارچ واپریل ۱۹۳۶ء میں سہیل نے ایک خاص نمبر بھی شائع کیا تھا۔ عام
نمبروں سے اِس کا معیار یقینی بلند تھا۔ مقالات میں نواب نصیر حسین خاں
خیالؔ عظیم آبادی مرحوم کا خط، طلسم ہوش رُبا، فردوسی اور اسدی، رباعی نگاری
اور شاد عظیم آبادی، مسلمانوں کے زمانۂ حکومت میں ہندوستان کا نظامِ تعلیم،
فرقہ بندی کی نفسیات، ہندوستان میں دستوری حکومت کا ارتقا، نہایت
معیاری مقالے تھے۔ مقالات کے علاوہ چند افسانے اور کئی نظمیں بہت خوب
تھیں، افسانوں میں سہیل کا افسانہ رات کی ہنسی، وہ رات اور نظموں میں سعی خام
اور فکرِ جمیل خوب چیزیں تھیں۔ لیکن بہرحال یہ تو طے شدہ حقیقت ہے کہ سہیل کے
اس نمبر کا علمی حصہ ادبی حصے کے مقابلے میں کہیں وزنی تھا۔
سہیل میں ترقی اور کمال کی بکھری ہوئی اہلیت موجود ہے۔ کوشش
کرنی چاہئے کہ منتشر امکانات سے فائدہ اٹھا کر اس کا معیار قائم کیا جائے اور پھر
ہمیشہ اسی معیار پر جاری رکھا جائے۔
رسالہ میں تصاویر کی اشاعت نیرنگِ خیال کے قائم کردہ ۱۹۲۵ء
کے کلچر کو پیش کرتی ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ چند سال بعد کاروان لاہور نے
اس کلچر کو دقیانوسی بنا دیا تھا اور اب نئے ادب میں تصویر تو نہیں مگر مضمون نگار
کی تصویر کی اشاعت کے معنی تو صرف ایک ہی یعنی چھچھورپن .... اگر اعلیٰ ترین
آرٹ کی اشاعت ممکن نہیں ہے تو کم درجے کے آرٹ کی تصاویر کی اشاعت ہرگز
معیاری چیز نہیں۔
سہیل کے خاص نمبر میں بھی تصاویر تھیں، ان تصاویر نے سہیل کی
علمی و ادبی خوبصورتی کو ہمارے خیال میں کم کر دیا تھا۔
ہماری رائے میں رسالے کو ہمیشہ ادنیٰ درجہ کی تشہیر سے محفوظ
رکھا جائے جو ایک عظمت اور حسن رکھتا ہے، پھر لوگوں پر تصاویر کا کیا نفسیاتی
اثر پڑتا یا پڑ سکتا ہے۔ لوگ اس بھید کو بیسویں صدی میں بھی نہیں سمجھتے!؟
میں بہار اور اہلِ بہار کا ہمیشہ سے قائل ہوں اور اُن سے محبت کرتا ہوں

— ایشیا دسمبر ۱۹۳۶ء

اس لئے اُن کی ترقی کا خواہاں بھی ہوں۔ اُن کے رسائل اور اُن کے ادب
کو بلند اور کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں، ہمارے بہت سے دوست ترقی اور حسن
کا مخزن ہیں۔ مگر صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اُن کے اندر سے وہ انفعالیت
غائب نہیں ہوئی جو اوّل تو بدھ ازم کی تعلیمات کے نتیجہ میں غیر شعوری
طور پر اُن کی زندگی کا جزو بن کر رہ گئی اور دوسرے عظیم آبادی کی نوآبادی کا بھول
پن بھی ان شریف لوگوں کے مزاج میں رس بس کے رہ گیا ہے۔
میری خواہش ہے کہ سہیل ترقی کرے اور اس کے ارباب حل و عقد
چاہیں تو اُسے بہ آسانی نیا جنم دے سکتے ہیں۔!؟
موجودہ حالت میں بھی وہ ایک اچھا رسالہ ہے اور ناظرین آیشیا کو
اس کے مطالعہ سے ضرور فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

مسلم لیگ اور کانگریس

مرتبہ، ظہیر الاسلام قریشی بی۔ اے (علیگ) ۸ بلاک کوٹھی نمبر ۲
ماڈل ٹاؤن
آنریری سیکرٹری مجلس مندوبین آل انڈیا مسلم لیگ لاہور

جب سے ملک میں کانگریس برسر اقتدار آئی مسلم لیگ اور کانگریس
کے متعلق کافی لٹریچر اُردو زبان میں پیدا ہوا۔۔۔۔ اس سلسلے میں عبد الوحید خاں
بی۔ اے نے جو دو کتابیں لکھیں وہ واقعات اور تاریخ کی غلط تعبیر پر مبنی ہیں،
انہیں مسلم عوام کی عام جہالت سے حطیبانہ اپیل کی گئی ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کے
اسلامی احساسات کو چھیڑ کر بھڑکایا گیا ہے۔ یہ اور ایسی بہت سی کتابیں سنم پریس
سے شائع ہوتی ہیں جن میں کوئی معقول دلائل نہیں ہیں سوائے اس کے کہ روایتی
طور پر مذہبی احساسات کو وقتی اور بے بنیاد طور پر چھیڑ دیں، لیکن چند صفحے پڑھ کر
"مسلم لیگ اور کانگریس" کے متعلق مجھے یہ رائے قائم کرنی پڑی کہ یہ چھوٹی سی کتاب
گو مسلم لیگی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا لہجہ نسبتاً نرم ہے
پہلے مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کی مجمل تاریخ ہے۔ جس میں اُن کا ذکر سیاسی
نہیں مذہبی انداز میں کیا گیا ہے؛
لیکن، ہندوستان پر بیرونی حملہ آوروں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ
سے ہرگز اسلام کا پیامی اور "شراب معرفت سے مخمور" بہادر کہہ دینا درست نہیں ہے
جن جن مسلم قوتوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اُن کو ایک زرخیز میدان کی ضرورت

تھی اور بس۔۔۔ اور کیونکہ وہ اس تجسس اور تلاش کیساتھ تھا ایک عقیدہ بھی
رکھتے تھے اس لئے آر[illegible] کو جس میں موجودہ فوج کی طرح نوجی [illegible]
نہ تھا [illegible] نام پر جان بازی کی صلاحیت رکھتے تھے [illegible] مسلم
لیگ یا کانگرس دیتے ہیں۔ یہ مقصد اس میں سیاسی غلبہ تھا اور یہ کوئی قابل
اعتراض بات نہیں۔ مسلمان مسلمانوں پر ایک دوسرے کا ملک چھیننے کے لئے حملہ
آور ہوتے تھے افغانوں اور ایرانیوں کی جنگ، خود اسلامی بادشاہوں کی
سینکڑوں آپس کی لڑائیاں، اس اصول ملک گیری کی [illegible] ہندوستانی قوم
کی روحیں "عرفان الٰہی کیلئے کیا مضطرب ہو سکتی تھیں جو اپنی آزادی کو برقرار نہ رکھ
سکے وہ "عرفان الٰہی" کا خیال کیا کر سکتے تھے!؟
چھوٹا طبقہ ردی کے لئے مسلمان ہوا اعلیٰ طبقہ عزت و جاہ کے لئے،
کوئی شک نہیں ایک طبقہ افراد کا ایسا بھی تھا جو تعلیمات، اسلام کے سماجی نظام
اس کی آزادیوں یا وسعتوں کو دیکھ کر مسلمان ہوا لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا
ان اسلامی حملہ آوروں کا ہندوستان میں آنا سیاسی حیثیت رکھتا ہے،
اچھوتوں کے سلسلے میں ظہیر صاحب تمام تر زیادتیوں کی ذمہ داری
ہندوؤں پر رکھتے ہیں، درست، لیکن عین اس وقت ہی مسلمانوں اور اچھوتوں کا
تعارف کیوں ہوا، جبکہ ہندوؤں کے متفکرین سیاسی نے یہ طے کیا کہ اچھوت
بھی عام انسانوں کی طرح انسان ہیں اور زندگی کی جملہ نعمتوں سے مالا مال ہونے کا حق
رکھتے ہیں!؟
یہ خیال اگر کوئی خیال ہے تو کیا مسلمان اس اچھوت کو مرغوب اسلام
نہیں کرتا مگر پاکیزہ ہے اپنے دسترخوان پر جگہ دے سکتے ہیں، یہ اچھوتوں
کو مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں۔
لیکن کیا یہ دینی فرض کی بنا پر یا سیاسی پالیسی کی بنا پر ۔۔۔
کیا خفتہ بختی ہے کہ دوسرے جب جاگ گئے ہیں اور بیدار ہو [illegible]
ہم خواب ہی میں پکار اُٹھتے ہیں اور جھومنے میں بیٹھے بچوں کی طرح ضد کرتے ہیں،
اچھوتوں کے مسئلے کے بعد ریاستوں کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے،
کانگریس فیڈریشن میں ہندوستانی ریاستوں کی شرکت اس لئے نہیں چاہتی
کہ برطانیہ ان کو شریک کر کے کانگریس کی کثرت باقی رکھنا نہیں چاہتی
والیان ریاست کی [illegible] گی کا اصول [illegible] وقت تسلیم کیا [illegible]
جب وہ اپنی ریاستوں میں نمائندہ حکومت قائم کریں۔ والیان ریاست کوئی

حیثیت و قوت سیاسی اہمیت اور روایات نہیں ہیں سوائے اس کے کہ ان کا وجود محض برطانیہ کی وجہ سے قائم ہے، جس روز انگریزی حکومت کا ہندوستان میں خاتمہ ہوا، یہ ریاستیں بھی ختم ہو جائیں گی۔

ترقی یافتہ مزاج اس مسئلہ پر اس لئے زور دیتے ہیں کہ بیسویں صدی میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غریب و محکوم نسل انسانی آج بھی اتنی ہی ننگی بھوکی رہے جتنی جاگیردارانہ نظام کے ماتحت تھی لاتعداد انسانوں کے پاؤں میں راہ کے کانٹوں، تپتے ہوئے پتھروں اور بارش کے پانی سے بچنے کے لئے جوتے بھی نہ ہوں اور شخص واحد کے پاس وقت اور موسم کے لحاظ سے نہ صرف جوتوں کی ایک فیکٹری ہو بلکہ وہ ایک نہیں تین چار موٹریں بھی رکھتا ہو ہندو مہاسبھا کے متعلق ظہیر صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اس کے جھنڈے تلے ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت جمع ہے۔

اِن تمام فرقوں کے اختلافات کا ذکر کرکے ہمارے دوست نے یہ ثابت کیا ہے کہ کانگریس ہر طرف مردود ہے اور نمائندہ اسمبلی کا مطالبہ محض ڈھونگ ہے لیکن مستقبل میں ہم بتائیں گے کہ مرکزی اقتدار کس جماعت کو حاصل ہو اور صوبہ جاتی حکومتیں یا جو بھی نظام حکومت آئندہ آئیگا اس پر کونسی جماعت چھا جائے گی، حکومت کے ارکان اور حکام کے اعلیٰ دجل و فریب اس وقت ملک میں جو کچھ کیا ہے، ہم نے اس کو نوٹ کر لیا ہے وہ وقت آنے پر ہم جو کچھ کرینگے اُسے ابھی نہیں بتا سکتے

جیسے جیسے ہی اس کتاب کو پڑھتے جایئے یہ اپنا مقصد خود ہی پورا کرتی جاتی ہے۔ یعنی قومی ارتقاء اور انقلابی روح کی تکذیب، البتہ یہ ضرور ہے کہ اندازِ تحریر اور الاٹ کی نوعیت اور اُن کا استعمال کہیں کہیں سیاست دانوں کا سا ہے، زبان رواں اور سلیس ہے، بیان خوب ہے، مگر ایسے شخص سے جو سیاسی تاریخ کہہ رہا ہو، ہم ان فقروں کی اُمید نہیں رکھتے تھے —

غدر کا ذکر کرتے ہوئے ظہیر صاحب لکھتے ہیں :-

"ہندوان حالات سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کے منظورِ نظر بنگئے اور مسلمانوں کو مٹانے کا جو مقصد وہ خود اب تک پورا نہیں کر سکتے تھے انگریزوں کے ہم نوا بن کر اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے"۔

مسلمانوں کی حکومت تھی، اسلامی تمدن اور اسلامی حکومت کے اثرات کو مٹانا انگریزوں کا مقصد تھا تاکہ وہ مغربی تمدن، اس کے اثرات اور اپنی حکومت کی بنیاد کو مضبوط تر کرسکیں، ہندوؤں سے وہ اور ہندو اُن سے تجارتی اور اقتصادی تعاون کے لئے اس طرح تیار ہو گئے جس طرح مسلمانوں سے ہو گئے تھے اور انگریزوں نے نہایت حسنِ تدبیر کا ثبوت دے کر مسلمانوں کی پہلی کی ایک قوم کے مقابلے میں ۵۰۰ سال پیچھے کر دیا، ان کا مقصد حاکم قوم کو بالکل مفلوج کر دینا تھا۔ اس میں ہندوؤں نے کیا کیا —— !؟

بہرحال کتاب شروع سے آخر تک مسلم لیگ کی قصیدہ خوانی اور کانگریس کی مذمت پر مبنی ہے اور انھیں حالات پر بحث کی گئی ہے جو ملک میں تین سال سے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہم منکرین مسلم لیگ کو کوئی سیاسی بصیرت عطا نہیں فرماتی، اس کے بجائے ہمارے دوست اگر کوئی "ادبِ لطیف" کی کتاب شائع کرتے تو اُردو لٹریچر میں اضافہ ہوتا !؟

ہاں اُن خواتین اور اُن منفعل مردوں کے لئے جو کانگریس کو زمِ موغوں سے کوسنے دینے کے عادی ہیں یہ کتاب مفید اور جرأت افزا ہے، بہرحال اس کو ہمارے دوست نے محنت سے لکھا ہے، اچھے کاغذ پر چھپوایا ہے، مفت تقسیم کیا ہے اور اس طرح لکھا بھی ہے کہ بس ہم ہی اس کو بُرا بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی جس شخص کو خدا اور رسول کا خوف ہے اور جو ذرا بھی اسلام کا درد دل میں رکھتا ہے وہ اس کتاب کو نہایت حضورِ قلب سے پڑھے گا! اور مصنف کی تعریف کرے گا۔ میں بھی دل پر پتھر رکھ کر تعریف کرنے پر مجبور ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ نوجوان جن کی رگوں میں گرم خون ہے، جدت اور انقلاب کے علمبردار ہوں" خاصکر تعلیم یافتہ نوجوان جو مغربی زبانوں کے ماہر ہیں اور جنھوں نے انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کی تاریخ پڑھی ہے جو سیاست عالم اور اس کے جزر و مد کو سمجھتے ہیں، حقائق کی تہ میں سونے والے واقعات اور انسانی نسل کی بڑھتی ہوئی روحِ آزادی کو جانتے ہیں سائنسی ارتقاء اور اُس ارتقاء کے پھیلاؤ کا اندازہ کرسکتے ہیں، اُن نوجوانوں کو تو رجعت پسندی سے گریز ہی کرنا چاہئے۔

سالِ نو کا پیام، نوجوانانِ ہند کے نام

از محمد حسام الدین خان غوری صدر جمعیت مسلم نوجوانان سکندرآباد (دکن)

یہ آٹھ صفحات کا ٹریکٹ ہے، جس میں نوجوانوں کو مخاطب کرکے نہایت ہمت افزا اور صالح خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، غوری صاحب نے اس کو

—— ایشیا دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

بیس ہزار کی تعداد میں شائع کر کے مفت تقسیم کیا ہے، ۵۰۰۰ کی تعداد مفت تقسیم کی جا چکی ہے اور اب فی ٹریکٹ ۔ر کے حساب سے مندرجہ بالا پتہ سے مل سکتا ہے، ایک سو جلدیں ایک روپیہ میں علاوہ محصول ڈاک کے روانہ کی جا سکتی ہیں۔

اس ٹریکٹ کے آغاز میں "فرمان انقلاب" کا اقتباس بھی دیا گیا ہے جس کے متعلق غوری صاحب نے اطلاع دی ہے کہ یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو اُن کی جمعیت کے طالب علموں نے اسے گاتے ہوئے سکندر آباد دکن کا گشت کیا۔ مضمون کے الفاظ جوش پیدا کرنے والے، اور طرزِ بیان بہت دلکش ہے۔

دیر و حرم

مصنفہ چودھری منظور احمد بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی سیکریٹری لائل پور میونسپلٹی پبلیشر: لاہور بک شاپ لنسیت روڈ لاہور، مجلد حسین حجم ۲۰۰ صفحات۔
قیمت ؏ مجلد

کسی شاعر پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے محض اُس کے کلام کا مطالعہ ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اُس کی زندگی اور فطرت کے مطالعہ اور مشاہدہ کی لازمی طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ منظور صاحب سے میری ملاقات لدھیانہ (پنجاب) میں ۲۱، ۲۲ نومبر ۱۹۴۰ء کو ہوئی، ہم ایک جگہ تو مقیم نہ تھے مگر دو دن میں چند ہی گھنٹوں کے لئے علیحدہ ہوئے اس قدر قلیل وقت میں ارادی مطالعہ یا پُرسکون مشاہدہ آدمی کیا، کسی چیز کا بھی ممکن نہیں، لیکن بہرحال ان کی کتاب کے جس قدر اوراق دیکھے جا سکتے تھے ایک سرسری نگاہ سے دیکھ ڈالے، وہ ایک نفیس اور شریف نزل معلوم ہوتے ہیں اور ان میں اکثر شاعروں کی طرح حریفانہ غرور، سفلہ مزاجی، بے سیرتی اور فعل رندانہ طبعی اور وہ جو ایک ناگوار قسم کی بار ارتیت شعرا نے اپنا پیشہ بنالی ہے، پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اُن کے اطوار اور اخلاق سے معلوم ہوتا ہے کہ عام انسانوں کی طرح انھوں نے ایک صالح ماحول میں آنکھ کھولی اور اُن کی چال ڈھال میں وہ ہی سلاست اور بیساختہ وقار ہے جو ایک عام شریف انسان کی خصوصیت ہوا کرتا ہے

میری اُن سے ملاقات ایک مشاعرے میں ہوئی۔ مشاعرہ! شاعروں، اور شاعر پرستوں کا دنگل، اس دنگل میں وہ اپنے قد کے لحاظ سے تو چھوٹے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے مگر اُن میں وہ بیباکی اور شوخی نہ تھی جو ماحول اور اُن کی ذات میں تطابق پیدا کرتی۔ مگر وہ کچھ اُس فضا کی مخلوق نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اسی لئے میری رائے ہے کہ وہ [illegible] فضا کی خلوت بننے کی کبھی کوشش نہ کریں

اُن کو عام ادب [illegible] لوگوں کی طرح کوئی غلط فہمی بھی نہیں معلوم ہوتی اور علم و ادب کے حصول کے سلسلے میں وہ [illegible] نہیں [illegible] معلوم ہوتے ہیں۔

ایک شاعر کی روح میں جس قدر لذّت اور اخلاص میں جس درجہ سعت ہونی چاہئے اس کی جھلک بھی ان کی آنکھوں میں پائی گئی

ان کی کتاب کے یہ چند اوراق ہی میں پڑھ سکا گو میں اپنے مطالعہ کو [illegible] نہیں کہہ سکتا کیونکہ صاحب نظر نہیں، پھر بھی اب میں دیر و حرم پر اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے کر سکتا ہوں۔

دیر و حرم کا انتساب اردو زبان کے محسن اور ادیب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی ذات سے ہے۔ اس کے بعد کیفی صاحب کی [illegible] پھر منظور صاحب کا "تعارف" پنڈت جی نے تحریر فرمایا ہے۔ جو تعارف ہونے کے ساتھ ہی منظور صاحب کے کلام پر ایک آدھ نزاعی بات [illegible] تنقید ہے۔ تعارف کے بعد تجزیہ تصدق صاحب کا پیش لفظ ہے جو [illegible] صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس کے بعد منظور صاحب کی تصویر ہے اور صفحہ ۲۵ سے [illegible] شروع ہوتی ہیں، جو اب ایک سو چھیتر صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

تعارف کے سلسلے میں پنڈت جی نے جو کچھ منظور صاحب کے [illegible] وہ جامع، مختصر اور دقیق نظر پر مبنی ہے۔ مثلاً ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اس کے کلام میں داخلی اور خارجی دونوں رنگ پایا جاتا ہے [illegible] علاوہ اخلیت کو حاصل ہے۔"

کلاسیکل لفاظی اور اسلوب آرائی سے کام لینے والوں کے [illegible] پنڈت جی نے تحریر فرمایا وہ محض اُن کے پرکھنے اور لکھوانے کا کمال ہے۔ [illegible] بہ حیثیت ایک جامع نقاد کے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آرٹسٹ کے لئے [illegible] ہونا لازمی ہے اور شاعر جس کا تمام [illegible] الفاظ ہی ہیں الفاظ سے کیونکر دست بردار ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ الفاظ کے استعمال میں غرابت اختیار کرتا ہے۔ بلطافت ایک الفاظ کی تراش، بندش اور بندش کی ندرت ان تمام حقائق کو وہ نظر انداز ہو سکتے ہیں کر سکتا ہے!؟

نمونہ کے طور پر جن اشعار کو پنڈت جی نے لکھا ہے۔ صرف ایک ایک کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں الفاظ کے معیار و استعمال کا پایہ نہایت [illegible]

۵

ایشیا، دسمبر ۱۹۴۰ء

دا فر کلام میں الفاظ اور اُن کی بندش وہ جو بنیادی اصول ہے اس کا انجام شاعری کے مذاہب میں کلاسیکل ہو جانے ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔

وہی یہ ہے بھی سہی پر کچھ دماغِ شوق — سجدہ گہہ جمال مرا آستاں ہے آج
انوارِ حسن سے ہے در و بام کو فروغ — یہ خاک تیرہ غیرتِ ہفت آسماں ہے آج
بکھرے ہوئے ہیں دوش پہ گیسوئے نرم نرم — موجِ شمیم کارواں در کارواں ہے آج
بیٹھے ہیں ست کلیدِ درِ عیش و انبساط — ہاتھوں میں میرے لطفِ طرب کی عناں ہے آج
اے شوقِ ناصبور ذرا بڑھ کے اک قدم — اے جرأتِ حریص ترا امتحاں ہے آج

ایک جگہ پنڈت جی منظور صاحب کے گیتوں اور ان کی زبان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :-

" آپ اردو والوں کے خلاف یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے کہ ان کا کلام دیسی روایات سے معرّا اور غیر ملکی تلازموں اور تلمیحوں سے بھرا ہوا ہے"

"آپ" پر جو زور ہے اس کے متعلق پنڈت جی اگر برا نہ مانیں تو اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ سے بہت پہلے اُردو شاعری دیسی روایات اور غیر ملکی تلازموں اور تلمیحوں سے آزاد ہو چکی تھی، منظور صاحب کے اُن پیشروؤں نے اس فرض کو ادا کیا، جن سے متاثر ہونے کا نتیجہ "دیر و حرم" ہے۔ ایک دوسری جگہ پنڈت جی اشتراکی اور انقلابی شعراء پر ہلکا سا حملہ کرتے ہیں اور اُن کے جوش کو ناقص اور منظور صاحب کے اعتدال کو مستحسن قرار دیتے ہیں :-

" آج کل جوان عمر (یہ ترکیب اُسی وقت استعمال کی جاتی ہے جب کسی کا بچکانہ پن ظاہر کرنا ہو) شعراء میں ایک موضوع بہت زور شور سے چل رہا ہے وہ ہے عوام کا افلاس اور مزدور" غیر معتدل اور وہم وہامی نگارش پسند کرنے والے اسے اشتراکیت محض کی حد تک پہنچا دیتے ہیں لیکن منظور صاحب کے یہاں یہ محض "ہمدردیٔ عامّہ" کی حد تک محدود رہتا ہے"

ان سطور کو پڑھ کر غالب کا مشہور شعر یاد آگیا ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

رومانی عہدِ شاعری کے بعد جس اسکول کا آغاز ہوا اور "جوان عمر شعراء" نے جس مدرسۂ شاعری کی بنیاد رکھی ہے وہ زندگی کی واقعیت اور مسائلِ حیات پر حقیقت کی روشنی میں تنقید پر مشتمل ہے۔ "ہمدردیٔ عامّہ" سے آپ سماج کے ناسورِ افلاس کا علاج نہیں کر سکتے۔ لفظ "ہمدردی" خود اک بورژوا اصطلاح ہے۔ جس وقت تک سماج میں یکسر انقلاب نہیں ہو جاتا یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اس نظامِ تمدن کے تمام تر اثرات مٹ نہیں جاتے اُس وقت تک نئی دنیا پیدا نہیں ہو سکتی" جوان عمر شعراء" قسمت کے قائل نہیں حقیقتوں کو مانتے ہیں، اسی لئے اُن کے کلام میں ان عناصر کے خلاف باغیانہ جوش ہے، جنھوں نے "ہمدردیٔ عامّہ" "تحریکِ امدادِ باہمی" "تخیّر"، علم دوستی، ادب نوازی اور ایسے لاکھوں بے معنی اور ذلیل سکّے سماج میں ایجاد کر کے مشتہر کر دیئے ہیں، لیکن انسانوں کی بڑی تعداد جن میں قصیدہ خواں اور انجیل گو فرشتے" بھی شامل ہیں، بھوک اور افلاس میں ایڑیاں رگڑ رہی ہے اس لئے اشتراکیت محض ہی ان کے خیال میں ان بیماریوں کا علاج ہے اور ان کی کوشش ہے کہ وہ اُسی طرح ادب کو حقیقی اور ذی روح بنا دیں جس طرح انقلابِ روس سے پہلے روسی ادیبوں اور شاعروں نے روسی ادب کو حقیقی اور جاندار بنا دیا تھا۔

منظور صاحب نے اِن مسائل کو معلوم ہوتا ہے ابھی چھوا نہیں ہے، اِس لئے اس قسم کی نظمیں محض جوشؔ کی "بیوہ سہاگن" اور ضعیفہ وغیرہ سے متاثر ہونے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، ان نظموں میں وہ اثر اور جوش نہیں جو ان کی دوسری رومانی نظموں کی جان ہے۔

بہر حال پنڈت جی نے اپنے دیباچے میں صاف نہیں بتایا کہ منظور کے یہاں جو بھی رنگ ہے وہ اس کے پیشروؤں کا پرتو ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ لوگ اس بات کو عیب خیال کرتے ہیں کہ آدمی کی صحیح پوزیشن بتائی جائے شاعر اور شاعر کے پسند کرنے والوں کو بھول بھلیوں میں ڈال دینا تنقید کی کونسی قسم ہے !؟

اُنیسویں صدی کے درمیانی حصے میں ٹالسٹائی، ترجنیف، دوستوفسکی نے روسی ادب کے ارتقاء کے لئے میدان تیار کیا اس کے بعد میکسم گورکی نے جو روس کا ادیبِ اعظم ہے سر بفلک عمارت کھڑی کر دی۔ یہ سب کچھ اُنیسویں صدی کے ربعِ آخر میں ہوا۔ یعنی میکسم گورکی نے اپنے پیشروؤں کی تیار کی ہوئی زمین پر اپنے ادب کے گل کھلائے۔ لیکن اس اظہار سے گورکی کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی طرح یہ کہہ دینے سے کہ منظر نگاری میں منظور جوش کے متبع گیتوں کی زبان، شعری نزاکت تخلیقِ حسن و رومان اور اسالیب (Mannerism) میں بادۂ مشرق سے متاثر اور عام رومانیت میں اختر شیرانی سے بہت کچھ

ایشیا، ستمبر ۱۹۵۶ء

متاثر ہیں تو یہ نہ حقیقت کے خلاف ہوگا نہ منظور صاحب کی حقیقی پوزیشن کی منافی کیونکہ اس حقیقت کے اظہار کے باوجود دیر و حرم کے ثناخوانوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ ہمارے دل میں اُنکی زیادہ قدر ہو جاتی ہے۔

پنڈت جی کے بعد نجمہ صاحبہ کا پیش لفظ ہے۔ یہ دیباچہ محنت اور بڑی شگفتگی کے ساتھ لکھا گیا ہے، مگر یہ در اصل گلدستۂ تاثرات ہے جو منظور صاحب کی شاعری کی بارگاہ میں پیش کیا گیا ہے۔ تنقید سے اسے کم تعلق ہے اور جو تنقیدی نکتۂ نظر ہے وہ قدیم مغربی نکتۂ نظر ہے، اب خود یورپ میں ادب کے جدید نظریے کے مطابق تنقیدی اصولوں میں بہت کچھ رد و بدل ہو گیا ہے اور ادب کو محض جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

اس مضمون میں جس قدر اقتباسات ہیں وہ سب پرانے نقادوں کے نقطۂ نگاہ کو پیش کرتے ہیں، بجنوری وغیرہ اگر آج زندہ ہوتے تو حیران رہ جاتے کہ تغیر نے اُردو شاعری کو رومان اور تخیل کی اندھیری گپھاؤں سے نکال کر حقیقت کے کھلے میدان میں کیسی دیدہ دلیری سے لا کھڑا کیا ہے۔ (باقی)

معاصر (بانکے پور پٹنہ)

(ماہانہ)

مدیر علیم الدین احمد، پبلشر نیا سنسار کتاب گھر (بانکے پور پٹنہ)

چندہ سالانہ للعہ رقی پرچہ ۱۲ر سائز ۲۰×۳۰ سادہ و خوبصورت

صوبۂ بہار میں اُردو ادب سے دلچسپی تو ہمیشہ ہی جاتی رہی لیکن چند برسوں میں اس نے عملی طور پر جو قدم اٹھائے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیداری کی لہر بہار میں بھی دوڑ گئی، یقیناً یہ بات مسرتناک اور مبارکباد کے قابل ہے۔

معاصر کے دو نمبر ہماری نگاہ کے سامنے ہیں اس کے اداریہ ہی سے مدیر کی اصابت رائے اور ٹھوس قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ معاصر کے مقاصد کو مدیر معاصر ہی کے الفاظ میں سنئے۔

"معاصر میں مختلف اثرات اور نئے معیار نظر آئیں گے، لیکن کورانہ تقلید کے عوض، ان اثرات اور ان معیار کو اپنے ماحول اپنے مذاق کا صحیح لحاظ رکھتے ہوئے ایک نئے قالب میں تبدیل کیا جائے گا۔ ایسا قالب جو زندگی کا حامل ہو اور جس میں اجنبیت نظر نہ آئے"

پھر ایک جگہ قدامت اور جدت کے ایک معقول امتزاج کے [illegible] دلائل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"معاصر کی کوشش ہوگی کہ تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے [illegible] کو عملی صورت میں ظاہر کیا جائے اور [illegible] زندگی [illegible] شعور سے قریب تر بنا دیا جائے"

بہر حال معاصر کوئی محض [illegible] کا تجارتی مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب میں فکر کو دخل ہے [illegible] مضامین ہیں ان میں اعتدال کے ساتھ تغیر کی جھلک [illegible] رسالہ کی زندگی اہل بہار کو مستقل بنا دینی چاہئے [illegible] چیز ہے جس کو باقی اور جاری [illegible] اظہار رائے کروں گا۔

یومِ ادب گونڈہ

چند سالوں پہلے صرف مشاعروں میں ہندو مسلمان اسی طرح شریک ہوتے تھے، جس طرح آجکل مل جل کر بیٹھتے ہیں، باوجود سیاسی اختلافات اور ہزار دوری کے یہ اسٹیج ایک ایسا اسٹیج تھا اور ہے کہ یہاں ہندو مسلم پارسی، سکھ عیسائی کا کبھی سوال نہیں اٹھایا گیا مگر ہماری بدبختی کی انتہا ہے کہ ہم اس اسٹیج کو بھی گرا دینا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں ۵-۶ سال سے کوی سیلن (ہندی مشاعرہ) کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ جس میں محض ہندو ہندی شاعر ہی شریک ہوتے ہیں، ان جلسوں کو ابھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن بہر حال ان کا چلن ہوگیا ہے۔

ہندو مسلم ملاپ، اور ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں کوئی ایسی بات میرے علم میں نہیں ہے جس کو میں نے پہلا درجہ دیا ہو، میری سمجھ میں یہ چیز بالکل نہیں آئی کہ ایک طرف ہندو مسلمان (خاصکر ہندو بھائی) آپس میں ملنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف بنیادی چیزوں میں علیحدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یا میل کی آرزو جھوٹ ہے یا یہ علیحدگی پاگل پن ہے!؟ ہندوستانی ادب کا ایک مرکز ہونا چاہیئے۔ بغیر اس مرکزیت کے اُردو ہندی ادب میں اعتدال ہرگز پیدا نہیں ہو سکیگا۔

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ گونڈہ نے اس حقیقت کو محسوس کیا اور وہاں خواجہ مسعود علی ذوقی بی اے (علیگ) کے انتظام میں ایک ایسا آئیڈیل جلسہ ہو رہا ہے۔

ادبی دنیا خواجہ مسعود علی ذوقی بی، اے (علیگ کی ادبیانہ اور شاعرانہ کارفرمائیوں سے اچھی طرح واقف ہے، وہ سکون گذار سہی، لیکن خاموش کبھی نہیں رہے، اور کبھی کبھی وہ جوش و خروش اُن کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے ادبی دوستوں کی مایوسی کو بُری طرح ہار تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

خواجہ صاحب نے ۲۶ جنوری ۱۹۴۱ء کو ایک بالکل انوکھی ادبی بزم رچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ چیز ہندوستان کی ادبی تاریخ میں بالکل انوکھی ہوگی یہ اجتماع اعلیٰ پیمانہ پر ایک ایسے "یوم ادب"، کو پیش کرے گا جس کی مثال آج وقت تک دیکھنے میں نہیں آئی ہوگی

ملک کے تمام مشاہیر شعراء کو مدعو کیا گیا ہے: دن کی پہلی مجلس میں تمام حضرات اپنی شاعری کے متعلق خود نوشتہ تنقیدی مقالے پڑھیں گے، رات کو عظیم الشان مشاعرہ ہوگا۔ جس میں ہندوستان کے مشہور اُردو شعراء کے علاوہ ہندی کے نامی شاعر بھی شریک ہوں گے:

دن کو جو مقالے پڑھے جائیں گے وہ ۲۰ منٹ میں ختم ہونے والے ہوں گے، مقالے کے بعد ہر شاعر اپنی ایک ایسی نظم یا غزل سنائے گا جسے اپنے خیالات معتقدات اور مزاج شعری کا بہترین ترجمان تصور کرتا ہے۔

اسی دن دوسری نشست میں ادب کی دوسری اصناف کے متعلق کسی قدر طویل مقالے پڑھے جائیں گے مقالہ نگار حضرات [illegible] کی فہرست یہ ہے:

رشید احمد صدیقی	طنزیت
نیاز فتحپوری	ادبیت
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	ہندی اور اُردو [illegible]
آل احمد سرور	تنقید ادب
سیّد سلیمان ندوی	ارتقائے زبان
مجنوں گورکھپوری	زندگی اور ادب
مسعود حسن رضوی ادیب	مرثیہ کی ادبی اہمیت

دن کی مجلس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق [illegible] کی صدارت حضرت جگر مرادآبادی،

اس یوم ادب کی اہمیت ظاہر ہے اس کے نظام کی بنیادی [illegible] تجربہ اور ترقی کی طرف نئے اقدامات پائے جاتے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ [illegible] ادیبوں اور شعراء کے لئے مفید نہ ہو۔

اُردو زبان کا بالپن ہے یہاں سب سے زیادہ تنقید کا کال ہے جو حضرات بزعم خود نقاد بنتے ہیں، اُن کی روحیں نفرت اور محبت سے خالی نہیں ہیں وہ جانب داری اور پارٹی پالیٹکس یا درسے سے زیادہ ذلیل شے یعنی "ذاتی پسندیدگی" کے جذبے سے خالی نہیں ہیں۔ اِس ادبی دنائت سے جو سب سے بڑا نقصان ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ خود شعراء میں ناقدانہ نظر پیدا نہیں ہوئی اور وہ اپنی صحت دار نقد کا پیمانہ نہیں بنا سکے۔ بلاشک اِس یوم ادب کو کامیاب بنانا چاہیئے اور جو شعراء نثر لکھ سکتے ہیں یا تنقید کر سکتے ہیں اُن کو اپنے معائب اور محاسن آمادہ بیان کرنے چاہئیں اور جو نثر نہیں لکھ سکتے اُن کو ہمت کر کے لکھنی چاہیئے: عجیب دعوت و پیغام ہے۔ اگر ذرا بھی اس تحریک کی چولیں ڈھیلی ہوں تو ہم اس کو خواجہ صاحب کی فطری شوخی پر مبنی کرتے لیکن یوم ادب کی ہیئت

ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

١٢٩

ترکیبی بالکل انوکھی ہے۔ اسی لئے ہم اس کی کامیابی کا یقین رکھتے ہیں۔

مرزا ابراہیم بیگ

"سرگذشت" کے اڈیٹر مرزا ابراہیم بیگ صاحب کئی ماہ سے بیمار تھے آخر دسمبر کی ۲۸ کو ۱۲ بجے دوپہر اُن کا انتقال ہوگیا۔ مرزا صاحب نہ ادیب تھے نہ جرنلسٹ نہ شاعر، مگر ان کی ذہانت کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ یکایک سنہ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے "سرگذشت" کو جاری کیا اور کامل دس سال وقت کی پابندی کیساتھ جاری رکھا۔ انھوں نے کبھی مضمون نگاری نہ کی تھی، مگر جب مضمون نگاری کی تو معلوم ہوا کہ وہ فطرتاً مزاح نگار ہیں۔

اصل راز یہ ہے کہ وہ ایک وسیع ادبی خاندان کے چشم و چراغ تھے مرزا فرحان علی بیگ صاحب جو "صلائے عام" دہلی کے مخصوص لکھنے والے تھے اور ہمارے دوست عظیم بیگ چغتائی یا فہیم بیگ چغتائی، یہ دونوں صاحب مرزا ابراہیم بیگ کے قریبی عزیزوں میں سے ہیں۔

"سرگذشت" نے کیا کیا — !؟ یہ ایک سوال ہے، مگر اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس نے کچھ نہ ہو کر بھی بڑا کام کیا وہ "علیگرین" طبقہ جس [illegible] انگریزی [illegible] وہ ایک حرام زبان تھی، ابراہیم بیگ کے چٹکلوں کی وجہ سے اُردو کو دس برس تک پڑھتا رہا۔ دوسرا معجزہ یہ تھا کہ اس طبقے نے کبھی "اولڈ بوائے" تک کو زیادہ عرصہ تک جاری رہنے نہیں دیا مگر "سرگذشت" نے جو عمر پائی وہ حیرتناک ہے۔

مرزا ابراہیم بیگ نے صداقت کے ساتھ یونیورسٹی سے اخلاص برتا اور اس پر کڑی تنقید کے ذریعہ بیشک علی گڈھ کی بڑی خدمت کی۔

مرزا ابراہیم بیگ، نہایت دلچسپ، عالی ظرف، باہمت اور دوست پرست شریف انسان تھے، میں نے اُن کی شرافت اور نفس کی بلندی کے وہ مظاہرے دیکھے ہیں جن کی بنا پر میں اُنھیں اس دنیائے آب و گل کا غیر معمولی انسان کہتا ہوں، مگر افسوس دنیا غیر معمولی انسانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے۔

سُنا ہے کہ ظفر عمر صاحب نیلی چھتری والوں نے "سرگذشت" کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ ان کی بڑی محسن پرستی اور فرض شناسی ہے، بہرحال جب تک ہو مرزا ابراہیم بیگ کی اس یادگار کو باقی و جاری رکھنا چاہیئے۔

معاملات اور معلومات

ایشیا کا دسمبر نمبر آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ رسالہ کی اصلی ضخامت ۲۰ صفحے ہے لیکن یہ نمبر ۱۴۴ صفحات پر شائع ہو رہا ہے گویا ۸۰ صفحات مزید پیش کئے جا رہے ہیں۔ نومبر نمبر کے سلسلے میں واجب صفحات جنوری نمبر میں بڑھا کر پیش کر دیئے جائیں گے۔

جنوری نمبر کی کتابت و طباعت شروع ہوگئی ہے اور اُمید کی جاتی ہے جنوری سنہ ۱۹۴۱ء تمبر ۲۰ جنوری تک شائع ہوگا۔ اصل راز موجودہ زمانے کا شدید اقتصادی جمود ( ) ہے جو کم و بیش زندگی کے ہر پہلو اور سماج کے ہر طبقے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ آپ اس حقیقت کو جانتے ہیں اس لئے عفو و درگذر کی آرزو بے جا نہیں۔ کئی مضامین اس نمبر میں تمام اور شروع ہو رہے ہیں۔ وداع آخر کی آخری قسط شائع ہوگی۔ اب یہ کتاب حسب اعلان کتابی صورت میں بھی شائع ہوگی اور ادبی مرکز سے مل سکیگی۔

- -

ہے، اِن مسلسل کتابوں کی اشاعت سے مراد کوئی تجارتی فائدہ نہیں۔

اُردو ادب ترجمہ کے عہد سے گزر رہا ہے۔ یہ مرحلہ کسی زبان کی تعمیر میں نہایت ممد و معاون ہوتا ہے، اس سے بھڑکنا نہ چاہئے۔ اگر مجھے "گورکی . . . . . . اور ڈکنس جیسے لکھنے والے اُردو میں مل جائیں تو محض ان ترجموں کی اشاعت ہی پر اکتفا نہ کیا جائے، لیکن سوائے ایک دو حضرات کے اُردو میں تخلیقی ادب اُن صاحب لکھتے یا لکھ سکتے ہیں۔ !؟

جن حضرات کو زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع دی جا چکی ہے اُن کو اس مرتبہ وی، پی ارسال نہیں کئے جائینگے، واپسی سے دفتر کو سخت نقصان ہوتا ہے یاد دہانی کی گئی ہے اگر خریدار ہو جائیں تو شکریہ ورنہ کوئی شکایت نہیں ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

خریدار حضرات، دوست

اور تمام خطوط لکھنے والے حضرات معاملاتی خطوط پر "تجارتی" اور پرائیویٹ اور غیر تجارتی پر "ذاتی تحریر فرمادیا کریں، اس میں دفتر کو آسانی ہوتی ہے۔

جنوری نمبر ٹھیک اُس وقت شائع ہوگا۔ جب کئی سالنامے نکل چکے ہوں گے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ سالناموں کے ساتھ اُس پر بھی آپ نگاہ ڈال سکیں۔

نمایندے عام اطلاع کے لئے یہ شائع کرنا ضروری ہے کہ:۔ حسن مسعود صاحب (دہلی) اور ابراہیم صاحب برنی کو ایشیا کا نمائندہ مقرر کیا گیا تھا۔ اب یہ حضرات ایشیا کے نمائندے نہیں ہیں اور خاصکر حسن مسعود صاحب اگر جنوری ۱۹۳۳ء سے کسی صاحب کو ایشیا کا خریدار بنائیں گے اور اس کی اطلاع دفتر میں نہیں پہونچے گی تو ادبی مرکز ایشیا کو جاری کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

"نمونہ باز"

آیئے! آج آپ کو بالکل عجیب و غریب نسل سے ملائیں، یہ نسل ہے "نمونہ باز"، ہندو یا مسلمان، سکھ ہو یا پارسی، عیسائی ہو یا کوئی دوسری "دیسی" قوم، اِس نسل کے افراد ہر قوم میں ایک خاص تعداد میں پائے جاتے ہیں، اِس نسل پر دل میں طعن و تشنیع کرنے سے پہلے یہ یاد کر لینا ہوگا۔ خدا نخواستہ یہ نسل ذہن و دماغ سے عاری نہیں ہے، بلکہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔ لٹریچر سے اس کو دلی تعلق ہے۔ فلسفۂ اقتصادیات کی گہرائی کو جانتی ہے، اور اُلجھے ہوئے اقتصادی مسائل کے ساتھ لٹریچر کا مطالعہ کیونکر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اس راز سے یہ نسل خوب واقف ہے۔

ہر ماہ مختلف ناموں اور طرح طرح کے اسالیب خطوط کے ذریعہ اسکے افراد نمونہ منگاتے رہتے ہیں اور آپ کبھی ان کو گرفت نہیں کر سکتے صرف ۔۔ میں ہر ماہ ایشیا کا مطالعہ مغرب کے تمام ماہرین اقتصادیات کے تجربوں اور نظریوں سے فائدہ اُٹھا کر بھی ممکن نہیں۔

اب اِس نظام کو ذرا پھیلا کر دیکھیے کہ ۔ ر پیسے کے حساب سے ایک "نمونہ باز" ایک روپیہ میں بیس رسائل دیکھ سکتا ہے؛ یاد دہانی کے اخراجات کو بھی شامل کر لیجئے تو ۱۵ سہی۔

لیکن اقتصادیات میں شاید اس سے بہتر نظریہ اور کوئی نہ ہوگا کہ ایشیا اب اُن حضرات ہی کو نمونہ ارسال کرتا ہے جن کا لفافہ ٹکٹوں سے گلزار بنا ہوا آتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے حضرات جو محض نمونہ مفت حاصل کر کے رسائل پڑھنا چاہتے ہیں، ایشیا کا دروازہ اپنے اوپر بند خیال کریں۔

زبان کا معیار اور صحت

مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہندو قوم سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرتی ہے، اور اس طرح وہ اُردو کے مروجہ اسلوب کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ سمپورنانند جی کو "آداب عرض" سے ضد ہے۔ اور وہ اس زبان کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کرتے بلکہ مٹا کر رکھ دینا چاہتے ہیں، تاکہ اُن کو قدوائی صاحب کے سامنے کیبنٹ میں "آداب عرض" نہ کرنا پڑے۔

بعض ہندوؤں کو فارسی اور عربی کے لفظوں کے استعمال پر اعتراض ہے۔ لیکن ہمارا کوئی ہندو بھائی انگریزی سے نفرت نہیں کرتا۔ مسلمانوں کو ہندی لفظ اچھے معلوم نہیں ہوتے مگر انگریزی لفظ۔ گویا قرآن کی زبان کے الفاظ ہیں۔

بہر حال ہر طرف ایک نفرت اور فضول جاہلانہ شور و شر ہے کہ ما بین ایک دوسرے کے کلچر اور تمدن کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اسی شور و شر میں بعض اوقات سنگین قدم بھی اُٹھ جاتے ہیں، جیسے کہ سمپورنانند جی کا خطبۂ صدارت!

ہندی سے تو اس وقت بحث نہیں۔ لیکن میں ان دوستوں کو ضرور متوجہ کرتا ہوں جو ایشیا کے صفحات پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہتے ہیں کہ زبان کا معیار مزید لطیف اور آسان بنائیں: جاوید صاحبہ کا مضمون نہایت سخت زبان میں ہے۔ اس کو وہ شخص نہیں سمجھ سکتا جس کی نگاہ سے مذہبی لٹریچر نہ گذرا ہو۔ اور اس میں شدید الفاظ کی سخت بھرمار ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور ایشیا کے تمام نامہ نگاروں کو اس پر توجہ دینی چاہیئے کہ وہ آسان اُردو لکھیں جو ہندو مسلمان، بچوں نوجوانوں غرضکہ سب کی سمجھ میں آئے۔ آئندہ سے ایشیا ایسے مضامین کو شائع نہ کر سکے گا جو سادہ اور صاف زبان میں نہ ہوں گے۔

اُردو میں اس آسان اسلوب کی کمی نہیں ہے۔ پختگی کا اظہار شدید الفاظ سے نہیں ہوتا، آسان الفاظ کے خوبصورت استعمال سے ہوتا ہے۔

ایشیا دسمبر ۱۹۳۲ء

منیجر اور ایڈیٹر کی ضرورت

م۔ک۔م متین الحق صاحب کیفؔ مراد آبادی اپنی شدید علالت کی وجہ سے میرٹھ قیام نہ کر سکے اور انھیں ایشیا سے تعلق ترک کر دینا پڑا اس قدرتی مجبوری پر انھیں بھی افسوس ہے اور مجھے بھی ۔ لیکن ؎

کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

ایشیا کے تمام انتظامی اور ادارتی فرائض کا ادا کرنا میرے لئے ممکن تو ہے مگر میرے اندر جو شاعر ہے اسکی زندگی کی ضمانت میں نہیں لے سکتا پھر سرکارے اور ہر مردے، کہاں میں اور کہاں انتظامی معاملات" اسکے لئے علیحدہ ایک ایسے صاحب کی ضرورت ہے جو قدرتی طور پر تجارتی ذہنیت رکھتے ہوں اور اقتصادی طور پر ایشیا کی ترقی کی ضمانت دیں ۔ ایشیا کی ادارت کے علاوہ میرے پیشِ نظر، اپنی کتابوں پر نظرِ ثانی اور نئی کتابوں کی ترتیب و تحریر بھی ہے ۔ جس کو میں جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہونچانا چاہتا ہوں ۔ اس لئے ایک ایسے صاحب کی بھی ضرورت ہے جو ترجمہ سے لیکر ادارت اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام امور پر درک و مہارت رکھتے ہوں

قوم و مذہب کی کوئی شرط نہیں ہے ۔ لیکن چند باتیں لازمی ہیں جو میں اپنے ساتھیوں میں دیکھنا چاہتا ہوں ۔ (۱) شاعر اور عاشق نہ ہوں، صوفی اور فرقہ پرست نہ ہوں ۔ اور مجھے آقا اور خود کو ملازم خیال نہ کریں ۔ یعنی محض ملازمت نہیں مقصد کی امداد کے لئے میرا ساتھ دیں ۔ اور اگر انھیں میرے خیالات سے اتفاق نہ ہو تو خط و کتابت کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا ۔

کم از کم اڈیٹر کو تو میرا ہم خیال ہونا ہی چاہیئے ۔ انگریزی، ہندی، اُردو وغیرہ جاننا ظاہر ہے کہ اس کے لئے ضروری ہے، ورنہ ایک علمی ادارہ کا کاروبار نہیں چل سکیگا ۔!؟

میں جانتا ہوں کہ میرے احباب میں ایسے افراد کی کمی نہیں ، چاہیئے تو یہ تھا کہ جس طرح میں اپنی جان کھپا رہا ہوں، احباب میں سے میری صحت و درستی ہی کے لئے کوئی میرا ہاتھ بٹاتا ۔ لیکن یو۔پی میں ایسا خیال کرنا، محال اور جنوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔

منیجر اور اڈیٹر صاحبان کو ماہانہ معقول معاوضہ پیش کیا جائیگا ۔ لیکن میں اس معاوضہ کی قیمت صرف یہ وصول کرنا چاہتا ہوں کہ ایشیا کے ادارتی اور انتظامی معاملات سے بے نیاز ہو جاؤں اور میری عدم موجودگی میں تمام کاموں کی تکمیل کے کلی ذمہ دار منیجر اور اڈیٹر صاحبان ہوں ۔

اس سلسلے میں جنوری ۱۹۴۱ء کے آخر تک آئے ہوئے خطوط، مکاتیب، اور ذاتی ملاقاتوں سے میں یہ نتیجہ نکالوں گا ۔ کہ کون صاحب منیجری اور ایڈیٹری کے فرائض خوبصورتی اور تن دہی سے ادا فرما کر مجھے ممنون کر سکتے ہیں ۔!؟

ہر چند کہ یہ معاہدہ معاملاتی ہوگا، مگر جہاں کسی مقصد کی تکمیل پیشِ نظر ہوتی ہے وہاں صرف معاملاتی معاہدات کام نہیں آیا کرتے کوئی قلبی لگاؤ بھی مقصدِ ادب سے ہونا چاہیئے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بغیر ہم آہنگی کے ہو نہیں سکتا ۔

ساغر

SAGHAR

IN ENGLISH

Saghar's entire attitude and approach towards life is of youth, richly endowed with a passion for the history, romance, hope and freedom of his country. He is in every fibre of him Indian and his art is both drawn from and dedicated to his motherland."

SAROJINI NAIDU

The Urdu knowing world is already familiar with the message of this young and buoyant poet of the East.

It is a message of independence and national pride.

The Hindi Edition of Saghar's poems is already in the market and eagerly sought by lovers of poetry and literature.

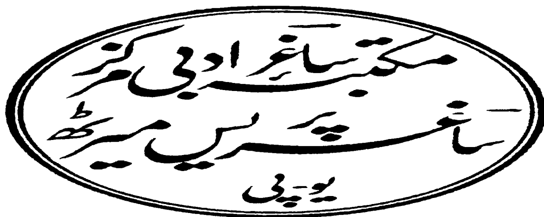
It is now translated into English for the benefit of English knowing world.

Price per copy Rs. 4-12 only. To those who order in advance it will be given for Rs. 3 only.

BOOK YOUR COPIES NOW TO AVOID DISAPPOINTMENT.

Manager, Adbi Markaz
MEERUT.
(India.)

Registered No A 656



Published by—

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.

ایشیا

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ
محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ
محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ بہار

زیر سرپرستی:- ڈاکٹر سید محمود

اڈیٹر
ساغر

اسسٹنٹ اڈیٹر
م۔ک۔م

ناشر
مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپے (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۵ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپے (دیگر ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

(جملہ حقوق محفوظ)
(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

فہرست مضامین ایشیا اکتوبر و نومبر ۱۹۴۰ء

ایشیا

جلد ۶ | اکتوبر و نومبر ۱۹۴۰ء | نمبر ۳ و ۴

حدیثِ جنگ و ستیاگرہ

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری!؟

ج

اعلیٰ ترین علمی اعزاز

ایشیا اس مسرت میں کہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر طبیعیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی بی۔ اے (عثمانیہ) ایم۔ اے (کیمبرج) پی' ایچ ڈی (لائزگ) کو اس سال طبیعیات کا نوبل پرائز ملنے والا ہے۔ رسمی طور پر شریک نہیں بلکہ ادارۂ ادبی مرکز کو وہ حقیقی افتخار اور خوشی حاصل ہوئی ہے جس کے پس منظر میں تمام ہندوستان کا فخر و مباہات کارفرما ہے۔

ڈاکٹر رضی کی تصنیف "کوانٹم ( ) کو جو گذشتہ سال جامعۂ عثمانیہ کی طرف سے شائع ہوئی، یورپ کے علماء نے خاص درجہ دیا اور اس محققانہ تصنیف نے اس درجہ متاثر کیا کہ نوبل پرائز کی کمیشن تحقیقات نے ڈاکٹر رضی کو نوبل پرائز پیش کرنے کی سفارش کی۔

ڈاکٹر رضی "کوانٹم" پر تصنیف لکھنے سے پہلے بھی اپنی علمی تحقیقات کے سلسلے میں مشہور اور معزز ہو چکے ہیں، اس مرتبہ اُن کو وقت نے اعلیٰ ترین نیا علمی اعزاز عطا فرمایا ہے، جس کے سلسلے میں تمام ہندوستانی قوم اُن کی ذات پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

یقیناً یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب ماہرِ ریاضیات ہی نہیں، ادب سے بھی ذوق رکھتے ہیں، شعر و سخن سے بھی لگاؤ ہے (کاش اس موقع پر آپ ہمارے دوسرے ماہرِ ریاضی کو نہ جوتے ہوں!؟) اُن کا اسلوبِ نگارش علمی مضامین کو ادا کرنے میں کامیاب ہے، اُن کی کتاب بھی انجمن ترقی اردو نے "اضافیت" کے عنوان پر شائع کی ہے جس کے متعلق نقادوں کی رائے ہے کہ انگریزی زبان میں بھی

الشا

اس موضوع پر اتنی سلیس اور عام فہم کتاب نہیں ہے۔

ڈاکٹر رضی حیدرآباد میں سنہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے، سنہ ۱۹۲۰ء میں منشی اور مولوی کے امتحانات میں اوّل درجہ کی کامیابی حاصل کی سنہ ۱۹۲۵ء میں جامعہ عثمانیہ سے ریاضی میں بی۔اے کی ڈگری لی، یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ ریاست حیدرآباد کا یوروپین اسکالرشپ حاصل کیا سنہ ۱۹۲۶ء میں کیمبرج جاکر سنہ ۱۹۲۸ء میں علم حساب کا اعلیٰ نصاب کامیابی کے ساتھ ختم کیا، سنہ ۱۹۲۸ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک برلن، گاٹنجن اور لائبزگ میں ریاضیات پر کام کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں لائبزگ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی سنہ ۱۹۳۱ء میں پیرس یونیورسٹی میں ریاضیات پر تحقیقی کام کرتے رہے، سنہ ۱۹۳۱ء میں وطن واپس آئے اور اب جامعہ عثمانیہ میں ریاضیات کے پروفیسر ہیں۔ خالص ریاضیات پر بھی آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور بھی کئی علمی فضیلتیں ان سے تعلق رکھتی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

یہ تو ہیں وہ محاسن علمی جو ڈاکٹر رضی کی ذات سے بلند ہوکر ہیں اُن کے مطالعہ اور تعارف کا ذوق پیدا کرتے ہیں، لیکن وہ محاسن علمی کے ساتھ ساتھ ذاتی و اخلاقی خوبیوں کے بھی حامل ہیں، انسان جب ملک و قوم بلکہ دنیا میں ایک ممتاز شخصیت حاصل کر لیتا ہے تو قدرتی طور پر ہم اُس کی ذاتیات کی طرف بھی نظر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ بحیثیت انسان بھی وہ ایک اچھے انسان ہیں اور اُن کے دوستوں کو اُن سے مل کر مایوسی نہیں ہوتی۔

اس وقت تک ہندوستان میں صرف سر رابندر ناتھ ٹیگور اور سر سی۔ وی رامن کو نوبل پرائز ملا تھا لیکن اِن دونوں بزرگوں کو یہ خصوصیت اُس وقت حاصل ہوئی جب عمر کی تلخی انعام کی شیرینی کو دبا دیا کرتی ہے، مگر ڈاکٹر رضی کو یہ خصوصیت اور اعلیٰ ترین علمی اعزاز اس وقت حاصل ہوا ہے کہ نوجوانی نے اُن کی دوستی سے انکار نہیں کیا ہے اور عطیۂ مغرب کے صحیح پرتو پڑنے کا کامل امکان ہے۔

قصاص

محبت کتنی بے

حواس ہے !؟ مولانا احسن مارہروی کی موت کی خبر شبیر صاحب مارہروی نے مارہرہ اور ایٹہ کے راستے میں سنائی جب کہ وہ میرے ہم سفر تھے اور ڈاکٹر ضیائے عباس صاحب ہاشمی (حیِّ و قائم) کے متعلق موت کی روح فرسا و دل گداز افواہ بدایوں میں سُنی، میں غم سے بے تاب ہوگیا اور ایک مختصر سا نوٹ ایٹہ ہی سے مرکز کو روانہ کردیا تاکہ ستمبر نمبر میں شائع کردیا جائے۔ مرکز پر آیا تو گوالیار کا ایک خط ملا جس سے اس خبرِ بد کی تردید ہوگئی۔ نوٹ چھپ چکا تھا، براہِ راست تصدیق کا موقع نکل چکا تھا ایک اندوہ ناک یقین کے سوا چارہ کیا تھا !؟

اس کے بعد میں کشمیر چلا گیا۔ ۱۷ راکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء کو ضیائی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ دلچسپ خط وصول ہوا جس کو ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ ضیائی صاحب کے دوستوں اور دنیائے ادب کے لئے اس سے زیادہ خوش خبری اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ خبرِ بد محض افواہ تھی جو ضیائی صاحب کے چھوٹے بھائی ابنِ عباس صاحب مرحوم کی روح فرسا موت کے واقع ہوجانے سے ایک غلط فہمی بن کر بدایوں اور میرٹھ تک پہونچی۔

ابنِ عباس صاحب مجسٹریٹ (گوالیار) کے کلکٹر تھے، ادیب و ادب پرست، شعر و ادب سے بدرجۂ کمال ذوق تھا، ہر وقت دیوان غالب ساتھ رہتا تھا سوتے بھی تو تکیہ کے نیچے رکھ کر سوتے تھے، مرنجاں مرنج، متواضع اور دوست پرست، یہ اُن کی ذاتی اور ادبی خصوصیتیں تھیں، لیکن اس سے بھی بلند اِن کی ایک اور بھی اشرف خصوصیت ان کی قوم پرستی تھی وہ لفظاً اور عملاً ایک سچے قوم پرست تھے۔ زندگی اور ہندوستان کی سیاسیات کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ قطعی Nationalist تھا ایک ایسی شخصیت کا ہم میں سے اُٹھ جانا سوسائٹی اور قوم کا کم نقصان نہیں ہے۔ خاصکر ایسی حالت میں کہ لوگوں کے دماغی سانچے فرقہ پرستی کی ضربوں نے ہلا دئے ہیں اور ملک میں نفاق اور جانبداری کی تند و تیز آندھیاں چل رہی ہیں۔

یہ محض ایک رسمی بات ہے کہ ڈاکٹر ضیائی کی خدمت میں اُن کے محبوب بھائی کی روح فرسا موت پر اظہارِ غم کیا جائے مگر یہ سنگدلی بنی نوع انسان کی تقدیر ہے۔۔!؟

آیئے اب آپ کو وہ دلچسپ خط سنائیں جو ڈاکٹر ضیائی نے اپنی موت کی تردید میں اپنے قلم سے لکھا ہے:

مکتوبِ ضیائی

موتی محل گوالیار
۱۵ راکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

عزیز مکرم سلمہ اللہ تعالےٰ۔

ستمبر سنہ ۴۰ء کا "ایشیا"، نیّر ضیا بیگم کے پاس پہونچا۔ اُس سے اُس حادثہ کا علم ہوا جو ضیائی کی موت سے اُس کے احباب کے قلب پر گذرا۔ عزیزی ساغر! مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ ادبی

حلقہ میں میری موت کا ایسا حسین ماتم کیا جائے گا
مجھے آپ کے ایسے پُرخلوص اظہارِ غم پر واقعی ناز رہے گا
اور اس غلط خبر کا مجھ پر تاحیات احسان رہے گا
کہ اُس نے مجھے "ساغر" کے پُرخلوص جذبات پر آگاہ
کردیا۔ ہزارہا برس گذرے جب ایک شعر کہا تھا، یہ
اُس وقت کی بات ہو جب آپ آگرہ میں تھے ؎

مرے مرنے کا سنتا ہوں کہ اُن کے گھر میں ماتم ہے
خوشا حالِ تباہِ عشق ہ چشمِ حسن پُرنم ہے

بھائی واقعہ اس قدر ہے کہ گذشتہ ماہ جون میں میرے عزیز بھائی ابن عباس عباسی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم حقیقی بھائی تھے مجھ سے چھوٹے تھے، ریاست گوالیار میں وہ بھی صوبہ تھے اور میرے بہت ہمشکل تھے، اکثر لوگوں کو ہم بھائیوں پر ایک کا دوسرے پر مغالطہ ہوجایا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے کسی نے تمھیں بھی لکھ دیا ہوگا یا اُس کا مقصد ابن عباس لکھنے کا ہوگا اور وہ ضیائی عباس لکھ گیا ہوگا

مجھے ندامت ہے کہ عرصہ سے میں کوئی خط نہ لکھ سکا۔ مگر میں اس زمانہ میں اس قدر پریشان رہا ہوں کہ بیان نہیں کرسکتا۔ میرے ابتلا کا اندازہ اسی سے کرلو کہ جس دن سے "ایشیا" ملا ہے، نیّر بیگم روزانہ تقاضا کرتی ہیں کہ تردید کے واسطے ساغر کو خط لکھ دو، مگر مجھے چار سطریں لکھنے کی فرصت نہ ملی۔

میں مارچ ۱۹۳۶ء میں صوبہ مقرر ہوا اور ضلع سردار پور میں تعیّن ہُوا، آج تک وہیں ہُوں۔ البتہ تقریباً گیارہ مہینے سے ایک خاص کام کے واسطے یہاں طلب کرلیا گیا ہُوں اور لشکر میں ہوں، غالباً ایک آدھ مہینے اور یہاں قیام رہے گا اس کے بعد اپنے ضلع کو واپس جاؤں گا۔
اپنی مفصل خیریت لشکر۔ دانا اولی کے پتہ سے لکھو۔
زیادہ شوق

ساغر کا ضیائی (کہو مرحوم)

(نہیں، زندہ و تابندہ و پائندہ باد)

ضیائی صاحب یا اُن کے متعلقین خاصکر اُن کی بیگم نیّر صاحبہ سے "محبت انگیز حواس باختگی" کی معافی کا امکان مکتوب ضیائی کے بعد قطعی غیر آئینی ہوگیا ہے۔ ایشیا کے صفحات پر مار ڈالنے کا انتقام ضیائی صاحب نے جن الفاظ میں مجھ سے لیا ہے
——— !؟ آپ ہی خدا لگتی کہئے کیا کم "قصاص" ہے۔ !؟

بھائی جان!

غور کیجئے تو کہاں تک کیجئے؛ ابن آدم کی بے چارگی اور ظرف لامحدود ہے۔ بے چارگی تو اس لئے کہ بے چارگی ہے، اور ظرف اس لئے کہ یہی تو اک شے انسان کے پاس ہے جو اس کی زندگی کا پیمانہ ہے۔ دیکھنے کی قوت کے ساتھ بے بصری، احساس کے ساتھ نفرت و محبت، مسرت کے ساتھ غم، اور زندگی کے ساتھ موت، قدرت نے مقدر کردی ہے۔ دوسری دنیا پر تو جب غور ہوگا، ہوگا، یہاں دنیا کی یہ عریاں حقیقتیں بجائے خود اک دعوتِ فکر ہیں۔

آپ کہیں گے جبرِ قدرت، رسمی مذہب پرست کہیں گے انسانی بے چارگی۔ میں کہوں گا یہ ابن آدم کا خلقی ظرف ہے ورنہ کلیجہ دیکھو اس ہڈیوں اور گوشت کے چلتے پھرتے ڈھانچے کا کہ باپ جوان بیٹے کو، بیٹا محبت کرنے والے باپ کو، عاشق محبوبہ کو، محبوبہ عاشق کو، ماں جگر گوشہ کو، اور بچہ ماں کو اپنی آنکھوں سے دم توڑتا دیکھے۔ اور زندہ رہے !؟

یہ تو وہ تعلقات ہیں" جو حادثاتی" ہیں لیکن" دماغی اتحاد" جو یکساں تقاضوں کی بنیاد پر متحد کرتا ہے اور دل لگاؤ کو بھی اپنا تابع کردیتا ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اُس دوست کو ابدی طور پر کھو دیتا ہے جس کے دماغ میں داخل ہوکر وہ دل کی مملکت پر چھا گیا تھا ——— !؟

اس گم شدگی کے بعد بھی وہ چلتا ہے، دوڑتا ہے اور زندہ رہتا ہے کیا یہ کم ظرف ہے کہ" بھائی جان" اس دنیا سے اُٹھ جائیں اور اُن سے محبت کرنے والے زندہ رہنے پر مجبور ہوں"۔

بھائی جان ٹونک کے رہنے والے تھے ان کی عمر ۶۰ برس کی تھی دبلے پتلے، ایک ٹانگ میں خفیف سا لنگ، سادہ قدیم وضع کا لباس، شرعی پائجامہ کرتا، کپڑے کی ٹوپی، بڑی بڑی مستی سے جھکی ہوئی آنکھیں، تل چاولی داڑھی سجتی

ہوئی تھی، تنہا شخص ہو کر ہزاروں انسانوں کے دل میں بستے تھے۔ پورا نام احمد حسین خاں صاحب عاشق، ریاست ٹونک کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ مولانا حالی اور ظہیر دہلوی سے عام طور پر اور مرزا داغ دہلوی سے خاص طور پر شرف تلمذ حاصل تھا، علوم مشرقی کے ماہر تھے، ہندی ادب میں کامل وقوف حاصل تھا وہ پرانے ماحول کی ایک ایسی شمع تھے جو بجلی کے عہد میں بھی اپنی جوت جگاتی رہی۔ عیش رفتہ کی خاکستر پر شعر و موسیقی میں تمام عمر گذار دی، پرانی محفلوں سے آنکھ گرمائے تھے، نئی بزم والوں کی گرمی کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتے تھے آنکھیں کنول اور دل زعفران کے پھول کی طرح شگفتہ، مسلمانوں کی بربادی اور اپنے شاندار ماضی کی تباہی کو قہقہوں اور بذلہ سنجیوں میں اُڑاتے تھے، غم نے بھائی جان کو سرتاپا محبت بنا دیا تھا۔

بھائی جان مرزا داغ دہلوی کے سچے معتقد تھے، انھوں نے اپنی شاعری کو لفاظی اور غلط و مہمل فلسفہ نگاری سے بالکل ملوث نہیں ہونے دیا۔

رسمی غزل کی انفرادیت محفوظ رکھی، اُن کے تغزل کے عناصر سلاست زبان اور معاملہ نگاری دو بڑے عناصر گھلے ملے پائے جاتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں مولانا سیماب اور میری آمد و رفت نے ٹونک کی شاعری کو کہیں غلط اور کہیں صحیح طور پر متغیر کر دیا۔ اکثر شعراء نے نیا رنگ اختیار کر لیا لیکن بھائی جان نے اپنی غزل کو آنچ نہ آنے دی نئی آگ اُن کے تغزل کے خس خانے سے دور دور ہی بھڑکتی رہی:

ظاہر ہے کہ ٹونک ریاست ہے، اور اس کے کچھ تقاضے ہیں، اِن تقاضات کی رو سے وہ دربار ٹونک میں محترم ہستی تھے:

مرنے والے کے ساتھ زندوں کا تعلق کوئی وقعت کی چیز نہیں، ہاں مرنے والے کو جو میری ذات سے لگاؤ تھا اس کو سوچتا ہوں تو زمانے کے آلام سے کچل کچل کر ڈھیٹ ہو جانے والا دل بھی بے چین ہو جاتا ہے، اک دھواں سا روح میں اُٹھتا اور دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ مگر اس دھوئیں کے باوجود مجھے زندہ اور روشن رہنا ہے،

مجرمانہ تاخیر

۔ اکتوبر و نومبر نمبر مجرمانہ تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اخلاقی طور پر اس جرم کی سزا سخت سے سخت ہونی چاہیے اور اصولی طور پر یہ طریقہ نہایت بددلی پیدا کرنے والا ہے، یہ صرف بددلی بلکہ کسی رسالہ کے تاریک مستقبل کا خود ہی اعلان ہے۔

میں جانتا ہوں کہ معافی یا وعدہ اس مجرمانہ تاخیر کی ہرگز تلافی نہیں اس کی تلافی تو صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ مشاعرہ منعقد کرنے والے عوام و خواص اور خود میں اپنے اخلاق کو درست کریں!؟

آپ حیران ہوں گے کہ وہ کونسی بداخلاقی ہے کہ جس کے سلسلے میں میں قوم کی قوم اور اپنی ذات کو مجرم کہہ رہا ہوں! آئیے اس کی کہانی سنئے:۔

کشمیر کی بزم ادب نے ایک ہفتہ کے لئے مجھے یاد فرمایا لیکن ٹھیک ایک ماہ میں آزاد کیا۔ ہر چند کہ بزم ادب سرینگر اور اہالیان کشمیر کی محبت و اخلاص کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن سوال تو اُن فرائض کا ہے جو آپ نے مجھ سے متعلق کر دیئے ہیں، اُن فرائض کا غیر مشروط طور پر ادا ہونا میری درستگی اخلاق ہے ورنہ مجھ سے زیادہ بد اعمال شخص کوئی نہیں ہو سکتا۔!؟

اگر شاعر اور غیر شاعر میں کوئی امتیازی فرق ہو اور شاعر خود "بے شعور" سہی لیکن دوسروں میں شعور پیدا کرنے کا مدعی ضرور ہے تو اولی الذکر (یعنی ادبی مجالس کے کرتا دھرتا) کی درستگی اخلاق کا نہ صرف سوال اُٹھ جاتا ہے بلکہ شاعر پر ایک مزید جرم عائد ہوتا ہے کہ وہ خود صالح اخلاق کا نمونہ کیوں نہیں بنتا؟

یعنی ضرورت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں اپنی اصلاح کروں اور مجرم ایک ہی ہے اور وہ میں ہوں جس کی وجہ سے ایک پبلک ادارہ کو ایسی سخت اصولی تجارتی شرمندگی اُٹھانی پڑی جو تقاضائے تجارت کے تحت خلاف ہے اور بدنظمی اور کم احساسی کی چغلی کھاتی ہے۔

یہ تو تھی وہ حقیقت، جسے میرے دل نے محسوس کیا اور آپ سے صاف صاف بیان کر دیا لیکن کشمیر جانے سے قبل میں جو انتظامات دفتر اور پریس میں کر گیا تھا، م۔ک۔ حسن صفائی کی شدید علالت نے اُن اہتمامات کو باقی نہیں رکھا۔ پھر بھی میں اُنھیں ذمہ دار قرار نہیں دیتا اور سمجھتا ہوں کہ جو کچھ فرو گذاشت ہے وہ میری ہی ہے، یقین کیجئے کہ اس تاخیر کے سلسلے میں میرے ضمیر نے مجھے جو سرزنش کی ہے وہ اتنی بڑی سزا ہے کہ کوئی جابر اتنی سخت سزا مجھے نہیں دے سکتا۔ اب آپ کا معاف کرنا یا معاف نہ کرنا آپ ہی کے رحم و جبر پر موقوف ہے!؟

رہی معاملاتی صورت، اس کے متعلق ادارہ ایشیا وعدہ کرتا ہے کہ دسمبر نمبر سو صفحات کا اور جنوری نمبر دو سو صفحات کا شائع کیا جائیگا۔ اس طرح نومبر نمبر کے سو صفحات آپ کو جنوری ہی میں ادا ہو جائیں گے۔ اگر اکتوبر نومبر مشترک نمبر نہ بنتا تو یہ اور بھی نقصان دہ بات تھی۔ اس لئے اس نمبر کو "اکتوبر نومبر" کے نام سے شائع کیا جاتا ہے۔ تاکہ دسمبر نمبر ٹھیک ۲۰ دسمبر کو آپ کی خدمت میں پہنچ جائے۔ یعنی اب نومبر نمبر کا آپ انتظار نہ فرمائیں۔

احساسِ برتری

مسٹر آئی۔ اسٹیفنس تین سال تک دہلی میں پبلک انفرمیشن بورڈ Public Information Board کے ڈائرکٹر رہے ہیں۔ اُنھوں نے میعاد سے قبل ہی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا تھا وہ آجکل اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ کے عملہ میں ہیں۔ ملازمت ترک کرنے سے قبل اُنھوں نے ایک مضمون دہلی کے اخبار نیشنل کال مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا جس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے، اُنھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے تاریخ میں اعلیٰ قابلیت کا امتحان پاس کیا ہے اور ممالک متحدہ صوبہ آگرہ اودھ کے سابق گورنر کی بیوی کے عزیزوں میں سے ہیں۔

انگلستان میں جب کوئی شخص ہندوستان سے رخصت یا پنشن لے کر واپس آتا ہے تو بعض لوگ اُس کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور اکثر لوگ اُس کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، تاوقتیکہ اس امر کے خلاف کوئی قوی ثبوت نہ ہو اُس سے مختلف باتیں منسوب کی جاتی ہیں، خصوصاً جب کہ وہ کسی اعلیٰ ملازمت کا فرد رہا ہو، یا فوجی افسر ہو، اور ادھیڑ عمر کا ہو، مثلاً یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ یقیناً وہ مغرور ہے، اپنے درجے کا اُس کو خیال ہے، اور وہ قدامت پرست ہے۔ کوئی چیز ساڑھے سات بجے شام کے بعد سوائے ڈنر کے نہیں کھا سکتا، صبح کو چا پیئے بغیر پلنگ سے اُٹھ نہیں سکتا اور ریلوے اسٹیشن پر اپنا سوٹ کیس نہیں لے جا سکتا۔ شراب بہت پینے والا ہے جس کا اثر اُس پر کچھ نہیں ہوتا، اور بڑے جانوروں کو ذبح کرنے کا بے حد شائق ہے، اور اگر اُس کی حیثیت اتنی نہیں ہے تو چھوٹے پرندوں کا شکار کھانے والا ہے۔ سمجھدار لوگ اُس سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے وبا سے کیونکہ کوئی بھی یہ یقین نہیں رکھتا کہ وہ کسی نئے خیال کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے اُس پر سنجیدگی سے بحث کرنے کا تو ذکر ہی کیا، نوکرانیاں اُس کے دروازے پر جانا پسند نہیں کرتیں کیونکہ وہ اُس کی عادات غیر معمولی اور اُس کے طریقوں کو مذموم پاتی ہیں جیسے اُن کو کبھی سابقہ نہیں ہوا تھا۔

یہ بدنصیب شخص ایک مرتبہ پھر معمولی انگریزی زندگی کے بہتے دریا سے غالباً نکلنے کی فکر میں لیکن اپنے بے پروا ماحول کو جو مخالفانہ نہیں اپنے خیالات اور اپنے کارناموں کے خلاف پا کر آخر کار اپنی جنس کے آدمیوں میں پناہ گزین ہوتا ہے مثلاً چیلٹنہم یا قلیٹ میں، جو ہندوستانی سرکاری افسروں کے لئے خاص مقامات ہیں۔ اگر اُس کو پھر مشرق کی طرف جانا نہیں ہے تو وہ وہاں آباد ہو جاتا ہے اور اپنے ہمسایوں سے پچھلے کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔ گورنمنٹ کی کمزوریوں پر خفا ہوتا ہے اور اپنے ماتحتوں کی گستاخیوں پر غصہ ظاہر کرتا ہے اور اپنی موجودہ حالت کا رونا روتا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اُس کو اُس سے کہیں زیادہ پنشن ملتی ہے جو وہ کسی دوسرے ملک سے لے کر آتا۔

(ف)

اس افسوسناک حالت کے باعث ہندوستان اور ہندوستانی ہیں بیشک اس شخص کو آب و ہوا سے بھی کچھ نقصان پہونچا ہے، دل و دماغ کی طاقت کو گرمی اور ایشیائی آفتاب کی بھون دینے والی کرنیں نقصان پہونچاتی ہیں اور وہ گرم ممالک کے ایک یا دو مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن خاص مصیبت عدم الانسان کی وجہ سے ہے، ہندوستان میں آنے کے بعد یہ مریض شروع ہی سے خوشامد اور چاپلوسی میں محصور ہو جاتا ہے اور اس کو ایسے ذمہ داری کے کام کرنے کی جرأت دلائی جاتی ہے اور وہ احکام جاری کرائے جاتے ہیں جو اپنے ملک میں وہ کبھی نہ کر سکتا تھا یا جب تک کہ وہ ادھیڑ عمر کو نہ پہونچ جاتا یہ بات خصوصاً اُس وقت زیادہ ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے آگے خدا کے فضل سے حروف آئی۔ سی۔ ایس I. C. S. لکھ سکتا ہو، اس خاص سرکاری ملازمت کے لئے نہایت ہوشیار گریجویٹ لے جاتے ہیں جو برطانیہ کی یونیورسٹیوں سے ہر سال نکلتے رہتے ہیں اور اگرچہ علمی معیار اب پہلے سے کم ہو گیا ہے لیکن داخلہ کا امتحان یا نامزدگی کا معیار بہت سخت ہوتا ہے۔

یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام آدمی ہر وقت ملاقات دلچسپ ہوں گے

ایشیا

لیکن عام طور پر (چند بظاہر اور خوشگوار مستثنیات کو چھوڑ کر) سمجھدار لوگوں کے حلقوں میں یہ اگر ۳۵ برس سے گذر گئے ہوں تو خود اپنے ملک میں کم قابل التفات ہوتے ہیں۔ بے شک ہندوستانی فوج کے افسروں یا دیگر سرکاری ملازمتوں کے آدمیوں جیسے ہندوستانی جنگلات کے ملازم یا انجنیئر وغیرہ سے یہ اور بھی کم قابل التفات ہوتے ہیں ان میں اُس وقت تک کوئی نہ کوئی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ کی تیزی و براقی جس کی بدولت اُنھوں نے یونیورسٹیوں میں امتیازات حاصل کئے اور ان کو ہندوستان میں معزز عہدے ملے اگر بالکل نہیں جاتی رہتی تو کم از کم خراب ضرور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ علم الانسان کا یہ معمولی مسئلہ ہے کہ تقریباً مطلق العنان طاقت کی استعمال سے زیادہ کوئی چیز دل و دماغ کی عمدہ قابلیتوں اور انسان کے چال چلن کے لئے مہلک یا نقصان دہ نہیں ہے۔

مجھے خوب یاد ہے جب سات سال پہلے میں نے بمبئی میں پہلے ہی دن اپنے ایک انگریز ملاقاتی کے مطلق العنان اختیارات اور اُس کی شان و شوکت پر حیرت محسوس کی۔ میں کبھی پہلے یورپ باہر نہیں گیا تھا۔ میرا ہندوستان آنا زیادہ تر خلاف توقع ہو گیا۔ مجھ کو تیاری کے لئے بہت کم وقت دیا گیا اگرچہ میں نے وہ ابتدائی تعلیم جو سرکاری ملازمتوں کے ایک باقاعدہ امیدوار کو دی جاتی ہے حاصل کر لی تھی میں ۲۷ سال کا تھا میرا خاندان معزز لیکن غیر ممتاز تھا۔ البتہ اوسط درجے کے برطانوی خاندان سے مافوق تھا کیمبرج میں ایک ذہین نوجوان کی طرح میرے خیالات میں کسی قدر مخالفت کا پہلو ضرور رہتا تھا اور میں تعطیلات کے دنوں کو خوشی سے بسر کرتا تھا پیدل چلتا تھا یا سائیکل پر جاتا تھا، خشک گھاس پر سو جاتا تھا وغیرہ یا پہاڑی جھونپڑیوں میں بسیرا لیتا تھا۔ بمبئی پر جب کہ میں جہاز سے اتر رہا تھا ایک سرخ سنہری پگڑی باندھے ہوئے شخص نے بڑی عزت سے میرے ایک دوست کی چٹھی (جو گورنمنٹ ہاؤس میں ملازم تھا) میرے حوالے کی اور مجھ سے کہا کہ آپ کا سامان کسٹم ہاؤس سے آپ کی موجودگی کے بغیر نکال لیا جائے گا، یہاں آپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور آپ کار میں بیٹھ کر ناشتہ کے لئے تشریف لے جائیں۔ اگلے روز وردیاں، سلامیاں اور جھنڈے نہایت ادب و احترام کے ساتھ دیکھ کر حیرت ہوئی، خاموش رفتار ملازموں کا ایک جھنڈ تھا جو بڑے بڑے کمروں میں مودب آتا جاتا تھا۔ یہ در اصل اُسی شان و شوکت اور دولت کا مظاہرہ تھا جو بکنگھم کے شاہی محل میں پایا جاتا ہے اگرچہ میں وہاں کبھی نہیں گیا کیونکہ وہاں با ادب حوالوں سے جو "ایچ۔ ای" کے الفاظ کے ساتھ ہوتے تھے۔

میں حیران ہو گیا۔ آخر کار مجھے معلوم ہوا کہ ان الفاظ کا اشارہ گورنر کی طرف ہے جس سے میں نے چند سال پہلے ہاتھ ملایا تھا جب کہ وہ ایک کمپنی کا ڈائرکٹر تھا اور مجھے اِس بات کا کچھ خیال بھی نہ رہا تھا۔ ہر شخص بجید مہمان نواز، راحت رساں اور خوش مزاج تھا مجھے یاد ہے کہ جب میں ریل میں بیٹھا جو جانب شمال جا رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ ہر اُس شخص کے لئے جو عرصہ تک اس قسم کے ماحول میں رہے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی روح کو تمکنت کی آلودگی سے بچا سکے خصوصاً جبکہ ہر ہندوستانی جس سے اس کو ملنے کا موقع ملتا ہے بظاہر اُس کے اندر یہ برا مادہ پہونچانے کی کوشش میں نظر آتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی روایات و تاریخ اور خصوصاً ذات پات کے جھگڑے اس ملک کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ نفرت انگیز بنائے ہوئے ہیں اور اس کے غیر جمہوری رجحانات اُن آدمیوں کے دماغوں پر جو انگریزی اعلیٰ متوسط طبقہ یا چھوٹے امراء کے طبقہ سے لئے جاتے ہیں جیسا کہ زیادہ تر ہندوستان میں سفید کھال کے ملازمین ہیں اثر انداز ہوتے اور اُن کے پوشیدہ جذبات کو اُبھارتے ہیں تقریباً ہر انگریز اپنے اندر اکڑفوں کا مادہ رکھتا ہے۔ ادنیٰ متوسط طبقہ اعلیٰ متوسط طبقہ سے اور بھی زیادہ۔ صرف واقعی امراء، ذہین و فہیم اشخاص اور مزدوروں کے طبقے اس سے آزاد ہیں، ہندوستان کو ان آخر الذکر طبقوں سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے اور چونکہ یہ ملک ہر اُس چیز کا جو خلاف جمہوریت ہو مادی مسکن ہے صرف کچھ کسانوں اور قوم پرستوں کو مستثنیٰ کر دیجئے لہٰذا جس قسم کے انگریزوں سے اس ملک کو واسطہ پڑتا ہے ان کے اندر اس مادّہ کو اُبھرنے اور گرم ملک میں پھیلنے کے لئے کچھ بھی دقت نہیں ہوتی۔



ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

۱۰ اکتوبر و نومبر

مرزا غالب کے چند غیر مطبوعہ اشعار

تبرکات غالب

مختار الدین احمد آرزو

میرزا غالب ہزار اپنے دیوان کو "دیوان بے رنگ" کہا کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو شہرت اور مقبولیت دیوان اردو نے حاصل کی فارسی کو نصیب نہیں۔
ابھی حال میں دیوان غالب کے دو قدیم مطبوعہ نسخے ہماری نظر سے گذرے ایک مفید خلائق آگرہ میں ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا اور دوسرا دہلی سے ۱۸۶۱ء میں۔ ممکن ہے اس
سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہوں اس مدت سے آج تک بیسیوں اڈیشن شائع ہوئے جس میں وہ اڈیشن بھی شامل ہے جو مرے بسے کاغذ پر ۲ کی قیمت کو ملتا تھا اور مطبوعہ جرمنی
اور مرقع چغتائی بھی جس کی قیمت سینکڑوں روپے تھی۔ ایک مدت کے بعد نسخہ حمیدیہ بھی شائع ہوا جس میں مرزا کے وہ اشعار بھی ہیں جو کسی متداول نسخے میں نہیں ملتے۔ لیکن
اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اشعار مندرجۂ دیوان کے علاوہ ان کے اور اشعار نہیں ہیں۔ اگر تفحص اور تلاش جاری رکھی جائے تو اب بھی سینکڑوں اشعار مل سکتے ہیں
ہم ناظرین کی ضیافت کے لیے ایک نادر اور جو مخطوطہ "عمدۃ المنتخبہ" مرتبہ سرور سے مرزا کے بعض اشعار درج کرتے ہیں۔ جو دیوان کے کسی نسخے میں نہیں۔

اعظم الدولہ سرور دہلی کے عمائدین سے تھے۔ تذکرہ سرور ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں لکھنا شروع کیا اور ۱۲۲۶ھ یا ۱۲۲۵ھ میں تمام کیا لیکن اس کے بعد بھی
معلوم ہوتا ہے کہ اضافے کرتے رہے۔ ورنہ غالب کا ذکر اس میں نہ ملتا کہ آپ کا سال ولادت ۱۲۱۲ھ ہے اور ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۲۶ھ میں وہ ۴ یا زیادہ سے زیادہ ۱۴ برس
کے ہوں گے۔ اس مختصر سی عمر میں ان کی شاعری نے اس قدر ترقی نہ کی ہوگی کہ سرور جیسا شخص ان کے بارے میں "درفن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا بیدل در ریختہ
و محاورات فارسی موزوں می کند بالجملہ موجد طرز خود است" اور "روبہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد" لکھتے۔
دوسری بات یہ کہ غالب کے سرور کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔ جیسا کہ خود سرور کے الفاظ "و باراقم رابطہ یک جہتی مستحکم دارد" سے ظاہر
ہوتا ہے اور یہ بالکل بعید ہے کہ اعظم الدولہ سرور ایک ۱۴ برس کے بچے کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات رکھتے۔
"پنج آہنگ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور غالب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا اور احمد بیگ تپاں مقیم کلکتہ کا حال اور کلام بھی ان
تذکرے کے لیے دیا تھا۔ غالب کا حال اور کلام تو تذکرہ سرور میں درج ہے لیکن معلوم نہیں کہ تپاں کا حال کیوں نہ درج ہو سکا۔
عمدۃ المنتخبہ ایک نادر اور کمیاب تذکرہ ہے۔ یوروپ میں اس کے بہت کم نسخے نظر آتے ہیں۔ ہمیں ہندوستان کے قابل فخر محقق جناب قاضی عبدالودود صاحب
بی۔اے کینٹب بیرسٹر کا ممنون ہونا چاہیے جو وہاں سے بعض نادر تذکروں کی نقلیں یا اقتباسات لائے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں سنگ بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں
اب ذیل میں تذکرۂ سرور سے غالب کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

"اسد اللہ خاں اسد الملقب مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش اکبرآباد، جوان قابل یار باش، دانشمند، ہمیشہ بہ طرش معاشی بسر بردہ، ذوق ریختہ گوئی در
خاطر شکن، غمہائے عشق مجاز، تربیت یافتۂ نگارندۂ نیاز، درین سخن سنجی تتبع محاورات مرزا بیدل در ریختہ و در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجد طرز خود است۔ و با راقم
رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ مضامین موزوں کردہ، روبہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد"

اب اشعار ملاحظہ ہوں۔ ترتیب اشعار مرتّب کی ہے۔ صاحب تذکرہ کی نہیں۔

جگر سے ٹوٹے ہوئے مو کی (ہے) شاں پیدا — دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا
نیازِ عشق خرمن سوز اسبابِ ہوس بہتر — جو ہو جائے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط — کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط
محفلِ شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں — شمع ساں میں تہ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہوئے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام — جس گذرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک روح کے نہ رہنے سے ہو — کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صبا جاتا ہوں

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھکو — آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھکو
شمشیرِ صاف یار جو زہراب دادہ ہو — وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے — یہ رنگ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بیتاب ہے — دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا میفروش — اب شکستِ توبہ میخوارو کو فتح الباب ہے
اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے — رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسد — ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے
ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے — عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

"تذکرہ سراپا سخن" مصنفہ سید محسن علی محسن لکھنوی میں بھی مرزا غالب کا ایک شعر منتخب جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں۔ اس تذکرہ کا سال تکمیل ۱۲۷۹ھ ہے۔ مرزا کے حال میں یہ دو سطریں لکھی ہیں۔
"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ولد عبداللہ بیگ خاں قوم ترک اولاد میں گشتاسپ کے، مولد اکبرآباد مسکن دہلی، دیوان فارسی اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے۔ مشاہیر شعرائے دہر ہیں۔"
اور اس کے بعد نمونۂ کلام میں یہ غزل درج کی ہے۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں — ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

دیوان کے متداول نسخوں میں یہ غزل ۸ شعر کی ہے اس میں ۹ اشعار ہیں۔ فاضل شعر یہ ہے ؎

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی — کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں

مختار الدین آرزو

۴

ایران باستان

قدیم مشرق کے شمالی باشندے

یہ ملتیں ایشیائے صغیر میں رہتی تھیں۔ توریت اور مصری آثار
کی [illegible] یہ لوگ مردم ہیئت سمجھے جاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ سب گ[illegible]
الارومنسل سے ہیں۔ ہیرودوت نے ان کو ہرجگہ ارآرت اور آلاروڈ لکھا ہے
مگر میخی کتبوں سے ظاہر ہے کہ وہاں اور لوگ بھی تھے جو ایشیائے صغیر میں
بستے تھے۔ بین النہرین میں میتانی تھے اور ان میں خالدی۔ بعض لوگ
کیلیکیہ، دریائے سیکیہ کے بسنے والے۔ لیدی، ازوسک، توبال، مسکو کو
بھی شامل کیا ہے۔ جو سات آٹھ سو سال قبل میلاد تھے۔ بعض تو اور بھی
معراج تصور پر پہنچ کر یونانی بومیوں کو اسی نژاد کے گل بوٹے سمجھتے ہیں
جن کے جزئیات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تین ہزار قبل مسیح فراعنہ مصر سے
ہم دوش تھے۔

ہیتی ارزاوا اور میتانی کے آثار میخی خطوط سے ملتے ہیں۔ خالدی
کتبے اسوری خط میں لکھے گئے تھے۔ ہیتیوں کے آثار تل العمارنہ مصری اور
بوغازکوئی سے بھی ملتے ہیں جو پچھلی راجدھانی تھی اور پادوکیہ میں واقع تھی۔
ہیتوں کے آخری آثار راکدتی دفتروں میں محفوظ ہیں

ہمزیل کا خیال ہے کہ ہیتی زبان کے کچھ نقش ونگار گرجی زبان
میں بھی ملتے ہیں۔ [illegible] کہتا ہے ارمن زبان میں بھی اس زبان کے بعض اثرات
ملتے ہیں۔ ایشیائے صغیر میں بعض ایسی تحریریں جو نقشی تھیں اور خیال
ہوتا ہے کہ میخی خط سے پہلے یہ خط رائج تھا۔ گندروپانی رو ہیتوں کا اصلی
وطن پادوکیہ کو سمجھتے ہیں۔ الوگ اور غازمیں بہت سے کشف ہوئے ہیں اور
راکدتی دفتر بھی وہیں سے ہاتھ آئے ہیں۔ اس دفتر میں ہزاروں سندیں
ہیں۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے میتانیوں نے ہجرت کی اور دکھن اور
پورب کی طرف پھیلتے ہوئے بین النہرین تک پہونچ گئے۔ قرن ۱۵ قبل مسیح
میں اخفش نے حرکت شروع کی۔ اس کے بعد گیارھویں قرن میں اور ہجرتیں شروع
ہوئیں جن میں بعض آریہ دست بھی تھے۔ یہ ایسی طوفانی ہجرتیں تھیں جو دیار
مصر تک پہونچ گئیں۔

غرض میلاد سے ایک ہزار برس پہلے تک ایشیائے صغیر میں ہیتی اور
آرامی سلطنتیں تھیں۔ مشرق میں وان سلطنت کا دور دورہ تھا جسے ہندی
[illegible] نے ختم کر دیا۔

۵

آریہ۔ ہندی اور یورپین قوموں میں آریہ ایک [illegible] ان کے
اصلی وطن کی تحقیق نہیں ہوسکی۔ نہ یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوسکی کہ کس
راہ سے ہندوستان و ایشیائے صغیر میں وارد ہوئے۔ [illegible]

قدیم مشرق پر ان کے بڑے بڑے احسانات ہیں۔ [illegible]
انھیں تمام سرزمینوں کو ایک جا کرکے ایک منظم سلطنت کی تعمیر کی

ان کے تمدن کا سرچشمہ کافی خشک ہوچکا ہے [illegible]
اور پارسیوں نے آبی اسوری و عیلامی تہذیبوں کو [illegible]
جذب کرلیا ہے۔

بعض کے نزدیک ۱۶ قرن میلادی میں اور بعض کے نزدیک میلاد سے
دو ہزار سال پیشتر آریہ ایشیائے غربی میں آئے اور جم گئے۔ ایشیائے صغیر
اور سوریہ میں ۱۷ صدی قبل میلاد میں بھی بعض آثار ملتے ہیں [illegible] Hommel
[illegible]
میں [illegible] خدوخال کی جھلک پائی جاتی ہے [illegible]
[illegible] عناصر سے تھیں جنھوں نے بابل فتح کرکے چھ سو سال وہاں [illegible] سے لگ بھگ

۷۰۰ تک ق م) سلطنت کی تھی۔ مگر اب یہ نظریہ منسوخ ہو چکا ہے۔

ون ونکلر نے ۱۹۰۷ء میں ہتیوں کے قدیم پایہ تخت بوغاز کوئی میں حفریات کے سلسلہ میں کچھ ایسے دفترِ اکدی پائے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ جو بین النہرین کے شمالی گوشے میں رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میتانی رؤسا نے آریہ دیوتاؤں کی قسمیں کھائی ہیں۔ اندر، وارون، ناساتیہ، متر کا نام کثرت سے آیا ہے۔ اڈورڈ میر نے اسی حیثیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میتانی رؤسا آریہ تھے اور ان کی تاریخ چودہ اور پندرہ قرن قبل میلاد سے شروع ہوتی ہے مگر ۱۹۱۵ء کے حفریات نے آئینہ کر دیا کہ بوغاز کوئی کی کتبوں میں آٹھ مستقل زبانیں مستعمل ہوئی ہیں اور یہ کتبے ایسی زبان میں ہیں جو کئی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہیں۔ قدیم مشرق کی تاریخ تو ابھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

بہرکیف آریوں کی حرکت اور راستوں کا مسئلہ اب بھی زیرِ بحث ہے ہم کل کے نزدیک مشرقی یورپ اور دریائے خزر کو راستہ مقرر کرتے ہیں۔

سکاہوں کو یونانی سکیتھ کہتے تھے۔ فرانس نے سپت کہا مگر دارا کے کتبوں میں ایرانیوں نے ان کا نام سک اور سکار رکھا تھا اور بعض جغرافیائیوں نے ان لوگوں کو جو ایران کے شمال و مشرق میں آ گئے تھے، ساک [illegible] [illegible]) کہا ہے لہٰذا ہم بھی سکا کہتے تھے۔ سکا سک سے بہتر ہے۔ اس پر سگ کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

سکائی بیلوں کی حرکت کیمریون (Cimmerians) کی ایشیائے کوچک کی طرف والی حرکت تھی۔ اس تاخت و تاراج نے ایشیائے صغیر تہ و بالا کر ڈالا۔ ہتیوں میں آریہ عنصر بڑھا۔ یونانیوں نے سکاہوں کا ذکر کیا ہے۔ تراسیس کی جنگ جو مصریوں اور فرعون میں ہوئی بھلائی نہیں جا سکتی۔

گو شواہد پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حفریات کی بنا پر قدیم مشرق کے باشندے چھ حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔

(۱) سومری
(۲) سامی — سامیوں نے جنوب سے چل کر سوریہ، بین النہرین اور شمالی افریقہ کو اپنا وطن بنایا۔
(۳) حامی
(۴) عیلامی
(۵) ہتی — ہتیوں نے مقابل کے راستوں سے آ کر سوریہ میں ان سے میدانِ جنگ گرم کیا
(۶) آریہ

ان لوگوں نے اس کے بعد سومریوں اور عیلامیوں سے مشرق میں چھیڑ لگی۔ سومریوں نے بابلی تمدن کو اپنا کر قدیم مشرق کے شرقی حصوں میں پھیلایا۔ آریہ شمال سے جستہ جستہ کر کے مشرق میں آئے اور بابلی تمدن کے زیرِ نگیں ہو گئے۔ ادھر جب ان لوگوں نے غربی ایشیا میں قوتیں پکڑیں تو تمام قدیم مشرق مادیوں اور پارسیوں کی مدد سے ایک دولتِ واحد میں تبدیل ہو گیا۔ اسی لئے ہخامنشی سلطنت قدیم مشرق کا آخری چراغ تھی۔ بعض لوگوں کو بھی اس تمدن میں تھوڑا سا حصہ ملا تھا۔ جیسے نوبی ([illegible]) کی دولت ناپاتا اور حبشہ کی دولت مرا۔

سیّد طالب علی ایم۔ اے الہ آبادی

دو شرابی

مری زود خواہی تری دیر یابی — محبت میں دونوں ہیں وجہِ خرابی
نگاہیں ملیں یوں نگاہوں سے گویا — ہوئے آمنے سامنے دو شرابی
محبت میں ہر جیت ہو اک ہزیمت — محبت میں ہر زک ہے اک کامیابی
مرے ذوقِ رندی کے رستے میں حائل — تمہاری نگاہوں کی عفت آ بنی
حریمِ محبت کے پردے اٹھا دو — کہ فطرت کو ہے حسرتِ جلوہ یابی

فطرت
(راولپنڈی)

جنوبی ہند کے مرہٹی شعراء

جنوبی ہند میں مرہٹی زبان کی ترویج و اشاعت کی داد و تحسین کا واحد حقدار رام داس ہے در اصل یہ اُسی کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج مرہٹی زبان جنوبی ہند میں جاری و ساری ہے۔

رام داس نے مرہٹی زبان کی حمایت اس طرح کی ہے۔

" مرہٹہ تی تکا، میلا وادا
مہاراشٹر، دھرم وادھا والوا"

یعنی مرہٹوں کو ایک ہو کر مرہٹہ تہذیب اور تمدن کو پھیلانا چاہیے" توسیع زبان اور اتحاد قومیت کے اصولوں نے مرہٹوں کے دل میں اخوت اور ملی تڑاپ پیدا کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ شیواجی کے انتقال کے بعد بھی وہ خرم و شاداں رہے۔ حالانکہ وقت نہایت سخت تھا اور دنیا کا نظام درہم و برہم ہو رہا تھا۔

شاہ جی، شیواجی کے والد کے دور سے مرہٹوں نے جنوبی ہند کی طرف جانا شروع کر دیا تھا اور آج بھی تنجور کے علاقہ میں بہت سے ایسے مرہٹہ خاندان موجود ہیں جو شاہ جی کے زمانے میں وہاں سکونت گزیں ہو چکے تھے جب شیواجی تنجور گیا۔ رام داس سوامی، ان علاقوں میں اپنے مذہبی عقائد اور ملی اصولوں کی تبلیغ کے لئے اپنے چیلے روانہ کر چکا تھا۔ جن میں بھیم سوامی، اننت موتی اور رگھو سوامی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس تبلیغی جماعت نے رام داس کے مسلک اور مذہبی عقائد کو پھیلایا۔ ضمناً مرہٹی زبان کی ترویج و توسیع بھی عمل میں آگئی۔

بھیم سوامی کی داستان ذرا دلچسپ ہے۔ وہ شاہ پور کے کلاجی پنتھ کا پوتا تھا۔ اُس کی دادی، گنگا بائی رام داس کی مرید تھی۔ رام داس اس سے ملاقات کی غرض سے گیا اور بھیم کی ذکاوت و ذہانت سے بہت زیادہ متاثر ہوا بھیم کی عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ رام داس نے اس سے پوچھا:۔

"کیا تم ہمارا مسلک قبول کروگے؟ اثبات میں جواب پاکر رام داس نے کہا "مگر تمھیں ہر حالت میں ہمارے احکام پر سختی سے عمل کرنا پڑے گا،" تو کیا ہوا؟ نوجوان عقیدت کیش نے کہا۔ قریب کے ایک کنوئیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رام داس نے کہا "اس میں کود پڑو،" فوراً بھیم کود پڑا۔ رام داس اس کی وفاداری اور عقیدت کیشی سے بہت زیادہ خوش ہوا اور مرید بنا کر اپنی سرپرستی میں اُس کی تعلیم شروع کرائی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ شاہ پور کے مٹھ کا مہنت مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ شیواجی کے ساتھ تنجور چلا گیا وہاں شیواجی کے بھائی ویانکوجی نے اس کے لئے ایک مٹھ بنوایا اس کے ماننے والے وہاں اب تک پائے جاتے ہیں۔ اس نے بہت سے گیت (بھجن) اور رام داس کی کتاب زندگی لکھی۔

رام داس کے دو اور مرید جو اُسی زمانے میں تنجور گئے، آننت اور رگھو تھے، آج بھی اُن کے مٹھ تنجور میں موجود ہیں۔ میرو سوامی، آننت جی کے مرید نے متعدد کتب لکھیں۔ یہ کتابیں انھیں زندگی کی تفذلیں بار روح سے معمور ہیں۔ مادھو، رگھو کا مرید، ایک پُر نویس مصنف تھا۔ اس نے رامائن بحر اور وزن کے علاوہ اشعار منشورہ میں بھی لکھی ہے۔ اُس نے مہابھارت بھی لکھی، جو اٹھارہ حصص پر مشتمل ہے۔ اس کام میں اس کی زندگی کے کم از کم چار سال صرف ہوئے، یہ نو سو چوبیس ابواب پر منقسم ہے اور جیسا کہ خود مصنف کہتا ہے۔ یہ دریا کاویری کے کنارے گوری ناگر[1] میں لکھی گئی ہے۔ یہ مرہٹی زبان کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے لیکن شعری، اور زبان و بیان کی خوبیوں کے لحاظ سے کتاب کی ادبیت ذرا کم ہو جاتی ہے۔

کاویری کے قرب و جوار میں دوسرے شاعر بھی ہوئے جن میں رنگا ناتھ کو کافی شہرت ہوئی۔ اس کی نظم "کاویری" نہایت خوب ہے۔ درد، اثر، سادگی، اور حب الوطنی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے رنگا نے اساطیری

---

[1] ایک شہر کا نام

موضوعات پر بھی اکثر نظمیں لکھی ہیں۔ رنگناتھ کے علاوہ کاتبری سے کن لیے اور بھی بہت شاعر رہتے تھے۔ جن میں وسنو داس، بھگونت اور ویدیاناتھ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا نے مذہب کی مقدس زندگی کو موضوع شاعری قرار دیا اور اسی لیے ان کی شاعری مذہبی زندگی کے گیتوں سے بھری ہوئی ہے۔ حالانکہ ان میں شعری صداقت (Poetic Truth) اور ادبی فطانت کا کم و بیش فقدان ہے۔

ان علاقوں کے مرہٹی ادب میں ایک صنف امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ صنف ڈرامے (ناٹک) کی ہے۔ بادشاہ ساہو نے بے شمار ڈرامے لکھ کر مرہٹی زبان کو بہت وسعت بخشی۔ ڈرامہ نویس خود بادشاہ سے یا کوئی درباری شاعر۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔

ڈرامے بہت زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ لیکن پھر اس زمانے کے اسٹیج (Stage) اور ڈرامائی اصولوں (Dramatic Tradition) پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس دور کے اکثر مصنف سنسکرت پراکرت زبان جانتے تھے۔ لیکن کسی نے بھی کالیداس اور بھوبھوتی کے ڈراموں کا ترجمہ کرنے کا خیال بھی نہ کیا۔ قدیم زمانے کے مرہٹی ادب میں ناٹک کے ساتھ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ ناٹک دیکھنے، اداکاری میں لطف اٹھانے اور ڈرامائی آرٹ کے حسن و قبح کی تمیز سے بے بہرہ تھے۔ یا انھیں ۔۔۔۔ آرٹ کے لیے وقت نہ تھا۔ اس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عام طور سے تنگ دست تھے۔ زندگی کی اہم ترین ضروریات کے بعد اگر ان کے لیے کوئی باعث تفریح شغل تھا تو وہ زندگی کے حکیمانہ اقوال اور روحانی حقائق کا تجزیہ۔ اس دور کے ادبا کو ناٹک سے کچھ یونہی سا لگاؤ تھا۔ گرد و عقیدت کے شعرا نے یہ ضرورت کم و کیف پوری کر دی۔

آنندا، رام داس کا مرید جو پہلے ضلع تارہ میں رہتا تھا۔ بعد کو ولنگ آباد کے مٹھ کا مہنت ہو گیا۔ رام داس کا مرید ہونے کے علاوہ اسے وٹھل دیوتا اور کرشن مذہب سے خاص عقیدت تھی۔ اس نے رامائن کے موضوعات کو عنوان شاعری قرار دیا ہے۔ ایک اور شاعر آنند تنیہ (آنند کا بیٹا) بھی انتخاب موضوع، زبان اور بیان میں آنندا سے ملتا جلتا ہے۔ یہ دونوں شاعر سنسکرت اور ہندی جانتے تھے علم نجوم سے بھی انھیں کافی دلچسپی تھی۔ ان کی نظمیں سہل اور سادہ ہیں اور جیسا کہ علامہ عبدالحق نے کہا ہے "درد اور اثر سادگی کے ساتھ چلتے ہیں"، ان کی نظموں میں درد اور اثر بھی موجود ہے۔ ان میں ایک ڈرامائی کیفیت ہے جس کی وجہ سے بچوں اور عورتوں میں وہ خاص دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی یہ نظمیں خوش الحان اخلاقی خطیبوں نے بکثرت استعمال کیں۔ دونوں شاعروں میں سہ حرفی صنعت (Alliteration) کی وجہ سے الفاظ کی جبری ترتیب ۔۔۔ (Forced arrangement of words) کا اظہار ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دونوں کا کلام معمولی اغلاط کسی قدر گنجلک اور خراب ہو گیا ہے (تمام شعرا ساغر نظامی کو بھی سہ حرفی صنعت کے استعمال میں یدطولیٰ حاصل ہے مگر ان کے اشعار سے الفاظ کی جبری ترتیب کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ شعر میں زور، جوش، لطافت اور نغمگیت پیدا ہو جاتی ہے) لیکن آنند تنیہ، بالاشبہ شعری جدت، فطری قابلیت، غیر معمولی ذہانت اور اختراعی قوت کے لحاظ سے آنندا سے کہیں بہتر ہے وہ ایک نئی بحر "ڈنڈی" کا موجد مانا جاتا ہے۔

اس بحر کو جھنجھناتی ہوئی غنائیت Ringing Music کی وجہ سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی شاعری نغمۂ موسیقی سے بھرپور ہے۔ "سیتا سوئمبر" اس کی نہایت مشہور تصنیف ہے اس کے ہر مصرع کے اختتام پر ایک لطیف جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہ غنائی کیفیت تمام نظم میں موجود ہے ۔۔۔ الفاظ کی ہم آہنگی سے نکلی ہوئی یہ جھنجھناہٹ نقرئی گھنٹیوں کی آواز سے بہت مماثل ہے۔ اس کے اشعار میں ایک خواب آلود ترنم ہے جو ہمارے کانوں پر اتنی آہستگی سے گزرتا ہے جیسے ہماری تھکی ہوئی آنکھوں پر ہوا کے ٹھنڈی پلکیں۔ پھر سب سے زیادہ قابل قدر بات یہ ہے کہ آنند تنیہ کی موسیقی بے معنی نہیں، اساطیری موضوعات کے علاوہ آس نے بھگوت گیتا، کرشن کی زندگی اور رامائن کے رزمیہ (Epic) سے اکثر موضوعات لے کر طبع آزمائی کی ہے۔ اس نے کم و بیش ایک سو پچاس گیت لکھے جن میں نرم ساز کا لطیف سوز پنہاں ہے۔ اس کے موضوعات شاعرانہ اور فن ۔۔۔ دوسرا شاعر ناٹک کے ایک مقام ارنی کا رہنے والا تھا اس کا نام گوپال تھا وہ فن حرب سے کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے خود اپنے آپ کو اپنی ایک نظم میں "ارنی کے سپاہی" کے نام سے خطاب کیا ہے۔

عام خیال ہے کہ آنند تنیہ کے لڑکے کی شادی رگھوناتھ پنڈت کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔ رگھوناتھ مرہٹی زبان کا بہت بڑا شاعر تھا۔ اس کا شمار مرہٹی ادب کے کامیاب اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اس کی نظم "نل اور دمینتی کی شادی"

فن کارانہ نظموں میں بے مثل ہے۔ یہ نظم سنسکرت زبان کے اصول شاعری کو
مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ مگر اس کی نظمیں آورد آگیں، صنعت کارانہ اور
مختلف صنائع و بدائع سے پُر ہیں۔ اُس نے بہترین الفاظ کا انتخاب کر کے نہایت
حسن و خوبی کے ساتھ انھیں استعمال کیا ہے وہ ایک جیّد عالم تھا ادبی مضامین
اس کی گہرائیوں سے چمک اٹھتے تھے؛ اس نے اپنے شاہکار "نل اور دمنتی"
کی شادی میں کردار نگاری کا اعلیٰ ثبوت دیا ہے۔ "راج ہنس" کا قصہ اور اس
کا نل کے ہاتھوں میں پہنچنا، اس حسن و خوبی سے کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا
جب تک کہ بیان کرنے والا خود ایک چابک دست اور فن کار مصور نہ ہو۔
رگھوناتھ پنڈت کی رنگین اور پُر نور، لطیف اور مدہوش کن نظمیں پڑھ کر
کیٹس (Keats) یاد آجاتا ہے۔ محاکات اور واقعات کی تفصیل بیان کرنے
میں رگھوناتھ کا حریف اور مماثل انگلستان کے مشہور شاعر کیٹس (Keats)
کے سوا اور کوئی نہیں۔ مناظرِ فطرت کی نقشہ کشی میں اُسے یدِ طولیٰ حاصل تھا اور
اسی وجہ سے ہم اُسے (Pre - Raphaelite School) کا
ایک فرد خیال کرنے لگتے ہیں۔ اُس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات عسرت
اور تنگ دستی کی حالت میں بسر کئے جس کا اُس نے نہایت موثر الفاظ میں تجزیہ
کیا ہے۔ اُس نے "گنگا تدرموکش" اور "رام داس" پر بھی نظمیں لکھیں لیکن وہ زیادہ
مشہور نہیں ہوئیں۔

اکرام حسین بی، اے (بریلوی)

دردِ جانکاہ

کوئی نہ ہوگا فطرت سے آگاہ — اس رہگذر میں رہبر بھی گمراہ
تیرے سوئے ہے ذرّوں میں دنیا — میری نظر میں دنیا پرِ کاہ
ڈوبا ہوا ہوں کیفیتوں میں — جی بھر کے پی ہے الحمدللہ
فکرِ مداوا کیا زندگی میں — خود زندگی ہے اک دردِ جانکاہ
تابِ تماشا لائیں کہاں سے — اک برق بھی ہے جلووں کے ہمراہ
روتا ہوں گل کی مجبوریوں پر — دل ہے مآلِ گلشن سے آگاہ
کانٹوں کو بخشی وہ عمرِ باقی — گل کو عطا کی یہ مرگِ ناگاہ
اس کشمکش سے تاباں کو مطلب
وہ، اور توبہ استغفراللہ

تاباں دہلوی، ایم اے

مشرق میں عورت کا مرتبہ

(از شفیق بانو بیگم)

اس مضمون میں محترمہ شفیق بانو بیگم صاحبہ نے مشرق کے بڑے بڑے ملکوں کی قدیم و جدید عورتوں پر ایک معلوماتی روشنی ڈالی ہے لیکن خود اپنے ملک کی بہنوں پر لکھتے ہوئے وہ جذبات کی رو میں بہ گئی ہیں اور وسیع النظری سے کام نہیں لیا گیا، مشرق میں ہندوستان خود اتنا بڑا ملک ہے جس میں مختلف مقامات کی عورتوں کی فطرت، تہذیب، رہن سہن اور سماجی زندگی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ اور ہر قوم کی عورت کی زندگی، رسم رواج / معاشرت اور تعلیمی معیار بجائے خود ایک موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جاسکتا ہے۔

"ہندوستان کی عورتیں" کے ضمن میں شفیق صاحبہ نے محض مسلمانوں کے اعلیٰ، متوسط اور نیچے طبقہ کی مسلمان عورتوں کی زندگی دکھائی ہے۔ اور وہ ان تینوں طبقوں کی "حالت زار" پر بہت ناراض ہوئی ہیں۔ حالانکہ ناراض ہونے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ اُن حالات سے بحث کرتیں جو عورتوں کی موجودہ زندگی کے اصل سبب ہیں۔

عورتوں کا کیا ذکر ـــــ سوال یہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کا مرد بھی کوئی سانچہ اختیار کرسکا ہے؟ مغربی تعلیم و تمدن اور مغربی معاشرت نے مردوں کو جس طرح ایک جو بہ مخلوق بنا دیا ہے، ظاہر ہے کہ عورتوں پر بھی وہ اسی طرح اثر انداز ہورہا ہے۔ لیکن میں جدت پسند اور وقیانوسی خیال کا انسان نہیں ہوں اس لئے میرے نزدیک یہ کہنا کہ مغربی تعلیم و تمدن اور معاشرت و نظام نے ہم کو گمراہ کردیا ہے، کلی طور پر صحیح نہیں۔ میری رائے میں ہم نے ان چیزوں کا مصرف غلط اور بھونڈے پن سے کیا ہے۔ یعنی ہم نے کلی طور پر نسخہ کو استعمال ہی نہیں کیا ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق آپ پوری خوراک استعمال نہیں کرینگے تو کیونکر صحت یاب ہونگے۔ میں خیال کرتا ہوں ہندوستانیوں نے صرف معاشرتی اور لباسی تقلید میں تو ضرور ایک نقص انگیز کمال دکھایا ہے۔ مگر ذہنی، دماغی اور ایجادی عناصر سے قطعی متاثر نہیں ہوئے۔ اگر مغرب کی اصول پرستی اور عملی اسپرٹ سے ہم لوگ متاثر ہوتے تو عورت کو اتنی آزادی ضرور دے دیتے جتنی آزادی کی مساوی طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے اُس کو ضرورت ہے۔

وہ لوگ بھی جو انگریزی تعلیم و تمدن کے دلدادہ ہیں، عورتوں کی طرف سے دل میں "چور" رکھتے ہیں اور ہرگز وسیع الخیال اور نئے نظام کے قائل معلوم نہیں ہوتے وہ ابھی تک روحانی اور دماغی طور پر قدیم استبدادی تصور کے عادی ہیں۔

خیر، یہ رونا کب تک روئے گا۔ انتظار کیجئے ایک سیلاب ایسا بھی آئے گا جس میں بقیہ خس و خاشاک بھی بہ جائیں گے۔ لیکن بہرحال میں تجویز کروں گا کہ دوسرا سلسلہ شفیق بانو اور لکھیں جس میں ٹھنڈے دل سے صوبہ وار ہندوستانی عورتوں کی زندگی کے حالات سے واضح بحث کی جائے۔

آخر میں اس سلسلے میں "بیرونی عورتیں" ادارہ کی طرف سے منسلک کی جاتی ہیں۔ اس مضمون سے شفیق صاحبہ کو کافی اندازہ ہوجائے گا کہ ایشیا خواتین کے متعلق کس قسم کے معلوماتی مضامین شائع کرنا چاہتا ہے۔

ساغر

ایرانی عورتیں

پہلی قسط

ایران کی پرانی تاریخ آج تک تاریکی میں رہی اس کی وجہ کچھ اس ملک کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ پرانی کتابوں سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانۂ ایران کی عورتوں کے خیالات بہت پاکیزہ تھے۔ خدا کی بھی قائل تھیں۔ عورتوں کو اپنے گھروں پر پورا پورا اختیار تھا اور اپنے خانگی معاملات میں پوری پوری آزادی میسّر تھی۔ عورتوں کی طرح مرد بھی بلند اعتقادات رکھتے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً تیرہ سو برس پہلے کلدانیوں نے ایران کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ چنانچہ اُسی وقت سے ایرانی مرد عورتوں میں کو ایک پستی شروع ہو گئی۔ اس کے بعد کلدانیوں کے اثر سے ایرانی عورتوں کی حالت پست ہو گئی ، ان کو جو حقوق حاصل تھے وہ ضبط ہو گئے۔ حرم سرا میں قید ہو گئیں جہاں صرف مردوں کی تفریح تصوّر کی جانے لگیں۔ گھر سے کچھ لگاؤ نہ رہا۔ خانہ داری کے کام خواجہ سرا کرتے رہے۔ غرضکہ کلدانیوں کی فتح کے بعد کئی سو برس تک ایرانی عورتوں کی وہی حالت رہی۔ جو آشوری ، بابلی اور کلدانی عورتوں کی تھی۔

جب کلدانیوں کا زوال ہوا تو ایران میں خود مختار سلطنت قائم ہوئی اس کا بانی قورش تھا۔ لیکن عورت کی زندگی بدستور رہی۔

جب ایران میں پارتھیا کے حکمرانوں کو عروج حاصل ہوا تو ایرانی عورتوں کی حالت زیادہ پست ہو گئی۔ گھر کی ملکہ اور لونڈی میں کوئی فرق نہ رہا۔ اسلام چمکنے سے تقریباً دو سو سال پہلے ایرانی عورتوں کی حالت پھر غنیمت ہو گئی وہ گھریلو زندگی اور معاملات میں آزاد ہو گئیں۔ اور سوسائٹی نے ان کے حقوق کو تسلیم کرایا۔

فردوسی نے شاہنامہ میں ایرانی عورتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف گھر کی مالک تھیں بلکہ سیاسی کارناموں میں بھی شوہروں کے ساتھ تھیں اور قومی کاموں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتی تھیں۔ مصوری ، کشیدہ کاری ، سنگ تراشی اور دیگر فنون میں کافی ماہر تھیں۔ کھانا پکانا ، سینا پرونا اور بچوں کی تربیت سے بخوبی واقف تھیں۔

ایرانی عورتوں کی یہ بات خاص کر قابلِ ذکر ہے کہ یہ ہمیشہ دو طبقوں میں منقسم رہیں۔ ایک طبقہ جو شہری زندگی بسر کرتا رہا۔ یہ عام طور سے حرم سرا میں زندگی گزارنے کی عادی تھیں ۔۔ دوسرا طبقہ خانہ بدوش ایرانی عورتوں کا رہا۔ جن کے قافلے مستقل طور پر کہیں قیام نہیں کرتے۔ پرانے زمانوں سے اب تک ان خانہ بدوشوں کی یہی کیفیت ہے۔ یہ عورتیں پردہ نہیں کرتیں کھلی ہوا میں زندگی بسر کرنے کی عادی ہیں۔ سب کے سامنے آتی ہیں اس لئے بغیر کسی جھجک کے سب مردوں سے گفتگو کرتی ہیں اور مردوں کے دوش بدوش کام کرکے کاروباری معاملات میں مدد کرتی ہیں۔ ان خانہ بدوش عورتوں کی اب تک یہی زندگی ہے اس لئے شکل و صورت ، صحت اور جسمانی حیثیت سے شہر کی ایرانی عورتوں سے بہت بہتر ہوتی ہیں۔ چنانچہ عہدِ قدیم سے آج تک ان عورتوں کی دستکاری قابلِ تعریف ہے اور بہت مشہور ، گھر کے کاموں کے علاوہ سمور کے گرم کپڑے ، بھیڑ کے روئیں سے قالین تیار کرتی ہیں اور چیزوں کو فروخت کرنے میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔

موجودہ ایرانی عورتیں اس دَور میں بہت ترقی کر گئی ہیں اور پردہ کو ترک کرکے بالکل آزاد ہیں۔

تعلیم میں ملکہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دستکاریوں ، صنعتوں اور دوسرے کاموں میں کافی مہارت پیدا کر چکی ہیں اور نہایت محنتی ہیں۔

عرب عورتیں

ایامِ جاہلیت میں عرب عورتوں کی کوئی وقعت نہ تھی ، عرب میں عورت کو جو کچھ عزت اور اقتدار حاصل ہوا وہ پیغمبرِ اسلام رسول خدا صلعم کے زمانے میں ۔۔۔ آپ نے لڑکی زندہ دفن کرنے کی سختی سے مخالفت کی اور بچیوں کی

محبت اُن کے خاندان والوں کے دل میں پیدا کر دی۔

ایک عرب کا افسانہ میں نے پڑھا تھا۔ دو بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی کے ہاں خلافِ توقع لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ بہت غصے میں اپنی بیوی سے کہنے لگا " تم نے مجھے ذلیل کر دیا۔ اب میں بڑے بھائی کے سامنے سر اونچا نہیں کر سکتا۔ تم نے مجھے ایک لڑکی کا باپ بنا دیا۔ خیر اب اس لڑکی کو دفن کرنے کے بجائے تم راز میں رکھو اور لڑکوں کا لباس پہنا کر پرورش کرو۔ چنانچہ بیوی نے سولہ سال تک اس بچی کو لڑکوں کے بھیس میں پرورش کیا۔ تمام ہنر، گھوڑے کی سواری، تیر اندازی، شیر کا شکار وغیرہ اُس نے سیکھائے۔ دنیا کو پتہ نہ چل سکا۔ ایک دن اُس کا چچا زاد بھائی اس لڑکی کو لڑکا سمجھتے ہوئے مقابلہ پر آ گیا اور تلوار سے اُس کے ساتھ کھیلنے لگا۔ کھیلتے کھیلتے اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اُس کے سینے ... سے چھو گیا اور ایسا معلوم ہوا گویا بجلی نے ہاتھ کو بیکار کر دیا۔ چند منٹ بعد یہ راز راز نہ رہا۔ اور سب کو معلوم ہو گیا کہ لڑکے کے بھیس میں حسین لڑکی تھی

۱۲

عرب میں عورتیں جرأت اور ہمت والی ہوتی تھیں۔ حضرت نائلہ کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ وہ بہت حسین تھیں۔ مخمور آنکھیں دلفریب چہرہ۔ ارقم بن شیب عرب کا مشہور شاعر تھا۔ اُس نے نائلہ کی غائبانہ تعریف سن لی اور لگا بھری محفل میں اشعار کہنے۔ کیونکہ اُس زمانے میں عرب شعراء کا یہ عام قاعدہ تھا کہ اپنی محبوبہ کا نام لے کر محفلوں میں شعر خوانی کیا کرتے تھے۔ ارقم نے جب اپنے اشعار میں نائلہ کے حسن و جمال کی تعریفیں نظم کیں اور رعنائیوں کا تذکرہ کرنے لگا تو حضرت نائلہ کو بھی اس کی خبر ہوئی۔ آپ بہت رنجیدہ ہوئیں اور قسم کھا کر بیان کیا کہ میں نے کبھی ارقم کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کون ہے۔ ناحق میرا تذکرہ کر کے مجھے رسوا کرتا ہے۔ ادھر یہ بے چاری اپنی پاکبازی کا ثبوت دے رہی تھیں اور اُدھر ارقم اپنے اشعار میں اُن کی ملاقاتوں کو فخریہ بیان کر رہا تھا، اور اپنی غزلیں عام محفلوں میں سنا رہا تھا کہ کس طرح کب میں نے دیکھا تھا اور کب عاشق ہوا اور کس وقت نگاہ کا گھائل ہوا وغیرہ وغیرہ۔

نائلہ جب عاجز آ گئیں تو انھوں نے ارقم سے انتقام لینا چاہا۔ اس فیصلہ کے بعد ایک دن جبکہ ارقم عظیم الشان مجلس میں اپنے اشعار سنا رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ نائلہ مجھ پر فریفتہ ہے اور اُس نے فلاں وقت مجھ سے ملاقات کی اور فلاں وقت پھر ملنے کا وعدہ کیا تو نائلہ نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر ارقم

سے کہا " بھائی جو تم نے مجھ سے بکری خریدی تھی، اس کے دام اب تک ادا نہیں کئے۔ آجکل میں غریب پریشان ہوں لہٰذا میری رقم خدا کے لئے دیدو"

ارقم نے کہا " میں نے تم سے کبھی کوئی چیز نہیں خریدی تم غلط کہتی ہو" نائلہ نے کہا افسوس تم غریب سمجھ کر مجھے اس طرح کہتے ہو۔ لیکن میں تم سے اپنی رقم وصول کر کے رہوں گی۔ اس کے بعد نائلہ نے ایک تحریر پیش کر کے کہا کہ حاضرین یہ اس شخص کی تحریر ہے۔ لیکن آج یہ انکار کر رہا ہے۔ تحریر دیکھ کر ارقم نے کہا یہ میری تحریر نہیں ہے۔ یہ عورت قطعی فریب کار اور جعلساز ہے جو مجھ سے زبردستی روپیہ وصول کرنا چاہتی ہے۔ الفاظ سنتے ہی نائلہ نے رونا شروع کر دیا۔ اور اہل مجلس سے کہا کہ حاضرین خدا کے لئے مجھ غریب کی مدد کیجئے یہ شخص میرے ساتھ بے ایمانی کرنا چاہتا ہے۔ یہ الفاظ سنکر حاضرین کو نائلہ سے ہمدردی ہو گئی اور ارقم سے کہا تمھیں ایک عورت پر اس قدر ظلم نہ کرنا چاہئے۔ اس کا جو کچھ مطالبہ ہو دیدو۔ ارقم نے کہا کہ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اس عورت سے بالکل واقف نہیں ہوں۔ یہ سُنکر نائلہ نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور فرمایا۔ تم نے اپنے وعدے سے انکار کیا۔ اپنی تحریر سے بھی۔ اب کیا میری صورت سے بھی انکار کرو گے؟ ارقم نے کہا آج پہلی مرتبہ میں نے صورت دیکھی ہے۔ آج سے پہلے کبھی خواب میں بھی تمھیں نہیں دیکھا۔ نائلہ نے کہا اچھا قرآن اٹھاؤ کہ تم نے آج سے پہلے مجھے نہیں دیکھا تو میں اپنی رقم چھوڑ دوں گی۔ ارقم نے فوراً قرآن شریف اٹھا کر کہا میں خدا اور اس کے مقدس کلام اور رسول کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے آج سے پہلے اس عورت کو نہیں دیکھا۔

حلف اٹھاتے ہی حضرت نائلہ نے ارقم کے چہرے پر تھوک دیا اور حاضرین سے کہا، محترم بھائیو! یہ ابھی قسم کھا چکا ہے کہ اس نے آج سے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔ سنو میں تم کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں نائلہ بنت عامر ہوں جس کے عشق کی داستان یہ اپنے اشعار میں لکھتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ فلاں مقام پر میری ملاقاتیں ہوئیں اور مجھ پر فریفتہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے کوئی بکری فروخت نہیں کی اور نہ میری رقم چاہئے مگر اس کے حلف اٹھانے سے آپ سب کو یہ معلوم ہو گیا کہ کس قدر بے حیا اور جھوٹا یہ مکار ہے اور ناحق مجھے بدنام کرتا ہے۔ اس کے بعد نائلہ چلی گئیں اور اس حیرت انگیز واقعہ پر حاضرین سراپا حیرت بن گئے۔ ارقم نے شرم و ندامت سے سر جھکا لیا۔

۱۰ اکتوبر ۶۲۵ء کو حضرت نائلہ کا نکاح حضرت عثمان غنی رض سے ہوگیا۔ وہ اپنے شوہر کی بے انتہا محبت شعار تھیں اور تمام گھر کا کام خود ہی کرتی تھیں اور ہر لحظہ شوہر کی خوشی کا خیال رکھتی تھیں ـــــ نائلہ بہت بہادر تھیں۔ جب اہلِ مصر نے حضرت عثمان پر قاتلانہ حملے کئے تو حضرت نائلہ نے تلوار اٹھالی اور باغیوں میں گھس کر ایسی بے جگری سے تلوار چلائی کہ دشمنوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔

جب محمد بن ابو بکر نے اور عبدالرحمٰن نے حضرت عثمان پر تلوار سے حملہ کیا تو حضرت نائلہ نے فوراً بڑھ کر تلوار کو ہاتھ سے روکا۔ اُن کی انگلیاں کٹ کر الگ جا پڑیں اور بیہوش ہوگئیں۔

اس واقعہ کو لکھنے سے میرا مقصد عرب عورتوں کی مثال دینی تھی کہ قدیم زمانے میں عرب کی عورتیں کتنی بہادر اور صاحبِ سیرت تھیں عرب کی عورتیں حسن میں تصویر ہوتی ہیں۔ لباس شرعی پاجامہ اور لانبا کرتا اور سر پر ایک خاص قسم کا رومال جیسے "کسایا" رکھتی ہیں۔ بازار سے تمام سودا لین دین، ضرورت کے کام خود ہی انجام دیتی ہیں۔ پردہ کسی کام میں مانع نہیں اور وہ پردہ ایسا ہوتا بھی نہیں جیسا کہ ہندوستان میں ہے۔

جاپان کی عورتیں

جاپانی عورتیں وہم میں تمام ملک سے آگے ہیں اور رسم و رواج کی زبردست حامی۔ جاپان میں جب عورت حاملہ ہوتی ہے اُس وقت اس بات کا یقین کرتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں شوہر کی بیوی اب بنی ہے۔

وہاں کی بدھ خواتین ہونے والی اولاد کے لئے کافی دُور دراز کے سفر کر کے مختلف مندروں میں منت مانگتی ہیں اور بہت زبردست عقیدت کے ساتھ پانچویں مہینہ بچہ کا باپ ایک جلسہ کرتا ہے جس میں سب رشتہ داروں کا آنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ پھر سب کو یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے اس کے بعد رسموں کا ہر ہر قدم پر استقبال ہوتا رہتا ہے۔

جاپانی عورتیں زچگی کی حالت میں بھی آخر تک کام کرتی رہتی ہیں اور بڑی جفاکش ہوتی ہیں۔ اگر بچہ کا باپ دولت مند ہوتا ہے تو دایہ کا پانچویں مہینے سے انتظام کر دیتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں دایہ صرف وقت پر آجاتی ہے۔ یہ کچھ فلکیات، علمِ نجوم، اور چاند کے تغیرات و حوادج کے مدوجزر سے بھی واقف ہوتی ہیں اور جانتی ہیں کہ بچہ کی پیدائش کے اوقات کیا ہو سکتے ہیں۔ یعنی دریا چڑھاؤ پر ہو۔ صبح جس وقت جانور چرنے جاتے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ

جاپانی عورتیں زچگی کو کچھ بہت مصیبت خیال نہیں کرتیں۔ شاید یہ اُس جسمانی ورزش کا سبب ہے۔ اگر پہلا بچہ لڑکا ہو تو عورت کو بہت زیادہ مبارکباد دی جاتی ہے اور اگر لڑکی ہو تو بہت افسردہ ہو کر تسلی دیتے ہیں کیونکہ لڑکی خاندان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ بچے کی آنول صحن کے دروازہ کے قریب ایک مٹی کی ہنڈیا میں بند کر کے گاڑ دی جاتی ہے اور بچی کی آنول دروازہ سے باہر گاڑتے ہیں۔ اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ لڑکا گھر کا مالک گھر میں رہتا ہے اور لڑکی بڑی ہو کر باہر جانے والی ہے۔ جاپانی عورتیں زچگی کے بعد اکیس روز تک بستر پر آرام کرتی ہیں۔ بچوں کے نام چھ روز کے بعد رکھتی ہیں، اور سب سے پہلے بچہ کو کسی مزار یا مندر میں اپنے مذہبی اصول کے مطابق بچہ کی دادی وغیرہ لے جاتی ہے تاکہ سب چھوت مانتے ہیں۔ جاپانی عورتوں کے بچے کو جب رشتہ دار تحائف دیتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ایک سفید کتا جس کی آنکھیں چمکدار اور دم مڑی ہوئی ہو اور کان بڑے بڑے ہوں تحفہ میں دیں۔ وہ یہ وہم یا عقیدت رکھتے ہیں کہ کتا راتوں کو بچہ کی حفاظت کرے گا۔ اسی خیال سے وہ اس کتے کو سرہانے رکھتے ہیں کہ جو کوئی جن، بھوت، پری یا ڈراونے خواب آتے ہیں، کتا ان کو نگل جاتا ہے۔ جاپانی عورتیں سال بھر تک اپنے بچے کو چلنے نہیں دیتیں۔ اگر بچہ کوشش کرے تو روکتی ہیں تو۔ . . . . . ، یہاں تک کہ بانده دیتی ہیں اور بچہ جب تک "فش"، یعنی مچھلی کا لفظ اپنی زبان سے نہ کہہ سکے جب تک اُس کو مچھلی نہیں کھلاتیں۔ بچوں کے کپڑے آسمان کے نیچے نہیں سکھلاتیں اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ فضا میں اُن عورتوں کے بھوت پرندوں کی شکل میں ہوتے ہیں جو زچگی کی حالت میں مرچکی ہیں۔ اگر وہ غلطی سے کوئی کپڑا باہر سکھائیں تو اُس پر چند قطرے خون کے چھڑکنے کے بعد استعمال کرتی ہیں۔ وہ بچہ کو ہاتھوں پر نہیں لیتیں بلکہ پیٹھ سے باندھ کر کام کرتی رہتی ہیں۔ اس سے اُن کو کام کرنے میں آزادی رہتی ہے۔ جاپانی عورتوں کے توہم اور بے جا اعتقاد کی فہرست لکھنے کے بعد ضروری ہے کہ کچھ تعلیمی حالت بھی لکھوں :-

جاپانی عورتوں میں اب تعلیم عام ہوگئی ہے۔ جاپان کے ہر ایک کے گاؤں میں بھی پڑھنے لکھنے کا کافی ذوق و شوق ہے۔ مارچ ۱۹۳۱ء بنتِ جاپان

۱۴۳

ایشیا

میں ۴۵،۹۳ تعلیمی ادارے تھے اور طلبا کی کل تعداد ۱۳۴۰۸۹۷ تھی۔ بچوں کی تعلیمی عمر چھ اور چودہ سال کے درمیان مقرر ہے۔ وہ بچے جو دماغی یا جسمانی کمزوری کی وجہ سے معذور ہیں تعلیم سے مستثنیٰ ہیں۔

۱۹۲۳ء تعلیم پانے کے بچوں کی مدرسہ میں شرکت کا فی صدی اوسط ۹۹۴۵۷ تھا۔ ان میں ۳۱۱۴۵۴۵ لڑکے تھے اور ۳۰۱۸۴۸ لڑکیاں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تعلیمی معاملات میں صنف کی کوئی خلیج حائل نہیں ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو مشترکہ طور پر سماج اور حکومت کی تعمیر میں حصہ دیا جاتا ہے۔ جاپانی عورتوں میں موسیقی کا بھی خاصا ذوق ہے اور صنعت و حرفت کی درس گاہیں تو مخصوص ہیں۔ جاپانی عورتیں بچپن ہی سے سختی سے لڑکیوں کو تمام گھر کے انتظامات سکھاتی ہیں کپڑا رنگنا، سوئی کا کام، مصوری سکھانے کے ادارے قائم ہیں۔ لڑکیاں بڑی محنت سے تعلیمی کھلونے "لکڑی کے برتن، دستکاری کی اعلیٰ نمونہ کی چمڑے کی تھیلیاں، غرض تمام چیزیں ہاتھ سے بناتی ہیں۔

اسکولوں میں خاص طریقے سے کھانا پکانے کی تعلیم کی استانیاں دیتی ہیں "کنڈر گارڈن" میں بچوں کی اور بچوں کی عمریں چار اور چھ سال کے درمیان ہوتی ہیں۔

اسکولوں کی تمام لڑکیاں ایک قسم کا لباس پہنتی ہیں اور ان کا لباس انگریزی وضع کا ہوتا ہے اور بال کٹے ہوئے ہوتے ہیں

جاپان کا نسوانی مدرسہ ۱۹۰۱ء میں پہلے پہل قائم ہوا تھا اس کی پریسیڈنٹ اب مسز ہامیٹانو ہیں۔ گذشتہ تیس سال میں اس مدرسہ سے پانچ ہزار طالبات نے تعلیم سے فراغت پائی ہے

جاپانی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تعلیم کو امکان کی حد تک عام کر دیا جائے تاکہ لڑکیاں پیچھے نہ رہیں۔ یہاں تک کہ اندھی بہری گونگی اور ایسی تمام معذور لڑکیوں کے لئے درس گاہیں قائم ہیں

حسن و معصومیت میں بھی جاپانی عورتیں کم نہیں ہیں۔ بھولپن کی تو تنہا مالک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے جاپانی عورتوں کا سڈول جسم اور بھولا سا چہرہ بہت ہی پسند ہے۔ مسکراہٹ، سادگی اور بھولپن پر قربان ہوتی رہتی ہوں۔

سروش

کرن اُمید کی نایاب ہوئی جاتی ہے
ہر سحر شام سے بیتاب ہوئی جاتی ہے

خوابِ اُلفت کی جو تعبیر نظر آتی تھی
اب وہ تعبیر بھی اک خواب ہوئی جاتی ہے

قلزمِ عشق کی اللہ رے طوفاں خیزی
زندگی چشمۂ پایاب ہوئی جاتی ہے

اُف، وہ طوفان کہ اُمڈا ہی چلا آتا ہے
اُف، وہ کشتی کہ تہِ آب ہوئی جاتی ہے

ڈوبی جاتی ہے مجھے مرے دل کی اُمنگ
یہ ہے وہ موج کہ گرداب ہوئی جاتی ہے

ہنس دیا کون اُلٹ کر رُخِ رنگیں سے نقاب
پانی پانی جو مئے ناب ہوئی جاتی ہے

عسکری طباطبائی بی۔اے

ایشیا

ہندوستان کی اہمیّت

اب تک ہم یا دوسرے لوگ ہندوستان کو نظر انداز کرتے رہے ہیں تو خیر، یہ ہماری بے بصری اور دوسروں کا عدم تدبر ہے لیکن وقت کی رفتار یہ ثابت کردے گی کہ آج ہندوستان کی اہمیت کو سمجھنا کس قدر ضروری ہے ــــــــ !؟

قانونِ قدرت کے مطابق جس درجہ پر آج ہندوستان پہونچ گیا ہے اور وہ جس حل (Evolution) کا نتیجہ ہے ہیں، اُسے یعنی ہندوستان کی اس روح کو سمجھنا ہے۔

اصل نکتہ یہ ہے کہ جس حل کے ماتحت وہ وضع و ترتیب ہوا ہے اور جس کے نتیجہ کے طور پر وہ آج ثابت و قائم ہے اور ہندوستان کی جو پوزیشن ہے اس کی وجہ سے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے حد درجہ اہمیّت رکھتا ہے

آیئے ہندوستان کے اس حل، اس پوزیشن اور اس نوعیت کو ذرا وضاحت سے آپ کو بتائیں

دنیا بظاہر دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ بَرّی اور بحری، اس تقسیم بَرّی اور بحری کے بعد میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ تمام بَرّی اور بحری دنیا کے تعلقات تختِ دہلی (ہند) کے ساتھ کیا ہیں۔

مذاہب

بَرّی }
ہندوؤں کا مرکز مذہبی - برج متھرا اس کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ
مسلمانوں کا کہ مدینہ اس کا تعلق تخت دہلی۔ہند کے ساتھ

بحری }
انگریزوں کا مرکز مذہبی بیت المقدس اس کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ

مذہبی مرکزوں کی طرح بَرّی و بحری حکومتوں کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ کیسا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

حکومتیں

بَرّی }
پہلا راج ، ہندو قوموں کا تسلط اور اس کا ربط تخت دہلی ہند کے ساتھ
دویم فاتح اقوام مسلمان اور ان کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ

بحری } قابض حال تخت دہلی عیسائی قوم اور اس کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ

اس تفصیل سے آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ہندوستان کو تمام دنیا کا میدانِ عمل مقرر کیا گیا ۔ گھر گھرست میں ہندو قومیں سب سے اوّل تھیں اور تمام دنیا کا تعلق انھیں سے کرایا گیا ہندو قوموں نے اپنا گھر نہیں چھوڑا۔ ہندو یہاں کے باسی، مسلمان فاتح اور عیسائی قابض ہیں۔ یعنی تمام دنیا کا مارک بنایا (نشانِ تسلیم) دہلی ہند کے ساتھ ہے۔

جزئیات سے قطع نظر یہ تسلیم کر لینا پڑے گا کہ جملہ تحقیقات جو دنیا میں ہوتیں وہ ہندوستان میں جذب ہوکر اس کا جزو لاینفک بن گئیں اور ہم اس کے حل ہی کا نتیجہ ہیں۔

بَرّی مشرق، ہندو قوموں کی اخلاقی، مذہبی، سماجی اور ادبی، عالمانہ و حکیمانہ تحقیقات، مسلمانوں کی تمام تحقیقات اور انگریزوں کی تمام سائنٹفک تحقیقات کے پھیلاؤ کا میدان ہندوستان بنا ہے۔ یعنی مشرق و مغرب کی صدیوں کی علمی و تمدنی جد وجہد کے عناصر ہندوستان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہیں۔ دوسری اقوام مشرق کے علاوہ

انگریزوں کی حکومت میں ایک دورِ عمل ہندوستان پر شروع ہوا اور سائنس نے ترقی کی۔

ہندوستان کی اہمیّت اور تقدیس نہ پوچھئے۔ یہ جملہ ایشیائی مذاہب کا مرکز ہے۔ یورپ نے ایک نیا اصول سائنس ہندوستان کو ودیعت کیا اور اہل یورپ بھی اس کی آغوش میں آگئے۔

ایشیا

اہلِ ہند کا تعلق پہلے مسلمانوں سے ہوا جو اپنا مذہب، اپنا کلچر
اور ایرانی و عربی مخلوط تمدن لے کر ہندوستان کی سرزمین جنت
نشان میں داخل ہوئے۔ اس زمانے سے بحری اقوام کی آمد بھی شروع ہوئی
تجارتی تعلقات اور اختلاطِ تمدن نے ایک دوسرے کو مربوط کر دیا۔

اور ایک شاندار وسیع المرتبت برِ اعظم میں اُن تمام خصوصیتوں
کا اجتماع ہو گیا جو دنیا کے مختلف گوشوں میں اکیلی بکھری ہوئی پڑی تھیں
تو ثابت ہُوا کہ آج ہندوستان تمام برّی اور بحری دنیا کے تعلقات
کا امین و حامل ہے، مشرق و مغرب سے اثر پذیر ہے اور مشرق و مغرب کی
تہذیب و تمدّن ہندوستان کی تہذیب و تمدن میں حل ہو چکی ہے۔

یہ حل ایک عظیم الشان تمدن کے وضع و ترتیب کی خوش آیند اساس
ہے اور نوید ہے اُس شاندار مستقبل کی جو قدرت اور ہندوستان کی طرف سے
ہندوستان کو ودیعت ہونے والا ہے۔

آج ایک ہندوستان، کس قدر مکمل، کس قدر بہتر اور لاثانی عقل و
خرد کا نمونہ ہے

ہندوستان بحری اور برّی دنیا ہے اور خود برّی اور بحری دنیا کا
نتیجہ اس طرح تمام ہندوستان تمام دنیا کے حل کا نتیجہ ہے۔ اور اسی لئے پردۂ
عالم پر ہندوستان ہی ایک ایسا مکمل ملک ہے جس کو آئیڈل مکمل ملک کہا
جا سکتا ہے۔

ہندوستان والے غیر شعوری طور پر ہمہ داں بنے رہے۔ ہر تحقیق
کی شاخ، تہذیب و تمدن، میل جول، اور ہر قسم کے بیرونی تعلقات ان کی زندگی
کا نہ فنا ہونے والا جزو ہو گئے اور وہ مکمل ہوتے رہے۔ اور آج وہ زمانہ ہے کہ
ہم تمام اقوامِ عالم سے مکمل ہو گئے۔

قانونِ قدرت کا حل ہی اس طرح ہوا ہے کہ حل ہوتے ہوتے آج
برّی اور بحری ایک جگہ جمع ہو گئے اور ہندوستان بہرحال مکمل ہو گیا۔
آج اہلِ ہند ہر طرح سے مکمل ہیں اور اُن کی صفات تکمیل شدہ حُسن رکھتی ہیں۔
ہندوستان کو غلط سمجھا گیا ——— !!

آج اگر (انگریز) ہندوستانیوں کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ ہمارے
موجودہ احوال کا ردِ عمل (   ) اور اثر ہے اور یہی اثر ہمارے خیالات
کے سمجھنے اور قبول کرنے میں بھی غیر شعوری جھجک پیدا کرتا ہے۔

١٦

ہندوؤں کے تعلقات، مسلمانوں کا اثر، اور انگریزوں کی تعلیم،
ان سب کا نتیجہ ہم ہیں۔ ہندوستان تمام دنیا کا مرکز ہے اور تمام دنیا کی جدوجہد
کا اسٹیج بھی رہ چکا ہے۔ کون ہے جو ان حقائق سے انکار کرنے کی جرأت کرے !؟
کیا ہندوؤں کا تعلق ان کی تمام ازلی خصوصیات حکیمانہ کے ساتھ اس
سرزمین عرفان سے نہیں ہے۔ کیا بحری قومیں اس کے ساحل پر نہیں اُتریں، اور
کیا برّی اقوام نے بھی اس کی آغوش میں پناہ نہیں لی !؟
اور کیا ان سب کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہوا ——— !؟
ہوا اور ضرور ہوا۔ آج نتیجہ میں ہمارا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

کیونکہ ہم برّی اور بحری اقوام کے تعلقات کا نتیجہ ہیں۔ رہے دوسرے، وہ صرف
ایک خط، ایک قسم کی تہذیب اور تحقیقات کی صرف ایک شاخ کے سانچے میں ڈھلے ہیں
لیکن ہم ——— ہم، ہمہ گیر، اور عالمگیر تعلقات کے حل کے سانچے میں
ڈھلے ہیں، اور اس سے ہماری زبردست اہمیت مصدق ہے۔

جس حل کے ماتحت ہندوستان سفر کرتا رہا ہے وہ ایسا ہے کہ ہر تہذیب
و تمدن تحقیقات کی ہر شاخ، اہم مذاہب، حکومتوں اور قوموں کا سایہ اس پر پڑتا رہا
ہے اور وہ ہندوستان میں جذب ہو کر ایک یادگار تشکیل اختیار کر گیا ہے۔

اچھا کیا تمام مذاہب کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہے؟
اور کیا برّی و بحری حکومتوں کا تعلق اس سے نہیں ہوتا رہا ہے
اور تحقیقات کی ہر شاخ یہاں پہونچ کر ہم میں حل ہو گئی ہے۔ ہندو، مسلمان، انگریز
تینوں کی تحقیقات کے میدان ہندوستان کے وسیع دامنِ عرفان میں جذب
ہو گئے۔

ہم کس سے اثر پذیر نہیں ہوئے۔ ہماری تہذیب میں کون سا خام
پہلو ہے !؟

انگریزوں میں صرف ایک تہذیب کا پہلو ہے، اسی طرح دوسروں کی
تہذیب کا بھی صرف ایک پہلو ——— !؟
لیکن آج ہم ہر ایک اہم پہلو کے حل کا نتیجہ ہیں۔ ہم تمام اہم پہلوؤں
کو جذب کر چکے ہیں۔ ہندو، مسلمان اور عیسائیوں کی تحقیقات اور تہذیب کے پہلو
ان سب سے مل کر ہم بنے ہیں۔ کوئی کس طرح ہمارے درجہ پر آ سکتا ہے
کیا ترک، یا انگریز، یا چینی، یا جاپانی !؟
کوئی نہیں ——— ہم "کل" کی حیثیت رکھتے ہیں اور انگریز جزو کی، وہ صرف

عقلی میدان کا نتیجہ ہیں اور ہم روحانی امانتوں کے امین ہیں۔
ہم انگریزوں کا اہم سرمایہ جذب کر چکے ہیں اور اس طرح انگریز ایک جزو میں اور ہم میں جذب ہو چکے ہیں وہ ہمارے پایہ کو کس طرح آسکتے ہیں۔ اس طرح ترک صرف ایک جزو کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم مسلمانوں کو جذب کر چکے ہیں غلط دعویٰ نہیں، ہم کل کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمارے مقابلے میں کوئی تکمیل کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔
آج ہر ہندوستانی کل دنیا کا مکمل باشندہ ہے۔ غیر شعوری طور پر ذہن ان ہی بے پایاں ہے، ہمہ گیر ہے، عالمگیر ہے، اور مکمل صلاحیتوں کا حامل ہے۔

آج قانونِ قدرت نے ہندوستان کو حل کرتے کرتے نمونتاً مکمل بنا دیا ہے۔
یعنی تمام دنیا میں ہندوستان ہی مکمل ملک ہے۔
یہ ہے قانونِ قدرت کے حل کا نتیجہ
یہ حقیقت ہے اور حقیقت کو ہمیشہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اندھوں کی طرح قانون قدرت کے حل کے مطابق جس درجہ پر آج ہندوستان پہونچ گیا ہے وہ دنیا و تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

مرزا ارشاد احمد بیگ چغتائی

عندلیب کا پیام

(از ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی)

مائی ڈیر ساغرؔ! کل شام ایشیا ملا۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ صورت بھی اچھی، سیرت بھی اچھی، اس میں آنکھوں کے لئے راحت اور دل کے لئے سکون ہے، اور میرے لئے اس سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ آپ کی دل نوازیاد بھی تو اپنے ساتھ لایا ہے۔ خدا اسے رہتی دنیا تک زندہ رکھے، خوشحالی اور کامرانی کے ساتھ۔
"تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام" پر آپ کا تبصرہ دیکھا۔ بڑے سلیقہ سے آپ نے انتقاد کیا ہے اور بڑے مزے مزے کی چٹکیاں لی ہیں۔ پڑھ کر لطف آگیا۔ مولانا کی یہ جدت واقعی قابل داد ہے کہ حضرت عیسیٰ، رسول صلعم کے صاحبزادے ہیں ع۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔
کیوں صاحب پٹنہ سے واپسی پر ملاقات کا وعدہ تو خوب وفا کیا۔ ہم آخر وقت تک راہ ہی دیکھتے رہے۔ اچھا اب اکتوبر میں یہ دین مع سود آپ کو ادا کرنا ہوگا۔
ہاں یہ............ کون ہیں؟ کیا.......... پچ مچ انھیں کا لکھا ہوا ہے جب ہی تو کوئی ندرت نہیں مگر عبارت کی پختگی غمازی کر رہی ہے، اچھا خدا حافظ۔ کیفؔ صاحب کو میرا اسلام پہونچیے اور یہ شعر ؎

(ممنونِ التفات) عندلیب شادانی

کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب، ایسا ہی منظر تھا
نہ پوچھو آہ کیا یاد آگیا تاروں کی جھلملی سے

بقیہ

فلک پیما کی رسائیاں

خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب "فلک پیما" بار ایٹ لا کا مکتوب

ڈیئر ساغر صاحب۔ تسلیم

منادی مورخہ ۲۴ اپریل میں آپ کی نظم "سرورِ عالم" کے ایک مصرع نے بہت لطف دیا "پیکرِ خاکی میں داخل ہو گیا نورِ ازل"

ایک نکتہ چیں (اہلِ ہنود میں سے) مجھ سے کسی موقع پر خواہ مخواہ اُلجھ گئے۔ اقبال کا شعر ؏ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں، پڑھ کر فرمانے لگے کہ اقبال بھی تو (Incarnation) کے آرزومند تھے، جو یہ آرزو نہ ہوتی تو کیوں یہ شعر لکھتے۔ خدائے نادیدہ کے لئے تو اُن کے پاس گنتی کے چند سجدے تھے۔ مگر جو خدائے نادیدہ کہیں لباسِ مجاز میں نظر آ جاتا تو حضرت اقبال ہزاروں سجدے پیش کر دیتے، پیش کیا سجدے موجود تھے خدا موجود نہ تھا۔ یا کم از کم ایسی صورت میں موجود نہ تھا کہ تڑپنے والے (رسمی شرعی سجدے سے) سجدوں سے اُس کی پرستش ہوتی۔ ان نکتہ چیں حضرت کو آپ کے مصرع سے (Incarnation) کا پورا ثبوت بھی مل جائیگا۔ کرشن کے اوتار ہونے میں اب کوئی مسلمان کس مُنہ سے اعتراض کرے گا؟ قادیان کے مرزا نے تو کرشن جی کو صرف نبوّت کے لگ بھگ رتبہ دیا تھا۔ مگر جو خدا اوتاروں سے کام لیتا ہے تو کیا ہند کیا عرب سبھی جگہ اوتار ہوں گے (Hollywood) میں تو ضرور ہی ہوں گے یا نہ ہوں گے۔ اسی نورِ ازل کو نظم کے خاتمہ پر آپ نے ایک زبردست دعوت بھی دے دی۔ چاہے جس صورت میں آ، اور چاہے جس پیکر میں آ، آ خدا کے واسطے اِس ظلم کے محشر میں آ، یعنی اوتار ہوں، اوتاروں کا تو اتر ہو، اوتاروں کا ظہور اگر جاہلیت اور ظلم کے زمانوں کے لئے مخصوص ہے تو ظالم اور جاہلوں کا خدا پر بڑا احسان ہے کہ اسے لباسِ مجاز میں نظر آنے کا موقع دیتے ہیں۔ خوش عقیدہ مسلمان جب حضرت اقبال کا یہ شعر لہرا لہرا کر گاتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی ہے مگر اب آپ کی سند اُن کو مل گئی تو میری ہنسی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

اعتراض ہرگز نہیں کر رہا۔ وہ احساسِ خودی جسے آپ روحِ زندگی سمجھ کر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چند لفظ لکھوانے پر مجبور کر رہا ہے۔

"فلک پیما"

مکرر یہ کہ تناسخ کے متعلق تو اہلِ ہنود کے پاس مولانا روم کی سند پہلے سے موجود ہے۔ یعنی ؏ ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم۔ ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ایم۔ صرف اوتاروں کے متعلق کج بحثی کیا کرتے تھے۔ سو اقبال اور ساغر دو مفتی موجود ہو گئے۔ اہلِ ہنود کا خدا ضرور بہروپیا سا تھا۔ یعنی برہم اور شو اور کیا اور کیا۔ اب مسلمانوں کا خدا بھی کایا پلٹ ہونے لگا تو یہ انتہا ترقی کی گنجائش ہے۔ میں وہابی نہیں ہوں۔ شرک سے نہیں ڈرتا۔ مگر خدا کو خاک آلودہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

غنائی شاعری اور مصحفی

شعر ارسطو کے نزدیک مُتناسب خیال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ سوانح اور تاریخ کسی ایک فرد کا کیریکٹر اور اصلی واقعہ پیش کرتی ہے۔ شعر مناظرِ فطرت اور مقاصد حیات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ لیکن اس میں ادراکات کی توضیح تخیل اور تصور کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ راستی اور سچائی گو سوانح اور تاریخ کا جزو لاینفک ہیں۔ تو حُسن و عشق "شاعری کی جان ہے۔ بیکن ــــــــــــ نے یوں کہا ہے

ایک فلسفی کا مقولہ ہے۔ کہ "شاعری انسان کی اُس فطری خواہش کا نتیجہ ہے، کہ چیزوں کو وہ دیکھے یا سُنے اُن کو اپنے طور پر پیش کرے یا جو خیالات اور جذبات اس کے دل میں موجزن ہوں، ان کو ظاہر کرے"۔

مذکورہ بالا خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علماء نے شاعری کی دو بڑی قسمیں بتائی ہیں۔ پہلی قسم کی شاعری "خارجی" کہلاتی ہے۔ اور دوسری قسم کو "داخلی" کہتے ہیں۔

پہلی قسم شاعری کی وہ ہے۔ جس میں شاعر اپنے موضوعات اور الہامات کی تلاش خود اپنی ذات یعنی اپنے تجربات، خیالات اور جذبات کی اندر کرتا ہے ایسی شاعری شخصی، ذاتی یا داخلی کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس میں شعری تحریکات شاعر کو اپنے ہی اندر دستیاب ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے، جس میں شاعر اپنی ذات سے ہٹ کر اپنے اطراف کی وسیع کائنات پر نظر ڈالتا ہے۔ اور اپنے کلام میں ذاتی احساسات اور جذبات کو بہت کم داخل کرتا ہے۔ یہاں ہمیں شاعری کی دوسری قسم سے بحث ہے شاعری کی اس نوع (داخلی شاعری) کو انگریزی میں "لی رک" کے نام موسوم کرتے ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو عموماً موسیقی اور رقص کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں، ان میں زیادہ تر حُسن و عشق کے جذبات اور قلبی واردات کا بیان ہوتا ہے عبدالقادر صاحب سروری "لی رک" کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:-

" لی ریکل شاعری عموماً زیادہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ پُرجوش جذبات اس کے ماخذ ہیں۔ اسی لئے یہ فطرتِ انسانی کے جذباتی پہلو سے زیادہ واسطہ رکھتی ہے، استدلال اور تفکر کو متاثر کرنا اس طرح کی شاعری کا کام نہیں"

لی ریکل شاعری ــــ گیت ــــ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے رقص و سرود کی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ شاعر رقص و نغمہ کو "لی رک" کے لوازمات سمجھ کر بھی اشعار لکھے۔ مگر جب تک اس میں سچے جذبات، سادگی اور رنگینی موجود ہے۔ وہ ہر طرح سے موسیقیانہ شاعری کہلانے کی مستحق ہے۔ ایک اچھا نغمہ نگار جو ساز کے تاروں کے ساتھ نہ گونجے اور خاموشی ہی میں پڑھا جائے، پڑھنے والے کے دماغ اور تصور میں ناچتا اور گاتا ہے۔

پالگریو ــــــــــ نے "لی رک" کی یوں تعریف کی ہے:-

" ایک خیال کا ایک جذبہ کے ماتحت کسی ایک موقع یا محل پر سلاست اور روانی کے ساتھ بیان کر دینا"

چونکہ تاثر اور جذبہ کی کیفیت شاعر پر زیادہ عرصہ تک طاری نہیں رہتی، اس لئے "لی رک" عام طور سے مختصر اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ "لی رک" کے موضوعات عام طور پر ایسے ہوتے ہیں۔ جو فوراً دل و دماغ پر ایک کیف اور بیخودی کی حالت طاری کردیں، لہٰذا اس میں عموماً عشق و محبت، شراب، مستی و مدہوشی، مذہب اور نیچر کی کارفرمائیاں پیش کی جاتی ہیں۔ "وفورِ شوق، بخششِ غم" اور "عشق و موت" سے موسیقیانہ شاعری مملو ہے۔ ایک اردو شاعر نے ان تمام موضوعات کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے

ہوائیں رقص کرتی ہیں گھٹائیں   دھویں کا سر پہ بادل چھا رہا ہے

پرندے چھپاتے ہیں کچھ۔ ایسے　　کہ سننے والوں کو وجد آ رہا ہے
وہ حالت ہے کہ ہر دیوار و در پہ　　سرور جاودانی چھا رہا ہے
مگر غمگیں ہوں میں ایسے سمے میں　　مرے سینہ میں دل گھبرا رہا ہے
بہت بےچین ہے میری طبیعت　　کوئی رہ رہ کے پھر یاد آ رہا ہے

الٰہی وہ بھی میرے پاس ہوتا
مجھے غم جس کا کھائے جا رہا ہے

اُردو میں "لی رک" کے لئے کوئی خاص صنف نہیں۔ صرف غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو کسی حد تک "لی رک" کے موضوعات اور لوازمات کی حامل کہی جا سکتی ہے۔ غزل ابتدائے آفرینش سے اب تک رقص و سرود کی محفلوں کی دُولہن بنی رہی ہے۔ چنانچہ قدما میں میر، سودا، درد، مصحفی، آتش، تسنیم اور متاخرین میں ذوق، غالب، مومن، شیفتہ، مولانا اور عصر حاضر میں فانی، اصغر، جگر، حسرت، سہا ساغر وغیرہ کی غزلیں نغمات سرمدی بن بنکر بلند ہوتی ہیں۔ غزل گوئی "لی رک" کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ گو خارجی واقعات کو داخل کر لینے سے یہ بات جاتی رہتی ہے۔ لیکن پھر بھی غزل کو "لی رک" کہنا بے جا نہیں، جہاں تک اس کا تعلق شریفانہ جذبات، صداقت شاعری، حسن صفائی بیان، درد، اثر، جوش اور سوز و گداز سے ہے۔

جدید اُردو شاعری نے شاعری کے دامن کو اور وسیع کر دیا ہے ؟ اور اب غزل ان تمام آلودگیوں سے پاک صاف نظر آتی ہے۔ فی زمانہ اس میں خارجی واقعات مفقود نظر آتے ہیں۔ اور غزل اب تمام و کمال داخلی جذبات اور واردات قلبی کا جھلکتا ہوا آئینہ ہو رہی ہے۔ علاوہ اس کے سانیٹ اور چھوٹی چھوٹی موسیقیانہ نظمیں بھی لکھی جانے لگی ہیں۔ جو شخصی اور ذاتی جذبات کا آئینہ ہونے کی وجہ سے تیر و سناں بنکر قلب روح کو برما رہی ہیں۔ خیر یہ تو تھا جملۂ معترضہ، کیونکہ ہمیں ثابت یہ کرنا ہے۔ کہ مصحفی نے موسیقیانہ .... شاعری کے ان اصولوں کو کہاں تک نبھایا ہے۔

مصحفی نے خود کہا ہے۔ کہ "والحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش ماہ می روند" ان کے نزدیک شاعری "عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ تھا" لیکن میں کہوں گا، کہ شاعری میں خصوصاً موسیقیانہ شاعری "عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ ہے"، کیونکہ شاعری کی یہ صنف ذاتی محسوسات، جذبات اور قلبی واردات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جو تنہائی اور خاموشی ہی میں کچھ اچھی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ اور صاحب جس کے دل و دماغ پر مدہوشی اور کیف بنکر چھا جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ایک سچا اور حقیقی شاعر کبھی دُنیا اور دُنیا والوں میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایسی دُنیا کی سیر کرتا ہے۔ جہاں سکوت ہو، جہاں ذرے ذرے میں فطرت انگڑائیاں لے رہی ہو۔ جہاں نرگس اور گلاب کے شگفتہ پھولوں کی نازک پتیاں سبز اور مخملی گھاس پر اتنی آہستگی سے گرتی ہوں۔ جیسے رُوح پر نغمے کی مستیاں۔ ایک حقیقی شاعر کی دُنیا اتنی رنگین ہوتی ہے ؎

مری دُنیا شراب شعر سے مدہوش دُنیا ہے
جوانی کے بہارستان میں آوارہ پھرتا ہوں
میں اس خلد طرب میں محو کشش نظارہ رہتا ہوں
مری دُنیا بہار و کیف سے گل پوش دُنیا ہے
مری دُنیا میں عیش سرمدی کے پھول کھلتے ہیں
مرا ہر پھول رشک جنت کشمیر ہے یعنی
مرا ہر باغ، باغ خلد کی تصویر ہے یعنی
جہاں رنگینیوں کی گود میں دن رات کٹتے ہیں
فرشتوں کی طرح میں کھیلتا رہتا ہوں پھولوں سے
مجھے دن رات حوریں سحر زا نغمے سناتی ہیں
میں سوتا ہوں تو اپنی گود میں مجھکو سلاتی ہیں
میں جھولے جھولتا ہوں رات دن خوابوں کے جھولوں میں!
کبھی تم کو بھی اس دُنیائے عشرت میں بلاؤں گا
تمہیں بھی ان گلستانوں کا نظارہ کراؤں گا

مصحفی صرف شعر کہنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی شعر و شاعری میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔ نواب شاہ محبت کے زمانے میں دلی قیام تھا۔ فارغ البالی تھی، خودداری تھی۔ لہذا اشعار اثر اور جوش میں ڈوبے ہوئے نکلتے تھے۔ آخر دلی تباہ ہوئی اور مصحفی جیسا صاحب کمال ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوا مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوا۔ کاہش و کاوش کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی۔ چند روز بعد ان کے مسلم الثبوت استاد ہونے کا چرچا ہر خاص و عام میں ہونے لگا۔ حکیم سید عبدالحیٰ صاحب گل رعنا میں فرماتے ہیں:۔
ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی، ان کے

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

کلام میں کہیں میر کا درد ہے۔ کہیں سودا کا انداز، کہیں سوز کی سادگی، اور جہاں
کہیں ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی اپنے پیشرو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے
تو وہ اردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی کی رائے ہے کہ "میر اور مرزا کے بعد کوئی اُستاد
ان کے مقابلے میں نہیں جچتا، اور یہ اپنے ہمعصروں میں سب سے برتر اور فائق نظر
آتے ہیں" مولانا آزاد نے بھی آبِ حیات میں اسکو تسلیم کیا ہے کہ:۔

"یہ اُصولِ فن سے بال برابر بھی نہ سرکتے تھے، کلام پر قدرت کامل
پائی تھی۔ الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس درو بست سے
شعر میں کھپاتے تھے، کہ جو حق اُستادی کا ہے ادا ہو جاتا ہے۔ ساتھ اس کے
اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، ایسے موقع پر کچھ سودا کا سایہ
پڑتا ہے، جہاں سادگی ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں"

میر، سودا اور آثر کی شاعری ہر طرح سے موسیقیانہ اور "لی ریکل" ہے
شروع شروع میں مصحفی نے بھی انھیں شعراء کا اتباع کیا، مگر یہ وہ زمانہ تھا
کہ شاعری فقراء و صوفیہ کی خانقاہوں سے نکلکر عام طور پر امراء و سلاطین کے
درباروں میں آگئی تھی، اور اس انقلاب نے اردو شاعری پر گوناگوں اثرات
ڈالے۔ اخلاق خراب ہوگئے، شاعری میں تصنع اور بناوٹ شامل ہوگئی۔ اور
شاعری صرف اُمراء اور نوابین کی خوشامد کا ذریعہ ہوکر رہ گئی۔ مصحفی کے
کلام میں بھی تغیر رونما ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال ہے کہ:۔

"جو شاعر دربارِ شاہی میں قدم رکھتا ہے۔ اس کو لازمی طور پر حقیقی
اور ذاتی شاعری کے اوصاف سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے ان کی
شاعری درد، اثر، جوش اور سوز و گداز سے تہی دامن ہو جاتی ہے"

مصحفی بھی اب ایک درباری شاعر تھے۔ انشا سے برابر نوک جھونک
اور شاعرانہ مناظرے جاری تھے، لہٰذا ذاتیات میں پڑکر شاعری کی وہ روح
جو موسیقیانہ شاعری کی جان ہے۔ ان میں بالکل مفقود ہوگئی تھی۔ اس اثنا
میں انکی تنخواہ میں تخفیف ہوگئی۔ اور وہ دل برداشتہ ہوکر عزلت گزیں
ہوگئے۔ یہی زمانہ ان کی شاعری کے شباب اور ترقی کلام کا تھا:
ان کا کلام سوز و ساز کی بولتی تصویر، درد و جوش کی شاندار رنگین پھلجھڑی
تھی، سادگی، شریفانہ، ذاتی احساسات، حسن و عشق کی داستان،
اور جوش جو موسیقیانہ شاعری کی جان ہیں۔ سب کچھ ان کے کلام
میں پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری وہی سچی اور عرفانی ہوتی
ہے۔ جو درد بھری ہو۔ چونکہ اب مصحفی دل برداشتہ اور دل گرفتہ ہوگئے
تھے۔ لہٰذا ان کے دل کے تاروں سے درد بھرے نغمات ہی نکلتے تھے اور
تاثرات اور سادگی میں ڈوبے ہوتے تھے، اس زمانے میں رنج و غم، گریہ و ماتم
مصحفی کی شاعری کے خاص موضوعات تھے، اور جن کو وہ گوناگوں رنگوں میں
ادا کرتے تھے، یہ اشعار صرف ظاہری نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ان میں ان کے
آنسوؤں کی سُرخی اور خونِ جگر کی گرمی بھی شامل ہوتی تھی۔ اور یہی وہ
باتیں ہیں۔ جو انھیں ایک امتیازی "لی ریکل" شاعر بناتی ہیں۔ اس طرح
کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شام ہی سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہے گویا چراغ مفلس کا
درد و غم کو بھی ہے نصیب شرط — یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا
افتادگانِ وادیٔ غربت کی سرگزشت — کرتا ہے خود بیاں لبِ خاموش نقشِ پا
فلک گر ہنساتا ہے مجھ کو کسی کو — میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں
غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی — کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی
کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر — فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی
ہے غربت میں خبر کس کو وطن والوں کی — کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی
پڑا ہوں شاخ سے گر کر میں برگِ زرد کی صورت — خدا جانے کہاں لے جائے اب بادِ خزاں مجھ کو

پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اشعار ایک بڑھتی ہوئی لہر ہیں۔ جو ہمارے
جذبات سے مس ہوکر ہمارے چہرے پر شادی و غم کے آثار نمایاں کر دیتے ہیں
دل کے تاروں میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ شعر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ شاعر خود سوز کے مدھم سروں میں اشعار گنگنا رہا ہے۔ گو حقیقت
میں ایسا نہیں ہے۔

میرے نزدیک شاعر، خواہ وہ کسی مرتبہ کا بھی ہو، اس وقت تک ایک
سچا اور حقیقی "لی ریکل" شاعر نہیں کہا جا سکتا، جبتک اسکے کلام کے اندر اسکے
خونِ دل کی سُرخی نہ جھلکتی ہو اور اسکے الفاظ سے اس کے پوشیدہ دلی
جذبات اور احساسات نمایاں نظر آتے ہوں، حسبِ ذیل اشعار سے یہ بات
ظاہر ہوتی ہے ؎

نہ وہ راتیں، نہ وہ باتیں، نہ وہ قصہ کہانی ہے
سرِ بستر فقط ہم یا ہماری ناتوانی ہے

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

مختصر سے شعر میں جوانی اور ایامِ گذشتہ کی باتوں کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے - یقیناً شعر ایک مکمل داستان ہے - یاس و ناامیدی کی ایک کہانی ہے - حسرت و ارمان سے مملو -

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لیکر — جو گیا یاں سے گیا حسرت و ارماں لیکر
کس قدر شاد ہوا کرتی ہے جی ہی جی میں — تیری آنکھوں کی بلائیں تری مژگاں لیکر
بلغ وہ وحشتِ جنوں تھا کہ کبھی جیب سے — لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لیکر

مصحفی گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث ملکِ سلیماں لیکر

ہجر کے مضامین کو اس حسن و خوبی سے نظم کیا ہے ؎

نالہ جاتا ہے تا بہ عرشِ بریں — ہے شبِ ہجر کی یہی معراج
کیا پوچھتے ہو ہمدم احوال مصحفی کا — راتیں اندھیریاں اور اختر شماریاں ہیں

مصحفی کے "حسن و عشق" کے جذبات کا دریا اس طرح موجیں مارتا ہے ؎

کہتے ہیں کہ عاشق کو آتی ہے اجل جلدی — کس طرح کا آنا ہے نے صبح و نہ شام آئے
اٹھنے لگے جو وہ مری بالیں سے وقتِ نزع — نکلا یہی زباں سے آہستہ کیا چلے!؟
ساعتِ عیسویاں ہے کہ مرا دل جس میں — خود بخود چوٹ لگی خود بخود آواز ہوئی

جمال و منظر کی موکشی اس طرح کی ہے :-

کون آیا ہے نہانے لطفِ بدن کس کے — لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

یہ میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مصحفی کی شاعری جہاں تک "لی ریکل" شاعری سے تعلق ہے، جذبات اور قلبی واردات کا صحیح نمونہ ہے - اُس نے بیساختہ عشقیہ غزلیات لکھیں - جگر سوز و ساز کا احترام مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ ہمیشہ سجدہ نظر آتا ہے - اُس کے اشعار نے وہ جذبات ظاہر کر دیئے ہیں - جو وہ خود کسی اور طرح ظاہر نہیں کر سکتا تھا - اس کے احساسات سکون پرور ہیں اور یہ بات اس کے مختلف اشعار سے ظاہر ہے ؎

میں تھا ہمدردِ اُس کا پاس مجنوں کے ہی لیجاتا — اگر لیلےٰ کے ناقہ کا بتائے ساربان مجھ کو
نگاہوں ہی میں بہارِ گل کو میں تو لوٹ لیتا ہوں — بھلا کیا رخصتِ سیرِ چمن آئے باغباں مجھکو
مت سیر رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ یاں — رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

مصحفی ایک باکمال شاعر تھے، اور اُن کی شاعری حقیقی معنی میں لیریکل کہی جا سکتی ہے :

اس تمام بحث سے ظاہر ہے - کہ مصحفی کا کلام ان کی طبیعت اور سیرت کی ہو بہو تصویر ہے، یہ صرف قیاسی یا فرضی بات نہیں ہے، پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے - کہ اُن کا ہر شعر ان کے درد دل کی تصویر ہے مصحفی کا کلام نہایت سادہ ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اثر اور جوش ہے - دراصل یہ ان شعراء میں نہیں جنھوں نے موزونیٔ طبع کی وجہ سے، یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کیلئے شعر کہے ہیں - بلکہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں - جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے، اور جنھوں نے اپنے کمال سے موسیقیانہ شاعری کو چمکا دیا اور زبان کو زندہ رکھا - شاعری مصحفی کی زندگی کا جزو تھی - گویا فطرت نے اُنھیں اسی سانچے میں ڈھالا تھا - اُن کا احسان اردو زبان پر تا قیامت رہے گا

مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری میں فرماتے ہیں -

"یہ بات یاد رکھنی چاہئے - کہ دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ہیں یا جن کو اُستاد ماننا چاہئے - ان میں ایک بھی ایسا نہ نکلے گا - جس کا تمام کلام اول سے آخر تک حسن و لطافت حقیقی جذبات و احساسات، موسیقیت اور ترنم کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہوا ہو - کیوں کہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہو سکتی ہے شاعر کا معراجِ کمال یہ ہے کہ اُس کا عام کلام..... اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے - جس سے شاعری کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے - البتہ اتنی بات ہے کہ اس کے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں، جیسا کہ اس کا خاص کلام ہر شخص کے دل میں ہر حالت میں اثر کرتا ہے - اور یہ بات اُسی شاعر کے کلام میں پائی جا سکتی ہے - جس کا کلام سادہ اور نیچرل ہو"

حسبِ بالا سطور کو حقیقت کی نظروں سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے - کہ اگر مصحفی میں کچھ خامیاں تھیں تو وہ اس کی خدائی لطافت پر کبھی پانی نہیں پھیر سکتیں

پروانہ

رُوس کا نظامِ تعلیم

(اشتمالی تعلیم کے اصول محض علمی سیاست کے نقطۂ نگاہ سے)

"مدرسوں کو اگر سیاسیات اور زندگی کے فلسفہ سے الگ کر دیا جائے تو اُن کی حیثیت مکاری اور ریاکاری کی تعلیم گاہوں سے زیادہ نہیں۔ لینن"

کسی ملک کا طریقۂ تعلیم اُس زمانہ کے حالات اور واقعات کا نتیجہ ہوتا ہے اور زمانہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ اُس میں انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ آج اسی اصول کی بنا پر ہمیں اشتراکی و اشتمالی طریقۂ تعلیم کی جانچ پرتال کرنی ہے۔ روسی معاشیاتی طریقہ ذرا مشکل ہی سے سیاسیات سے الگ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ نتیجہ ہے دُنیا کے اُن عظیم ترین اور بزرگ فلسفیوں مثلاً مارکس، اینجلس (Engels) لینن اور اسٹیلن کی غور و فکر کا جن کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "ہر ایک انسان قدرتی طور پر اپنی ضروریات اور ذہن کی رسائی کے لحاظ سے علم کے حاصل کرنے کا ذوق و شوق اپنے دل میں پنہاں رکھتا ہے" اور یہی وجہ ہے کہ آج دُنیا کا ہر فرد اپنی آزادی حاصل کرنے کیلئے اور ملکی ترقی کیلئے اپنے ملک کے ہر فرد کو زیورِ علم سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ مارکس کے فلسفۂ مادیت کی منطق تک پہنچنے کی اسی وجہ سے (U.S.S.R.) کو کافی امیدیں ہیں۔ گو اس وقت اسکے فلسفۂ منطق تک پہنچنے کی کافی منازل طے کی جا چکی ہیں اور اُس کی حدِ آخری پہ پہنچنے کے لئے ہر طرح کی جد و جہد جاری و ساری ہے۔

مادی منطق فلسفۂ حیات کا ایک اہم ترین عنصر ہے۔ اس سے حیاتِ انسانی کی تمام زندگی وابستہ ہے۔ اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ مثلاً سیاسیات، معاشیات، تعلیمات، آرٹ، سائنس وغیرہ، ان سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ انسانی زندگی میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ انسان بھی اپنا رنگ بدلتا جاتا ہے۔ مارکس کے خیال کے بموجب ہر اجتماعی حالت کی ترقی کے ساتھ اُس کا تنزل بھی ہے اور عمرانی جد و جہد کی ترقیات میں اُس کا رد بھی مضمر ہے کیونکہ انسان جب سے اس جد و جہد کے دور میں شامل ہوا ہے اُس نے اپنا ماحول خود تیار کیا ہے اور اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات پر نظر ڈالکر زمانہ کی جد و جہد میں پڑا ہے۔ انسانی زندگی کے اسی نظریہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اشتمالی اور اشتمالیت انسان کو زندگی کی اس بلند منزل پر پہنچانا چاہتے ہیں جہاں وہ غارت گری، سفاکی اور لٹیرے پن کو چھوڑ کر امن و امان کا دیوتا اعلیٰ تہذیب و تمدن کا خواہاں اجتماعی زندگی بین الاقوامیت اور انسانی مساوات اور میل ملاپ کا دلدادہ نظر آئے۔ معاشیاتی خاکہ جو اشتمالیوں کے پیشِ نظر ہے اُس سے اُنہیں انسان کے مادی اور ذہنی ارتقا کی کافی امیدیں ہیں اور یہی وہ عملی نقشہ ہے جس سے ہم آج (U.S.S.R.) کے تعلیماتی، معاشیاتی، اور سیاسی زندگی کے ہر دروازہ کو کھلا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ دُنیا کا کوئی شخص اشتمالی تعلیمات بالا میں سے کسی ایک کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سارا نظام منتشر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اشتمالی تعلیمات کے ساتھ ان تینوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ اشتمالی تعلیمات اور روسی زندگی کا جزوِ عظیم بن گئے ہیں اس صورت میں ان کا علیحدہ ہونا ناممکن سی بات ہے۔ یہی نہیں بلکہ جمہوریۂ اشتراکیہ (U.S.S.R.) کے کسی رُخ پر نظر ڈالئے آپ کو

؎ Communistic Education.

ایشیا - اکتوبر ۱۹۴۲ء

مجموعی طور پر بمقابلہ دیگر ممالک زندگی کے ہر رخ میں زمین آسمان کا فرق عظیم نظر آئے گا۔ چاہے وہ کھیل کود کا میدان ہو یا سنگتراشی کی جگہ، مقام صحت ہو یا تمثیل گاہ، غرض ہر شے میں آپ کو معاشیات اور انسانی سیاسیات کے فلسفہ کا ایک اکمل نمونہ نظر آئے گا۔

جمہوریہ اشتراکیہ کے بچوں کے سامنے جو نظریات آئے دن پیش کئے جاتے ہیں اُن میں اور اُن نظریات میں جو سرمایہ دار بچوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ مجھے یہ کہیں کہ میں غیر اشتراکی اشیاء میں تعصب سے کام لیتا ہوں، مگر یقین مانئے کہ اگر کسی حقیقت کے اظہار کو آپ تعصب سے تعبیر کرتے ہیں تو میں ایسا متعصب بننے کو تیار ہوں ——— دیکھئے نا! ہمارے مدارس کے بچے جب اپنی جماعتوں میں بیٹھے ہوتے ہیں اُس وقت اُن کے سامنے جن خیالات کا اعادہ کیا جاتا ہے اور جس جس طرح سے اُستاد اُن خیالات کو اُن کے سامنے پیش کرتا ہے جو نصب العین رات دن اُن کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے آپ خود ہی بتائیے کہ اس سے اُن کی مستقبل کی زندگی میں سوائے ایک زیادہ سے زیادہ چالیس روپیہ کا کلرک بننے کے اور کیا فائدہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اُستاد تو یہاں تک ستم ڈھاتے ہیں کہ بچوں کے دلوں میں شروع سے یہ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اعلیٰ گھرانوں میں پیدائش شرافت اور پاک دامنی کی دلیل ہے اور وہ بچے جو اعلیٰ گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں اُن بچوں سے جو معمولی گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں بہت افضل ہیں۔ بھلا آپ خود ہی بتائیے کہ جہاں بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے ایسے سرمایہ دارانہ خیالات بھرے جاتے ہوں وہاں سوائے کلرکوں کی پیدائش کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ لیکن اسی سلسلہ میں انگلستان کے ایک موسیقی کے مدرسہ کا واقعہ اور سن لیجئے۔ یہ مدرسہ انگلستان کا ایک بہترین موسیقی کا مدرسہ سمجھا جاتا ہے اور اس میں موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے دور دور سے طلبا آتے ہیں۔ اسکے اساتذہ انگلستان کے مانے ہوئے بہترین موسیقار رہ چکے ہیں اور ہیں۔ خیر۔ تو اسی مدرسہ کا ایک جلسہ ہو رہا تھا آٹھ نو سو کا مجمع تھا جس میں طلبا بھی شریک تھے۔ امیر مدرسہ کے حکم سے ایک اُستاد کو تقریر کرنے کا حکم ہوا۔ اُستاد مذکور نے طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر یوں شروع کی "ایک شخص جو زبردست موسیقار تھا لیکن اسکے باوجود اپنے کام سے مطمئن نہ تھا ایک بار اُس نے "خدائے بزرگ و برتر" سے درخواست کی اُسے ایسی چڑیا بنا دیا جائے جسکے نغمے کی صدا سُن کر تمام دُنیا پر ایک کیف کا عالم طاری ہو جایا کرے۔ خدا نے اُس کی دُعا کو قبول فرمایا۔ وہ ایک بہترین چڑیا بن گیا۔ جس کا حُسن دیدہ زیب اور جس کی آواز دلفریب تھی لوگ سنتے تو مست ہو جاتے تھے۔ لیکن اُس بندۂ خدا کو اپنی اس کیف آفریں آواز پر بھی اطمینان نہ ہوا۔ بالآخر اُس نے خدا سے پھر درخواست کی کہ صاحب مجھے اپنی اصلی ہی شکل میں دوبارہ واپس کر دیجئے۔ میں اس سے بھر پایا۔ خدا نے اُس کی دُعا پھر قبول کی اور وہ حضرت پھر ایک انسان ہو گئے۔ اپنی موسیقی سے پھر دل گدگدانے لگے" اُستاد نے تقریر کو یہاں تک جاری رکھنے کے بعد سامعین اور طلبا پر ایک نفسیاتی نظر ڈالی اُس نے محسوس کیا کہ بچے اور خود سامعین اُس کی تقریر سے مسحور ہو رہے ہیں تو اُس نے یہاں سے اپنے مضمون کو پلٹا دیا اور اب یہاں سے اُس نے "اطمینانی حالت اور غیر اطمینانی حالت" کے فوائد و نقصانات پر روشنی ڈالنی شروع کی اور کہا کہ "دیکھو اُس کی اسی غیر اطمینانی حالت نے اُس کو لکھ پتی بنا دیا۔ اُس میں جد و جہد کا جذبہ پیدا کر دیا اور بالآخر کچھ عرصہ بعد وہ دولت و ثروت میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس لئے تم کو بھی چاہیئے کہ دولت و ثروت حاصل کرنے کے لئے اسی طرح سے جد و جہد کرو اپنی زندگیوں کو کامیابی کا درجہ عطا کرو۔ اور کامیاب ہو"

ہوسکتا ہے کہ آپ کو اُستاد کے ان خیالات سے اتفاق ہو لیکن مجھے یہاں پر یہ دکھانا تھا کہ ہمارے مدارس میں کس طرح سے من گھڑت قصے اور کہانیاں بچوں کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ جد و جہد کی تعلیم دینا نہ جمہوریۂ اشتراکیہ میں بُرا سمجھا جاتا ہے نہ غالباً دُنیا میں کہیں اور لیکن میرا اعتراض تو اسپر ہے کہ ایسے مہمل طریقے کو کیوں قبول کیا جائے جس سے طالبِ علم کو سراسر اُس کی شروع ہی کی زندگی سے ہم غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ تو آپ نے ایک انگلستانی مدرسہ کا قصہ سُنا اب آئیے ایک روسی مدرسہ کا واقعہ بھی سُناتا چلوں اور یہ آپ کو دکھاؤں کہ جب اشتراکی اُستاد اپنے بچوں کو کوئی کہانی یا واقعہ سُناتا ہے اور اُسپر بچے سے سوال کرتا ہے تو بچہ کیا جواب دیتا ہے۔ ایک اشتراکی

مدرسہ میں حساب کا گھنٹہ ہو رہا تھا - ماسٹر نے بچوں سے سوال کیا کہ " اگر ایک شخص سیبوں کا ایک ٹوکرا تیس روبل .... میں خرید کر ستر روبل (روسی سکہ) میں بیچ دے تو بتاؤ اُس تاجر کو کیا ملے گا ؟ " اُستاد سوال ختم کرتا ہے - ایک بچہ اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے اُستاد سے اجازت لیکر فوراً یہ جواب دیتا ہے کہ " تین ماہ کی قید سخت " آپ سمجھے کہ اُس نے یہ جواب کیوں دیا - آپ شاید اسے ایک لطیفہ سمجھے ہونگے - لیکن نہیں اُس نے ایسا جواب صرف اس وجہ سے دیا کہ اُس کے دل میں شروع سے یہ ڈالا گیا ہے کہ نفع کمانے والا سماج اور جمہور کا دشمن ہے ، اس لئے جب کسی ایسے شخص کو دیکھو جو نفع کما رہا ہو تو متعلقہ افسران سے فوراً شکایت کرو تاکہ ایسے اشخاص کو عبرتناک سزائیں دی جاسکیں تاکہ وہ جمہور کو ، ملک کو حکومت کو اپنے ایک فعل سے نقصان نہ پہنچا سکے - آپ نے دیکھا کہ بچہ کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوگیا - کیونکہ اُس کو شروع سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اشتمالی معاشیاتی طریق نے انسان کی ہر اُس راہ کو جس سے فردِ واحد دولت عظیم اکٹھا کر سکے ، نفع کما سکے تنگ کر دیا ہے ، ایسی شاہراہ کو کھود ڈالا ہے - بند کر دیا ہے ، اشتمالی بچوں کے دلوں میں یہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے کہ وہ انسان سماج اور حکومت نیز جمہور کا دشمن ہے جس کی شروع کی زندگی تنگی سے گزری لیکن آخر میں وہ کروڑپتی ہوگیا ایسے اشخاص کو فنا کر دو کیونکہ ایسے اشخاص دولت کو جمع کر کے جمہور ، حکومت اور سماج کو نقصان پہنچاتے ہیں - یہی نہیں کہ یہ خیالات صرف بچوں کے دلوں میں بھر دئے گئے ہوں بلکہ ان کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا - جمہوریۂ اشتراکیہ میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا - عوام کے مطالبہ نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ ایسے طبقہ کی جائدادیں اور ملکیت ضبط کر لی جائے اور اُن کی یہ جائدادیں اور ملکیتیں جیلکین (chelyskin) کے کارخانے کی مہم کو سر کرنے والے مزدوروں اور اُن لوگوں میں جن کی یہ جائدادیں اور ملکیتیں تھیں برابر تقسیم کر دی گئیں - اور اس مسئلہ کا حل اس منصفانہ طریقہ سے عمل میں لایا گیا -

جمہوریہ اشتراکیہ کے نزدیک شرافت اور بلندی کی نشانی نہ دولت ہے اور نہ لمبے چوڑے خطابات بلکہ جمہور اور اشتراکی حکومت سے وفاداری اُسکی ترقی اور اُس کی عمارت کو مضبوط بنانے کی کوشش کرنے والے کی عزت تمام جمہوریۂ اشتراکیہ میں کی جاتی ہے اور اسے بہ نگاہِ عزت دیکھا جاتا ہے - انفرادیت کا دور دورہ گو آج کل سارے ملک میں ہے لیکن اسکے باوجود میل ملاپ اور اتحاد میں سارا ملک ایک مستحکم اور مضبوط دیوار کی طرح سے ہے جس کا توڑنا ناممکن ہے کچھ عرصہ کی بات ہے کہ اس انفرادیت کو ملک کے لئے نقصان دہ سمجھا جانے لگا تھا اور لوگوں کے دلوں میں یہ ڈر پیدا ہوگیا تھا کہ انفرادیت کہیں آگے چلکر ملک کی مستحکم عمارت کو گرا نہ دے - کافی چھان بین کے بعد یہ طے پایا کہ لوگوں کا یہ محض وہم و گمان ہے - ایسا ہونا ناممکن ہے کیونکہ سوسائٹی کا نظریہ نہایت اعلیٰ ہے اور اس اشتمالی سوسائٹی میں ہر شخص اپنے کو انفرادی طور پر بلند کرنے کی اور اپنی حالت کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہر شخص اپنی اور اپنے ملک کی حالت اُسی وقت بہتر بنا سکتا ہے جبکہ اُس میں انفرادی طور پر اپنی حالت کے سُدھارنے کا جذبہ نہ پیدا ہو جائے - انفرادیت ہی ایک ایسی شے ہے جو انسان کو بلندی کے اُن اعلیٰ مدارج پر پہنچاتی ہے جس کا ہر انسان مستحق ہوتا ہے - یہ اشتمالی سوسائٹی ہی کی برکتوں کا نتیجہ ہے کہ جمہوریۂ اشتراکیہ میں ہر شخص کیلئے معاشی ضمانت ، بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نے طریقِ تعلیم میں نرمی پیدا کر دی جس سے تمام روسی طریقوں کے اُن جراثیم کو جو اُن میں پائے جاتے تھے شدید تبدیلیاں ہوگئیں اور شروع کی ترقیوں میں اہلِ ملک کی اسقدر حوصلہ افزائی کی گئی کہ اُن میں انفرادی حیثیت سے ایک عجیب جذبۂ عمل اور جذبۂ علم پیدا ہوگیا - ہر اشتمالی باشندہ اس کا خواہاں نظر آنے لگا کہ وہ زیورِ علم سے جلد از جلد آراستہ ہوکر ملکی تعمیر میں اپنے پڑھے لکھے ساتھیوں کے دوش بدوش چل سکے - یہ لہر کسی خاص ... خاص طبقے کے اشخاص کی خواہشوں کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ سارے ملک میں یہ لہر بجلی کی طرح سے دوڑ رہی تھی ، بڑا ہو یا بوڑھا ، بچہ ہو یا جوان ، عورت ہو یا مرد غرض ہر فرد جماعت کے دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی کہ کس طرح جلد سے جلد تعلیم حاصل کر لی جائے " یہ نتیجہ تھا اُس اشتمالی تعلیمی تبلیغ کا جو سارے ملک میں بے پناہ طور سے جاری

کیا گیا تھا - اور ہر شخص پر اُس کی فہم کے مطابق اپنا اثر جما رہا تھا - یہ
اثر رفتہ رفتہ اتنا بڑھ گیا کہ اس نے ایک عام مطابلے کی شکل اختیار
کر لی - جمہوری حکومت تو یہ چاہتی ہی تھی کہ کسی طرح عوام میں خود علم
کے حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے - اشتمالی تعلیمی تبلیغ کی کامیابی
کو دیکھ کر حکومت نے اس تبلیغی کام کو اور زیادہ زور و شور سے جاری
کرنے کے احکامات نافذ کئے اور دوسری طرف یہ کیا کہ تعلیم کے حاصل
کرنے کے لئے بے انتہا آسانیاں مہیا کی جانے لگیں۔ ہر پڑھنے لکھنے
کی حوصلہ افزائی کی جانے لگی، ایسے مدارس قائم کئے گئے جن میں لوگ
مفت تعلیم حاصل کر سکیں - مصوری، گانا بجانا، ڈرامہ، سینما، لکھنے
پڑھنے غرض مدرسے اور طرح طرح کے شعبے قائم کئے گئے تاکہ لوگ
لکھنے پڑھنے کی تعلیم کے ساتھ اپنی دلچسپیوں میں بھی ماہر ہو سکیں اس
قسم کے مدارس یہی نہیں صرف مرکز پر قائم کئے گئے ہوں بلکہ شمالی
پاکستک (noth yakustk) اور
تاذجیکستان (Jodjhikistan) جیسے مقامات
پر بھی جو مرکز سے کافی فاصلے پر واقع ہیں ...... قائم کئے گئے
او ر اشتمالی تبلیغی تبلیغ زور و شور کے ساتھ جاری کی گئی - یہاں پر یہ کہنا
غالباً بجا ہو گا کہ اشتمالیوں کا یہ دعویٰ کہ دُنیا کے کسی مدرسے میں بچّہ کی
پسند کی اتنی چیزیں نہ ملیں گی جتنی کہ اُن کی درسگاہوں میں پائی جاتی
بالکل بجا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم میں اس قدر دلچسپی لیتے ہیں اور اپنے
بزرگوں کی تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں میں برابر کا ہاتھ بٹاتے ہیں

اشتمالی رہبروں کو سارے ملک میں اسی وجہ سے بہت جلد
کامیابیاں ہوئیں اور شب و روز ہو رہی ہیں کہ اُن کے چھوٹوں نے
جد و جہد میں برابر کا ہاتھ بٹایا اور اُن کی مدد کی - آج ہم دیکھتے ہیں کہ
موجودہ اشتراکی نسل (جو اشتمالی طریق بود و باش کی تربیت پا رہی ہے)
...... اُس میں اور اُن بچّوں میں جو دوسرے ممالک کے بچّے
ہیں اور اشتراکیت و اشتمالیت سے قطعی بے بہرہ ہیں زمین و آسمان
کا فرق ہے - بچّوں کو تو خیر چھوڑیئے اُن کے بڑوں ہی کو لے لیجئے
آپ دیکھیں گے کہ غیر اشتراکیوں میں کس طرح سے آئے دن سیاسی
اختلافات اور ہر شخص کے نئے نظریات پر مذاہب کے جھگڑوں اور
اختلافات پر .... سر پھٹول ہوتی رہتی ہے
لیکن اسکے برعکس اشتراکیوں کی زندگی پر اگر آپ ایک نظر ڈالیں گے تو
آپ کو بہ آسانی یہ پتا چل جائے گا کہ اُن کا ایک مقصدِ حیات، ایک نظریہ،
ایک سیاسی اصول، غرض اُن کی ہر شے میں اگر ایک طرف شانِ وحدت
نمایاں ہے تو دوسری طرف جلوۂ اتحاد و مساواتِ انسانی بھی اپنی شعاعوں
سے اور اپنے نور سے اشتمالی محفل کے بیٹھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے - آج
یہی وہ شے ہے، یہی وہ روشنی ہے اور یہی وہ تحریک ہے کہ جو شخص اس کا
دامن پکڑتا ہے وہ ایک زبردست بھائی چارہ اور بین الاقوامی زنجیر
میں ایک مضبوط حلقہ بن جاتا ہے اور اس کا شیدائی نظر آنے لگتا ہے
اور چاہتا ہے کہ کاش یہ اصول حیات چہار دانگِ عالم میں پھیل جائے
اور ہم جو آئے دن اپنی کم علمیوں کی بنا پر ایک آدم کی اولاد ہوتے ہوئے
انسانی خون کی ہولی کھیلتے ہیں وہ ختم ہو جائے - لیکن یہ خون کی ہولی اُس
وقت تک نہیں بند ہو سکتی جبتک ہم میں یہ سمجھ نہ پیدا ہو جائے کہ ہم ایسا
کیوں کرتے ہیں - آئیے میں آپ کو چند سطروں میں اس کا سبب بھی بتاؤں
گو یہاں اس کا تذکرہ بالکل غیر متعلق ہو گا مگر میں اس مسئلہ پر اس وقت
روشنی ڈالنے میں کوئی ہرج بھی نہیں سمجھتا - یاد رکھئے کہ ہم آج جو آئے
دن انسانی خون کی ہولی کھیلتے رہتے ہیں اُس کا سبب صرف ——————
ہماری جہالت —————— غلط قسم کا طریقۂ تعلیم —————— اور
اقتصادی و معاشی بھوک ہے —————— !؟ جو آج دُنیا کے تمام
غیر اشتراکی خطوں میں پھیلی ہوئی ہے -

سیاسی تعلیم

اشتمالی نظریّہ کے مطابق تعلیم کا تعلق سیاست اور معاشیات سے اُسی طرح
ہے جس طرح کہ معاشیات یا سیاسیات کا تعلق ایک دوسرے سے - اس نظریّہ
کی اکثر و بیشتر روسی ماہرینِ تعلیم تشریح کر چکے ہیں اور بارہا اس پر روشنی
ڈال چکے ہیں - یہی وجہ ہے کہ آج ہو بہو لفظ تعلیم اور نظریۂ تعلیم کو جمہوریّہ
اشتراکیہ میں انہیں معنوں میں سمجھا جاتا ہے - اور جب تعلیمی ترقیاں یا تعلیمات
کے مسئلوں پر سوچ و بچار کیا جاتا ہے تو انہیں نظریوں کو پیشِ نظر رکھا جاتا

ہے۔ جمہوریۂ اشتراکیہ کے پیشِ نظر تعلیم کے یہ مقاصد نہیں جو میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ کلرکوں کا اضافہ کیا جائے بلکہ اس کا مقصد متمدن اور قابل ہستیوں کی پیداوار ہے جن سے جمہور اور ملک دونوں کو فائدہ پہنچے۔ "تمدن" کا لفظ جمہوریۂ اشتراکیہ میں ایک ایسا وسیع المعنی لفظ ہے جس کو وہ ہر معنی میں بطور اصطلاح کے استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ سے وہ صرف لغت کے چند معنی نہیں لیتے بلکہ اس سے اُن کی مراد آرٹ اور سائنس، سیاسیات اور معاشیات، کھیل کود، کام کاج، طور وطریق اور اعلیٰ بود و باش غرض شعبۂ زندگی کی ہر شے کو اس میں دخل ہے۔ سینما کے ہال میں دیر سے پہنچنا وہاں انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے اشخاص کو انتہائی غیر مہذب اور غیر متمدن سمجھا جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کو بسا اوقات سزائیں بھی دی جاتی ہیں اور ایسی سزائیں یہ ہوتی ہیں کہ ایسے اشخاص کو تہذیب و شائستگی سکھانے والے مدارس میں داخل کیا جاتا ہے اور جب تک افسران مدارس افسران متعلقہ کو یقین نہ دلادیں کہ اب یہ لوگ مہذب ہو گئے ہیں ان مدارس سے چھٹکارا حاصل کرنا سخت مشکل ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جمہوریۂ اشتراکیہ میں بغیر موزوں کے چلنا پھرنا، نیکر پہن کر سوائے کھیل کود کے میدان کے گھومنا یا کسی ایسی چیز کو پہن کر شاہراہ عام یا سینما وغیرہ میں گھومنا جس سے نسائی ٹانگیں یا جسم کا کوئی حصہ کھلا ہوا نظر آئے اور تہذیب و تمدن انسانی کے منافی ہو بد تہذیبی ہے۔ ایسے اشخاص کو متذکرہ بالا مدارس میں بلا کسی عذر و معذرت کے داخل کر دیا جاتا ہے۔ اور جب تک اس کی ذات سے اس بدتمیزی اور بد تہذیبی کا دھبہ نہیں مٹ جاتا اُسے تہذیبی مدارس میں اپنی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارے آج کے نوجوان جمہوریۂ اشتراکیہ کی موجودہ سختیوں اور پابندیوں کو بیہودہ اور فضول کہیں۔ لیکن ایسے نوجوانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اشتراکیت کے معنی اُس غلط قسم کی آزادی کے نہیں ہیں جس کو وہ آج سمجھے ہوئے ہیں بلکہ اشتراکیت اور اشتمالیت نام ہے اُس فلسفۂ حیات اور اصولِ حیات کا جو حیاتِ انسانی کے شکستہ اور زنگ خوردہ ڈھانچے کو جو آئے دن کے حادثات عالم کے وجود میں آنے سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے جوڑ کر زندگی کی نئی بجلی دوڑا دے اور انسان کے رگ و ریشے میں پھر اُس کی بھرپور جوانی عود کر آئے۔ آج کہنے والے کچھ ہی کہیں مگر کون ایسا بدبخت ہوگا جو اشتمالیوں کے اس نظریہ سے اختلاف کرے گا کہ تہذیب و تمدن تعلیم کا ایک زبردست ترین حصہ ہے۔ اشتمالی حکومت کا مقصد اور مدارس کے مقاصد ایک ہیں۔ سیاسی اور معاشی مدارس کی منزلِ مقصود ایک ہے، اُن کی حیات اور بقا کا سوال اُن کے پنج سالہ نظامِ تعلیم کی کامیابی اور ناکامیابی پر ہے۔ اسی نظریۂ تعلیم کو پیشِ نظر رکھ کر سیاسیات کو تعلیم میں بڑا دخل دے دیا گیا ہے سینما، تھیٹر، عجائب خانے غرض ہر چیز میں سیاسیات اور تعلیم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور یہ تمام چیزیں کمشنر تعلیمات کے زیرِ تحت کر دی گئی ہیں۔ حکومت اشتمالی کے محکمۂ تعلیمات میں ایسے لوگ خاص طور پر رکھے گئے ہیں جو اشتمالی عوام کو اکثر بتاتے رہتے ہیں کہ ان اشیاء سے اہلِ ملک کس طرح فائدہ اُٹھائیں۔ اور یہ تربیت عوام کو اُسی وقت سے دی جانے لگتی ہے جبکہ وہ ابھی دارالصبیان (creche) ہی میں تعلیم پاتے ہوتے ہیں۔ اور یہ تعلیم اُس وقت تک دی جاتی ہے جب تک کہ وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کرلیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی معلوماتی جلسے طلب کئے جاتے ہیں، جن میں لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ اعلیٰ تہذیب و تمدن کسی آزاد اور اشتراکی ملک کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ غرض اُن کے دل و دماغ میں اعلیٰ تہذیب و تمدن کا لفظ اس نوعیت سے جذب کر دیا جاتا ہے اور شروع ہی سے اُنہیں اعلیٰ تہذیب و تمدن کی تربیت اس طرح دی جاتی ہے کہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں رہیں مگر اپنی اعلیٰ تہذیب اور اپنے اعلیٰ تمدن کو کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑتے۔ ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ ہے اُن کی اوّلین تربیت کا۔ کیونکہ یہ فلسفۂ نفسیات کا اصول ہے بچے کو شروع میں جس طرح کی تربیت مل جائے گی اپنے مرتے دم تک وہ اُسی سانچے میں ڈھلا رہے گا۔

تمام سیاسی برسیاں، معاشیاتی جانفشانیاں مثلاً قحط کے قرضے یا فصل کے کاٹنے یا بونے کی مہم سرانجام دینا۔ درس میں آج مدرسے اور تفریح گاہوں کی زندگی کا جزو بن گئی ہیں۔ اشتمالی اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ ایسی مہموں کو سرانجام دینے کیلئے فوراً تقریری جلسے رہیں، مقابلاتی موضوع دیے جائیں اور پھر اسے شماری دی جائے۔ اس کے بعد جو کچھ متحدہ طور پر

طے ہو اُس کو اُسی طریقے پر جس طرح کہ آپس میں طے ہو سر انجام دیں۔ مدرسوں کی پرورش گاہوں میں معمولی سے معمولی باتوں کیلئے تقریری مقابلے طلب کئے جاتے ہیں اور اسکے بعد کام کو سر انجام دیا جاتا ہے۔ کاغذ، پنسل، موقلم، ناچ گانا، غرض ایسی تمام چیزوں کا جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں سیاسی تعلیمات سے گہرا تعلق ہے "طبعیاتِ اجتماعی" جیسے اشتمالی سیاست بھی کہہ سکتے ہیں ——— ہر بچّے کے لئے اس کی تربیت [illegible] کرنا ضروری ہے ——— اور ہر مدرسہ کے نظام الاوقات میں ۱۹۳۲ء تک اسے برتا گیا۔ اُسی سال کے موسم خزاں [illegible] کہ تمام نظام الاوقات سے نکال کر الگ نصاب کی شکل دی گئی جو بارہ سال سے کم عمر کے طلبا کیلئے ضروری قرار دیدیا گیا اور اس جگہ پہلے نظام الاوقات میں تاریخ کو دی گئی ۱۹۳۲ء میں پوری طرح سیاست کا گہرا رنگ ہر شعبۂ حکومت پر چھایا ہوا تھا۔ مدرسائی پرورش گاہوں میں بڑے بڑے رنگین سیاسی اشتہارات، جوشیلے اور انقلابی اشعار ہوتے کتنے فوجی سپاہیوں اور جنگی طیاروں کی تصاویر آویزاں رہتی تھیں ہر گیت اور ہر نغمہ میں پنج سالہ نظام اور اشتمالی انقلاب کی خوبیوں اور بھلائیوں کا تذکرہ ضرور ہوتا تھا۔ غیر ملکوں کے بچّوں کی بابت اشتمالی بچوں کو جو معلومات دی جاتی تھیں وہ ضرورت سے زیادہ ہوتی تھیں ——— ——— یہ کہنا کہ غالباً صرف اُسی قسم کی معلومات دی جاتی ہونگی جن میں یکسانیت پائی جاتی ہوگی ——— غلط ہے اور قطعی غلط۔ انقلاب کے بعد کے ہر رُخ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انقلاب سے پہلے کی ایسی ہی شاید کوئی چیز ہو جس کی قدر کی جاتی ہو یا جس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ جہاں تک میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے مجھے پتا چلا ہے کہ آجتک جمہوریۂ اشتراکیہ میں انقلاب سے پہلے کی کسی شے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

دو سال کے عرصہ میں تمام تبدیلیاں جو اشتمالی حکومت کے رہبروں کے پیش نظر تھیں تقریباً سب عمل میں آگئیں۔ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے کچھ سال بعد تک مدارس میں انقلابی تصاویر انقلابی کتبے وغیرہ آویزاں تھے آج اُنہیں مدارس میں آپ جاکر دیکھئے تو آپ کو اُن میں آرٹ کی وہ مایہ ناز اور کمیاب تصاویر اور کتبے ملیں گے جن کی قیمت آج دُنیا کے مستوری میں لاکھوں اور کروڑوں سے کم نہیں آج روسی اشتمالی بچّے انقلابی اور خونی نغموں کے بجائے دوسرے ممالک کی طرح خوبصورت اور شیریں گیتوں سے اپنے مدرسوں کے در و دیوار کو مسحور کر رہے ہیں۔ وہ اپنے امن انگیز پیام سے دُنیا کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے معصوم اور بھولے بھالے نغموں سے گمراہ دنیا کو راہ پر لگا کر اُس کی اندھی آنکھوں میں روشنی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ روسی مائیں آج اپنے بچّوں کو پریوں اور دیو [illegible] کے قصوں کے بجائے جنگِ انقلاب کی کہانیاں سناتی ہیں۔ مُلکی تعمیر کے طریقے شروع سے اُن کے کانوں میں ڈالتی ہیں۔ غرض ہر فرد بچّہ کو ایسی تربیت دینے کی کوشش کرتا ہے اور دیتا ہے کہ بچّہ بڑا ہو کر مکمل انسان بن جائے۔ تاریخ اور جغرافیہ دوسرے ممالک کے بچّوں کی طرح اشتمالی بچّے بھی پڑھتے ہیں اُن کی تاریخ و جغرافیہ کا نصاب تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کسی سرمایہ دار ملک میں ہوتا ہے۔ یہاں میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ خیال ہے کہ آپ کو میرے اوپر کے بیانات سے یقینی غلط فہمی ہو [illegible] سبب ہے اس لئے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اشتمالی تعلیم کا مقصد ہرگز یہی نہیں ہے کہ بچّے کے دل و دماغ میں بچپن ہی سے سیاست کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے۔ نہیں بلکہ اُن کا مقصد یہ ہے کہ بچّہ جو آنے والی نسل کا ایک فرد ہوتا ہے شروع سے یہ سوچ سکے اور سمجھ سکے کہ اُسے کس رنگ میں ڈھلنا چاہئے تاکہ اس کا مستقبل کامیاب ہو۔ بقول ناظرِ مجلس علمی جو مارکس کے فلسفۂ حیات کے نظریہ کے بموجب طلبا کو نظم و نسق، صنعت و حرفت وغیرہ کی تعلیم دیتا ہے کہ "تاریخ اور جغرافیہ کی ایسی باتیں بچّوں کو نہیں پڑھانی چاہئیں جن کا نہ کوئی سر ہو نہ پیر۔ جو ایک ملک کے بچّوں میں جو ہماری آنے والی نسلیں اور قومیں ہونگی شروع ہی سے بغض و کینہ تعصب و فساد کی بنیاد رکھدیں" بالکل اسی قسم کے خیالات کا اظہار نائب کمشنر تعلیمات نے آج سے چند سال پہلے کیا تھا۔ اُنھوں نے فرمایا تھا کہ "تعلیم سیاست کے تابع ہونی چاہئے"۔ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے نہایت زوردار الفاظ میں اُنھوں نے کہا تھا کہ "اشتمالیت جب تمام سرمایہ دار دُنیا پر چھا جائیگی اُس وقت اسکی سیاسی تبلیغ سے ہم سرمایہ دار ملکوں کا

اُسی طرح مقابلہ کر سکینگے جس طرح وہ آج ہماری تحریک کی راہ میں اپنے سرمایہ کے زور کی بنا پر روڑے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب ہم تحریک اشتمالیت کے ساتھ ساتھ تمام عالم میں تحریک تعلیم بھی جاری کر دیں۔ کیونکہ جاہل عوام اوّل تو ہماری تحریک قبول ہی نہ کرینگے اور اگر اُنہوں نے قبول کر بھی لی تو خود ہمارے لئے اُن کا ہماری جماعت میں شریک ہونا مضرت رساں ہوگا اور پھر شاید ہمارا ابھی وہی حال ہو جو اکثر دُنیا کی بہترین تحریکوں کا عوام کی جہالت سے ہوا۔"

۱۹۳۴ء تک اشتمالیت کو کوئی خاص کامیابی نہوئی وجہ صاف ظاہر ہے۔ دُنیا کے اشتمالی رہبروں نے بھی اسے محسوس کیا اور ناظرِ مجلسِ علمی کی پیشین گوئی پر اب زور و شور سے عملدرآمد شروع ہوا۔ ملک کے کونے کونے میں تحریکِ علم جاری کر دی گئی ....

....

...... یہ اس زور و شور سے جاری ہوئی کہ سرمایہ دار ملکوں کی آنکھیں کھل گئیں اور مجبوراً تحریکِ علم کو اُنہیں بھی اپنے ملکوں میں جاری کرنی پڑا۔ لیکن دونوں کی تحریکوں میں اگر ہم معمولی چھان بین ہی کریں تو صاف فرق نظر آ جائیگا اگر ایک کی تحریک کا مقصد یہ ہے تو دوسرے کی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ بین الاقوامی بھائی چارہ ساری دُنیا میں قائم ہو جائے۔ لوگ اپنی علمیت سے آرٹ اور سائنس کو دُنیا میں زیادہ سے زیادہ پھیلا سکیں۔ اگر ایک طرف بچّوں کو پٹ، ڈسریلی بالڈون، چرچل، چیمبرلین اور میکڈانلڈ جیسے رہبرانِ ملک کے حالات سے آگاہ کیا جاتا ہے تو دوسری طرف رہبرانِ انسانیت مارکس، اینجل، لینن، گورکی، ٹراٹسکی، اسٹیلن کی زندگی اور ان کے فلسفۂ حیات سے واقف کرایا جاتا ہے۔ اگر ایک طرف بچّوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ اور نئی تاریخ کے ساتھ چلو تو دوسری طرف بچّوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ کی تقلید نہ کرو کیونکہ زمانہ غلط راہ پر جارہا ہے۔ اگر ایک طرف بچّوں کو انسانِ کامل بنانے کے لئے پنج سالہ نظام کی کامیابی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اُن کی حساب دانی اور علمیت کی ترقی کی کوششیں کی جاتی ہیں تو دوسری طرف بچّہ کو "سود در سود اور نفع ونقصان" کے اصول رٹائے جاتے ہیں اور ان کی قابلیت کی ترقی اسی رٹائی میں سمجھی جاتی ہے۔ کہنے والے جو کچھ بھی کہیں لیکن آج جو روسی ماہرین پنج سالہ نظام یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے ملک کے بچے جو آئندہ اپنی قوم و ملک کی باگ سنبھالیں اس طرح سے منظم و مرتب ہو جائیں کہ دُنیا کا کوئی نقص نہ انگلیاں اُٹھا سکے اُنکی اخلاقی اور دماغی و ذہنی حالت اسقدر بلند ہو جائے کہ دُنیا کی کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہ کر سکے تو اس میں مجھے بتائیے کیا بُرائی ہے-؟!

سعدی جعفری

زعفران زار میں ایک رات

ساقی ساغر میں زعفرانی بھر دے
دُنیا ہے صرف اک کہانی بھر دے
یہ چاندنی رات اور یہ زعفران زار
ماہ وشبِ ماہ کی جوانی بھر دے

ساغر

کشمیر ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۰ء

رامائن اور مہابھارت کے زمانے پر ایک نئی روشنی

(تاریخ ہند کے متعلق چند غلط فہمیاں)

ہمارے دوست تیج بہادر سنہا بی۔ اے بریلوی نے انگریزی میں ایک بسیط مضمون (On The Epic age A new light) تحریر کیا ہے اس نمبر میں اس کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔

مسئلہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے مگر جو باتیں سنہا صاحب نے تحریر کی ہیں، وہ مضبوط تاریخی دلائل رکھتی ہیں۔
(ساغر)

یہ بات ذرا عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن ہے بالکل ٹھیک کہ جو تاریخی کتب ہمیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں وہ چند غلط قیاسات پر مبنی ہیں اس لئے قریب قریب غلط ہیں۔ اگر ہم ان بنیادی غلطیوں کو ٹھیک کرلیں تو ہندوستان کی قدیمی تاریخ سمجھنے میں زبردست مدد مل سکتی ہے۔

ان غلط قیاسات میں سب سے پہلے عیسائیوں کا یہ عقیدہ آتا ہے کہ دنیا کی تخلیق کو کوئی دس ہزار سال گزرے ہونگے اور ۶۰ ہزار سال پہلے حضرت انسان کا وجود ہی نہ تھا۔ اس عقیدے کے زیر اثر تاریخ ہند کے غیر ملکی محققین کیلئے یہ سمجھ لینا بالکل غیر ممکن تھا کہ عین اس وقت جبکہ عیسائی دنیا عالم وجود میں آئی تھی ہندوستان کی تہذیب معراج کمال کو پہنچ چکی تھی یقینا قدیم یونانی سفیر میگستھنیز کی واقفیت ان لوگوں سے کہیں زیادہ تھی وہ لکھتا ہے "اہل ہند ڈایونی سس (Dionysos) سے سنڈروکوٹس (Sandrokottos) تک ۱۵۳ بادشاہوں کا پتا بتاتے ہیں جن کا مجموعی عرصۂ حکومت ۶۰۴۲ سال کا ہے اس عرصے میں تین مرتبہ جمہوری سلطنتیں بھی قائم ہو چکی ہیں۔ وہ لوگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ڈایونی سس ہیراکلیس سے پندرہ پشت پیشتر ہو چکا ہے۔"

بدقسمتی سے ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا جاسکا ہے کہ یہ ڈایونی سس کس قدیمی راجہ کا نام تھا میگستھنیز نے ہر ایک نام یونانی لہجے میں لکھا ہے گو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آخری بادشاہ سنڈروکوٹس مہاراج چندرگپت سنہ ۳۲۳ ق۔م کے قریب تخت نشین ہوئے تھے اس حساب سے ڈایونی سس کے زمانے کو ہزار سال سے زائد کا عرصہ گذر گیا ہے اسپر بھی لطف یہ ہے کہ میگستھنیز نے یہ نہیں لکھا ہے کہ ڈایونی سس ہندوستان کا پہلا بادشاہ تھا۔ دراصل ہندوستان کی قدیمی تاریخ کو تعلق اس قدیم زمانے سے ہے جب کہ زمانۂ حال کے غیر ملکی مورخوں کے نزدیک حضرت انسان کا پتہ نہ تھا۔

انہی غیر ملکی کرمفرماؤں نے ایک اور عجیب و غریب عقیدے کو جنم دیا۔ میکس مولر نے قدیمی آریہ تہذیب سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آریہ لوگ ایک خاص نسل سے تعلق رکھتے تھے اور لگ بھگ چار ہزار سال پہلے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ہونگے۔ انہوں نے ہندوستان کے قدیمی اور اصلی باشندوں کو دکن اور وسطِ ہند کے جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ اس نظریے کو لیکر اس آریہ نسل کے اصلی وطن کی تلاش

ایشیا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

شروع کر دی گئی۔ کسی نے وسط ایشیا کسی نے خطۂ آرکٹک اور بعض منچلوں نے وسطی یورپ کو آریوں کا اصلی وطن قرار دیا۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میکس مولر کو اپنی زندگی میں ہی اپنی اس زبردست غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بعد کی تحریروں میں یہ بھی لکھا کہ لفظ آریہ نسل سے اس کی مراد کسی خاص قسم کی جسمانی بناوٹ والے لوگوں سے نہیں ہے مگر اس کے اہلِ وطن جرمنی والے اس خیال کو پہلے ہی لے اُڑے تھے انہوں نے اس نظریے کو لیکر یہانتک تحقیقات کر ڈالی کہ اہلِ جرمنی آریہ نسل سے ہیں اور جرمنی آریہ نسل کا اصلی وطن تھا۔ دراصل اس غلط نظریے میں ہی جرمنی کے نئے جارحانہ فلسفے کی خونریز داستان مخفی ہے۔

دراصل ہندوستان پر ہزارہا سال سے غیر ملکی نسلوں کے حملے ہوتے رہے ہوں گے لیکن بہت جلد یہ ضرورت محسوس کر لی گئی ہوگی کہ سب لوگ مل جلکر رہیں اور آئندہ غیر ملکیوں کو ملک میں نہ آنے دیں۔ اس طرح ارتباطِ باہمی سے ایک مشترکہ تمدن کی بنیاد پڑی جو ملک کی ضروریات کے عین موافق تھا اور اس تمدن کو ہم آریہ تہذیب کے نام سے پکارتے ہیں اس تہذیب کا کسی خاص قسم کے نسلی امتیازوں سے تعلق نہ تھا اس میں طویل قامت اور پستہ قامت گورے اور کالے سبھی شامل تھے۔ دراصل لفظ آریہ کے معنی ہیں اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والا۔ اور یہ لفظ ان تمام لوگوں پر عائد ہوتا ہے جنہوں نے ایک خاص معیارِ زندگی اختیار کر لیا تھا۔

جس طرح آجکل اہلِ وطن کے روبرو ایک مشترکہ ہندوستانی قوم بنانے کا مسئلہ ہے اسی طرح قدیمی محبانِ وطن کو اس مشترکہ آریہ تمدن کے بنانے میں مشکلات پیش آئی ہونگی اور یہ سمجھ لینا دشوار نہیں ہے کہ اس مشترکہ تہذیب کے ارتقا میں ہزاروں سال لگ گئے ہونگے۔

اس آریہ تمدن نے ایک زبردست آریہ قوم کی بنا ڈالی جس نے رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں اپنا اقتدار جما لیا اور آریہ جاتی کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کو وہی پوزیشن حاصل ہوگئی جو آج کل دُنیا کے نقشے میں یورپ کو ہے اُس وقت دُنیا کے دیگر حصے اس درجہ مہذب نہ تھے اور بیشتر ممالک ہندوستان کے تابع تھے دراصل رامائن اور مہابھارت کا زمانہ اسی آریہ قوم کے عروج اور زوال کی کہانی ہے۔

آج کل وادیٔ انڈس کی تہذیب نے مورّخوں کو بہت پریشان کر رکھا ہے وہ لوگ نسلی جھگڑوں میں مبتلا ہو کر ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ موہن جو ڈارو ہڑپا کی یہ تہذیب یافتہ قوم کس نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے خیال میں اگر ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زمانۂ قدیم میں ہندوستان میں بہت سی تہذیب یافتہ نسلیں تھیں جن میں سے کچھ نے مشترکہ آریہ تمدن کی بنا ڈالی تو بہت سی اُلجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

تیسری غلط فہمی کے لئے صرف غیر ملکی مورخین کو ہی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وید نہایت قدیم زمانہ میں مختلف اوقات میں تصنیف کئے گئے تھے اور ان سے اس زمانہ کی تاریخ اور رسم و رواج کا پتہ چلتا ہے بعض مورّخوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ویدوں میں جنگ مہابھارت کے واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے اسی طرح رامائن کے واقعات بھی ویدوں سے ہی اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ہیم چندر رائے چودھری نے مہابھارت سے شیش ناگ خاندان ([illegible]) تک کی تاریخ کی تلاش کی ہے ان کا یہ خیال ہے کہ ویدوں میں پریکشت کی تخت نشینی کا سال موجود ہے۔ اور جنگ مہابھارت پیدائش مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہوئی ہوگی۔ اس لحاظ سے ویدوں کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح ہوا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریہ نہ صرف غلط ہے بلکہ انتہائی شر آمیز بھی ہے اگر ویدوں کو تاریخی نظر سے دیکھا جائے تو ان کا تاریخی مواد نہایت بے ربط معلوم ہوگا۔ بائبل کے تاریخی واقعات میں جو تسلسل معلوم ہوتا ہے اس کا یہاں پتہ بھی نہ ملے گا۔ تو کیا حقیقت یہی ہے کہ وہ کتاب جسے آریہ جاتی کے زبردست رشی مُنی الہامی مانتے رہے ہیں محض بے معنی کہانیوں کا مجموعہ ہے!؟

دراصل ویدوں کے اندر کسی قسم کا تاریخی مواد نہیں ہے گذشتہ صدی میں رشی دیانند نے پہلی مرتبہ یہ دکھایا کہ ویدوں کے ترجمے عموماً غلط کئے گئے ہیں۔ آج کل ہر مورخ جانتا ہے کہ موجودہ سنسکرت چوتھی صدی عیسوی میں مکمل ہو پائی ہے لہذا ویدوں کا ترجمہ کرتے وقت موجودہ سنسکرت کے قواعد سے مدد نہیں مل سکتی۔ کیونکہ وید اس سے

ہزاروں سال پہلے بن چکے تھے۔ اس ترجمے کی خرابی کی ایک آدھ
مثال دیدینا کافی ہے۔ رگ وید۔ منڈل ۴۔ سوکت ۱۵۔ منتر ۷ کا
ترجمہ میکس مولر نے یہ کیا ہے "جب سہدیو کے لڑکے راجکمار نے دو
لال گھوڑے دینے کے خیال سے مجھے یاد کیا تو میں اس شخص کی طرح
کھڑا ہوگیا جو بلایا گیا ہو"

اس منتر کا اصلی مطلب یہ ہے۔

"برہمچاری اپنے اُستاد سے درخواست کرے "اے اُستاد میں
طالب علموں کا ساتھی برہمچاری ہوں میں جن باتوں کو اچھی طرح سے
نہیں جانتا انہیں اچھی طرح سمجھا دیجئے گا تاکہ میں گھوڑوں کی مدد سے
تیز چلنے والے آدمیوں کی طرح مشق اور مطالعہ کی مدد سے عالم بن جاؤں"۔

آج کل ہر ایک انگریزی داں سمجھتا ہے کہ چاسر کے زمانہ کی انگریزی
موجودہ انگریزی سے مختلف ہے۔ حالانکہ چاسر کو صرف سات سو سال
کا زمانہ گزرا ہے تو کیا یہ امر قابلِ قیاس نہیں کہ ویدوں کی زبان اس سنسکرت
سے قطعی مختلف ہوسکتی ہے جس کی تکمیل صرف چوتھی صدی میں ہوئی تھی
اگر ویدوں کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح بھی مان لیا جائے تو بھی کم و بیش
۱۵ سو سال کا فرق ہے جو ایک زبان کی نشوونما اور ارتقاء کے نقطۂ نظر
سے نہایت اہم فرق ہے۔

اگر ویدوں کے صحیح مطالب سمجھ لئے جائیں تو ہماری تاریخ
کی بہت سی بنیادی غلطیاں دور ہوجائیں گی۔

تاریخ ہند کے متعلق چوتھی غلط فہمی کا میرے نفس مضمون سے
براہِ راست تعلق ہے۔ ڈاکٹر اسمتھ کو یقین ہے کہ رامائن صحیح تاریخی روایات
کی حامل نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہ بات بھی ان کے قیاس میں نہیں آتی
کہ دور دراز کے ممالک جن کا مہابھارت میں حوالہ دیا گیا ہے انہیں کورو
اور پانڈووں کے ان مقامی جھگڑوں میں دلچسپی ہوسکتی تھی جو دہلی
اور اس کے گردونواح کے تھوڑے سے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے
اس اعتبار سے دیکھا جائے تو موجودہ جنگ بھی دور دراز کے پولینڈ
میں صرف ذراسی کوراپڈر (Corridor) کے باعث شروع ہوگئی
تھی اور اس میں ہندوستان کو چھ ہزار میل کے فاصلہ سے شریک کرلیا
گیا۔ ممکن ہے اب سے پانچ چھ ہزار سال بعد لوگوں کی سمجھ میں آسکے
کہ پولینڈ کے معاملات سے ہندوستان کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی
لیکن واقعات اپنی جگہ پر قائم رہینگے۔

مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ رامائن اور مہابھارت
اصلی واقعات کے بہت دنوں بعد لکھی گئی ہیں اور ان کے اندر
زمانہ کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں پھر بھی ان کو پڑھ کر
ہمیں اس زمانے کی آریہ تہذیب کی کچھ کچھ جھلک مل جاتی ہے۔

دراصل رامائن اور مہابھارت میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے
وہ بلحاظ وقت ایک دوسرے سے دوری پر ہیں۔ عام طور پر ہندوؤں
کا عقیدہ ہے کہ رامائن کو بالمیک رشی نے اصل واقعات سے ہزار
سال پہلے تصنیف کیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقت اس کے بالکل
برعکس ہے۔ غالباً بالمیک رامائن اصل واقعات کے دس گیارہ
ہزار سال بعد لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان صاف بتاتی ہے کہ وہ دوسری
صدی قبل مسیح میں لکھی گئی ہوگی۔ اصل واقعات حضرت مسیح سے
تقریباً دس گیارہ ہزار سال پہلے وقوع پذیر ہوئے ہونگے۔

اسی طرح مہابھارت کی کتاب نے نویں صدی عیسوی میں اپنی
آخری شکل اختیار کی ہے لیکن اصل واقعات حضرت مسیح سے تقریباً
تین ہزار سال پہلے واقع ہوئے ہیں جیسا کہ ہم کو یدھشٹر کے سمت ۵۰۴
سے پتہ چلتا ہے۔

اس طرح رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں تقریباً ۷ ہزار سال
کا فرق معلوم ہوتا ہے اس عرصے میں بیسیوں انقلابات ہوئے ہوں گے
لیکن رام چندر جی اور کرشن جی سے ہندوؤں کی عقیدت قائم رہی۔ آج
اس زمانہ کی تو تاریخ نہیں ملتی لیکن کسی ہندو کے دل سے رامائن اور
مہابھارت کے واقعات نہیں مٹائے جاسکتے۔

مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ موجودہ رامائن
اور مہابھارت میں شاعرانہ تخیل کا بہت کچھ دخل ہے لیکن اس
تخیل کی تہ میں آریہ جاتی کے عروج و زوال کی کہانی مضمر ہے۔ گو یہ
کتابیں اصل واقعات سے بعد کو لکھی گئی ہیں لیکن ان میں وہ تمام روایات
ملتی ہیں جو زمانۂ قدیم سے ملک میں مروّج تھیں۔

مجھے افسوس ہے کہ رامائن اور مہابھارت پر اعتراض کرنیوالے

یوروپین محقق بائبل کے ذرا ذرا سے واقعات کو بروئے تاریخ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ٹرائے (Troy) کا بارہ سالہ محاصرہ اصلی نظر آتا ہے باوجودیکہ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ محاصرے کے اصل واقعات ہومر سے تقریباً سات سو سال پہلے واقع ہوئے ہونگے۔ ہومر کی داستان ناممکن باتوں سے بھری پڑی ہے لیکن اسکے واقعات کو فرضی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مگر یہی لوگ تواریخ ہند کے متعلق ہر چیز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

تیج بہادر سنہا بی۔اے

حمد ساقی

(نظم کہا ہے مستی کا ایک ابدی ساز ہے ــــ! مگر اس کی ضمانت کیا ہے کہ اپنے ساقی سے ماہر صاحب کے یہ مطالبات واقعی سچے ہیں۔! ؟ ــــ شاید صداقت کی طرح منافقت بھی اک حقیقت ہے)۔! ؟ ساغر

پھر بہار آئی مئے ہوشربا دے ساقی | عقل و دانش کی کشاکش سے چھڑا دے ساقی
دے نہ سادہ سے مجھے بادۂ گلرنگ کے جام | اس میں کچھ مست نگاہوں سے ملا دے ساقی
کوئی باقی نہ رہے شرم و تکلف کا حجاب | تجھ سے ممکن ہو تو ہونٹوں سے پلا دے ساقی
اور بھڑکا مرے سینہ میں دہکتی ہوئی آگ | کون کہتا ہے لگی دل کی بجھا دے ساقی
پردۂ نشہ و مستی بھی رہے کیوں حائل | آج تو سارے حجابات اٹھا دے ساقی
تشنگی ہی سبب شکوہ و فریاد ہوئی | دل سے گذری ہوئی باتوں کو بھلا دے ساقی
مست آنکھوں سے پلا کر مجھے الفت کی شراب | بادۂ ناب کے بھی ہوش اڑا دے ساقی
تو نے کس عالم مستی میں مجھے چھوڑ دیا | میں کہاں ہوں! مجھے اتنا تو بتا دے ساقی

تشنۂ جنبش مضراب ہے ساز ہستی
پھر وہی نغمۂ فردوس سنا دے ساقی

ماہر القادری

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء

قدیم مشرق کے نژاد اور ملل

بنی سام و بنی حام

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ توریت ہی ایک ایسی اکیلی تاریخی سند ہے جس نے نژاد شناسی کے زاویہ سے یہود کی ہمسایہ ملتوں کو تقسیم کیا۔ یہ نہیں معلوم کہ طرزِ تقسیم کی معیاری بنیادیں کیا تھیں مگر بہر کیف توریت میں وہ تمام ملتیں جو بنی اسرائیل کی تعریف میں آتی ہیں ان کی تقسیم اس شان سے ہوئی ہے۔ حضرت نوح کے تین بیٹے تھے سام۔ حام اور یافث۔ بابلی سمجھتے ہیں کہ توریت نسل حام پر نازل ہوئی۔ کنعانی جو زبان کی حیثیت سے یہودیوں سے بہت نزدیک تھے، فینیقیوں کو اور آسوریوں کو بھی اسی نژاد میں گنا گیا ہے مگر عیلامیوں کو جن کی زبان یہودی زبان سے دور کا رشتہ بھی نہیں رکھتی۔ پسرانِ سام کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نسلوں کی تشخیص میں توریت کی نظرِ انتخاب قرابت زبان ایسے نازک مسئلے پر نہ تھی بلکہ سیاسی جذبات کا دخل تھا مگر اب نژاد شناسی کے علم نے اپنا دامن سیاست وغیرہ سے پاک کر کے دوسرے سرچشموں کی طرف نظر ڈالنی شروع کر دی ہے تاکہ نسلوں کے جدا کرنے اور تقسیم میں سہولت ہو۔

اس مسئلہ میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ زبان کی اہمیت بہت بڑھی چڑھی ہوئی ہے مگر تجربہ اور تحقیق نے بتا دیا ہے کہ تنہا یہ منبع بھی بےداغ اور بالکل صحیح نہیں ہے جیسے قبطی عربی زبان میں بات چیت کرتے ہیں حالانکہ وہ بنی سام نہیں۔ مختلف ملکوں میں بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی بول چال بومی زبان میں ہے حالانکہ در اصل ان کے نژاد جداگانہ ہیں۔

جمجمے اور خطوط کے زاویہ بھی مناطِ کامل نہیں بن سکتے، انسانی اخلاق و عادات بھی بے کلف منبع قرار نہیں پا سکتا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ طائفے اور قبیلے جن کا مرکزِ ملتِ واحدہ ہو ان کے اخلاق اور ان کی عادتیں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ بھی مسلّم ہے کہ جغرافیائی ساخت اور تاریخی وحدت ان آدمیوں کے عادات و اخلاق کو یکساں بنا دیتی ہے جو مختلف نژاد سے متعلق ہوں اسی لئے کوئی محکم پایہ کوئی صحیح مقیاس جو ہر پہلو سے معتبر ہو اس کا وجود نژاد شناسی میں نہیں ہے۔ ان تمام فرضی سرچشموں میں زبان نسبتاً زیادہ صحیح ہے اور خاص کر عہدِ قدیم کے لئے بہت مفید ہے۔

نئے نئے اکتشافات کی بنا پر زبان شناسوں نے توریت کے لفظوں کی تاویلیں اور تفسیریں کی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمام وہ ملتیں جن کے لغت کے ریشے عربی لغت کے ریشے ہیں وہ سفید پوست بنی سام کی شاخ سے ہیں جیسے بابلی، آسوری، فینیقی، کنعانی، آرامی، کلدانی، یہود، آدم، اعراب اور وہ اعراب جو حبش میں بس گئے ہیں۔

بنی حام کے متعلق زبان شناسوں میں پورا اتفاق نہیں مگر ذیل کی فہرست پر قریب قریب سب موافق ہیں۔ قدیم مصری اور افریقہ کے وہ لوگ جو سفید پوستوں سے زیادہ نزدیک ہیں جیسے بربر، فیبل، لیبیاء کے رہنے والے ان لوگوں کی زبان کی رشتہ داری بھی مخصوص ہوتی ہے مگر اتنی نہیں جتنی سامی نژاد ملتوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قبطیوں کو چھوڑ کر بنی حام کی ملتوں کی کوئی ادبی زبان نہ تھی اور دوسری دقت یہ ہے کہ قرابت زبان ہمیں ان لغات سے معین کرنی پڑتی ہے جو آجکل استعمال میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے افریقہ کے برّاعظم میں بود و باش اختیار کر لی اپنے تمدن کو بلند نہیں کر سکے۔ حامی زبانیں نحو، صرف اور قاموس کی حیثیت سے سامی زبانوں کے چند نقطوں سے ہم رنگی رکھتی ہیں اسی سے لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ بنی سام و بنی حام کا اصلی وطن ایک ہی تھا۔ اور بعض تو کہہ اُٹھتے ہیں کہ تمام زبانیں ایک ہی اصلی زبان سے نکلی ہیں۔

مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان دو گروہوں کا اصلی وطن آجتک نہ معلوم ہو سکا۔ انسانی تاریخ کو یاد ہو یا نہ ہو عربستان میں ان کے علاوہ اور بھی ملتیں تھیں۔ اور غیر عربستان میں سامیت (Samition) کی بستی تھی۔

سوچا گیا ہے کہ بنی سام و بنی حام کا مسقط الرّاس عربستان ہے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ جب کبھی عربستان میں آبادی بڑھ جاتی تھی تو یہاں کے رہنے والے حاصل خیز ملکوں کی طرف توجہ کرتے تھے اور اسی راستے سے سامی عنصر بھی عربستان کے پڑوسی ملکوں سے شمال و مغرب میں داخل ہوتا تھا۔ ونکلر (winckler) کا خیال ہے کہ عربستان کے رہنے والوں نے چار دفعہ ہجرت کی ہے۔

پہلی: - بابل اور اسوری نہضت جو تاریخی ابتدائی عہدوں میں دو ہزار پانچسو برس قبل میلاد ہوئی ہے۔

دوسری: - کنعانی سوریہ اور دوسرے ملکوں کو قریب قریب ڈھائی ہزار برس قبل میلاد گئے ہیں۔

تیسری: - آرامی اور کلدانیوں کی مہاجرت جو ہزار سال بعد ہوئی ہے۔

چوتھی: - کلدہ اور سوریہ کی طرف عربوں کی ہجرت جو اسلامی پھریرے کے سایہ میں ہوئی اور جس نے قدیم مشرق کے خط و خال بالکل بدل دئے اسی واسطے عالم سامی کی دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔

(۱) شمالی: - بابلی، اسوری، کنعانی، فینقی، یہودی، اسرائیلی اور کلدانی،

(۲) جس میں اعراب اور عربستان کی جنوبی اقوام شامل ہیں جیسے سبا۔ مینا اور حبشہ کے رہنے والے۔

اس جگہ ایک نیا شگوفہ پھوٹتا ہے اور یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا بنی سام نے پہلے پہل بابل و سوریہ کو نوازا تھا یا وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے ایشائے عربی میں ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس مسئلہ میں چھان بین ابتک ہو رہی ہے اور علماء کے دو گروہ ہو گئے ہینکس اپر اور راولنسن کا خیال ہے کہ میخی خطوط سے لیئے گئے ہیں اور سامی زبانوں کے واسطے اوّل اوّل ان کی ترتیب نہیں دی گئی تھی اس لئے کہ وہ صدائیں اور وہ صرف و نحو جو اس خط کے ایجاد کا باعث ہیں وہ سامی زبان کے قواعد سے بالکل نہیں ملتے جلتے۔ اس معاملہ میں بھی بڑی حجت حکایت تھی مگر حسنِ قسمت سے ایک عمدہ سند ہاتھ لگ گئی جس سے صاف پتہ چل گیا دو کھمبے ملے ایک پر ایڈوگرافی یا مفہوم نویسی تھی اور اسی کے آمنے سامنے غیر سامی ہجامی میخی قرارت لکھی ہوئی تھی اور دوسرے کتنے بھی ملے جس میں متن غیر سامی ہے اور جس کا ترجمہ سامی زبانوں میں ہے اس موقع پر ایک خاص چیز جاذبِ توجہ ہوتی ہے۔

بابلی تمدن کے آخری دنوں تک سامی زبان صرف مصنوعی انداز سے لوگوں کی زبان پر اور سینوں میں محفوظ تھی اور صرف یہی مطالب ان میں بیان کئے جاتے تھے۔ (جیسا کہ قرون وسطیٰ میں لاطین زبان جو بالکل مردہ ہو چکی تھی، کتبوں اور مذہبی کتابوں کے لکھنے میں صرف کی جاتی تھی)۔

اس لئے بعضوں کا خیال ہے کہ میخی خطوط اور بابلی تمدن کے بعض دوسرے عناصر سامی منشار کے موافق نہ تھے۔ پھر ان کا اصلی

منشا رکیا تھا؟ ابھی تک اس بات کا جواب تعیین کے ساتھ نہیں دیا جاسکتا مگر یہ نکتہ نگاہ میں رکھنا چاہئے کہ بابل اور اسور کے بادشاہ اپنے آپ کو سومر اور اکد کے بادشاہ کہتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لقب اور اور سومری بادشاہوں نے فیاضی سے استعمال کیا ہے جن کے بعد حمورابی نے جس نے اک وسیع مملکت پر قبضہ کرلیا تھا۔ پہلے پہل اس لقب کا ذکر کیا ہے۔ بابلی مملکت کے اتری حصہ کو اکد اور دکنی حصہ کو سومر کہتے تھے۔ بابلی آثار سے آج بھی آئینہ ہے کہ خود سامی سومری زبان کو عبروں کی زبان یعنی قدیم مذہبی زبان جانتے تھے سلسلۂ اول کے ایک سامی بادشاہ نے اک فرمان جاری کیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکدی ترجمہ سامی نہیں اور سومری حاشیہ ہے مگر یہ بات بھی یقینی طور سے نہیں کہی جاسکتی کہ سومریوں نے میخی خط ایجاد کیا ہے اور یہ بھی تحقیق نہیں ہوسکی ہے کہ سومریوں کا اصلی نژاد کیا تھا سومری زبان کی تحقیق سے گمان ہوتا ہے کہ یہ ملتصق زبان ہے اور اسی لئے زبان شناسوں نے اس کا شمار اورال اور التائی زبانوں میں کیا ہے مگر ان کے اس خیال کو جوہر قبولیت حاصل نہیں ہوا۔

یومبلی کے ذریعہ سے جو حفرائی کام ہوا ہے کہ آثار محفوظ سومری سیارت مشابہ ہیں اور عیلامی شان رکھتے ہیں۔ اسی واسطے ان کو مغالطہ ہوا ہے شمالی ایران کی پہاڑیوں میں سومری اور عیلامی قدیم زمانے میں رہتے تھے اور بعد کو ہجرت کر کے مغرب اور کنارِ فرات تک رہتے تھے اور بعد کو ہجرت کر کے مغرب اور کنارِ فرات تک پہنچ گئے۔ اس دھوکے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سومریوں کا مرکز لیپور شہر تھا اور یہ شہر قلات ایران اور بابلی جگہ کی سرحد پر تھا مگر سامیوں کا مرکز سیپار اور اکدہ تھا ان دونوں میں سے کون یہاں پہلے پہنچا معلوم نہیں مگر اس خیال میں ذرا زیادہ قوت ہے کہ سامیوں کے آنے سے پہلے ہی سومری پہنچ چکے تھے۔ یہاں کے آثار بھی دو حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ ایک میں سامی شان ہے یعنی بال بہت کم ناک نازک اور دوسری علامتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سامی نہیں۔ تاریخ مشرق کے معروف عالم اڈورمیئر (Ed. Meyer) نے اس خیال کو پھیلایا ہے حالانکہ ہالوی (Holoy) جو مشہور آسور شناس ہے شدید طور پر مخالفت کرتا ہے اور اس نے ثابت کیا ہے کہ بابل میں دو ترگی ([illegible]) نہ تھی بلکہ سب کے سب سامی تھے اور میخی خط سامیوں کی ایجاد ہے۔

اب لوگوں نے اس کی تردید بھی شروع کردی ہے مگر ایسے لوگ کم ہیں اور ان کی کثرت ہے جو ([illegible]) کے قائل ہیں اور مزہ یہ ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سومر سے مراد وہی قطعہ ہے جسے توراۃ نے شنعار کے نام سے یاد کیا ہے۔

مصر کی طرف بنی سام کی ہجرت

تاریخ سے پہلے کے زمانے میں بابلی ہجرت کے قبل ہی سام کے بعض قبیلے سمندر کے راستہ سے مصر گئے تھے۔ سامی اور مصری زبانوں کا ربط ضبط دونوں کے ریشوں اور لفظوں سے ظاہر ہے۔ نحوی اور صرفی ترکیبیں ملتی جلتی ہیں۔ ریشے تین حرف کے ہوتے ہیں ساکن حرف ساکن حرف متحرک سے زیادہ اہم ہیں اسی وجہ سے اک زمانہ تک لوگ مغالطہ میں رہے۔ ان کا رہنا سہنا ایک سا تھا اور بابل اور مصر قدیم کے مذہبی اعتقادات یکساں تھے۔ بنی سام ایشیا سے مصر کی طرف گئے تو دلیل یہ ہے کہ مصری جڑی بوٹیاں اور چوپائے ایشیائی حیوانات اور نباتات سے ایک خاص ارتباط رکھتے ہیں جیسے (سی گ مر) جو مصر کا ایک قدیم اور پاکیزہ درخت ہے، اس کی قلم بابل سے وہاں پہنچی تھی۔ انگور، گیہوں، ذرت، گاڈر، بھیڑ اور بکریاں بھی ایشیا سے مصر میں پہنچی تھیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ قدیم مصری آبادی مختلف قبیلوں کے اختلاط کا نتیجہ تھی اس کا اندازہ قدیم مصری مجسمے اور نقاشیوں سے ملتا ہے مصر میں چھ قسم کے انسان پائے جاتے تھے۔ تدریج زمانہ سے سب گھل مل گئے ہیں اور ایک ملت وجود میں آئی۔ اس ملت میں حامی اور سامی عنصر غالب تھے۔

یہ خلط ملط اور ملتِ واحد کا آغاز تاریخ کے پہلے کی باتیں ہیں اور اتنے پہلے کی ہیں کہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ سنہ میلادی سے کئی ہزار سال پہلے یہ امتزاج ہوا تھا اسی لئے دو قسم کے قیاس اصلی مصری باشندوں کے متعلق کئے جاسکتے ہیں۔

۱- یہ کہ مصری لیبیا کے حامیوں کی ایک شاخ تھے جو مغرب سے مصر کو گئے اور وہاں سامیوں میں مل جل گئے -

۲- یہ کہ مصری ایشیائی حامیوں میں سے تھے - ایشیا سے مصر میں گئے اور حامی اور سامی ایک ہی نژاد سے ہیں - دوسرے قیاس کی تصدیق سامی اور حامی زبانوں کی یک رنگی سے ہوتی ہے - حقیقتاً سامی کس راستہ سے ہجرت کر کے مصر پہنچے کسی کو معلوم نہیں مگر یہ ضرور ہے کہ یہ ہجرت آتر کی طرف سے نہ تھی - معرفت الارض والے جانتے ہیں کہ دریائے نیل کا بہاؤ قابلِ اعتبار نہیں - دریائے احمر کی طرف سے سمالی لینڈ (Sumaliland) پونٹ (Pont) راستہ نکل سکتا تھا - آثار بھی اسی شکل کو دہراتے ہیں ایشیا والوں نے مصر کی طرف ایک ساتھ گھار کر کے ہجرت نہیں کی بلکہ دستہ دستہ کر کے گئے ہیں - سمندر کا سفر اس زمانے میں بہت دشوار تھا اور شعب بھی تنگ تھے - یہ ہجرت بھی اسی ہجرت کی طرح ہے جیسے میلاد سے پانچ سو برس پہلے عربستان سے لوگ حبشہ گئے تھے -

عیلام کی طرف بنی سام کی ہجرت

شوش کے حفریات بتاتے ہیں کہ سامی عنصر عیلام میں زیادہ تھا خود لفظ عیلام بھی سامی ہے - اس لئے کہ عیلام کے لوگ اپنی مملکت کو اپنے بحثوں میں 'حاتام ی' یا 'پرتی' لکھتے تھے -

قدیم اعلامی شاہزادوں نے ایسے کتبے لکھے ہیں جن کا خط منجی ہے اور زبان سامی ہے بومی زبان کی سندیں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں جس کا دار و مدار نقوش پر ہے یہ خط منجی خط کے دوش بدوش بھی کچھ دنوں چلا ہے تقریباً میلاد سے دو ہزار آٹھ سو برس پہلے (باش اپی شوشناک) کو منجی خط سے الگ کیا گیا ہے اور ہجائی سمجھا گیا ہے -

میلاد سے پانچسو سال قبل عیلامی تھی - عیلامی زبان کے متعلق شیل، بسیاق، ہیرنگ اور برگ نے کام کیا ہے - ان کا خیال یہ ہے کہ اس کے لہجے مختلف تھے اور قفقازی زبانوں سے ملتے جلتے تھے - مار عیلامی زبان کو گرجی اور بومی زبانوں کے خاندان سے شمار کرتا ہے جو قدیم ارمنستانی تھی یعنی ان لوگوں کی زبان تھی جو ارمنوں کے آنے سے پہلے ارمنستان میں بولی جاتی تھی - یہ زبانیں سامی زبانوں سے اتنی نزدیک ہیں کہ ان کے اندر کا تمدن بابلی اور سامی تمدن ہے - عیلامی سامیوں کی نسبت ویسے ہی ہے جیسے بابلیوں کی نسبت سومریوں سے ہے (دیکھئے تورائف جلد ۱ - صفحہ ۲۷)

سید طالب علی الہ آبادی ایم - اے

پیمان

جہنم زارِ عالم کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
نہیں تو مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

یتیموں کی نگاہِ یاس سے معصومیاں لیکر
میں قندیلِ دلِ مفلس فروزاں کر کے چھوڑوں گا

قسم بیوہ سہاگن کے تمنا سوز آنسو کی
میں ہر روتے ہوئے چہرے کو خنداں کر کے چھوڑوں گا

قسم ٹیپو کے خونِ پاک کی پیارے وطن اک دن
جوانی کو تری ہستی پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

گھنیری زلف کی سوگند اے مہتابِ رخ رانی
میں ہر ظلمتکدہ میرا اک چراغاں کر کے چھوڑوں گا

رنجور عظیم آبادی

مذہب، حکومت، قدروں کا معیار اور موجودہ نظام کی حقیقت

(ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ساغر)

مذہب، حکومت، سماج، قدروں کے معیار اور موجودہ نظام کی حیثیت زندگی میں کیا ہے ــــ!؟

وہ ان بنیادی مسائل کے متعلق گھنٹوں سوچتا اور محسوس کرتا کہ:-
ان اخلاقی اور سیاسی اداروں کی حیثیت زندگی میں تماشائیوں کی سی ہے مدد کرنے والوں کی سی نہیں۔ یہ زندگی کے حالات پر طعن و تشنیع تو کر سکتے ہیں لیکن کوئی علاج پیش نہیں کر سکتے۔

یہ زندگی کی بوتلوں پر لیبلوں کے مماثل ہیں۔ جو دواؤں کے نام تو رکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب بوتلوں پر چسپاں ہیں ان کی ادویات کو بہتر نہیں بنا سکتے۔

وہ غور و فکر کی گہرائیوں میں اتر جاتا اور کہتا کہ:ــ
یہ محض انسانی زندگی کے تماشبین ہیں اسکے ہمدرد یا ہمدم نہیں، آج مذہب کسی کو گناہگار، اور کسی کو کافر بنا سکتا ہے لیکن ایک داخلی طاقت کی طرح انسانی زندگی کو دُکھ سے بچا کر مسرت اور شانتی نہیں بخش سکتا۔ اس کا کام انسانیت پر فتوے لگانا تو ہے لیکن تباہی اور دُکھ سے بچانا اسے نہیں آتا۔

مگر اب یہ تمام تباہی کے قریب ہیں اور ان میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ان کو قائم و ثابت رکھ سکے۔

وہ ان افکار کی وجہ سے ایک اینٹھن سی محسوس کرتا اور کہتا:-
یہ محض تماشبین ہی نہیں ہیں، موجودہ دور میں ان کی ہستی انسانی زندگی کے لئے اک عذاب ہے۔ یہ انسانی زندگی کا دائرہ تنگ سے تنگ کرتے چلے جا رہے ہیں جس طرح ایک مفتوح خود اپنے مقبوضات کو آگ لگاتا ہوا بھاگ رہا ہو۔

موجودہ زندگی میں ان کے افادی اعمال سے قطعی برعکس نتائج مترتب ہو رہے ہیں۔

زندگی یہ برعکس نتیجے دیکھ کر ان سب کو دور پھینک رہی ہے اور یہ چکنا چور ہو رہے ہیں۔

مذہب میں کوئی فطری طاقت نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں داخل ہو سکے اور نہ کوئی خارجی فائدہ ہے۔ یہ اس وقت بھی جب جہالت کی بنا پر حکومت کی طاقت و پُشت پناہی کی وجہ سے زندگی میں اس کو اہمیت دی جاتی تھی زندگی کو دوامی معراج عطا نہ کر سکا ــــ!؟

حکومت کے جاتے ہی اور سائنس کا دور شروع ہوتے ہی مذہب اپنی "قدر"[1] کھو بیٹھا۔ ایک اس کی کفیل تھی اور اس کو بلند کرتی تھی اور دوسری کی موجودگی اسکی ساکھ کا باعث تھی۔

ایشیا- اکتوبر ۱۹۷۰ء

[1] لہ قدر (Values)

وہ اور بھی تفکر کی گہرائیوں میں اُتر جاتا اور محسوس کرتا کہ :-
آج ہم حکومتوں سے کیا توقع کر سکتے ہیں ـــــ ! ؟ کیا یہ راشن کارڈ جاری کر سکتی ہیں ـــــ ! ؟ !
ان حکومتوں سے انسانیت کا یہ توقع کرنا کہ یہ اس کا پیٹ بھر دینگی ہَوا میں قلعہ بنانے کے مترادف ہے۔
"موجودہ نظام" کی بنیاد "حُبّ الوطنی" ہے۔ اس سے ہمیں کیا ملا؟ .... جنگیں، خونریزیاں، مصائب و آلام، بھوک پیاس اور دیوالیہ ہونا۔
اور یہ حُبّ الوطنی کے نشہ سے سرشار فرمانرو اسلطنتیں (Sovereign States) جو دُنیا کو اپنے درمیان تقسیم کئے ہوئے ہیں، ہمیں کیا دے سکتی ہیں ـــــ ! ؟
اشتمالیت، فسطائیت، شہنشاہیت، اشتراکیت اور نازیت نیشنل سوشلزم ایک بدبختی ہے اور سوشلزم حماقت۔
آج حکومتیں، جنگ اور اسلحہ سازی کے متعلق خود دیوالیہ ہو رہی ہیں، وہ بھوکی جانوں کو روٹی کیونکر دے سکتی ہیں۔ البتہ وہ تم سے ٹیکس وصول کر سکتی ہیں اور تمہارے فائدہ کو محدود کر سکتی ہیں۔ تمہاری خوراک کی افراط کو قلت میں تبدیل کر سکتی ہیں اور تمہارے نفع کو زیادہ کرنے کے بجائے کم، یہ تمہاری تفریح میں آسانی کے بجائے مشکلیں پیدا کر سکتی ہیں اور تم سے کہہ سکتی ہیں کہ :-
بڑھو! بڑھو! قومی جلال و عظمت حاصل کرنے کے لئے بڑھے چلو! اُٹھو! مادرِ وطن کے تحفظ کے لئے،
ایک مرتبہ پھر مادرِ وطن کی عزّت کیلئے آگے کی طرف قدم بڑھاؤ۔
اور یہ حکومتیں یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ حکومت کے مفاد کے لئے اپنا سب کچھ ہمیں سونپ دو۔

اور موجودہ قدروں کا معیار تمہیں بدکار اور بداخلاق تو کہہ سکتا ہے لیکن احسن طور پر تمہاری خواہشات کی تکمیل کے اسباب پیدا نہیں کر سکتا۔
جب تم اپنی مجبوریوں کی بنا پر پست ہو جاتے ہو تو وہ تمہیں نفرت اور طنز کی نگاہ سے دیکھ کر تمہارے زخموں کی ترشی میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن ہائے پستی کے غار سے اُٹھا کر زندگی کی معراج یا کم از کم شکم سیری کی معراج پر پہنچانے کیلئے ہاتھ نہیں بڑھاتا۔
وہ محسوس کرتے ہی کرتے چیخ اُٹھتا :-
جو کچھ ہے، یہ ہے ـ ! ؟

مرزا ارشاد احمد بیگ چغتائی

عشق کی نزاکتیں

حُسن اگر بہ نازِ خود عشق کو دیکھتا نہیں
عشق بھی ہے بہ زعمِ خود اس کو بھی اعتنا نہیں

پہلے یہ ربط و ضبط تھا اب ہے یہ بے تعلقی
حسن کو جیسے عشق سے دور کا واسطا نہیں

ان کی نگاہ پڑتے ہی شیشۂ دل بکھر گیا
اُف رے مری نزاکتیں بارِ نظر اُٹھا نہیں

کہئے تو حُسن کے اس کا حال آپ ہیں مضطرب ہے کیوں
جالبؔ خستہ سے اگر آپ کو واسطا نہیں !؟

جالبؔ مرادآبادی

ہندوستان میں صنعتی جدوجہد

(ایک ماہرِ فن کے قلم سے)

ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کو اپنی اہم اور ناگہانی ضروریات کا بندوبست کرنا چاہئے۔ اس کام میں مدد کرنے کے لئے روجر کمیشن وارد ہوا ہے لیکن اجنبی لوگ اپنے فن میں کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں پھر بھی اجنبی کی حیثیت سے وہ اس مقصد کو کس طرح پورا کرینگے ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہر ہندوستانی مسئلہ جس سے ہندوستانی بخوبی واقف ہوتے ہیں نئے لوگوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کا ازسرِ نو مطالعہ کریں اور ان لوگوں کو وقت کے تقاضوں کے خلاف نتائج پر پہنچنا پڑتا ہے۔

۴۰

کے مقابلہ میں وہ سول سروس زیادہ اچھی طرح مسائل حل کر سکتی ہے جو لکڑی کی طرح جنبی واقع ہوئی ہے۔ سول سروس والے باوجودیکہ وہ ظاہری ٹیپ ٹاپ، مسودات [illegible]

[illegible] طی بھی کہا جا سکتا ہے [illegible] کی [illegible] پر بھی اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ سول سروس کسی چیز کو قائم [illegible] رکھ سکتی ہے لیکن نئی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتی۔

موجودہ صورتِ حال کا مطالبہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو منظرِ عام پر لایا جائے جو فکرِ سلیم سے مالا مال ہوں اور جو ظاہری شکل و صورت کی پرستاری اور پرانی ڈگر سے کم وابستگی رکھتے ہوں۔ یہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جنہیں پیداوار اور اُسے منظم کرنے کا کافی تجربہ ہو اور جو اپنے اپنے کاموں کو عملی طور پر جاری کر دینے کا سچا میلان بھی رکھتے ہوں لیکن اگر سول سروس اس کام کے لئے موزوں نہیں تو روجر مشن تو اس سے بھی کم تجربہ رکھتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسی جماعت جو ہندوستانیوں پر مشتمل نہ ہو [illegible]

جسے ہندوستان کا ذرّہ برابر تجربہ بھی نہ ہو، جو ہندوستانیوں کا اعتماد بھی حاصل نہ کر سکے، اور جسے یہ طاقت بھی حاصل نہ ہو کہ وہ ہندوستانیوں کا تعاون ہی حاصل کر سکے وہ ہندوستان میں یہاں کی گاڑی کے پہیّوں کو کیونکر حرکت میں لا سکتی ہے۔

انگریز ہر چیز کے بارے میں اپنا مخصوص تصوّر رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھتا ہے کہ دُنیا بھر کے مقابلہ میں صرف اسی کا تصوّر صحیح [illegible] درست ہے نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی جبلّت سے [illegible] [illegible] میں ہو سکتا۔ حتّٰی کہ شہروں اور قصبوں کے ناموں کے متعلق گو کہ وہ ان کا صحیح تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہے لیکن اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جو تلفظ وہ کرتا ہے وہ غلط ہے چنانچہ اس نے بڑی سفاکی سے دِلّی کی بجائے (ڈلہی)، کالی کتّہ کی بجائے (کلکٹہ) اور مُمبائی کی بجائے (بمبے) نام زبردستی ہم پر منڈھ دئے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دیدہ دلیری اور حیرت انگیز خود اعتمادی کے ساتھ اس نے اپنے اقتصادی تصوّرات اور نظریوں کو ہندوستان کے سر پر اور زیادہ سفّاکی کے ساتھ چپکا رکھا ہے۔ انگریز کی ناقابلِ اصلاح ہٹ کا یہ عالم ہے کہ وہ ہندوستانی اقتصادیات کے سلسلہ میں اپنی بنائی ہوئی اسکیم کے علاوہ کسی دوسری اسکیم کو ماننے کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اسکیم یہ تھی کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے اور اُسے ہمیشہ زراعتی ملک رہنا چاہئے اس لئے اس کی مالیّات کی پالیسی غیر محدود آزاد تجارت پر مبنی ہونی چاہئے۔ تاکہ ہر ملک اسے اپنا دساور بنا کر خوب خوب مال فروخت کرتا رہے اور ہندوستان کی دیہی مصنوعات جہنّم میں جائیں۔

ہندوستان نے اس پالیسی کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔

ایشیا - اکتوبر ۱۹۴۰ء

ہندوستانی خوب جانتے تھے کہ ہندوستانی اقتصادیات کیلئے اس غیر محدود آزاد تجارت کے کیا معنی ہیں۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ محض زمین پر انحصار کرکے معیارِ زندگی اونچا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس امر سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ زراعت کی مدد کیلئے ملک کو واقعی طور پر صنعتی بنانا ایک اہم اور ضروری خواہش ہے۔ ہندوستان میں افلاس کا جو عالم تھا اس کی نظیر دُنیا کے کسی اور مہذب ملک میں موجود نہ تھی۔ اس افلاس کو دور کرنے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے انگریز کے پاس کوئی اسکیم نہ تھی برخلاف اسکے ہندوستانی کے ذہن میں ایک اسکیم تھی لیکن اُسے جاری کرنے کے لئے جو طاقت درکار ہوتی ہے اس پر اُسے قابو حاصل نہ تھا لیکن انگریز نے کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا ' کہ اپنے مفاد کے متعلق انگریز کے مقابلہ میں خود ہندوستانی بہتر علم رکھتا ہے۔ لہذا بڑی بے رحمی کے ساتھ اس نے اپنی رائے پر عمل درآمد کرنا شروع کر دیا۔ یہ عمل درآمد بڑے قاعدے اور سلیقہ کے ساتھ کیا گیا۔ سائنٹفک انداز میں کیا گیا اور انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ اس طرح آزاد تجارت کو اس حد تک آگے ڈھکیلا گیا کہ جب آمدنی کے لئے درآمد کے مال پر ۳ ½ فی صدی محصول لگایا گیا تو اس کے اثرات کو برابر کرنے کی غرض سے حکومت ہند نے فوراً وہائٹ ہال کے حکم کے ماتحت ہندوستانی روئی کے کارخانوں کی پیداوار پر اکسائز محصول بشرح ۳ ½ فی صدی عائد کر دیا۔

ابتدائی مرحلہ میں، روئی، لوہے، شکر اور بہت سی دوسری صنعتوں کو اسی قسم کی آزمائشوں میں سے ہو کر گزرنا پڑا ہے۔ لیکن گذشتہ جنگ عظیم نے ہندوستان کی صنعتی توسیع کو ایک اور ریلا دیا اور اس سے جو حالات پیدا ہوئے انہوں نے ہندوستانی صنعت سازی کو اور ابھارا جو چیز ایک اسکیم کے ماتحت ہونی چاہئے تھی وہ قدرتی جذبہ کے ماتحت ظہور میں آئی۔ ہندوستانیوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس طرح سرکاری ہمت شکنی کے باوجود صناعت نے ہندوستان میں نیا قدم جما لیا۔

جنگ عظیم کے بعد گورنمنٹ نے تھوڑا بہت محسوس کرنا شروع کر دیا کہ آزاد تجارت کے معاملہ میں وہ حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہ دور جو جنگ کے بعد آیا اس کے دوران میں آزاد تجارت کے تصور کے متعلق خود انگلستان تک میں ایک نمایاں تبدیلی ہو گئی۔ ہوا یہ کہ یورپ کے دوسرے ممالک نے تجارت کے میدان میں زبردست مقابلہ شروع کر دیا۔ جرمنی نے جیسے تاوانِ جنگ کی اسکیم کے ماتحت انگلستان کو زبردست سالانہ رقمیں دینی ہوتی تھیں۔ خاص طور پر تجارتی مقابلہ کی ٹھان لی ظاہر ہے کہ ان حالات میں انگلستان کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ آزاد تجارت کی حمایت سے دستبردار ہو جائے۔ اس لئے مابعد جنگ کے دوران میں ایک نئی پالیسی ڈھالی گئی جس نے ایک حد تک ہندوستان کی بھی معاونت کی جنگ کے بعد تحفظاتی پالیسی کی نوعیت دودھ اور پانی کی تھی۔ اس پالیسی کا نام "امتیازی تحفظ" رکھا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ کی گورنمنٹ نے ایک مالی کمیشن مقرر کیا کہ وہ حکومت ہند کی مالیات کی پالیسی کے متعلق مشورہ دے اس کمیشن نے لمبے چوڑے دورے کئے اور سخت محنت اور کاوش کے بعد دو رپورٹیں مرتب کیں۔ ایک رپورٹ میں خالص ہندوستانیوں کی رائے کو ظاہر کیا گیا تھا اور دوسری رپورٹ، ملی جلی نوعیت رکھتی تھی جسے برطانی و ہندوستانی رائے کہا جاسکتا ہے۔ یہ دوسری ہی رپورٹ تھی جس نے "امتیازی تحفظ" کی اصطلاح کو گھڑا تھا۔ اور گورنمنٹ سے سفارش کی تھی کہ مالی معاملات میں اس کی پالیسی آئندہ اسی اصول کے مطابق ہونی چاہئے۔ حکومت ہند نے اس مؤخر الذکر رپورٹ ہی کو بالآخر منظور کیا۔ اس واقعہ نے ہندوستانیوں کے دلوں میں کوئی شبہ نہ رکھا کہ گورنمنٹ ہند ہندوستانی صنعتوں کو آگے بڑھانے کیلئے بالکل آمادہ نہیں اس کے بعد ہندوستانیوں کی تجارتی جدوجہد سے سامراجی ترجیح سروں پہ منڈلانے لگی۔ اب اس بات کے سمجھنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ملک معظم کی حکومت کی اسکیم یہ تھی کہ ہندوستان میں صرف وہ صنعتیں فروغ پائیں جو برطانی اشیاء درآمد کے مقابلہ میں نہ آسکیں۔ مختصر یہ کہ جنگِ عظیم کے بعد "تجارتی تحفظ" کا قانون عملاً صرف غیر برطانی اشیاء درآمد کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ صنعتی ترقی اس سے رک گئی۔ تاہم اگر سرکاری پالیسی بیدلی اور کنجوسی کے ساتھ چلائی جارہی تھی تو کب تھا

قدرت اپنے طریقہ پر وقتاً فوقتاً ابر ھالگاتی رہتی تھی، ہندوستانی صنعت ساز بھی ایسے موقعوں کو فوراً لپک لینے میں سستی نہ کرتے تھے۔ ایسا دور اس وقت تھا جب سر جارج شسٹر حکومت ہند کے ممبر مال تھے۔ جب ہندوستان کو زیادہ آمدنی کی ضرورت پڑی تو دباؤ کے ماتحت محصولات درآمد میں اضافہ کرنا پڑا۔ ہندوستانی صنعت کو اس سے فائدہ پہنچا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ سر جارج شسٹر ایک صاحبِ تخیل انسان تھا۔ حتی الامکان ہندوستان کو منصفانہ طور پر مواقع بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے جانشیں سر جیمیں گرگ نے بالکل برعکس پالیسی اختیار کی اور ہندوستانی صنعتی ترقی اور توسیع سے اپنی مخاصمت کو کبھی نہیں چھپایا۔ اسکے بعد موجودہ جنگ شروع ہو گئی۔ یہ ہے مختصر داستان ہندوستانی صنعتوں کی تاریخ اور جدوجہد کی۔

پچھلی تاریخ دُہرانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہندوستانی صنعت سازی کو اپنے جنم سے لیکر اب تک کتنی زبردست قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ پیدائش کے وقت بچّہ کو حفاظت کے لئے ماں کی نگرانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوستانی صنعت کی پیدائش کے وقت یہ پناہ بالکل مفقود تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ بچّہ کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنے کی باقاعدہ تدابیر کی جاتی تھیں۔ ایسی ناموافق فضا میں ہندوستانی صناعت کی نشوونما ہوئی اور اس درجہ پر پہنچی جو اس وقت سب کے سامنے موجود ہے۔

اگر آج کوئی صاحب ہندوستان کو اس بات کے لئے تیار نہیں پاتے کہ وہ اپنی دفاع یا برطانیہ کی امداد کے لئے کافی سامان پیدا کر سکے تو اس کا الزام کس پر عائد ہوتا ہے۔ "نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن"۔ اا اگست نے بجا طور پر لکھا ہے:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے کبھی یہ پسند ہی نہ کیا کہ ہندوستان کے لامحدود ذرائع کو پورے پورے طور پر ترقی دیں۔ گذشتہ صدی کی کل مدت میں ذاتی مفاد کی تنگ خیالی نے ایک ایسی اقتصادی پالیسی کو مسلّط کرایا جو ہندوستان کو محض خام اشیا مہیّا کرنیکا سرچشمہ سمجھتی تھی اور جس کی بنا پر ہندوستان میں جدید صناعتی ترقی کو یا تو نظر انداز کیا گیا اور یا اس کی ہمّت شکنی کی گئی۔

راستہ میں کیا چیز حائل ہوئی؟ جزوی طور پر کم نظر بنیاپن جو یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان محض کسانوں کا پس افتادہ ملک بنا رہے اور جزوی طور پر سیاسی بے اعتمادی۔ یہ دونوں توجیہیں اگر انہیں حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھا جائے تو گھُل مل کر ایک ہی چیز بن جاتی ہیں۔"

شاید اس سے زیادہ سچّے الفاظ کبھی مُنھ سے نہ نکلے ہوں گے۔

اگر تلافیٔ مافات کرنی ہے تو وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ دورانِ جنگ کی صنعت سازی کو محض گورنمنٹ . یا گورے چمڑے کے لوگوں تک محدود نہ کیا جائے۔ حصولِ مقصد کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا مل اعتماد کیا جائے۔

بعض صاحبان یہ کہتے ہیں کہ روجر کمیشن کا تقرر اس لئے نہیں ہوا ہے کہ ہندوستانی اثرات کو نکال باہر کیا جائے۔ بلکہ معاملہ کی نوعیت ایسی ہے کہ دورانِ جنگ کی پیداوار کی رہنمائی کے لئے ماہرین کی رائے حاصل کرنی ضروری تھی اور ہندوستان میں ایسے ماہرین دستیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ استدلال ایک زبردست کفر ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ بڑی سے بڑی مخالفت کی فضا میں ہندوستانی صناعت پروان چڑھی ہے کیا یہ شہادت اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہندوستانی صنعت سازوں میں استقلال، منظّم کرنے کی قابلیت، اور تجارت کرنے کا مادّہ کافی سے زیادہ موجود ہے۔ کسی بھی صنعت کے ہندوستانی کارخانہ کا چٹھا اُٹھائیے اور اس کا مقابلہ کسی ایسے کارخانہ کے چٹھے سے کیجئے جو یا انگریز کی ملکیت ہو یا اسکے زیر اہتمام ہو اور پھر خود نتیجہ دیکھئے۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے جسے روپیہ لگانے والی پبلک خوب جانتی ہے کہ روئی، کاغذ، شکر، چونا، یا جوٹ میں جہاں کہیں ہندوستانی اور انگریزی کارخانے برابر برابر یکساں حالات میں کام کر رہے ہیں ہر جگہ ہندوستانیوں کے مملوکہ کارخانے زیادہ بہتر نتائج دکھاتے ہیں۔

اگر حکومت فی الواقع چاہتی ہے کہ کار آمد نتائج برآمد ہوں تو اُسے چاہئے کہ اپنی ضروریات کو ہندوستانی صنعت سازوں کی ایک کانفرنس کے سامنے پیش کرے، وقت کا تعیّن کرے اور نئی جدوجہد میں ہندوستانی صنعتوں کی امداد کا وعدہ کرے۔ اگر ایسا کیا جائے تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں گورنمنٹ کو نتائج کی طرف سے ہرگز مایوس نہ ہونا پڑے گا۔ "ادارہ"

لیکن کیا گورنمنٹ ہم پر بھروسہ کرے گی؟ کون کہہ سکتا ہے۔ (ترجمہ)

نیا راگ

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۴۳ء

صنفِ نازک کا ایک یادگار مشاعرہ

مرتبہ محترمہ حمیدہ سلطان، احمد دہلوی

روداد

پچھلی سردیوں میں شیلونگ سے واپس آئے پندرہ دن بھی نہ گذرے ہونگے کہ مسز آصف علی نے دورانِ ملاقات میں ایک زنانہ مشاعرہ براڈکاسٹ ہونے کی تمنا ظاہر کی۔ مگر سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے خود انتظامات کرنے سے معذور رہیں۔

میں نے اندازہ کیا ان کو بڑا شوق ہے کہ دلّی کی یادگار تاریخی اور شعر آفریں فضاؤں میں ایک شاندار زنانہ مشاعرہ منعقد ہو اور سارے ہندوستان سے خراجِ تحسین وصول کرے۔

آرزو، اپنی، مگر مشاعرہ کے انتظامات کا بوجھ رکھ دیا میرے کاندھوں پر، برسوں کا میل جول، دلی شفقت و محبت، میں انکار نہ کرسکی ورنہ مجھے ایسے کاموں سے کچھ دلچسپی نہیں جس میں ذرا بھی نام و نمود کا شائبہ ہو، ایک تو ان کا حکم، پھر خود بھی اپنی جنس کو شعر و ادب میں حصہ لیتے ہوئے دیکھنے کا شوق،..... میں نے کہا، سرِ تسلیم خم ہے ———

وقت کم، شاعر بہنوں کا جمع کرنا، کلام کی جانچ پرتال، ایک مشکل بھول بھلیاں سے ہی درپیش تھی !؟

لیکن خدا کا شکر ہے اٹھائیس جنوری ۱۹۴۳ء کے عورتوں کے پروگرام میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے یہ پہلا زنانہ مشاعرہ نشر ہوا،

(۲)

مگر ایک تو وقت کی کمی، دوسرے ریڈیو کی پابندیاں، کچھ آزادی، اطمینان سے اس مشاعرہ کا لطف حاصل نہ ہو سکا، نہ سب بہنیں اس میں حصہ لے سکیں۔ میں نے مسز آصف علی سے اپنی آرزو ظاہر کی، کہ ایک ایسا مشاعرہ لیڈیز کلب دلّی کی طرف سے منعقد کیا جائے، اس میں خوش ذوق ہندو مسلم خواتین حصہ لیں۔ اس مرتبہ بھی انتظامات کا بار میں نے اپنے ہی کاندھوں پر لیا۔

مسز آصف علی نے میری تجویز کو سراہا اور مشاعرہ کے انتظامات ہونے لگے۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا، لینے کو تو اتنی بڑی ذمہ داری لے لی، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو مستقل مصیبت ہے۔ اس مشاعرہ سے وہ کوفت ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔

صدر کے انتخاب کا سوال پیدا ہوا، چند معزز بہنوں کو میں نے گھر پر تکلیف دی، ان سب نے رائے دی، بیگم نواب اسمٰعیل خاں کو صدر بنایا جائے۔ میں نے کہا، بیگم صاحبہ اس کی اہل ہیں، مگر یہ کیا، دلی میں مشاعرہ ہو، اور صدر باہر سے بلایا جائے[1]؟

بڑی رد و کد اور کئی گھنٹوں کی جھک جھک کے بعد ایک ہندو خاتون (؟) کو صدارت کیلئے منتخب کیا گیا، ان خاتون نے غرض کرنے پر صدارت تو قبول کر لی مگر فرقہ دارانہ سوال اور مذہبی جھگڑے نکالے۔ "اُسے بی بی! سرسوتی بھون ہندوؤں کا کلب، اور وہاں مشاعرہ!؟ میں تو پسند نہیں کرتی"

آخر ان سے بھی مایوس ہونا پڑا۔ میری آرزو تھی، دلی کی کوئی خاتون صدر بنیں، (!!) ورنہ خواتین کی کوئی کمی تھی۔ ہز اعلیٰ افسر کی بیگم کرسیٔ صدارت پر

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء

[1] اب پنجابیوں کی شکایت نہیں ——— "!؟"

مشکل پہنچانی تھیں -

آخر مسز آصف علی کے مشورہ سے محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کو صدر تجویز کیا گیا - یہ مرحلہ بھی خدا خدا کر کے طے ہوا ۔

کسی نہ کسی طرح تاریخ مشاعرہ کا تعین کیا گیا - ۲۶ر مارچ ۱۹۴۰ء کے لئے خاص و عام خواتین کو دعوت دیدی گئی -

ہر خاتون کے پاس خود جا جا کر، الگ منت سماجت کی، ٹیلیفون الگ، دلی جیسا بڑا شہر، مگر اس شہر میں جسے شعر و ادب کا مرکز کہا جاتا ہے بیس سے زیادہ بیبیاں نہ مل سکیں، اور پھر ان بیس کو جمع کرنے میں بھی جو مشکلیں مجھے اٹھانی پڑیں کچھ میرا ہی جی جانتا ہے -

عورتوں میں شعر و ادب کی کافی ترقی ہو سکتی ہے مگر ——— بیجا قیود کی بدولت غریب عورتوں کے دماغ سے صلاحیتِ شعری بالکل فنا ہو گئی ہے ورنہ شعر و نغمہ صنفِ نازک کا خاص حصہ ہے، ان فنون سے تو عورت کو ایک خاص، صناعی اور قدرتی لگاؤ ہے -

مشاعرہ کے سلسلے میں فروری کے مہینے سے لیکر مارچ کی ۲۶ر تک میری سرگردانی اسمبلی و کونسل کے امیدواروں کے الیکشن کی طرح تھی - اک جنون تھا، وقت الگ صرف کر رہی تھی، روپیہ الگ برباد ہو رہا تھا مگر چاہتی تھی کہ کسی طرح مشاعرہ کامیاب ہو ۔

اب یہاں سے وہ مرحلہ شروع ہوتا ہے جس نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا - کوئی مشاعرہ سے دو دن پہلے حضرت خواجہ حسن نظامی نے ٹیلیفون پر فرمایا : —

"سنا ہے ۲۶ر تاریخ کو کلب میں میوزک کانفرنس کا جلسہ ہے اور انعام تقسیم کرنے کے لئے چیف کمشنر صاحب آنے والے ہیں، کیا یہ صحیح ہے ——— ! ؟"

مجھے بڑا تعجب ہوا، مگر جب میں نے تحقیق کی، سکریٹری نے کہا آپ کو غلط خبر ملی، میوزک کانفرنس کے جلسے ۲۵ر تک ہونگے -

مشاعرہ کے علاوہ ۲۶ر کو کلب میں کوئی جلسہ نہیں ہے ... معاملہ ختم ہو گیا، مشاعرہ کوئی میری ذاتی چیز نہ تھا، لیڈیز کلب دہلی کی طرف سے تھا، میں تو صرف ایک کارکن تھی ۔

انتظام اور دیکھ بھال کی غرض سے ۲۶ر کو ۳ بجے کلب پہنچ گئی مجھے پہنچے مشکل سے پاؤ گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ کلب کے ملازم نے آکر کہا :- "کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں" یا الٰہی بغیر تعارف کسی اجنبی سے ملاقات، پوچھو وہ کیوں ملنا چاہتے ہیں — ! ؟

ایک اور بہن نے بھی جو کام میں مدد دے رہی تھیں میری تائید کی، یکایک ملازم واپس آیا اور اس نے ایک خط دیا - یہ خط قبلہ خواجہ صاحب کا تھا - اس خط میں خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا : —

"یہ نواب زادہ شہاب الدین صاحب ہیں - انہوں نے میوزک کانفرنس کی ہے - آپ ۷ ½ بجے مشاعرہ ختم کر دیں اور ان کو اطمینان دلا دیں"

مجھے خواجہ صاحب کی اس مداخلت بیجا پر غصہ تو آیا لیکن ان کی بیگم صاحبہ صدر تھیں - آپ خود فیصلہ کیجئے کہ با اختیار ہوتے ہوئے خواجہ صاحب قبلہ کا رویہ کس قدر غلط اور زیادتی پر مبنی تھا، کیا کر سکتی تھی، چپ ہو رہی، مگر میں نے کلب کے ملازم کے ذریعہ نواب زادہ شہاب الدین سے کہلوا دیا، آج مشاعرہ روکا نہیں جا سکتا، نہ کسی جلسے وغیرہ کیلئے کلب دیا جا سکتا ہے - آپ کوئی دوسرا انتظام کر لیں ۔

کوئی بس نہ چلا، تو شہاب الدین صاحب نے رشتہ داری کا راگ الاپا - پاٹودی سے اپنے تعلقات بتائے - سابق بیگم صاحبہ پاٹودی میری عزیز ہیں - مجبوراً مجھے خود ان حضرت سے گفتگو کرنی پڑی لیکن نواب زادہ صاحب کی پیچیدہ اور مسلسل تقریر جس میں میری مدح اور اپنی مجبوری، حالات پر تبصرہ بھی کچھ ہوتا، عجب تقریر تھی میں چاہتی تھی کہ یہ وقت کی قیمت جانیں، کام بہت ہے، مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور تقریر جاری رکھی "میری محنت اکارت ہو جائے گی، چیف کمشنر صاحب کے سامنے میں ذلیل ہو جاؤں گا - آٹھ بجے مشاعرہ ختم کر دیجئے، مجھے ندامت سے بچا لیجئے"

میں نے کہا کہ اگر مسز آصف علی اجازت دیں تو ۸ ½ بجے آجائیے اس سے پہلے مشاعرہ ختم نہیں ہو سکتا - کیا دلچسپ بات ہوئی، نواب زادہ صاحب نے فرمایا "میں مسز آصف علی صاحبہ سے مل چکا ہوں انہوں نے فرمایا آج ہال کا مکمل اختیار حمیدہ سلطان صاحبہ کو ہے"۔

مشاعرہ کیلئے ہال لیا جا چکا تھا لیڈیز کلب دہلی کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ میں مشاعرہ کی سکریٹری تھی، کلب کی نہ تھی، ان کی ذمہ داری تھی کہ موجود رہتیں۔

بہرحال وہ چلے گئے اور میں نے مسز آصف علی صاحب کو بذریعہ ٹیلیفون حالات سے آگاہ کردیا۔ اس دن مسٹر آصف علی صاحب کی والدۂ محترمہ کا آپریشن تھا اس لئے مسز آصف علی پریشان اور مصروف تھیں۔

آغاز مشاعرہ

ان قیامت کی باتوں کے بعد ٹھیک ۶½ بجے مشاعرہ استقبالیہ نظم سے شروع ہوا۔ اسکے بعد خواجہ بانو صاحبہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ بعض بہنوں کا خیال ہے کہ یوں تو صدر صاحبہ کی ہر بات سر آنکھوں پر مگر اس فضا کیلئے یہ خطبہ قطعی ناموزوں تھا۔

ہال خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہت سی بچوں والی اہلِ ذوق بہنیں ہال سے باہر بیٹھی سُن رہی تھیں۔ اس لئے کہ بچوں کو ہال میں لانے کی اجازت نہ تھی۔ خواتین کا ایک عظیم الشان مجمع تھا اور میں بڑی مسرور تھی کہ میری محنتوں کا ثمر مجھے مل رہا ہے۔ شدید علالت کے باوجود میرٹھ سے اردو زبان کی مشہور شاعر و ادیب خاتون بلقیس جمال صاحبہ تشریف لائی تھیں۔ اور بھی کئی بہنیں آس پاس سے آگئی تھیں۔ صفیہ بیگم صاحبہ شمیم ملیح آبادی اپنے مخصوص انداز اور دلنواز ترنم میں اپنی شاہکار نظم عورت سُنا رہی تھیں۔ سُننے والیاں محوِ حیرت تھیں۔ شمیم کی دلکش آواز نے سماں باندھ رکھا تھا۔

یکایک ایک بہن نے سرگوشی کے انداز میں آکر کہا، چیف کمشنر صاحب، نواب زادے صاحب اور خواجہ صاحب آگئے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں مشاعرہ ختم کردیجئے۔ مشاعرہ کی کارروائی ابھی جاری تھی اور میں نے نواب زادہ صاحب سے کہدیا تھا۔ آپ ۸½ بجے آجائیں۔ ۱۵ منٹ سے پہلے کارروائی ختم نہیں کی جا سکتی۔

چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ دوسری بہن پیغام لائیں۔ چیف کمشنر صاحب آپ کو سلام دیتے ہیں۔ میں نے ان بہن سے کہا، آپ ان کو کمرہ میں بٹھائیے اور ۱۵ منٹ کے لئے معافی مانگ لیجئے۔

سکریٹری صاحب کلب سے کہا کہ ہال کے دروازے بند کرا دیجئے۔ وہ حیران و سراسیمہ تھیں۔ میں نے خود جانا چاہا۔ بہرحال اس سراسیمگی میں تھی کہ ایک عقل مند بہن نے بلند آواز سے کہا کہ چیف کمشنر صاحب آگئے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ خواجہ بانو صاحبہ کرسی صدارت سے کھڑی ہوگئیں۔

یہ حال دیکھ کر پردہ نشیں خواتین گھبرا گئیں۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مجمع منتشر نہ ہو۔ لیکن تو یہ صاحب طوطی کی آواز نقار خانے میں کون سُنتا ہے۔ چند ہی منٹ میں ہال خالی ہوگیا۔

یہ بے ترتیبی سکریٹری صاحب کی غفلت اور حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی بیجا مداخلت کا نتیجہ تھی۔ ورنہ ان نواب زادہ صاحب کو یہ جرأت ہو نہیں سکتی تھی۔ دوسرے دن میں نے خواجہ صاحب قبلہ سے اس طرح مشاعرہ کو برباد کردینے میں حصہ لینے کے متعلق شکوہ کیا، دلی رنج اور اپنی سُبکی کے خیال نے میرا لہجہ سخت کردیا تھا، اور یہ قدرتی طور پر تھا۔

اسکے جواب میں سُنا ہے خواجہ صاحب قبلہ نے منادی میں لکھا کہ بیگم صاحبہ نے بیجا غصہ کیا اور میں نے صبر کیا حالانکہ یہ غلط بیان خواجہ صاحب کی ثقاہت کیلئے موزوں نہ تھا۔ شریف بیگمات اور پردہ نشیں خواتین کے اتنے بڑے مجمع کو منتشر کردینے کی رسوائی اور دہلی کے سب سے پہلے زنانہ مشاعرہ کی برہمی کا الزام ان کے سر پر ہے۔

میری ڈیڑھ ماہ کی ان تھک مسلسل کوششوں کو خواجہ صاحب قبلہ نے خاک میں ملا دیا اور اس پر یہ فرماتے ہیں کہ اک مسلمان عورت کی دلیری دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی ——— !؟

غریب مسلمان عورت کی ہر کوشش کو منہدم کرنے میں ایسے محترم بزرگوں کا ہاتھ نہ ہو تو وہ بھی اپنی اخلاقی خوبیوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی اہلیت رکھتی ہے لیکن جب ایسے لوگ جو ادب اردو کے بڑے حامی اور سرپرست بن کر بھی اس کی جڑ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ پنپنے کے آثار نہیں کہے جا سکتے۔

مجھے افسوس ہے کہ اپنی مصروفیت اور علالت کے باعث روداد

۴۷

مشاعرہ دیر سے شائع کر رہی ہوں۔

اب ان شاعر خواتین کا کلام ملاحظہ فرمائیے جو اس مشاعرہ میں شریک ہوئیں۔ اور جنہوں نے اپنے اعلیٰ اور لطیف خیالات اور جذبات سے حاضرین کو محظوظ و مستفید کیا۔

حمیدہ سلطان

"نواب زادہ موصوف: میرے بھی شناسا ہیں مشاعرہ کے سلسلے میں ایک یادگار لطیفہ ہو، یعنی چیف کمشنر صاحب کو انہوں نے مدعو کیا اور انگریز کے مکمل وعدہ کے باوجود ان کی "ہمہ دانی" نے ان کو یقین دلا دیا کہ "دلی کا قادرِ مطلق" ایسی معمولی کانفرنس میں کیا آ سکتا ہے"
مگر ۸ بجے کمشنر صاحب مع مولی بھون کے گیٹ پر موجود تھے اور گیٹ بند، ہال کا جہاں تک تعلق تھا خالی ہوتا تب بھی بالوجوہ نہیں مل سکتا تھا مگر چیف کمشنر صاحب کے آجانے نے ہنگامی طور پر ان کو ہال دلا دیا، مردوں کا بس محض اس لئے چل گیا کہ عورتوں کا جلسہ تھا۔ ان عورتوں کا جو مدافعت تو درکنار آنکھ بھی نہیں ملا سکتیں"

میرے خیال میں یہ کافی درس آموز روداد ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "مسلمان عورت" کس قدر مجبور ہے!؟

ساغر

تہنیت

آسمانِ نیلگوں پر ضو فشاں ہے ماہتاب — سلکِ گوہر کی طرح بکھری ہے سلکِ کہکشاں
ٹمٹماتے ہیں ستارے جس طرح چشمِ حباب — ہے فضا ساکن، زمیں خاموش، ساکت آسماں

یاسمیں کے سیمگوں غنچے بھی ہیں سوئے ہوئے — ہے تقاطرِ شبنمِ گل ریز کا گوہر تراش
برگِ گل ہائے حسیں اک کیف میں کھوئے ہوئے — اک شعاعِ نور سی ہے آسماں سے سیم پاش

رُک گئیں امواج ساکن ہو گیا آبِ رواں — نیلوفر آغوشِ جو میں سو رہا ہے بے حجاب
جھک گئیں خاموش چشمہ کے کنارے ڈالیاں — عکسِ مہ سے اک تجلی ہے تہِ دامانِ آب

اس فضائے کیف آور میں یہ بزمِ رنگ و بو — محفلِ رنگیں میں جوشِ شوق و سامانِ طرب
ذرہ ذرہ سے نمایاں انبساطِ آرزو — پتہ پتہ گل بداماں گل بدوش و گل بکف

مرحبا جوشِ تمنّا حبّذا شوقِ سرور — عشرتِ رنگیں سے ہے تابش فزا تارِ نظر

مرتعش ہے قلب کے پردوں میں اک کیفِ طہور — ہے شبِ امید میں عکسِ تجلّائے سحر

آرزو و دیرینہ امیدوں کی بر آئی ہے آج — عشرتِ شامِ تمنّا رشکِ صبحِ عید ہے

لے رہی ہے رونقِ شب صبحِ فردا سے خراج — فضلِ ربّانی کی شامل اس طرح تائید ہے

ہو مبارک آپ کو اے ہم نوایانِ چمن — محفلِ عشرت فروزاں جلسۂ شوق آفریں

ہو مبارک آپ کو اے نکتہ سنجانِ سخن — مجلسِ شعر و ادب بزمِ لطیف و دل نشیں

یہ گلستاں حشر تک گل ریز و گل افشاں رہے — اہلِ گلشن کی نوائیں آسماں افراز ہوں

یہ چمن زارِ ادب پنہاں طرب ساماں رہے — اب دعا میں اہلِ محفل میری ہم آواز ہوں

تا ابد بزمِ سخن ہو ربِّ عالم پُر بہار
گل بدوش و گل بداماں گل بکف گل در کنار

محترمہ رابعہ پنہاں صاحبہ

طرحی غزلیں

محبوب جہاں صاحبہ

کروں میں اس سے عرضِ مدعا کیا — وہ سمجھے گا وفا نا آشنا کیا

تمنّا تک ہے لطفِ زندگانی — تمنّا مٹ گئی تو پھر رہا کیا

نہ اب وہ بال و پر ہیں اور نہ جرأت — چھٹے بھی گر قفس سے تو مزا کیا
سُنی جب میری باتیں ہنس کے بولے — یہ ہے تمہیدِ عرضِ مدعا کیا؟
نہیں جب اُن کو اندازہ جفا کا — تو پھر سمجھینگے وہ میری وفا کیا

محبت میں جو اے محبوب گذری
کہیں اب تم سے اس کا ماجرا کیا!؟

امت الشکور صاحبہ راز

سفینہ لاپتہ ہے ناخدا کیا — مرے اشکوں کا طوفاں ہے بپا کیا
بہار آتے ہی کھل جاتے ہیں غنچے — بدل جاتی ہے گلشن کی فضا کیا
وہی ہوگا جو قسمت میں لکھا ہے — کسی سے ہم کریں جا کر گلا کیا
پھرا کرتا ہے جو ہم رنگِ مجنوں — بگولے کو بیاباں میں ہوا کیا
نظر آتی ہے صورت رہزنوں کی — بنائیں ہم کسی کو رہنما کیا
چلے آتے ہیں میکش میکدے میں — فلک پر جھوم کر آئی گھٹا کیا
اجل کا رات دن رہتا ہے کھٹکا — نکالے کوئی دل کا حوصلہ کیا

نہ لی کروٹ بشر نے راز مر کر
گئی ہے کان میں کہہ کر قضا کیا

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء

شکیلہ خاتون صاحبہ شکیل

دلِ ناداں تجھے آخر ہوا کیا — کسی کی یاد میں گم ہو گیا کیا
بُرا کوئی کہے لیکن نہ مانو — بھلا سمجھو بُرے کا ماننا کیا
مجھے مقصود ہے تری پرستش — مرے جینے کا ورنہ مدّعا کیا

حیاتِ جاوداں ہے بعدِ مُردن
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

رفعت جہاں صاحبہ نکہت گلشن آبادی

خفا ہو کس لئے مینے کیا کیا — بتاؤ تو ہوئی مجھ سے خطا کیا
حسینوں کا جفا کاری ہے پیشہ — پھر ان کی بیوفائی کا گلہ کیا؟
شکستہ ساز کو کیوں چھیڑتے ہو — مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کیا
جو سر سے پاؤں تک کافر ہیں کافر! — انہیں نامِ خدا سے واسطا کیا
نہیں جب امنِ ساحل کی ضرورت — تو پھر فکرِ خدا و ناخدا کیا
جفا بھی اب تو عنقا ہو گئی ہے — وفا کا ذکر اے نکہت بھلا کیا

آفتاب جہاں صاحبہ آفتاب دہلوی

خوشی کا ذکر کیا غم کا گلہ کیا ۔۔۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نہیں ملتا محبّت کا نشاں بھی ۔۔۔ یہ بدلی ہے زمانے کی ہوا کیا

گناہِ عشق کی ہیں مرتکب ہوں ۔۔۔ ذرا دیکھیں وہ دیتے ہیں سزا کیا

تصوّر میں وہی باتیں ہیں اُن سے ۔۔۔ جدا ہو کر وہ ہوتے ہیں جدا کیا

کرم کرتے نہیں چلئے نہ کیجئے ۔۔۔ ستم کی لذّتوں کا پوچھنا کیا

ڈبوئے میری بلا سیلابِ غم سے ۔۔۔ خدا جب آشنا ہے نا خدا کیا

نہیں کچھ اعتبارِ زندگانی ۔۔۔ مگر دل میں تمنّائیں ہیں کیا کیا

مسرّت ہے نہ الفت ہے نہ راحت ۔۔۔ الٰہی تیری دُنیا کو ہوا کیا

جہاں ہو آفتابِ عالم آرا
وہاں کی روشنی کا پوچھنا کیا

(باقی)

مشاعرہ کی باقی غزلیں نومبر ۱۹۴۰ء میں شائع کی جائیں گی ۔ یہ ایک نادر شے ایشیا میں شائع ہو رہی ہے جسے شدید فنی نقطۂ نگاہ سے ہرگز نہیں دیکھنا چاہئے ۔ ممکن ہے اسی ہجوم میں سے کوئی سروجنی اور قرۃ العین (دل آبرو) پیدا ہو جائے ۔ (ساغر)

—— ایشیا ۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء

جُدائی کا گیت

(سید مطلبی فریدآبادی)

جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ
مت ڈگدا میں مُنہ کو موڑ —— چلا ہوں تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

(۱) تیری یاد نہیں بھولے گی — من کی بگیا میں تو جھولے گی
ٹھنڈے سانس یہاں تو لے گی — دل کی کلی واں نا پھولے گی
پلک اُٹھا، مت دل کو توڑ — مت ڈگدا میں مُنہ کو موڑ —— چلا ہوں تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

(۲) تو ہردے میں بسی ہے رانی — رگ رگ میں تو رسی ہے رانی
پریم جال میں پھنسی ہے رانی — مجھ مجنوں کی سستی ہے رانی
پربت دکھا، نا سر پر سکوڑ — مت ڈگدا میں مُنہ کو موڑ —— چلا ہوں تجھکو چھوڑ
جیل چلا ہے دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

(۳) پھر اچھے دن آئیں گے رانی — بچھڑے سب مل جائیں گے رانی
دیس کے باسی گائیں گے رانی — جھنڈوں کو لہرائیں گے رانی
دو ہی دِنا کی بات ہے، رانی میرا پلا چھوڑ — مت ڈگدا میں مُنہ کو موڑ —— چلا ہوں تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

(۴) سورج، بادل، چند، ستارے — سب موہے دی کھیں کارے کارے
پربت، ریت، سینچی، پیارے — کوئی نہ دی کھے گھرے اندھارے
دیس بلی کی گیل تو چھوڑ — مت ڈگدا میں مُنہ کو موڑ —— چلا ہوں تجھ کو چھوڑ

(۵) ایسی ہوک اُٹھی ہے من میں — ایسی آگ لگی ہے تن میں
اگنی پھیلے جیسے بن میں — اگنی ہی اگنی ہے جیون میں
کبھی تو جل نا جاوے پیاری پلا سید کا دے چھوڑ
مت ڈگدا میں مُنہ کو موڑ — مت دل توڑ —— نا سر پر مروڑ —— میرا پلا چھوڑ —— چلا ہوں تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

۱۔ باغیچی ۲،۳۔ پنچھوں اور ستری پنچھے مجنوں و لیلیٰ ۴۔ جسم ۵۔ سکیڑ ۶۔ دلاں ۷۔ دامن ۸۔ مجھے ۹۔ دکھائی دیتے ہیں ۱۰۔ جنت ۱۱۔ بھسم ۱۲۔ ہوا خواہ ۱۳۔ شہید وطن ۱۴۔ آگ۔

بشیر۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء

عیدِ نظّارہ

(محترمہ عزیز جہاں بیگم اؔدا)

مژدہ نگاہِ شوق! کہ عیدِ نظّارہ ہے
پلکیں کسی کی راہگذر میں بچھاؤں میں

آمد ہے آج ایک سراپا بہار کی
سو طرح غمکدے کو اپنے سجاؤں میں

خورشید کی جبیں سے کرن مستعار لوں
مہتاب سے ضیائے جواں مانگ لاؤں میں

دامانِ ابرِ تیرہ سے گوہر سمیٹ لوں
قوسِ قزح کے رنگ سے محفل رچاؤں میں

باغِ ارم سے آرزوئے رنگ و بو کروں
روئے شفق سے غازۂ احمر چھڑاؤں میں

شبنم سے اشکہائے گہرتاب چھین لوں
غنچے کے لعل لب سے تبسم چراؤں میں

بلبل سے پاکبازئ الفت طلب کروں
معصومئ شباب کو پھولوں سے چھاؤں میں

جذب و وفا و ہمتِ پروانہ چاہیئے
بہرِ گداز و سوز سوئے شمع جاؤں میں

رنگینیاں شراب سے تھوڑی سی مانگ لوں
اور سادگی طفلکِ معصوم پاؤں میں

ظلمت میں ہو نہ نور فشاں ماہِ نیم ماہ
بہرِ نثار ساغرِ انجم منگاؤں میں

وہ اور میرے گھر میں ہوں مہماں خوشا نصیب
گلہائے اشکِ سرخ سے دیپک جلاؤں میں

آنکھوں کو میری دولتِ دیدار ہے نصیب
خود کو نہ ان کے شوق میں کیوں بھول جاؤں میں

وہ ابتدا سے آج سنیں گے حدیثِ غم
بلبل کی طرزِ نغمۂ رنگیں اڑاؤں میں

جب حسن ہی نیاز پہ مائل ہوا اے ندیم
پھر کیا صلاح آج نہ کیوں روٹھ جاؤں میں

اے اضطرابِ شوق سنبھلنے دے اسقدر
ہاتھوں پہ رکھ کے دل کو پئے نذر لاؤں میں

اور اس کے بعد عرض کروں حکم ہو اگر
رنگین ایک مطلعِ اؔدا کا سناؤں میں

اے چشمِ مست تیرا اشارہ جو پاؤں میں
جو نغمے سو رہے ہیں انہیں بھی جگاؤں میں

سہیلی کا پریم (گیت)

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

جب پیتم نین سماؤ گی — جب پریم کی گود بساؤ گی
پھر ڈھونڈے ہاتھ نہ آؤ گی — من مندر میں چھپ جاؤ گی

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

اب تتلی سی اتراتی ہو — ہر بات پہ سو بل کھاتی ہو
اب اپنے من کی گاتی ہو — جب ان کے من کی گاؤ گی

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

جب راتیں نیند اڑائیں گی — جب آنکھیں برہا گائیں گی
پھر سکھیاں یاد نہ آئیں گی — تم سکھیوں کو یاد آؤ گی

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

اب الڑھ ہو متوالی ہو — ہاں سچ ہے بھولی بھالی ہو
اب الجھے بالوں والی ہو — جب ایک اک لٹ سلجھاؤ گی

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

کیوں نجمی پینگ بڑھاتے ہیں — یہ بندھن ٹوٹے جاتے ہیں
اب خاطر والے آتے ہیں — اب خاطر میں کیوں لاؤ گی

نجم آفندی اکبر آبادی

ساغر

اک آغوشِ تمنّا و زمیں سے آسماں تک ہے
محبت ہی محبت ہے مرا قبضہ جہاں تک ہے

مرے نزدیک بیٹھو اور نفس سے عطر برساؤ
بہارانِ نکہتوں کے اس مہکتے کارواں تک ہے

الٰہی بدگماں ہو جائیں وہ معصوم نظریں بھی
گناہِ عشق کی لذّت نگاہِ بدگماں تک ہے

خدا رکھے جذبۂ الفت یہ رسوائی بھی ہے کیا کم
کہ رازِ عشق کا پرتو ضمیرِ رازداں تک ہے

نظر بچتے ہی اُنکا آستاں ہوگا مرے سجدے
یہ میری گریہ سنگینی نگاہِ پاسباں تک ہے

شگفتِ لالہ و گل سے طلوعِ ماہ و انجم تک
ہے اک حشرِ تبسّم حُسن کا پرتو جہاں تک ہے

سحر ہوتے ہی گل ہونگے نہ رنگِ گل نہ خاکِ گل
یہ ساری چاندنی گُلشن میں برق و آشیاں تک ہے

انہیں بجتے ہوئے تیوں سے گلشن پھوٹ نکلیں گے
بہاروں کا یہ ماتم صرف انجامِ خزاں تک ہے

فضا پر موت چھا جائے جو ہم خاموش ہو جائیں
کہ ساری گرمیٔ محفل ہماری داستاں تک ہے

چمن کی سمت کروٹ بھی نہ لینگی بجلیاں سو لیں
کہ پیہم اضطرابِ برق میرے آشیاں تک ہے

دلِ گرم و جواں قلقل دلِ گرم و جواں مینا
جنونِ مے کشی ساغر دلِ گرم و جواں تک ہے

ایشیا - اکتوبر ۱۹۴۰ء



ایشیا

دوسرا باب

فسانے و ڈرامے

ماہ اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۴۰ء

وداعِ آخر

(مسلسل قسط سوم)

(محمد جمیل احمد بی۔ اے، بریلوی)

[**خلاصۂ قسط اوّل و دوم:-** اپنی اکتالیسویں سالگرہ کے دن ناول نگار رحیق پہاڑ سے وائینا واپس آیا، اور اس کو ایک گمنام عورت کا خط ملا، جس میں اس نے اپنی سچی، گہری اور خاموش محبت کا فسانہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں دوہرایا تھا۔ جب اس کا اکلوتا بچہ اس کے سامنے مردہ پڑا تھا، وہ تیرہ برس کی تھی، کہ رحیق اس کے قرب کے ایک مکان میں رہنے لگا، اور اسی وقت سے اسے رحیق سے ایک جاں سوز عشق پیدا ہو گیا۔ جو وقت کے ہر ہر لمحہ کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔ وہ گھنٹوں دروازہ سے اس کو جھانکتی، اس کے کمرہ کو دیکھتی، اس کی کتابوں کو پڑھتی، اور اس کی محبت میں کھو جاتی، وہ سولہ برس کی تھی، کہ اس کی ماں نے جو ایک بیوہ عورت تھی، انسبرگ کے ایک متمول شخص سے شادی کر لی۔ اور پھر یہ لوگ انسبرگ کو منتقل ہو گئے۔ جہاں اس نے انتہائی کرب کی دو طویل سال تڑپ تڑپ کر گذارے اب وہ اٹھارہ سال کی تھی، اور وہ بات جو معصوم بچی کے خیالات سے پوشیدہ تھی، اب اس کی تمام تر آرزو بن چکی تھی۔ "ج"]

"میرے ساتھیوں کو یقین تھا، کہ میں باحیا اور شرمیلی ہوں۔ مگر میں اپنا مقصد قطعی طور پر متعین کر چکی تھی، میری تمام ہستی ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئی تھی —— میں وائینا واپس جاؤں، آپ کے پاس واپس جاؤں، میں اپنی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش میں بالآخر کامیاب ہو گئی، گو دوسروں کے نزدیک میرا یہ فعل غیر معقول اور غیر قابلِ تفہیم تھا، میرا سوتیلا باپ ایک آسودہ حال شخص تھا، اور مجھے اپنی لڑکی کی طرح رکھتا تھا۔ مگر میں نے زور دیا کہ اپنی معاش کا انتظام میں خود کروں گی، اور آخر کار اسے اس پر راضی کر ہی لیا، کہ میں وائینا واپس آ کر درزی کی ایک بڑی دوکان پر، جو اس کے عزیز کی تھی، ملازم ہو جاؤں۔

کیا ابھی مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے، کہ جب بالآخر میں وائینا پہنچی تو خزاں کی اس شام کو جب ہوائیں کہر آلود تھیں، میرے قدم پہلے مجھے کہاں لے گئے؟ کپڑوں کے کمرے میں میں نے، اپنا بکس چھوڑا اور ایک ٹرام کار کی طرف دوڑی وہ کس قدر آہستہ آہستہ چل رہی تھی! اس کا ہر دفعہ رکنا میرے لئے ایک نئی پریشانی کا باعث تھا۔ آخر کار میں آپ کے گھر تک پہنچ گئی۔ میرا دل اچھلنے لگا، جب میں نے آپ کے کمرے میں روشنی دیکھی، وہ شہر جو اب تک مجھے اس قدر اجنبی، اس قدر بھیانک معلوم ہو رہا تھا، دفعتہً پر رونق سا نظر آنے لگا۔ میں خود پھر ایک مرتبہ زندہ ہو گئی، چونکہ اب میں آپ کے نزدیک تھی، آپ جو میری زندگی کا ایک غیر مختتم خواب ہیں، جب آپ کے، اور میری اوپر کو اٹھی ہوئی نگاہوں کے درمیان صرف شیشہ کا ایک چمکدار پتلا ٹکڑا تھا، تو میں یہ حقیقت بالکل بھول گئی تھی۔ کہ میں آپ کے ذہن اور آپ کی یاد سے بہت دور ہوں، گویا ہمیں پہاڑوں، وادیوں اور دریاؤں نے بیچ میں حائل ہو کر جدا کر دیا ہے۔ میرے لئے اتنا ہی بہت تھا، کہ میں آپ کی کھڑکی کو دیکھتی رہوں، اس میں روشنی تھی، وہ آپ کی قیام گاہ تھی، آپ وہاں تھے، وہ میری دنیا تھی، دو برس سے میں اس ساعت کا خواب دیکھ رہی

تھی، اب وہ ساعت آگئی تھی، اس خوشگوار شام کو جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، میں آپ کی کھڑکیوں کے سامنے کھڑی رہی، یہاں تک کہ روشنی بجھ گئی اس وقت سے پہلے میں نے اپنا مکان تلاش نہیں کیا۔

ہر شام کو میں اسی طرح آتی۔ چھ بجے تک میں کام کرتی۔ کام سخت تھا مگر پھر بھی مجھے مرغوب تھا، چونکہ شوروم کا شور و شغب میرے ذہنی و قلبی ہیجان کو چھپائے ہوئے تھا، جیسے ہی کہ دروازے بند ہوتے، میں اپنے محبوب مقام پر دوڑ آتی، میری تمام تر خواہش یہ تھی، کہ آپ کو ایک دفعہ اور دیکھ لوں، آپ سے صرف ایک دفعہ مل لوں، صرف دور سے آپ کے چہرے کو اپنی نظروں میں جذب کر لوں۔ آخر کار ایک ہفتہ کے بعد میں آپ سے ملی، اور وہ ملاقات محض اتفاقیہ ہو گئی۔ میں کھڑی تنی آپ کی کھڑکی کو تک رہی تھی، کہ آپ سڑک کے اس پار سے آئے۔ ایک ہی لمحہ میں میں پھر بچہ تھی، وہی تیرہ برس کی لڑکی، حالانکہ مجھے آپ سے نظریں چار کرنے کا بے حد شوق تھا، میں نے اپنا سر جھکا لیا، اور آپ کے قریب سے تیزی سے آگے بڑھی جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا تھا، بعد کو مجھے اس طریقہ سے اسکول کی لڑکی کی طرح بھاگ جانے سے شرم آئی چونکہ اب مجھے احساس تھا کہ میں درحقیقت کیا چاہتی ہوں، میں چاہتی تھی، کہ آپ سے ملوں، میں چاہتی تھی کہ ان تھکا دینے والے برسوں کے بعد بھی آپ مجھے پہچان لیں، آپ مجھے دیکھیں مجھ سے محبت کریں۔

بہت عرصہ تک آپ نے مجھے نہیں دیکھا، حالانکہ میں روز رات کو آپ کے مکان کے سامنے کھڑی ہوتی تھی، چاہے وائینا کے موسم سرما کی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہوں۔ اکثر اوقات میں بغیر کسی نتیجہ کے گھنٹوں انتظار کرتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آپ کسی دوست کے ہمراہ گھر چھوڑ کر چلے جاتے، دو مرتبہ میں نے آپ کو ایک عورت کے ساتھ دیکھا اور یہ حقیقت کہ اب مجھ میں "عورت" جاگ چکی تھی۔ اور آپ سے متعلق میرے جذبات کچھ نئے، کچھ مختلف تھے، مجھ پر اس طرح واضح ہوئی، کہ جب میں نے آپ کو ایک غیر اجنبی عورت کے ساتھ غایت اعتماد سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ تو دفعتہً میں نے دل پر ایک شدید کرب، ایک گہری دکھن محسوس کی یہ میرے لئے نئی اور تعجب انگیز بات نہ تھی، چونکہ بچپن ہی سے میں نے دیکھا تھا کہ اس قسم کے ملاقاتی آپ کے گھر آتے ہیں، مگر اب اس منظر نے مجھے ایک شدید جسمانی اذیت پہنچائی، میرے دل میں دشمنی و شوق کا ایک مشترک جذبہ تھا، جب میں نے ایک اور عورت سے جسمانی تعلقات کی یہ بین و ظاہر مثال دیکھی، ایک دن غرور جوانی سے معمور ہو کر جس کا اثر اب بھی باقی تھا، میں...... معمول کے مطابق آپ کے مکان کے سامنے نہیں گئی۔ مگر مدافعت اور ترکِ علائق کی وہ سنسان شام کس قدر بھیانک تھی! دوسرے دن رات کو، انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ میں معمول کے مطابق آپ کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی اور منتظر تھی، جیسے کہ آپ کی بند اور مسدود زندگی کے سامنے میں ہمیشہ منتظر رہی ہوں۔

آخر کار وہ وقت بھی آیا، جب آپ نے مجھے دیکھا، میں نے دور سے آپ کو آتے ہوئے دیکھا، اور اپنی تمام طاقتوں کو مجتمع کر کے یہ عزم کیا، کہ میں آپ کے راستے سے نہیں ہٹوں گی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شراب کے ایک بھرے ہوئے ٹھیلے سے سڑک رک گئی، اور اسلئے آپ کو بالکل مجھ سے قریب ہو کر گذرنا پڑا، غیر اختیاری طور پر آپ کی نظریں مجھ پر پڑیں، اور فوراً ہی، اگرچہ ابھی آپ نے میرے چہرے کی دلکشی و دلآویزی کو محسوس نہیں کیا تھا، آپ کے چہرے پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی۔ جس کے ساتھ آپ، عورت کو دیکھنے کے عادی تھے، بجلی کی ایک رو کی طرح وہ پچھلی یاد میرے جسم میں سرایت کر گئی —— آپ کی اسی طرح بیباک اور دلکش نظر کی یاد جو بیک وقت بغلگیر ہوتی ہوئی بھی معلوم ہوتی تھی، اور عریاں ساز بھی، جس سے برسوں پیشتر آپ نے ایک "لڑکی" کو جگا کر ایک "عورت" اور عاشق بنا دیا تھا، ایک یا دو لمحہ تک اسی طرح آپ کی نظریں مجھ پر جمی رہیں، اور اس وقفہ کے دوران میں، میں اپنی نظریں بھی نہ ہٹا سکی، اور پھر آپ گذر گئے۔ میرا دل اس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے اپنی رفتار ہلکی کر دینا پڑی، اور جب ایک اندرونی خواہش سے مجبور ہو کر میں نے مڑ کر دیکھا، تو آپ کھڑے ہوئے تھے، اور مجھے دیکھ رہے تھے، آپ کے چہرے کی راز جویانہ اور استفسارانہ دلچسپی نے مجھے یقین دلا دیا، کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا، آپ نے مجھے اس وقت اور اس کے بعد بھی نہیں پہچانا، میں کس طرح بتاؤں کہ مجھے اس سے کس قدر مایوسی ہوئی، یہ اس قسم کی مایوسیوں میں پہلی مایوسی تھی، یہ پہلا موقع تھا، جب مجھے وہ بات برداشت کرنا پڑی، جو ہمیشہ میری قسمت رہی، اور آپ نے کبھی مجھے نہیں پہچانا مجھے یوں ہی آپ کے بغیر پہچانے ہوئے ہی مرنا ہو گا! آہ، میں اپنی یاس و حسرت کی کیفیت کس طرح آپ کو سمجھاؤں، اس زمانہ کے دوران میں، جو میں نے انسبرگ میں گذارا میں کبھی آپ کے خیال سے خالی نہیں رہی۔ وائینا میں ہماری دوسری ملاقات ہمیشہ میرے ذہن میں رہی، میرے تخیلات، میری کیفیت مزاج کے پہلو بدلتے رہتے کبھی ایک پر مسرت انجام کے امکانات کا تصور مجھے خوش کر دیتا، اور کبھی نامرادی کا خیال مغموم، ہر قابل قیاس تبدیلی میرے ذہن میں واقع ہوئی، اکثر ملول و غمگین لمحات میں خیال ہوتا تھا، کہ آپ مجھے بیکار سمجھ کر، سادہ و کم رو سمجھ کر یا بے رحم

ضدی خیال کرکے جھڑک دینگے، نفرت کرنے لگیں گے، میں نے بیرخی و بے توجہی کا ہر
ممکن تصور کرلیا تھا، مگر بےحسی و حزن کے انتہائی مدارج میں بھی، اپنی ہستی کو
معدوم و ہیچ و پوچ سمجھ لینے کے باوجود بھی، میں اس مکروہ ترین امکان کو کبھی اپنے
ذہن میں جگہ نہیں دے سکتی تھی، کہ آپ میری ہستی سے کبھی آگاہ نہیں ہوئے، اب میں
سمجھ گئی ہوں (آپ ہی نے مجھے سکھایا ہے!) کہ ایک آدمی کیلئے ایک لڑکی یا ایک
عورت کا چہرہ غیر معمولی طور پر تغیر پذیر ہونا چاہئے، وہ کیفیات مزاج کے عکس کے
سوا اور کچھ نہیں جو اس قدر تیزی سے گزرتی ہیں۔ جیسے آئینہ سے عکس، مرد ایک
عورت کے چہرے کو نہایت آسانی سے بھول سکتا ہے، چونکہ عمر اس چہرہ میں تبدیلی
پیدا کردیتی ہے۔ اور مختلف اوقات میں پوشاک مختلف گردوپیش اور مختلف ماحول
پیدا کردیتی ہے۔ عورت کی جتنی معلومات بڑھتی جاتی ہے۔ وہ توکل و قناعت تسلیم و
رضا سیکھتی جاتی ہے۔ مگر میں جو ہنوز لڑکی تھی، ابھی آپ کی بھول کو سمجھنے کے قابل نہ
تھی، جس وقت سے کہ میں آپ سے واقف ہوئی تھی، میرا ذہن آپ کے تصورات
کا گنجینہ رہا تھا، اور اس نے مجھ میں ایک یہ غلط خیال پیدا کردیا تھا، کہ آپ بھی اکثر
میری بابت سوچتے ہوں گے، اور میرے منتظر ہوں گے، میں زندگی کے بار کو کس
طرح اٹھا سکتی، اگر میں یہ سمجھ لیتی، کہ میں آپ کے نزدیک نہ ہونے کے برابر ہوں، کہ
میرے لئے آپ کے حافظہ و یادداشت میں کوئی جگہ نہیں ہے، اس شام کو آپ کی نگاہوں
نے مجھے بتایا، کہ اس طرف کوئی ادنی ترین تعلق بھی ایسا نہ تھا، جو مجھے آپ کی زندگی کے
منسلک و وابستہ کردیتا، پہلی دفعہ میں حقیقت کی تلخی میں غرق ہوئی، پہلی دفعہ میں نے
اپنی تقدیر کا اشارہ پایا۔

آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ دو روز بعد جب ہم دونوں سڑک پر پھر ملے اور
آپ نے بےتکلفی پیدا کرنے کی کوشش کرنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھا، تو یہ آپ نے
اس لڑکی کو پہچان کر ایسا نہیں کیا تھا، جو اس قدر مدت سے آپ سے محبت کرلی
تھی، اور جس میں آپ نے "عورت" کو جگادیا تھا، بلکہ اسکی وجہ یہ تھی، کہ آپ نے
اس اٹھارہ برس کی خوبصورت لڑکی کا چہرہ پہچان لیا تھا، جس سے دو روز قبل آپ
اسی جگہ شام کو ملے تھے، آپ کے چہرہ کے انداز میں استعجاب کی ایک مرغوب پسندیدہ
جھلک تھی، اور آپ کے لبوں پر ایک تبسم رقص کررہا تھا، پہلی کی طرح آج بھی آپ گذر گئے
اور پہلے کی طرح آج بھی آپ نے اپنی رفتار ہلکی کردی، میں لرزہ براندام تھی، میں
نازاں تھی، میری خواہش تھی، کہ آپ مجھ سے بات کریں، میں نے اس وقت پہلی مرتبہ
محسوس کیا، کہ میں آپ کے لئے زندہ ہوں، میں بھی آہستہ آہستہ چلی اور آپ سے

بچنے کی کوشش نہیں کی، دفعتاً میں نے آپ کے قدم کی آواز اپنے پیچھے سنی، بغیر
مڑے ہوئے میں جانتی تھی، کہ اب آپ کی پیاری آواز مجھے مخاطب کرے گی
شدت امید سے میرے اعضا جیسے شل پڑگئے تھے، اور میرا دل اس قدر زور زور
سے دھڑک رہا تھا، کہ میں نے سوچا مجھے ایک جگہ بالکل رک کر کھڑا ہوجانا پڑے گا
آپ میرے قریب آگئے تھے، آپ نے گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا، گویا ہم پرانے دوست
تھے ــــ حالانکہ آپ درحقیقت مجھے نہیں جانتے تھے، حالانکہ آپ نے کبھی میری
حیات مستالم کی بابت کچھ نہیں جانا، آپ کا طریقہ اس قدر سادہ، اس قدر دلکش تھا
کہ بغیر کسی جھجک کے میں جواب دینے کے قابل تھی، ہم سڑک پر چلتے رہے اور آپ نے
مجھ سے کہا، کہ شام کا کھانا دونوں ساتھ ہی کھائیں، میں راضی ہوگئی۔ کون سی
بات تھی جو میں آپ سے منع کرسکتی؟

ہم نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا، آپ کو یہ جگہ یاد
نہیں ہوگی۔ آپ کے نزدیک یہ اس قسم کی بہت سی باتوں میں سے ایک بات تھی، کیونکہ
بہر حال یہ تھی کیا؟ ایسی سینکڑوں عورتوں میں سے ایک تفریحی مرحلہ،
غیر مختتم زنجیر کی ایک کڑی۔ اس شام کو ایسی کیا بات ہوئی۔ جو آپ مجھے یاد رکھتے
میں بہت کم بولتی چونکہ میں بے انتہا مسرور تھی، کہ آپ کے قریب ہوں، اور آپ مجھ
سے ہم سخن ہیں، میں ایک لمحہ بھی سوالات یا لغو الفاظ میں برباد کرنا نہیں چاہتی
تھی، میں کس ساعت کیلئے، اس طریقہ کے لئے جس سے آپ نے میرے جذبہ ستائش
کا جواب دیا، آپ کی ہمیشہ ممنون رہوں گی، آپ نے جو نیک سلیقہ برتا تھا، میں
اس کو کبھی نہیں بھولوں گی، آپ میں کوئی نازیبا اشتیاق نہ تھا۔ ملاطفت و
ملاعبت کے اظہار کی کوئی جلدی نہ تھی۔ پھر بھی آپ نے اول لمحہ ہی سے اس قدر
دوستانہ اعتماد کا اظہار کیا، کہ اگر میری تمام ہستی پہلے ہی سے آپ کی نہ ہوتی
تب بھی آپ مجھے جیت لیتے، کیا میں آپ کو یہ بتا سکتی ہوں، کہ یہ بات میرے
لئے کس قدر اہمیت کی حامل تھی، کہ میری پانچ سال کی امیدیں اس قدر
مکمل طور پر پوری ہوگئیں۔

رات زیادہ ہوگئی اور ہم ریسٹورنٹ سے چلے آئے، دروازہ پر آپ
نے مجھ سے دریافت کیا، کہ آیا مجھے جانے کی جلدی ہے یا میں کچھ اور وقت آپ
کے ہمراہ صرف کرسکتی ہوں، میں نے کہا میرے پاس کافی وقت ہے، ایک لمحہ کے
تامل کے بعد آپ نے مجھ سے کہا، کہ کیا میں گفتگو کرنے آپ کے گھر میں چل
سکوں گی، میں مسرور ہوں گی" میں نے آمادگی سے جواب دیا، اور اس طرح پہنچے

جذبات کو بالکل ظاہر کر دیا، میں نے محسوس کیا کہ میری اس طرح کی آمادگی سے آپ کو تعجب ہوا، میں نہیں کہہ سکتی، کہ آپ مسرور تھے، یا پریشان، مگر ہاں آپ متعجب ضرور تھے، آج میں آپ کے اس استعجاب کو سمجھ سکتی ہوں، آج میں جانتی ہوں، کہ گو عورت کی شدید خواہش ہو کہ وہ اپنی ہستی کو کسی مرد کے سپرد کر دے اس کا معمول ہے کہ وہ ناراضامندی کا حیلہ کرے، انتباہ و غصہ کا اظہار کرے اور وہ راضی کر لی جائے سخت منت و سماجت سے، جھوٹ اور فریب سے۔ قسموں سے وعدوں سے، میں جانتی ہوں کہ صرف پیشہ ور طوائفیں ہی اس قسم کی دعوتوں کا جواب بالکل صاف رضامندی سے دینے کی عادی ہوتی ہیں ——— ہاں طوائفیں یا پھر، سادہ لوح، نابالغ لڑکیاں۔ آپ یہ کیسے سمجھ سکتے، کہ میرے معاملے میں یہ رضامندی ابدیت آرزو کی آواز تھی، ان جذبات کی آواز تھی، جو مدتوں تک میرے دل میں گھٹتے رہے تھے۔

اپنے معاملہ میں، میں نے اپنے طریق عمل سے آپ کی توجہ مبذول کر لی، میں آپ کی دلچسپی کا مرکز بن گئی، ہم دونوں ساتھ جا رہے تھے، اور دوران گفتگو میں، میں نے محسوس کیا، کہ مجھے کسی نہ کسی طرح جانچنے، میرا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے، آپ کے قیاسات اور جذبات کے کھیل میں آپ کے لمس نے آپ کو فوراً یہ سمجھا دیا، کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے، کہ یہ خوبصورت شائستہ لڑکی اپنے سینہ میں کوئی راز چھپائے ہوئے ہے، آپ کا جذبہ تجسس جاگ اٹھا تھا، اور آپ کے عاقلانہ سوالات سے ظاہر تھا، کہ آپ میرا راز پا لینے کی کوشش کر رہے تھے، مگر میرے جواب، بات کو ٹال دینے والے تھے، میں اپنے آپ کو بیوقوف ظاہر کرنا، اپنے راز کے ظاہر کر دینے سے بہتر خیال کرتی تھی۔"

ہم آپ کے مکان پہونچے، میرے محبوب مجھے معاف کیجئے، اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ نہیں سمجھ سکتے، کہ میرا آپ کے ساتھ زینہ پر جانا کیا معنی رکھتا تھا، میں کس طرح پاگل سی بنی جا رہی تھی، ایک خلش تھی جو مجھے پھاڑے دے رہی تھی، افراط مسرت سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا، آج بھی میں اس کا خیال بغیر آنسوؤں کے بمشکل کر سکتی ہوں، اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں رہے ہیں، اس گھر کی ہر چیز میرے جذبات میں ڈوبی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، ہر چیز میرے بچپن اور بچپن کی خواہشات کی ایک یادگار تھی، سامنے وہ دروازہ تھا، جس کے پیچھے بیٹھ کر ہزاروں دفعہ میں نے آپ کے آنے کا انتظار کیا تھا سیڑھیاں جہاں میں نے آپ کے قدموں کی چاپ سنی تھی، اور جہاں میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا، دروازہ کی وہ دراز جس میں سے میں نے آپ کو بارہا آتے جاتے جھانکا تھا، وہ دروازہ کا فرش جس پر میں ایک دفعہ جھکی تھی، قفل میں چابی کی آواز جو ہمیشہ مجھے آگاہ کرنے کا ایک ذریعہ رہی تھی، میرے بچپن اور اس کے جذبات کی نشوونما اس ہی چند گز قطعۂ ارض میں ہوئی تھی، یہاں میری ساری زندگی تھی، اور اس نے ایک زبردست طوفان کی طرح اٹھ کر مجھے گھیر لیا تھا، چونکہ سب کچھ پورا ہو جانے والا تھا، میں آپ کے ہمراہ جا رہی تھی، آپ کے گھر میں۔ خیال فرمائیے (جس انداز سے میں ادا کر رہی ہوں، وہ بہت معمولی ہے۔ مگر مجھے بہتر الفاظ نہیں ملتے) آپ کے دروازہ تک حقیقت و دنائیت کی دنیا تھی، وہ بے مزہ روزمرہ کی دنیا جس میں میں نے آج تک زندگی گزاری تھی، اس دروازہ سے میرے بچپن کے تصورات کی طلسمی دنیا، علاؤالدین کے چراغ کی مملکت شروع ہوتی تھی، سوچئے کس طرح میری مشتعل نگاہیں اس دروازہ پر جا چکی تھی، جس میں اب داخل ہو رہی تھی، میرے دماغ میں ایک ہیجان تھا — اور صرف اس ہی سے آپ یہ اندازہ لگا سکیں گے، کہ اس زبردست لمحہ کی اہمیت میرے لئے کیا تھی۔

میں نے وہ رات آپ کے ساتھ گزاری، آپ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے، کہ آپ سے پیشتر کسی نے میرے جسم کو چھوا یا دیکھا تک نہ تھا، آپ یہ کیسے سمجھ سکتے تھے، جب کہ میں نے اس ڈر سے کہ کہیں میری محبت کا راز افشا نہ ہو جائے، کوئی حیل و حجت نہ کی اور شرم و حیا کے ہر جذبہ کو دبا دیا، اس سے ضرور آپ کو شبہ ہوا ہوگا چونکہ آپ اسکی پرواہ کرتے ہیں، جو آسانی سے ہاتھ آ جائے، اور آسانی سے واپس ہو جائے۔ جو سہل اللمس ہو، جو سبک ہو

آپ کسی دوسرے کی قسمت کے جھگڑوں میں شامل ہونے سے ڈرتے ہیں آپ تمام دنیا کو اپنے آپ کو فیاضانہ دے دینا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی ایثار و قربانی کرنا نہیں چاہتے، جب میں آپ سے یہ کہوں، کہ میں نے بحیثیت ایک دوشیزہ کے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کر دیا، تو مفہوم غلط نہ سمجھئے، میں آپ پر کوئی الزام نہیں رکھ رہی ہوں، آپ نے مجھے نہیں بہکایا، آپ نے مجھے دھوکا نہیں دیا، آپ نے مجھے اغوا نہیں کیا، میں نے اپنے آپ کو خود آپ کی آغوش میں ڈال دیا، میں خود اپنی قسمت کو ڈھونڈنے گئی، میرے پاس سوائے جذبات تشکر کے اور کچھ نہیں جو میں اس ہیموں شب کے سلسلے میں آپ کو پیش کر دوں، جب میں نے تاریکی میں آپ نی آنکھیں کھولیں، اور آپ میرے پاس تھے، تو میں نے محسوس کیا، کہ میں فردوس

میں ہوں"، اور مجھے تعجب تھا، کہ کیوں ستارے مجھ پر نہیں چمک رہے ہیں۔ میرے محبوب میں کبھی اس بات پر نہیں پچھتاؤں گی، کہ اس رات کو میں نے خود اپنے آپ کو کیوں آپ کو سونپ دیا، جب آپ میرے پاس سو رہے تھے، جب میں نے آپ کے تنفس کی آواز سنی، جب میں نے آپ کا جسم چھوا، اور اپنے آپ کو آپ کے اس قدر قریب پایا، میں فرطِ مسرت سے آنسو نہ روک سکی۔

میں علی الصبح ہی چلی گئی" مجھے کام پر جانا تھا، اور میں آپ کے ملازم کے آنے سے پہلے ہی چلی جانا چاہتی تھی، جب میں جانے کے لئے تیار ہو گئی، آپ نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا، اور بہت دیر تک میری طرف دیکھتے رہے، کیا کوئی بھولی بسری یاد آپ کے دماغ میں آ رہی تھی، یا صرف میری مسرت کے نور نے مجھے آپ کی نظروں میں خوبصورت بنا دیا تھا، آپ نے میرے لبوں کو بوسہ دیا، اور میں چلنے کیلئے اٹھی، آپ نے دریافت کیا" کیا تم کچھ پھول لو گی؟ لکھنے کی میز پر نیلے بلوریں گلدان میں چار سفید گلاب کے پھول تھے، (میں اس گلدان کو پہلے سے جانتی تھی، جب میں نے بچپن میں اس پر ایک جھجکتی ہوئی نظر ڈالی تھی) اور آپ نے وہ پھول مجھے دیدیئے، بہت دنوں تک میں ان پھولوں کو پیار کرتی رہی،

ہم نے ایک اور شام ملنے کا انتظام کیا تھا، یہ ساعتیں مسرت و استعجاب سے پر تھیں، آپ نے مجھے ایک رات اور بھی بخشی، پھر آپ نے کہا کہ کچھ عرصہ کیلئے آپ واقعتا کے باہر بلائے گئے ہیں ـــ آہ، مجھے آپ کے سفروں سے بیحد کسقدر نفرت رہی !ـــ اور آپ نے وعدہ کیا کہ، آپ واپس آتے ہی مجھے اطلاع دینگے میں نے صرف آپ کو ڈاکخانے کا پتہ دیا جہاں خط میرے طلب کرنے تک محفوظ رہ سکتے تھے، اور آپ کو اپنا صحیح نام نہیں بتایا، میں نے اپنے راز کی حفاظت کی ایک مرتبہ پھر رخصت ہوتے وقت آپ نے مجھے گلاب کے پھول دیئے ـــ رخصت ہوتے وقت، !!

دو مہینے تک ہر روز میں اپنے آپ سے پوچھتی رہی ـ مگر نہیں مگر اپنی امید کے اس کرب و مایوس کا ذکر نہیں کروں گی۔ میں شکایت نہیں کرتی، میں آپ سے اسی طرح محبت کرتی ہوں جیسے کہ آپ ہیں ـــ پر جوش و تغافل شعار، فیاض و وفا ناآشنا ـــ میں آپ سے اسی طرح محبت کرتی ہوں، جیسے کہ آپ ہمیشہ رہے ہیں، دو مہینے ختم ہونے سے کہیں پہلے آپ واپس آچکے تھے آپ کی کھڑکی کی روشنی نے مجھے یہ بتا دیا تھا۔ مگر آپ نے مجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ زندگی کی اس آخری ساعت میں میرے پاس آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک سطر بھی نہیں ہے۔ اسکی ایک سطر بھی نہیں ہے جس کو میں اپنی تمام زندگی سونپ چکی، میں انتظار کرتی رہی، مایوسی سے انتظار کرتی رہی، آپ نے مجھے پاس نہیں بلایا، آپ نے مجھے ایک لفظ نہیں لکھا، ایک لفظ بھی نہیں ....

میرا بچہ جو کل مر گیا، وہ بھی آپ کا تھا۔ وہ آپ کا لڑکا تھا، ان تین راتوں میں سے ایک کا حاصل!۔ اس وقت سے اسکی پیدائش تک میں آپ کی تھی، صرف آپ کی معلوم ہوتا تھا۔ میں آپ کے لمس سے متبرک ہوئی ہوں اس وقت میرے لئے قطعی ممکن نہ تھا، کہ میں کسی اور شخص کی پیشکش الفت کو قبول کر سکوں۔ وہ ہمارا بچہ تھا، میری دانستہ محبت اور آپ کی بے پرواہ، عیاشانہ اور نادانستہ مہربانی کا حاصل! ہمارا بچہ، ہمارا لڑکا، ہمارا اکلوتا بچہ! شاید آپ چونک اٹھیں، شاید آپ کو یوں ہی سا تعجب ہو۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ کیوں میں نے لڑکے کی بابت کبھی آپ کو کچھ نہیں بتایا، اور کیوں اس قدر طویل عرصہ خاموش رہنے کے بعد اب میں آپ کو یہ بتا رہی ہوں، جب وہ اپنی آخری نیند سو رہا ہے۔ اور مجھ سے جدا ہونے کو ہے ـــ کبھی، کبھی واپس ہونے کے لئے! میں آپ کو بتا بھی کیسے سکتی تھی۔ میں ایک اجنبی تھی، ایک لڑکی جس نے وہ تین راتیں، آپ کے ساتھ بہت شوق سے گذاری تھیں۔ آپ اس وقت کبھی یہ یقین نہ کرتے، کہ ایک گمنام لڑکی، جس کا آپ سے اتفاقیہ ساتھ ہو گیا تھا، آپ سے بے وفا سے، وفادار رہی ہے، آپ کبھی ہرگز بغیر شبہات کے اس لڑکے کو اپنا تسلیم نہ کرتے۔ اگر آپ بظاہر میرے الفاظ کا یقین کر بھی لیتے، تب بھی آپ کے دل میں یہ پوشیدہ شبہ باقی رہ جاتا، کہ غالباً آپ کے بعد بھی میں نے کسی دولتمند شخص کو اس لڑکے کا باپ بنایا ہے۔ آپ کو ضرور شبہات ہوتے، میرے اور آپ کے درمیان، ہمیشہ ایک بے اعتباری کا سایہ حائل رہتا۔ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ علاوہ ازیں میں آپ کو جانتی ہوں، شاید میں آپ کو آپ سے بھی زیادہ جانتی ہوں۔ آپ بالکل بےفکر، آزاد و طلب ہیں، اور یہ ہی آپ محبت کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو اس بات سے نفرت ہوتی کہ آپ دفعتاً ایک باپ بن گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بچہ کی زندگی و قسمت کے ذمہ دار ہیں۔ آزادی کا سانس آپ کیلئے زندگی کا سانس ہے۔ اور آپ میری ہستی کو ایک بندھن تصور کرتے، اور یہی اندر اپنی دانستہ مرضی کے خلاف آپ مجھے ایک مشکل و مجسم دعویٰ سمجھ کر مجھ سے نفرت کرتے، شاید کبھی کسی وقت، کسی ساعت، یا کسی تیزی سے گذر جانے والے لمحے کے لئے آپ مجھے ایک بار

محسوس کرتے، مجھ سے نفرت کرتے، مگر میرے غرور کا تقاضا تھا، میں زندگی بھر آپ کی کسی مصیبت یا فکر کا باعث نہ بنوں، میں بجائے اسکے کہ آپ کو بار معلوم ہوں، تمام بار اپنے ہی کاندھوں پر لے لینا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ان تمام عورتوں میں جن کو آپ جانتے ہیں، میں ہی صرف وہ عورت ہوں جس کا خیال آپ ہمیشہ محبت و تشکر کے جذبات کے ساتھ کریں، درحقیقت آپ کو کبھی میرا خیال آیا ہی نہیں، آپ مجھے بالکل بھول گئے۔

میں آپ کو الزام نہیں دے رہی ہوں، یقین کیجئے، میں شکایت نہیں کر رہی ہوں مجھے معاف کر دیجئے، اگر آپ کو خیال ہو کہ گاہے گاہے میرا قلم زہر اگلنے لگتا ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ چونکہ میرا بچہ، ہمارا بچہ شمعوں کی تھرتھراتی ہوئی روشنی میں مردہ پڑا ہے، میں نے خدا کے خلاف اپنی مٹھیوں کو بھینچ لیا ہے، میں نے اسے قاتل کہا ہے۔ چونکہ وفور غم سے میں اپنے آپے میں نہیں ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے، کہ میں شکایت کر رہی ہوں، میں جانتی ہوں، کہ آپ رحمدل ہیں اور ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے کو مستعد رہتے ہیں آپ غیر سے غیر شخص کے ایک لفظ پر اسکی مدد کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ مگر آپ کی رحمدلی مخصوص ہے، وہ لامحدود و غیر مسدود ہے، کوئی شخص بھی آپ کو اتنا پا سکتا ہے۔ جتنا وہ اپنے ہاتھوں سے گرفت کر لے۔ تاہم مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کا رحم و کرم سستی سے کام کرنے کا عادی ہے، آپ سے مانگنا پڑتا ہے آپ اُن کی مدد کرتے ہیں جو مدد کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ شرم کی وجہ سے مدد کرتے ہیں۔ کمزوری کی وجہ سے مدد کرتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کرتے، کہ استمداد فی نفسہ ایک پُرمسرت کام ہے۔ مجھے صاف طور سے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے، کہ وہ لوگ جو مصائب و آلام میں ہیں، آپ کے نزدیک ان لوگوں سے زیادہ قابل رحم، زیادہ عزیز نہیں ہیں۔ جو آپ کی طرح عشرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ کی قسم کے لوگوں میں سے کسی سے بھی، ان میں سب سے زیادہ رحمدل شخص سے بھی کچھ مانگنا مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے۔ ایک دفعہ جبکہ میں ہنوز بچہ تھی، میں نے اپنے دروازہ کی درز سے جھانکا تھا، کہ کس طرح آپ نے ایک فقیر کو کچھ دیا، جس نے آپ کے دروازہ کی گھنٹی بجائی تھی۔ ہاں اس کے سوال کرنے سے بھی قبل آپ نے نہایت سرعت سے، نہایت فیاضی سے اس کو دیا تھا۔ آپ کے طریقہ میں ایک خاص بےچینی و اضطراب تھا۔ ایک خاص سرعت و تیزی تھی۔ گویا کہ آپ کا خاص مقصد اس سے چھٹکارا پانا تھا

معلوم ہوتا تھا، کہ آپ اس سے نظریں چار کرنے سے ڈرتے ہیں۔ میں استمداد کے اس ڈرپوک و مضطرب انداز کو، لفظ تشکر سے عذر کرنے کے اس طریقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکی۔ یہ ہی وجہ ہے۔ کہ میں نے مصیبت میں کبھی آپ سے رجوع نہیں کیا۔ آہ میں جانتی ہوں، کہ باوجود اس شک کے، کہ میرا بچہ واقعی آپ کا ہے، آپ مجھے وہ سب مدد دیتے جس کی مجھے ضرورت تھی۔ آپ مجھے آرام و آسائش پہنچاتے اور مجھے روپیہ دیتے۔ بہت روپیہ دیتے، مگر ہمیشہ ایک اضطراب اور بےچینی کے پردے میں مصیبت کو ٹالدینے کی ایک پوشیدہ آرزو کے پردہ میں مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے اس ہونے والے بچے سے بھی چھٹکارا پانے کا مشورہ دیتے، میں اس بات سے سب سے زیادہ خوفزدہ تھی، چونکہ میں جانتی تھی، کہ آپ جو کچھ کہیں گے مجھے کرنا ہی ہوگا، مگر وہ بچہ میرے لئے سب کچھ تھا، وہ آپ کا تھا، یہ آپ ہی نے دوسرا جنم لیا تھا۔ وہ "آپ" ہیں جو بےفکر و مسرور ہیں اور جنکو حاصل کرنے کی میں کبھی اُمید نہیں کر سکتی، بلکہ وہ "آپ" جو صرف میرے ہی لئے پیدا کئے گئے تھے، میرے ہی ایک گوشت کا ٹکڑا، جو میری ہستی سے لاینفک طور پر وابستہ تھا آخرکار میں نے آپ کو پا لیا تھا! میں اپنی رگوں میں آپکے خون کی گردش محسوس کر سکتی تھی، میں اپنے دل کی ہر تڑپ کے ساتھ آپ کو غذا دے سکتی تھی، آپ پر محبت سے ہاتھ پھیر سکتی تھی۔ آپ کو پیار کر سکتی تھی، یہ ہی وجہ ہے کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ میں حاملہ ہوں تو میں اس قدر مسرور تھی! یہ ہی وجہ ہے کہ میں نے اس راز کو آپ سے چھپائے رکھا، اب آپ مجھ سے غدر نہیں کر سکتے تھے۔ آپ میرے تھے۔

مگر آپ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے۔ کہ انتظار کے یہ مہینے اتنی ہی خوشی سے کٹے، جو میں نے اپنی مسرت کے اولین لمحات میں محسوس کی تھی، وہ آلام و افکار سے پُر تھے، انسانی پستی اور رذالت کے تنفر سے معمور، مجھے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، آخری مہینوں میں، میں کام پر نہ جا سکی، چونکہ میرے سوتیلے باپ کے عزیز میری حالت کو سمجھ لیتے اور گھر خبر بھیج دیتے، میں اپنی ماں سے بھی روپیہ مانگنا نہیں چاہتی تھی، لہذا وضع حمل کے وقت تک میں اپنے چھوٹے موٹے زیورات بیچکر گذر کرتی رہی۔ زچگی سے ایک ہفتہ پیشتر میری جیب میں جو کچھ دام پڑے تھے، وہ ملازم نے چرا لئے۔ اور اسلئے مجھے زچگوں کے شفاخانے جانا پڑا۔ وہ بچہ، آپ کا لڑکا، بدبختی و بدنصیبی کے اس خرابے، اس محتاج خانہ میں غریبوں، لاوارثوں، بےخانماؤں کے درمیان میں پیدا ہوا، وہ ایک منحوس مہلک جگہ تھی، ہر چیز اجنبی، ہر چیز بیگانہ تھی۔ ہم وہاں اپنی تنہائی میں ایک

دوسرے سے بیگانہ پڑے تھے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات تھے، شفاخانے کے اُس وارڈ میں جہاں خون۔ کلوروفارم کا تعفن تھا، جو آہ و ماتم کی آوازوں سے معمور تھا، ہم افلاس کی حیثیت کے تنہا رشتہ میں منسلک وہاں پڑے تھے، شفاخانے کے ایسے کمروں میں، سرہانے کی تختی پر لکھے ہوئے نام کے علاوہ مریض اپنی تمام شخصیت، اپنی تمام انفرادیت اپنی تمام انانیت کھو بیٹھتا ہے۔ بستر پر پڑا ہوا مریض انسان نہیں، گوشت کا ایک تڑپتا ہوا ٹکڑا، مطالعہ و مشاہدہ کی ایک چیز ہے۔

ان باتوں کے بیان کرنے کیلئے میں آپ سے معافی کی خواستگار ہوں، میں ان کا پھر کبھی تذکرہ نہیں کروں گی، گیارہ برس سے میں خاموش رہی اور تھوڑی دیر میں ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جاؤں گی۔ ایک مرتبہ میں یہ بتانا چاہتی تھی، کہ یہ بچہ کس قدر گراں قیمت پر خریدا گیا تھا۔ یہ بچہ جو میری مسرت کا ذریعہ تھا، اور جو اب مردہ پڑا ہے، میں وہ المناک ساعتیں فراموش کر چکی تھی۔ اسکے تبسم اور اس کی آواز میں ان کو محو کر چکی تھی، اپنی مسرت میں ان کو بھول گئی تھی۔ اب جبکہ وہ مُردہ پڑا ہے وہ کرب و اذیت پھر زندہ ہو گئے ہیں اور میں صرف ایک مرتبہ الفاظ میں اس کو ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں آپ کو الزام نہیں دیتی، صرف خدا کو، ہاں صرف خدا کو جو ان سب بے معنی مصیبتوں کا خالق ہے، کبھی آپ کے خلاف کوئی برہم خیال میرے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ دردِ زہ کے جانسوز کرب میں بھی مجھے آپ پر غصہ نہیں آیا۔ میں کبھی ان راتوں پر نہیں پچھتائی جب مجھے آپ کی محبت مل گئی تھی۔ میں ہمیشہ آپ سے محبت کرتی رہی، ہمیشہ اس ساعتِ مسعود کو دعائیں دیتی رہی جب آپ میری زندگی میں آئے۔ اگر میرے لئے یہ ممکن ہوتا کہ میں زمانے کو لوٹا کر اتنے عرصہ کیلئے پھر زندہ رہ سکوں، چاہے یہ زندگی جہنم ہی میں بسر کرنا پڑے، تو میں ایک بار نہیں متعدد بار ایسا کر چکی ہوتی۔

ہمارا بچہ جسے آپ جانتے بھی نہیں کل مر گیا۔ آپ کی نظر میں اس پر نہیں پڑیں اس کی بشاش ہستی سے آپ کا کبھی ابعید ترین گزرنا عارضی اتصال بھی نہ ہو سکا۔ بچہ کی پیدائش کے بعد بہت عرصہ تک میں آپ کی نظروں سے پوشیدہ رہی، میری ہستی پر آپ کی محبت کا چھا جانے والا اثر کم ہو گیا تھا، ہاں مجھے یقین ہے، میرے دل میں آپ کی محبت کا وہ پہلا سا جوش باقی نہ رہا تھا۔ اب آپ کی محبت میری پہلی سی قلبی اذیت کا ذریعہ نہ تھی۔ چونکہ اب میرے پاس لڑکا تھا۔ میں اپنے آپ کو اسکے اور آپ کے درمیان میں تقسیم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنی ہستی کو آپ کے سپرد نہیں کیا جو مجھ سے بے نیاز و مسرور تھے۔ بلکہ اس لڑکے کے لئے وقف کر دیا جس کو میری ضرورت تھی، جس کی میں پرورش کر سکتی تھی، جس کو میں پیار کر سکتی تھی، جس کو سینے سے لگا سکتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اپنے قلب میں آپ کی تڑپتی ہوئی مضطرب آرزو کا درماں مجھے مل گیا ہے، معلوم ہوتا تھا آپ کے اس دوسرے جنم نے جس میں آپ سچ مچ بالکل میرے تھے، میری قسمت کی تباہی و بربادی کو دور کر دیا ہے، اب یوں ہی کبھی کبھی میرے جذبات آپ تک، آپ کی قیام گاہ تک پہنچتے تھے، ایک خاص بات یہ کہ ان پھولوں کی طرح جو آپ نے محبت کی پہلی شب کو مجھے دیئے تھے کچھ سفید گلاب کے پھول میں آپ کی سالگرہ کے دن ہمیشہ بھیجتی رہی۔ کیا اس دس گیارہ سال کے دوران میں کبھی ایک دفعہ بھی آپ کو یہ خیال آیا کہ آپ اپنے دل میں سوچیں کہ یہ پھول کس نے بھیجے ہیں؟ کیا آپ کو کبھی یہ بھی یاد آیا کہ اسی قسم کے چند پھول آپ نے ایک دفعہ ایک لڑکی کو دیئے تھے؟ میں نہیں جانتی اور کبھی نہیں جان سکوں گی۔ میرے لئے اتنا ہی بہت تھا کہ لاعلمی کی تاریکی سے آپ کو وہ پھول بھیج کروں، اتنا ہی بہت تھا کہ ہر سال اس ساعتِ مسعود کی یاد کو [illegible] میں تازہ کر لیا کروں!

(باقی)

سایہ نما قاتل

کلبس روڈ تھانہ کے کمرے میں ناکبھ جاسوس بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں چھوٹی تپائی پر تھے اور دل میں امنگیں تھیں کہ آدھی رات ہو اور فریضۂ نیم شبی سے گلوخلاصی ہو جائے۔ پہلو والی کرسی پر انسپکٹر آباد جلوہ فرما تھے اور ابھی ابھی کلب کی واپسی میں گھر جاتے ہوئے آ گئے تھے۔

"سارا حلقہ شہرِ خموشاں ہو یا جزیرۂ غیر آباد" ناکبھ نے انسپکٹر آباد کے جواب میں کہا جس نے پوچھا تھا کہ کہو کیا حال چال ہے "زندگی روزمرّہ کا دائرہ بن کر رہ گئی ہے۔ پیری بڑھتی جاتی ہے اور پنشن کا انتظار رہتا ہے۔"

انسپکٹر نے دانت دکھا دئے۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ اس کا ماتحت قابلِ قدر ہے۔ اور اس پر نچلا بیٹھنا ایک بوجھ ہے۔

بڑے نے تشفی آمیز لہجے میں کہا "رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" اور اسے خبر نہ تھی کہ اس کے الفاظ میں کتنی پیشگوئی کی شان تھی۔

ناکبھ نے ایک سانس لی اور پھر حیرت انگیز سکوت میں غوطے لینے لگا۔ کرسی کے اگلے دو پائے اٹھے ہوئے تھے اور ناکبھ پچھلے پاؤں پر ٹیک لگائے چھت کو ان دیکھے طور پر دیکھ رہا تھا۔ دوسری کرسی پر انسپکٹر آباد شام کا ایک اخبار لئے یونہی سیر کر رہے تھے۔ یکایک ناکبھ کی میز پر فون کی گھنٹی بجی جس کے تیز اور پیہم ترنم نے بوجھل سناٹے کو توڑ دیا۔

"اخوہ" ناکبھ نے زور سے اپنے پاؤں فرش پر دھماکے سے پٹکے۔

"غالباً کوئی معمولی سی بات ہوگی جو میرے بستر کو ایک گھنٹہ اور میرا منتظر رکھے گا۔" بڑبڑاتے ہوئے اس نے ریسیور کو کانوں سے لگا لیا۔

"یہ تم ہو ناکبھ؟ نچلی والی منزل سے کرخت سی آواز آئی "ایک شخص جو اپنا نام نہیں بتاتا کہتا ہے کہ وہ جاسوسی سارجنٹ ناکبھ سے بنفسِ نفیس ٹیلیفون پر باتیں کرنی چاہتا ہے۔

میں آپ کا نمبر ملا کر سلسلہ قائم کئے دیتا ہوں۔

دوسرے ہی لمحے میں ناکبھ کے کانوں میں ایک اور صدا آئی۔ یہ نقاب پوش صدا تمکنت اور نفرت، طعن اور تشنیع سے بھری ہوئی تھی۔

"کیا مجھے جاسوسی سارجنٹ ناکبھ سے بولنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے"

"یقیناً" ناکبھ نے بے دلی سے کہا،

"بہتر" تار پر ایک قہقہہ سا دوڑ گیا۔ "ذرا بہت غور سے میرا ایک ایک حرف سنئے۔ تاکہ واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے آپ کو تمام باتیں معلوم رہیں۔"

"باتیں۔ ظہور پذیر ہونے والے واقعات" سارجنٹ کی ساری کسالت کافور ہو گئی، وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ حسنِ اتفاق سے انسپکٹر آباد بھی یہیں موجود ہیں، بہتر ہے کہ تم انھیں سے باتیں کرو"

"انسپکٹر آباد" لہجہ میں بلا کی نفرت اور سبکی تھی۔ "تمہیں سارجنٹ انسپکٹر کو غائب سمجھو، میں تو کسی نفیس حریف کے ساتھ بساطِ عقل بچھا کر کھیلنا چاہتا ہوں، جو پورا پھکیت کھلاڑی اور جاسوس ہو، جیسے کہ تم ہو"

"دیکھئے میں شرما جاؤں گا" ناکبھ نے دانت پیس کر کہا، اور ریسیور کے دہانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر انسپکٹر آباد سے کہنے لگا۔ یقیناً کوئی عملی ظریف ہے جو مجھے بنانا چاہتا ہے"

"یہ تمہاری بھول ہے سارجنٹ" دہانۂ فون پر کڑک کے ساتھ آواز آئی۔

"تم نے جو انسپکٹر سے کہا وہ میں نے سن لیا۔ بیشک تم نے دہانۂ فون پر ہاتھ رکھ لیا تھا مگر تم نے دستہ کو اپنے سینے کے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ اسی لئے تمہاری صدا تمہاری انگلیوں کے درز سے سما کر مجھ تک پہونچ گئی۔ میں تمہیں اتنا سادہ نہیں سمجھتا تھا اگر تمہیں اپنی شہرت، لیاقت اور محنت کو کلنک کا ٹیکہ لگانا منظور نہیں تو جزئیات کا دھیان رکھا کرو۔

"بہت خوب، آئندہ احتیاط کی جائے گی" ناکبھہ نے مغلوبی انداز
میں کہا "ذرا اپنا کام جلد بتاؤ، میں گھر جانے والا ہوں۔"
"فضول بسلیاں چھوڑ دو۔ آج تم بھی ساری رات بستر کا منہ دیکھوگے"
"خیر تم اپنی کہو" سارجنٹ نے جھنجلا کر کہا۔
آواز نے حاضر جوابی سے کہا "پہلے آپ کو سارا کچا چٹھا معلوم ہو جانا چاہیئے"
"آپ فانڈا محل سے واقف ہیں؟ میں نے اس محل کو اکثر دیکھا ہے" ناکبھہ نے
اقرار کیا

"ہاں کیوں نہ دیکھا ہوگا" غائب متکلم نے کہا "فانڈا محل اپنی شان کا نرالا ہے، اور ظاہرہ بہت عظیم معلوم ہوتا ہے۔ تم جانتے ہوگے کہ اس محل کے
مالک مارٹ فانڈا صاحب ہیں۔ جن کے پاس لاانتہا دولت موجود ہے، اور تم یہ بھی
جانتے ہیں کہ سارا سرمایہ اُن کے پاس کیونکر جمع ہوا۔ بیشک تمہیں یہ بھی معلوم
ہوگا کہ بیگم فانڈا مر چکی ہیں اور ان کی تین اولادیں موجود ہیں مگر تم یہ نہ جانتے
ہوگے کہ راجہ صاحب اس وقت بُری طرح بیمار ہیں۔ فالج گر چکا ہے۔ بھیجے پر خون
کے نکتے جمع ہوگئے ہیں۔ دیدوں کی تشخیص یہی ہے۔"
"یہ سنکر بہت افسوس ہوا۔" ناکبھہ نے ایک جھلی سی نگاہ دیوار گھڑی کی
پر ڈالی "مگر ان تمام قصوں کا مجھ سے کیا علاقہ؟"
تار پر جو آواز آرہی تھی بیکایک دھیم ہوگئی۔ اس میں سرد سی سے پیدا
ہونے والی کپکپاہٹ اور سرگوشی کی سی تیزی پیدا ہوگئی۔ "آج ٹھیک ٹھیک
آدھی رات کو فانڈا اراج میں ایک آدمی قتل کر دیا جائے گا۔ وہ میرا پہلا شکار
ہوگا۔ مگر مجھے اپنے مقصد حاصل کرنے کے لئے یعنی فانڈا کے لاکھوں روپیہ پر
قبضہ کرنے کے لئے اور بھی بہت سے آدمیوں کو قتل کرنا ہے۔
ناکبھہ ایک تکان کے ساتھ اپنی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں
میں ایک بیچینی پیدا ہوگئی اور اُس نے چلّا کر دہانہ فون میں کہا۔ "میں بہت
تھکا ہوا ہوں اور سونے جاتا ہوں۔ مجھے کسی غیر ذمہ دار احمق سے بک بک
کرنے کی فرصت نہیں۔ شب بخیر۔"
"ٹھیرو" اس حکم میں بلا کا اصرار انتہا کا تحکم تھا۔ سارجنٹ رسیور
رکھتے رکھتے رک گیا۔ "سارجنٹ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ تمہیں بھی ابھی معلوم
ہو جائے گا۔
"بیشک" ناکبھہ نے تیزی سے کہا "ایک سنجیدہ قاتل یقیناً حکام کو

پہلے ہی سے اپنے ارادوں کا اشتہار دے دیگا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے
بکواس کا دماغ نہیں میں یہ سلسلہ قطع کرتا ہوں۔
"رکو" غائب متکلم کی آواز گھٹ کر انتہائی خوفناک ہوگئی۔ ناکبھہ
تاثیر سزا سے گھبرا سا گیا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم عین موقع پر شروع ہی سے
موجود رہو تاکہ میں تمہارے آزادی سے گفتگو کر سکوں۔ ...... پولیس والوں
میں آزادی سے مل جل جاؤں اور اُن کو مدد دوں کہ کسی غلط آدمی کے سر سارا
الزام تھوپ دیں۔
"تمہارا دماغ خراب ہوگیا" سارجنٹ نے غصہ سے اکڑ کر کہا
"اگر تمہارا بیان صحیح مان لیا جائے تو بھی تم سے پہلے بہتوں نے سوچا تھا کہ قتل
کر کے بے داغ نکل جائیں گے، مگر آج ان کی ہڈیاں بھی جیلخانوں میں پس کر چونا
ہوگئی ہیں۔
"ہاں گدھوں کے جسم چونا ہوگئے ہوں گے" آواز میں تشنیع تھی،
"مگر سارجنٹ تم کو بھی اقرار ہوگا کہ بہت سے غیر گرفتار شدہ قاتل ہیں جو ہم تم
جیسے آزاد آدمیوں میں چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ میں بھی اسی جماعت کا ایک کن
بن جاؤں گا مجھے آزادی کہ اس دولت سے پورا لطف حاصل کرنے کا حق ہے جو
قتل و غارت سے حاصل کروں گا۔

ناکبھہ کی رگیں اینٹھی سی گئیں۔ سانس گلوگیر ہونے لگی۔ سوچا کہ پاگل ہے
یقینی ہے مگر شبہ کی بھی ایک جھلک انداز تکلم میں تھی۔
حقارت سے بھری ہوئی آواز کہتی ہی گئی "میرا ارادہ ہے کہ قتل
کو تھیٹر سا بنا دوں۔ میں نے اپنی پوری اسکیم بھی طرح سوچ لی ہے۔ ابھی ابھی
چند لمحوں میں تم اور انسپکٹر آباد آ دھمکوگے تو میں تم لوگوں کے سواگت کے لئے
چہار دیواری کے قریب ہی موجود رہوں گا۔ اور سارجنٹ یاد رکھو تمہیں ایک چند
بہت سے مقدمات کی تفتیش کرنی پڑیگی۔ بہت کا بڑا مالی نہری کے پودوں کی خریداری کے
بہانے سے ٹھیک آدھی رات کے دو چار سنٹ پہلے اپنا دروازہ کھولے گا۔ سب
پہلے اسی کو قتل کروں گا تاکہ شبہ کی اُنگلی میری طرف سے دوسری طرف پھر جائے
اور قتل و غارت کا جلسہ شروع ہو جائے۔
"مگر ——" ناکبھہ نے کہنا شروع کیا
"یقیناً یہ سب مجذوب کی بڑ معلوم ہوتی ہوگی، بیچ بستر آواز نے متقرض
ہو کر کہا "یہ ظاہری حماقت بھی میری نفیس تجویز کا جزو ہے تمام واقعات ایسے غیر

"قتل اتنے جنوں آمیز معلوم ہوں گے جس میں ٹیلیفون کی یہ دعوت اور یہ بات چیت بھی شامل ہے۔ کہ تم لوگوں کے ہوش و حواس شروع ہی سے پراگندہ ہو جائیں گے اور لاکھوں کی دولت حاصل کرنے میں جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے جائیں گے ویسے ہی بیکار اور بظاہر مجنونانہ حرکتیں بھی بڑھتی جائیں گی تاکہ تمہاری وحشتوں میں کمی نہ ہونے پائے۔ ایک کے بعد ہی دوسرا قتل اتنی تیزی سے ہوگا کہ تم صحیح طور سے کچھ سوچ بھی نہ سکو گے۔ غالباً تم میرا مفہوم سمجھ گئے ہو گے۔ مطلب یہ ہے کہ تم حواس باختہ ہو کر کسی بے گناہ کو گرفتار کر لو گے۔ اس کی سزا ہو جائے گی اور وہ پھانسی کے تختے پر لٹک جائے گا اور خود بخود میدان میرے واسطے صاف ہو جائے گا تاکہ میں اپنی اپنی دولت کا آزادی کے ساتھ لطف اٹھا سکوں۔

ناگمبھ نے دیر تک اپنے غصہ کو روکا۔ پھر متانت سے کہنے لگا

"بہت خوب حضورِ اعلیٰ اب برائے کرم آپ اپنا نام اور پتہ بتا دیں تو میں آپ کی خدمت میں ایک اچھی سی موٹر بھیج دوں اور آپ کے واسطے سرکاری مہمان خانہ میں ایک گرم اور سجی سجائی کوٹھری تیار رکھوں۔

تار پر ایک مرتبہ اور قہقہہ آمیز فضا دوڑ گئی "میرا پتہ فاونڈ اٹھل میں کتب خانہ سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمہیں ضرورت نہیں کہ بات کرنے والے کی جگہ کا پتہ لگاؤ، میرا نام تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ تم سے ملاقات ہو گی اور تم کل پرسوں ایسے محشر خیز دنوں میں مجھ سے باتیں بھی کرو گے۔ مگر جہاں پناہ کو شبہ بھی نہ ہوگا کہ میں ہی قاتل ہوں۔

"مگر مجھے اپنے روزنامچہ میں یہ گفتگو لکھنی ہو گی۔" ناگمبھ کی آواز میں وہ اثر تھا جو سرکش بچوں کے بہلانے کے لئے ہوتا ہے۔ "بتاؤ میں کس نام کا اندراج کروں۔"

آواز نے حاضر جوابی سے کہا "ایسا نام جو میرے کردار کے لئے بالکل موزوں ہو۔ ایسا نام جو کل کے اخبارات میں موٹی موٹی سرخیوں سے لکھا جائیگا۔ ایسا نام جسے تم فاونڈ اٹھل کی فصیل کے نیچے مجھے اپنے انتظار میں دیکھ کر کہہ دو گے یہی نام میرے لئے موزوں ہے۔ میں جس نام سے یاد کیا جانا چاہتا ہوں وہ سایہ نما قاتل ہے"

متکلم نے یہ کہتے ہی سلسلہ قطع کر دیا۔

"بڑی دیر کی" انسپکٹر آباد نے سرجنٹ سے مڑتے ہی پوچھا "قصہ کیا ہے"

ناگمبھ نے حرف حرف بیان کر دیا۔ انسپکٹر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

"میں عملی مسخروں سے شدید نفرت کرتا ہوں" گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ بارہ میں دس باقی ہیں" فریضہ کے طور پر ہم کو تفتیش کرنی ہی پڑے گی۔ آدھ شرط لگا لو وہاں تمہیں کوئی بجز عملی ظریف کے نہ ملے گا جس کو گھر کے تمام تہذیب لوگ گھیرتے ہوں گے وہ سب کے سب ہم لوگوں سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کر کے سگار اور ساغر سے پیش کریں گے۔ یہ مذاق بھی کوئی مذاق ہے۔

"مگر متکلم کے لہجے میں خلوص بھرا ہوا تھا"، ناگمبھ نے اپنی ٹوپی اٹھائی اگر راجہ صاحب بیمار ہیں تو ایسا جلسہ وہاں کیسے ہو سکتا ہے۔

انسپکٹر آباد نے تیز نگاہوں سے ماتحت کو دیکھا۔

"کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ وہاں کوئی قتل واقع ہوگا چلو دو منٹ میں پہونچے جاتے ہیں۔

ناگمبھ نے ہلکے سے دانت پیسا اور آگے آگے ہلکے ہلکے چلا۔ دو لوب سارجنٹ کی نئی موٹر آسٹن شات کے قریب پہونچ گئے

انسپکٹر بغل والی سیٹ پر سکڑ کر بیٹھ گیا اور سارجنٹ نے چکے پر ہاتھ ڈالا مگر اس کے سر میں ہزاروں خیالات چکر کھا رہے تھے۔ مذاق، فریضہ، اگر متکلم ظریف تھا تو واقعی غضب کا اداکار تھا جس نے اپنے نخ بستہ لہجے میں بلا کی حقارت پیدا کر لی تھی، وہ طعن سے بھری ہوئی صدا اب تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور چھوٹی آسٹن ہنکی اور تیزی کے ساتھ فاونڈ اٹھل کی طرف رواں تھی۔

جاسوس ناگمبھ اور انسپکٹر آباد دونوں نے ایک چیز کو بہ یک وقت دیکھا۔ فاونڈ اٹھل کے دروازے پر سڑک والے لیمپ کی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی مگر دونوں کی آنکھوں میں چکا چوندسی ہو گئی، دیوارے اُبل پڑے چیز ایسی عجیب تھی کہ انھیں گھور کر دیکھنا پڑا۔

چہار دیواری کے پاس ہی بیچ ہوا میں معلق ایک نورانی مگر خوفناک، دہشت زا اور وحشت انگیز نقاب لہرا رہا تھا۔ اس کی لہروں میں میٹھی چٹکیاں بھی شامل تھیں۔

ناگمبھ نے برک دیا۔ اور اتنے اچانک طور پر کہ موٹر کے تمام پرزے ہل گئے اور وہ کھڑی ہو گئی۔

یہ شیطانی چہرہ سارجنٹ کے نیم اُمید کے خلاف فوراً ہی غائب نہیں ہو گیا بلکہ پودوں کے حاشیہ پر اُسی طرح لپکتا رہا ایک سنگین لمحے تک دونوں پولیس والے گردنیں نکال کر گھورتے رہے۔ روشن مگر بدنما چہرے کی باچھیں طعن آمیز طریقے سے ادھی کھل گئیں۔ سارجنٹ کو اپنے کاندھے کی چتونوں میں ہلکا سا لرزہ محسوس ہوا مگر وہ فوراً سنبھل گیا۔

"اگر میں اس ظریف کو پا جاؤں تو مزاج پوچھ لوں۔ ناکبھ فرودگاہ پر اُچھل کر پہنچا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اونچے کر لئے اور فصیل کی منڈیر کی طرف جست کی۔ حسنِ قسمت سے فصیل پر بلور کے ٹکڑے جمے ہوئے نہیں تھے۔ مگر اینٹوں کے حاشیہ سے پوریں چھل اٹھیں۔ پھر بھی وہ پوری قوت لگا کر اوپر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی سکنڈ میں وہ پار تھا۔ کودنے میں اُس کے ٹانگوں نرم سبزے میں دھنس گئے۔۔ ہوا میں لہرانے والے سبزہ گوں روشن نقاب کی طرف دیوانہ وار دوڑ پڑا۔

ممکن ہے کہ ایک عملی مذاق رہا ہو۔ غالباً ایسا ہی تھا۔ مگر ایسے ظریف سے دست و گریبان ہونے کے شوق میں جاسوس بیتابانہ بڑھ رہا تھا۔

بڑبڑاہٹ کھردری کی آوازیں اور دھمدھاہٹ بتا رہی تھی کہ انسپکٹر آبادی تعاقب میں ہے۔ ناکبھ کو اس خیال سے بڑی تسلی ہوئی اور وہ پوری طاقت سے اس شیطانی پیکر کی طرف روانہ ہو گیا۔

سارجنٹ آگے بڑھتا گیا وہ چیز پیچھے ہٹتی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز پودوں، جھاڑیوں، ٹٹیوں سے بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ گزر رہی ہے، جو سارجنٹ کی راہ میں کوڑے کانٹے اور روڑے بن رہی تھیں۔ مگر یہ بات حیرت انگیز نہ تھی۔ غالباً نقاب میں ہسد کی ڈور لگی ہوئی تھی اور کوئی اسے کھینچ رہا تھا پھر بھی وہ رات کے سیاہ چادر میں مستانہ طور پر ناکبھ کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔

یکایک جبکہ سارجنٹ اور انسپکٹر کانٹے کانٹے خاردار جھاڑیوں کو پھاڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سایہ نما چہرے سے ایسا تیز اور ہنسی سے بھری ہوئی آواز آئی، پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ناکبھ نے ویسی ہی آواز ابھی چند منٹ پہلے ٹیلیفون پر سنی تھی۔

انسپکٹر اب ناکبھ کی برابر پہونچ چکا تھا۔ وہ بھی بڑبڑا اٹھا۔ اس سے مطلب ——"

ناکبھ نے باقی جملہ نہیں سنا وہ جھاڑیوں کا پردہ پھاڑ کر لان پر پہونچ چکا تھا۔ اب تو لپکتا ہوا روشن چہرہ بالکل اُس کے روبرو تھا اور ایک اوسط درجے کے آدمی کے سر کے برابر اونچا تھا وہ بمشکل حرکت کر رہا تھا۔ ناکبھ نے پھر ہاتھ بلند کر کے جست کی وہ قریب تھا اس وحشی چیز کے اوپر پہونچ گیا۔ مگر اسے چھٹے حواس نے بتایا کہ یہ تفریح اور عملی مذاق نہیں، بلکہ واقعہ ہے اگر چھیڑ چھاڑ ہوتی تو اب تک اُس نے قہقہہ لگا کر ختم کر دیا ہوتا اور اسی کو کافی سمجھنے کہ دو پولیس والے جھاڑیوں میں اُلجھ کر ہانپتے کانپتے دوڑ رہے ہیں۔ یہ حقیقت بھی اب ناکبھ کو یقین آ گیا۔ طرہ یہ کہ وہ بے جسم کا چہرہ اب صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا سارجنٹ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور ہوا میں جست کر کے اس شخص کے پکڑنے کی کوشش کی جسے وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مگر روشن نقاب کے نیچے ہوا ہی ہوا تھی اور وہ منہ کے بل زمین پر تھا۔ اُس نے گرتے گرتے پھر وہی تیز اور حقارت آمیز قہقہہ سنا اس میں فتحمندی اور بشاشت کی جھلک بھی آ گئی تھی، پلک جھپکتے ہی ناکبھ اٹھ کھڑا ہوا اور آدھر کی طرف لپک پڑا جدھر سے یہ سوکھا قہقہہ بلند ہوا تھا اسے کیا خبر تھی کہ ٹھیک اسی لمحہ پر انسپکٹر بھی داہنی طرف حملہ کر رہا تھا۔ چاندنی نہیں تھی، چاروں طرف اندھیرا گھُپ تھا۔ مگر ناکبھ کو ایسا نظر آیا گویا کوئی شخص کالی رات سے بھی زیادہ کالا سامنے ہے وہ اور انسپکٹر آباد چشم زدن میں ایک دوسرے سے گتھتے ہوئے زمین پر نظر آئے۔

ان کے گرتے ہی سایہ نما چہرہ جھکنے لگا اور اتنا جھکا کہ قریب قریب ان کے چہرے کو چھو گئے اور پھر وہی طعنہ بھرا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

بُری طرح ہانپتا ہوا ناکبھ بہ دقت پھر کھڑا ہوا اور کھڑے ہوتے ہی وہ اُس طرف جھپٹا جدھر سے اس قہقہہ کی صدا بلند ہوئی تھی یہ حرکت اس برق روشی کے ساتھ ہوئی تھی کہ اُس کے ہاتھ میں کسی کا دامن آ گیا، اور اُس کا بدن کسی اور جسم سے ٹکرا گیا۔ دوسرے ہی لمحہ میں وہ زخمی شیر کی طرح اس اندھیری رات میں ایک پھسلنے والے جسم سے ہاتھا پائی کر رہا تھا جس کے چہرے پر سایہ نما روشن نقاب تھا۔

ناکبھ نے اس قابل حسین پیکر کو زیر کرنے کے لئے ساری طاقت ختم کر دی مگر وہ پیکر بھی کالے کوڑیالے کی طاقت اور غصہ کے ساتھ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ دونوں کے پھیپھڑے مانو دھونکنی بنے ہوئے تھے وہ آواز کے ساتھ سانس لے رہے تھے اور گتھے جا رہے تھے۔ ناکبھ کا پاؤں سبزہ تر پر پھسل گیا وہ گرا مگر

اپنے دشمن کو گھسیٹتا ہوا، اس کی پیٹھ زمین پر لگی تھی کہ دوسرے نے اپنا چاقو بلند کرلیا۔ ناکبھ نے چمکدار پھل کو اپنے گلے کی طرف آتے ہوئے دیکھا اس نے عین موقع پر اپنے سر کو جھٹک کر وار کو خالی دیا پھر دونوں ہاتھوں سے اُس نے اُس کلائی کو پکڑ لیا جس میں چاقو تھا اور اتنی زور سے مروڑا کہ دشمن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

پھل کی نوک کسی کپڑے میں اُلجھ گئی۔ حقارت پاش نقاب پیچھے ہٹا۔ دشمن روم گھوم گیا۔ کلائی چھوٹ گئی اور روشن چہرہ پیچھے ہٹتا ہوا غائب ہوگیا۔

ناکبھ آہستہ آہستہ کھڑا ہوا اور ایک لمحہ کھڑے کھڑے سانس جاں بخش ہوا سے اپنے پھیپھڑے بھرے وہاں سے وہ انسپکٹر آباد کے پاس پہونچا جو بڑی مشکل سے اٹھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ "تمہارا سر سیدھا میری کنپٹیوں پر پڑا تھا، میں گر کر بیہوش ہوگیا تھا" سارجنٹ نے اسے سہارا دیکر بلند کیا" انسپکٹر نے پوچھا "کیا وہ نکل گیا" "ہاں" ناکبھ نے اقرار کیا۔

اور ایسی نپٹ اندھیاری میں اُسے ڈھونڈھ نکالنے کی کوئی امید بھی نہیں۔ آؤ چلو اب کوٹھی پر چل کر سب کو خبردار کردیں۔ کل صبح کنگھی لے کر اس مقام کا ذرہ ذرہ چھان ڈالیں گے کسی نہ کسی کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہے ــــ"

یکایک وہ رک گیا اور گھوم کر دیکھنے لگا ہوا میں ایک چیخ بلند ہوئی گویا کوئی شخص مرنے کے قریب ہو۔ ناکبھ کو محسوس ہوا جیسے اس کا خون جم گیا ہو۔

"وہ میرے پیچھے ہے وہ مجھے ــــ" چیخ مدھم ہو کر گلوگیر ہوگئی۔ ناکبھ اور انسپکٹر ایک ہو کر صدا کی طرف دوڑ پڑے۔ دونوں نے سرکاری پستول جیبوں سے نکال لئے۔

مگر ناکبھ انسپکٹر سے رفتہ رفتہ آگے بڑھ گیا۔ اس نے آخری کانٹے دار جھاڑی پار ہی کی تھی کہ اُسے ہانپنے کی آواز سی آئی اور دو پیکر سایہ کی طرح ایک بڑے شاہ بلوط کے نیچے گتھے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے صدا دی کہ میں پہونچ گیا اور اپنی رفتار بھی تیز کردی ــ مگر یہ سب بقدر ایک قہقہے کے ناکافی ثابت ہوئی اب چاندنی باراں آلود ابر میں سے جھانکنے لگی تھی۔ اس کے ایک ہی پرتو میں ناکبھ کو ایک چاقو ہوا میں لہراتا ہوا سر سے بلند دکھائی دیا۔ چاقو شیطانی طور پر چمک کر نیچے جھکا اور اگر سیاہ پوش پیکر اچھل کر درختوں میں غائب ہوگیا اور وہاں سبزے پر ایک مجروح دم توڑتا نظر آیا۔

ناکبھ نے ذرا سی جھلک دیکھی کہ وہ رواں دواں پیکر محل کی پشت کی طرف بھاگا۔ یکایک اُس نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کیا اور اپنے چھ فائر والے پستول کو ہوا میں خالی کردیا۔ ساری فضا دھوئیں اور دھماکوں سے گونج اٹھی۔ جواب میں صرف ایک طعنہ آمیز قہقہہ ملا۔

اس کے بعد روح فرسا سکوت طاری ہوگیا۔ کسی ہمسایہ گھڑیال میں پوری بارہ ضربوں میں بارہ بجے ٹھیک آدھی رات ہوگئی۔

سایہ نما قاتل نے اپنے وعدے کا حرف حرف پورا کردکھایا تھا۔

کئی طویل اور سنگین لمحوں تک ناکبھ بت بنا کھڑا رہا۔ اور اُس جگہ کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا جہاں سے وہ پیکر غائب ہوا تھا پھر پستول جیب میں رکھ کر انسپکٹر کی طرف مڑا۔ جو گھٹنوں کے بل کھڑا ہوچکا تھا۔

"پیچھا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ ناکبھ نے بھی گھٹنوں کے بل ہوکر کہا۔ یقیناً وہ چور دروازے سے چپکے سے داخل ہوگیا ہوگا اور نقاب اُتار کر لوگوں کے ساتھ مِل جُل گیا ہوگا۔

اب اس نے بہت احتیاط سے مقتول کو دیکھا۔ اُس کے گلے میں دستے تک چاقو اُتر گیا تھا۔ زبان نکل آئی تھی، دیدے پھٹے ہوئے تھے اور بے گناہ کے وہ پتھر کی طرح سرد اور سخت ہوچکا تھا۔

اپنا رومال دستے پر لپیٹتے ہوئے ناکبھ نے چاقو زخم سے باہر کھینچ لیا اور اُس کو تیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ چاقو عام قسم کا تھا مگر نیا ہی تھا اور بہت تیز تھا۔

انسپکٹر نے اوب کر سانس لی اور کہا ہم عین موقع پر موجود تھے پھر بھی ــــ" وہ کانپ کر چپ ہوگیا۔ "ہاں" ناکبھ نے لعنتی آواز میں کہا۔ "طرہ تو یہی ہے اب ہیں ــــ"

وہ یکایک چپ ہوگیا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ فانڈامحل کے ہر کمرے میں قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ شور و غل سے گھر والے جاگ اٹھے تھے اور سامنے کی برجی سے متجسس، متحرک، اور متحیر لوگ باہر آرہے تھے۔ ناکبھ انسپکٹر آباد ابھی کھڑے بھی نہ ہوئے تھے کہ آنے والوں میں سے چند آدمیوں نے اپنی ٹولی الگ کرلی اور اُن کی طرف بڑھے۔

(باقی)

سید طالب علی ایم۔اے الہ آبادی

اَنّا کرینینا

ٹالسٹائی کا مشہور شاہکار اُردو میں

مسلسل

(جملہ حقوق محفوظ)

(م۔ک۔م)

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے"؟

"وہ یہ نہیں کہتی کہ کٹی کو تم سے محبت ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ تمہاری بیوی ہوگی!"

یہ الفاظ سن کر لیوِن کا چہرہ خوشی کی مسکراہٹ سے جگمگا اُٹھا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسوؤں کی جھلک تھی۔

"کیا وہ ایسا کہتی ہے؟" اس نے کہا "میں ہمیشہ سے یہ کہتا چلا آیا ہوں کہ تمہاری رفیقۂ حیات بہت پیاری ہے۔ بہرحال ہمیں اب اس معاملہ میں زیادہ گفتگو کرنی نہیں چاہئے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اُچھا۔ اچھا۔ بیٹھ جاؤ"

مگر لیوِن نہیں بیٹھا۔ اس نے کمرے میں ایک طرف سے دوسری طرف جمے ہوئے قدموں کے ساتھ دو ایک مرتبہ چکر لگائے آنسوؤں کو روکنے کے لئے زور سے دو ایک مرتبہ آنکھوں کو میچا اور پھر میز کے قریب کرسی پر آکر بیٹھا۔ "تمہیں میری بات سمجھنی چاہئے" اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ محبت نہیں ہے۔ میں محبت کر چکا ہوں مگر وہ ایسی نہیں تھی جیسی کہ یہ ہے یہ صرف جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے یہ تو ایک ایسی اندرونی قوت ہے جو میرے اوپر حاوی ہے۔ میں نے ماسکو چھوڑ دیا تھا کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس مسرت کا حاصل کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے اگرچہ وہ اس عالم کے لئے ایک نعمت ہے۔ میں اپنے آپ سے لڑا مگر بیکار۔ اب میں اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ اس کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ اس کا ایک مرتبہ فیصلہ ہونا چاہئے۔ اور......"

"لیکن پھر تم چلے کیوں گئے تھے؟"

"اوہ۔ ٹھہرو۔ میں نے اس کا خیال کتنی مرتبہ کیا؟ سنو! تم خیال نہیں کرسکتے کہ تمہارے الفاظ نے میرے اندر کتنی جرأت پیدا کردی ہے۔ مجھے کیسی خوشی ہے کہ میں بالکل خود غرض ہوا جا رہا ہوں اور سب کچھ بھول رہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے...... میرا بھائی نکولی یہیں ہے...... مجھے آج صبح ہی بتایا گیا ہے ... مگر میں اس کے متعلق سب کچھ بھول چکا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ بھی خوش و خرّم ہوگا۔ لیکن یہ ایک دیوانگی کا دورہ سا ہے۔ پھر

بھی ایک بات میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ تم شادی شدہ ہو۔ اور غالباً اس جذبہ کو سمجھتے ہو۔ میرے لئے یہ تکلیف دہ ہے کہ ہم جیسے لوگ جو معمر ہوئے جا رہے ہوں اپنے گزشتہ گناہوں کے ساتھ......
انھیں جلد از جلد ایک معصوم دوشیزہ لڑکی کی قربت حاصل ہونا چاہیئے یہ ایک انقلابی کشمکش ہے......... میں اس (کیٹی) کے قابل نہیں ہوں۔"

"اپنے آپ کو ملامت کرنے کے لئے تم نے بہت سے گناہ تو نہ کیے ہوں گے۔"

"ہاں۔ مگر اس کے ساتھ ہی......" لیون نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "اس کے ساتھ ہی جب میں اپنی گزشتہ زندگی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے نفرت ہو جاتی ہے۔"

"لیکن ہم کر کیا سکتے ہیں۔ دُنیا کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا ہے" اسٹیفن آرکیڈی وچ نے کہا۔

تسکین کی صرف ایک صورت ہے۔ التجا! مجھے معاف کرو۔ یہ دیکھ کر نہیں کہ میں کس قابل ہوں۔ اپنے کرم پر نگاہ رکھ کر اور صرف اسی طرح وہ معاف بھی کر سکتی ہے۔

(۱۱)

لیون نے اپنا گلاس ختم کیا اور دو منٹ تک دونوں دوست خاموش رہے۔

"میں ایک بات تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں" اسٹیفن آرکیڈی وچ نے کہنا شروع کیا "کیا تم 'اونسکی' کو جانتے ہو؟"

"نہیں! تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ہمیں ایک بوتل اور چاہیئے" اسٹیفن آرکیڈی نے ملازم سے کہا جو ان کے لئے گلاس بھر رہا تھا۔ اور میز کے آس پاس گھومتا رہتا تھا خصوصاً اس وقت جبکہ اُس کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔

"کیونکہ 'اونسکی' تمہارا رقیب ہے!"

"لیکن یہ اونسکی ہے کون؟" لیون نے پوچھا اور اس کا چہرہ جس نے ابھی اپنے پُر شباب جوش سے اسٹیفن کو حیران کر دیا تھا ایک دم پژمردہ ہو گیا۔

"وہ کاؤنٹ کیرل آئیو نیو وچ اونسکی کا لڑکا ہے اور سینٹ پیٹرسبرگ کی سوسائٹی کے سب سے آگے بڑھنے والے نوجوانوں میں سے ایک ہے۔ میں اس سے 'ور' میں ملا تھا جبکہ میں ڈیوٹی پر تھا وہ وہاں فوجی امیدوار کی حیثیت سے آیا تھا۔ وہ بہت دولتمند ہے حسین ہے اور با اثر تعلقات رکھتا ہے۔ اڈی کیمپ ہے۔ دلکش انداز رکھتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ بہت خوش مزاج انسان ہے۔ وہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ میں نے اس کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسے ایک بہت ہوشیار تہذیب یافتہ جوان پایا۔ وہ آجکل میں اپنی شہرت کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیگا۔"

لیون نے اپنی بھوؤں کو سکیڑا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"تمہارے جاتے ہی وہ ماسکو آگیا تھا۔ اور کٹی کی محبت میں سرتاپا غرق ہو گیا۔ غالباً تم کٹی کی ماں سے تو واقف ہو......"

"معاف کرنا۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا" لیون نے ذرا درشتی سے جواب دیا۔ اُسی وقت اسے اپنے بھائی 'نکولی' کا خیال آیا اور اسے اس وقت تک بھولے رہنے پر خود کو ملامت کی۔

"ایک منٹ۔ صرف ایک منٹ" اسٹیفن نے اپنا ایک ہاتھ نہایت خلوص سے لیون کے بازو پر رکھ کر مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں نے تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے مگر ان تمام اُلجھے ہوئے معاملات سے جو نتیجہ میں نے نکالا ہے میں اُسے جانتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ تمام حالات تمہاری موافقت میں ہیں۔"

لیون نے کرسی سے تکیہ لگا لیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو چکا تھا "مگر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم معاملہ کو جس قدر جلد طے کر سکو کر لو" ابلانسکی اسٹیفن نے لیون کا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ بس اَب میں اور زیادہ نہیں پیوں گا" لیون نے گلاس کو ہاتھ سے سرکاتے ہوئے کہا "نہیں تو پھر میں بالکل مدہوش ہو جاؤنگا اَب تم اپنے حال چال بتاؤ" اس نے گفتگو کا رُخ بدلنا چاہا۔

"بس ایک بات اور۔ چاہے کچھ بھی ہو مگر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اس معاملہ کو بہت جلد طے کر لو۔ آج رات کو کوئی گفتگو نہ چھیڑنا" اسٹیفن نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "ہاں کل جاؤ۔ اور

تجویز کو باقاعدہ پیش کردو۔۔۔۔۔۔۔۔ اور میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"کیا اب بھی تم ہمارے یہاں شکار کے لئے نہیں آنا چاہتے بہار کے موسم میں آؤ۔" لیون نے کہا۔ اسے اس بات کا دلی رنج تھا کہ یہ گفتگو کیوں چھیڑی گئی۔ اور سب سے زیادہ اسے اسٹیفن کی نصیحت اور مفروضہ رقیب کے متعلق اس کے چبھتے ہوئے جملوں سے اسے بڑی تکلیف ہوئی۔

اسٹیفن ارکیڈی وچ مسکرایا۔ اس نے لیون کی دماغی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ "کسی نہ کسی وقت میں بالکل گر جاؤں گا۔ میرے عزیز دوست میری بات یاد رکھنا۔ عورت ایک ستون ہے جس کے گرد تمام دنیا چکر کاٹتی ہے۔ میرے اپنے معاملات بھی خراب ہیں بہت خراب۔ اور سب عورتوں کی وجہ سے ہیں۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔۔۔۔" اس نے ایک ہاتھ میں سگار لے کر دوسرے ہاتھ سے جام شراب اٹھاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "تم اپنی قیمتی رائے دو"

"کس بات کے متعلق؟"

"معاملہ کچھ ایسا ہے۔ فرض کرو تمہاری شادی ہو چکی ہے اور اسی زمانہ میں جبکہ تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو کوئی اور عورت تمہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

"مجھے معاف کرنا۔ میں اس معاملہ کو سمجھ نہیں سکتا۔ مجھے یہ بات ایسی معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ ہم یہاں سے بہترین کھانا کھا کر چلیں اور راستہ میں ایک نانبائی کی دوکان سے ایک روٹی چرا لیں۔"

اسٹیفن کی آنکھوں میں پہلے سے زیادہ چمک پیدا ہو گئی "کیوں نہیں؟ بعض اوقات روٹی کی خوشبو تمہیں اس قدر مست کر دیتی ہے کہ تم اپنی خواہش کو روک نہیں سکتے۔"

یہ کہتے ہوئے ابلانسکی مسکرا رہا تھا۔ لیون سے بھی مسکراہٹ ضبط نہ ہو سکی۔

"اچھا اسے چھوڑو۔ ایک عورت کا خیال کرو۔ ایک غریب پیاری مخلص عورت کا جس نے سب کچھ تمہارے اوپر نثار کر دیا ہو اور جب یہ سب کچھ ہو چکا ہو تو کیا اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ میرے خیال میں تو خاندان میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے اس سے رشتہ کو منقطع کرنا ضروری ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مرد کو اس پر رحم نہیں آئے گا۔ اور وہ جدائی کو کم تکلیف دہ بنانے کے لئے اس کے مستقبل کا کوئی انتظام نہیں کرے گا؟"

"معاف کرنا۔ تم جانتے ہو کہ میرے لئے عورتیں دو قسموں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔۔ واضح الفاظ میں یوں سمجھو۔ کچھ تو عورتیں ہیں اور کچھ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی دیکھوں گا۔ ایک ایسی گری ہوئی عورت جو خوبصورت ہو ایسی تمام عورتیں اس مصنوعی طور پر رنگین فرانسیسی لڑکی کی طرح ہوتی ہیں جس نے اپنے بالوں میں بناوٹی خم پیدا کئے ہوں اور دکان کی میز پر بیٹھی ہوئی ہو۔ اور ایسی تمام عورتوں سے میں نفرت کرتا ہوں۔"

"لیکن نئی انجیل کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"برائے مہربانی ذرا ٹھہرو۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے الفاظ کو اس طرح استعمال کیا جائیگا تو وہ غالباً نہیں فرماتے ہی نہیں۔ لوگ انھیں تمام انجیل میں سب سے زیادہ او[illegible] ہیں۔ بہرحال میں اس معاملہ میں جو کچھ خیال کرتا ہوں وہ نہیں [illegible] ہوں بلکہ وہ کہہ رہا ہوں جو محسوس کرتا ہوں۔ اس قسم کی عورتوں میں میرے لئے کوئی دلکشی نہیں ہوتی۔ اور ان کے متعلق میرے دل میں وہی احساس پیدا ہوتا ہے جو تمہارے دل میں مکڑیوں کے متعلق ہوتا ہے۔ اور تم نے غالباً مکڑیوں کی خصوصیات کا اتنا گہرا مطالعہ نہ کیا ہوگا جتنا کہ میں نے اس قسم کی عورتوں کی عادتوں کا کیا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس طرح تم ڈکنس کے اس کردار کے مطابق ہو جو تمام مشکل مسائل کو ہمیشہ بائیں طرف سے سیدھی جانب پھینک دینے کا عادی تھا۔ لیکن کسی واقعہ سے انکار کر دینے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اس کا جواب دیدیا گیا۔ آخر انسان کرے کیا۔ میں تو

یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اَب مجھے ہی دیکھ لو۔ میری بیوی بوڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ اور اَب میں اس سے اتنی محبّت نہیں کر سکتا جتنی کہ اس کی عزّت کر سکتا ہوں۔ اور میں ابھی جوان ہوں زندگی سے لبریز میری ملاقات کسی اور سے ہوتی ہے مگر اس کا مطلب صرف تباہی ہے صرف تباہی!" اسٹیفن نے انتشار میں دُہرایا۔

لیون کے لبوں پر طعن آمیز مسکراہٹ آئی۔

"لیکن میں کروں کیا؟" ابلانسکی نے پوچھا

"نئی روٹی مت چراؤ!"

اس پر اسٹیفن کو زور سے ہنسی آ گئی۔ "بڑے اخلاق کے معلّم! اب دو عورتیں سامنے ہیں۔ ایک اپنے حق پر زور دیتی ہے اور وہ تمہاری محبّت ہے اور وہ تمہاری محبّت ہے جسے تم نہیں دے سکتے ہو۔ دوسری عورت تمہیں سب کچھ دے دیتی ہے اور جواب میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ ایسی صورت میں تم کیا کرو گے۔ تمہارا عمل کیا ہوگا یہ کیسا المناک حادثہ ہے۔"

"اگر تم مجھ سے پوچھو تو اس میں المناکی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ افلاطون کے نظریّہ کے مطابق محبّت دو قسم کی ہوتی ہے اور دونوں محبّتیں انسان کے لئے کشش رکھتی ہیں۔ بعض لوگ صرف ایک قسم کی محبّت کر سکتے ہیں اور بعض لوگ صرف دوسری قسم کی۔ جو لوگ افلاطونی محبّت کو نہیں سمجھتے ہیں انھیں اس سلسلہ میں المناکی کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسی محبّت کسی المناکی سے بہت بلند و بالا ہوتی ہے اسی طرح افلاطونی محبّت کا انجام بھی کسی المناک واقعہ پر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بہت لطیف اور ملکوتی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ...."

یہاں لیون کو اپنی کوتاہیوں اور اس اندرونی کشمکش کا جس سے وہ گزر رہا تھا خیال آیا۔

"لیکن بہرحال تم بھی اپنی جگہ صحیح ہو سکتے ہو۔" اس نے ایکدم گفتگو کا رُخ بدلا "یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس معاملہ میں کچھ نہ جانتا ہوں اور بالکل لاعلم ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک ایسے انسان ہو جو اپنی زندگی کا ایک مقصد رکھتا ہے۔ یہ تمہاری ایک قیمتی خصوصیت ہے اور ساتھ ہی یہی تمہارا قصور بھی ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ زندگی کے تمام واقعات اسی ایک مقصد سے متعلق ہو جائیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کرتا۔ تم ریاست کی ملازمت کو چھوڑ دیتے ہو کیونکہ وہ تمہیں بیکار اور بے مقصد معلوم ہوتی ہے۔ تم چاہتے ہو کہ ہر شخص کسی ایک مقصد کے ماتحت کسی ایک لائحۂ عمل کے مطابق کام کرے۔ تم یہ یقین رکھتے ہو کہ خاندانی زندگی اور محبّت علیحدہ علیحدہ قائم نہیں رہ سکتے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ زندگی کا جمال اسی وقت تک ہے جب تک نور اور ظلمت میں نمایاں امتیاز قائم رکھا جائے۔"

لیون نے ایک آہ کھینچی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ابلانسکی کی باتیں سُننے کے بجائے اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔ جلد ہی دونوں یہ سمجھ گئے کہ اس ڈنر نے جو انھیں ایک دوسرے سے اور قریب کرنے کے لئے تھا باوجود ان کی گہری دوستی کے دونوں کے درمیان اختلافات کی خلیج اور وسیع کر دی۔ ابلانسکی کو اس قسم کے واقعات سے اکثر دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے وہ جانتا تھا کہ ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیئے۔

"میرا حساب کیا ہوا" اس نے ہوٹل کے ملازم سے کہا اور دوسرے کمرے میں جا کر اپنے ایک ملاقاتی سے ایک ایکٹرس اور اُس کے چاہنے والوں کے متعلق گفتگو کرنے لگا۔ لیون سے گفتگو کرنے کے بعد جس سے اس کے دماغ پر کافی اثر پڑا تھا یہ ایک دلچسپ تبدیلی ثابت ہوئی۔

اتنے میں ملازم حساب کا کاغذ لے آیا۔ ڈنر کی قیمت اٹھائیس روبل اور کچھ ہوئی تھی۔ لیون کو ایک ڈنر میں اس قدر رقم کا صرف ہونا ناگوار تو ہوا مگر اس نے اپنے حصّے کے چودہ روبل چپکے سے ادا کر دئے۔ اور اُسی وقت گھر کو روانہ ہو گیا۔ کیونکہ اسے شرنسکی خاندان میں جانا تھا۔ جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

(باقی آئندہ)

۴۷

مترجمہ:۔ محترمہ سیدہ خاتون یحییٰ

دو شہروں کی کہانی

چارلس ڈکنس کا ایک شاہکار اردو میں

نومبر ۱۷۷۵ء کی ایک بھیگی ہوئی شام کا ذکر ہے۔ ایک سن رسیدہ شخص مسٹر لوری جو لندن کے ٹیلسن بنک سے بھی تعلق رکھتے تھے ڈاک گاڑی میں ڈوور کی طرف سفر کر رہے تھے۔ اُن کا ایک عجیب و غریب مقصد تھا۔ کسی گم شدہ شخص کو قبر سے باہر نکالنے کے لئے سفر کی تکلیف اٹھا رہے تھے۔ جیسے جیسے گاڑی چلتی گئی مسٹر لوری کے سامنے اس شخص کا چہرہ زیادہ نمایاں طور پر آتا گیا۔ ایک ایسے شخص کا چہرہ جس کی عمر پینتالیس کی تھی۔ حالت خراب و خستہ تھی اور سر کے بال قبل از وقت سفید ہو چکے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مسٹر لوری کو وہ چہرہ ہزاروں بار ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ سینکڑوں مرتبہ اس اونگھتے ہوئے مسافر نے اس "خیالی پیکر" سے سوال کیا۔

"دفن ہوئے کتنا عرصہ گزرا؟"

جواب ہمیشہ ایک ہی ملا۔ "تقریباً اٹھارہ سال!"

"کیا تم نے قبر سے دوبارہ باہر نکالے جانے کی تمام امیدیں منقطع کر دی ہیں؟"

"مدت ہوئی!"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم دوبارہ زندگی کی طرف بلائے جا رہے ہو؟"

"لوگ ایسا کہتے ہیں!"

"مجھے اُمید ہے کہ تمہیں زندہ رہنے کی آرزو ہے"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا"

گاڑی تمام رات چل کر دوپہر سے پہلے ڈوور پہنچ گئی۔ مسٹر جاروس لوری نے ناشتہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی ہم سفر ساتھی سے ملے جو مدفون شخص یعنی اپنے باپ کو دوبارہ زندگی کی طرف بلانے کے لئے فرانس جانے والی تھی

'لوسی مینٹ' فرانسیسی بھی تھی انگریز بھی۔ عمر سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ میانہ قد۔ نازک اور حسین پیکر۔ سنہرے گھنے بال نیلگوں آنکھیں جو مسٹر لوری کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی پیشانی میں عجیب و غریب صلاحیت تھی۔ کبھی اوپر کو اُٹھ جاتی کبھی ایسے بل پڑ جاتے جن سے اندرونی جذبات کا اظہار ہونے لگتا۔ ان جذبات کا جن میں اضطراب۔ حیرت۔ خوف اور گرمی توجہ چاروں کیفیتیں شامل تھیں۔ اگر وہ صرف انھیں پر مشتمل نہیں تھے۔

لوسی کی پرورش انگلستان میں اس یقین کے ماتحت کی گئی تھی کہ اس کے ماں باپ دونوں اس جہان سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مسٹر لوری کو چند حیرت انگیز خبریں لوسی پر ظاہر کرنا تھیں یعنی یہ کہ اٹھارہ سال ہوئے فرانس کے دو نوجوان بدمعاش امیر دل

نے ڈاکٹر مینٹ کو دو مریضوں کے علاج کے لئے خفیہ طور پر بُلایا
تھا۔ ان مریضوں میں ایک کسان لڑکی تھی جسے وہ بھگا لائے تھے
اور جس کے ساتھ انھوں نے ایسا بُرا سلوک کیا کہ آخر کار وہ مرگئی
دوسرا اس کا بھائی تھا جو بہن کو بچانے میں گولی کا نشانہ بنا تھا۔

دونوں بیمار مرچکے تھے۔ اس بدترین فعل کو چھپانے
کے لئے ڈاکٹر کے سامنے سونا پیش کیا گیا۔ مگر بہادر ڈاکٹر نے
اسے ٹھکرا دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس کے دولتمند اور امرا بے انتہا
طاقت کے مالک تھے۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر مینٹ کو گرفتار کرلیا گیا
اور قیدخانہ میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر کی بیوی کو جو اس واقعہ سے دو
سال بعد مرگئی۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا شوہر کیوں اور کس قیدخانہ
میں بھیجا گیا۔

مسٹر لوری نے یہ تمام قصہ لوسی سے بیان کیا۔ سُنتے وقت
وہ کانپ رہی تھی اور بالکل بے جان معلوم ہوتی تھی۔ اس کی
پیشانی جو مسٹر لوری کے لئے خصوصاً جاذب نگاہ تھی خوف اور درد کے
زیادہ گہرے مظاہرہ میں تبدیل ہوگئی تھی۔

"لیکن اس کا پتہ معلوم ہوگیا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اغلب ہے
کہ اس میں بہت تبدیلی ہوگئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صرف ایک
پیکر شکستہ ہو کر رہ گیا ہو۔ تاہم ہمیں نیک گمان کرنا چاہئے وہ ابھی
تک زندہ ہے۔ تمہارے باپ کو پیرس میں ایک پُرانے ملازم کے
مکان میں رکھا گیا ہے۔ اور ہم وہیں جارہے ہیں۔ میں اس لئے جارہا
ہوں کہ اگر ممکن ہو تو اُس کی شناخت کروں۔ اور تم اس کی زندگی
بحال کرنے، محبّت، فرض ادا کرنے اور اسے آرام و راحت پُہنچانے
کی غرض سے جارہی ہو"

لوسی کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور اس کے بعد مسٹر لوری
سے۔ اِس نے مدھم، صاف اور سہمی ہوئی آواز میں اس طرح کہا گویا
وہ خواب میں بول رہی ہو:۔

"میں اس کی روح کو دیکھنے جارہی ہوں۔ یہ اس کی روح
ہوگی۔ وہ نہ ہوگا"

"ایک بات اور کہنی ہے" مسٹر لوری نے کہا "اس کو اب
ایک دوسرے نام کے ماتحت پکارا جاتا ہے۔ اس کا اصل نام عرصہ
ہوا بُھلا دیا گیا یا مدّت سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اس کی تفتیش
کرنا بالکل بیکار ہوگا کہ آیا اس کو نظرانداز کردیا گیا ہے یا ہمیشہ
جان بوجھ کر قید میں رکھا گیا ہے۔ یہ نہ صرف بیکار ہے بلکہ خطرناک
بھی ہے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس موضوع کا ذکر کسی جگہ اور کسی طریقہ پر
بھی نہ کیا جائے اور اس کو فرانس سے باہر لایا جائے۔ میں باوجودیکہ
ایک انگریز ہونے کی حیثیت سے بالکل محفوظ ہوں تاہم اس معاملہ کا
ذکر کرنے سے اجتناب کرتا ہوں۔ یہ بالکل ایک خفیہ چیز ہے۔ اور
میری تمام استاد کا لب لباب صرف ایک نظر میں ہے۔"

(St. Antoine) میں شراب کی دُکان

اس عہد میں فرانسیسی عوام کی جو حالت تھی اس کی صحیح تصویر
پیش کرنا بہت دشوار ہے۔ ملک کے طول و عرض میں یہ بیچارے
محنت کرتے تھے اور بھوک کے مرتے تھے۔ انھیں زد و کوب کیا جاتا
تھا اور طرح طرح کے مظالم ان پر توڑے جاتے تھے اور یہ سب کچھ اس
لئے تھا کہ امیر لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرسکیں۔ کسانوں کے
کاندھوں پر موقعہ اور بےموقعہ محصولات کا بار رکھا جاتا تھا۔
ان کی زندگیاں خوفناک افلاس، بھوک، اور سینکڑوں بلاؤں
میں مبتلا کی جاتی تھیں تاکہ شاہی دربار پانی کی طرح روپیہ
بہا سکے۔

سینٹ انٹائنی کے محلّہ میں افلاس، عریاں چلتا پھرتا نظر آتا
تھا۔ ہر قدم پر بھوک کے دُبلے پتلے مجسّمے متحرک تھے۔ ناتوانی کا
یہ عالم تھا کہ گویا چھڑیوں یا لکڑیوں کو پھٹے پُرانے کپڑے پہنا دئے
گئے ہیں۔ ان بھوکے لوگوں کو فلک بوس عمارتوں سے دھکے
دیکر نکال دیا جاتا تھا۔ ان کے جسموں پر گھاس، پھونس، کاغذ،
لکڑی اور چیتھڑوں کے پیوند کے ساتھ بھوک پیوست کی تھی
"بھوک" بغیر دھوئیں کی چمنیوں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھانکتی
تھی۔ "بھوک" گندے اور بدبودار گلی کوچوں سے نکل کر جہاں کے

کوڑے کرکٹ میں کھانے کا بچا کھچا تک مفقود تھا اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی تھی۔ نان بائی کی الماریوں پر موٹے حرفوں میں "بھوک" کندہ تھا۔ خراب روٹیوں کے تھوڑے سے ذخیرہ کی ہر چھوٹی سی روٹی پر، ترکاری کی ہر دُوکان پر، اور فروخت ہونے والے ہر کھانے پر "بھوک" لکھا ہوا تھا۔

غرض ان تمام چیزوں سے بھوک نمایاں تھی جو مفلس لوگوں سے تعلق رکھتی تھی۔

ایک تنگ گلی، بدبو اور تعفن سے رچی ہوئی جس میں اور دوسرے اسی طرح کے تنگ اور پیچیدہ کوچے آ کر مل گئے تھے وہاں پھٹے پُرانے چیتھڑے پہنے ہوئے لوگوں کا مجمع تھا۔ یہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا وہ کسی شکاری کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ اور جس طرح ایک جنگلی جانور شکاری کے تعاقب سے تنگ آ کر حملہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جان پر کھیلنے کیلئے آمادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ناتواں اور کمزور ہونے کے باوجود ان کی آنکھوں میں انتقام کی آگ کے شعلوں کی کمی نہ تھی۔

سڑکوں کے آرپار کافی فاصلہ پر ایک بھدا سا لیمپ ایک رسّی اور چرخی سے باندھ کر لٹکایا گیا تھا۔ رات کے وقت جب لیمپ جلانے والا ان کو نیچے جھکاتا، لیمپ جلاتا اور پھر اوپر اُٹھا دیتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ دھیمی بتیوں کا ایک دھندلا سا کنج سروں پر مریضانہ انداز میں لٹکا ہوا ہے۔

وہ وقت بھی مستقبل کے بطن میں پوشیدہ تھا جب لیمپ جلانے والے کے طریقۂ کار کو ترقی دیکر اس علاقہ کے پتلے پتلے شماروں کو ایک نئے تخیل کے احساس کے ساتھ انسانوں کو اوپر کھینچنے کے لئے دار ورسن میں تبدیل کیا جانے والا تھا۔

سڑک کے ایک کونے پر ایک شراب کی دُوکان تھی۔ جو اس حصہ کی اور دُوکانوں سے بہتر حالت میں تھی۔ دُوکان کا مالک دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اس شخص کی گردن بجار کی طرح فربہ، عمر تیس سال سیاہ گھونگر والے بال، شگفتہ تاہم ناقابلِ فہم چہرہ۔ بظاہر ایک ایسا شخص تھا جس کا ایک متعین مقصد ہو اور جس کی انجام دہی سے کوئی اسے باز نہ رکھ سکے۔

جیسے ہی کہ وہ اندر آیا اسکی بیوی (Madam Defalge) (دوکاندار کی میز) (Counter) کے پیچھے ایک کونہ میں بیٹھ گئی۔ میڈم ڈیفالج ایک طاقتور عورت تھی جس کی عمر اس کے شوہر کے لگ بھگ تھی۔ اس کی آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ شاذ ونادر ہی اِدھر اُدھر اُٹھتی ہیں۔ لیکن نظریں نگران تھیں۔ لمبے ہاتھ جن میں بہت بھاری بھاری چھلے پڑے ہوئے تھے۔ متحمل چہرہ۔ سخت خدوخال لیکن اطوار وعادات میں سکون وطمانیت۔ میڈم ڈیفارجے کے بُشرے سے ایسی سیرت کا اظہار ہوتا تھا جس نے شاذ ونادر ہی اِن معاملات میں غلطی کا ارتکاب کیا ہو جو اس کی نگرانی میں دیئے گئے ہوں۔

اس کا مُبنائی کا سامان اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن چمٹے سے اپنے دانت اٹھانے کے لئے اس نے سامان نیچے رکھدیا۔ وہ اپنی داہنی کہنی کو بائیں ہاتھ سے سہارا دئے ہوئے اس طرح مصروف تھی جب اس کا شوہر اندر آیا تو میڈم ڈیفارجے نے بجز کھانسنے کے کچھ نہیں کہا۔

کھانسی کے ساتھ اس نے اپنی بھویں اوپر کو اُٹھائیں گویا کہ وہ شوہر کو اشارہ کر رہی تھی کہ وہ اپنے گاہکوں میں نو وارد گاہک کو دیکھ لے۔

شراب والے نے دوکان میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں یہاں تک کہ اس نے ایک عمر رسیدہ جنٹلمین اور ایک نوجوان خاتون کو ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا پایا جیسے ہی کہ وہ (دوکاندار کی میز) کے پیچھے سے گزرا، اس نے نہایت غور کے ساتھ اِس بزرگ جنٹلمین کو اس خاتون سے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "ہمیں اسی شخص سے ملنا تھا"

مسٹر ڈیفارجے نے اپنے دل میں کہا "خبیث تم اِس مقام پر کیا کرنے آئے ہو میں تم سے واقف نہیں۔"

لیکن اس نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اِن اجنبیوں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ تین آدمیوں سے گفتگو میں مشغول ہو گیا

جو (Counter) پر کھڑے ہوئے شراب پی رہے تھے۔ ہر ایک ایک دوسرے کو (Jacques) کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ یہ ایک مختصر سا لفظ تھا جس کی اہمیت صرف وہی لوگ جانتے تھے جو اس راز سے واقف تھے (St. Antoine) کے علاقہ میں رہنے والے مفلس اور بے چین لوگوں کا یہ پاسپورٹ تھا جو اپنے اچھے دن لانے کے لئے سازش کر رہے تھے۔

اس دوران میں تمام گاہک چلے گئے۔ اور وہ عمر رسیدہ جنٹلمین اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اور مسٹر ڈیفارجے سے گفتگو کی پھر مسٹر ڈیفارجے وہ جنٹلمین اور نوجوان خاتون باہر چلے گئے۔ میڈم ڈیفارجے نے مستقل مزاجی سے اپنی بُنائی جاری رکھی۔

ڈیفارجے مسٹر لوری اور مس مینٹ کو ایک بدبودار صحن میں سے لیکر گزرا۔ پھر وہ ایک تاریک دروازہ میں پہنچا۔ اور وہاں سے گزر کر پلید اور شکستہ زینہ کی طرف لیگیا۔ جب وہ لوسی کو متعفن سیڑھیوں پر لیجا رہا تھا تو راستہ میں اس نے آہستہ سے کہا "اس میں حیرت انگیز تبدیلی ہوگئی ہے۔ وہ بہت بدل گیا ہے"

جوں جوں لوری اور اس کے ساتھی زینہ پر چڑھتے جاتے تھے مسٹر لوری اپنے دل و دماغ پہ ایک قسم کا وزن محسوس کر رہا تھا۔ شراب کی دوکان کا مالک آگے چل کر رُک گیا۔ دیوار میں زور سے گالی کے ساتھ دستک دی۔ وہ سیدھے بالاخانہ پر پہنچ گئے ڈیفارجے نے دروازہ کھولا اور مسٹر لوری کو حیرت زدہ دیکھتے ہوئے اس نے کہا :

اتنے عرصہ دراز تک وہ یہاں رہا ہے کہ وہ خوفزدہ ہو جائیگا اگر دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے تو بہت سے امکانات ہیں ۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے یا مر جائے یا خدا معلوم اس کو کیا کیا نقصان پہنچے۔

دروازہ اندر کی جانب کھولا گیا۔ اس نے کمرہ میں جھانک کر دیکھا اور کوئی بات کہی۔ ایک کمزور و نحیف آواز نے جواب دیا۔

بالاخانہ تنگ و تاریک تھا۔ جس میں بغیر پالش کی کھڑکی لگی ہوئی تھی۔ ایک نیچی بنچ پر ایک سفید بالوں والا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا اس کی پشت دروازہ کی جانب تھی۔ اور آگے جھکا ہوا وہ جوتے بنانے میں مشغول تھا۔

زندگی کی طرف دوبارہ دعوت

(Recalled to life)

جوتے بنانے والے کی ڈاڑھی سفید تھی۔ جو مخصوص طریقے سے ترشی ہوئی تھی۔ چہرہ میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور آنکھیں بہت روشن تھی۔ اس کی قمیص کے زرد چیتھڑے گریبان کے قریب سے پھٹے ہوئے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا جسم کس قدر بوسیدہ اور درماندہ ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ہڈیاں تک صاف نظر آتی تھیں۔ آواز کمزور اور مدھم۔ اور نگاہ بے مقصد معلوم ہوتی تھی۔

"تمہارا پیشہ جوتے بنانا نہیں ہے؟" مسٹر لوری نے کہا۔

اس کی بھونچکی نگاہیں کمرے میں چاروں طرف پڑیں اور آخرکار اس نے جواب دیا۔

"کیا میرا پیشہ جوتے بنانا نہیں ہے ؟ ...... نہیں ! میرا پیشہ جوتے بنانا نہیں تھا"

(Bastille) کے قیدخانہ میں ۱۸ سال کی طویل مدت کی قید تنہائی سے اس کے اعصاب اس درجہ شکستہ ہو چکے تھے کہ باوجود مسٹر لوری اور اس کی لڑکی (قیدی کی لڑکی) کی انتہائی مہربانی اور شرافت کے ان کو یہ سمجھانے میں کافی دیر لگی کہ وہ کون تھے اور کیوں اس کے پاس آئے تھے۔

"میں نے حرفہ کو خود حاصل کیا اور بہت عرصہ کے بعد بہ مشکل تمام اس کو سیکھا۔ اور جب سے اَب تک میں جوتے ہی بنا تا رہا ہوں"

بعض وقت چند لمحوں کے لئے اس کی توجہ اِدھر اُدھر بَٹ جاتی تھی۔ اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اَب بھی قیدخانہ میں ہے

اس کا علاج بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ اسے پیرس سے باہر ——

اُس پیرس سے باہر جس کے ساتھ ہولناک متعلقات دابستہ تھے فوراً

لیجایا جائے۔ اور آرام دہ اور نئے ماحول میں بتدریج اس کا علاج کرایا جائے۔

لوسی اس سفید ریش شخص پر ترس کھا کر کچھ از خود رفتہ سی ہوگئی مسٹر لوری جلدی جلدی واپسی کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے اور وہ اس بوڑھے کے پاس ٹھیری رہی۔

اس کا باپ بڑے انتشار میں مبتلا تھا لیکن وہ کھاتا تھا اور پیتا تھا ایک ایسے آدمی کی طرح جو کافی عرصہ تک اطاعت گزاری کا عادی ہو چکا ہو اور ہر اُس بات پر عمل کرتا تھا جو اُس سے کہی جاتی تھی۔

بالآخر جب روانگی کا وقت آیا تو وہ جوتے بنانے کے اوزار اور نامکمل جوتوں کو ساتھ لئے بغیر جانے پر راضی نہ ہوا میڈم ڈیفارجے جس کا بُنائی کا کام ہنوز جاری تھا ان چیزوں کو لانیکی غرض سے زینہ پر گئی۔ وہ جلدی سے ان کو واپس لے آئی اور اس کے سپرد کر دیا اور اس کے بعد فوراً ہی دروازہ سے لگ کر کھڑی ہوگئی.... وہ بن رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی چیز کو نہیں دیکھ رہی۔

ڈیفارجے کوچ بکس پر بیٹھ گیا اور یہ الفاظ کہے "سرحد کی طرف"

کوچوان نے اپنا ہنٹر چٹخایا اور وہ لیمپوں کی مدھم روشنی میں تیزی سے نکل گئے۔

تمام رات کے طویل سفر میں مسٹر جارویس لوری کے کانوں میں وہی قدیم سوال گونجتا رہا۔

"مجھے اُمید ہے کہ تم دوبارہ زندہ ہونیکی آرزو رکھتے ہو؟"

اور وہی پُرانا جواب ۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

پانچ سال بعد

عدالت کے تاریک راستوں میں ایک ۲۵ سال کے نوجوان کے آس پاس سے مبارکباد کی صدائیں اُٹھ رہی تھیں۔ ایک فرانسیسی شخص چارلس ڈارنے نے اب انگلستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس پر فرانس اور انگلستان کے مابین جاسوسی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور وہ فاتحانہ طریقہ پر بری کر دیا گیا تھا۔

اس کے اطراف و جوانب میں ڈاکٹر مینٹ، اسکی بیٹی لوسی مینٹ مسٹر لوری، مشیر قانون اور وکیل صفائی مسٹر اسٹرائور سزائے موت سے بچنے پر اسے مبارکباد دے رہے تھے۔

جس روشنی میں یہ لوگ کھڑے ہوئے تھے اس سے بھی کہیں زیادہ روشنی اگر ہوتی تب بھی یہ پہچاننا مشکل ہوتا کہ ڈاکٹر مینٹ جس کے چہرہ سے ذہانت ٹپک رہی تھی اور جس کی وضع قطع سے بلندی کا اظہار ہوتا تھا یہی شخص ہے جو پیرس کے بدبودار گوشہ میں ایک موچی کا کام کرتا تھا۔

یہ تو ممکن نہ تھا کہ ڈاکٹر مینٹ اپنی طویل اسیری کے جملہ آثار کو فراموش کر دیتا۔ تاہم پُرسکون اور خاموش انگریزی زندگی اور اس کی لڑکی کی پُرخلوص اور گہری نگہداشت نے اس کو ایک نیا آدمی بنا دیا تھا۔

لوسی ایک ایسا سُنہرا رشتہ تھی جس نے اُسے اس ماضی سے منسلک کر دیا تھا جو اس کے مصائب سے پہلے گزر چکا تھا۔ نیز ایسے حال سے متحد کر دیا جو اس کے آلام کے بعد اسے نصیب ہوا۔

پانچ سال قبل جب وہ فرانس سے انگلستان کی طرف سفر کر رہے تھے، لوسی اور اس کے باپ کی ملاقات چارلس ڈارنے سے ہوئی۔ یہ نوجوان شخص، عیار، سُرخ فام مسٹر اسٹرائور کا شکریہ ادا کرنے میں مشغول تھا جس نے اس کے مقدمہ کو بڑی خوبی سے انجام دیا تھا۔ اس کے بعد چارلس ڈارنے اور یہ دونوں باپ بیٹی ایک گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ مسٹر اسٹرائر لباس تبدیل کرنے والے کمرہ میں چلا گیا۔ وہاں اس کا ایک ہم پیشہ وکیل سڈنی کارٹن موجود تھا۔ سڈنی کارٹن چارلس ڈارنے کی طرح ایک اور نوجوان شخص تھا۔ حقیقتاً اِن دونوں میں اگرچہ کوئی رشتہ داری نہ تھی، تاہم ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ تھے کہ اگر ان کے لباس اور اخلاق و عادات میں اختلاف نہ ہوتا تو اِن میں امتیاز کرنا دشوار تھا۔

ڈارنے صاف اور سادہ لباس میں ملبوس تھا

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء

اوراس کے لمبے بال گردن پر بندھے رہتے تھے لیکن سڈنے کارٹن ہمیشہ میلا کچیلا رہتا تھا۔ اوراس کے بال بے ترتیبی کے ساتھ چہرے پر بکھرے رہتے تھے۔

نوجوان اور کسی زمانہ میں ترقی پذیر کارٹن کی زندگی کی کہانی ایک المناک داستان تھی۔ وہ ایک کاہل ترین آدمی تھا اور وہ شراب جو اس کے گلے سے اُتر چکی تھی اگر اس کو ایک جگہ جمع کیا جاسکتا تو شاہی جہاز کو تیرانے کیلئے کافی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر تھا کہ "یہ بیکار آدمی ہے" کیونکہ جب سب لوگ کام کرتے تو سڈنے کارٹن سویا کرتا تھا۔ اور جب سب لوگ سو جاتے تو وہ شراب نوشی کیا کرتا تھا۔

سڈنے کارٹن اسٹرائور کا بڑا گہرا دوست تھا۔ اس لئے مؤخر الذکر کا یہ انکشاف تھا کہ کسی مشکل مقدمہ کی تیاری کرنے میں اگر کوئی کاہل شخص چاہے تو اس کی کوئی برابری نہیں کرسکتا یہی وجہ تھی کہ اسٹرائور اس کو شراب میں اچھی طرح مشغول رکھ کر اپنے مشکل کاموں میں اس کی مدد لینے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس ذریعہ سے کارٹن ——— تھوڑا بہت سامانِ زندگی حاصل کرتا تھا۔ تاہم اس کے جبلی محاسن اس کی بُرائیوں کے نیچے سد . کے سب دب نہیں گئے تھے۔ نہایت خاموشی اور مایوسی کے ساتھ وہ ———

لوسی مینٹ سے محبت کرتا تھا وہ ایک ایسے درخشاں خواب کی مانند تھی جو اسے اس کے اسفل سے اُبھار کر بعض اوقات اعلیٰ تصورات کی طرف لے آتا تھا۔

ڈاکٹر مینٹ کی سادہ رہائش گاہ ایک پُرسکون سڑک کے ایک گوشہ میں واقع تھی جو   سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہ تھی۔ یہاں وہ اور اس کی لڑکی مس پروس کی سخت محافظت میں رہتے تھے۔ جو قدیم اناّ نرس تھی۔ یہاں مسٹر لوری ہر اتوار کو تیسرے پہر کے وقت آیا کرتے۔ اور چارلس ڈارنے بھی اکثر آتا تھا۔ یہانتک کہ سڈنی کارٹن بھی جب وہ ہوش و حواس میں ہوتا وقتاً فوقتاً ادھر آنکلتا تھا۔

مقدمہ کے چار ماہ بعد گرمی کی ایک شام کو کارٹن وہیں تھا۔ یکایک طوفان آنے کی وجہ سے وہ سب باغیچہ سے اندر کمروں میں چلے گئے۔ گلی کوچوں میں بڑی چلت پھرت ہو رہی تھی۔ لوگ طوفان کی تندی سے بچنے کے لئے تیزی کے ساتھ پناہ تلاش کر رہے تھے۔ بازگشت کی صداؤں کے لئے یہ ایک عجیب و غریب گوشہ تھا۔ آنے جانے والے قدموں کی صدائے بازگشت یہاں گونجتی تھی لیکن وہاں آنے جانے والا کوئی بھی نہ تھا۔

"میں اکثر اوقات شام کے وقت یہاں تنہا بیٹھتی ہوں" لوسی نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اور بازگشت کی صداؤں کو سنتی ہوں میں یہ خیال کرتی ہوں کہ پاؤں کی یہ تمام آہٹیں رفتہ رفتہ ہماری زندگی میں داخل ہو گئی ہیں"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مس مینٹ! ایک نہ ایک دن کوئی عظیم گروہ ہماری زندگی میں داخل ہونے والا ہے۔ ایک عظیم انسانی جماعت ہمارے اوپر نازل ہونے والی ہے اور مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ میں اس مجمع کو بجلی کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں"

اعلیٰ حضرت مارکوئس ان بڑے نوابوں میں سے تھا جو دربار میں زبردست اقتدار کے مالک تھے۔ وہ خود پیرس کے عظیم الشان ہوٹل میں اپنا پندرہ روزہ دربار منعقد کرتا تھا۔

مارکوئس اپنے اندرونی کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کمرہ اس کے ان پجاریوں کے لئے جو باہر کے کمروں میں بیٹھے تھے حرم مقدس کی حیثیت رکھتا تھا۔

بہت جلد دربار ختم ہوگیا۔ اور تمام اجتماع میں سے صرف ایک شخص وہاں رہ گیا تھا وہ آہستہ آہستہ باہر آیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ زینہ سے نیچے اُترا۔

اعلیٰ حضرت مارکوئس ساٹھ سالہ آدمی تھا۔ خوش پوشاک، تُند مزاج۔ اور ایک نفیس نقاب کا سا چہرہ لئے ہوئے۔

وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا وہ اس بات کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس کے گھوڑوں کے سامنے سے لوگ ہٹ جائیں اسکے بعد گاڑی کو آگے بڑھائے۔ اور بسا اوقات لوگ بال بال اسکی گاڑی کے نیچے آنے سے بال بال ہی بچ جاتے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے اس طرح گاڑی چلائی گویا کہ وہ کسی دشمن پر حملہ کر رہے تھے۔ اور جو لوگ

سڑکوں پر چل پھر رہے تھے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ پہیوں
کی تیز گڑگڑاہٹ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کیساتھ مارکوئس
کی گاڑی گلیوں سے ہو کر گزری۔ جس بیرحمانہ لاپروائی کے ساتھ
گاڑی چلائی جا رہی تھی اس کا موجودہ زمانہ میں اندازہ نہیں کیا
جا سکتا۔ موڑوں پر اس کی تیز رفتاری قائم تھی۔ عورتیں اس کے سامنے
چیختیں، مرد ایک دوسرے کو پکڑتے اور بچوں کو اس کے راستے سے
ہٹانے کے لئے گھسیٹتے تھے۔ آخرکار ایک فوارے کے نزدیک گلی کے
ایک موڑ پر تیزی سے گھومتے ہوئے اس کا ایک پہیہ کسی چھوٹی سی
مریض چیز سے اٹک کر رُکا۔ مجمع کی طرف سے چیخوں کی آوازیں بلند
ہوئیں گھوڑے الف ہو کر رک گئے۔

مارکوئس نے اطمینان سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "کیا خرابی ہو گئی؟"
دراز قد آدمی نے جو نائٹ کیپ پہنے ہوئے تھا گھوڑوں کے
پاؤں میں سے ایک بنڈل کو اُٹھایا۔ اور فوارہ کے دامن میں کھرنجہ
پر رکھ دیا۔ پھر وہ کیچڑ اور نمی میں اس بنڈل پر جھکا اور خونخوار حیوان
کی طرح بڑبڑانے لگا۔

"اعلیٰ حضرت مارکوئس! معاف کیجئے۔ یہ ایک بچہ ہے" ایک
پھٹے حال شخص نے کہا۔

دراز قد آدمی یکایک زمین سے اُٹھا اور دوڑتا ہوا گاڑی
تک آیا "مار ڈالا" اس آدمی نے والہانہ انداز میں اپنے دونوں
ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے کہا "مر گیا"

"تم میں سے کوئی نہ کوئی ہمیشہ راستہ میں ہوتا ہے۔ مجھے
کیا معلوم کہ تم نے میرے گھوڑوں کو کیا نقصان پہنچایا ہے۔ لو یہ
اس شخص کو دیدو" مارکوئس نے سکون کے ساتھ کہا۔

اس نے ایک سونے کا سکہ باہر پھینکا۔ ایک گہرے رنگ
کے پُراسرار شخص نے اٹھا لیا۔ یہ شخص ڈیفارجے مے فروش تھا
سکہ کو اُٹھا کر بڑی جرأت کیساتھ گاڑی کے اندر پھینک مارا۔

"کتے کہیں کے" مارکوئس نے کہا اور اپنی گاڑی چلا دی
اور دیہاتی رقبہ کے اندرونی حصہ میں میلوں تک لئے چلا گیا۔ اس
کو یہ معلوم نہ تھا کہ گاڑی کے پیچھے تمام راستے ایک ایسا شخص جس کی
آنکھیں وحشت ناک تھیں زنجیر کا سہارا لئے ہوئے لٹکا ہوا چلا جا رہا
تھا ــــ کس کام کے لئے؟ ......انتقام کی خاطر۔

جب مارکوئس گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔

اعلیٰ حضرت مارکوئس کا شاطو (باغ) ایک بہت بڑی عمارت
تھی جس کے سامنے ایک لمبا پتھریلا صحن تھا اور بڑے دروازہ کے
بالمقابل دو سنگین زینے تھے جو ایک پتھریلے چبوترے پر آ کر ملتے تھے
یہ تمام عمارت پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ بھاری سنگین جنگلے سنگین بڑے
بڑے گلدان جن میں ترشے ہوئے پتھر کے پھول، آدمیوں کے سنگین
چہرے اور شیروں کے سنگین سر ہر سمت دکھائی دیتے تھے۔
شاطو کا عظیم الشان دروازہ اس کے مالک کی
آمد پر کھلا۔

"مسٹر چارلس، جن کا میں انتظار کر رہا تھا انگلستان سے آ گئے؟"

"حضور! ابھی تک نہیں"

نووارد کچھ دیر بعد آیا۔ یہ مارکوئس کا بھتیجا تھا اور انگلستان
میں چارلس ڈارنے کے نام سے مشہور تھا۔
مارکوئس نے اس کا درباری انداز سے استقبال کیا۔ لیکن انھوں نے
مصافحہ نہیں کیا۔ یہ دونوں اتنے مختلف تھے کہ کبھی ایک دوسرے
سے متفق نہیں ہوئے۔

چچا ــــ ظالم اور سخت مزاج تھا اور اس بات پر یقین رکھتا
تھا کہ دنیا اور اس کی تمام مسرتیں صرف سرمایہ داروں کیلئے ہیں۔
بھتیجے نے اپنی مرحومہ ماں کی آخری وصیت کو اپنے دل میں گہری
جگہ دی تھی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ جب وہ برسر اقتدار آئے تو عوام الناس
کو خوفناک مظالم سے نجات مل جانی چاہئے۔

آج وہ مارکوئس سے یہ کہنے آیا تھا کہ وہ جائداد جو اسے ترکہ میں
آئندہ ملنے والی تھی اس سے وہ دستکش ہو جائے گا۔ اور عوام کی
بہبود اور فلاح میں نہ کہ خود اپنے نفع کی خاطر اس کو استعمال
میں لائے گا۔

"اور آپ کا کیا ہو گا؟" چچا نے کہا "معاف کیجئے۔ کیا آپ
اپنے اس جدید فلسفے کے ماتحت عمدہ اور نفیس زندگی بسر کرنے کا

ارادہ رکھتے ہیں؟"

"زندگی بسر کرنے کے لئے وہی کرنا چاہئے جو میرے دوسرے ہموطنوں کو حتّٰی کہ اُن لوگوں کو جن کی پشت پر شرفائے ملک ہیں کرنا ہوگا۔ یعنی "کام"

"مثال کے طور پر انگلستان میں"

"جی ہاں! خاندانی عزت و حرمت اس ملک میں میرے وجود سے کم از کم محفوظ ہے۔ خاندانی نام کو میری وجہ سے دوسرے ملک میں کوئی بٹہ نہیں لگ سکتا۔ اس لئے کہ دوسرے ممالک میں میں اس نام کو استعمال نہیں کرتا۔"

"میں بیس ۲۰ سال زندہ رہنے کی امید کرتا ہوں" چارلس کو شب بخیر کہتے ہوئے مارکوئس نے طنزاً کہا۔

لیکن اس وقت اس کو اس قابلِ رحم شخص کا کوئی علم نہ تھا۔ جس نے اس کی گاڑی کے نیچے سفر کیا تھا۔

جب صبح ہوئی تو شاطو (باغ) کے سنگین چہروں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان میں ایک اور سنگین چہرہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ —— یہ سنگین چہرہ اعلیٰ حضرت مارکوئس کے تکیہ پر الٹا پڑا ہوا تھا۔ اس سنگین وجود کے قلب میں اُترا ہوا' اور اس سے وابستہ ایک چاقو تھا۔ چاقو کے دستے پر کاغذ کا ایک پرزہ تھا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

"اس کو جلد اس کی قبر میں اُتار دو —— منجانب جیکیس"۔

تنہائی

ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ چارلس ڈار نے انگلستان میں فرانسیسی زبان کے ایک اعلیٰ اُستاد کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ اور مزید یہ کہ چارلس ڈار نے دامِ محبت میں گرفتار تھا۔ وہ اُسی ساعت سے لوسی مینٹ سے محبت کرنے لگا تھا جبکہ اس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ سڈنی کارٹن کو بھی اس سے بہت پریم تھا۔ وہ دوسری جگہ کتنا بھی ہر دلعزیز ہو لیکن بلاشبہ ڈاکٹر مینٹ کے گھر پر اس کی ذہانت کبھی مقبول نہ ہوئی۔ وہ اس قدر تصوراتی' اتنا سست اور بیکار تھا کہ موسم گرما کی ایک شام کو جب وہ لوسی کے ساتھ تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ لوسی نے اس سے پوچھا:۔

"کیا یہ قابلِ رحم نہیں ہے کہ اس سے بہتر زندگی نہ گزاری جا سکے؟"

"خدا جانتا ہے کہ یہ قابلِ شرم ہے۔"

"تب اس کو بدل کیوں نہیں دیتے؟"

اس نے دوبارہ مشفقانہ نظریں اس پر ڈالیں۔ سڈنی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لوسی اسے دیکھ کر حیرت زدہ اور مغموم ہو گئی۔ اس کی آواز میں بھی آنسو تھے جیسا کہ اس کے جواب سے ظاہر ہوتا تھا:۔

"تبدیلی کا وقت گزر گیا۔ میں اپنی موجودہ حالت سے بہتر اب کبھی نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی اب مجھے ادبستی اور خرابی کی طرف لے جائے گی۔"

اس نے رنجیدگی کے ساتھ یہ اور اضافہ کیا:۔

"وقت جلد آنے والا ہے جب تم نئے رشتوں میں منسلک ہو جاؤ گی۔ آہ! مس مینٹ! جب وہ وقت آ پہنچے تو کبھی کبھی یہ سوچ لیا کرنا کہ دُنیا میں ایک وجود ایسا ہے جو تمہارے علاوہ اب زندگی کو بچانے کے لئے —— اس زندگی کو بچانے کیلئے جس سے تم پریم رکھتی ہو اپنی زندگی بھینٹ چڑھانے کیلئے تیار ہوگا۔"

مسٹر ڈیفارجے کی شراب کی دوکان میں آج معمول سے پہلے مے نوشی شروع ہو گئی تھی۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا جب دو گرد آلود اشخاص اندر داخل ہوئے۔ ایک مسٹر ڈیفارجے۔ دوسرا سڑکوں کا مرمت کرنے والا تھا۔ اس تنگ و تاریک مقام پر اس سے قبل ایک سُفید بالوں والا ضعیف آدمی جوتے بنایا کرتا تھا۔

سڑک کوٹنے والے نے ڈیفارجے اور اس کے دوستوں جیکیس نمبر ایک۔ جیکیس نمبر دو۔ اور جیکیس نمبر تین ۳ سے وہ ہیبتناک کہانی بیان کی کہ کس طرح مارکوئس کا قاتل گرفتار ہوا۔ اور اس کو انتہائی ظلم و تعدی کے ساتھ سزائے موت دی گئی۔ جب اس نے اپنا قصہ ختم کیا اور چلا گیا تو چاروں جیکیس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

(باقی آئندہ)

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۴۰ء

کسوٹی

(چند نئے رسالے، کتابیں اور اخبارات)

تصویر دہلی
(باتصویر)

یہ ایک نیا ہفتہ وار ہے جسکے اڈیٹر ہمایوں صاحب بی۔ اے ہیں اور جسے ایم۔ اے حامد صاحب نے دہلی سے شائع کیا ہے۔ سرِورق پر تین ستاروں میں تین عنوان، ادب، فلم اور آرٹ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور یہ خود ہی اپنے اصول کا اعلان ہیں۔

اس وقت تک تصویر کے دو نمبر دیکھنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مالی آسانیوں کی "تصویر کدہ" میں کمی نہیں مگر مضامین کی طرف سے حامد صاحب کی بے نیازی حیرتناک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بغیر اقتصادی پُشت پناہی کے موجودہ سخت زمانے میں کسی اخبار کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جبتک کسی ہفتہ وار میں علمی و ادبی عناصر اور سیاسی اصابت رائے کا وافر خزانہ موجود نہیں ہوگا محض اقتصادی پشت پناہی اخبار کی کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

تصویر کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ وہ دہلی سے شائع ہوتا ہے جہاں ریاست، دین و دنیا اور تیج جیسے ہفتہ وار عرصہ سے نکل رہے ہیں اور ایسی دنیا و دین و تیج ہو نکلی جاری ہو کر اپنا ادبی، سیاسی اور علمی اعتبار قائم کر چکے ہیں۔ یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے اور ادارۂ تصویر کو اجرائے تصویر سے قبل ہی اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر قدم اُٹھانا چاہئیے تھا۔ مقابلہ کے لئے لازم تھا کہ ادارتی استحکام کے ساتھ ملک کے بہترین ادیبوں اور شعرا کا ایک حلقہ بنا لیا جاتا۔ تاکہ تصویر متاخرین کے معیار سے ہمدوش ہو کر شائع ہوتا۔ خاصکر اس جنگ کے زمانے میں جبکہ حالات نے دو تین محاذوں پر مقابلہ کو ناگزیر کر دیا ہے۔

تصویر اپنے ظاہری جمال کے لحاظ سے سچ مچ تصویر ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت یعنی اپنے تمام گیٹ اَپ کے ساتھ وہ واقعی دلکش ہے لیکن اس خارجی حُسن کے ساتھ اسکے داخلی جمال میں اضافوں کی گنجائش ہی نہیں شدید ضرورت ہے۔ اور اگر اس ضرورت کے ساتھ اس کے کارکنوں نے فوری توجہ نہ کی تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ معاصرین میں اپنی ادبی اور آرٹسٹک خصوصیتوں کو کیونکر نمایاں کر سکے گا۔

تصویر میں وافر حصّہ فلم انڈسٹری کے متعلق ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا خاص میدان یہی تجویز کیا ہے کوئی ہرج نہیں ہمیں تو مسرّت ہے کہ ملک میں کوئی ایسا "آئیڈیل" ہفتہ وار جاری ہو اور قائم ہو جائے جو فلم اور اسکے متعلقات کے بارے میں واقعی ایک اعلیٰ ترین آرگن کہا جا سکے۔

فلمی دُنیا میں تکمیل کی بڑی گنجائش ہے۔ اور علمی طور پر اس دُنیا کی افادیت دوسری باتوں سے بہت سے بہتر لٹریچر پیش کیا جا سکتا ہے اس میں جان بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہاں کی بے جان فلم انڈسٹری، دبے ہوئے فن کاروں اور مفلوج فلمی ترقی میں روح بھی پیدا کر سکتا ہے۔ میدان سامنے ہے۔ تصویر اپنا فرض ادا کرے۔ تصویر اگر چاہے تو وہ ایک اور بڑا فرض بھی ادا کر سکتا ہے، وہ اُس خلیج کا پاٹنا ہے جو ادبی دُنیا و فلمی دُنیا کے مابین حائل ہے۔

اس خلیج کے حائل ہو جانے نے فلمی دُنیا میں بے رنگی سی پیدا

کرایکی سے یعنی موجودہ تصویر میں ایک ایسا سنّا نی لٹریچر ہیں جسے ہمارے دیسی ادب سے کوئی خاص تعلق نہیں، عجیب قسم کی شاعری، عجیب قسم کی نثر، عجیب قسم کے گیت، جنہیں اُردو شاعری سے تعلق نہ ہندی گیتوں سے۔ نہ غزل نہ نظم، نہ افسانہ، نہ ڈرامہ، نہ ٹھمری ——

اگر تصویر چاہے تو فلمی دُنیا میں ادبی موج دوڑ سکتی ہے مدیر، دیکھتا چلا آرہا ہوں کہ جس قدر اخبار شائع ہوتے ہیں، ان کا مقصد سوائے جلب منفعت کے اور کچھ نہیں۔ یہ کوڑہ اخبار نویسوں نے قدری ہو کر رہ گیا ہے۔

"زر اندوزی" "تائید اور تردید کا مقصد ہے۔ تائید اور تردید زر اندوزی کے لئے کی جاتی ہے۔ ترقی ہو تو کیونکر۔ روپیہ کماتا فلم اسٹوڈیوں کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی ہے، ایک مجرمانہ دباؤ ڈال کر جلب منفعت آرٹ کی بدبختی بن گئی ہے۔ اصلاح ہو تو کیونکر!؟

اخبار نویسوں کے اعمال و افعال نے کمپنیوں کے تصویر بند اہلِ قلم کو اس درجہ گرا دیا ہے کہ کوئی بھلا آدمی ان سے ربط پیدا کرنے کے لئے قدم نہیں اُٹھا سکتا۔

تصویر ایک نیا ستارہ ہے، وہ اپنی ضو کی پاکیزگی سے ایک نئے فلمی تنقیدی اخلاق کا آغاز کرسکتا ہے اور گو مشکل سہی لیکن خود فلم کمپنیوں کے مالکوں کی قلبِ ماہیت کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔

تصویر میں تعلیم و تربیت اور ترقی کی اس لئے گنجائش ہے کہ اس نے ابھی آنکھ کھولی ہے۔ بے حیا لڑکے کی طرح اُن اخبار نویسوں اور اخباروں کی اصلاح اب ناممکن ہے جو جرائم پیشگی میں طاق ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی تصویر کی معصومیت دوشیزہ ہے جو ایک سانچے میں ڈھالی جاسکتی ہے۔ بہرحال تصویر کو چاہئے کہ وہ اپنی سعادتِ صحافت کو قائم کرے۔

"ان نمبروں میں ابھی کافی صلاحیت اور اپج موجود ہے ذرا سی توجہ اور نظام کے بعد تصویر کو اونچا کیا جا سکتا ہے موجودہ صورت میں بھی تصویر پڑھنے دیکھنے اور خریدنے کے قابل ہے، میں ایشیا کے ناظرین سے اس کی خریداری کی پُر زور سفارش کرنے میں اپنی روح کو بالکل مطمئن پاتا ہوں۔

میں دیکھتا ہوں کہ جدّت و تازگی کی کمی سہی مگر یہ دونوں نمبر قابلیت اور رنگا رنگی سے مرتب کئے گئے ہیں۔ اور کیا عجیب ہے کہ اسکے بعد جو نمبر شائع ہوئے ہونگے، وہ ان نمبروں سے بہتر نہ ہونگے۔

سالانہ قیمت صہ فی پرچہ ۲ر عقب جامع مسجد دہلی

اضطراب لکھنؤ
ماہنامہ

اڈیٹر: نسیم سندیلوی بی۔اے۔
مسعود اختر جمال۔

سائز ۲۰×۳۰ سالانہ قیمت عہ "معاونین" صہ

نگار اور نیا ادب کی موجودگی میں لکھنؤ سے اضطراب کی اشاعت نہایت حیرتناک ہے۔ اضطراب کے شائع کرنے والوں کے سامنے یہ حقیقت رہنی چاہئے تھی کہ نگار اور نیا ادب اپنا مستقل اور ترقی یافتہ معیار رکھتے ہیں اور اب جو رسالہ لکھنؤ سے شائع ہو وہ کم از کم ان دونوں رسالوں کے معیار سے کم معیار پر شائع نہ ہو۔

اضطراب کے اوراق بھی یہ بتانے سے قاصر رہے ہیں کہ اسکی اشاعت کا خاص مقصد کیا ہے۔ ایسی حالت میں ہر شخص یہی سمجھ سکتا ہے کہ اُردو زبان و ادب اور سماج کی جملہ مجلسی و اخلاقی ادبی و سیاسی ضرورتوں کی کفالت اس کا مقصد ہو سکتا ہے۔

یہ مقصد گویا ایک اجتماعی مقصد ہے، اور ایسے دو رسالوں کی موجودگی میں جو اس مقصد کو خوبصورتی اور تکمیل کے ساتھ پورا کر رہے ہیں کسی ذہین فرد یا جماعت کے خیال میں جو فرائض اور ذمہ داریوں کی اہمیت سے واقف ہے۔ یہ اپج پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ خاص کر ایسی حالت میں کہ نگار کو چھوڑ کر "نیا ادب" کو حکومت کی طرف سے کئی کچوکے دئے جا چکے ہیں اور وہ گوناگوں مشکلوں میں مبتلا رہا ہے۔

وہ نوجوان جو اضطراب کا علم لے کر اُٹھے ہیں ان کو نیا ادب کے لئے بے چین ہونا چاہئے تھا۔ اور جس قدر روپیہ وہ اس وقت تک اضطراب کی اشاعت میں صرف کر چکے ہیں، اسے نیا ادب کے استحکام میں لگانا چاہئے تھا۔ اگر اہلِ اضطراب کے پیشِ نظر زبان و ادب کی حفاظت و ترقی کا اجتماعی مقصد ہے تو اس کی تکمیل ایک مرکز پر مجتمع ہو کر بہ آسانی ہوسکتی تھی۔

نیا ادب بھی تازہ دم نوجوانوں کا آرگن ہے، اور وہ ہر اس نوجوان

فرد یا جماعت کو اپنے اندر ضم کرسکتا ہے، جو زبان و ادب کی خاطر کام کرنے کے لئے بے چین ہوں۔ صحیح الخیال کام کرنے والوں کے نزدیک انفرادی خیال کے بجائے ایک اجتماعی تصور ہونا چاہئے۔

لیکن بہر حال ایسا نہیں ہوا اور اضطراب جدا گانہ ایک رسالہ ہے جو جگر صاحب مراد آبادی کے قصیدۂ منشور سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک "انعامی تنقید" ہے۔ جو انتقاد کی مبادیات پر بھی صحیح نہیں اُترتی۔ البتہ یہ سارا مضمون ایک "نغمۂ عقیدت" ضرور ہے۔ شروع میں سوانح حیات اور حضرت جگر کی زندگی تک کو کھول کر بیان نہیں کیا گیا۔ مین پوری کا ذکر ہو اور "بامِ طور" جیسی بلند جگہ کا ذکر نہ ہو۔ تنقید نگار کی کیسی کھلی ہوئی ناواقفیت ہے۔!؟

اصل میں "شعر اور تنقید" ایک نہایت اہم فریضہ ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جبتک کہ نقاد، شاعر کی زندگی میں داخل ہو کر ——— نہایت گہرائی کے ساتھ اس کی زندگی کے ایک ایک پہلو کا مشاہدہ نہ کرے۔

معلوم ہوتا ہے صغیر احمد صاحب نے جگر صاحب کو صرف مشاعروں میں دیکھا ہے یا محض اُس وقت جب وہ اپنے مدّاحوں کے گروپ میں عشقیہ شاعر ہوتے ہوئے شاعری کی فلسفیانہ تعبیرات کرنے کی کوشش فرمایا کرتے ہیں۔

اس "انعامی تنقید" میں قدم قدم پر ٹھوکریں ہیں اور ایک جگہ منطقی ربط نہیں، یہی نہیں، دعاوی ہیں اور دلائل غائب۔ ایک جگہ مضمون نگار لکھتے ہیں:—

"ہر موزوں طبع اس وقت تک شاعر کہے جانے کا مستحق نہیں جب تک وہ خود اپنے شعر کی تفسیر نہ بن جائے اس معیار پر جب جگر کو دیکھتے ہیں تو ان کی شاعرانہ عظمت مسلّم ہو جاتی ہے کیونکہ ان کا ہر شعر خود ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔"

یہ لکھ کر مقالہ نگار نے نہ جگر صاحب کی زندگی کی خصوصیات بتائیں اور نہ ان کے اشعار میں وہ زندگی بتائی جس کو ہم ان کی روحانی یا مادّی حیات کا پرتو سمجھ سکتے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:—

"ایجاد و تخلیق" جگر کی دوسری خصوصیت ان کا تخلیقی آرٹ ہے۔"

حضرت جگر میرے دوست ہیں، ان کے کلام سے مجھے محبت ہے اور باوجود چند اصولی اختلافات کے میں ان کو پسند کرتا ہوں [illegible] اس وقت جگر صاحب کو محفوظ کر کے واقعہ یہ ہے کہ [illegible] غزل گو کی دُنیا چند مخصوص و محدود عنوان اور موضوعات [illegible] لیکن اس پر بھی کوئی غزل گو اتنی جدّت [illegible] نہ کرسکا کہ [illegible] ہی کو حقیقی بنا دیتا؛ تو جن لوگوں کی تقلید اور لکیر کے فقیر [illegible] یہ حالت ہو وہ ایجاد و تخلیق کیا کر سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ [illegible] میں جس قدر "تخلیق و ایجاد" ممکن تھی وہ میر و مومن و غالب تک [illegible] اور اس زمانے کا کوئی غزل گو اس حد تک بھی نہیں آسکا [illegible] غالب کا مرکز آغاز ہے۔

البتہ اُردو زبان کے جدید نظم گو شعراء نے اُردو شاعری [illegible] تخلیق کا فرض ادا کیا اور ان کی شاعری کو تخلیقی ادب سے [illegible] جاسکتا ہے۔

اقبال و جوش اور دوسرے مخصوص نظم نگار شعراء [illegible] جن عنوانات خارجی اور داخلی کیفیات کے متعلق جس قدر [illegible] پیدا کیا وہ ایسی متاع ضرور ہے جس کی نظیر قدیم شاعری [illegible] میں نہیں ملتی۔

ایک جگہ "فاضل انعامی مقالہ نگار" تحریر فرماتے ہیں کہ:—

"متقدمین کے کلام میں طرزِ ادا اور جدّت بیان کے ساتھ ساتھ "جوش و ولولہ" بہت کم ہے جگر نے اُردو کے قالب میں (اُردو شاعری کے قالب میں نہیں) جوش مستی کی نئی روح پھونک دی ہے۔"

کہنے کو تو بہت جی چاہتا ہے مگر معاصرین ضرورت سے زیادہ نازک [illegible] واقع ہوئے ہیں، انعامی مقالہ نگار سے دو دو باتیں کرنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں، بیچارے جگر صاحب بیچ میں آئے جاتے ہیں۔

اور یہاں مقصد یہ نہیں ہے کہ جگر صاحب پر براہِ راست

انعامی مقالہ نگار کی طرح میں بھی ظلم ڈھاؤں بلکہ مقصد یہ ہے کہ انعامی مقالہ نگار کو سمجھاؤں کہ تنقید اس قدر آسان کام نہیں ہے جس قدر کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے۔

جگر صاحب کا موازنہ متقدمین کے ساتھ کرکے انہوں نے ایک ایسا دعویٰ کر دیا جس کو وہ ثابت نہیں کر سکتے۔

میر کے یہاں باوجود قنوطی ہونے کے جوش و ولولہ کی کمی نہیں اور غالب کی تو یہ ایک خصوصیت ہے جس شاعر کے کلام میں جوش و ولولہ نہ ہو کا آخروہ شاعر کیا ہے۔ جذبات کو ولولہ کے ساتھ بیان کرنے ہی کا نام شاعری ہے، اور موجودہ عہد میں یہ جوہر سب سے زیادہ جوش کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ جگر صاحب کے یہاں یہ جوہر بھی انفعالیت میں پایا جاتا ہے مگر جوش کی شاعری میں ولولہ کی کافی مقدار گھلی ہوئی ہے۔

جوش ہی نہیں، اقبال کے کلام کی جان جوش و ولولہ ہی ہے چند چوٹی کے اشعار بطور مثال سُنئے ؎

جہاں ہر لبو ترہے قانع قفس میں ۔۔۔ وہاں دولتِ بام و در بیچتا ہوں
جہاں برق و شبنم سے وابستگی ہے ۔۔۔ وہاں ذوقِ برق و شرر بیچتا ہوں
جہاں اُنس ہے تنگ دامانیوں سے ۔۔۔ وہاں وسعتِ بحر و بر بیچتا ہوں

جلوہ گاہِ ناز میں جس وقت رکھتا ہوں قدم ۔۔۔ اس کے رہ کو حلقۂ بیرونِ در پاتا ہوں میں
دیکھتا ہوں جس قدر گہری نظر سے بار بار ۔۔۔ حسن کو پہلے سے کچھ پاکیزہ تر پاتا ہوں میں
دوڑتا ہے نبضِ خس میں برقِ سوزاں کا لہو ۔۔۔ سینۂ شبنم میں طوفانِ شرر پاتا ہوں میں

یا اس شعر کی تخلیقی اور ولولہ انگیزی کو ؎

اشتیاقِ اوج میں ہیں نا تراشیدہ صنم ۔۔۔ پتھروں میں جنبشِ صد بال و پر پاتا ہوں میں
راہِ حق ہی میں نہیں ہیں حسن کے نقشِ قدم ۔۔۔ گمرہی کو بھی کسی کی رہگذر پاتا ہوں میں

"بارگاہِ شعر" میں کہتا ہے ؎

چومی ہے نخوتوں نے یہ خاکِ فتادگی ۔۔۔ ڈالی ہے رفعتوں نے فلک کی سپر یہاں
پڑتی ہے آکے قلب پہ حسنِ ازل کی ضرب ۔۔۔ آئینہ توڑ دیتا ہے آئینہ گر یہاں
ہوتے ہیں نورِ صبح سے تعمیر سقف و بام ۔۔۔ بنتے ہیں رنگِ شام سے دیوار و در یہاں
ہر ذرۂ حقیر بصد ناز و دلبری ۔۔۔ رکھتا ہے آفتاب کے زانو پہ سر یہاں

مجھے پڑے ہیں زمانے کے ہاتھ سے ہرچند ۔۔۔ مگر بہیمہ برق و شرار ہیں ہم لوگ
نگاہ روبرو اے روحِ نعمتِ دارین ۔۔۔ بہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

یا جنگل کی شہزادی کا یہ شعر کہ ؎

چہرے پہ رنگ تمکین، آنکھوں میں بیقراری ۔۔۔ ایمائے سینہ کوبی فرمانِ بادہ خواری

تصنیف ہو رہے ہیں ہزاروں چھپتے ہوئے فسانے ۔۔۔ ان انکھڑیوں کی صنوبر کا نہیں شراب خانے

سچ ہے طوفانِ جوانی کو دبا سکتا ہے کون ۔۔۔ سر شاب شعلہ پرور کا جھکا سکتا ہے کون!؟

وارثِ کونین ہوں میرا کوئی ثانی نہیں ۔۔۔ میرے قدموں پہ جھکی رہتی ہے فطرت کی جبیں
مسکراتی ہے غرورِ عرش پہ میری زمیں ۔۔۔ ظالم و سرکش عناصر ہیں مرے زیر نگیں

لطف یہ ہے کہ اکثر دعوے بے بنیاد ہیں، اور جو بے بنیاد ہیں ان میں شدید تضاد ہے۔ ایک جگہ فاضل انعامی مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"جگر کے کلام میں مجموعی حیثیت سے "غالبیت" نہیں ٹپکتی ان کی زبان نہایت شستہ اور صاف ہے"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"جگر غزلوں میں بہت سے ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن کو اب تک کسی غزل گو نے نہیں استعمال کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ نامربوط اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوتے، میرے نزدیک یہ شاعر کا ایک زبردست آرٹ ہے غزل جیسی نازک اور لطیف صنف میں غیر مستعمل الفاظ نہایت خوش اسلوبی سے کھپا دینا ایک ایسا اعجاز ہے جو صرف حضرت جگر مرادآبادی کے حصے میں آیا ہے۔ طوالت مضمون کے خیال سے مثال کے طور پر صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں" (یعنی ایسے اشعار جگر صاحب کے کلام میں زیادہ سے زیادہ ہیں — !؟ خدا جگر صاحب کو ان کے دوستوں سے بچائے) ؎

ہم عشق مجسم ہیں لب تشنہ و مستسقی
دریا کی طلب کیسی دریا کو رُلاتا ہے

اس صفت سے جگر کو موصوف کرنا ان غریب پر بڑا ظلم ہے ۔ ان کے
کلام میں ایک ( ) غنائی شاعری کی تمام
خصوصیتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں اور وہ غیر مترنم الفاظ سے ہمیشہ
گریز کرتے ہیں ۔ "عشق مجسم" اور "لب تشنہ و مستقی" دونوں ترکیبیں
غیر مترنم اور جگر کی بندشوں کی نزاکت کے منافی ہیں ۔ لیکن اس ایک مثال
سے (جس کو فاضل انعامی مقالہ نگار نے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر
پیش کیا ہے) جگر صاحب کی اس خاص غنائی صفت کو دبایا نہیں جاسکتا
ایک دوسری جگہ تحریر ہوتا ہے کہ : —

"جگر کا فلسفۂ زندگی"

(۱) ہماری زندگی آج کل افلاس و جہالت کے باعث نئی نئی
اُلجھنوں میں گرفتار ہوتی چلی جارہی ہے ۔ اب "ان" (؟)
کی نگاہیں رونے والے شاعر پر نہیں ٹھہرتیں ۔ اب عوام
ایسی شاعری کو پسند کرنے لگے ہیں جو ان کے دل کا غم
بھلا سکے جس میں زندگی ہو ، اثر ہو ، اور سرور آگیں نغمات
کے دھارے ہوں ۔
جگر ہماری سوسائٹی میں اسی "انفرادیت" کے باعث
مقبول ہے ۔ وغیرہ "
پھر ایک جگہ کہتے ہیں کہ : —
(۲) "وہ دُنیا کو ایک خواب نہیں تصور کرتے بلکہ جائے عمل
اور کارزارِ حیات سمجھتے ہیں ۔" لکھا ہے

سمجھ سوچ کر پاؤں آگے بڑھانا
حقیقت ہے دُنیا کہانی نہیں ہے

جگر صاحب انقلابی اور اجتہادی دل و دماغ لے کر آئے ہیں
اور قدامت پرستی سے کوسوں دور ہیں ۔ زمانے کے مصائب
ان کے مزاج میں قنوطیت (نراشا) نہیں پیدا کرتے بلکہ وہ ان
کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں یہی "پیغام"
بھی دیتے ہیں ۔ ذیل کے شعر میں وہ زمانے کے حوادث اور
اپنے جذبات میں کتنی لطیف ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں ملاحظہ ہو
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر میرے لئے پیغام ہے معلوم نہیں کیوں "

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل انعامی مقالہ نگار "جدید شعرائے اردو" ...
نقادوں سے متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے محبوب موضوع ...
خصوصیتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو اس میں واقعاتی طور پر ...
اور جو نہیں ہونی چاہئیں ۔
اوپر کے دو ٹکڑوں میں جن باتوں کو دُہرایا گیا ہے یہ ملک کے ...
اور قومی شعراء کے تذکرہ میں لکھی جاتی ہیں ۔ نیچرل یا خطیبانہ اور ...
شاعری میں بنیادی طور پر خارجی عناصر ہوتے ہیں ۔ اس لئے وہ ...
حیات سے ہم آہنگ ہوتی ہے ۔ اور اس ہم آہنگی کی وجہ سے ...
کا ایک نقطۂ نگاہ بھی ہوتا ہے وہی پختہ ہو کر ان کا فلسفۂ زندگی
بن جاتا ہے ، لہذا جہاں ان کی شاعری کے محاسن شاعرانہ سے بحث
کی جاتی ہے یہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ یہ زندگی اور انسان کو ...
میں ڈھالنا چاہتے تھے ۔"
جس طرح اقبال کیلئے لکھا جاسکتا ہے کہ
"...) ہیں یا دُنیا کو "اسلامی فیسزم" یا "پین اسلامزم" کی
زنجیر میں منسلک کر کے مغلوں کے دور کا اسلامی زمانہ واپس لانا چاہتے
تھے ۔ اور اسلام کو وہ بہترین نسخۂ حیات خیال کرتے ہیں اور انسان کیلئے
ایک ذی عمل روحانیت لازمی قرار دیتے ہیں ۔ اقبال کے برخلاف ...
اشتراکی نظام کے قائل نظر آتے ہیں اور وہ دُنیا میں انسان کی خالص ...
مختاریت قائم کرنا چاہتے ہیں وہ مذہب ہی نہیں ذی عمل روحانیت کو
بھی زندگی کیلئے لازمی قرار نہیں دیتے ہیں ۔

. . . .

. . . .

. . . .

لیکن پیامی یعنی فلسفی شعراء کے برخلاف غنائی شاعر اور اسکی شاعری
کے فرائض بالکل مختلف ہیں ۔"
غنائی شاعر کا فرض زندگی میں محض مسرت پیدا کرنا ہے ۔" اور بس ،
اس کی شاعری کو خارجیت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ، داخلی عنصر
اس کی شاعری کا جوہر ہوتا ہے اور انسانی روح پر اس کی شاعری کا جادو
اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح سارنگی اور ستار کا ۔"

ایشیا ۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء

سارنگی اور ستار کو بول، بیچ اور کراہ سے کوئی نسبت نہیں۔ اس طرح غنائی شاعری کو فلسفہ و حکمت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

جگر صاحب غنائی شاعر ہیں، اور لافانی غنائی شاعر ہیں۔ ان بیچاروں کے متعلق "انقلابی" اور "اجتہادی" "فلسفۂ زندگی" "جائے عمل" اور "کارزارِ حیات" قسم کی ترکیبیں لکھنا ایسا ہی ہے جیسے بلبل پر بہ ڑلا دینا۔

جو شعر انعامی مقالہ نگار نے مثال میں دیا ہے، وہ، اور اس میں لفظ "تعبیہ" کا استعمال نئے ماحول اور شعرائے جدید کا فیضان ہے اس ایک شعر سے کوئی متغزل، فلسفی شاعر نہیں ہو سکتا۔

ہاں اگر میں جگر صاحب پر مضمون لکھتا تو دنیا کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا کہ "ادب لطیف" کا رسیا اب "ادب کثیف" کے جاروب کشوں کی خاک پا سے موتی رولتا ہے۔

ان کی تازہ نظمیں ؎

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

یا "مدت میں وہ تجدیدِ ملاقات کا عالم"

یہ متغزل جگر کے رنگ میں بکھری ہوئی غزلیں نہیں ہیں، بلکہ یہ مسلسل نظمیں ہیں جو ایک خیال کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں۔

یقیناً یہ جدید رومانیت کے اثرات ہیں جن سے بڑی کشمکش کے بعد بھی جگر صاحب اپنا دامن نہ بچا سکے۔ یہ ان کا ارتقا ہے اور اس ارتقا پر ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا تنقیدی مضمون آرزو صاحب لکھنوی پر ہے جس میں نظم و غزل کے مسئلہ پر کمزور دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ اور اس مضمون کے لکھنے والے نے بھی وہی زیادتی اپنے موضوع سے کی ہے جو جگر صاحب کے ساتھ انعامی مقالہ نگار نے کی تھی۔ یعنی خیر سے آرزو صاحب کو سرمایہ داری کے مظالم اور غربت کی بے بسی کا مرقع نگار بتایا ہے۔

افسوس یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ خارجی شاعری کی تخلیق بھی بغیر داخلی ہیئت کے ناممکن ہے۔!؟ اب بتائیے اس شعر میں کیا جان ہے ؎

عجب زندگی ہے عجب زندگی ہے
کہ ہیں ظلم پر ظلم اور بے بسی ہے

بہرحال یہ مضمون پہلے مضمون سے غنیمت ہے، شاید اس لئے کہ "انعامی" نہیں ہے۔!؟

مجھے افسوس ہے کہ اضطراب کا ہر صفحہ مجبور کرتا ہے کہ میں اس کو ایک "رجعت پسند" آرگن کہوں۔ "ہماری شاعری" کے عنوان سے سوز شاہجہانپوری کا ایک مختصر سا مضمون ہے اور اس کا بھی مقصد محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں پہ دھول اڑائی جائے جو شاعرانہ ترقی کی دوڑ میں ہوا بن کر اڑ رہے ہیں۔

اس مضمون کی روح یہ اعتراض ہے کہ موجودہ شاعری محض الفاظ اور ان کے غلط استعمالات کا ایک معجون مرکب ہے۔ آئیے ذرا اس مسئلہ پر تفصیلی نگاہ ڈالیں۔

موجودہ شاعری کی دنیا کو چار حلقوں میں اگر تقسیم کیا جائے تو یہ حلقے بنیں گے۔ (۱) ترقی یافتہ متغزلین (۲) ترقی یافتہ متغزلین کے غلط مقلدین۔ (۳) ترقی یافتہ انقلابی نظم نگار شعراء (۴) اور انکے غلط مقلدین۔

فرسودہ اور پٹی ہوئی شاعری یا انفعالی شعراء سے مجھے غرض نہیں، موجودہ شاعری اور شعراء کے یہی چار حلقے بن سکتے ہیں۔ جہاں تک نمبر ۱ اور نمبر ۳ کا تعلق ہے، ان کے ترقی یافتہ ادب نے آج اردو شاعری کو اس درجہ بلند کر دیا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی شاعری کے سامنے زیادہ شرمندہ نہیں ہو سکتی۔

(۱) عشقیہ شاعری اور (۲) انقلابی جدید شاعری، دونوں کے نکھار اور ارتقا نے اردو ادب کو تباہی و شرمندگی سے بچا لیا ہے۔ اب رہے نمبر ۲ اور نمبر ۴ سو ہر ملک میں "غلط مقلدین" کا نہ کوئی معیار ہوتا ہے اور نہ ان کی کچھ عمر ہوتی ہے، اس لئے ان کے اشعار کو موضوع بنا کر حقیقی شعراء یا ان کے ادب کو تنقید کا نشانہ بنانا ہرگز تنقید نہیں ہو سکتا۔

جن اجزاء اور عناصر کو جناب سوز نے گنایا ہے یہ غلط ہے کہ

موجودہ شاعری محض ان اجزا کی بُنیادوں پر قائم ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ اقبال، جوش اور دوسرے لوگوں کے دواوین سوز صاحب کی نظر ہی سے نہیں گذرے، یہی نہیں اور بھی بہت سے نو طلوع ستارے ایسے ہیں جن کی ضو منفعل شاعری کے آفتاب و ماہتاب کی روشنی کو ماند کر رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں لڑکیاں ایسی نظمیں اور غزلیں کہتی ہیں جن کے آگے فرسودہ غزل گو اساتذہ کا کلام بے روح معلوم ہونے لگا ہے۔

اصل میں یہ مضمون نظم نگار شعراء کے حلقے پر ایک کمزور ضرب ہے اور یہ حضرت سخت قسم کے دقیانوسی معلوم ہوتے ہیں۔ جب انسان کی خود کوئی حیثیت نہیں بن سکتی تو اسی طرح دل مسوستا ہے۔

اس کے بعد سوز صاحب نے صاحبانِ ترنم پر چنگاریاں پھینکی ہیں۔ اس انداز اور ان اطوار سے آپ اضطراب کی متاعِ ادب کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔

سارا رونا تو دراصل ترنّم ہی کا ہے، کیونکہ جدید متغزلین اور نظم نگار شعراء میں زیادہ تر ایسے ہی خوش نصیب ہیں جو ترنم کے ساتھ اپنا کلام سُناتے ہیں اور ان کو وہ ہر دلعزیزی اپنے کلام اور ترنّم کی وجہ سے حاصل ہے جس کو مغلوب کرنا فرسودہ، بوڑھے، حاسد اور متشنج شعراء کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان شعرائے جدید کے اقتدار کا عالم اس وقت دیکھیے جب وہ کسی مشاعرہ یا جلسے میں موجود ہوں، کوئی نظام باقی نہیں رہتا۔ "گلوگیر شعراء" (جن کی نسل میں سے سوز صاحب بھی معلوم ہوتے ہیں) موجود ہوتے ہوئے نابود ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی روحانی تکلیف ہے جس کو گمراہ سبزہ آغازی اور ڈاڑھیوں کا سپید رنگ برداشت نہیں کر سکتا۔

لیکن اگر عقل کا ایک جزیہ بھی ان حضرات کے پاس ہے تو ان کو نفسیاتی اور حقیقی اسباب پر غور کرنا چاہیے جن کی بُنیاد پر جدید شعراء عوام میں ہر دل عزیز ہیں۔

گو آپ جانتے ہیں لیکن آئیے ذرا ان حقائق کو دُہرائیں اور اپنے دوستوں کی آتشِ حسد کو سرد کرنے کی کوشش کریں جو ان کے دل و جگر کو پھونکے ڈالتی ہے۔

یہ صرف ایک حد تک صحیح ہے کہ ترنّم شاعر کو مقبول کر سکتا ہے، ہمارے سامنے ایک مترنّم شاعر کی مثال موجود ہے جو ۳۶ء میں پیدا ہوا اور ۳۹ء میں مرگیا (!؟!)

اس کی موت کا مقابلہ اس کا ترنّم نہیں کر سکا کیونکہ اسکی شاعری میں بلوغ کی اہلیت نہ تھی اور نہ صرف ماحولی یا قومی [illegible] محض [illegible] شاعری کی کسوٹی پر بھی پورا نہیں اُترتا تھا۔ جدید شعراء اس لئے عوام میں مقبول، زندہ، تابندہ اور پائندہ ہیں کہ وہ سماج کی آواز ہیں، جو اُن کے نمائندے ہیں وہ موجودہ سیاسی، مجلسی، ارتقاء اور زندگی کی اُٹھان کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اور اپنے عصر کی نمائندگی کرتے ہیں، [illegible] کی نمائندگی کرتے ہیں جو انسانی روح و دل سے اُٹھنے [illegible] سے بے تاب تھے۔

وہ فرسودہ، گلوگیر، منفعل اور مُردہ شاعروں کی [illegible] نہیں ہیں، جو منافق ہیں، قافیہ سے خیال پیدا کرتے ہیں [illegible] میں سے شعر کی بھرڈ کلاس سیپیاں تلاش کر کے جوہریوں [illegible] موتی کا نام لے کر رکھتے ہیں۔ جدید شعراء شاعری [illegible] فطرت کے ناپیدا کنار سمندر کے [illegible] غوّاص ہیں۔ جان پر کھیل جانے والے غوطہ زن ہیں، وہ زندگی کی تہ تک جاتے ہیں اور [illegible] موتی نکال لاتے ہیں۔

ان کی کامیابی ان کو مست کر دیتی ہے۔ اس موتی کو اپنے خونِ دل سے رنگین بنا کر سماج کی گردن میں ڈال دیتے ہیں، اور مست ہو کر گاتے ہیں۔

وہ ڈرائنگ روم کے بھاٹ نہیں ہیں، وہ امراء کے وظیفہ خوار خود فروش نہیں ہیں، وہ بوژروا طبقۂ انسانی کے خادم نہیں ہیں، وہ ندیم ہیں انسانیت کے، وہ نقیب ہیں آزادی اور ذہنی ارتقاء کے، وہ مغنی ہیں انسانی روح و دل کے لطیف ترین حقیقتوں کے، وہ مطرب ہیں، سرمست اور الھڑ شباب کے، اور وہ نمائندے ہیں اس عصرِ خونیں کے جس سے ہستی کانپ رہی ہے۔

جن مُردہ روایتوں کا نام ادارۂ اضطراب نے مذاقِ سلیم اور

آدب رکھا ہے۔ سچ پوچھئے تو جدید شاعری نے اس کو اُجاگر کیا ہے
یم غزل نے اُس کی میت تیار کی ہے۔

لیکن بہرحال اسی اُلٹی سیدھی ترتیب کے باوجود اضطراب میں
ب صاحب کی غزل، پیرا شوٹ کے متعلق مضمون اور اضطراب عالم
سوزش ماضی، بہ حبیب آمنہ صاحبہ کی نظم اچھی چیزیں بھی موجود ہیں
اپنے نادیدہ دوستوں سے عرض کروں گا کہ دُنیا بہت آگے نکل چکی
جاگ چکی ہے، بہت ہوشیار ہوگئی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں
ی اضطراب کو ایک ادبی رسالہ بنائیں، اپنے اندر جوش و ولولہ
ریں، ترقی یافتہ بنیں، محنت کریں، کوئی وجہ نہیں کہ وہ انفرادی طور پر
ادب اور سماج و ملک کی خدمت نہ کرسکیں۔ ایک چھپی ہوئی خواہش
اب کی لہروں میں ضرور پائی جاتی ہے۔ ذاتیات اور غلط مقابلہ
جانا ہی ذہن و دماغ کی صحت و ترقی کی دلیل ہے۔

آخر میں اضطراب کے ٹائٹل کے متعلق بھی ایک بات ادارہ
طراب کو محسوس ہونی چاہئے۔

زبان کی ترقی کے لئے اس نظریہ کی تصدیق کی اب ضرورت باقی
رہی ہے کہ زبان کو جس قدر آسان اور سہل بنایا جاسکے بنایا جائے
غالباً اس سلسلے میں رسم الخط بھی ایسا ہونا چاہئے جس کو محض "کوفی"
پڑھ سکیں ہندوستانی بھی پڑھیں۔

کوئی شک نہیں کہ یہ ابداع جمیل (خوبصورت بدعت) ہے خوب
مگر میں نے کشمیر سے واپس آکر اس رسالہ کو ہفتہ بھر تک مرہٹی رسالہ
سمجھا اور اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ کسوٹی کا باب لکھتے وقت معلوم ہوا کہ آپ
اُردو رسالہ واقع ہوئے ہیں!؟

نیا ادب اس "کوفیت" کا موجد ہے مگر وہ بھی اب اپنی ایجاد
سے دست بردار ہو چکا ہے۔

ایک طرف آپ ہندو بھائیوں سے شکایت کرتے ہیں کہ وہ اُردو
نہیں پڑھتے دوسری طرف آپ نستعلیق خط سے رجعت کرکے ایسے رسم الخط
میں اپنے رسائل کے نام لکھواتے ہیں جن کو اُردو خواں عوام بھی نہیں پڑھ
سکتے ــــ!؟

بہرحال میں اضطراب کی ترقی اور اشاعت کا خواہاں ہوں اور

پُرزور سفارش کرتا ہوں کہ ناظرین ایشیا اسکو منگا کر دیکھیں۔

داستان لاہور | سائز ۲۰×۳۰/۸ اڈیٹر خلیل احمد و بشیر ہندی | سالانہ چندہ ۵ر، فی پرچہ ۶ر ۵۴ ٹمپل روڈ لاہور

"ہزار داستان" کے بعد "داستان" کا لاہور سے شائع ہونا اس ارتقا
کی مناسبت کو پیش کرتا ہے جو ۵ برس کے اندر ادبی دُنیا میں پیدا ہوا ہے
گو داستان میں سے "ہزار" کی کمی ہوگئی ہے لیکن یہ کمی اُس ذہنی و ادبی
تکمیل کا سرآغاز ہے جس کے لئے ادبی دُنیا رات دن کوشش کر رہی ہے۔

ہزار داستان کا تصور یقیناً ہمارے گزرے ہوئے ساونتی عہد کے
کلچر کی تصویر پیش کرتا ہے جس کی ہر شے سے ہمارے احساس و خیال
کو ایک نفسیاتی لگاؤ تھا۔ اور باوجود ناپسندیدگی کے آج بھی اس عہد کا
تصور ہمیں سرشار کردیتا ہے۔

فارسی اور اُردو ادب میں "ہزار داستاں" کی چہک روح و دماغ میں
چٹکیاں لیتی تھی دل کو مست کرتی اور سراپڑدلوں کے پس منظر کو چیرتی
ہوئی لالہ رخوں کے جلسوں میں پہنچا دیتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر "ہزار"
کی کمی اس لفظ میں ایک ایسا عجیب رومانی اور حکیمانہ اضافہ کرگئی ہے جسکی
وحدانیت، وحدت پر بھی چھائی ہوئی ہے اور کثرت پر بھی ــــ!

داستان میں زندگی کی ہر کہانی پوشیدہ معلوم ہوتی ہے جن مسائل سے
اراکین داستان نے بحث کرنا چاہی ہے، ان تمام مقاصد اور مسائل کا
بکھراؤ داستان کی اتھاہ دُنیا میں پایا جاتا ہے۔ اس تصرف پر خلیل و بشیر
کی ملی جلی اسم تراشی پر داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ خلیل و بشیر جو
داستان کے واضع اور مرتب ہیں، رسائل کے شائع کرنے کا سلیقہ رکھتے
ہیں اور ان کو ادبی و تجارتی تجربہ ہے لیکن داستان کے دو نمبر دیکھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی راہ واضح نہیں کرنا چاہتے۔ اور جدت و قدامت
کے بین بین سلامت روی کی پالیسی پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر نے ایسا
چاہا مگر اس سلامت روی کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ یا بالکل قدیم ہوگئے یا
بالکل جدید۔ بہرحال ادب کا نیا نظریہ ملک میں مقبول ہو رہا ہے۔ ہمارے شاعروں
اور ادیبوں نے تخیل سے رہائی حاصل کرنے کی جد و جہد شروع کردی ہے
اور ادب کا سرشتہ زندگی کے دامن سے باندھا جاچکا ہے، اب حقیقت
تسلیم کی جاچکی ہے کہ فرسودگی اور قدامت ہمارے مرض کا علاج نہیں ہے۔ (باقی آیندہ)

SAGHAR

IN ENGLISH



"Saghar's entire attitude and approach towards life is of youth, richly endowed with a passion for the history, romance, hope and freedom of his country. He is in every fibre of him Indian and his art is both drawn from and dedicated to his motherland."

SAROJINI NAIDU



The Urdu knowing world is already familiar with the message of this young and buovant poet of the East.

It is a message of independence and national pride.

The Hindi Edition of Saghar's poems is already in the market and eagerly sought by lovers of poetry and literature.

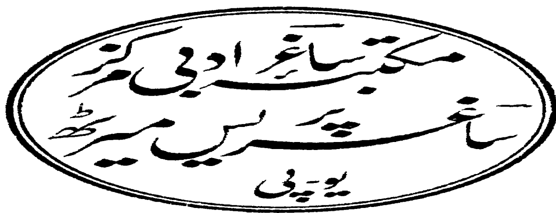
It is now translated into English for the benefit of English knowing world.

Price per copy Rs. 4-12 only. To those who order in advance it will be given for Rs. 3 only.

BOOK YOUR COPIES NOW TO AVOID DISAPPOINTMENT

Manager, Adbi Markaz,
MEERUT.
(India.)

Registered No. A 656



Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT

ایشیا

اُردو دنیا کی طرف سے ہندی سنسار کیلئے بہترین تحفہ

رس ساگر

بادۂ مشرق کا نیا رُوپ

ہندوستانی ادب میں یہ پہلی مکمل کوشش ہے، جس کی بنیاد میں لسانی اتحاد۔ قومی ملاپ اور ہندوستان کی ایک لنگوا فرینکا وضع کرنے کے خیال کی طرف پورے وثوق کے ساتھ قدم اٹھایا گیا ہے یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ساغر کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کی منتخب نظمیں اور نیا کلام ناگری حروف میں ایک مرتّب مجموعہ کی شکل میں چھاپا گیا ہے اور حواشی میں ان تمام الفاظ کے معنی آسان زبان میں دیئے گئے ہیں جن کو ہندی دنیا بآسانی سے نہیں سمجھتی۔

کتاب کے لئے خاص طور پر سپلا اینٹک پیپر مل سے بنوایا گیا ہے اور چھپائی ہندوستان ٹائمز پریس دہلی میں ہوئی ہے "رس ساگر" مجموعی طور پر نہایت حسین اور اعلیٰ سامانوں کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور اُردو دنیا کی طرف سے ہندی سنسار کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ آپ اپنے ہندی جاننے والے دوستوں کو نہایت فخر و مسرّت کے ساتھ اس تحفہ کی نذر دے سکتے ہیں

منیجر ادبی مرکز میرٹھ (یو۔پی)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی، ادبی ماہی رسالہ

ایشیا

زیر سرپرستی

ڈاکٹر سید محمود

(بہار گورنمنٹ کی طرف سے اسکولوں کے لئے منظور شدہ)

ایڈیٹر ساغر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مجلد ایشیا چھ روپیہ (۶)
قیمت سالانہ غیر مجلد ایشیا پانچ روپیہ (۵)

قیمت ایک نمبر مجلد عہ، علاوہ محصول
قیمت ایک نمبر غیر مجلد ۸، علاوہ محصول

انقلاب

امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کی ایک رباعی

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
میخانے نے رنگ و روپ بدلا ایسا
میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

ب

ایشیا

فہرست

رسالہ ایشیا (سہ ماہی) جنوری، فروری، مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

بقیہ مضمون "کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی" صفحہ ۳۴

طرز حکومت میں زیادہ تر اکثریت ہی حکومت --- کرتی ہے۔ لیکن اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ اکثریت اور اقلیت کی مخلوط حکومت رہی ہے۔ موجودہ سویٹ روس کا نظام جمہوری انگلستان میں ۱۹۳۱ء میں سب پارٹیوں کی مخلوط حکومت تھی اور آج بھی ہے۔ بہرحال حکومت مخلوط ہو یا اکثریت کی ہو دونوں حالتوں میں بلا امتیاز جماعت ہر قوم وملت کے عوام کا خیال کرنا اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا حکومت کا فرض ہوتا ہے۔

موتمر آئین ساز کو بھی اصولاً میں بہت اچھا سمجھتا ہوں مگر ابھی تک مجھے اس کی تشفی نہیں ہوتی ہے کہ ہندوستان کی فرقہ وارانہ اُس تعلیم کی کمی اور کورانہ تقلید کی حالت میں موتمر آئین ساز مفید ہوسکتی ہے یا نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر بڑے بڑے معاملات آپس میں طے ہوجائیں تو پھر پورے آئین کے لئے ایک موتمر کا قائم کرنا یا آئین کو استصواب کے لئے عوام کے سامنے پیش کرنا مناسب ہوسکتا ہے۔

تین فیصلے

تنقید ۱۹۵۹

وقت آگیا ہے کہ مسائل کو جذباتی نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ تدبیرو امکان کی روشنی میں دیکھا جائے۔"

دیکھنے میں بظاہر ہندوستان اس وقت نفاق، نفرت، شورش اختلاف اور طرح طرح کے ہنگاموں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور ہندوستانی قوم کی یہ پریشانی، یہاں کے بسنے والوں کا یہ بکھراؤ سخت ہمت شکن ہے لیکن نکتہ رس ذہن و دماغ جانتے ہیں کہ تاریخ کے صفحے قوموں کے ایسے سخت مراحل سے بھرے پڑے ہیں۔

جس طرح ہم شیریں چشمۂ آب تک پہونچنے کے لئے خس و خاشاک اور مٹّی کے ملبے کو نکال پھینکنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح آزادی، جو سرچشمۂ حیات ہو اپنی منزلیں رکھتی ہے۔ اس سرچشمۂ زندگی کے کنارے تک پہونچنے کے لئے ہمیں اس ملبے کو نکالنا اور پھینکنا ہی پڑے گا۔ یعنی جو فرقہ پرستانہ اختلاف مختلف سیاسی نظریوں کی صورت میں ہماری راہ میں روڑہ بن رہا ہے اُسے کسی نہ کسی طرح ختم کرنا ہی ہوگا۔

استقلال اور ہمّت کے معنی یہ ہیں کہ انتہائی آفت اور مصیبت کا مقابلہ نہایت خندہ پیشانی اور صبر کے ساتھ کیا جائے اور اُس آئیڈیل کو ایک صورت دینے کی لگاتار کوشش کی جائے جو ہم نے "آزاد ہندوستان" اور جنتا کو سکھی بنانے کے متعلق مدّتوں کی کوشش اور سوچ وچار کے بعد قائم کیا ہے۔

لوگ اور حکومت غلط خیال کرتی ہے کہ اس آئیڈیل میں جان ڈالنے کے معنی دوسروں کو بے روح کر دینا ہے۔ کسی ملک کو آزاد کرانے اور اُس کے بسنے والوں کی راحت اور سُکھ کا انتظام کرنا زندگی کی سب سے بڑی عبادت اور انسانیت کا سب سے اہم فرض ہے۔

ہندوستانی قوم کی واحد آزادی پرست جماعت کانگریس نے انسانیت کے اس سب سے اہم فرض کی ادائیگی کی داغ بیل ۵۰ برس قبل ڈالی اور وہ نصف صدی سے برابر کوشش کرتی رہی ہے کہ کسی طرح ہندوستان اور اُس کے باشندوں کو دنیا میں سربلند و آزاد کرائے۔

کیونکہ ہندوستان کی آزادی اور یہاں کے باشندوں کی راحت نہ صرف داخلی حیثیت رکھتی ہے بلکہ وہ اثر انداز ہوتی ہے۔ کل بنی نوع انسان پر اس کے نتیجہ کے طور پر دنیا میں ایک نئی پُر امن اور متوازن زندگی شروع ہو سکتی ہے اس لئے ہندوستان کی "آزادی" دنیا کی آزادی کے مترادف ہے

الف

گو "جمہوریت" "عیسائیت" اور خاص کر "انسانیت" کے بلند بانگ طاغی دعویدار اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے پھر بھی اس وقت بد ستی بساط پر اُن کی چال کا وہی انداز ہے جو ڈیڑھ صدی سے ہندوستانیوں کو حیرت میں ڈالتا رہا ہے۔

اُن کے قول کے مطابق برطانیہ یورپ کی موجودہ جنگ میں جمہوریت عیسائیت اور انسانیت کے اعلیٰ مفاد کی خاطر کُودا ہے۔ لیکن یہ عجیب سمجھ میں آنے والی منطق ہے کہ یہی نظریّہ ہندوستان اور اُس کی جمہوری آزادی سے متعلق استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ ٹھیک اُس وقت جبکہ یقینی طور پر تمام ہندوستانی قوم کو اپنے حقِّ آزادی کے لئے متحد ہو جانا چاہئے تھا ہم قوم میں شدید قسم کا بکھراؤ اور آپس میں سخت بے اعتمادی دیکھتے ہیں۔

یہ بے اعتمادی اور بکھراؤ کس زہریلے بیج کا نخل ہے اور کس زہر آلود ہاتھ نے اس کو بویا ہے۔ ذمّہ دارانہ طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن حکومت کرنے کے مسلّمہ اصولوں اور تسلیم شدہ سیاسی حکمت عملی کی روشنی میں ہم اس "معشوق" کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جو اس "پردۂ زنگاری" میں چھپا ہوا ہے؟

(۱) موجودہ ہندوستانی سیاست کے ڈرامہ میں مسلم لیگ کا رول نہ صرف مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے بلکہ انتہائی افسوسناک اور خود غرضانہ ہے۔ دراصل چند وزارتیں نہ ملنے پر کانگریس اور قوم پرور مسلم جماعت سے رقابت

ایشیا

پسند مسلمانوں کا اس قدر گرگرا انتقام لینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ مسلم لیگ سیاسیات میں کسی سنجیدہ مقام پر نہیں ہے۔

مسٹر جناح کے حواریوں کے متعلق جو اکثر سرمایہ دار یا حکومت پرست ہیں کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے وہ تو کھلم کھلا سامراج کے حامی اور برطانیہ کے دوست ہیں لیکن میں بہت حیران ہوں کہ خود مسٹر جناح کے بارے میں کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے!؟ ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح اُن کا غرور اور ضد اُس وقت تک نہایت دلکش تھی جس وقت تک وہ امکان اور قیاس کی حدود میں تھی، لیکن یکے بعد دیگرے جمہوریت کی مخالفت، یومِ نجات اور پاکستان کی تحریک ان تمام اقدامات کی وجہ سے مسٹر جناح کی ذات لامحالہ مشکوک ہوئی جاتی ہے۔ گو شک کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن عین اُس وقت جبکہ برطانیہ پر سیاسی دباؤ ڈال کر ہندوستان کے لئے کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا مسٹر جناح کا وطنیت کی بنیاد پر کلہاڑی مارنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ محض کسی داخلی مخالف جماعت کے لیڈر نہیں ہیں بلکہ وہ اسی طرح ہندوستان کے مخالف ہیں جس طرح برطانیہ کے سامراجی سیاست داں۔

غور سے دیکھا جائے تو وہ برطانوی سیاست دانوں کے مقابلے میں ہندوستان کے بدتر دشمن ہیں۔ برطانوی سیاست دانوں نے فرقہ وارانہ مسئلہ کو تقسیم ملک کی صورت میں حل کرنے کی تجویز پیش نہیں کی۔ مگر مسٹر جناح نے پاکستان کا ناقص اور ناقابلِ عمل خیال پیش کر کے انتہائی رجعت پسندانہ وطن دشمنی کا ثبوت دیا ہے

۲

مسلم لیگ نے (Full Independence) پوری آزادی سے بغاوت کر کے اپنے ریزولیشن میں سرے ہی سے وفاقی نظامِ حکومت سے انکار کر دیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ ہندوستان کے لئے جو قانون نافذ ہو وہ مسلمانوں کے مشورے و منظوری سے نافذ ہو۔

تیسرے یہ کہ صوبۂ سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان کو ایک مسلم ریاست بنا دیا جائے جس کا ہر حلقہ خود مختار ہو۔

اسی طرح بنگال اور آسام کی ایک خودمختار مسلم ریاست، جس کا ہر حلقہ خود مختار ہو۔

اس کے علاوہ جن صوبوں میں مسلم آبادی اقلیت میں ہے اس کے قومی، مذہبی اور اقتصادی حقوق کی حفاظت کی جائے۔

یہ ہے وہ شاندار فیصلہ جو بزعمِ خود "مسلمانوں کی نمائندہ جماعت" مسلم لیگ نے کیا ہے۔ جس کی تمام تر سیاست محض کانگریس کی مخالفت تک محدود نظر آتی ہے۔

اس نمبر میں پاکستان کے ماخذ اور آغاز کے متعلق ایک سرسری اشارہ کیا گیا ہے جس میں مسلم لیگ کے رزولیوشن پر اظہار رائے کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ تقسیم ملک کے منحوس نظریہ میں بھی مسلم لیگ نے مسئلۂ اقلیت کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔

اوّل تو کسی دماغی اور اصولی انسان کو مسلم لیگ کا بنیادی خیال ہی دلکش معلوم نہیں ہوتا۔ کسی ملک میں آپ اس طرزِ عمل کی مثال نہیں دکھا سکتے کہ ایک ایسی جماعت جو بزعمِ خود نو کروڑ افراد کی نمائندہ ہو مگر اپنے تولّد کو مولد کہنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اس میں بسنے والی دوسری قوموں سے مستقل نفرت و جنگ کے لئے معصوم و جاہل مسلم عوام کو آمادہ کرے۔ سیاسی طور پر انگریز اور اقتصادی طور پر انگریز و ہندو دونوں کی غلام ہو کر ملکی و اقتصادی آزادی کی جد و جہد میں ایک لمحہ حصہ لینے کے لئے آمادہ نہ ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ ملکی آزادی کے بنیادی خیال کی بھی موئد نہ ہو۔ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہے مذہب اور کلچر کے نام پر مسلم عوام کے مستقبل کو تباہ کرے جس کے پیش نظر کوئی پروگرام نہ ہو۔ جس کا ماضی غلط، جس کا حال بے معنی، اور جس کا مستقبل کچھ نہ ہو لیکن وہ غیر منطقی طور پر زبردستی سو فیصدی مسلم اقلیت (یعنی ۹ کروڑ) کے حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کرے۔

قطعی غیر منطقی طور پر! کیونکہ حصّہ طلبی کا حق محض اس کو پہنچتا ہے جو دوسروں کو خود بھی حصّہ دے۔ ثابت ہے کہ مسلم لیگ میں جو حضرات ہیں اُنھوں نے کوئی ایثار اور قربانی نہیں کی ہے

دنیا جانتی ہے کہ ان ڈرائنگ روم کے بورژوا سیاست دانوں کو آزادی کی جد وجہد سے دور کا بھی تعلق نہیں - اور سچ پوچھئے تو وہ ہندوستان کی آزادی کا امکان ہی قرمن نہیں کرتے، وہ ہندوستان کی غلامی کو تغیر و انقلاب کا بند نیال کرتے ہیں۔ اے کاش اُنھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ جب سیلاب اپنی پوری گھن گرج کے ساتھ آتا ہے تو تمام بند اور سنگین پشتے خس و خاشاک کی طرح بہ جاتے ہیں۔

پہلے نہ تھا۔ لیکن اب یہ یقین واثق ہو گیا ہے کہ ہندوؤں کے سر

تاہم غلامی تھوپ کر مسٹر جناح اور اُن کی اُمّت ملک کی پائدار غلامی پر ایمان رکھتے ہیں اور نئے تصوّرات کی روک اور اپنے تحفظ کے لئے وہ برطانوی سامراج کے قیام کو ہندوستان میں ضروری خیال کرتے ہیں یعنی اصل میں وہ محض اُس طبقاتی مفاد کے لئے سعی کر رہے ہیں جس کی تباہی کا اُنھیں سخت اندیشہ ہے۔

آیئے ذرا تفصیل سے مسلم لیگ اور مجاہدین لیگ کے اعمال کا اندازہ کریں، مسلم لیگ میں جو طبقہ حاوی ہے وہ اصل میں مسلمانوں کا طبقۂ اعلیٰ ہی جو زیادہ تر امرا و سرمایہ داروں پر مشتمل ہے۔ مگر تاریخ سے واقف حضرات کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یورپ میں بھی عوام کی نمائندگی کبھی لارڈ ( ) اور بیرنوں (Barons) نے نہیں کی۔ پھر آج بیسویں صدی میں انسان کا ارتقائی ذہن اس فریب میں کیونکر آ سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے سرمایہ دار، حکومت پرست، رجعت پسند اور طبقاتی مفاد کو پیش نظر رکھنے پر مجبور امراء مسلم عوام کے حامی ہو سکتے ہیں!؟

غور کیا جائے تو ان کی ساری کشاکش اور کشمکش محض اس لئے ہے کہ عوام جاگ رہے ہیں وہ اس بیداری ہی سے تو خوف زدہ ہیں اُنھیں انقلاب کے قدموں کی چاپ سنائی دے گئی ہے یہ چاپ اس راہ سے آئی ہے جس پر کانگریس گامزن ہے انقلاب کے ہلکے سے پر تو نے انھیں پریشان کر دیا ہے دیوانہ کر دیا ہے اس لئے وہ کانگریس کا راستہ روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور سامراج سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں کیونکہ اس اتحاد میں اُن کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن وہ غلطی کرتے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ وہ اپنے طبقاتی مفاد کے نمائندے ہیں مسلمان اور اسلام کے نام پر اپنی حفاظت کرنے کے بجائے خود سامنے آکر انقلاب پر حملہ آور ہوں، ان ڈھالوں کو استعمال کرنا ان کے شایانِ شان نہیں

آیئے اب ذرا اس تحلیل سیاسی کا رشتہ اس نقشہ سے ملائیں جو مسلم لیگ نے بنایا ہے۔ یعنی ہندوستان کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم کر دینا۔

اس کی واضح مثال تاریخ میں دو صورتوں میں ملتی ہے۔ قدیم زمانوں میں رجواڑہ نظام ہیں اور اس کے بعد اُس طریقہ کا ہیں جس کی بنا پر شمالی ہندوستان میں السٹر بنائے گئے تھے۔

(۱) رجواڑہ سسٹم کے مآل کے متعلق ہندوستان کی تاریخ سیاہ ہے۔ یہی بنیادی خرابی تھی کہ ہندوستان کے رجواڑے ہمیشہ آپس میں حسد و رشک کا شکار رہے یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کے غلام ہو گئے۔ مرکز میں کسی مضبوط حکومت کا قیام ہی مستقل سلطنت اور پر امن سیاسی زندگی کا ضامن ہوا کرتا ہے۔ لیکن اگر اس نقشے پر ہندوستان کو تقسیم کیا جائے گا تو ان آزاد ہندو مسلم ریاستوں میں امن قائم رکھنے کی ذمہ داری کون لے گا ——!؟

ظاہر ہے برطانیہ! —— اور صرف برطانیہ!!

تو کیا ایک عاقبت اندیش قوم پرست بھی اپنی زندگی میں مسٹر جناح کی اس اسکیم کو برداشت کر سکتا ہے جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ برطانوی اثر و اقتدار کے قیام کو حق بجانب اور دوامی تسلیم کر کے ابدی توثیق کی مہر لگا دی جائے!؟

اگر یہ محض ایک سیاسی شرارت ہو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی متحدہ قومیت کی ناقابل تردید تشریح کا محض جواب تو خیر ورنہ معقول کہتا ہی:-

"دو قوموں کا نظریہ میری رائے میں لغو ہے۔ کیونکہ ہندو مسلمان دو علیحدہ قومیں نہیں ہو سکتیں جنھیں خدا نے ایک بنایا ہے انھیں انسان تقسیم نہیں کر سکتا۔" (گاندھی جی)

انسانی اعمال میں تضاد اور اختلاف ایک حد تک اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن جناب جناح کی کوئی اسکیم منطقی معیار پر صحیح نہیں اُترتی ایک طرف وہ کانگریس سے سمجھوتہ کرنے کے لئے مسلم لیگ کی واحد نمائندگی پر اصرار کرتے ہیں دوسری طرف وہ پاکستان میں ان ہندو اکثریت والے صوبوں کی مسلم اقلیت کی قطعی پروا نہیں کرتے "جو ظالم ہندو اکثریت" کے رحم و کرم پر ہوگی۔ کوئی ہے جو یہ بتائے کہ یہ کس قسم کی نمائندگی ہے!؟

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(۲) مسلم لیگ سے پہلے رام گڑھ کانگریس کے ۱۹۴۰ء اجلاس میں جو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی نمائندہ جماعت کے ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی ... امام الہند ابوالکلام آزاد نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسائل کے رُخ سے وہ تمام نقابات اُٹھا دیئے جو نگاہوں کے لئے دیوار بنے ہوئے تھے۔ اس خطبہ کا خطیب محض ایک محبِ وطن ہی نہیں حقیقی مسلمان بھی ہے۔ مولانا آزاد نے اسلامی مفاد کو پیش نظر رکھ کر ان تمام تاریخی حقائق کو بیان کیا جن پر نہایت بے ساختہ اور بیانات پروپگنڈے کی گرد جما دی گئی تھی۔

قطع نظر اس اعلیٰ ادبیت کے جو مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کی خصوصیت ہے خطبۂ صدارت سیاسی تدبر کی ایک یادگار دستاویز ہے۔

وقت کے اصل سوال کے عنوان سے کانگریس نے ۱۹۳۶ء میں اجلاس لکھنؤ میں بین الاقوامی صورت حال پر جو تجویز پاس کی تھی اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے بتایا ہے کہ ہندوستان اُس بین الاقوامی کشمکش سے آزاد نہیں ہے جس میں اس وقت یورپ اُلجھا ہوا ہے بلکہ اس کشمکش میں شریک ہے، متاثر ہوتا اور متاثر کرتا ہے۔

اس کے بعد یورپ کی ارتجاعی (Reactionary) تحریکوں فیسزم اور نازسی ازم پر تبصرہ کرتے ہوئے اِن تحریکوں کو دنیا کی ترقی اور امن کے لئے عالمگیر خطرہ سے تعبیر کیا ہے اور اس سے زیادہ خطرناک شے برطانوی سامراج کو ثابت کیا ہے جس کے بطن سے اصل میں یورپ کی یہ ارتجاعی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں۔ صدر کانگریس نے ان تحریکوں کے فروغ اور اس کے اسباب پر نہایت عالمانہ بحث کرتے ہوئے ان تجاویز کی طرف اشارہ کیا جو اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست ۱۹۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ اگر ہندوستان کو آزادی نہیں دی جاتی تو ہندوستان برطانیہ کی امداد کے لئے تیار نہیں ہے۔

مولانا آزاد نے آزادی کے ساتھ یہ ثابت کر دیا کہ یورپ کی جنگ اور فیشزم اور نازسی قوت کی ہمت افزائیوں کی عامل سوائے برطانیہ کے اور کوئی دوسری طاقت نہیں ہے

ظاہر ہے کہ جب یورپ میں ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ کا اعلان ہو گیا تو اس اعلان کے بارے میں ہندوستان کو اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرنا تھا۔ یہاں مولانا آزاد نے واضح طور پر جوان خون کے تقاضوں کا ذکر کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ کانگریس نے "وقت کے ان تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضا کر رہے تھے اپنے کانوں کو بند کر لیا" اور برطانیہ سے اس جنگ کے مقاصد دریافت کئے کہ آخر یہ لڑائی کیوں لڑی جاری ہے اور اگر یہ جمہوریت، انصاف اور دنیا کے امن کے لئے لڑائی جا رہی ہے تو اس کا اثر خود ہندوستان پر کیا پڑیگا۔

یہاں مولانا آزاد نے ورکنگ کمیٹی کے اعلان مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء اس کی تاریخی و سیاسی نوعیت اور حکومت برطانیہ کی طرف سے اس کو مسترد کر دینے کو نہایت منطقیانہ انداز میں بیان فرمایا۔ اس کے بعد خطبہ مندرجہ ذیل مطالب و مباحث پر مشتمل ہے۔

(۱) برطانوی حکومت کا جواب اور کانگریس کا پہلا قدم

(۲) ہم آج کہاں کھڑے ہیں

(۳) باہمی مفاہمت

(۴) ہندوستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں۔

(۵) ہندوستان کے مسلمان اور ہندوستان کا مستقبل

(۶) مسلمانان ہند کے لئے ایک بنیادی سوال

(۷) مسلمان اور متحدہ قومیت

خطبۂ صدارت کا نصف کے قریب دوسرے سیاسی مباحث، اور نصف کے قریب مسلمانوں کے مسائل کے متعلق ہے۔ شاید اس سے قبل کانگریس کے کسی صدر نے مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن پر اتنی گہری روشنی نہیں ڈالی۔

مولانا آزاد جو برِ اعظم ایشیا کے سب سے بڑے خطیب اور دنیائے اسلام کے عظیم ترین سیاسی مدبر و مفکر ہیں اپنے کلی تدبر اور تفکر کی تمام عظمتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ اس مقام پر نمودار ہوئے ہیں میں یہاں کسی مسلمان سیاست داں سے مولانا آزاد کا مقابلہ نہیں کروں گا کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ مسلمہ ہے کہ ابوالکلام ملکی اور بین الاقوامی سیاسی نباض ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی مفکر اور تاریخ عالم کے ماہر بھی ہیں اس لئے وہ کسی مدعی اور خود غلط لیڈر کی طرح اُن تاریخی حقائق کو ضبط نہیں کر سکتے جو اپنی جگہ مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے خطبۂ صدارت کا کلائمکس اُس مقام سے شروع ہوتا ہے جہاں اُنھوں نے لفظ "اقلیت" کی علمی تحلیل کی ہے اور مسلمانوں کو اقلیت تسلیم کرنے سے بالدلیل انکار کیا ہے۔

(دیکھئے اسی نمبر میں صفحہ ۲۷ کالم ۲ پر)

(باقی صفحہ)

اور اعداد و شمار دلائل و شواہد کے ذریعہ ثابت کردیا ہے کہ مسلمان اسی ملک میں بہ حیثیت اقلیت نہیں۔ خطبہ کے آخر میں مولانا آزاد نے نہایت ذی روح اور پُرجوش الفاظ میں اعلان فرمایا کہ "میں مسلمان ہوں اور اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اسکی حفاظت کروں"۔

یہ حصہ اپنی دلنوازی، جوش تاریخی تجزیہ، تدبر سیاسی اور مدلل ہونے کی حیثیت سے سیاسی ادبیات کا شاہکار ہے۔ اس حصہ میں مولانا نے متحدہ قومیت کو تاریخی نقطۂ نگاہ سے ثابت کیا ہے جسے کوئی شخص باطل کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اختتام پران چند الفاظ میں وہ پیغام اور راہِ عمل پوشیدہ ہے جو مسلمانوں کیلئے صحیح ترین شاہراہِ عمل ہوسکتی ہے:-

ہماری ایکہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں، علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے ایک ہونے کو وہ نہیں بنا دے سکتا ہمیں قدرت کے فیصلہ پر رضامند ہونا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔

آخر میں مولانا ابوالکلام نے، کامیابی کا دار و مدار تین چیزوں پر کیا اتحاد۔ ڈسپلن اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔

کوئی شک نہیں، کانگریس میں اندرونی خلفشار رہا اور اسے اس خلفشار کو مٹا کر مستقبل کیلئے خود کو تیار کرنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کانگریس نے مستقبل کیلئے آخر کیا فیصلہ کیا میں سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ جو کانگریس پر خاموشی اور بے عملی کا الزام لگاتے ہیں ذرا جلد بازی اور غلط فہمی سے کام لیتے ہیں۔ کانگریس ہر وقت حرکت میں ہے سوائے اس کے کہ اس نے سول نافرمانی کرنیکا فیصلہ نہیں کیا۔ اس نے آٹھ صوبوں میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو ناکام و معطل کردیا۔ کانگریس کے برسرِ حکومت ہو جانے کی وجہ سے جو تن آسانی قوم میں پیدا ہوگئی تھی وہ اسکو دور کرنیکی کوشش اور آگے بڑھنے کی تیاریوں میں ہمہ وقت مصروف ہے۔ وہ ملک کی موجودہ فضا کی نباض ہے اور ہوشیار پہلوان کی طرح اپنے داؤں کو سوچ رہی ہے بہرحال اسنے برطانیہ سے اخلاقی اور سیاسی تعاون قطعی طور پر ختم کردیا اور وہ ہرگز اب اس چیز پر قانع نہیں ہوسکتی جسے اُسنے ٹھکرادیا ہے۔ اگر آپ اسکا فیصلہ تلاش کرنا چاہتے ہیں تو آپکو آسانی سے معلوم ہو جائیگا کہ کانگریس نے مکمل آزادی سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹایا اور وہ کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کا قیام چاہتی ہے جسمیں ہندوستانی خود اپنا قانون وضع کریں اور اسکی بنیادوں پر ملک کو چلائیں یعنی مکمل آزادی کی راہ کو اور بھی پختہ تر کریں۔

(۳)

آپ جانتے ہیں کہ کانگریس کے اجلاس رام گڑھ کے بعد مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ رام گڑھ کی بلندی سے آزاد نے متحدہ قومیت کا نعرہ بلند کیا اور تاریخی شواہد و دلائل نیز زندگی کے روزانہ تجربوں کی روشنی میں ثابت کردیا کہ ہندو مسلمان ایک قوم ہیں۔

۵

اس کے جواب میں مسلم لیگ کے "قائدِ اعظم" نے دو قوموں کی تھیوری پیش کی اور تقسیم ہند کی ناقابلِ عمل تجویز پیش کی۔ کانگریس نے انتہائی نازک حالات کے باوجود اپنے تعمیری پروگرام کو ترک نہیں کیا بلکہ عمل کی تجدید کی۔ "قومی ہونے کیلئے ہاتھ پیر کھولنے اور کھڑے ہو جانے کی دعوت دی۔" لیکن مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نے ٹھیک اسوقت جب مسلمانوں کو جگا کر میدان میں لاکھڑا کردینا چاہیئے تھا۔ تقسیم ہند کی پیالی میں پاکستان کی افیون گھول کردی، تاکہ رہا سہا شعور بھی ختم ہو جائے۔ مسلم عوام جنھیں زندگی کے مصائب اور اقتصادی گراوٹ نے پیس دیا ہے۔ جن کے دماغوں کو روایتی مذہب کے کیڑے چاٹ گئے ہیں۔ جب یہ سنتے ہیں کہ ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست، کا قیام مسلم لیگ چاہتی ہے اُنکی عقیدت کا پوچھنا ہی کیا لیکن شاید مسٹر جناح کو اتنی شدید مایوسی بھی نہ ہوئی ہوگی جتنی پاکستان کی اسکیم کے سلسلے میں ہوئی ہے۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے اس اسکیم پر لعنت اور

ایشیا

نفریں کی بوچھار کی گئی - یہاں تک کہ حسرت موہانی یعنی خود مسلم لیگیوں کے نزدیک یہ اسکیم بے ....اغی کی دلیل تصور کی گئی -

(۴)

ٹھیک اسی ا....یاتی موقع پر ..بلی میں آزاد مسلم کانفرنس کا عظیم الشان اور نمائندہ اجلاس ہوا - سب سے پہلے اس کانفرنس کی تحریک مولانا نورالدین بہاری نے پیش کی جس کے متعلق ایک تائیدی بیان پریس کو دیتے ہوئے میں نے تجویز کیا تھا کہ اس کانفرنس کو محض "مسلم نیشنلسٹ کانفرنس" نہیں - بلکہ تمام اسلامی جماعتوں کی آل پارٹیز کانفرنس ہونا چاہیئے - تاکہ مسلم لیگ کی واحد نمائندگی کی حقیقت عوام پر آشکار ہوجائے -

یہ ایک ایسا نکتہ تھا جو واضعین کانفرنس کے پیشِ نظر رہا اور یہ کانفرنس مسلمانوں کی سات جماعتوں کی طرف سے منعقد ہوئی جس میں تمام ہندوستان کے قوم پرست مسلمان ایک شاندار تعداد میں شریک ہوئے -

آزاد مسلم کانفرنس کے اس عظیم الشان اجتماع نے مسلمانوں کی اُس رُوح کو آشکار کردیا جو سینوں میں دبی ہوئی تھی اور "غیر سنجیدگی" کے مقابلے میں جس کی نمائش کرنا دراصل اسکی توہین تھی - لیکن آپ جانتے ہیں کہ صبر و ضبط کی ایک حد ہوتی ہے - تقسیم ہند جیسی مہمل تجویز اور اغیار سے مسلم لیگ کے مسلسل پیمانِ وفا نے اُن دیوانوں کو میدانِ جنون میں آنے پر مجبور کر ہی دیا جو اپنی جگہ خاموش کام کررہے تھے -

جن سات مسلم جماعتوں نے اس کانفرنس کا انعقاد کیا ان جماعتوں نے "سنتِ موسوی" ادا کی اور جن افراد نے اس کو تاریخی یادگار اور سیاسی اجتماع کی حیثیت دی، انھوں نے مسلم لیگ کی آزادی کے مقابلے میں کار ابراہیمی کیا - بلاشک وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں -

تمام ہند نمائندگی کے لحاظ سے بیس سال کے بعد مسلمانوں کی یہ پہلی کانفرنس تھی جس میں ٹوٹی کوٹ سے لیکر صوبہ سرحد اور آسام سے بلوچستان کے محب وطن اور قوم پرست مسلمان شریک ہوئے تھے - مسلمانوں کی جماعتوں کے پندرہ سو نمائندے اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور ان نمائندوں نے ۲۰۰ افراد کی ایک سبجیکٹ کمیٹی وضع کی جس نے کامل احساس ذمہ داری اور سنجیدگی سے مسائل پر بحث و مباحثے سے رزولیشن پاس کئے جو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ہزار مسلمانوں کی عام تائید سے کانفرنس کے کھلے اجلاس میں متفقہ طور پر منظور ہوئے -

شیخ محمد جان صاحب ایم - ایل - اے کا استقبالیہ خطبۂ صدارت اپنے اختصار، مسائل پر صحیح سیاسی تنقید اور وقار کے لحاظ سے نہایت خوب تھا - شیخ صاحب خود مسلم لیگ میں تھے - لیکن آب و ہوا کی عدم موافقت نے آخران کو اپنی صحیح جگہ واپس کردیا -

اللہ بخش صاحب سابق وزیراعظم سندھ کا خطبۂ صدارت جو کامل دو گھنٹہ تک کانفرنس میں پڑھا گیا: سیاسی ادب میں اپنی خاص جگہ رکھتا ہے؛ جس میں مسائل حاضرہ، سیاسی آئیڈل، ہندو مسلم سمجھوتہ، کانگریس اور مسلم لیگ کے سمجھوتوں اور پاکستان کی اسکیم کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی تھی -

پاکستان کی اسکیم پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے صدر کانفرنس نے نہایت صحیح نکتہ بیان فرمایا :-

ہم ہندوستانی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اس ملک کی چپہ چپہ زمین اور اس کی تمام مادی و تمدنی نعمتوں کے پورے مالک ہیں اور تو اور شعر و ادب میں ہم سب ایک دوسرے کے شریک ہیں"
ہندوستان ایک نہ تقسیم ہونیوالی جغرافیائی وحدت ہے اور اسمیں یہاں کے سب باسیوں کا برابر کا حصہ ہے"

صدرِ کانفرنس نے اپنے خطبہ میں پُرزور الفاظ میں چیلنج کیا کہ اسکی نمائندگی کا امتحان اسوقت ہوگا جب لیگ اپنے لاہور والے رزولیشن کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرے اور اس ایک مسئلہ پر از سر نو انتخاب لڑا جائے -

اقتصادی اور سیاسی طور پر جو ممکن دلائل و حقائق ہوسکتے ہیں وہ پاکستان کے خلاف صاحب صدر کے بسیط خطبہ میں پوری قوت کیساتھ موجود ہیں اور ان کی موجودگی میں کسی عاقل و فہیم انسان کیلئے اسکیم میں کوئی جان و اعتماد باقی نہیں رہ جاتا - آئندہ اشاعت میں ہم اس خطبہ کو تمام و کمال ایشیا میں شائع کرینگے -

بہرحال کانفرنس میں جو مفید تجاویز پاس ہوئیں وہ قوم کے اجتماعی مفاد کی محافظ ہیں - مگر ذاتی طور پر میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ "تحفظات" کی کوئی حیثیت نہیں - کسی قوم کی اجتماعی سیاسی قوت سب سے بڑا تحفظ ہوا کرتی ہے - اگر مسلمانوں نے آزاد ہندوستان میں اپنی اجتماعی ... قوت کو منضبط

نہ کیا اور وہ مجموعی طور پر طاقتور نہ بے توان تحفظات ... کی حیثیت ردی کے ٹکڑوں سے ہرگز زیادہ نہ ہوگی! اسی طرح جداگانہ طریقہ انتخاب کی موجودگی میں ہرگز متحدہ قومیت کا تخیل وسیع نہیں ہوسکتا۔ لیکن بہرحال کیونکہ تقریباً ستر ہزار مسلمانوں کی رائے عامہ سے یہ رزولیوشن پاس ہوئے اس لئے یقیناً یہ قوم کا صحیح مطالبہ ہیں اور فی الحال ہمیں اس مطالبہ کی تکمیل کرنی ہے۔

بہرحال اس کانفرنس نے، برطانیہ اور مسلم لیگ دونوں کو بتادیا کہ مسلم عوام ہندوستان کی آزادی کے اسی طرح خواہشمند ہیں جس طرح کانگریس اور ہندوستان کی دوسری قومیں اور پاکستان کی اسکیم کو قطعی ناقابل عمل اور ہذیانِ محض یقین کرتے ہیں؛ انکی ساری جدوجہد ایک متحدہ ہندوستان کیلئے ہے۔ اور وہ ہندوستان میں ایک ایسی جمہوری حکومت چاہتے ہیں جس کا نظام ایک کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی کے ذریعہ خود ہندوستان کی قومیں سر جوڑ کر وضع کریں؛

یہی نہیں، بلکہ مسلمانوں کی اس عظیم الشان نمائندہ کانفرنس نے مسلم لیگ کی واحد نمائندگی کے جھوٹے دعوی کو کانگریس اور برطانیہ دونوں کی نگاہوں میں ببانگِ دہل باطل کردیا۔ اور اب اسکا کوئی امکان نہیں ہے کہ لیگ اس دعوی کو دوبارہ دہرانے کی جرأت کر سکے؛

لیکن بہرحال میرے خیال میں کانفرنس کا کام ختم نہیں ہوگیا کانفرنس نے ۲۰ ۔آدمیوں کا جو بورڈ بنایا ہے اسکے ناموں کا اعلان جلد از جلد ہونا چاہیئے بورڈ کے ارکان کو جلد از جلد اپنا کام شروع کردینا چاہیئے۔

کانفرنس کے دستور العمل کو ایک مستقل نظام کی حیثیت دے کر تمام ہندوستان میں جاری اور قائم کردینا چاہیئے۔

مسلمانوں کو اپنے مقام کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہے۔ اب انکا فرض ہے کہ وہ مذہب، وطن اور اپنی ترقی و آزادی کیلئے خاموش و پُرامن جہاد کیلئے تیار ہوجائیں؛

آپ نے غور کیا، پہلا فیصلہ ٹھیک اس وقت جب حکومت نے ہندوستان کے فرقہ پرستانہ اختلاف سے فائدہ اٹھاکر قومی مطالبہ کو ٹھکرادیا کانگریس نے کیا اور وہ یہ تھا کہ برطانیہ کو ہندوستان کا حق آزادی تسلیم کرنا چاہیئے اور ہندوستانیوں کو کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی کے ذریعہ خود اپنا آئین بنانیکا حق دینا چاہیئے۔

دوسرا فیصلہ مسلم لیگ نے کیا، کہ ہندو مسلمان دو قومیں ہیں، او ہندوستان کو مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں تقسیم کردینا چاہیئے۔

تیسرا فیصلہ آزاد مسلم کانفرنس نے کیا کہ مسلمان آزادی کے مطالبہ میں ہرگز کسی سے پیچھے نہیں ہیں، وہ ایسی مکمل آزادی چاہتے ہیں جس میں ان کے مذہبی، ملی اور سیاسی حقوق محفوظ ہوں، اور وہ ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے بلکہ وہ ایسا ایک جمہوری اور وفاقی نظام چاہتے ہیں جس میں صوبہ جاتی خود مختاری کے ساتھ مرکزی حکومت کا تخیل بھی موجود ہو۔ وہ کانگریس کے اس فیصلے سے قطعی متفق ہیں کہ ایک کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی بلائی جائے اور ہندوستانی قومیں خود اپنا آئین وضع کریں۔

آخر میں میں فیصلوں کی معقولیت کے متعلق کچھ عرض نہیں کرتا۔ آپ خود ہی خدا لگتی کہیں کہ آپ کا دماغ و دل کس فیصلے کو قبول کرتا ہے!؟

غلامی و منافرت، تقسیم و جنگ کو یا آزادی، محبت، اتحاد و ملاپ کو!؟!

ساغر

ڈنمارک

تاریخ اپنے ورق برابر لوٹ رہی ہے۔ یورپ کی بین الاقوامی بساط پر چھوٹے چھوٹے مہرے برابر پٹ رہے ہیں۔ ڈنمارک بھی جرمنی میں شامل ہوگیا۔ جنگ کے شعلے تیزی کیساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ خونریزی۔ قتل۔ غارتگری کا بازار گرم ہے۔ باوجود جدوجہد کے چھوٹے چھوٹے ممالک جرمنی کے قبضہ میں آتے جارہے ہیں۔ اسٹریا۔ زیکوسلاویکیا۔ پولینڈ۔ ڈنمارک یہ سب حال ہی کے صید زبوں ہیں۔

آیئے ڈنمارک کی مختصر تاریخ آپ کو سنائیں۔

۵ نومبر ۱۹۳۵ء کو جو مردم شماری ہوئی تھی اس کے لحاظ سے ڈنمارک کا رقبہ ۱۶,۵۷۵ مربع میل ہے اور آبادی ۳,۷۰۶,۳۴۹ ہے۔ فاروکے جزیرے کا رقبہ ۵۴۰ مربع میل ہے اور آبادی ۲۵,۷۴۴ ہے۔ یہاں کے ....

ایشیا

بادشاہ کرسچین دہم (Christian X) ۲۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۱۴ مئی ۱۹۱۲ء کو تخت پر بیٹھے تھے ۱۸۶۳ء میں جب سونڈاسٹرڈیسن (Sund Estridsen) کے شاہی خاندان کا آخری مرد وارث مرگیا تو تخت کیلئے کرسچین اوّل کاؤنٹ آف اولڈنبرگ کا انتخاب ہوا اور اس خاندان میں شاہی چار سو سال سے زیادہ مدت تک رہی حالانکہ ۱۶۶۰ء تک تاج وتخت کے سلسلہ میں وراثت کا سوال طے نہیں ہوا تھا۔

۱۵ نومبر ۱۸۶۳ء یعنی بادشاہ فریڈرک ہفتم کے زمانہ سے خاندان اولڈنبرگ کے مرد وارثوں کو تخت سے محروم کردیا گیا۔ چونکہ ڈنمارک اپنی اہمیت کے لحاظ سے بین الاقوامی شہرت رکھتا تھا اور ڈنمارک کی شاہی وراثت کے معاملہ کو طے کرنا تمام یورپین اقوام کے مفاد سے متعلق تھا اسلئے ۸ مئی ۱۸۵۲ء کو لندن میں ایک صلحنامہ مرتب ہوا جسکی رو سے ڈنمارک کا تخت شہزادہ کرسچین کو دیدیا گیا اور شہزادی لوئس سے اسکی شادی کرادی گئی اور یہ بھی طے ہوگیا کہ اب شاہی تخت وتاج اسی خاندان میں رہیگا۔

۳۱ جولائی ۱۸۵۳ء کو شاہی تخت وتاج کی وراثت کے سلسلہ میں ایک باقاعدہ قانون بنایا گیا جس پر ڈنمارک کے شاہی خاندان کی منظوری لی گئی۔

ڈنمارک کا موجودہ نظام حکومت ۵ جون ۱۹۱۵ء کے گرنڈلو (Grundlov af 5 June 1915) سے لیا گیا ہے جس میں ۱۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کی ترمیم بھی شامل کرلی گئی تھی۔ موجودہ قانون کے ماتحت آئین سازی کے اختیارات بادشاہ اور "رگسڈیگ ڈیٹ" "Rigsdag Deet" کے ہاتھ میں تھے۔ انتظامی اختیارات بادشاہ کے ہاتھ میں تھے جو وزراء کے ذریعہ ان کا استعمال کرتا تھا۔ جوڈیشل طاقت عدالتوں کے ہاتھ میں تھی۔ بادشاہ کیلئے یہ ضروری تھا کہ وہ ایونجینیکل لوتھران چرچ (Evangelical Lutheran Church) کا ممبر بھی ہو۔ یہ گرجا تمام سلطنت کا واحد سرکاری گرجا تھا۔" رگسڈیگ کے مشورے بغیر بادشاہ کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ جنگ کا اعلان کرے یا کسی صلحنامہ پر دستخط کردے۔ رگسڈیگ (Rigsdag) دو جماعتوں سے ملکر بنی ہے۔ فاکٹنگ (Folketing) جسے دارالعوام بھی کہا جاسکتا ہے اور لینڈاسٹنگ (Landsting) جسے دارالخواص کہہ سکتے ہیں۔ رائے دہندہ بننے کیلئے مرد ہو یا عورت مگر اسکی عمر کم از کم پچیس (۲۵) سال ہونیکی شرط ہے اور اسکا کوئی مستقر ضرور ہو۔ دارالعوام

میں ۱۴۹ ممبر تھے ۱۱۷ ممبروں کا انتخاب ۲۳ ضلعوں سے حسب تناسب آبادی کیا جاتا تھا۔ ۴ نومبر ۱۹۳۵ء کو جو ایگزیکیٹو جماعت مقرر کی گئی تھی جس کا صدر خود بادشاہ تھا اسکا نام اسٹیٹ سراڈیٹ (Statsradet) تھا۔ جسے اسٹیٹ کونسل بھی کہا جاسکتا ہے۔ وزراء اپنے کام کا اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے ذمہ دار ہوتے تھے اور اگر ان سے کوئی غلطی یا جرم سرزد ہوجائے تو بغیر فاکٹنگ (Folketing) کی منظوری کے انھیں معاف نہیں کیا جاسکتا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء کو جو دارالخواص (Landsting) کا انتخاب ہوا تھا اسمیں ۳۱ سوشلسٹ ۲۲ رلبرل۔ ۱۵ اکنزرویٹو، ریڈیکل اور ایک انڈیپینڈنٹ تھے ۱۹۲۰ء میں سلیسوگ (Slesvig) کے حصے بھی ڈنمارک میں شامل ہوگئے تھے۔ اور وہاں والوں نے صلحنامہ وارسلیز مورخہ ۲۸ جون ۱۹۱۹ء (عملدرآمد ۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء) کے سلسلہ میں پلیبسائٹ (Plebiscite) پر ڈنمارک کیلئے ووٹ دیے تھے۔ شمالی زون (Northern Zone) نے ۱۰ فروری ۱۹۲۰ء کو رائے دی ۷۵۴۳۱ ووٹ ڈنمارک کے حق میں اور ۲۵۳۲۹ ووٹ جرمنی کے حق میں ڈالے جنوبی زون (Southern Zone) نے ۱۴ مارچ ۱۹۲۰ء میں رائے دی ۱۲۸۰۰ ووٹ ڈنمارک کو اور ۵۱۷۲۴ جرمنی کو دیے۔ نئے سلسوگ علاقہ جات ۹ جولائی ۱۹۲۰ء کو ڈنمارک میں شامل کئے گئے اور سرکاری طور پر ان کا نام ساؤنڈر جائلڈ کی لینڈس ڈیل (Sönderjydskelandsdele) جنھیں ساؤتھ جٹلینڈ پراونسز (South Jutland provinces) بھی کہا جاتا ہے رکھا گیا انتظامی معاملات کے سلسلہ میں ڈنمارک کو ۲۴ حلقوں میں تقسیم ہے۔ ہر حلقہ کا انتظام ایک گورنر کے سپرد ہے۔ فوج اور بحری طاقت کا انتظام وزیر مدافعت (Minister of Defence) کے سپرد ہے۔ ڈنمارک کی فوج ایک قومی فوج ہے۔ سوائے جزیرۂ فارو اور گرین لینڈ کے باشندوں کے ڈنمارک کا ہر تندرست انسان فوج اور بحری بیڑے میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں کم لوگوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے حتیٰ کہ گرجا کے پادری بھی فوج میں داخل ہوتے ہیں۔ ہر سال جو رنگروٹ فوجی تربیت کیلئے بلائے جاتے ہیں انکی تعداد ۶۸۰۰ ہوتی ہے۔ انکی تربیت ڈویژنوں (Divisions) میں تقسیم کرکے کیجاتی ہے۔ ہوائی طاقت کے سلسلہ میں ۶۵ ہوائی جہاز ہیں ۳۹-۱۹۳۸ء کا فوجی بجٹ ۴۳۹

ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی جہاز ہیں اور کچھ تیار کئے جارہے ہیں بحری طاقت میں ۳۵ ہوائی جہاز بھی شامل ہیں اسکے علاوہ ساحل کی حفاظت کیلئے بہت سے قلعے بھی ہیں۔ جہاز رانی اور دیگر بحری خدمات کی تربیت کی مدت تقریباً ایکسال ہے اور حفاظت ساحل کی تربیت ۱۳۵ دن میں دیجاتی ہے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء کا بحری طاقت کا بجٹ ..... ۲۹۱ کروڑ (Kroner) تھا

ہندوستان کا سچّا دوست

شاید اس زمانہ میں مسٹر سی ایف ۔ اینڈریوز مرحوم کی ایک ایسی شخصیت تھی جو باوجود انگریز ہونے کے ہندوستان میں بہت ہردلعزیز تھے" ۔ یہ ہے وہ تبصرہ جو ہمعصر ہندوستان ٹائمز نے مسٹر اینڈریوز کی موت پر ان کی زندگی کے متعلق کیا ہے اور جو مختصر الفاظ میں نہایت صداقت کیساتھ مرحوم اینڈریوز کی زندگی کے ایک بڑے حصہ کا خلاصہ ہے ۔

مسٹر اینڈریوز کی زندگی کو ہند اور اہل ہند سے کس قدر گہرا تعلق تھا اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کی دائمی مفارقت پر اظہار رنج و افسوس کیا جا رہا ہے ۔

جس ہستی کے متعلق گاندھی جی کی یہ رائے ہو ۔

مسٹر اینڈریوز کی موت سے صرف ہندوستان ہی کو صدمہ نہیں پہونچا بلکہ عالم انسانیت نے اپنا ایک سچّا فرزند اور خادم کھو دیا ۔"

ٹیگور کا یہ خیال ہو کہ

" وہ ہمارا بہترین دوست تھا "

پنڈت جواہر لال یہ کہیں :۔

" ہمیں یقین نہیں آتا کہ وہ عظیم شخصیت جو دوستی اور نیک نیتی کا مجسمہ تھی اب ہم میں نہیں ہے ۔ اُن کے خیال کیساتھ ساتھ ہزاروں ایسی تصویریں آتی ہیں جن سے ان کی اس محنت و جانفشانی کا اندازہ ہوتا ہے جو انھوں نے انسانی مصیبتوں اور تکلیفوں کو مٹانے کیلئے کیں ۔ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہندوستانی ان کو اپنا ایک ایسا دوست سمجھتے تھے جس نے کبھی ان کی کسی اپیل کا نفی میں جواب نہیں دیا ۔"

مسٹر کنزرو یہ بیان دیں :۔

" یوں تو وہ دنیا کے تمام مظلوم و مجبور انسانوں کا دوست تھا ۔ مگر ہندوستان کے رہنے والوں کیساتھ اس کی ہمدردیاں مخصوص تھیں ۔

راجندر بابو اظہار رائے کریں کہ

" ہندوستان کے معاملات میں مسٹر اینڈریوز کی رائے مستند تھی کیونکہ وہ ہندوستان کی مشکلات اور پریشانیوں سے خوب اچھی طرح واقف بھی تھے اور ان سے محبت بھی کرتے تھے "

پھر ایسی ہستی کی جدائی پر ہندوستان کے رہنے والے جس قدر شدید رنج و غم کا اظہار کریں کم ہے ۔

مسٹر اینڈریوز کی موت پر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی اسی طرح اظہار افسوس کیا جا رہا ہے ۔ " ڈیلی ٹیلیگراف "، "ٹائمز" اور تمام دوسرے برطانوی اور غیر برطانوی اخبارات نے مرحوم کی زندگی کے خاص خاص حالات اور ان کی بہترین صفات کی داستانیں شائع کی ہیں ۔

مسٹر اینڈریوز نے اپنی زندگی کے آخری چھتیس ۳۶ سال مسلسل ہندوستان کی خدمت میں گذارے ۔ وہ ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے تھے ۔ برمنگھم اور کیمبرج میں تعلیم پائی ۔ ۱۸۹۶ء میں پیمبروک کالج مشن کے افسر اعلیٰ ہوئے ۱۹۰۴ء میں "کیمبرج برادری" میں شامل ہوئے ۔ اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں پروفیسر ہو گئے ۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کے فیلو ہوئے ۔ تقریباً نو سال کے بعد آپ کی زندگی میں انقلاب ہوا ۔ ڈاکٹر ٹیگور کے کالج "شانتی نکیتن" کے ممبر ہوئے اور اسی زمانہ سے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں حصہ لینا شروع کیا کئی سال جنوبی افریقہ رہے اور یہیں سے مہاتما گاندھی کے ساتھ ان کی دوستی کا آغاز ہوا جو ان کی ساری زندگی قائم رہا ۔ آپ ہندی اقوام کے مسائل کو حل کرانے کے لئے برٹش گائنا، مشرقی افریقہ، "فجی" وغیرہ بھی گئے آپ نے اپنی عمر کا آخری حصہ "شانتی نکیتن" میں گذارا اور وہیں سے ۲۰ر جنوری کو آپریشن کیلئے کلکتہ آئے تھے ۔ ہسپتال میں آپ کے ملنے والوں کا ایک ہجوم

رہتا تھا۔ مرنے سے تقریباً دو ہفتہ قبل آپ کا دوسرا آپریشن ہوا تھا۔ آخری ایام میں مسٹر مہادیو ڈیسائی (جن کو گاندھی جی نے آپ کی خدمت میں بھیجدیا تھا) اور ڈاکٹر ٹیگور کے صاحبزادے اور ان کی بیوی آپ کے پاس موجود تھیں۔

زندگی سے مایوس ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنا ایک آخری بیان بھی دیا۔

"مسٹر اینڈریوز ایک عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی موت عالمِ انسانیت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ وہ ہندوستان کے سچے دوست تھے۔ سچے اور مستقل"!

آج ہر طرف وطن دشمنی کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ کپوت ہندوستان کے حصے بخرے کر دینا چاہتے ہیں۔ اغیار مادرِ وطن کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دینا چاہتے ہیں۔

غداری، ملک دشمنی بالفاظِ دیگر بے غیرتی کا ایک طوفان ہے۔

اس وقت ہمارے ہاتھوں سے اینڈریوز جیسے سچے اور مستقل دوست کو موت کا چھین لینا ہماری سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔

وطن کا سچا پجاری

ملک ایک بالکل نئے انقلاب سے قریب ہو رہا ہے۔ کہنگی، جدت، ضعیفی شباب اور بے شوری، شعور میں تبدیل ہو رہی ہے۔ جب کسی قوم کی رگ و پے میں زندگی اس طرح سرایت کرتی ہے اس قوم کا تمام نظامِ عصبی متاثر ہو جاتا ہے۔

یہی تو بات ہے ورنہ قوم کے ان بیکار اور فرسودہ، مفلوج اور دقیانوسی اعضا میں جنھیں رجعت پسند حلقوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیوں حرارت پیدا ہوتی!؟ یہ ہے روحِ انقلاب کی کارفرمائی! اس نے مُردوں میں جان ڈالدی سوتوں کو جگادیا، لوگوں کو متحرک کر دیا، اور زندگی کے نام نہاد جمے ہوئے ذرّوں کو اٹھا کر ہمسرِ آفتاب ہونیکا دعویٰ دار بنا دیا! رجعت پسند مسلمان احرار کے منہ آنے لگے، اور انقلاب کے بطن سے پیدا ہو کر انقلاب ہی کیخلاف سانپ کے سے خم ٹھونکنے لگے!؟ ہر طرف وطن دشمنی کا اک شور بلند کیا گیا۔ یہ کوئی قابلِ توجہ حقیقت نہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ شور، متوجہ ضرور کرتا ہے؛ مشکوک بھی کرتا ہے، اور شک کبھی کبھی کمزوروں کے پاؤں راہِ مستقیم سے ڈگمگا دیتا ہے لیکن سیٹھ یعقوب حسن جو ہندوستان کے سچے پجاری تھے، ایک حقیقی مسلمان اور مضبوط و مستقل انسان تھے۔ جنھوں نے ہندوستان کے غداروں کی طرف توجہ نہیں کی اور ساری زندگی ایک مضبوط کیرکٹر محبِ وطن کی طرح گذار دی۔

تحریکِ خلافت، اور اس کے بعد ہر تحریکِ آزادی میں ان کی قربانیاں مانی ہوئی حقیقتیں ہیں؛ جب مادرِ وطن کے سپوتوں کی فہرست مرتب کی جائیگی؛ سیٹھ یعقوب حسن کا مقدس نام جلی حروف میں تحریر کیا جائیگا۔ تاریخِ وطن، اپنے دیوانوں کو کہیں نظر انداز کر سکتی ہے۔

وہ مدراس کی کانگریسی وزارت کے رکن منتخب ہوئے۔ لیکن وزیر ہونا یعقوب کی گرامی ذات کو بلند نہیں کرتا یا انکی قومی خدمات کا کوئی بدل بھی نہیں تھا ان کی رفعت اور بلندی، انکا مضبوط قومی کیرکٹر تھا۔ صداقت اور حریت کیساتھ وفاداری تھی، انھوں نے جہادِ قومی میں جان دیدی اور وہ معاہدہ نہیں توڑا جو صداقت اور آزادی سے کیا تھا!

یہ عظیم الشان کیرکٹر ان کا ورثہ ہے۔ اپنے اخلاف کے لئے، اور شاید یہی ان کی ابدی یادگار بھی ہے۔

مرگِ اکبر

پروفیسر محمد اکبر خاں اکبر حیدری جو دہلی کے ایک مشہور ادیب اور خوشگو شاعر تھے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو انتقال فرما گئے۔ (تاریخ ولادت ۳۱ اگست [illegible])

کسی شخص کی موت اور زندگی بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اگر اس شخص کی ہستی کا کوئی خاص عکس سماج پر نہیں پڑتا! زندگی کا سونا ہمیشہ ماحول کی کسوٹی پر کسا جاتا رہا اور آج بھی کسی انسان کی زندگی اور موت پر مسرت اور رنج کے اظہار کا معیار، مجلسی مفاد کی بنیادوں ہی پر قائم ہے

اکبر حیدری نے اپنی زندگی اپنے دست و بازو سے پیدا کی اور جس قدر مادی ترقی کی وہ کلیتہً اپنی جد و جہد کے ذریعہ۔ اکبر نے شعر و ادب کو کبھی عزت کا ذریعہ نہیں بنایا، اور نہ معاش کا۔ معاش اور ادب کے مابین ان کی زندگی بلندسے بلند ہوئی۔ وہ فوج میں زبانِ اردو کے استاد تھے۔ اس سلسلے

ہیں انھوں نے کئی مفید کتابیں لکھیں ۔ انگریزوں کو اُردو سکھانیوالی یہ کامیاب وآسان کتابیں ان کی کامیابی کا راز تھیں ۔

اردو نثر میں ان کا طرز نیم مزاحی تھا ۔ اور ان کی نظم جدت و قدامت کا ایک موزوں امتزاج تھی ۔ باوجود اس کے کہ شعر و ادب کے ذوق میں وہ بالکل گم نہیں ہوئے تاہم انھوں نے اپنی ایک جگہ پیدا کرنی شروع کر دی تھی اور دہلی کے مشہور اور خوشگو شعرا میں ان کا شمار ہوتا تھا ؛

بہ حیثیت انسان وہ ایک اصولی آدمی تھے ؛ خوش مزاج اور دوستوں کے دوست ، ان کا تصور ، بلند قہقہوں اور ہنستی ہوئی آنکھوں ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے ۔

نظم میں ان کا ایک خوبصورت مجموعہ " روحِ جذبات " کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ نثر میں بھی متعدد کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں ۔ میں خیال کرتا ہوں ۔۔۳ صفحات کی نظمیں اور غزلیں وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں ؛ جو یقیناً پہلے مجموعہ کی نظموں سے بلند ہیں ۔

فنِ شعر میں وہ حکیم آزاد انصاری کے شاگرد تھے ؛ آخر میں متعلقین کو تلقینِ صبر اور جوارِ رحمت کی دعا ، دونوں باتیں انتہائی غلط اور بے روح ہیں ، اس لئے کہ ہمارے کہنے سے زخمی دلوں کو چین آ سکتا ہے اور نہ جوارِ رحمت کی گارنٹی مل سکتی ہے ۔ مگر ہاں ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اکبر حیدری کی ادبی کاوشوں کو آپ تک پہنچائیں اور ان کو محفوظ کریں ۔ سو ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ نمبر میں ہم ان کے وہ چند خاص خطوط شائع کریں گے جو انھوں نے ساغر نظامی کے نام مختلف اوقات میں تحریر کئے ۔ اور ان کا کچھ آخرِ عمر کا کلام مع سوانح حیات کے تاکہ وقت پر تاریخ ادب میں اس سے کوئی مدد لی جا سکے ۔

حضرتِ آغا شاعر قزلباش دہلوی

آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم کا تصور کرتے ہی تصور میں قہقہہ اور گرم جوانی اور ضعیفی اور کمال و زوال کی تصویر کھینچ جاتی ہے ۔

آغا صاحب کی جوانی ، انتہائی عیش و نشاط میں بسر ہوئی اور اسی عہد میں انکی شاعری کا سکہ سارے ملک میں جاری ہو گیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تمام ملک پر " داغ اسکول " کے اثرات چھائے ہوئے تھے ؛ اور " داغ اسکول " پیداوار تھا ۔ سماج کے گرتے ہوئے

اخلاق کی ، شاعری ، عیش پرستی ، ہوسکاری اور بازاریت ان اربع عناصر سے اس وقت کے ادب کی ترکیب ہوئی تھی ؛ جس شاعر میں یہ چاروں صفات نہیں ہوتی تھیں کامل تصور نہیں کیا جاتا تھا ؛

اس کے بعد زمانہ نے اپنا چولا بدلا ، اور غالب و اقبال کی مقبولیت نے سوسائٹی میں ایک سنجیدہ شعر و ادب کا تخیل پیدا کیا ۔ آغا صاحب کو بھی پیری نے آگھیرا جہاں قہقہے بلند ہوتے تھے ، وہاں مرثیہ پڑھا جانے لگا ۔ جہاں رنگ اچھلتا تھا وہاں خاک اڑنے لگی ؛ جو ہستی جوانی کا مجسمہ تھی ، وہ سر تا بقدم شیب بن گئی ؛ اور جو آنکھیں موتیوں سے لبریز معلوم ہوتی تھیں اُن میں آنسو ڈبڈبا آئے ۔

لیکن آغا شاعر کے کمالِ شاعری میں کوئی کمی نہ آئی ، وہ اس وقت سے پہلے اپنا کام ختم کر چکے تھے ۔ وہ ہندوستان کے نہایت بانکے سخنور تھے ؛ اور قدیم اندازِ شاعری کو نئے زمانہ میں بھی برقرار رکھنے کے مدعی ۔ ان کا ادعا غلط نہیں تھا ، ان کے کلام میں شاعری کا جوہر موجود تھا ۔ وہ ایک آئینہ تھے جس میں قدامت کا جوہر جھلکتا تھا ؛

ان کی وضع قطع ، انکا اندازِ گفتگو ، ان کی وضعداری اور خلوص ، اگلے زمانوں کی یاد دلاتی تھی ؛

11

قدیم اردو شاعری اور مرزائی اسلوبِ بیان کے وہ ماہر اور مسلم الثبوت استاد تھے ؛ قرآنِ کریم کا منظوم ترجمہ بھی آغا صاحب نے کیا تھا جو شائع نہیں ہو سکا ؛ اس کے علاوہ اُن کے کئی دیوان بھی غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں جن کے متعلق اردو دان طبقے رہ الفاظ دیگر مسلمانوں سے) یہ اپیل کرنا کہ ان دیوانوں کا انتخاب شائع کرنے کے انتظامات کرنے چاہئیں ؛ ایک شدید حماقت کا ارتکاب کرنا ہے ؛

کیونکہ جس قوم نے جیتے جی آغا شاعر کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے دیا کوئی خبر نہ لی ، اُس کو شاعر کے مرجانے کے بعد ایسی کیا پڑی ہے کہ اس کے دیوان شائع کردے ۔ پھر وہ معروف بھی بہت زیادہ ہے ، " مسلم انڈیا " کی تعمیر اس کے پیشِ نظر ہے ؛ جہاں اُردو کی کوئی گنجائش کیوں ہونے لگی ؛ ایک ٹکڑے کی زبان سندھی ، پشتو ، پنجابی (ترین بولی اسلامی) ، ہو گی اور ایک حصہ کی زبان " اسلامی بنگالی " ۔ یہ نہیں تو شاید قائدِ اعظم کی مادری زبان کی رعایت سے " انگریزی اسلامی زبان " ہو ؛ رہے ہندو ، اور ان کا کفرستان ، سو الحمد آغا شاعر

اور اس کی شاعری سے مطلب ! ؟

ان حالات میں میں صرف آغا شاعر کی روح کے حضور میں ہدیۂ احترام ہی پیش کرنے پر اکتفا کروں گا ۔ مجھے ہرگز جرأت نہیں کہ میں مسلمانوں سے ان کے دیوان کی اشاعت کیلئے کوئی اپیل کروں ۔

ہاں ان کے صاحبزادوں کو چاہیئے کہ وہ جد و جہد کریں اور آغا صاحب کی زندہ یادگار بنیں ، کیونکہ ان سے زیادہ کوئی بہتر یادگار آغا صاحب کی ہو نہیں سکتی !

پاکستان

شاید بے دماغی کی اتنی مجنونانہ مثال تاریخ نے کبھی پیش نہ کی ہوگی جو مسلم لیگ نے اجلاس لاہور میں "پاکستان" کی فرسودہ، تفرقہ انداز، غلامی پرست، حب الوطنی کے خلاف اور غیر قیاسی تحریک پر مہر تصدیق ثبت کرکے پیش کی ہے ۔

آیئے ذرا آپ کو "پاکستان" کے ماخذ اور آغاز کی داستان سرسری طور پر سنا دیں :-

سپین میں اسلامی حکومت کے اختتام پر یورپ نے مسلمانوں سے جو کچھ روحانی اور ذہنی فیوض حاصل کئے تھے ان کو چودہویں اور پندرہویں صدی میں احیاء العلوم یا نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے ذریعہ تمام یورپ میں پھیلایا اور ترقی دی ۔ جدید شاہراہیں معلوم کرکے یورپ نے اسلام کے نظام ریاست کا قلع قمع کر دیا اور اس نقطہ سے نہ صرف اسلامی ریاست کا انحطاط شروع ہوا بلکہ اسلامی دماغ اور قوتِ فکر بھی مائل بہ انحطاط ہوتی چلی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی مادی اور ذہنی ترقی کی نسبت سے اسلامی ریاست اور ذہن کا تنزل بھی ہوتا چلا گیا ۔

بالآخر انیسویں صدی کے اواخر میں بعض ایسی ہستیاں نمودار ہوئیں جنھوں نے اسلام کی حقیقی اسپرٹ کو ردِ ایتی مذہب سے جدا کرکے زمانہ کے تقاضوں اور وقت کے حالات کے مطابق پیش کرنا ضروری سمجھا ۔ ان مفکرین کے سلسلے میں ایک نمایاں شخصیت جمال الدین افغانی کی تھی جن کا ذہن ایک طرف اسلام کی اس لچک سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو اپنے اندر بدلے ہوئے حالات میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور دوسری طرف یورپ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور اسلامی دنیا کو ایک رشتہ میں پرونے کی خاطر وہ ایک "عالمگیر اسلامی وفاق" پیدا کرنا چاہتے تھے ۔

اس جگہ تفصیلات کی گنجائش نہیں لیکن تاریخ کا مسلسل مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جمال الدین افغانی کی تحریک نے اسلامی دنیا میں ان جدید نظریوں کے ماتحت غور و فکر کرنے کے جذبات کو تو ابھارا ، لیکن مرکزی اسلامی ریاست کے "قیام کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی !

ترکی کے ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں نوجوان پارٹی کے ترک مدبرین پین اسلام ازم کا خیال لیکر خلافتِ عثمانیہ کے ماتحت اسلام کا ایک روحانی اور مادی مرکز قائم کرنا چاہتے تھے لیکن جنگِ عظیم نے پرانی دنیا کے تمام نظام کی کایا پلٹ کر دی اور کمال اتاترک نے یہ محسوس کر لیا کہ کوئی ریاست موجودہ دور میں مذہبی بنیادوں پر قائم نہیں کی جا سکتی ؛ چنانچہ خلافت کی تحریک ناکام ہوئی اور اس کی جگہ شدید قوم پرستی نے لے لی ۔ آج اگر اسلامی دنیا کی تمام ریاستوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ سمجھنے میں ایک لحہ بھی نہیں لگے گا کہ مراکش سے عراق تک کم و بیش چھ ریاستیں کرورعربوں کی آبادی اتحادِ عرب کے بے پناہ جذبے سے متاثر ہے ؛ ترکوں نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ترکی قوم کی ریاست بنا ڈالی ۔ رضا شاہ پہلوی نے نہ صرف ایران کو ایک قومی حکومت عطا کی بلکہ کلچر اور زبان میں سے تمام غیر ملکی عناصر ایک ایک کرکے نکال باہر کئے ۔ افغانستان میں جغرافیائی حدود قائم کئے گئے اور آج افغان قوم کا ایک علیحدہ قومی حلقہ بن گیا ہے ۔

جمال الدین افغانی کی تحریک کے اثرات ہندوستان تک بھی پہونچے

اور اگرچہ اس سے قبل کئی مرتبہ یہ کوشش کی گئی تھی کہ مسلمانوں کا کوئی سیاسی حلقہ
ہندوستان میں بنایا جائے لیکن وہی لوگ[لہ] جو اس میں پیش پیش تھے ۔ بالآخر
اس کو ایک سعی لاحاصل سمجھ کر قوم پرستی کی طرف رجوع ہو گئے ۔ تاہم ڈاکٹر
محمد اقبال کے ذہن نے اس تحریک کے عکس کو قبول کیا اور انھوں نے "پاکستان"
کا نظریہ بغیر دلیل اور کسی لائحہ عمل کے ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا ۔ اقبال
ایک فلسفی تھا اور اسلام کو ایک سوسائٹی خیال کرتا تھا، وہ مفکر تھا کوئی عملی سیاست
داں نہ تھا ۔ اس نے کبھی اس مسئلہ کے عملی پہلو پر غور نہیں کیا اور نہ یہ سمجھنے یا
سمجھانے کی کوشش کی کہ عرب، ترک، ایرانی، افغانی قوموں کی جداگانہ حیثیتوں
کو ملحوظ رکھتے ہوئے پاکستان کی تحریک کیا معنیٰ رکھ سکتی ہے ؟!

ظاہر ہے کہ اس کو ایک "پنجابیوں کی تحریک" کہا جا سکتا ہے جسے
اقبال کے بعد ملک برکت علی وغیرہ نے اپنے طور پر پیش کیا ۔

حال ہی میں اس تحریک کو بظاہر علمی روپ دے کر دکن سے ڈاکٹر عبداللطیف
نے "ہندوستان کا تہذیبی مستقبل" کے نام سے پیش کیا جس پر ملک میں کافی نکتہ
چینی کی گئی اور جس کے متعلق ایشیا دسمبر ۱۹۳۹ء کے مشترک نمبر میں سید محمد یحییٰ صاحب
میرٹھی نے بھی ایک نہایت مدلل مقالہ تحریر فرمایا اور بتایا کہ تقسیم ملک اور انتقالِ
آبادی کا یہ تخیل قومیت متحدہ اور مسلمانوں کے اعلیٰ مفاد کے قطعی منافی ہے ۔

ذیل میں اس مقالہ کا آخری حصہ درج کیا جاتا ہے ۔

> ہندوستان صدیوں سے ایک قسم کی اقتصادی وحدت
> قائم کرتا چلا آیا ہے ۔ مسلم حکمرانوں نے اس وحدت کو اور
> بھی استوار کیا اور یہ "مشترک اقتصادی شعور" اب اس
> درجہ وسیع اور گہرا ہو چکا ہے کہ اسے تہذیبی تقسیم کے ذریعہ
> شکست نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لئے ہندوستان میں واحد
> قومیت کی تشکیل ارتقائی سلسلہ کی ایک ضروری کڑی ہو
> جو ہو کر رہے گی ۔ بدگمانیاں اور تہذیب و کلچر کا شور
> صرف ایک محدود حلقہ میں گونج رہا ہے ۔ کسان اور
> مزدور جو ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ہنوز بالکل
> گونگے اور بہرے ہیں ۔ جس وقت انھیں یہ علم ہو جائیگا
> کہ کس طرح مذہب اور کلچر کا نام لیکر ان کے مفادات
> کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو انتشار پیدا کرنے
> والے تمام عناصر کو ایک ایک کر کے قومی جسم سے نکال
> باہر کردیں گے ۔ اور ہندو مسلم ملاپ کی گتھی چشم زدن
> میں سلجھ جائے گی ۔ چوٹی پر بیٹھے ہوئے سیاسی بازی
> گروں کے دلوں میں بدگمانیاں ہیں تو ہوا کریں لیکن
> فیکٹریوں کے مزدوروں اور گاؤں کے سیدھے
> سادے دہقانیوں میں اب بھی ملاپ ہے اور کوئی
> بدگمانی نہیں ۔ ہندوستان میں آج کل جو ہلچل ہے
> اس کے اسباب پر ایمانداری سے غور کرنا چاہیے ۔
> سوال یہ ہے کہ یہ ہلچل پیدا کرانے والے کون لوگ ہیں !
> ظاہر ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو برسر اقتدار
> رہنا چاہتا ہے اور جسے یہ خیال ہے کہ اگر متحدہ قومیت
> قائم ہو گئی تو ان جیسی ذہنیت کے انسانوں کو اس
> بلندی سے نیچے اترنا پڑے گا جہاں وہ اس وقت
> براجمان ہیں ۔ جو لوگ فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات
> کا جھنڈا اڑائے پھرتے ہیں ۔ ان کی ذہنیت کچھ طبقاتی
> مفاد سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ انگریزی راج کے
> برکات کا نتیجہ ہے ۔ ورنہ "قومیت" کی تشکیل دور
> حاضر کی ایک موجود حقیقت ہے اور ہیئت اجتماعیہ
> کے ارتقاء کی ایک ضروری کڑی ہے ۔ قومیت کا نتیجہ
> "شہری حقوق" کی آزادی ہے اور شہری حقوق قریب
> قریب سب کے یکساں ہوتے ہیں ۔ آزادی ضمیر،
> شخصی قانون کا تحفظ اور اسی قسم کے دیگر مسائل "قومیت"
> کے مبادیات میں شامل ہیں اور ہندوستان کا کوئی
> دستور انھیں نظرانداز نہیں کر سکتا ۔ اگر غلامی کی حالت
> میں عبادات اور معاشری قوانین میں ایک غیر ملکی
> حکومت دست انداز نہیں ہوئی اور ہندو و مسلمان
> مسجدوں اور مندروں میں آزادی کیساتھ عبادت

لہ شیخ الہندؒ عبیداللہ سندھی وغیرہم

کرتے ہیں۔ نیز معاشرتی معاملات میں اپنے اپنے مذاہب کے احکام کے مطابق عمل کرنے کی انہیں آزادی حاصل ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک قومی جمہوری حکومت کے ماتحت یہ آزادی کس مصلحت کی بنا پر واپس کرلی جائے گی۔ کیا ہندو اس بات کو پسند کرسکتے ہیں اور اگر پسند بھی کریں تو کیا وہ حکومت کو ایک لمحہ کیلئے چلا سکتے ہیں جب کہ ہندوستان کے نو کروڑ باشندے تلملاتے رہیں کوئی قوم اتنی بیوقوف نہیں ہوسکتی کہ وہ قومیت کی تشکیل کی خواہشمند بھی ہو اور ساتھ ہی اس قومیت کے ایک زبردست حصہ کو بےچین رکھے۔ بدگمانی ایک مصنوعی اور عارضی بات ہے اور قومی حکومت ہی اس کا علاج ہے۔ یہ بڑا زبردست فریب ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے میں ضم ہوئے بغیر متحدہ قومیت کی بنا نہیں ڈال سکتے۔ چین اور یوگوسلاویہ میں مسلمان کسی دوسرے مذہب میں ضم نہیں ہوئے لیکن قومیت متحدہ کے ارکان ہیں۔ فلسطین، شام، عراق اور مصر کے عیسائیوں نے اپنے مذاہب کو خیرباد نہیں کیا اور اس کے باوجود وہ قومیت متحدہ میں شامل ہیں۔ یہ تمام نظائر اور حقائق اس بات کے سمجھنے کیلئے کافی ہیں کہ قومیت متحدہ محض مذہب کی یکسانیت کی محتاج نہیں ہے۔ ان ممالک کے تمام عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی تہذیب اور بقول فاضل مصنف (ڈاکٹر عبداللطیف) کے ان کا "اخلاقی شعور" یقیناً مذہبی روایات کے زیر اثر ہے لیکن باینہمہ ان کا "وطنی یا قومی شعور" اتنا ہی قوی ہے جتنا کہ مذہب سے پیدا شدہ "اخلاقی شعور"

(ایشیا نمبر ۱۹۳۰ء)

سید محمد یحییٰ نے اپنے مقالہ میں نہایت واضح دلائل کے ساتھ ہندوستان کے تہذیبی مستقبل کو ناقابل عمل قرار دیا تھا۔ اور اس قسم کے ہر تخیل کے متعلق وضاحت کیساتھ بتادیا تھا کہ اس قسم کی تحریکوں کا پہلا اور آخری مقصد محض یہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کبھی آزاد نہ ہو اور برطانوی سامراج ابدی طور پر جونک کی طرح ہندوستان کے عظیم الشان پیکر سے چمٹا رہے۔

آپ کو اپنے حافظہ پر زور دے کر یہ بھی یاد کرنا چاہیئے کہ مسلم لیگ نے خود ڈاکٹر عبداللطیف کی اس اسکیم کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

اب مسلم لیگ کے اجلاس لاہور ۱۹۴۰ء میں "پاکستان" کی جس شکل کو ریزولیشن کے ذریعہ پاس کیا گیا ہے وہ دراصل ڈاکٹر عبداللطیف کی اسکیم سے بھی زیادہ ناقص اور ناقابل عمل ہے۔ ایک ناقص ترین اسکیم کو مسلمانوں کے سیاسی مطالبہ کے طور پر پیش کرکے مسٹر جناح نے اپنی وطن دشمنی پر مہر توثیق ثبت کردی ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسٹر جناح ڈکٹیٹرشپ کے راستہ پر چلنا سیاسی سعادتمندی خیال کرتے ہیں، جس طرح ڈکٹیٹر اپنے ملک کو ایک لمحہ کیلئے غور و فکر کا موقع نہیں دیتا اور مسلمات کے قطعی خلاف ایک نہ ایک پھلجھڑی چھوڑتا رہتا ہے۔ اسی طرح مسٹر جناح کو بھی سیاسی پھلجھڑیاں چھوڑنے میں مہارت تامہ حاصل ہوگئی ہے۔ اس آتشبازی سے ان کا مقصد قوم کو بہلانا ہے تاکہ نگاہیں پھلجھڑی کے فریب میں الجھ کر رہ جائیں مگر مسلمان ان چنگاریوں سے بے خبر رہیں جو ان کے خرمن کو پھونکے ڈال رہی ہیں۔

مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے اعمال کا اگر جائزہ لیا جائے تو سوائے ایک مسلسل بے معنی اور غیر سنجیدہ تضادات کے اور کچھ نہیں مل سکیگا۔

اوّل اوّل انہوں نے نظریۂ جمہوریت سے انکار کیا، اس کے بعد کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی کی مخالفت کی اور اب وہ "مسلم انڈیا" قائم کرنا چاہتے ہیں۔ "قائداعظم" کی یہ بازیگرانہ قیادت اپنی مثال آپ ہی ہے۔

اصل راز یہ ہے کہ مسلم لیگ اور اسکے لیڈر کے پیش نظر کوئی پروگرام نہیں سوائے اس مقصد کے کہ وہ قومی ارتقا کی بڑھتی ہوئی موج کی مخالفت کریں۔ اور مسلمانوں کی توجہات کو آزادی کی جدوجہد سے ہٹا کر مہمل اور بے معنی باتوں میں الجھائے رکھیں۔

سب سے پہلے مسلم لیگ نے Full Independence "پوری آزادی" کو منزل مقصود بنایا اور کانگریس کی طرح دوسرے لفظوں میں کامل آزادی

کی دعوی دار بنی لیکن اس نے کبھی پوری آزادی کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا اور نہ اس سلسلے میں کوئی پروگرام ملک کے سامنے پیش کیا جب تک کانگریسی حکومتیں تھیں اس وقت تک اس کی پہلی اور آخری "پوری آزادی" ان حکومتوں کی مخالفت اور ہر جائز و ناجائز، شریفانہ اور غیر شریفانہ طریقہ سے ان کا انہدام و مخالفت تھی۔ اور جب از خود کانگریس نے "صوبوں میں سیاسی جمود پیدا کر دیا" مسٹر جناح کے سیاسی کھیل کے لئے بساط پر کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ برطانیہ سے ٹکر کھانے کی صلاحیت قدرتی طور پر ان کو ودیعت نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ سب سے پہلے ہندوستانی ہیں جن کے متعلق تاریخ کا فیصلہ نہایت گھناؤنا ہوگا اور ان کی تصویر کے نیچے لکھا جائیگا:

"وہ شخص جس نے ممکن طور پر ہندوستان کی آزادی کو ناممکن بنایا"

بہر حال ایک اُس خالی الذہن مقرر کی طرح جسے اسٹیج پر صرف اپنی نمائش مقصود ہوتی ہے۔ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے "پاکستان" کا خیال پیش کیا ہے جو سراسر مسخرہ ہے: اور جس کا اس جمہوری ملک میں کوئی مستقبل نہیں

"پاکستان" کی وجہ تسمیہ

"پاکستان" کی ترکیب حرفی ہی میں زہریلے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس لفظ کے ترکیب دینے والے کا دماغ مذہبی عصبیت سے لبریز ہے۔ وہ "پاکستان" کے علاوہ باقی کو ناپاک قرار دیتا ہے: اس طرح وہ نام ہی میں ہندوستانی قوم کے دلوں میں نفرت انگیزی کا بیج بوتا ہے؛ اور اپنے تصور میں اس قسم کی ایک ریاست قائم کر کے مسلمانوں کو اُس عہدِ جاہلیت کی طرف واپس لیجانا چاہتا ہے جب "مفروضہ پاکی" کی بنا پر "کفار" کی لوٹ مار اور مالِ غنیمت میں عورتوں تک کو لونڈیاں بنا لینے کا حق منجانب اللہ تصور کیا جاتا تھا؛ گویا جو شخص "پاکستان" کا نقشہ خیال میں مرتب کرتا ہے: وہ "کفرستان" پر حملہ کرنا اس کے افراد کو لوٹنا اور قتل کرنا اور پھر کفرستان کی حدود کو پاکستان میں شامل کرنے کا سفیہانہ اور ذلیل خواب بھی دیکھتا ہے۔

یہ نام وضع کرنے والا اُس اعلیٰ انسانیت اور مجد و شرف کا دشمن ہے جس کی رو سے بنی نوعِ انسان کو زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کا حق حاصل ہے۔

زندگی کے اجتماعی تجربوں کی بنا پر آج مجھے یہ کہنے میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ بظاہر "پاکستان" کی تحریک اسلام اور مسلمانوں کے نام پر پیش کی گئی ہے لیکن اسکے پس منظر میں رجعت پسند پنجابی مسلمانوں" کی ذہنی خود غرضی کارفرما ہے جن کے پیشِ نظر نہ اسلامی اخوت ہے اور نہ عالمگیر اتحادِ اسلامی، بلکہ وہ حقیقتاً زندگی میں نہایت محدود "وطنیت" کے قائل ہیں اور "پنجاب پنجابیوں" کے لئے ان کا روحانی اور وطنی تقاضہ ہے۔

سر سکندر، جناح، فضل الحق، راجہ محمود آباد، خلیق الزماں اور گنتی کے چند مسلمانوں کو ایک میز پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر اس فریب میں مت آؤ کہ یہ سب ایک اسلامی رشتہ میں بندھ کر اسلامی اخوت کیلئے کوئی ہار گوندھ رہے ہیں بلکہ جغرافیائی اور نفسیاتی طور پر بنگالی، سرحدی، پنجابی، آسامی اور سندھی مسلمان کا مزاج دیکھو؛ اور اندازہ کرو کہ کیا واقعی یہ کسی وقت اقلیت والے صوبوں کی مسلم آبادی کو اپنی اسلامی اخوت کی پناہ میں لے سکتے ہیں ـــ!؟

یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے کہ تجارتی، معاشرتی اور مزاجی طور پر مختلف صوبوں کی مسلم آبادی میں شدید دوری اور بعد موجود ہے ....

....

....

....

.... بنگالی سوا ابھی گذشتہ زمانے میں جب بنگال میں اردو زبان کی ترویج کا سوال اٹھا تو بنگال کے شاعرِ اعظم قاضی نذر الاسلام نے اسکی سخت مخالفت کی:

حیدر آباد میں غیر حیدر آبادی سے اقتصادیات کی بنا پر نفرت کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اور باقی کا بھی ایسا ہی حال ہے۔

....

....

ان حالات میں ہم سوائے اس کے کیا خیال کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی تحریک دراصل پنجاب کے طبقۂ بالادست کی خواہش حکومت کے علاوہ اور کچھ نہیں آیئے اب اس مسئلہ کو خود مسٹر جناح کی .... تشریح کی روشنی میں دیکھیں:-

ان کی رائے ہے کہ :-

اسلامی ریاستوں میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی تقریباً ۶ کروڑ ہو گی (جو فی نفسہٖ تصدیق طلب ہے) خود مختار ہندو ریاستوں میں مسلم اقلیت تین کروڑ ہوگی۔ در بہ حساب مسٹر جناح، ۶ کروڑ کے فائدہ کے مقابلے میں ۳ کروڑ کو قربان ہو جانا چاہیئے۔"

کیا وعجیب بات ہے کہ تقسیم ملک کی تحریک پیش کر کے ایک فتنۂ عظیم اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن ناسور ناسور ہی رہتا ہے، یعنی پاکستان کی اسکیم میں اقلیت کے مسئلہ کا کوئی حل موجود نہیں۔

مسلم نیشنلس - - - - - - ، کی حیثیت سے ہندو خود مختار ریاستوں میں جو اقلیت ہو گی اس کے تحفظ کی کیا تدبیر اور ضمانت ہو گی۔ اگر مسلم نیشنلس کے تحفظ کی ضمانت خود مختار مسلم ریاستوں کے قشونِ قاہرہ ہوں گے اور ہندو نیشنلس کے تحفظ کی ضمانت ہندو خود مختار ریاستوں کی فوجیں، تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ ملک ابدی طور پر خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائیگا اور ایسی خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائیگا جس کی نظیر یورپ میں بھی نہیں ملیگی۔

دوسرا نکتہ یہ ہے جو سب سے بڑے اعتراض کی حیثیت رکھتا ہے کہ صوبۂ سرحد و سندھ کی مالیات مرکزی حکومت کی رہونِ منت ہیں۔ ۶۰ لاکھ روپیہ کی امداد ان صوبوں کو مرکزی حکومت سے ملتی ہے! خود مختار مسلم ریاست ہونے کی حیثیت میں اس امداد کا جاری رہنا ضروری نہیں۔ پھر یہ خود مختار مسلم ریاستیں اپنا کام کیوں کر چلا سکیں گی!؟

اس کے علاوہ بیرونی حملوں سے محفوظ رہنے کیلئے فوجی استحکامات کے سلسلے میں جو روپیہ خرچ ہو گا اس کا کیا بندوبست ہوگا۔ آج شمالی مغربی سرحد کے استحکامات پر جس قدر روپیہ صرف کیا جا رہا ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ تمام پاکستان کے ہر چہار جانب کی سرحدوں کو لازمی طور پر محفوظ کرنا پڑیگا۔ انکی حفاظت کیلئے جدید فوج بنانے اور فوجی استحکامات کیلئے کہاں سے روپیہ آئیگا!؟

اگر ہندو خود مختار ریاستوں میں پاکستان کے حکمراں مسلم اقلیت کو محفوظ و مامون رکھنا اسلامی فرض خیال کرینگے (جس کی امید نہیں)، تو حلقۂ پنجاب میں ۴۴ فیصدی غیر مسلم اقلیت کو کس قسم کے حقوق دیے جائیں گے۔ اور حقوق دینے کے بعد مسلم ریاست کس حد تک مسلم ریاست ہو گی!؟

اسی طرح بنگال میں ۴۶ فیصدی غیر مسلم اقلیت کا کیا انتظام کیا جائیگا جب کہ آسام کے ملا دینے کے بعد ہندو اکثریت اور بھی بڑھ جائیگی شمالی مغربی مسلم انڈیا کی سرحدوں پر روس افغانستان اور ایران ہوں گے، اس خوش اعتقادی کو کیوں فرض کیا جائے کہ یہ طاقتیں مسلم انڈیا پر حملہ آور نہ ہوں گی۔ وہ کونسی اخلاقی ضمانت اور مسٹر جناح کے قشونِ قاہرہ ہوں گے جن سے لرزہ بر اندام ہو کر روس اس علاقہ پر چھاپہ مارنے سے احتراز کر لیگا۔!؟

بہت ممکن ہے کہ علامہ مشرقی مسٹر جناح کی اسی طرح پشت پناہی کریں جس طرح ۔۴۰ جانوں کے ضائع ہو جانے کے بعد سکندر گورنمنٹ کے مفاد کی خاطر مسٹر جناح نے خاکساروں کو دبا دیا!

لیکن حلقۂ بنگال میں خود مختار مسلم ریاست کے لئے بڑی دقت پیش آئیگی یہاں جاپان کے حملوں سے محفوظ رہنے کیلئے زبردست بحری قوت رکھنی پڑے گی۔ میں نہایت ادب کیساتھ عرض کروں گا کہ :-

اس بحری بیڑہ کیلئے مسٹر جناح کا ۶۰ لاکھ روپیہ قطعی ناکافی ہے۔ غرض کہ پاکستان کی تحریک جس قدر بے دلیل، نامعقول اور احمقانہ ہے اس سے قبل کوئی ایسی تحریک پیش نہیں ہوئی اور ہمیں مسرت ہے کہ ملک اور خاص کر مسلمانوں میں اسدرجہ سیاسی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ ہر حلقہ کی طرف سے اس تحریک کو مسترد کیا جا رہا ہے۔ یہ ناقابلِ تقسیم متحدہ قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے! ملک کو کاٹتی چیرتی ہے، دو قومیں بناتی ہے! عقل و قیاس کے خلاف ہے! وحدتِ قومی کے منافی ہے اور مادرِ وطن کے پیکر پر ایک وحشیانہ حملہ ہے۔ کوئی صحیح الدماغ مسلمان اسکو ایک لمحہ کیلئے برداشت نہیں کر سکتا، اور جہاں تک ہندو قوم کا تعلق ہے مسٹر جناح کو کیونکر معلوم ہوا کہ اتنی وطن کش تحریک کو ہندو ٹھنڈے دل سے منظور کریں گے، ہندو ہی نہیں، ہم مسلمان کبھی اس زہریلے پودے کو نخل نہیں بننے دینگے: ہندو مسلمان سکھ پارسی، عیسائی یعنی ہندوستان کی جملہ اقوام متحدہ آواز کے ساتھ لیگ کے اس احمقانہ تصور کی مخالفت کر رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ تا آنکہ اسکو فنا کی گود میں دفن نہ کر دیں!

حیرت ہے کہ مسلم لیگ برطانوی سامراج کی موجودگی میں "مسلم انڈیا" کا خواب دیکھتی ہے، جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

ساغر نظامی



امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد صدر انڈین نیشنل کانگریس

خطبۂ صدارت

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد صدر انڈین نیشنل کانگریس

منعقدہ رام گڈھ مارچ ۱۹۴۰ء

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ قوموں کی جدوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اسقدر تیز کردی ہے کہ اب وقت کے پرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک، بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور کا تھا اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گذرے۔

ہم ہر منزل میں ٹھہرے مگر رُکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہتے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گذرا ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے نہ چل سکے ہوں۔ لیکن آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دیگا۔

۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھایئے اور سامنے کی طرف دیکھئے نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے بلکہ خود منزل بھی دور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے، ہماری جد و جہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے وہاں طرح طرح کی نئی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کردی ہیں اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گذر رہا ہے۔

ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش اُن کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزلِ مقصود سے بالکل نزدیک کر دے اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں اُلجھا دے۔ ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے جس بھروسہ کا اظہار کیا ہے وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسا ہے جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزت ہے اس لئے بہت بڑی ذمہ داری ہے میں اس عزت کیلئے شکرگذار ہوں اور ذمہ داری کے لئے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کیساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

وقت کا اصلی سوال

اب میں سمجھتا ہوں مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال

پر آ جانا چاہیئے۔

ہمارے لئے وقت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلانِ جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اسوقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟

غالباً کانگریس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقطے کا یہ ایک نیا رنگ تھا کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں یوروپ کی بین الاقوامی (انٹرنیشنل) صورتِ حال پر ایک لمبی تجویز منظور کرکے اس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کردیا اور اس کے بعد سے وہ کانگریس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا۔

سب سے پہلی بات جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورتِ حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں بلکہ اس سے باہر کی دُنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانہ کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کردیا ہے۔ اور فکر و عمل کی لہریں ایک گوشے میں ابھر کر اس تیزی کیساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کرتی ہیں، کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چاردیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے کہ باہر کے حالات ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا جس نے اس فیصلہ کی شکل اختیار کی ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشزم اور نازی ازم کی جو ارتجاعی (Reactionary) اکسٹری تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں، ہندوستان انھیں دنیا کی ترقی اور امن کے لئے ایک عالمگیر خطرہ تصوّر کرتا ہے اور اس کا دل و دماغ ان قوموں کیساتھ ہے جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کررہی ہیں۔

لیکن جب فیشی ازم اور نازی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جارہا تھا تو ہمارے لئے ناممکن تھا کہ ہم اس پرانے خطرے کو بھلادیتے جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لئے مہلک ثابت ہوچکا ہے اور جس نے فی الحقیقت ان نئی ارتجاعی (Reactionary) تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم ان نئی ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اس لئے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کھولدی کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کرلی تو ہندوستان جو اپنے آزاد ارادے اور آزاد پسند سے محروم کردیا گیا ہے۔ اس میں کوئی حصہ نہیں لے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے جبکہ اُسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازی ازم اور فیشی ازم سے بیزار ہے مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے۔

اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی (Traditional) خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے اور ہندوستان کسی حال میں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کیلئے مدد دے۔

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔ یہ تجویزیں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ سے لیکر اگست ۱۹۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور ہیں۔

کانگریس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہوگئی۔

اب میں اس موقعہ پر ایک لمحہ کیلئے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا۔ اور درخواست کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھئے۔ پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے۔

برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے

سر جبراً تھوپا اور حسبِ معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اُس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اُس نے کچھ عرصے کیلئے دم لینے کا ارادہ کیا اور اس پر آمادہ ہوگئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کیساتھ کام کر رہی تھیں اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جا سکتا ہے قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورتِ حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمن سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنیوالی قوموں کے ساتھ تھیں۔ اور صورتِ حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت (Mentality) میں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی (Diplomacy) ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت ضرور محسوس کرے گی کہ اس موقع پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے اور ہندوستان کو ایسا محسوس کرنیکا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب و ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برطانوی حکومت کا طرزِ عمل کیسا رہا۔

تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے۔ اُس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کر لیا اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو لڑائی میں اس کے شامل ہو جانیکا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنیکا ایک موقعہ دے دیا جائے جنھیں خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرنے کیلئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے!

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کینیڈا۔ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ۔ جنوبی افریقہ۔ آئرلینڈ۔ سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون سازی مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا۔ اور اُس کے اُس فیصلے پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ویلرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک آلسٹر (Ulster) کا سوال قابلِ اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا۔ وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ اُسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کا درجہ (Status) ملنے والا ہے۔ اس کی ہستی کا کیوں کر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح کہ اُسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی ہونے والی لڑائی میں اچانک دھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اُسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔

19 { صرف یہی ایک واقعہ اس کے لئے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اُس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں، ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم اُسے اور زیادہ نزدیک سے اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے!

سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سلگی تھی اس لئے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر یادش بخیر، پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکتے دنیا کے سامنے آئے اور ان کا جو کچھ حشر ہوا دنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورتِ حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتحمندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِّ عمل (Reaction) شروع ہو جائے۔ وہ شروع ہوا۔ اس نے اٹلی میں فیسزم اور جرمنی میں نازیزم کا روپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت (Dictatorship) دنیا کے امن

ایضاً

اور آزادی کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دنیا کے سامنے آکھڑی ہوئیں ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی۔ دوسری ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کو آگے بڑھانے والی، اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہوگیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لئے فسشٹ اٹلی اور نازی جرمنی سے کہیں زیادہ سوویٹ روس کی ہستی ناقابلِ برداشت تھی اور جو اُسے برطانی سامراج کے لئے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھیں، تین برس تک اس منظر کا تماشہ دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ اور نازی قوتوں کی جرأتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابے سنیا۔ اسپین۔ آسٹریا، چیکوسلاواکیا اور البانیا کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹ گئیں اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے انھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنے انتہائی شکل میں اُٹھ آیا اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہوگئی۔ اُسے لڑائی کے میدان میں اُتر نا پڑا۔ کیونکہ اگر اب نہ اترتی تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہیت کیلئے ناقابلِ برداشت ہوجاتی۔ اب چھوٹی قوتوں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ جمہوریت آزادی اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لے لی۔ اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی ۳ ستمبر کا اعلان جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دنیا کی ان تمام بے چین روحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہورہی تھیں ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دیئے!

کانگرس کا مطالبہ

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا اور ۸ ستمبر کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی تاکہ صورتِ حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقعہ پر کیا کیا؟ کانگرس کے وہ تمام اعلان اُس کے سامنے تھے جو ۱۹۲۷ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلان جنگ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا وہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کیا جاسکتا تھا اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کردیتی جو اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اُس نے پوری احتیاط کیساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اُس نے وقت کے اُن تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضہ کررہے تھے اپنے کانوں کو بند کرلیا۔ اُس نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کرکے وہ قدم اٹھایا جسے آج ہندوستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے کہ اس صورتِ حال میں اُس کے لئے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اُس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کردیئے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھدے جس پر نہ صرف ہندوستان کا بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔

اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جارہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی المناکی (Tragedy)، کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا ہے جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے اور یہ واقعی اس لئے لڑی جارہی ہے کہ آزادی، جمہوریت، اور امن کے ایک نئے نظم (order) سے دنیا کو آشنا کیا جائے تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبہ کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے کہ خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبہ کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا اور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ شائع ہوگیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی ملکی سیاسی تاریخ میں اپنے لئے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا تو مجھے یقین ہے میں آنیوالے مورخ سے کوئی بیجا توقع نہیں کررہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت (Reason) کا ایک سادہ مگر ناقابلِ رد نوشتہ (Document) ہے جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کرسکتا ہے اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس[25] برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں، جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکی ہیں، مبتلا کی گئی اور صرف اس لئے مبتلا کی گئی تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے۔ کمزور قوموں

کی آزادی، امن کی ضمانت، خود اختیاری فیصلہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ ہتھیاروں کی حدبندی، بین الاقوامی پنچایت کا قیام یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں سلگائی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی۔ ہر جلوہ خواب و خیال ثابت ہوا!
آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ کیا معقولیت (Reason) اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہو جانا چاہیئے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کرسکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اسکا کیا اثر پڑے گا۔

برطانوی حکومت کا جواب اور کانگرس کا پہلا قدم

کانگرس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلے کیلئے پہلی کڑی وائسرائے ہند کا وہ اعلان سمجھنا چاہیے جو ۱۷ اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومت ہند کے سرکاری علم و ادب کے الجھے ہوئے انداز اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے۔ صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی اسقدر بتانے پر مشکل آمادہ ہوتا ہے۔ کہ لڑائی کے مقصد کیلئے برطانوی وزیراعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیئے۔ جو صرف یورپ کے امن اور بین الاقوامی (Inter national) رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے
جہاں تک ہندوستان کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا، آج بھی وہی پالیسی اسکے سامنے ہے اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔
۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا اور ۲۲ کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی اور بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہونچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اُسے مطمئن نہیں کرسکتا، اور اب اُسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کر دینا چاہیئے جو اسوقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا جو فیصلہ کمیٹی نے کیا، وہ اُسکی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے۔
"ان حالات میں کمیٹی کے لیئے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کرلے۔ کمیٹی کانگرس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں"
چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفیٰ دیدیا۔ یہ تو اس سلسلہ کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرکے کہاں تک پہونچتا ہے؟
وائسرائے ہند کا ایک کمیونکے جو ۵ فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی ہی کا بیان جو انھوں نے ۶ فروری کو شائع کیا، اسکی آخری کڑی سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔
برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندوستان جلد سے جلد وقت میں جو صورتِ حال کے لحاظ سے ممکن ہو، برطانوی نو آبادیوں کا درجہ حاصل کرلے، اور درمیانی زمانے کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کیلئے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے۔ اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرسکتا ہے دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندوستان کے لئے خود اختیاری فیصلے ( ) کا حق تسلیم نہیں کرسکتی۔
حقیقت کی ایک چھوت (Touch) سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہوگیا؟ پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہی ہیں، وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں،

مگر جونہی ہندوستان نے یہ سوال اٹھایا، حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آ جانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ اس لڑائی کا مقصد ہے۔ مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہیئے کہ امید کی نگاہ اٹھائیں۔

مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے۔ اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انھوں نے ہمارے لئے برطانوی حکومت کے صاف طرزِ عمل کیساتھ صاف قول بھی بہم پہونچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دُنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں۔

"ہماری لڑائی اس لئے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کریں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آئندہ اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی۔"

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقعہ پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانوی نہیں ہے۔ بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اُس عام ذہنیت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جو تقریباً دو صدیوں سے دُنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انسان کے انفرادی اور جماعتی آزادی کے جس قدر اصول قبول کئے گئے، ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کیلئے خاص سمجھا گیا۔ اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جا سکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اسقدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں، اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنھیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ آ رہا ہے۔ وہ انسانی حقوق کے لئے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔ ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم نے جب اعلان جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے، اور ہندوستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی سنہ [illegible]ء اور سنہ ۱۹[illegible]ء میں کیا رہ چکی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ سنہ ۱۹۳۹ء کی اس دُنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے، ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے؟ اُس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟

ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی اپنے سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی ہے۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہشمند ہے کہ ہندوستان جہاں تک جلد ممکن ہو نوآبادیات (Dominions) کا درجہ حاصل کر لے۔ ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وہ اس کی "بہت زیادہ خواہشمند ہے"۔ مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لئے یہ سوال بنیاد کی اصلی اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے۔ ہمارے لئے صورتِ حال بالکل واضح ہو گئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتحمندیوں کے لئے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لئے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اسکے مقابل سمت جا رہی ہے۔

ہم آج کہاں کھڑے ہیں ؟

اب ہم اس جگہ پر واپس آجائیں جہاں سے ہم چلے تھے۔ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ ۳ ستمبر کے اعلانِ جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں اس کا رخ کس طرف ہے ؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں ؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف ابھر آیا ہوگا کہ اب اُسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں، میں آپ کے دلوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون ، Cooperation کا جو قدم ۱۹۳۸ء میں اٹھایا تھا، اُسے اعلان جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رُخ ترک تعاون Non-Cooperation کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اُس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں ؟ جب قدم اٹھا دیا جاتے تو وہ رُک نہیں سکتا۔ اگر رُکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں، جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے !

باہمی مفاہمت

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے، جبکہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کردے۔ اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرزِ عمل بدلتے رہے ہیں، مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی Reactionary قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہ و بالا کر دیے اور انصاف اور معقولیت Reason کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی دلیل رہ گئی، لیکن ساتھ ہی جہاں دُنیا تصویر کا یہ مایوس رُخ ابھار رہی ہے۔ وہاں امید کا ایک دوسرا رُخ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے جو نہایت تیزی کیساتھ ہر طرف اُبھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظم کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے، اور معقولیت انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کے لیے بیقرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کردیا تھا اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر ابھر رہی ہے، اور اس طرح اُبھر رہی ہے کہ شاید تاریخ میں کبھی نہیں اُبھری۔

ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پُرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا ؟

کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا۔ آئندہ کیلئے معقولیت، انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لیے تیار ہو جاتیں ؟

عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کسی طرح امیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جاتیں، معقولیت اور انصاف کے دور کی ایک نئی صبح کسی طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی، انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتحمندی ہوتی، اگر آج برطانی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے !

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے، مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے ہیں جو آن پر کھولا جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں۔ بلا تامل قدم

ایشیا

رکھنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ برطانوی کابینہ (Cabinet) کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا، اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔

ہندوستان سے بڑھ کر اور کون سا ملک ہو سکتا ہے جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن و انصاف کی راہ روکے کھڑا ہے جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعوؤں کے لئے ایک حقیقی کسوٹی تھی۔ دعوے کسوٹی پر کسے گئے، اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے۔

ہندوستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے، معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں جو میں نے اختصار کیسا تھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گزشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا تو اس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گذری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جا سکے گا۔

بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں جہاں تک کانگریس کے قدم پہونچ گئے ہیں اور براہ راست اقدام عمل (ڈائرکٹ ایکشن) کے طریقہ سے جو سیاسی ہندوستان کی اکثریت نے اختیار کر لیا ہے، متفق نہیں ہیں لیکن جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے ہندوستان کی ذہنی بیداری اب ان ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی ہے کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے گریز کرنے کی جرأت کر سکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کیلئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورت حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں، وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضہ سے بے بس ہو رہی ہیں اور انھیں بھی ہندوستان کی سیاسی منزل مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورت حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اٹھا دیئے۔ وہاں اس گوشہ کو بھی بے نقاب کر دیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ وارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کر کے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کر دی جائے بار بار دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہیں کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرز عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لئے کام میں لایا جائے تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا اور ہمارے لئے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند نہیں ہو سکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لئے سب سے بڑی ضمانت ہے لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا، یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم از کم ان گوشوں میں وہ اپنے طرز عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے اس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا۔ اور جس دور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ ختم ہو گیا، اسے ابھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہر حال اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے اور ان مسئلوں میں یک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ ہم برطانوی

حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیئے، کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے، اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پرواہ ہو کر اٹھے گا۔ یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی صرف یہی ہونے چاہئیں کہ اس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ اسے ہندوستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے، تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے وہ یہی گوشہ ہے۔

کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لئے جو جگہ بنائی ہے وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اول دن سے دعویٰ رہا ہے، کہ وہ ہندوستان کو بہ حیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے، اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے، ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ کانگریس نے یہ دعویٰ کر کے دنیا کو اس بات کا حق دیدیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کیساتھ چاہے اس کے طرزِ عمل کا جائزہ لے، اور کانگریس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگریس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈالیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے، اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آ سکتی ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی، اس کی اہمیت، اُس کے فیصلے کا طریقہ۔

کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی اُس نے اس کے فیصلہ کیلئے وہی طریقہ تسلیم کیا جس سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتلایا جا سکتا، اور اگر بتلایا جا سکتا ہے، تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں!

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لئے سب سے پہلی شرط یقین کریں؟ میں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابل انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگریس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی قدم اٹھایا تو اِن دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا:۔

۱۔ ہندوستان کا جو دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آئندہ بنایا جائے۔ اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیئے۔

۲۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کیلئے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لئے جج خود اقلیتیں ہیں۔ نہ کہ اکثریتیں، اس لئے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیئے نہ کہ کثرت رائے سے۔

۲۵ اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرزِ عمل اس بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرزِ عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگریس اپنے ادائے فرض کی خامیوں پر غور کرنے کیلئے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصہ میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گذرا۔ جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقے سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا۔ اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرزِ عمل تھا۔ پچھلے پندرہ

برسوں کے اندر بار بار اس طرز عمل کے لئے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ اس کے لئے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ مسلم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں ان کے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رائوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہو سکتی ہے تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگریس نے اپنے طرز عمل کیلئے یہ اصول سامنے رکھ دیئے ہیں اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آ رہی ہے تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقعہ نہیں دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں۔ اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کیلئے تصفیہ کر لیں۔

ہم میں تفرقے پیدا کئے گئے، اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں، ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقعہ نہیں دیا جاتا اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہئیں۔ یہ صورت حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں

رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں، کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اور ہندوستان کا مستقبل

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے۔ جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم، آپ لوگوں میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے ۲۸ برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کریں۔ میں نے اس زمانہ میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لئے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھولدیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کیساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کیلئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں

ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے۔ اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا۔ کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنی چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور ایک سابق لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہیئے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گذر چکے ہیں۔ مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے۔ جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کیلئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ نوعیت (Kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا۔ اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کرلیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کیلئے تعداد کی نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کرلیں گے۔ کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے۔ خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے کیا انسانی تعداد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی نگہداشت خود نہیں کر سکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص تقسیم کیساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو

ایک اقلیتی گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔

ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو۔ مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا۔ جس کے تمام حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے۔ اور فیڈرل مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع (Defence) کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے۔ کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کیلئے بھی اپنے سامنے لاسکتا ہے اُن اندیشوں کے قبول کرنے کیلئے تیار ہو جائے جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کیلئے یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کیلئے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبّر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے۔ ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا چاہتے ہیں مگر دریا میں اُترتے نہیں ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بے خوف و خطر کود نا چاہیئے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا۔ ہم معلوم کر لیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔!

مسلمانانِ ہند کیلئے ایک بنیادی سوال

تقریباً ۳۰ برس ہوئے جب میں نے بہ حیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جد و جہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی۔ اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی بنیاد کر لی گئی تھی۔ وقت کی یہ عام آب و ہوا میرے غور و فکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا۔ اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اُسی کشتی میں سوار ہیں، اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اپنے طرزِ عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کریں۔ یہ فیصلہ ہم کیوں کر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اس کی بنیادوں تک اتریں، اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا، اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آئندہ کا کوئی وعدہ، دستورِ اساسی کا کوئی تحفظ، ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں، اور ہمیں بھی یہی خواہش رکھنی چاہیئے۔ کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔ لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ ہمارے لئے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیئے، تو پھر ہماری راہ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک۔ تذبذب، بے عملی اور استغا کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی یقین، جماؤ، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ معاملوں کی کوئی چبھن ہمارے قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتے بڑھے جائیں۔

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں میں کسی مسلمان کیلئے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے۔

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا۔ اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں
کے سامنے رکھا۔ آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں
بے اثر نہیں رہیں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی
نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب چار برس کی
نظر بندی کے بعد میں رہا ہوا تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت
اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے۔ اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر
بیس برس گذر چکے اس عرصہ میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے
حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم
ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے
پیچھے لوٹنے کیلئے تیار نہیں۔

ہاں، وہ اب پیچھے لوٹنے کیلئے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے
کی راہ اس پر مشتبہ ہو رہی ہے میں اس وقت اسباب میں نہیں
جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے
ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں
مخاطب کیا تھا۔ آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدّت نے حالات
کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے، ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو
میرے سامنے سے نہ گذری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے
دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے
سے گذرتے ہی نہ رہے میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک
حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں میرے
لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں
دبا سکتا میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے
کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نوکروڑ مسلمانوں کیلئے صرف وہی ایک راہِ عمل
ہوسکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا
مگر آج انہیں مجھ سے اختلاف ہے، میں انھیں اس اختلاف کیلئے ملامت نہیں
کروں گا۔ مگر میں ان کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں
اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے
نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں
تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم
کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انھیں حقیقت
کی روشنی میں آنا چاہیئے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملہ پر غور کریں۔ وہ
اس کے سوا کوئی راہ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

مسلمان اور متحدہ قومیت

میں مسلمان ہوں اور فخر کیساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔
اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔
میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔
اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب
میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔
بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک
خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت
کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں
جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس
سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ
محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور
ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک
ایسا اہم عنصر ہوں۔ جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔
میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں میں اپنے
اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین
انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں
کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں
کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد سلسلہ جاری ہوا۔ اس کی وسیع
سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کیلئے
جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی
تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ
کے لئے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں

۲۹

ایشیا

کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے ہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے .... دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرہ کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دیدی۔ جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گذر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوی رکھتا ہے جیسا دعوی ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کیساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرہ کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھاکے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگان ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی، تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں

پر نہیں مل سکتا یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے چھوڑکر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہیئے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کبھی پورا ہونیوالا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گذری ہوئی تہذیب معاشرت کو پھر تازہ کریں، جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے، تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (Revival) مذہب میں ضرورت ہے مگر معاشرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے۔

ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا ہمیں قدرت کے فیصلہ پر رضامند ہونا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔

حضرات میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا میں اب اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں، لیکن قبل اس کے کہ ختم کر دوں مجھے ایک بات کی یاد دلانے کی اجازت دیجئے کہ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دار و مدار تین چیزوں پر ہے۔ اتحاد، ڈسپلن (Discipline) اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا اور صرف اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہماری آزمائش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی دعوت دیدی ہے۔ کوشش کیجئے کہ ہم اسکے اہل ثابت ہوں۔

امام الہند ابوالکلام آزاد

وہ اک روحِ چمن افروز جانِ سوسن و لالا
وہ بلبل جس نے سارا باغ نغموں سے ہلا ڈالا

چمن والوں کو رحمت ہے پیامِ نو بہار اسکا
تخیّل عرش تو بس اُسکا تصوّر لالہ کار اُسکا

وہ اک کوہِ وقار و تمکنت اک بطلِ حریّت
وہ سازِ پیکرِ انساں میں اک آوازۂ قدرت

طلاقت جسکی خاموشی ہے غفلت جسکی بیداری
عیاں جسکے تکلّم سے خطابت کی فسونکاری

وہ سیّد جس نے تعمیرِ سیادت کی بنا ڈالی
وہ قائد جس نے توقیرِ قیادت کی بنا ڈالی

مفکّر جسکی فکری قوّتیں جانِ سیاست ہیں
مُدبّر جس کے محسوسات ایمانِ سیاست ہیں

زمانے میں وہ قربانی کی اک تصویر ہے زندہ
وہ چرخِ حریّت کا اک ستارہ ہے درخشندہ

ایشیا

وہ مشہودِ حقیقت اور آزادی کا شاہد ہے
مفسّر ہے، مقرّر ہے، مدبّر ہے، مجاہد ہے

وہ جس کا سینۂ اقدس امینِ رازِ یزدانی
وہ اک موّاج بحرِ بیکرانِ علمِ قرآنی

وہ نائب ہے حقیقی علم کے افرادِ عالی کا
وہ اصلی جانشیں ہے آج رازی اور غزالی کا

سیاست اور تاریخ و ادب کی ایک دنیا ہے
عطارد جس کی کلکِ گوہریں کو بوسہ دیتا ہے

وہ نبّاضِ حقیقی قوم کے امراضِ کہنہ کا
وہ اصلی رازدانِ حالات و احساتِ دنیا کا

وہ ارضِ ہند میں واحد امامِ قومِ مسلم ہے
قوی ہاتھوں میں ہے آج اسکے زمامِ قومِ مسلم ہے

نگہبانِ حقوقِ امّتِ اسلامیہ ہے وہ
امیرِ کاروانِ ملّتِ اسلامیہ ہے وہ

کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی

موتمر آئین ساز

ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ۔ ار ۔ ایٹ لا

ہمارے پاس اشاعت کے لئے اس اہم موضوع پر کئی مضامین آئے ہیں، ہمارے پیش نظر وہ مضامین بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً گاندھی جی
پنڈت نہرو، سوبھاش بابو، مسٹر ایم۔ این رائے وغیرہ رہنمایان کرام نے لکھے، حال میں سر شفاعت احمد خاں کی طرف سے ایک مقالہ
بھی اس موضوع پر شائع ہوا ہے۔ دہلی کے رسالہ طلوعِ اسلام نے بھی اپنی ایک اشاعت میں بہت کچھ زہر پاشی کی ہے۔ اس اشاعت
میں ہم جناب ڈاکٹر جعفری کے مضمون کو شائع کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت عالمانہ انداز میں موتمر آئین ساز کی تاریخ پر
روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان کی موجودہ سیاسی فضا کے پس منظر کو پیش کرتے ہوئے ہندوستان میں کسی موتمر آئین ساز کی
کامیابی پر شکوک بھی ظاہر کئے ہیں۔ حالانکہ جیسا کہ انھوں نے خود تاریخ کی روشنی میں نہایت قابلیت سے ثابت کیا ہے۔ یہ کوئی ایسا مشکل
کام نہیں ہے۔

ایڈیٹر

ہندوستان اس وقت ایسے دور سے گذر رہا ہے کہ ہر وہ
شخص جس کو اپنے ملک کے مستقبل سے ذرا بھی دلچسپی ہے وہ اس خیال میں محو
ہے کہ ملک کا آئندہ آئین کیا ہونا چاہئے اور کیا ہوگا۔ چونکہ آئین کی بنا
جمہوریت پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے اس کے ضمن میں موتمر آئین ساز
(Constitutional Assembly) کا نام آنا لازمی تھا
چنانچہ اس اسمبلی کے من وعن پر اس وقت ہر طرف بحث ہو رہی ہے مگر تمام بیانات
اور تقریروں و تحریروں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص عوام کے
سامنے اپنی رائے کو لاتے وقت صرف ایک رُخ کو پیش کرتا ہے لیکن میں
سطور ذیل میں نہایت صفائی کے ساتھ اس کے ہر رُخ پر روشنی ڈالوں گا۔
اور آپ کو یہ بتاؤں گا کہ موتمر آئین ساز کیا ہے اور اس کے انتخابات وغیرہ
کس طور پر عمل میں لانے چاہئیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ موتمر آئین سازی کسی ملک کی ایک ایسی جماعت
کا نام ہے، جو اس ملک کے دستور اساسی بنانے کے لئے مجتمع کی جائے
اور جو صحیح صحیح عوام کی رائے کی ترجمانی کرے۔ ایسی جماعتیں بارہا عالم وجود
میں آچکی ہیں۔ فرانس کے انقلاب کے بعد شہنشاہیت کا جب خاتمہ ہو گیا
تو ۱۷۸۹ء میں ایک ایسی ہی انجمن کے تحت اس کا آئین تیار ہوا۔ جرمنی میں بھی
۱۸۴۸ء میں اسی نوعیت سے ایک قانون بنا۔ اگرچہ ان دونوں ممالک میں
جو آئین اس طرح تیار ہوئے وہ تھوڑے ہی دنوں میں مسترد کر دیے گئے
لیکن اس سے اصول موتمر آئین سازی پر حرف نہیں لایا جا سکتا۔ ان کی
ناکامیابی کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ دونوں ملکوں میں جن جماعتوں نے امتیازی
حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اُن کے رہنماؤں نے آپس میں جھگڑا آئین بنانے
جس سے عوام کی رائے کی پوری ترجمانی نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ اس وقت

تک موتمر آئین ساز میں جمہوریت کا تخیل ہر لحاظ سے نہ تھا۔

روس نے ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کے اختتام پر اسی طریقے سے اپنا آئین تیار کیا اور یہی طریقہ چند معمولی تبدیلیوں کے بعد چین میں جاری ہے اور یہی ملک جو جنگ سے پہلے استبدادیت کا مرکز تھا آج اس آئین کی بدولت عوام کا پاسبان ہے۔ ان کے علاوہ سلطنت برطانیہ کی نوآبادیوں میں بھی اس اسمبلی کی خوشگوار مثالیں ملتی ہیں۔ کناڈا میں ۱۸۶۴ء میں تمام جماعتوں کو او مختلف خیال کے لوگوں کو جمع کرنے کے بعد کیوبک (Quebec) کے مقام پر آئین کا ایک مسودہ تیار ہوا جو سلطنت برطانیہ کے مدبرین کے مشورہ سے چند ترمیمات کے بعد اُن کا آئین بن گیا۔ اسی طرح آسٹریلیا کے طرز حکومت کو مرتب کرنے کے لئے ۱۸۹۱ء میں آسٹریلین کنونشن (Australian Convention) قائم کی گئی۔ اور اُس نے اپنے ملک کا آئین ترتیب کیا۔ بعد ازاں اسی طرز کی ایک دوسری جماعت نے ۱۸۹۷ء میں آسٹریلیا کے اس آئین میں کچھ ردّوبدل کیا جس نے ۱۹۰۰ء میں سلطنت برطانیہ کی پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد قانونی شکل اختیار کر لی۔ جنوبی افریقہ میں ۱۹۰۸ء میں وہاں کی کلونیل پارلیمنٹ (Colonial Parliament) نے بمقام ڈربن ایک کنونشن یعنی کانفرنس بلائی جس نے ۱۹۰۹ء میں ایک قانون مرتب کیا۔ یہ قانون بعد میں دوسری کنونشن میں جو بلیو فونٹین (Blue Fountain) میں بلائی گئی ترمیم کیا گیا اور بعد میں کانسٹی ٹیوانٹ ایکٹ آف ساوتھ افریقہ ۱۹۰۹ء (Constituent Act of South Africa 1909) کے نام سے نافذ ہوا۔

آسٹریلیا کے قضیے تیس برس تک رہے۔ لیکن ان تمام قضیوں کے بعد جو قانون بنا اُس نے سارے ملک میں یکسوئی پیدا کر دی۔ کناڈا کی ذی اقتدار قومیں صرف دو ہیں۔ انگریز اور فرانسیسی۔ انگریزوں کی تعداد زیادہ ہے اس لئے فرانسیسی اقلیت کو اپنے حقوق کی حفاظت میں دقّت پیدا ہوئی مگر برطانوی پارلیمنٹ نے جو قانون پاس کیا اس سے ان کا اطمینان ہو گیا۔ جنوبی افریقہ میں بھی ڈچ اور انگریز ذی اقتدار قومیں ہیں اور انگریز اقلیت میں ہیں۔ ایک مدت تک ڈچ اس پر راضی نہ تھے کہ انگریزوں کو (Franchise) یعنی ووٹ کے حقوق دیئے جائیں۔ لیکن بڑی کشمکش اور جنگ کے بعد اُن کو یہ حق حاصل ہوا۔

بعض لوگ اِن ملکوں کی آئینی جدوجہد کی تاریخ کو موتمر آئین ساز کے خلاف بتاتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے اعتراضات کرتے وقت غالباً وہ بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کی ساری کشمکش موتمر آئین ساز ہی نے دور کی۔ آئین سازی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ملک کے مستقبل میں اس کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو جسم میں روح کی۔ اس لئے اگر اس میں کچھ کشمکش رہے تو وہ مستبعد نہیں۔

آئین سازی میں ایک اور طریقہ بعض ممالک مثلاً سوئٹزرلینڈ (Switzerland) وغیرہ میں کارفرما رہا۔ یعنی کوئی ایک آئین یا اُس کا جزو استصواب عام کے لئے پیش کیا گیا۔ جس طریقے کو انگریزی میں Plebesite یا Referender کہتے ہیں اور یہ طریقہ بھی کامیاب ثابت ہوا۔ اس کو گو موتمر آئین ساز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ اُسی جنس کی ایک نوع ہے اور یہ سب جمہوریت کے بنیادی اصولوں میں شامل ہیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ موتمر آئین ساز مرادف ہے بالغان کی رائے کا، یعنی ایسی موتمر صرف بالغان کے ووٹ سے بن سکتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ آج بجز روس کے کسی ملک میں صحیح معنوں میں موتمر آئین سازی نہیں قائم ہے۔ جس میں پورے طور پر رائے شماری کی گئی ہو۔ کناڈا آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں جو موتمر آئین ساز بلائی گئیں۔ اُن کے ارکان کی تعداد بہت کم تھی۔ آسٹریلیا میں جو ۱۸۹۱ء میں نیشنل کنونشن بلائی گئی اُس کے ارکان وہ لوگ تھے جنھیں آسٹریلیا کی نوآبادی کی اسمبلیوں نے منتخب کر کے بھیجا تھا۔ یہ نمائندے براہِ راست عوام کے بھیجے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ انھیں اسمبلیوں کے ممبروں نے منتخب کیا تھا۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت آئین سازی کا اصلی اور ابتدائی کام مرکزی اسمبلی نے نہیں کیا۔ بلکہ چند چیدہ آدمیوں کی منتخب جماعت نے انجام دیا۔ بہرحال یہ تو ایک اصولی بات ہے۔ کیونکہ آئین کی ابتدائی مراحل اسی طرح طے ہو سکتے ہیں۔ اور اس کی ساخت کا ڈھانچہ اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔

متذکرہ بالا واقعات سے یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ موتمر آئین سازی کی کوئی ایک معین صورت نہیں ہے۔ بلکہ واقعات اور حالات کی بنا پر وہ ایک شکل اختیار کرتی ہے وہ ملک کے تمام بالغان کی رائے کے ذریعہ سے بھی بن سکتی ہے۔ مجالس آئین ساز بھی موتمر آئین ساز کی شکل اپنے کو دے سکتی ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ملک کی ہر مجلس آئین ساز اپنا نمائندہ منتخب کرے۔ اور وہ سب مل کر ملک کی موتمر آئین ساز کی شکل اپنے کو دے دیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ملک کی تمام جماعتوں کے نمائندے لیکر ایک ایسی موتمر آئین ساز بنائی جائے۔ صرف اس امر کے لحاظ کی ضرورت ہے کہ موتمر جس شکل کی ہو وہ عوام کی رائے کی ترجمان ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ صرف ایک موتمر بنے اور وہی صوبہ جاتی آئین سازی کرے اور مرکزی بھی، یہ ہوسکتا ہے کہ ہر صوبہ اپنی موتمر علیحدہ بنائے اور مرکز کے لئے ایک علیحدہ موتمر بنے۔ شاید ہندوستان میں ایسا ہی کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ سوال کہ ایسی موتمر کون بلا سکتا ہے کوئی پیچیدہ سوال نہیں اور نہ آئینی لحاظ سے اس کے لئے کوئی خاص رکاوٹ ہے۔ ہندوستان کی موجودہ صورت کو دیکھتے ہوئے یہ ظاہر ہے کہ یہاں کوئی ایسی موتمر صرف برطانوی حکومت کی طرف سے بلائی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اگر حکومت کی طرف سے نہ بلائی جائے گی تو اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی کہ جو موتمر قائم ہوگی اور جو فیصلہ وہ کرے گی اس پر کسی طرح بھی عمل درآمد ہوسکے گا۔ یہ کہنا کہ سلطنت برطانیہ موتمر آئین ساز کے بنانے سے انکار کرے گی بے معنی سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ جب نوآبادیات کے معاملے میں موتمر آئین ساز کو وہ تسلیم کرچکی ہے تو پھر اب کیوں انکار کرے گی۔ برطانوی حکومت کا اقتدار موتمر آئین ساز کے بنانے سے ہرگز نہیں گرتا۔ کیونکہ جو آئین یہاں بنے گا اس کی پارلیمنٹ سے منظوری تو لی ہی جائے گی

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صورت میں موتمر مفید ہوگی یا نہیں اور اگر ہوگی تو کس قسم کی۔ ہندوستان میں اس وقت مختلف قومیں آباد ہیں یعنی ہندو جن میں ایک تہائی وہ قوم ہے جو ہندوستان کے اصلی قدیم باشندے تھے اور جن کو آریہ قوم نے ختم کرکے ایسی حالت میں کردیا کہ ان کے ساتھ اب خود ہندو نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ ان کے ساتھ کوئی معاشی تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ ہندو جو اونچی ذات کے کہے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ آریہ ہیں جنھوں نے آکر ہندوستان کو ختم کیا اور ایسے ہندو ہیں جن میں دراویڈ اور منگول اور تاتار وغیرہ کے خون شامل ہیں۔ دوسرے مسلمان ہیں جن میں تھوڑے باہر سے آئے اور باقی اونچی نیچی ذات کے ہندوؤں میں سے مسلمان ہوگئے۔ تیسرے عیسائی جو یہیں کی آبادی سے عیسائی بنائے گئے۔ چوتھے اینگلو انڈین جو ہندوستانی اور یوروپین نسلوں سے مخلوط ہیں اور پانچویں وہ یوروپین جو تجارت کے سلسلے میں یہاں ہیں۔ لیکن جنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنایا۔ آخرالذکر کو میں خارج از بحث سمجھتا ہوں اور نیز اینگلو انڈین اقوام کو بھی۔ جب تک کہ یہ اپنے کو ہندوستانی کہنے اور سمجھنے پر راضی نہیں ہوتے۔ لیکن جنوبی افریقہ کی تاریخ جس کا اوپر ذکر ہوچکا ہے ہماری نظروں کے سامنے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم اُن کو رائے دینے سے انکار کردیں گے تو ہمیں ایک غیر مفید جنگ و جدل کا سامنا کرنا ہوگا۔ کچھ پارسی اور بودھ وغیرہ ہیں مگر وہ سیاسی جذبات کے لحاظ سے ہندو کے ساتھ ہیں اس لئے ان کو علیحدہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہندوستان کے آئین کے متعلق ساری کشمکش ہندو اور مسلمانوں میں ہے اس لئے یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں قوموں کا خیال رکھتے ہوئے موتمر کی بنا کیا ہو سکتی ہے۔ ہندوؤں کا قدیم تمدن انھیں معاشی علیحدگی سکھاتا ہے اور ذات پات کی تقسیم اُن میں اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ آپس میں بھی اُن کا ایک ساتھ کھانا پینا نہیں ہے۔ نہ ایک ذات کا دوسری ذات کے ہندو سے شادی اور بیاہ کا تعلق ہے۔ اُن کا رہنے سہنے کا طریقہ اُن کی پوشاک بھی نفسیاتی طور پر بالکل مسلمانوں سے مختلف ہے مسلمانوں کا تمدن اُس کے بعد کا ہے اور فطرتاً اُس سے آگے ہے۔ اُن کا رہنا سہنا اُن کا طریقہ خور و نوش نئے تمدن سے قریب تر ہے مغلوں نے بہت کوشش کی کہ دونوں تمدن مل جائیں اور اس کا اثر بھی ہوا مگر بعد کے تدریجی سیاسی رجحانات اور اقتصادی کشمکش نے دونوں کو ایک دوسرے سے پھر علیحدہ کرنا شروع کیا۔ موجودہ زمانے میں کچھ قومی لیڈر بھی ایسے پیدا ہوگئے جو اس کی کوشش کرتے رہے اور اب بھی اس کی

کوشش کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے قدیم تمدن پر قائم رہیں۔ ہندوؤں میں خاص طور پر قابل ذکر پنڈت مدن موہن مالویہ اور مہاتما گاندھی ہیں۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمدن کی جو چیزیں لی تھیں وہ تو اُن میں اب بھی بدستور ہیں لیکن ہندوؤں نے جو چیزیں مسلمانوں سے حاصل کیں اُن کو وہ پوری کوشش سے چھوڑتے جاتے ہیں مثلاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ایک زبان اُردو قائم ہوئی تھی اور اب بھی بیس برس پہلے ۹۵ فی صدی ہندو طلبا علم مدرسوں میں اسی کو پڑھتے تھے لیکن آج ۵ فی صدی بھی اس کے سیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔ پوشاک بھی، ہندوؤں نے مسلمانوں سے جو کچھ لی اُسے چھوڑ دیا۔ بجز روشن خیال کشمیریوں کے جن میں اب بھی اس کا اثر ہے۔ میل جول کا یہ حال ہے کہ نہ ہندو عام مسلمان سوسائٹی میں گھلتا ملتا ہے اور نہ مسلمان ہندو کی سوسائٹی میں۔ افسوس کی بات یہ ہوئی کہ سوا دو برس تقریباً آٹھ صوبوں میں کانگریسی حکومت رہی اُس میں بھی ناگفتہ حالات کی بنا پر ایسی فضا پیدا ہوئی کہ جس سے اب دونوں قومیں ایک دوسری سے اور دُور ہو گئیں میں یہ بات ماننے کو تیار ہوں کہ اس کی ذمہ داری پورے طور پر کانگریس کے نظام پر نہیں ہے بعض خارجی وجوہ بھی تھے لیکن ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت سے باہر جو مہاسبھائی ذہنیت کے کم قیمت کانگریسی تھے اُنہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے فرقہ دارانہ جذبات کی تشفی کی کوشش کی اس حالت میں کوئی ایسی اسمبلی جو تمام قوموں پر حاوی ہو مشکل ہی سے بن سکیگی کانگریسی مجلس انتظامیہ نے اپنے تازہ ریزولیوشن میں یہ لکھا ہے کہ اقلیت کے حقوق کی حفاظت کے ساتھ موتمر قائم کی جائے گی مگر اس کی تشریح نہیں کی ہے کہ اس پر عمل درآمد کس طرح ہوگا میری رائے میں تو اس کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ تمام فرقہ دارانہ مسائل پہلے پیشوایانِ ملک متحدہ طور پر طے کریں۔ اس کے لئے اقلیتوں کی ایک علیحدہ موتمر بنے اور پھر اس کے بعد پورا آئین۔ خواہ ایک موتمر کے سامنے پیش کیا جائے یا (Referende) کی شکل میں عوام کے سامنے لایا جائے تو بھی مشکل حل ہو سکے گی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ہمارے عوام صرف ۷ فی صدی بھی تعلیم یافتہ ہیں۔ اُن میں بھی شاید ایک ہی فی صدی ایسے ہوں گے جن کو ایسی تعلیم حاصل ہے کہ وہ مسائل کو سمجھ سکیں۔ ایسی حالت میں رائے عامہ کا حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ اگر بالغان کے ووٹ سے ایسی رائے کا حاصل کیا جانا تجویز کیا جائے تو اس کے معنی تو صرف یہ ہوں گے کہ چند رہنمایان کے ووٹ حاصل کئے گئے۔ ہندو ان پڑھ جماعت پر اس وقت سوائے صوبہ بنگال کے اور بہار اضلاع کے ایک حصے کے مہاتما گاندھی کا اتنا اثر ہے کہ صرف اُن کے نام سے لوگ ووٹ دیتے ہیں۔ چند سال ہوئے میں ایک کونسل کے الیکشن میں ریٹرننگ آفیسر تھا۔ اُس حلقہ انتخاب میں ایک زمیندار اور دوسرے کانگریسی امیدوار تھے۔ زمیندار کی طرف سے جو لوگ ووٹ دینے آئے تھے وہ اُن کا نام لیتے تھے اور کانگریسی اُمیدوار کو جو ووٹ دینے آئے تھے وہ کہتے تھے کہ ہم گاندھی بابا کو ووٹ دینگے اور میں اُمیدوار کا نام بتا کر اُن کا ووٹ درج کرتا تھا۔ اسی طرح آج مسٹر جناح کا عام اَن پڑھ مسلمانوں پر ایسا ہی اثر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ووٹ کی کیا وقعت ہو سکتی ہے اب رہا یہ سوال کہ اس موتمر کے ساتھ ریاستیں بھی شامل کی جائیں گی یا نہیں تو میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ یہ آئین فی الحال صرف برطانوی ہند کا بننا چاہیے۔ ریاستوں کے شامل ہونے سے اس میں رجعت پسندی کا رنگ ہوگا اور اس کے عملدرآمد میں رجعت پسندی اپنا اثر دکھاتی رہے گی۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ریاستیں کسی ایسی موتمر میں شرکت نہیں کرنا چاہیں گی اور Paramount Power بھی ریاستوں کو بُلانا نہ چاہے گی وہ یہ بھولتے ہیں کہ موتمر آئین ساز اُس وقت بنتی ہے جب ملک کا ہیجان ایک قوت بن جاتا ہے جس کے آگے سب کو جھکنا پڑتا ہے۔ ہم ریاستوں کو ضرور اس آئین میں شامل کریں گے۔ مگر اُس وقت جبکہ ریاستوں کی رائے عامہ ایک قوی اور ناقابلِ نظر انداز رائے بن جائے گی۔ ہاں! ریاستوں کو البتہ یہ سنا دینا چاہیے کہ "آنچہ دانا کند کند ناداں۔ لیک بعد از خرابی بسیار"

معاملہ نہایت پیچیدہ ہے اور ایسا نہیں ہے کہ محض جذباتی نظر سے اُس کو دیکھا جائے۔ میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو جمہوریت کے خلاف ہیں۔ میں جمہوریت کا دلدادہ ہوں اور کسی نظام کو اس کے مقابلے میں ترجیح نہیں دے سکتا لیکن جمہوریت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اکثریت ہی حکومت کرے اور یہ کہ اکثریت اس لئے حکومت کرے کہ اقلیت کو پسپا کر دیا جائے اس طرح نہ

(بقیہ مضمون ملاحظہ کیجئے فہرست مضامین کے پیچھے)

برطانیۂ عظمیٰ میں تحریکِ مزدور

(جنگِ عظیم سے لیکر عصرِ حاضر تک کی تاریخ)

(مسلسل جملہ حقوق بحقِ ادبی مرکز محفوظ)

از "ف"

اس کا انجام یہ ہوا کہ رائے دہندگان کی تعداد قانونی طور پر بڑھا دینے کے باوجود صرف ۵۰ فی صدی انسانوں نے انتخاب میں حصّہ لیا اور حرص و آز، جذبات اور توہمات، جبر و فریب، کے دیوتا جن کے ظاہر و باطن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنگ نے ان کی تجوریاں زیادہ بھاری کردی ہیں، فتحیاب ہوئے۔ پھر بھی پچھلے الیکشن (سنہ۱۹۱۰ء) کے مقابلے میں مزدور پارٹی کے ووٹوں میں ۲۵ لاکھ سے اکیس لاکھ کا اضافہ ہوا، اور ۶۰ نمائندے انتخاب میں آئے جنہوں نے مجلسِ عوام میں ایک مضبوط مخالف جماعت بنالی، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ بھی کوئی اہم ترقی نہ تھی ملک کے سامنے بڑے بڑے دعوے کئے گئے تھے لیکن مسٹر ولیم ایڈمسن اور کلائنس کی رہنمائی میں پارلیمنٹری پارٹی کے طرزِ عمل سے عوام زیادہ متاثر نہ ہوسکے۔

سنہ۱۹۱۹ء کے پہلے تین مہینوں میں تو برطانوی سرمایہ داری ہوا میں تھرک رہی تھی۔ سنہ۱۹۱۲ء میں جو انقلابی طوفان اٹھا تھا وہ اسوقت ملک کے معاشرتی نظام کو ڈگمگاتا نظر آرہا تھا، نہ صرف یہ کہ مزدور جنتا ایک عجیب و غریب ہیجان میں مبتلا تھی۔ لاکھوں مزدور اسلحہ جات کا استعمال سیکھ چکے تھے۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد اس وقت بھی ہتھیار بند تھی، برطانیہ کے پاس ایک عظیم زبردستی کی بھرتی کی ہوئی فوج تھی جس کو دھیرے دھیرے منتشر کیا جارہا تھا۔ یہ جیتی ہوئی لڑائی کے وہ ہیرو نوجوان تھے جو اپنے نئے گھروں میں واپس جانے کیلئے بے چین ہو رہے تھے جن کا انھیں دورانِ جنگ میں خواب دکھایا گیا تھا، صلح اور اس کے بعد ایک سال کے درمیان وہ وقفہ تھا جس میں کہ سامراج اور مزدور دونوں اپنی اپنی تیاریاں کررہے تھے، ایک طرف وقتی رعایت تھی دوسری طرف مطالبے پیش کئے جارہے تھے، ہر تجارت میں یونین کام کے اوقات کو کم کرنے کے لئے زور دے رہی تھیں اور اُن مزید اجرتوں کیلئے جھگڑ رہی تھیں، جن کے وعدے جنگ کے دوران میں کئے گئے تھے سامراجی حکومت نے سرمایہ کی طاقت سے کام لیکر فوراً ہی ایک قانون ملک کے سامنے پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اُجرتوں میں اضافہ تو نہ ہو لیکن وہ ایک میعادِ مقررہ تک کم بھی نہ کی جاسکیں، ساتھ ہی حکومت نے ایک وقتی بہلاوا یہ بھی دیا کہ فوج سے منتشر کئے ہوئے بے روزگار سپاہیوں اور سامانِ جنگ کے کارخانوں کے مزدوروں کو امداد کے طور پر کچھ دیا جائے۔

لیکن مزدور جماعتیں اس سے مطمئن نہ ہوئیں اور سنہ۱۹۱۹ء کے آغاز میں حالات سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ انقلاب کا بم پھٹنے ہی والا ہے۔ سپاہی اتنی سست رفتاری سے منتشر کئے جارہے تھے۔ کہ جنگ اور فوجی

زندگی سے تھکے ہوئے نوجوان بے چینی دکھانے لگے تھے۔ نوجوانوں کی یہ بے چینی اس وقت زیادہ بڑھتی ہوئی معلوم ہوئی جب برطانیہ نے شمالی روس کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کیں اور بالشویک حکومت کے خلاف ARCHANGAL، آرچینگل کے مقام پر خواہ مخواہ مداخلت کرنی چاہی۔ (T. H. WINTRINGHAM) کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ فوج کی بے شمار کمپنیوں میں خصوصاً لندن اور جنوب کی فوجوں میں بے شمار رجمنٹیں اٹھ کھڑی ہوئیں، ہزارہا سپاہی لاریوں میں بھر بھر کر لندن کو آئے تاکہ وہ حکومت کے سامنے اپنی شکایتیں پیش کر سکیں لیکن بدقسمتی سے جیسا کہ ہر جنگ کے بعد ہوتا رہا ہے انگریزی سوشلسٹ جنکی اشتراکیت کیلئے لینن اور بحارین ایسے لوگ "ہوائی اشتراکی" کا خطاب دے چکے تھے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں الگ کھڑی کر بیٹھے اور جنتا کے جوش و خروش سے علیحدہ ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلح فوجوں اور ان کے مسائل کی طرف سے منہ موڑ لینے نے یہ ظاہر کیا کہ تحریک عام تو ضرور ہے لیکن مضبوط رہنمائی سے خالی۔ بیچارے باغی سپاہی آخر کیا کرتے۔ جب ان کو مزدوروں کی کسی جماعت کی رہنمائی نہ حاصل ہو سکی وہ سامراج شاہی کے ناخدا بالڈ ملے BOTTOM-LEY کے سامنے دستِ سوال بنکر رہ گئے۔ پھر بھی مورخ کیلئے اُس زمانے کے حالات اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ اگر صنعتی مزدوروں اور باغی سپاہیوں میں اشتراکی لیڈر رہتا اسا بھی اشتراک پیدا کر دیتے تو سامراج شاہی کی بنیادیں تک ہل جاتیں۔

ہوا یہ کہ ہر تحریک جو اٹھی اس نے ایک دوسرے سے آزاد ہو کر کام کرنا چاہا۔ نہ تو متحدہ کوشش ہی تھی، اور نہ مشترکہ حملہ، لیڈروں نے یا تو حالات کی نزاکت اور مسائل کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں، یا اگر سمجھا، تو سرمایہ داری سے مرعوب اور متاثر ہو کر آنکھیں پھیر لیں، حکومت کیلئے یہ بہت آسان تھا کہ زبردستی اور دھوکے سے اپنے مخالفوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دے، اور اُس نے ایسا ہی کیا۔

تاریخ کی روشنی میں اگر حالات کو دکھایا جائے، تو وقت کی نزاکت صاف سمجھ میں آتی ہے، سب سے پہلے کلائڈ میں ایک زبردست ہڑتال ہوئی جو ۲۷ جنوری سے گیارہ فروری تک رہی، اس ہڑتال کا مقصد یہ تھا کہ کام کے اوقات ۴۰ گھنٹہ فی ہفتہ کر دئے جائیں، ہڑتال میں کلائڈ کے انجنیئر، جہازوں کے مزدور، اور دوسرے تمام مزدور بھی یک جہتی سے شامل تھے، مقامی یونین کے ذمہ دار افسر اور کان کے منتظمین، مزدور جماعتوں کے ساتھ ہڑتال کو کامیاب بنانے میں مشغول تھے، اس ہڑتال کا اثر دور دور تک پہونچ چکا تھا، گلاسگو جو برطانوی صنعت کا ایک اہم مرکز ہے لرزہ براندام تھا، یہاں تک کہ میونسپل آفس پر سرخ پرچم لہرا رہا تھا، اس سے بھی زیادہ طوفان خیز حالت جارج اسکوائر کے جھگڑے سے ظاہر ہوتی تھی جہاں کے مزدوروں کا غم و غصہ اتنا ترقی کر گیا تھا۔ کہ شہر کے مزدوروں کے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں پر پولیس کو لاٹھیاں برسانا پڑی تھیں، مزدوروں کے لیڈر DAVID KIRKWOOD اور (WILLIM GALLACHER) اور دوسرے مقبول لیڈروں کو نہایت بے رحمی سے پیٹا گیا تھا، پھر بھی لوگوں کو منتشر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ لوگوں نے جوابی حملہ کیا اور لاٹھیوں کا جواب لاٹھیوں سے دیا، ہر طرف یہ جذبہ پھیلتا جا رہا تھا کہ وہ ہڑتال معمولی ہڑتال نہیں تھی، حکومت کو خوف پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں عام بغاوت نہ ہو جائے حکومت نے فوراً تازہ دم نوجوانوں کی نئی فوجیں بنائیں۔ یہ وہ نوجوان تھے جن کو جنگ نے زیادہ خستہ حال نہ کیا تھا، ان فوجوں کو ٹینکوں اور مشین گنوں کے ساتھ کلائڈ بھیجا گیا۔ زبردست خلفشار اور جارج اسکوائر میں کافی خون خرابے کے بعد اس فوج نے کلائڈ پر قبضہ کر لیا اور ہڑتال کے لیڈر گرفتار کر لئے گئے، گلاسگو میں اس وقت بھی پہلی فوج کی ایک بڑی طاقت موجود تھی۔ مگر ان پر ذرا بھی بھروسہ نہ کیا گیا، تجربہ کار اور جنگ عظیم میں قربانیاں کئے ہوئے سپاہی ہڑتال کے شروع ہوتے ہی میری ہل کی بارکوں میں بند کر دئے گئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود فوج میں انقلاب کے کیسے جراثیم موجود تھے، چونکہ ہڑتال کرنے والوں کو صحیح رہنمائی حاصل نہ ہو سکی اور لیڈروں نے حالات کی صحیح نبض شناسی بھی نہیں کی اس لئے ہڑتال کرنے والے میری ہل کی مضبوط دیواروں میں سوراخ نہ پیدا کر سکے، اور ایک تربیت یافتہ فوج سے اشتراک پیدا کر کے جنگ کو باضابطہ نہ بنا سکے، خود ولیم گلچر (WILLIAM GALLACHER) نے ہڑتال کے بعد ایک بیان دیتے ہوئے کہا۔

"ہم سے شدید غلطی ہوئی۔ جس وقت ہم ہڑتال کر رہے تھے ہمیں

چاہیئے یہ تھا کہ بغاوت کر رہے ہوتے۔

گلیچر نے آگے چل کر اپنی اور دوسرے لیڈروں کی غلطی کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ:-

"یہ غلطی ہم سے اس لئے ہوئی کیونکہ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ صرف صنعتی نظم اور صنعتی تحریکوں ہی سے ہم اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ سیاسی انقلاب کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوئے ہم نے صحیح انقلابی تحریک کو حقارت کی نظر سے دیکھا کاش ہم ساری تحریکوں کو ایک دوسرے سے بغل گیر کر دیتے پھر ہم شاید اس قدر آسانی سے فنا نہیں ہو سکتے تھے"

جس وقت کہ کلائڈ کی ہڑتال کلائڈ کی حدوں میں رہتے ہوئے حکومت سے صنعتی جنگ کر رہی تھی اسوقت حکومت کے زیر اثر یونین کے وطن پرست حکام بھی اس کی مخالفت کر رہے تھے؛ انکا اقتدار دوسرے انجنیرنگ اور جہاز کے کارخانوں کے مراکز تک ہڑتال کا اثر نہ پہونچنے دینے کیلئے کافی تھا؛ بیچارے کلائڈ کے مزدور اپنے دوسرے بھائیوں کی مدد نہ حاصل کر سکے۔ صرف بالفاسٹ میں تو البتہ ہڑتالوں کا وہی زور رہا جو کلائڈ میں تھا لیکن وہاں بھی عام اشتراک نہ ہونے کے باعث تحریک جلد ہی دبا دی گئی چونکہ سامراجی نظام کے تحت یونین کے حکام ہمیشہ سرمایہ داری کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں اس لئے حکومت کو موقع ملا اور یونین میں بدنظمی کے جرم میں ہڑتال کرنے والے مقامی حکام کو علیحدہ کر دیا گیا؛ مثال کے طور پر (AMALGAMATED SOCIETY OF ENGINEERS' EXECUTIVE) مختلف ایگزیکٹیو انجنیروں کی مخلوط سوسائٹی نے کلائڈ کے مقامی حکام کو برخاست کر دیا۔ کلائڈ کے جھگڑے سے کچھ پہلے ہی ملک کے دس لاکھ کوئلے کے مزدوروں نے بھی فتح کے نشہ میں متوالے سامراج کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں:- ۱۴ جنوری ۱۹۱۹ء کو ساؤتھ پورٹ کے مقام پر کان کے مزدوروں کے فیڈریشن نے اپنی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا کہ اُجرت میں ۳۰ فی صدی کا اضافہ کیا جائے اور ۶ گھنٹے روزانہ کام کا وقت مقرر کیا جائے؛ اور کوئلہ کی کانوں کا نظم تمام ملک کے ہاتھوں میں ہو جس پر خود مزدوروں کا کنٹرول ہو۔

مزدوروں کا یہ فیصلہ ٹھکرا دیا گیا۔ کانوں پر حکومت نے اپنا قبضہ بدستور جاری رکھا۔ فیڈریشن نے مجبور ہو کر اپنے لکھوکھا ممبروں سے ایک احتجاجی تحریک کیلئے اپیل کی؛ اس فیصلے کیلئے کہ ہڑتال ہونی چاہیئے یا نہیں، ووٹ لئے گئے، ایک لاکھ پچاس ہزار بیاسی ووٹوں کے مقابلے میں ۶ لاکھ پندرہ ہزار ایک سو چونسٹھ ووٹوں سے ہڑتال کے حق میں فیصلہ ہوا؛ اور ہڑتال کے لئے عام اعلان کر دیا گیا۔ فروری کے آخری دنوں میں حکومت کو یہ الٹی میٹم ملا، حکومت نے حالات کی نزاکت محسوس کی؛ عام حالات بھی مزدوروں کے حق میں تھے۔ کوئلہ کے اسٹاک میں شدید قحط کی کیفیت پیدا ہو چلی تھی؛ لندن میں صرف تین دن کے استعمال کیلئے کوئلہ باقی رہ گیا تھا۔ اسی وقت ریل کے آدمیوں اور درآمد و برآمد کے مزدوروں نے بھی کوئلہ کی کان کے مزدوروں سے گفت و شنید شروع کی اور حکومت کے سامنے اپنے مطالبے بھی رکھ دئے: مختصر یہ کہ مسٹر لائڈ جارج اور ان کی حکومت کو یہ صاف معلوم ہو گیا کہ سارا ملک ایک عام ہڑتال کی تیاری کر رہا ہے اگر حکمت عملی سے کام نہ لیا گیا تو اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو روس میں دو سال پہلے ہوا تھا؛

۳۹ ایشیا

حکومت نے دورخی پالیسی اختیار کی۔ ایک طرف تو کان کے لیڈروں پر یہ رعب ڈالا کہ ہڑتال دبانے کیلئے فوج استعمال میں لائی جائے گی دوسری طرف یہ بھی کہا کہ اگر ہڑتال ملتوی کر دی جائے تو حکومت کوئلہ کی صنعت اور اُس سے متعلق تمام مسائل پر آزادانہ اور منصف مزاجی سے غور و خوض کریگی؛ تمام شکایات کی بے لاگ تحقیقات کیجائیگی۔

فیڈریشن کے صدر رابرٹ سمیلی (ROBERT SMILLIE) اور دوسرے لیڈروں نے فوراً حکومت کی پیشکش منظور کرنے کے لئے کوشش شروع کر دی؛ ہرچند کہ مسٹر سمیلی کا مزدوروں کی جماعت پر بے انتہا اثر تھا پھر بھی ان کو اپنی ساری طاقت صرف کر دینی پڑی، تب کہیں جا کر ۲۶ اور ۲۷ فروری ۱۹۱۹ء کو نمائندوں کی کانفرنس نے معمولی اکثریت کیساتھ مشروط منظوری دیدی۔ مگر ہڑتال کے اعلانات دیواروں اور شاہراہوں سے نہیں ہٹائے گئے۔ پہلے ہڑتال کیلئے ۱۵ مارچ کی تاریخ رکھی گئی تھی؛ اب ۱۵ دن کے لئے ہڑتال مزید ملتوی کر دی گئی تاکہ اس رائل کمیشن کا نتیجہ معلوم ہو سکے؛ جس کو حکومت نے فوراً مقرر کر دیا تھا۔

رائل کمیشن کے صدر مسٹر جسٹس سینکے تھے۔ اور اُن کے آدھے ممبر یا تو خود مزدوروں کے نمائندے تھے ؛ یا وہ لوگ تھے جنھیں مزدوروں نے منظور کرلیا تھا ؛ کمیشن کی نشستوں کا اثر ہیجان پیدا کرنے والا تھا، اخبارات نے اس کا موازنہ ایک انقلابی عدالت سے کیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئلہ کے سرمایہ دار ملزم کے کٹہرے میں اپنی موت کا فیصلہ سُننے کیلئے کھڑے ہیں،

۲۰ رمارچ ۱۹۱۹ء کو جو رپورٹ شائع کی گئی اس میں فی ٹولی (Shift) دو شلنگ اُجرت کا اضافہ اور کام کے اوقات میں ۸ گھنٹے کے بجائے، ۷ گھنٹے طے پائے تھے ؛ رپورٹ میں یہ بھی تھا کہ "کوئلے کی صنعت کی ملکیت اور مزدوری کا موجودہ طریقہ قابلِ مذمت ہے۔ اور کوئی دوسرا طریقہ مزدور اس کے بجائے اختیار کرنا چاہیئے ؛ ملک کے مفاد کی خاطر ہم اس بات کی رپورٹ کے لئے تیار ہیں کہ کوئلے کے مزدوروں کی آواز کانوں کے نظم ونسق کیلئے ذی اثر سمجھی جانی چاہیئے "

مزدوروں کیلئے یہ ایک نہایت پیچیدہ سی بات ہو کر رہ گئی، یہ ان کے مطالبات کی محض ایک قسط تھی، وہ اُجرت میں ۳۰ فی صدی مطالبہ کرتے تھے، اور یہاں دو شلنگ فی ٹولی (Shift) اور کام کے اوقات میں ۸ گھنٹے کے بجائے، ۷ گھنٹے کا فیصلہ کیا گیا تھا ؛ پھر ان کے لئے یہ بھی غور طلب بات تھی کہ کیا وہ حکومت کے وعدوں پر اعتبار کرلیں ؛ جس دن رپورٹ ملک کے سامنے آئی اُسی دن مسٹر بونرلا (BONARLAW) نے مجلسِ اقوام میں کیبنٹ کے نام پر حکومت کے ان وعدوں کو دہرایا۔ ساتھ ہی انھوں نے حکومت کی طرف سے پہلی دھمکی کو بھی دہرایا کہ اگر ہڑتال شروع کی گئی تو حکومت اسکو کچل دینے میں اپنی پوری طاقت سے کام لیگی : اسی دن کان کے فیڈریشن کے سکرٹری کے نام ایک خط بھی بھیجا گیا جو نیچے درج کیا جاتا ہے :-

۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ وہائٹ ہال
۲۱ رمارچ ۱۹۱۹ء
ایس۔ ڈبلو

پیارے جناب !

گذشتہ رات کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کوئلے کی صنعتی کمیشن کے متعلق حکومت کی پالیسی کے سلسلے میں میں نے ایک بیان دیا تھا ؛ میں اس خط کے ذریعہ نہایت مسرت کیساتھ اپنے اس بیان کی مزید تائید کرتا ہوں، جیسا کہ غالباً آپ چاہتے ہیں کہ میں ایسا ہی کروں کہ حکومت سر جان سینکے کی رپورٹ کی سفارشوں پر اس کی پوری روشنی میں مکمل طور پر عمل کرنے کیلئے تیار ہے ؛

آپ کا عقیدتمند

اے بونرلا

بونرلا BONARLAW کے خط کا یہ نتیجہ ہوا کہ کان کے مزدوروں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ۱۶ رمارچ کو منعقد ہوئی جس میں وہی طے پایا کہ جو بونرلا چاہتے تھے، سر جان سینکے کی رپورٹ منظور کرلی گئی، ووٹ پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا گیا اور آخر اکثریت سے یہ فیصلہ کرا دیا گیا کہ ہڑتال کی نوٹس ہٹالی جائے۔ یہ سرمایہ کا جادو تھا جس میں سب موہ گئے۔

حکومت کو دوبارہ اطمینان کی سانس لینے کا موقع ملا۔ امتحان میں حکومت کو کامیابی ہوئی۔ خطرہ کا نازک لمحہ دور ہوگیا۔ ہوائی وعدوں نے اپنا اثر کیا اور چھپی ہوئی دھمکی کارگر ہوئی۔ یہ بات کہ وعدے صرف رسمی تھے، چند ہی دنوں بعد معلوم ہوگئی ؛ ۲۳ رجون کو کوئلہ کی کان کے رائل کمیشن نے اپنی آخری رپورٹ پیش کی۔ اس بات پر کہ مزدوروں کا نظم ونسق میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور رہا اور کان کی قدرت پر قومی ساکھ قائم ہو، چیرمین کے علاوہ مزدوروں کے چھ نمائندوں نے اتفاق کیا۔ مالکوں اور کان کے خداؤں کے پانچ نمائندوں نے ملکیت میں کسی قسم کی تبدیلی کے خلاف رپورٹ دی، چھٹے سرمایہ دار نمائندے سر آرتھر ڈکھم (SIR ARTHUR DUCKHAM)، نے اپنی اسکیم سب سے الگ پیش کی۔ انھوں نے کوئلے کی صنعت کو ایک ٹرسٹ کی ماتحتی میں لانے کی خواہش ظاہر کی جس کے تحت پرائیویٹ سرمایہ دارانہ ملکیت اور نسق برقرار رہتا۔ مزدوروں نے حکومت پر پورا بھروسہ ظاہر کرتے ہوئے، حکومت سے اپیل کی کہ وہ سر جان سینکے کے مشوروں پر عمل کرے گو اُن کے مقاصد پورے نہ ہوتے تھے، پھر بھی اُن کے نمائندوں کی کانفرنس نے جولائی میں کثرتِ رائے سے سر تسلیم جھکا لینے کیلئے کہدیا تھا۔ لیکن وعدوں کی بات اب پُرانی ہوگئی تھی۔ ماضی کی باتیں خواب سے زیادہ حقیقت ہی کب رکھتی

ہیں اور خواب پر کہیں عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ حکومت نے اب دوسرے ہتھیار استعمال کرنے شروع کئے۔ اسوقت مختلف کوئلہ کے کانوں میں اجرت کے مسئلہ پر نئے کام کے اوقات (گھنٹے) کے مطابق گفت و شنید ہو رہی تھی لیکن اسی وقت کوئلہ کی کانوں کے کنٹرولر نے حکومت کا نیا حکم نافذ کر دیا جس کے بعد اجرت میں دس فیصدی سے زیادہ اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ حکومت کی اس نئی کروٹ نے مزدوروں میں پھر ہیجانی کیفیت پیدا کی تھما ہوا طوفان پھر اٹھ کھڑا ہوا، انقلاب کی نئی بجلیاں کوندنے لگیں۔ مزدوروں کی جماعت میں حشر برپا ہو گیا۔ یارک شائر (YORK SHIRE) کی کوئلہ کی کان میں زبردست ہڑتال ہوئی جو وسط جولائی سے وسط اگست تک رہی۔ ہڑتال کو ختم کرنے کیلئے اور مزدوروں کی طاقت کو کچلنے کیلئے فوج کا پھر استعمال ہوا۔ لیکن اس مرتبہ حکومت مزدوروں کی یک جہتی نہ ختم کر سکی۔ بٹے ہوئے دھاگوں کی طرح وہ مضبوط تھے، توڑے نہ جا سکے۔

آخر حکومت کو شکست ہوئی اور اجرت کیلئے امتناعی حکم واپس لے لیا گیا۔ اس جھگڑے میں یارک شائر کے کوئلہ کی کان کے مزدوروں کی ایسوسی ایشن نے ہڑتال کے دنوں میں مزدوروں کی مالی مدد اور تنخواہ پر ۳،۵۶،۰۰۰ پونڈ (۴۶،۲۸،۰۰۰ روپیوں سے کچھ زیادہ) خرچ کیا۔ مگر حکومت موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ جس ہفتہ میں یارک شائر کے مزدوروں نے کام شروع کیا، اُسی ہفتہ میں حکومت نے پھر حملہ کیا۔

۱۸ اگست کو دارالعوام میں مسٹر لائڈ جارج نے اعلان کیا کہ حکومت کانوں پر قومی ساکھ کو نہیں تسلیم کر سکتی اور سر جان سینکی کی رپورٹ کے اس مشورہ کو نامنظور کرتی ہے۔ اس کے بجائے حکومت نے سر آرتھر ڈکھم کی رپورٹ کے مشوروں پر غور کرنیکا ارادہ ظاہر کیا۔ یعنی کوئلہ کی کانوں کو ٹرسٹ کے زیر نسق کر دیا جائے۔ مگر مزدوروں کا ذکر تو کیا خود دارالعوام میں کسی نے حکومت کے اس اشارہ پر سنجیدگی سے سوچ بچار نہیں کی۔ حکومت کے تحریری وعدے کو پانچ مہینے گذر چکے تھے مزدوروں کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے صاف دیکھا کہ حکومت نے انھیں کس طرح بیوقوف بنایا ہے۔ لیکن اُن کی آنکھیں اسوقت کھلیں جب بٹے ہوئے دھاگے جیسے ہو چکے تھے۔ مزدوروں کے لیڈر مسٹر سمیلی (SMILLIE) نے صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ۲ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو ڈیلی ہرلڈ (DAILY HERALD) میں لکھا:۔

"مزدوروں نے نہایت دلگی گرانی کے ساتھ اپنے مطالبوں کو کمیشن کے سامنے پیش کرنیکا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ پچھلے تجربوں سے یہی ان پر واضح ہوا تھا کہ ایسے کمیشن اسی لئے بیٹھائے جاتے ہیں تاکہ حکومت ایسے مسئلوں کو ٹال سکے جن پر غور کرنا بھی اس کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔ مسٹر ہربرٹ اسمتھ (HERBERT SMITH) مسٹر فرنیک ہاجز (FRANK HODGRS) اور میں اس بات کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ ہم ہی نے مزدوروں کو اس فیصلہ پر مجبور کیا تھا کہ وہ کمیشن کے سامنے اپنے مطالبے پیش کریں اور صبر و برداشت سے کام لیں اور میں نہایت ایمانداری اور سچائی سے اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ حکومت اپنے وعدوں سے پھر جائیگی، ہمارا طرز عمل بالکل دوسرا ہوتا۔ ہم اُسوقت مزدوروں کو یہی مشورہ دیتے کہ وہ کمیشن کو ٹھکرا دیں اور فیڈریشن کے کثرت آرا سے منظور کئے ہوئے ریزولیشن پر عمل کریں۔"

دارالعوام میں بھی اس کا ردعمل حشر انگیز ہوا۔ قوم پرست نمائندوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ۱۸ اگست کے ایک اجلاس میں مسٹر ورنن ہارٹ شارن (VERNON HARTSHORN) نے سوال کیا۔

"آخر کمیشن کیوں بیٹھائی گئی تھی؟ کیا یہ سب دھوکہ ہی کا کھیل نہیں تھا؟ کیا ہمارا یہ مطلب نہیں تھا کہ اگر کمیشن قومی ساکھ کے موافق فیصلہ کریگی، ہم اس پر عمل کریں گے؟ . . . اسی قسم کے سوالات ملک کی کانوں کے تمام مزدور ہم سے پوچھیں گے اور وہ ہم نمائندوں کے منہ پر کہیں گے کہ انھیں ہم نے دھوکا دیا، اُن سے دستبردار ہو گئے اور انھیں دن دھاڑے لوٹ لیا۔"

اس موقعہ پر حکومت کی چالوں پر گہری نظر ڈالنا غلط نہ ہوگا۔

فروری میں حکومت نے وعدوں کی جو تصویر پیش کی تھی۔ اس میں فوجی طاقت کے مظاہرہ کے پس منظر کی بھی تصویر تھی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس کو فیڈریشن کے لیڈروں اور خصوصاً مسٹر سمیلی (SMILLIE) نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کشت و خون (ظلم و ستم) کا ایک تصویری مرقع ان کے دلوں پر بیٹھ گیا اسی خیال سے لرز کر صدر نے ایک پرائیویٹ جلسہ میں اپنے ساتھیوں سے کہا تھا: "اگر ہم نے ہڑتال جاری رکھی، وہ مسلح سپاہیوں کو ہمارے سروں پر بھیجدینگے۔ میرے لوگ گولیوں سے اڑا دیئے جائیں گے۔ میں اس خون خرابہ پر جو کچھ بھی ملے ترجیح دوں گا"

یہ لیڈروں کی سخت غلطی تھی۔ کیونکہ اس وقت حکومت کے پاس باقاعدہ اور بھروسہ کے قابل فوج اتنی کافی تعداد میں نہ تھی کہ ایک ایسی تحریک کیلئے جو سارے ملک میں پھیل جاتی، استعمال میں لاتی۔ یہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کے شروع میں حکومت کی فوجی طاقت خود ہی متزلزل تھی۔ چھ مہینے کے بعد بھی جب فوج پوری طرح منتشر ہو چکی تھی، ہڑتال کرنے والوں کے خلاف اُن کی دوبارہ بھرتی حالات کی روشنی میں کسی طرح کامیاب نہ ہوتی۔ ویبس (WEBBS) نے اپنی تاریخ مزدور تحریک میں لکھا ہے:۔

"یہ واقعہ تھا کہ اکثر موقعوں پر سپاہیوں نے ہڑتال کرنے والوں سے پوری ہمدردی ظاہر کی اور فوراً ہی اُن سپاہیوں کو ان کی بیرکوں میں بند کر دیا گیا۔ حکومت کی کیبنٹ (CABINET) کو فوج کے سب سے بڑے افسر نے آگاہ کر دیا تھا کہ فوج کو ہڑتال کرنے والوں مزدوروں کے خلاف جنگ کیلئے اگر مجبور کیا گیا، بغاوت کا شدید اندیشہ ہے"

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد ملک جس معاشرتی کشمکش میں مبتلا تھا، اقتصادیات کی جو فصیلیں روز بنتی تھیں اور خود بخود گر جاتی تھیں، اس کو دیکھتے ہوئے گولیوں کی پہلی ہی باڑھ کے بعد حکومت کی بنیادیں تک ہل جاتیں گولیوں کی آواز حکومت کیلئے موت کی آواز ہوتی۔ اور حکومت کیلئے یہ موقع اس موقع سے زیادہ خطرناک ہوتا جب ۱۹۰۵ء میں پیٹرسبرگ (PETERS BERG) میں "خونی اتوار" کا کھیل کھیلا گیا تھا۔

بہرصورت حکومت کی اس وعدہ شکنی کا یہ اچھا نتیجہ ہوا کہ مزدوروں پر یہ چیز پوری طرح واضح ہو گئی، کہ سرمایہ داروں کی بنائی ہوئی حکومت کے تحریری وعدوں پر بھی کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیئے اس لئے کہ وہ طبقہ ہمیشہ حالات کو دیکھ کر اپنی زبان بھی بدلتا رہتا ہے۔ ایسے طبقہ کی حکومت اخلاقی روایات کو کبھی بھی دھیان میں نہیں لایا کرتی۔

فروری اور مارچ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے ایک طرف تو کان کے مزدوروں کو سبز باغ دکھایا، دوسری طرف سڑکوں کے الفاظ میں گورنمنٹ نے ایسی چالیں بھی چلیں جن سے حکومت کا حسنِ ظن عام طور پر سمجھا جا سکے یعنی کسی خاص مراعات کو پیش نہیں کیا۔ بلکہ اُس مشنری کا بجلی بٹن دبا یا جس نے اپنی گھن گرج سے ٹریڈز یونین کو یہ یقین دلا دیا کہ واقعی مراعات بھی ملنے ہی والی ہیں۔ کارخانہ داروں کی انجمنیں اور ٹریڈ یونین کو ایک صنعتی کانفرنس میں حصہ لینے کیلئے دعوت دی گئی جو لندن میں اسی دن منعقد ہوئی جس دن کہ کان کے مزدوروں کی کمیشن میں حصہ لینے کیلئے رضامندی ظاہر کی تھی۔ انجنیروں اور یونینوں نے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ لیکن پھر بھی کانفرنس نے اپنا کام جاری رکھا اپریل کے آخری اجلاس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۴۸ گھنٹہ فی ہفتہ کام اور ایک قطعی مقررہ اُجرت کے متعلق قوانین بنا دیئے جائیں۔ ایک مشترکہ کمیٹی مزید غور و تحقیق کیلئے بنائی گئی۔ جس کے سامنے ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں نے مزدوروں میں بے چینی دور ہونے کے وجوہ اور اُن کے سدِّ باب کے متعلق رپورٹ پیش کی اس رپورٹ کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مزدور اس کے لئے بالکل تیار ہو گئے تھے کہ سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کے خلاف ملک کو آخری چیلنج دیدیا جائے مگر ہمیشہ کی طرح چونکہ بدقسمتی سے تحریک کی رہنمائی ذہنی مفکرین کر رہے تھے اس لئے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ایسے چیلنج کو کسی قومی صنعتی کانفرنس کے ذریعہ بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ حکومت نے دکھانے کیلئے بلوں کے کئی مسودّہ بنائے مگر ان کے خاکے ایسے تھے کہ یونینس نے انھیں نامنظور کر دیا۔ کانفرنس منعقد کرا کے حکومت گرم لوہے کو سرد کر ہی چکی تھی البتہ بعد کے کئی سالوں تک کمیٹی دھیرے دھیرے ٹھنڈے ہوتے ہوئے لوہے کو ایک کاروباری لوہار کی طرح پیٹتی ہی رہی:

کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ حکومت کی چالوں کو سمجھ کر مزدور تحریک کے لیڈروں نے سرِ تسلیم پیٹ لینے کے بجائے اک نعرۂ تحسین بلند کیا

اور انٹی حکومت کی پیٹھ ٹھونکی ر Mr. J. McGurk) جو لنکا شائر کے ایک نمایاں مزدور لیڈر رہتے ۱۹۱۹ء میں ساؤتھ پورٹ کے مقام پر منعقدہ سالانہ لیبر کانفرنس میں اپنے خطبۂ صدارت میں اس طرح لکھا ہے :

> پچھلے چند مہینوں میں صنعتی بےچینی زیادہ گہری رہی جس کا اثر دور دراز تک وسیع رہا ہے ۔ ایک وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری قوم حکومت کے سامراجی نظام کے خلاف بغاوت کر دے گی ساری قومی صنعت منتشر ہو جائے گی جس کا نتیجہ سارے ملک کے ہر باشندے پر تباہی لائیگا ، خوش قسمتی سے حکومت نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ مزدوروں کا دماغ اتنی دیوانگی تک پہونچ چکا ہے کہ فوری علاج اور توجہ کی ضرورت ہے ۔ کان کے مزدوروں کے فیڈریشن نے ہرتال کا نوٹس دے ہی دیا تھا جسکے کچھ ہی دنوں کے بعد ریلوے کے مزدور ، درآمد و برآمد کے مزدور ، انجینیرنگ اور جہاز کے کارخانوں کے مزدور ، اور قریب قریب تمام تجربہ کار اور ناتجربہ کار مزدور جماعتوں کی طرف سے حکومت کو نوٹس مل چکے تھے ۔ ساری مزدور جنتا غم و غصہ کے بخار میں تھرتھرا رہی تھی ۔ حکومت نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا کہ زیادہ دیر خطرہ سے خالی نہ ہوگی ۔ حکومت نے فوراً ہی اپنا دروازہ کھول دیا ۔ ایک طرف سنکے کمیشن بٹھائی دوسری طرف صنعتی کانفرنس بلائی ان دونوں تحقیقاتوں نے زیادہ دیر کے لئے نہیں تو ہنگامی طور پر ضرور مزدوروں کے پارۂ حرارت کو اتار دیا ۔ وہ خوفناک صنعتی بےچینی جو ملک کے طول و عرض میں پھیلتی جا رہی تھی ۔ عارضی طور پر ختم ہو گئی اور ملک ایک بڑی تباہی سے بچ گیا

صاحب موصوف کے جواب میں مزدور تحریک کے زبردست مورخ اور ماہر اقتصادیات مسٹر کول نے لکھا ہے کہ :-

> صنعتی کانفرنس اور کول کمیشن میں مزدوروں کی شرکت ہی کا یہ نتیجہ ہوا ! کہ ۱۹۱۹ء کی پہلی چھ ماہی کی خوفناک صورتِ حال پر پانی سا پڑ گیا جس وقت کہ حکومت نے کانفرنس بلائی اور کمیشن بٹھایا ، مزدور لیڈر اپنے بھولے پن سے پھولے نہ سمائے ۔ لیکن جونہی سرمایہ داری کیلئے نہایت فوری خطرہ ختم ہو گیا حکومت نے نہ اپنی عزت کا پاس کیا ، وعدوں کی لاج رکھی ! نہ اپنی زبان کا خیال کیا اور تھکا تھکا کر مزدور سنگٹھن کو توڑ دیا ۔ ممکن ہے کہ اس بارے میں رائیں مختلف ہوں کہ مزدوروں میں فوجی جنگجوئی کے جذبہ کا کیا نتیجہ ہوتا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صنعتی کانفرنس بلاکر اور کمیشن بٹھاکر حکومت کو اس کا موقع ضرور مل گیا کہ ایک طرف فوری خطرہ دور ہو جائے دوسری طرف عام فوجی پالیسی کو ترقی نہ ہونے پائے

(باقی)

میڈم کیوری

جدید انکشافات میں ریڈیم نہایت اہم دریافت ہے۔ اس کے انکشافات سے نہ صرف کیمیائی اور طبیعی سائنس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے، بلکہ صنعت و حرفت، علم الحیاۃ، اور طب و جراحی کو بھی اس سے بہت فائدہ پہونچا ہے۔ تحقیقات و تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ جو شعاعیں ریڈیم سے خارج ہوتی رہتی ہیں، ان میں ہر قسم کی زندگی میں ہیجان پیدا کر دینے کی طاقت ہے۔ ان شعاعوں کے اثر سے پودوں کی نشو و نما ہوسکتی ہے اور کلیاں کھل سکتی ہیں۔ بعض علمائے سائنس کا خیال ہے کہ آگے چل کر ان شعاعوں کی مدد سے انسانی زندگی کو بھی ایک طویل عرصہ تک قائم و برقرار رکھ سکیں گے۔ چنانچہ آج کل بھی ان شعاعوں کی مدد سے مختلف مہلک امراض کا علاج ہو رہا ہے۔

اگر ہم کسی معمولی دھات کو سونے میں تبدیل کرنا چاہیں تو ریڈیم کے ذریعہ سے یہ بھی ممکن ہے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ ریڈیم کا ایک ذرہ سخت سے سخت مرض کو دور کر سکتا ہے۔ اور ہزاروں برس تک روشنی اور حرارت پہونچا سکتا ہے۔ ماہرینِ سائنس کا قول ہے کہ ریڈیم انجن کی طرح کام کرتا رہتا ہے۔ اس کو نہ کسی ایندھن کی ضرورت ہے نہ اسکی "رفتار" کو روکا جا سکتا ہے۔ گرمی، سردی، یا دیگر موسمی تغیرات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

آؤ، ہم اس نامور خاتون کے حالات سے واقف ہونے کی کوشش کریں جس نے ریڈیم ایسی بیش بہا چیز دنیا کو بخشی اور جس نے اپنے خود انکارانہ انہماک سے دُنیائے سائنس میں وہ انکشافات کئے جن سے دنیا مالا مال ہو گئی۔ اس کی زندگی نہایت سبق آموز ہے۔ اُس کے راستہ میں طرح طرح کی مشکلات حائل ہوئیں لیکن وہ سب پر غالب آتی گئی، اور آخر کار اپنی محنتوں کا پھل حاصل کر کے رہی۔

ویسے تو کئی صدیوں سے سائنٹفک تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری ہے اور کم و بیش ہر صدی میں جدید معلومات کا اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن اس سلسلے میں انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ابتدائی دَور کو جو طرۂ امتیاز حاصل ہے وہ کسی ماقبل صدی کو حاصل نہیں۔ بات یہ ہے کہ انیسویں صدی نے ایسے نامور اور قابل سائنسداں پیدا کئے جنھوں نے اپنی علمی اور عملی قابلیتوں کے باعث تمدّن کے بوسیدہ ڈھانچہ کو یکسر بدل دیا اور تمدّن کی ایک نئی اور عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی جو بیسویں صدی کے ابتدائی دَور میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ میڈم کیوری کا نام بھی انیسویں صدی کی اُن قابل قدر ہستیوں میں شامل ہے جنھوں نے تمدّن کی اس عظیم الشان عمارت کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں جی کھول کر حصّہ لیا۔

میڈم کیوری جس کا اصلی نام میری کلوڈوسکا ہے، ۷ رنومبر ۱۸۶۷ء کو وارسا میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ وہاں کے کالج میں پروفیسری کی خدمات انجام دیتا تھا، اور والدہ لڑکیوں کے ایک ہائی اسکول کی صدر معلّمہ تھی میری کی ابتدائی تعلیم وارسا میں ہوئی۔ بچہ ماں باپ کا عکس ہوتا ہے اس لحاظ سے عالم و فاضل باپ کی گود میں پلکر وہ بہت جلد قابل ہو گئی۔ باپ کی سرپرستی نے اُس کے میلانِ طبع کو سائنس کی طرف رجوع کیا اور اُس کی مدد سے وہ سائنسی تحقیقات میں بیحد دلچسپی لینے لگی۔

میری بڑی ڈرپوک اور شرمیلی لڑکی تھی۔ کیا گھر میں اور کیا اسکول میں، وہ دبکی سی رہتی تھی۔ اسکی اُستانیوں کو اس کی یہ عادت ناپسند تھی۔ وہ ہر ممکن طریقہ سے اس کی یہ جھجک مٹانا چاہتی تھیں۔ میری کو اپنی والدہ کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھنا اور اُن سے کہانیاں سُننا بہت مرغوب تھا۔ اِن کہانیوں کو وہ اِس وجہ سے پسند کرتی تھی کہ وہ سچی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ان کہانیوں میں کبھی قدرت کی نیرنگیوں کا بیان ہوتا تھا کبھی زندگی اور روشنی کا، کبھی ستاروں اور بادلوں کی حقیقت بتائی

جاتی تھی کبھی قوس وقزح اور چٹانوں کی کیفیت۔ لیکن میری کی یہ خوشی اس سے بہت جلد چھن گئی۔ ابھی وہ نو برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ والدہ کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ یہی صدمہ اس کے لئے کیا کم تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کو وہ پرائمری اسکول بھی چھوڑنا پڑا جس میں وہ تعلیم پاتی تھی اور جہاں کی صدر معلمہ اس پر بیحد مہربان تھی۔ اب اس کو ایک روسی مدرسہ میں داخل ہونا پڑا۔ جہاں پولش بچوں کو بڑی حقارت اور اشتباہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ روسی اسکول ماسٹر پولش قومی جذبات کے سخت مخالف تھے۔ وہ اپنے شاگردوں سے دشمن ایسا سلوک کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کے گھروں کی سراغ رسی بھی کیا کرتے تھے۔ ایسے اسکول کی فضا میں بچے کیا خاک خوش رہ سکتے! میری کو اپنے قومی جذبات سے اُلفت تھی، اسلئے روسی مدرسہ میں اسکو بڑی کوفت ہوتی تھی۔

میری کی طالب علمی کی زندگی میں وہ چند گھنٹے بڑی مسرت و آرام کے ہوتے تھے جبکہ شام کے وقت وہ اپنے والد اور بھائی بہنوں کے ساتھ گھر میں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کلوڈوسکا کو ادبیات سے خاص دلچسپی تھی شاعری سے ان کو شغف تھا، اور بہت سی نظموں کا انھوں نے پولش زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ میری کو بھی شاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور بہت جلد اُس نے غیر ملکی ادبیات پر عبور حاصل کر لیا۔ انگریزی فرانسیسی اور جرمنی ادبیات اُس کے مطالعہ کی خاص چیزیں تھیں۔ طبعیات اور ریاضی سے اس کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچا کرتی تھی کہ کاش میرے پاس ذاتی لیبورٹری ہوتی تاکہ ان حقیقتوں کا میں ذاتی تجربہ کر سکتی جنکو امر قیاسی کے طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

وہ پندرہ برس کی تھی کہ اُسے اسکول کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس کے والد کی صحت اچھی نہ تھی۔ اُنھیں آرام کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ ان کے پاس بہت کم اندوختہ تھا لہذا میری کام کرنے کو مجبور ہوئی۔ اتفاق سے اُسکو گورنس کا کام مل گیا۔ اس کام کے ساتھ ساتھ اُس نے ایک اور دلیرانہ قدم اُٹھایا۔ اس نے دیہاتی بچوں کے لئے ایک خفیہ اسکول قائم کیا تاکہ جن بچوں کو روسی حکومت کے مدرسوں میں پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا وہ بھی تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ اگر روسی حکومت کو علم ہو جاتا تو میری کو جیل جانا پڑتا یا سائبیریا کو جلاوطن کر دیجاتی۔

شام کے وقت میری کتابوں کا مطالعہ کرتی تھی۔ جب سب لوگ سو جاتے، وہ اپنی سائنس کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی اور نہایت توجہ سے پڑھتی۔ اُس کی سائنس کی تعلیم نامکمل تھی، اور جن کتابوں کا وہ مطالعہ کرتی تھی وہ بھی کچھ زیادہ مفید نہ تھیں۔ تاہم اس مطالعہ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ آزادی سے کام کرنیکی عادی ہوگئی۔

میری نے چار برس تک دیہات میں گورنس کی خدمات انجام دیں بعد ازاں وہ وارسا کو واپس چلی گئی۔ اپنے والد کی وساطت سے اس کو طبعیات کی ایک لیبورٹری میں عملی تجربات کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ وہ صرف اتوار کے دن لیبورٹری میں جایا کرتی تھی، کیونکہ ہفتہ میں صرف یہی ایک دن تھا جس میں اُسے کچھ اور کام نہ ہوتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا وارسا میں اُس کی مشکلات بڑھتی گئیں۔ پروفیسر کلوڈوسکا اپنے وطن، پولینڈ کی آزادی کا نہایت زبردست اور سرگرم حامی تھا۔ میری کو بھی اپنے باپ سے یہ جذبہ وراثت میں ملا۔ چنانچہ اپنے باپ کیساتھ وہ بھی ایک انقلابی جماعت کی رُکن بن گئی۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ پولینڈ میں روس کی حکومت کا خاتمہ کردیا جائے۔ لیکن روس کی خفیہ پولیس کو اس جماعت کا پتہ چل گیا۔ آخر کار ایک روز رات کے وقت وہ ایک بوڑھیا کا بھیس بدل کے چھپ چھپاتے پیرس کو روانہ ہوگئی۔ اُس کے پاس کوئی ذریعہ تھا نہ سہارا۔ لیکن اُس نے کسی بات کی پروا نہ کی۔

پیرس میں میری نے ایک چھ منزلہ مکان کی اٹاری میں رہائش اختیار کی، اور حصول معاش کے لئے سار بون لیبورٹری میں کیمیائی آلات کو صاف کرنے کی خدمت پر مامور ہوئی۔ اٹاری کا کمرہ بہت چھوٹا اور غیر آرام دہ تھا۔ جاڑوں میں برتن کا پانی جم جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے تمام کپڑے بستر پر بچھا لیتی تھی کہ کچھ تو گرمائی حاصل ہو سکے۔ اٹاری میں ایک آہنی انگیٹھی ضرور تھی۔ لیکن کوئلوں کو اتنی بلندی پر لیکر چڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ علاوہ ازیں کوئلہ خریدنے کیلئے میری کے پاس بعض اوقات پیسے بھی نہ ہوتے تھے۔ وہ اپنا کھانا اسپرٹ لیمپ پر تیار کرتی تھی۔ بسا اوقات ایک پیالہ قہوہ، تھوڑی سی خشک روٹی، اور کچھ پھل اس کا

۴۵

کھانا ہوتا تھا۔ روٹی اور تھوڑے سے دودھ کے سوا کوئی اور چیز اُسے مہینوں کھانے کو نہ ملتی تھی۔ اس افلاس و غربت کے باوجود اُس کے شوقِ تعلیم نے اُسے ہمیشہ خوش رکھا۔ جیسے جیسے اُس کی تعلیم میں ترقی ہوتی گئی، اُس کے سامنے ایک نئی دُنیا ظاہر ہوتی گئی۔ اپنی تکلیفات پر کچھ سوچنے کا گویا اُسے موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

ساربون لیبورٹری کے شعبۂ طبعیات کے صدر نے جب میری کی طبیعت کا رجحان اور اس کے کام کی صفائی دیکھی تو اُس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ غیر معمولی دل و دماغ کی لڑکی ہے۔ اُس نے چند با اثر اصحاب کے ذریعہ سے میری کے والد کو آمادہ کیا کہ میری کو طبعیات کی سند حاصل کرنے میں مدد کریں۔ اُس کے والد نے اس تجویز کو منظور کیا اور میری باقاعدہ تعلیم پانے لگی۔ دو سال کی سخت محنت کے بعد اُس نے طبعیات کی سند حاصل کی اور اس کے کچھ عرصہ بعد ریاضی کی۔ اس کے بعد اُس نے ساربون لیبورٹری میں تحقیقاتی کام شروع کر دیا ۱۸۹۴ء کے موسم بہار میں اس کی ملاقات پیئری کیوری سے ہوئی۔ وہ ایک ۳۵ سالہ جوان اور اپنے زمانہ کا نہایت قابل اور محنتی محقق تھا۔ اُس کا باپ ایک مشہور ڈاکٹر تھا جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ غریبوں اور حاجتمندوں کی خدمت میں صرف کرتا تھا۔ اُس کو نیچرل سائنس سے بیحد دلچسپی تھی۔ اُس نے اپنے بچّوں کو بھی علم نباتات اور علم الحیاۃ کے مبادیات ازبر کرا دئے تھے۔

پیئری کیوری کو ریاضی سے خاص شغف تھا۔ اس شعبہ میں اُس نے یہاں تک ترقی کی کہ وہ صرف اُنیس[19] برس کا تھا کہ پیرس یونیورسٹی کی فیکلٹی آف سائنس لیبورٹری میں اسسٹنٹ ہو گیا۔ اس خدمت پر فائز ہوتے ہی وہ پھر نیچرل سائنس کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ میری کلوڈوسکا سے اُس کی ملاقات ایک دوست کے مکان پر ہوئی تھی۔ دونوں کی طبیعت کے رجحان میں خاص مطابقت تھی۔ دونوں نے دل ہی دل میں ایک دوسرے کے علمی انہاک کو سراہا۔ دونوں کی طبیعتیں مل گئیں۔ آخر ۱۸۹۵ء میں دونوں کی شادی ہو گئی، اور میری کلوڈوسکا اب میڈم کیوری کہلانے لگی۔

نکاح کی رسم پیرس میں ادا ہوئی۔ دونوں کی مشترکہ آمدنی ایسی

تو نہ تھی کہ گھر گرہستی کا تمام سامان عمدگی سے مہیا ہو سکتا، تاہم کچھ تو احباب کے عطیات سے اور کچھ مانگے تانگے کی چیزوں سے اُن کا کام چل گیا۔ گھر کا تمام کام خود میڈم کیوری کرتی تھی۔ اتنی مقدرت نہ تھی کہ ایک آدھ ملازم رکھا جا سکتا۔ لیبورٹری میں وہ اپنے شوہر کی بھی مدد کرتی تھی اور ساتھ ساتھ پروفیسری کی سند لینے کی بھی تیاری کرتی رہی۔ ایک برس کے بعد اُسکو یہ سند مل گئی۔

۱۸۹۷ء میں ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام آئرنی رکھا گیا۔ میڈم کیوری کی مصروفیات میں اور اضافہ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اُس کے خسر اُن کے ساتھ آ رہے، اور جب تک میڈم کیوری لیبورٹری میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھی وہ آئرنی کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس طرح کام پہلے کی بہ نسبت اب نہایت خوش اسلوبی اور نمایاں کامیابی کے ساتھ انجام پانے لگا۔

۱۸۹۶ء کا ذکر ہے کہ پروفیسر ہنری بکرل نے "یورینیم" نامی دھات کے نمکوں پر جدید تجربات کئے تھے۔ میڈم کیوری اور اس کے شوہر نے بکرل کے تجربات کو دیکھا تو انھیں بہت حیرت ہوئی۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ اس دھات کا خاص مطالعہ کریں گے۔ میڈم کیوری نے تجربات شروع کر دئے، اور اس کو بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ یورینیم میں اور مادّے بھی شامل ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے ایک جدید شئے دریافت کی جو یورینیم کے مقابلہ میں زیادہ سریع الاثر ہے۔ اُس نے اس کا نام اپنے وطن کی مناسبت سے "پولونیم" رکھا۔ اس جدید انکشاف سے دونوں میاں بیوی، بیحد خوش تھے اور دونوں کو احساس تھا کہ بہت جلد ایک عظیم الشان انکشاف ہونے والا ہے۔ پیئری کیوری نے کچھ دن کے لئے اپنے تجربات کو ملتوی کر دیا اور میڈم کیوری کے تجربات میں اُس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ جب وہ دونوں مل کر "پولونیم" پر تجربات کر رہے تھے تو اُنھوں نے ایک اور عنصر دریافت کیا۔ دسمبر ۱۸۹۸ء، جس کا نام اُنھوں نے "ریڈیم" رکھا۔

میڈم کیوری کئی سال کی مسلسل اور اَن تھک کوششوں کے بعد ریڈیم کے نمکوں کو خاص حالت میں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی اور بعد ازاں اُس نے ریڈیم کے جوہری خواص کا بھی پتہ چلایا۔ اس کے بعد

اُس نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر ریڈیم اور پولونیم دھاتوں کے خواص دریافت کرنیکا بیڑا اٹھایا اور بالآخران کے تزہری مظاہر کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس مہم میں ہنری بکرل بھی ان کے ساتھ تھا۔ تینوں کی اعلیٰ تحقیقات پر سنہ۱۹۰۳ء میں انھیں نوبل انعام (آٹھ ہزار پونڈ) عطا ہوا۔

میڈم کیوری نے علمی اور عملی میدان میں بہت سے کارنمایاں انجام دیئے ہیں اور بحیثیت ایک استاد اور مُشیر کے بہت سے طالبانِ علم کو مستفید کیا ہے۔ چنانچہ سنہ۱۹۰۰ء سے سنہ۱۹۰۶ء تک وہ سیورے میں پروفیسری کی خدمات انجام دیتی رہی۔ اسکی اعلیٰ قابلیتوں کے اعتراف میں سنہ۱۹۰۴ء میں پیرس کی فیکلٹی آف سائنس نے اس کو ڈاکٹر آف سائنس کا اعزاز بخشا اور اسے اسکے شوہر کی ماتحتی میں پرنسپل آف ورکس مقرر کیا۔ لیکن افسوس کہ سنہ۱۹۰۶ء میں اس کا شوہر ایک حادثے کی نذر ہوگیا۔ وہ ایک دعوت میں مدعو تھا۔ دعوت کیا تھی، سائنس کے پروفیسروں کا اجتماع تھا۔ اُس نے اپنے رُفقاء سے دل کھول کر باتیں کیں۔ وہ اتنا زیادہ شاد و بشاش تھا کہ اس سے قبل شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ اپنے آئندہ کام کے متعلق وہ اپنے ذہن میں ایک خاکہ تیار کرچکا تھا اور اسی پر غور کرتا ہوا اپنے احباب سے رخصت ہوا۔ لیکن نہ اپنے گھر پہنچ سکا نہ لیبورٹری میں۔ وہ آدمیوں سے بچتا بچاتا چوراہے سے پار ہو رہا تھا کہ پاؤں پھسل کر گر پڑا، اور ایک وزنی لاری اس پر سے گذر گئی۔ پیئری کیوری کی روح فوراً پرواز کرگئی۔

میڈم کیوری کا دل بیٹھ گیا۔ اس کے حواس جواب دے گئے بلکہ کہنا چاہیئے کہ اس صدمہ سے وہ اتنی نڈھال ہوگئی کہ اُس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ رفتہ رفتہ جب اس کے حواس درست ہوئے تو اُس نے اس کام کو برابر جاری رکھنے کا تہیہ کیا جس کو وہ اور اُس کا شوہر مل کر کررہے تھے۔ پیئری کیوری کی وفات پر اُس کی جگہ میڈم کیوری کا تقرر ہوگیا اور سنہ۱۹۰۶ء کے بعد سے وہ اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے لگی۔ اُس کے لیکچر بالعموم تابکاری اور اُس کے متعلقہ مضامین پر ہوا کرتے تھے۔ سنہ۱۹۱۰ء میں اس نے اپنے لیکچروں کو ایک مقالہ کی صورت میں پیش کیا۔ یہ کتاب ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں میڈم کیوری نے نہایت فخر سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ "تابکاری" بجائے خود کیمیائی طبعی سائنس کی ایک بالکل جداگانہ شاخ ہے۔ اس کے بعد میڈم کیوری اپنی ذاتی لیبورٹری میں مختلف اشیاء کے تابکارانہ خواص پر تحقیق و تجربہ کرنے لگی۔ باوجودیکہ اب اس کے پاس دو بچیاں تھیں۔ اور اُن کی دیکھ بھال بالکل اُسی کے ذمہ تھی لیکن وہ اپنے کام میں برابر مشغول رہی۔

ریڈیم اور پولونیم کی تحقیق کے سلسلے میں سنہ۱۹۱۱ء میں اُسے کیمیا کا نوبل انعام عطا ہوا۔ یہ غیر معمولی اعزاز ہے۔ کیونکہ اس سے قبل یک ہی شخص کو یہ انعام دوبار عطا نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ریڈیم کے حاصل کرنے میں بیحد مالی اور جسمانی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا، مگر اس کے اور اس کے شوہر کے استقلال اور احباب کی ہمت افزائی نے اس کی تحقیق کو کامیاب بنانے میں بڑی مدد دی اور بالآخر اُس نے شاندار کامیابی حاصل کی۔

جنگِ عظیم سے کچھ عرصہ قبل پیرس یونیورسٹی میں ایک ریڈیم انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد تابکاری کی تحقیق تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے دو شعبے تھے۔ ایک "کیوری لیبورٹری" جس کا مقصد تابکاری کے متعلق کیمیائی اور طبعیاتی تحقیق ہوتی تھی، دوسرا "پاسچر انسٹی ٹیوٹ" جسمیں اس امر کی تحقیقات ہوتی تھی کہ فن طب میں اس جدید دریافت کو کیوں کر استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں سرطان کے علاج کی تحقیق ہوئی۔ اس کے بعد زمانۂ جنگ میں میڈم کیوری نے اپنا ذاتی ادارہ قائم کیا اور اسی کی تحریک و کوشش سے اُس کے مولد وارسا میں بھی ریڈیم انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔

میڈم کیوری کی قابلیت کو دنیا کا ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ مختلف علمی اداروں نے اس کو اپنا رکن بنایا اور مختلف یونیورسٹیوں نے اس کو اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ میڈم کیوری نے مختلف مقامات اور بالخصوص فرانس میں بیشمار تقریریں کی ہیں۔ اپنے شوہر کی وفات کے کچھ دنوں بعد اُس نے پیرس میں ایک تقریر کی۔ سامعین میں متعدد نامی ہستیاں شامل تھیں۔ مثلاً شاہ پرتگال، صدر جمہوریہ فرانس، لارڈ کیلون، سر ولیم ریمزے، سر آلیور لاج وغیرہ۔ آخری تین حضرات صرف اس کی تقریر کو سننے کیلئے انگلستان سے تشریف لائے تھے۔ جب میڈم کیوری

شہ نشیں پر نمودار ہوئی تو سب لوگوں نے کھڑے ہو کر اسکی تعظیم کی اور
تحسین کے نعروں سے ہال گونج اٹھا۔

میڈم کیوری اپنی لیبورٹری میں تحقیقاتی کاموں کے علاوہ اپنی
دونوں بیٹیوں آئرنی اور آیو کو تعلیم بھی دیا کرتی تھی۔ بڑی لڑکی خود اس کے
ساتھ کام کرتی تھی۔

دوران جنگ میں اس نے اپنی انسان دوستی کا پورا پورا ثبوت
دیا۔ فوجی دواخانوں میں اُس نے نہایت قیمتی خدمات انجام دیں میدانِ
جنگ میں جا کر بیماروں کو دیکھتی اور اُن کے زخموں کا ریڈیالوجی کے
ذریعہ سے علاج کرتی۔ رفاہ عام کیلئے کئی مقامات میں اس نے ریڈیم
انسٹی ٹیوٹ قائم کئے۔ چونکہ سارا کام ایک شخص سے نہ سنبھل سکتا تھا۔
اس لئے اُس نے کئی جوانوں کو اس فن کی نظری اور عملی تعلیم دی جس کی
وجہ سے کام میں سہولت اور عمدگی پیدا ہوگئی اور ریڈیالوجی سے بھی لوگ
دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔

جنگ کے زمانہ میں تو ریڈیم کے ذریعہ سے زخموں وغیرہ کا علاج
ہوتا رہا۔ لیکن اختتامِ جنگ پر میڈم کیوری نے اس بات کی ضرورت محسوس
کی کہ دیگر امراض میں بھی ریڈیالوجی سے کام لیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل
کیلئے پیرس کے ریڈیم انسٹی ٹیوٹ نے وہاں کی علم الحیاۃ کی لیبورٹری سے اپنا
تعلق پیدا کرلیا۔ پاسچیور لیبورٹری یہ تعلق پہلے ہی قائم کرچکی تھی۔ اب کام
نہایت عمدگی سے انجام پانے لگا۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر ریڈیم ہے کیا چیز؟

ریڈیم بجائے خود ایک عنصر ہے جو خام یورینیم سے حاصل کیا
جاتا ہے۔ یورینیم سے ریڈیم کو الگ کرنے کیلئے متعدد کیمیائی عمل کئے
جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ یورینیم کے بغیر ریڈیم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ میڈم
کیوری نے اس قسم کی بہت سی معدنیات پر تجربات کئے اور اُن کے
بہت سے نمونے بھی جمع کئے تھے، اور اُن کیساتھ ہمیشہ بیحد دلچسپی کا
اظہار کیا۔ اُس کا شوق اور دلچسپی ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتی ہے:۔

جب میں واشنگٹن میں ایک ادارہ کی افتتاحی رسوم
کے لئے مقیم تھی۔ تو مجھے معدنیات کا ایک نمونہ دیا گیا۔
اگرچہ اس وقت میں بہت تھکی ہوئی تھی، تاہم میرے

امریکن احباب کا بیان ہے کہ جیسے ہی میری نظریں
اُس معدنی ٹکڑے پر پڑیں، میرے چہرے پر امید
و بیم کی ایک لہر دوڑ گئی اور رسم افتتاح کے ختم ہونے
تک میری نظریں برابر اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔"

معدنیات کو صاف کرکے ریڈیم حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے

یورینیم کی قسم کی معدنیات سے چند خاص عملوں کے بعد خالص تابکار مادہ
یا ریڈیم حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی یقینی امر نہیں ہے۔ کیونکہ ہمیں کیا معلوم
کہ اس معدنی شے میں ریڈیم موجود ہے کہ نہیں۔ لہذا اس خیال سے کہ محنت
کے رائگاں ہونے کا احتمال باقی نہ رہے خارجی طور پر جانچ کرلی جاتی ہے
کہ اس معدنی شے میں تابکار مادہ ہے کہ نہیں۔ اس مقصد کیلئے بالعموم دو
طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ اُس معدنی شے کو فوٹو
گرافی کی پلیٹ پر جو سیاہ کاغذ میں ملفوف ہوتی ہے، رکھتے ہیں۔ چند
گھنٹے اس طرح رکھنے کے بعد پلیٹ نکالی جاتی ہے۔ اگر پلیٹ پر سیاہ
نشانات پڑجائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس معدنی شئے میں تابکار
مادہ یا ریڈیم موجود ہے۔ اس کے بعد اُس معدنی شے کی ایک بڑی مقدار
لیکر اور اس کی تحلیل کرکے ریڈیم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے
کہ برق پیما (الیکٹرومیٹر) میں ترقی کی لہر جاری کرکے شئے مذکور کو اس کے
پہلو میں رکھ دیا جاتا ہے۔ برق پیما کا انحراف صاف طور پر ریڈیم کی موجودگی
کا پتہ دے دیگا۔

کیمیائی طریقوں سے ان تابکار اشیا کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے
اس لئے کہ ان میں ریڈیم بہت قلیل مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ ان معدنیات
مثلاً پوٹونیم، ارنیم اور میسوتھوریم میں ریڈیم کی بہت کم مقدار شامل ہوتی ہے
یعنی ایک ٹن میں دو ڈیسی گرام۔ مزید برآں، یہ معدنیات خود بہت کم
مقدار میں حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے صرف کیمیائی ضروریات کیلئے اسکو
حاصل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے۔ لہذا صنعتی کارخانوں سے
اتحاد اور معاہدہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مستعملہ معدنیات سے ریڈیم حاصل
کرنے کی اجازت دیدیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیم اب تک بہت کم مقدار میں
حاصل ہوا ہے۔

میڈم کیوری کا بیان ہے کہ:۔

"ہماری لیبورٹری میں چند گرام ریڈیم موجود ہے۔ اس میں سے ایک گرام تو میں نے اور میرے شوہر نے حاصل کیا تھا۔ نصف گرام حکومتِ فرانس کا عطیہ ہے۔ نصف گرام ڈاکٹر ہنری راتھس چائلڈ نے تحفہ دیا، اور ایک گرام امریکہ کی خواتین کا تحفہ ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ریڈیم کس قدر کمیاب چیز ہے۔ ریڈیم کو صرف برقی پیمانوں سے وزن کیا جاتا ہے اور کیپسول یا چھوٹی چھوٹی شیشیوں کے اندر اسکو رکھتے ہیں۔

ریڈیم کے استعمال سے حد درجہ احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ بہت تھوڑی مقدار میں حاصل ہوتا ہے دوسرے فنِ طب میں اسکو استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت میں یک گونہ اضافہ ہوگیا ہے۔ تجارتی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ریڈیم کی دھاتیں اور منرل واٹرس وغیرہ میڈم کیوری کے ریڈیم انسٹی ٹیوٹ لیبورٹری کو روانہ کئے جاتے ہیں جہاں ان کی تحلیل کی جاتی ہے اور تابکار مادہ کی مقدار کے متعلق صداقت نامہ دیا جاتا ہے، جس کو دُنیا کے تمام ڈاکٹر تسلیم کرتے ہیں۔

ریڈیم سے جو شعاعیں خارج ہوتی رہتی ہیں وہ تین قسم کی ہیں۔ لیبورٹری میں انھیں اے۔ بی۔ سی (الف، ب، ج) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے:۔

الف شعاعوں میں ہیلیم کے جواہر ہوتے ہیں۔ ان پر مثبت بار ہوتا ہے۔ اور ان کی رفتار تین ہزار کیلومیٹر فی ثانیہ ہوتی ہے۔

ب۔ شعاعوں میں منفی برقی بار ہوتا ہے۔ ان کی رفتار روشنی ... ۸۶ میل فی ثانیہ ہوتی ہے۔ اور

ج شعاعیں لاشعاعوں کے مماثل ہیں، لیکن ان کا طول نسبتاً بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ لاشعاعیں جو تمام دنیا میں "ایکس رے" کے نام سے مشہور ہیں نہ صرف انسان کے جسم سے گذر سکتی ہیں بلکہ لوہا اور سیسہ بھی ان کے راستہ میں حائل نہیں ہوسکتا۔ طب میں ان شعاعوں سے بہت کام لیا جاتا ہے ان شعاعوں کے استعمال میں بیحد احتیاط کی ضرورت ہے، ورنہ نقصانِ جان کا احتمال ہے۔ شروع شروع میں کئی سائنسدانوں نے لاعلمی کے باعث اپنی جانیں ان شعاعوں کی نذر کردیں۔ ایک بار پیئری کیوری نے ریڈیم کی شعاعوں پر کچھ دیر تک اپنا ہاتھ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا ہاتھ جل گیا اور زخم ایک مدت تک مندمل نہ ہوسکا۔ پروفیسر ہنری بکرل نے ریڈیم برومائڈ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند گھنٹے میں واسکٹ راکھ ہوگئی اور بکرل کا سینہ خطرناک طور پر جل گیا۔ پیئری کیوری نے ایک دفعہ کہا تھا کہ کسی ایسے کمرے میں داخل ہونا جس میں ریڈیم کی ایک سیر مقدار موجود ہو، خواہ وہ کمرہ کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو، خود اپنی فوری ہلاکت کا سامان بہم پہونچانا ہے کیونکہ ریڈیم کی شعاعیں آنکھوں کو اندھا کردینگی اور لباس اور جسم کے ذرہ ذرہ کو جلاکر خاک کردیں گی۔ میڈم کیوری نے ریڈیم کی شعاعوں کے استعمال کا خاص انتظام کیا تھا۔ اس کی احتیاط ملاحظہ ہو کہ دورانِ تحقیق میں نہ اسکو نہ اس کے کسی ساتھی کو کسی قسم کا ضرر پہنچا۔

مذکورۂ بالا شعاعوں کی تحقیق میں بھی میڈم کیوری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی اعلیٰ قابلیت اور مہتم بالشان تحقیق نے سائنس اور خصوصاً طب کو بہت ممنون کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں ریڈیم کو زندگی کا جزو لاینفک قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ موجودہ تحقیقات سے اس امر کا انکشاف ہوا ہے کہ ریڈیم سے جملہ امراض کا معقول علاج کیا جاسکتا ہے۔

میڈم کیوری کی طبیعت شہرت پسندی سے نفور تھی۔ اس نے اس بات کو کبھی پسند نہیں کیا کہ اخبارات میں اس کی تصویر شائع ہو۔ وہ فوٹوگرافروں اور اخباری نمائندوں سے ہمیشہ بچتی رہی۔ اسی طرح جاہ طلبی کا مادہ بھی اس میں مفقود تھا۔ اُس نے جو کچھ کیا نوعِ انسانی کے فائدہ کیلئے کیا۔ یہ بات اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی کہ وہ اپنے انکشافات سے مالی منفعت حاصل کرے۔ نہ اس نے کوئی پیٹنٹ حاصل کیا نہ اپنے حقوق کے تحفظ کی کوشش کی۔ اُس کی لیبورٹری میں جتنا ریڈیم بنایا گیا وہ اُس نے اسی کو دیدیا تاکہ آئندہ تحقیقات میں اس سے کام لیا جاسکے۔

ریڈیم کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ معمولی ذہنیت کے لوگوں

کے لئے اس کو اپنے تخیل میں جگہ دینا بھی مشکل ہے۔ ایک اونس ریڈیم کی قیمت ۳/۴ ۲ ٹن سونے کی قیمت کے برابر ہوتی ہے، یعنی تقریباً پچیس لاکھ پونڈ۔ دوسرے الفاظ میں اسکو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیم سونے سے ستر گنا مہنگا ہے۔ اس کے باوجود میڈم کیوری نے اپنے اس لازوال سرمایہ کو نوعِ انسانی کی نذر کر دیا۔ کیا ایثار و قربانی کی اس سے بہتر کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟

میڈم کیوری کے نحیف و ناتواں پیکر پر نظر ڈال کر کون یقین کر سکتا تھا کہ دنیا کی سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ قابل عورت یہی ہے! اس کے چہرہ سے محنت، رنج اور فکر کے آثار ہویدا تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کی روح حیات سلب ہو چکی ہے۔ وہ سیاہ رنگ کا سادہ لباس پہنتی تھی جس میں آئے دن کے بدلنے والے ذہن کچھ تغیر نہ کر سکے۔ یہی وہ عورت تھی جس سے شاید ہزار میں ایک شخص بھی روشناس نہ ہوگا، لیکن جس نے سائنس کے اساسی تصورات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا!

افسوس کہ ۴ر جولائی ۱۹۳۴ء کو یہ نامور خاتون اس دارِ ناپائیدار سے رحلت کر گئی۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۶۷ برس کی تھی۔ جس اعلیٰ مقصد کو اُس نے اپنے سامنے رکھا تھا، آخر تک اسی پر قائم رہی۔ ریڈیم وہ بیش بہا عطیہ ہے جو بنی نوعِ انسان کو اس کی طرف سے عنایت ہوا۔ کچھ شک نہیں کہ اس کا نام ہمیشہ عزت و تعظیم سے لیا جائیگا۔

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

چند نتائجِ فکر

اگر انسان یہ سمجھ لے کہ بعض اوقات اس کی ذراسی "لغزش" سے خود اس کے مشاہدات اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں تو نگاہ اٹھاتے ہوئے گھبرانے لگے۔

کسی نہ کسی نوعیت سے پرستش تو سب کرتے ہیں مگر کوئی یہ بھی سمجھنا چاہتا ہے کہ جب انسانی فطرت میں "جذبۂ پرستش" یکساں ہے تو یہ دنیا کے پرستش گاہوں میں اختلاف کیوں ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ انسان خود پرستش کرنے سے کہیں زیادہ دوسروں کو اپنے اصول کے مطابق پرستش کرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شعاع کی خفیف سے خفیف جنبش آفتاب کے نظام کی مطابعت کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تو حقیقت ہے کہ اگر آفتاب کے نظام کو برقرار رہنا ہے تو کسی شعاع کی ایک خفیف سی جنبش کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابھی آپ نے کوئی نیکی کی، اور آپ کے ہونٹوں پر تبسم کی موجیں دوڑ گئیں —— ابھی آپ نے کوئی بدی کی اور آپ کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے —— گویا آپ انسانیت کے بھیس میں ایک ایسا کھلونا ہیں جسے خود اپنے اعمال کے نتائج کو بھی صحیح طور پر محسوس کرنیکا حق نہیں ہے!

جب آپ کے افعال میں تقلیدی رنگ نمایاں نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی حقیقی قوتیں اضمحلال پذیر ہو رہی ہیں۔

مفکّر

ٹیگور کیساتھ دوسال

یہ تقریر میری ایک کتاب "میرے ملاقاتی" (جو زیرِ قلم ہے) کے مضمون "رابندرناتھ ٹیگور" کا ایک حصہ ہے اور ۱۲ر نومبر ۱۹۳۹ء کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیگئی تھی۔ اسکی اشاعت کیلئے آل انڈیا ریڈیو کی اجازت حاصل کرلی گئی ہے۔

عرش تیموری

سُرخی مائل چمپئی رنگ، آنکھیں غلافی اور گہرے غور وفکر کو ظاہر کرنیوالی، چاندی کی طرح سپید بال جن سے ہوا اٹھکھیلیاں کرتی رہتی ہے بے حد دردناک اور شیریں آواز!

تقریر کرتے وقت آنکھیں بند کرلیتے ہیں اور بڑے اطمینان سے بولتے ہیں، ان کی تقریر سُنتے ہوئے سامعین کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ ایک دھیمے سروں میں گانے والی ندی میں بہے چلے جا رہے ہیں

میری اُن سے پہلی ملاقات کی تاریخ ۵ر جولائی ۱۹۳۵ء تھی، یہ میرے لئے پہلا دن تھا کہ میں اس شخص سے ملنے جا رہا تھا جس نے اپنے قلم کے زور سے ایک دُنیا کو ہلا ڈالا تھا۔

ہم تین آدمی۔ کرپلانی جی، پروفیسر کھیتش رائے، اور میں ٹیگور صاحب کے باغ میں سے گزر رہے تھے۔ ہم بالکل خاموش تھے اور اپنے اپنے حرکت کرتے ہوئے سایوں پر نظر جمائے چل رہے تھے، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، پریت کے مارے بھونرے کے گیت، اور پنکھڑیوں پر میگھ راجا کے لرزتے ہوئے آنسو جینی عورت میں بھی حُسن کا ایک احساس پیدا کردیتے ہیں تو کہاں ہم! بہرحال ٹیگور کا خوبصورت مکان آگیا۔ جہاں وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کرپلانی جی نے میرا تعارف کرایا۔

"کیا آپ پنجاب سے آرہے ہیں؟" ٹیگور نے شاید میری شیروانی کو دیکھ کر کہا۔

"جی نہیں حیدرآباد دکن سے،" میں نے جواب دیا

"آپ بنگالی جانتے ہیں؟"

"جی نہیں، جلد از جلد سیکھنا چاہتا ہوں" میں نے کہا

ہاں ضرور سیکھئے! دیکھئے ضیاالدین بنگالی جانتے تھے اور انھوں نے جو میری نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔۔ وہ نہایت عمدہ ہے!

پھر کرپلانی جی ٹیگور صاحب سے ان کی تصویروں کے بارے میں بات چیت کرنے لگے اور کہا کہ امریکہ سے ایک شخص نے خط لکھا ہے جس میں آپکی تصویریں خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ٹیگور نے بلا ایک رقم کی بابت پوچھا، کرپلانی جی نے چند ہزار کی رقم بتائی جو اس وقت مجھے یاد نہیں۔ ٹیگور نے سنتے ہی ماتھے پر ہاتھ مارا اور میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے۔

"ہائے قسمت!"

"بلو۔ اُردو نہیں جانتے لیکن پتہ چلتا ہے کہ اُردو کے کچھ الفاظ انھیں معلوم ہیں۔ اس کے بعد اُن کی میری ادبیات کے بارے میں کچھ گفتگو ہوئی۔ اس مباحثے کو میں اسوقت نہیں سناؤں گا، کیونکہ اس میں ٹیگور نے اپنے بھی خیالات کو تھوڑے بہت رد و بدل کیساتھ پیش کیا جنھیں انھوں نے اپنے مختلف مضامین میں لکھا ہے۔

ایک دن صبح کے وقت ٹیگور صاحب کے مکان اترائن میں گیا تو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے پھلوں کا ناشتہ کررہے ہیں۔

میں اُن کے قریب بیٹھ گیا تاکہ ناشتہ ختم ہونے کے بعد بات چیت ہو۔ ناشتہ ختم کرنے کے بعد وہ تیزی سے کھڑے ہوگئے اور اُن کی چہرے پر شرارت کی چمک تھی۔

"آؤ۔ غرش تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں!"

میں اُن کے پیچھے پیچھے ہولیا —— ایک میز کے قریب جاکر ٹیگور نے گردن پھیر کر دیکھا اور پھر میز کی طرف دیکھا جس پر خطوں کا انبار لگا تھا۔ مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا اور پھر —— ان کی انگلیاں تیزی سے ایک موٹا سا لفافہ ڈھونڈ رہی تھیں —— جب لفافہ مل گیا تو مجھے ہاتھ اونچا کرکے دکھایا اور کہنے لگے۔

"دیکھو! اس میں کوئی چک (Cheque) ہوگا"

پھر لفافہ پھاڑا —— اور بہت مایوس سے نظر آنے لگے۔

"کیوں کیا بات ہے؟ —— آپ غمگین کیوں ہوگئے؟"

"ہائے افسوس —— اس میں تو خط ہے!" ٹیگور نے کہا۔

مجھے معلوم ہوا کہ ٹیگور اکثر یہ مذاق کیا کرتے ہیں!

پچھلے سال خزاں میں ایک سہ پہر کو ہم ٹیگور کے مکان اترائن میں بیٹھے ہوئے تھے، سورج کی کرنیں ننگے درختوں پر ناچ رہی تھیں!....

ایک دم کوئل کی کوکو نے ہماری توجہ کو جذب کرلیا! —— ایک صاحب کسمسا کر بولے:-

"گرودیو! خوب یاد آیا، آپ نے کسی جگہ خزاں کا ذکر کرتے ہوئے کوئل کی کوکو کا بھی ذکر کیا ہے، یہ کیا بات ہے؟ شاعر تو ہزارہا برس سے یہی لکھتے آئے ہیں کہ موسم بہار ہے اور کوئل کوک رہی ہے!"

کہنے لگے "میری اور نیچر کی کوئل تو تمام سال کوکتی ہے، مگر شاعروں کی صرف موسم بہار میں"

میں نے کچھ گستاخ ہوکر کہا "گرودیو شاعروں نے ٹھیک لکھا ہے، ان کی کوئل موسم بہار ہی میں کوکتی ہے"!

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز کا تعلق احساسات سے ہے، کوئی ویران قبرستان میں گراموفون بجائے تو آپ کو لطف نہیں آئے گا، اور اگر وہی گراموفون کسی رسیلی چاندنی رات میں جھیل ڈل پر چلتی ہوئی کشتی میں بجاکر سنایا جائے تو آپ بے خود ہوجائیں گے۔ یہی حال شاعروں کا ہے کہ بہار اُن میں حسن کا شعور پیدا کردیتی ہے، اس لئے خزاں کی کوئل کا نغمہ شاعروں کے نزدیک نغمہ نہیں، ان کے لئے تو بہار کی کوئل کوئل اور اس کا نغمہ نغمہ!"

مسکرائے اور کہنے لگے "ہمیں خزاں میں بھی بہار نظر آتی ہے!"

.. ..

ایک دن میں نے دیکھا کہ کسی بات سے متاثر ہیں! میں بھی چپ چاپ بیٹھ گیا —— ساون کا زمانہ، مدھ بھرے بادل، سورج کی ملگجی کرنیں، ٹیگور کا خوبصورت گھر، اور پھر ٹیگور! ایک شاعر موجود ہو تو کیوں کر رہا جاتا ہے۔ "کچھ سنائیے، گرودیو!" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا، کیونکہ وہ کسی خیال میں گم تھے۔

"کچھ سنائیے نا گرودیو!" میں نے دوبارہ کہا۔

ایک درد بھری آواز نکلی اور فضا میں نغمات کو بکھیر دیا!

.... وہ اپنی نظم "تاج محل" گاکر پڑھ رہے تھے، اور اُن پر خاص کیفیت طاری تھی۔

اس نظم کا ترجمہ یہ ہے:-

اے روضۂ مرمریں!
یہ چھلکتی ہوئی زندگی تجھے کس نے عطا کی؟
یہ ابدی زندگی کا لبریز جام تیرے ہاتھ میں کس نے دیدیا؟
جو تو اس طرح سرور دہر کے پھول کو ہمیشہ اپنے ہاتھ میں لئے
آسمان کیطرف بڑھائے خاموش کھڑا ہے!

بہار واپسیں کی سرد آہ ہمیشہ تیرا طواف کرتی ہے!

شب وصال کی آخری گھڑی تھی،

دوشیزۂ فلک کے نیلے جوبن کو ڈھانکنے والے ستاروں کی دمک پر سپیدۂ سحر سے مردنی سی چھا گئی تھی۔

رات کو تھکی ماندی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں کے آبشار کے کنارے غمزدہ دل کی تاریک گہرائیوں سے جو گنگناتا ہوا گیت کبھی سنائی دیا تھا،

وہ آج کہیں نہیں!

لیکن اے ابدی زندگی کے مرمریں تاج!

وہی نغمہ، وہی نوائے غم، تجھ میں آج بھی انگڑائیاں لے رہی ہے!

عاشق شہنشاہ نے ٹوٹے ہوئے دل سے اپنے سرمایۂ فراق کا موتی نکالا اور زمانے کی ہتھیلی پر رکھ دیا!

اس شہنشاہ کا کوئی دربان، کوئی پہرہ دار، اس کی حفاظت کیلئے موجود نہیں!

شہنشاہ عالم کے اس دردِ دل کے موتی کو صرف آسمان گھیرے ہوئے ہے۔

اس درد دل کے موتی کو آسمان ایک پریم بھرا بوسہ سدا سے دے رہا ہے!

صبح اپنے نور کی پہلی کرنوں سے اسے نہلاتی ہے!

چاندنی اسے اپنی پیلی پیلی حسرت بھری روشنی کا لبادہ پہناتی ہے!

اے ملکہ ممتاز! تیرے عشق کی یاد عالم بقا میں تیرے حسن پر سبقت لے گئی!!

——— + ———

نظم ختم ہوگئی، وہ بالکل خاموش تھے، اور سکون کی لہریں ان کے چہرے پر کھیل رہی تھیں۔ شاید اُن کو محسوس ہو رہا ہو کہ کوئی بھاری بوجھ ان کے سینے سے ہٹ گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کہنے لگے:

"لوگ مجھے صرف شاعر اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والا انسان سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نوجوانی سے ہی مجھے اپنی جاگیروں کا کام سنبھالنا پڑا، گو نو عمری کی وجہ سے ایسے کاموں سے بھاگتا تھا لیکن میں ویران گاؤں میں رہنے پر مجبور تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے گاؤں کے رہنے والوں کی جہالت اور چھوٹی چھوٹی خود غرضیوں نے متوجہ کیا اور میں گرام سُدھار میں منہمک ہوگیا!

یہ ہے ٹیگور کی زندگی کا اصلی مقصد! اور وہ بہت کامیاب ہے!!

آج بھی اس کی جاگیروں میں گھوم کر جس سے بھی پوچھئے کہ وہ کیسے زندگی بسر کر رہا ہے اور اس زمین پر کس کا راج ہے؟'

تو وہ یہی جواب دیگا کہ "رام راج" ہے! — شکھ ہی شکھ ہے!!"

——— ∴ ———

چند سال پہلے کا ذکر ہے جب کہ ٹیگور رام گڑھ کی پہاڑیوں پر ٹھیرے ہوئے تھے:

ایک دن پہاڑیوں میں گھومتے گھومتے فطرت کے حسن سے لطف اٹھاتے دور نکل گئے، جب زیادہ دیر ہوگئی اور ٹیگور واپس نہ آئے تو ان کے پرسنل سکریٹری، سدھار کانتا رائے چودھری پریشان ہو گئے اور انھیں ڈھونڈنے نکلے۔ آخر کار وہ اونچائی پر خوشبوؤں، رنگین پھولوں اور حسین تلملاتی تیتریوں کی چھوٹی سی دنیا میں ملے جہاں وہ بیٹھے اپنے ایک پاؤں میں سے موزہ اتار رہے تھے۔

"آپ موزہ کیوں اتار رہے ہیں؟" سدھا کانتا بابو نے پوچھا۔

شاعر نے جواب دیا "چند منٹ پہلے میں بنگال کے اُس پرانے خیال کو دعوت دے رہا تھا کہ تلوا کنول کی پنکھڑی جیسا ہوتا ہے"

"یہ خیال میرے نزدیک رواجی تھا، مگر آج معلوم ہوا کہ یہ کنول کا تخیل رسمی و رواجی نہیں بلکہ اس کے معنے بہت گہرائی لئے ہوئے ہیں کیونکہ چند منٹ پہلے ایک شہد کی مکھی میرے موزے میں گھس گئی اور تلوے میں کاٹ لیا، جس سے ثبوت ملتا ہے کہ میرے تلوے کو کنول سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور ہے!"

یہاں، یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ٹیگور کا مذاق صرف آپ کے

پھولوں پہ مسکرا سکتا ہے، ہنستا نہیں سکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مذاق تہذیب، شائستگی کی حدوں سے باہر نہیں ہوتا اور عام طور پر ادبی شان لئے ہوئے ہوتا ہے۔

ایک واقعہ بہت مزے دار ہے۔ وہ یہ کہ اسکول کے بچے آم کے درختوں پر چڑھ کر کیریاں توڑ توڑ کر کھا جایا کرتے تھے۔ بچوں کے استادوں کو اس بات کا بہت غم تھا کہ وہ آم نہیں کھا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک استاد جو آم کے بہت زیادہ شوقین تھے، اس حرکت سے بہت ہی ناراض ہوگئے۔ ٹیگور کے پاس دوڑے ہوئے پہنچے اور کہا "دیکھئے گرودیو یہ لڑکے کیریاں توڑ کر کھا جایا کرتے ہیں اور ہم لوگ آم کی صورت بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

ٹیگور صاحب سن کر خاموش ہوگئے اور ان کے لئے چائے منگوائی جب انھوں نے دیکھا کہ ٹیگور خاموش ہیں تو بے چین ہو کر کہا:۔

"گرودیو! ان کے لئے کوئی سزا تجویز ہونی چاہیئے"

"آپ ہندو ہیں" گرودیو نے پوچھا

"یقیناً!" انھوں نے جواب دیا۔

ٹیگور نے سنسکرت کا یہ اشلوک پڑھا۔

"ما پھلیشو کدا چنم" (اپنے اعمال کے پھل کی امید نہ رکھو) اور پھر ان سے مخاطب ہو کر کہا "تو مطلب یہ کہ لڑکوں کو پھل کھانے دیجئے اور آپ کو تو پھل کی پروا نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ آپ ہندو ہیں۔"

ہمارے ملک میں فن تنقید کی جو حالت ہے، وہ سب جانتے ہیں... ضرورت ہے کہ لفظ "بہترین" اور "بدترین" کو اصول تنقید سے نکال دیا جائے اور کسی چیز کو جانچتے وقت جذبات، تعلقات، عقائد اور شخصیتوں کا خیال نہ کیا جائے۔ اسی اصول کے تحت ہم ٹیگور کو ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے جانچیں تو بہتر ہوگا۔

ہم اس لئے ٹیگور کو بڑا نہ سمجھیں کہ اسے نوبل پرائز مل چکا ہے بلکہ اس کی بزرگی اس میں ہے کہ اس نے گوشت پوست کے دا بندرا ناتھ سے دامن چھڑا کر ہماری پیاسی روحوں کو تسکین پہنچانے کا سامان مہیا کیا ہے۔

شانتی نیکتیان
(بنگال)

عرش تیموری

مشاہدات

رات دریا کی طرف جاتے ہوئے ہمیشہ
جگنوؤں کی نور آگیں مخملوں کے قمقمے
رات کے پہلوؤں پر کوندتے سطح
چاندنی راتوں میں الجھی طرح شاعر ہستی

جب تصور کی فضاؤں میں تڑپ اٹھتا ہے دل
ٹوٹ جاتا ہے نظام ہوں رنگیں جمال
شام کے رنگین سائے کے اتر جس طرح
سست رو دریا کے سینے میں موج کا خیال

طفل ادیب

لہ مقدس گیتا

ایران باستان

نسلیں

سب سے پہلے یہ بات گوش گزار کرنی ہے کہ آج کل کے آدمی پہلے جیسے آدمی نہیں ہیں پہلے بھی مختلف قسم کے بشر آئے اور لکھو کھا برس رہ کر نابود ہو گئے ہم سے قریب ترین بشر ۴۰ ہزار سال کی مدت کے مالک رہ کر ناپید ہوئے ہیں۔ ہماری کرہ میں حادثات ہوتے رہے پست مٹتے رہے بلند ابھرتے رہے آج کل کے بشر، بشر عاقل کی تعریف میں آتے ہیں ان کا آغاز ابھی معلوم کیا جا رہا ہے مگر کم سے کم اتنا یقینی ہے کہ یہ بھی کئی لاکھ برس سے روئے زمین پر زندگانی کے مزے لے رہے ہیں

نسل شناسی والے عالموں نے آج کے آدمی کے پانچ ٹکڑے کئے ہیں۔ یہ تقسیم نسل کے اعتبار سے ہے۔

(۱) گوری یا سفید پوست یہ نسل نہ اندرتال۔ امالت رن میں ڈود مشلدرف کے پاس نہ اندرتس زیادہ پائی جاتی ہے۔ HOMONEHNDERTALENSIS

(۲) پیلی یا زرد پوست۔ HOMOSPIENS

(۳) لال یا سرخ پوست۔ ETHNOLOGIE

(۴) کالی یا سیاہ پوست۔ LYBIE

(۵) گندمی یا مالہ۔ NOLDEKE

بعض کے نزدیک صرف تین ہی نسلیں ہیں۔ وہ لال کو پیلی اور مالہ کو کالی کی شاخ سمجھتے ہیں

(۱) گوری یا سفید پوست۔ اس نژاد کی بھی تین قسمیں ہیں

(الف) ہندی اور یوروپین یا آریہ

(ب) سامی

(ج) حامی

توارت شاہد ہے کہ بنی حام نوح کے بیٹے حام کی نسل سے ہیں۔ ان کے مسکنوں کے بارے میں محققین میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ بابل میں یا پچھمی ایشیا میں رہتے تھے۔ وہاں سے افریقہ گئے اور مصر و لیبیا میں مقیم ہوئے مگر ملڈنگ کی رائے میں انکا مستقل مسکن شمالی افریقہ میں تھا اور قیافہ اور شکل کے اعتبار سے واقعی یہ لوگ افریقہ کے کانوں سے نزدیک تر ہیں۔ اکثر محققین نے قبطیوں، بربریوں، کوہوں اور حبشیوں کو بنی حام میں شمار کیا ہے۔

بنی سام گوری نسل اور سفید پوست نژاد کے ہیں عربستان بین النہرین، شامات شمالی افریقہ اور شمالی مشرقی افریقہ میں سکونت رکھتے ہیں۔ ان کی ایک شاخ بنی اسرائیلی کہی جاتی ہے یورپ اور ایشیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ سامی نژاد مشاہیر ان سے پہلے گذری ہیں۔ کلدانی، آشوری، فینیقی عبری، یہودی، اسرائیلی، آرامی اور عرب، توارت نے فینیقیوں کو بنی حام سے گنا ہے مگر محققین نے نزدیک بنی سام ہیں ان کی زبانیں ملتی جلتی تھیں، توارت کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل میلاد سے پندرہ سو سال پہلے بھی عربی بغیر ترجمان کے سمجھ لیتے تھے۔

ہندی اور یوروپین لوگوں کے مسکن ہندوستان سے یورپ تک ہیں۔ ہندوستان میں صرف آریائی ہندی ہیں یورپ میں عام یوروپین ہیں جن میں ترک تاجاری، چینی، ساموری اور یہود شامل نہیں ہیں ہندی اور یوروپین کی اصطلاح جامع نہیں ہے، اس میں امریکی ہندی، افریقی ہندی وغیرہ شامل نہیں کر لیا جاتے یہی زبانوں پر بھی ہوتی ہے۔ پھر بھی "آریہ" مدت سے جیسے فرانسی اب بھی آریہ ہی کہتے ہیں۔ یہ زیادہ جامع ہے ورنہ جزو کا اطلاق کل پر ہو جاتا "آریہ" کی تقسیم جمجمہ، زبان، مذہب، اصنام اور تاریخ سے قبل کے افسانوں کے موازنہ کے بعد آٹھ حصوں میں کی گئی ہے۔

(۱) حامس آریہ
(۲) یونانی و مقدونی
(۳) ارمنی
(۴) البانیائی (جزیرہ مالکان کے قرب وجوار میں)
(۵) اطالی - ایطالیائی یا اٹیلین
(۶) سیتی (غربی یورپ کے یوتی)
(۷) ترمنی - جرمن - (غربی و شرقی یورپ کے باشندے جرمن انیگلو سیکسن اور اسکانڈی نیوین
(۸) پیتھوانی و اسلاوی (غربی شرقی اور جنوبی یورپ کے باشندے)

بعض محققین کے خیال میں بہت زمانہ ہوا جب یہ سب لوگ جن کو ہم آریہ کہہ سکتے ہیں ایک ہی مقام پر رہتے تھے پھر شاید جگہ کی تنگی اور آب و دانہ کی قلت، زراعتی رس کی کمی اور شکار کے ناکافی ہونے کی وجہ سے دنیا کے کئی گوشوں کی طرف بڑھتے چلے گئے - یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا گروہ کس وقت اور کس طرف کو گیا - بعض کا قیاس ہے کہ یہ پھیلاؤ یہ عبور اور یہ دوا دوش تین چار ہزار سال قبل میلاد مسیح ہوئی ہوگی - ان کے اصل مسکنوں کے مسئلہ میں بھی بہت اختلاف ہے مختلف نظریے ہیں اور مختلف مقامات بتائے جاتے ہیں -

(۱) پامیر
(۲) وسطی ایشیا
(۳) ملات ایران
(۴) ارمنستان
(۵) کاریات
(۶) جنوبی روس
(۷) سواحل رود ڈینوب
(۸) شمالی آلمان
(۹) جنوبی اور غربی اسکینڈینویا

اسی طرح یورپ اور ایشیا کے ہر ممکن گوشہ میں ان کا مسکن بتایا جاتا ہے - ابھی یہ مسئلہ زیر بحث ہے، ہاں شمالی یورپ اور ایشیا ر کے متعلق کثرت رائے ہے -

پیلی . زرد پوست نژاد

بعض اس کو منگولی نژاد بھی کہتے ہیں - اکثر علمار کے نزدیک ان کا دامن بہت وسیع ہے -

(۱) چین و تبت
(۲) منگول و منچو
(۳) ترک و تاتار

یہ سب اس میں شامل ہیں - اس میں سے اکثر، شرقی ایشیا - سائبیریا اور وسطی ایشیا میں بستے ہیں - کچھ شاخیں، قفقازی - تاتاری، ترک، حجازی اور چینی وغیرہ یورپ میں ایک زمانہ سے متوطن ہیں -

باقی تمام نسلوں کا ذکر اس موضوع سے بیگانہ سا ہے - بس اتنا سمجھ لیجئے کہ زرد پوستوں کا اصلی مسکن امریکہ تھا مگر یورپین غلبہ کے بعد تتر بتر ہو گئیں - بعض اب بھی امریکہ میں باقی ہیں مگر نہ ہونے کے برابر ہیں اور چند ہی سال میں نابود ہو جائیں گے - کالی نسل والے وسطی اور جنوبی افریقہ میں اپنی حیات کے دن پورے کر رہے ہیں، مالہ نسل ایشیا کے شرقی و جنوبی میں اور اوقیانوس کبیر میں پائے جاتے ہیں اور ہندوستان اور چین کے جنوبی جزیروں میں بھی خال خال ہیں - نیکوبار سے پاک تک، سانڈویچ سے تازلاند تک پائے جاتے ہیں - مالکا - فرمزا اور میڈاگاسکر میں بھی دکھائی دیتے ہیں -

زبانیں

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا، کچھ غوں غاں، سے کچھ ہاتھ پاؤں کی حرکت اور چشم و ابرو کی نگاہوں سے ایک دوسرے سے ہمکلام ہونے لگا - قومیں آئیں - ملتیں بنیں - مدنیت اپنے ماحول کے اعتبار سے عروج اور زوال کے نقطوں سے چشمک زنی کرتی رہی - زبانیں بھی انسانی زندگی کے مختلف مدارج میں اپنے آپ کو، اقتصادی انسان کے لئے مفید بناتی رہیں - قومیں مٹ گئیں - ملتیں فنا ہو گئیں - اور زبانوں کا کوئی پتہ نہیں -

اور پتہ چلے تو کیسے ؟ ابھی ہماری تاریخ ہمارے اندازے کے سامنے وہی حیثیت رکھتی ہے جو کسی حکیم کے سامنے کسی نو آموز طفل مکتب کی ہوتی ہے

رہا قیاس اور تطابق ان دونوں کی مدد سے ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ابتدائی نطق کا بہت سا حصہ نطق حیوان سے ملتا جلتا ہوگا ڈاکٹر فیکاسٹ (SPHAECAUSTE) جو علم الکلاب کے سب سے بڑے ماہر ہیں ان کے حال کی تصنیف LINGUA FRANKA OF DOGS "کتوں کی عام زبان" میں ہم کو بتایا گیا ہے کہ انکی آواز کی اتار چڑھاؤ اور صداؤں کے بہت باریک باریک تہوں میں مقرہ معنی اور معیّن مفہوم ہیں۔

یہی معیّن مفہوم ہم ابتدائی انسانوں کی فغانی زبان میں بھی اٹکل سے پا سکتے ہیں اور غالباً ان صداؤں کا آواز طبیعی اور فطری صداؤں کی تقلید میں ہوا ہوگا۔ کم سے کم علم الاصوات والے (IONOMATOPEE منصر ہیں کہ ہم کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے اور وہ اپنے بیان کی گواہی اس طرح لاتے ہیں کہ فصحاء کے کلام میں جس موقعہ کے لئے جو لفظ استعمال ہوئے ہیں ان میں جذبات و ترنم کے تناسب سے بجلی کی کڑک، بادل کی گرج، ہوا کی سنسناہٹ، آندھی کا تور، طوفان کی گڑگڑاہٹ کے علاوہ بھی بعض اور طبعی صداؤں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اور آج بھی جب کہ انسانوں کی زبانیں معراج ترقی کے مختلف فلک بوس زینوں تک پہونچ چکی ہیں، اکثر الفاظ سے طبعی صدائیں پھوٹی پڑتی ہیں۔ جیسے دَف دَق، تہ شر، سرش، تبنول، دبدبہ، طنطنہ، فش فش، اور اسی طرح کے ہزاروں الفاظ ہیں۔

آجکل کے قاسین علم الالسنہ (PHILO GOE COMPAREE) کی رائے میں دنیا کی تمام زبانیں تین گروہ میں تقسیم ہوسکتی ہیں۔

(۱) پہلا گروہ ان زبانوں کا ہے جو ایک ہجائی کہلائی جا سکتی ہیں (LANGUES MONOSYLLABITUES) یہ زبانیں ریشی بھی کہلاتی ہیں۔ اس لئے کہ انکی بنیاد ہی ایک ریشے پر ہے۔ چینی، انامی اور سیامی زبانیں مثال میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ریشی زبان میں لغات بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لئے چینیوں کو ضرورت ہوتی ہے کہ اپنا مطلب بیان کرنے میں الفاظ کا الٹ پھیر کریں یا آواز کو گھٹائیں بڑھائیں۔

(۲) دوسرا گروہ ملتصق زبانوں کا ہے (LANGUES AGGLUTINANTES) یہ زبانیں یک ہجائی یا ریشی نہیں ہیں۔ ان کے

ایشیا

لغات میں ہزاروں اشتقاق ہیں مگر ہر شق میں اصلی صورت بے نقاب رہتی ہے اور عام طور پر اصلی لغت کے اخیر میں قواعد کے مطابق کچھ بڑھا دیا جاتا ہے۔ بعض ملتیں جنکی زبانیں ملتصق سمجھی جاتی ہیں حسب ذیل ہیں

۱۔ اورال اور الطائی جو زرد پوستوں کی شاخیں ہیں جیسے مغل، تاتاری ترک، تونفوز، فین، ساموذی وغیرہ

(ب) جاپانی اور اہالی کوری (COREE) ہندوستان کے دروبدی اور باسک (BASQUES)

(ج) امریکا کے بومی

(د) افریقہ کے جنوبی مصر میں رہنے والے زنبی اور ہوت تن تت (HOTTONTOTS) کالے کافر CAFFREES

(س) آسٹریلیا میں قارے

عبلامی کے متعلق سب متفق ہیں کہ ملتصق تھی سومری اور ہتی کے متعلق بعضوں نے تردید کی ہے حالانکہ بعض کے نزدیک سومری خالص ملتصق زبان نہیں ہے۔

۳۔ پیوندی زبانیں (FLLCTIVES) اسمیں ریشوں کا اضافہ اور شقوں کی افزائش اصل لغت کے شروع درمیان اور آخر۔ غرض ہر پہلو سے ہوتی ہے۔ اور اس میں ایک نیا جوش سا پیدا ہو جاتا ہے

۵۰

نمونے کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ فارسی زبان پیوندی زبان ہے۔ اور ترکی آذربائیجانی ملتصق زبان ہے اگر یہ زبانیں روبرو ہو جائیں تو دونوں کی نزاکتیں میزان مقابلہ میں تھوڑی بہت کارفرما نظر آئیگی۔

جیسے فارسی میں رفتن مصدر ہے جس کا ریشہ ہے رَو، اس سے کم و بیش یہ صورتیں پیدا ہوں گی۔ میروم، رفتم، میرفتم، رفتہ ام، رفتہ بودم رونده، رفتہ، برو، بروم

ترکی میں ہے گدماخ، جس کا ریشہ ہے' لدس ـــ بہت سی تیریتیں نکلی ہیں جیسے گدرم، گدوم، گدسم، گدمش دم، گدس، گدمش، گد، گدم۔

اس حرف سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ریشہ گدلی ابتدا میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور جو چیز بڑھائی گئی اس نے اصل ریشہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی زیر زبر ہوکر ریشہ سے چمٹ گئی مگر اس کے بالکل برعکس فارسی

ریشہ کے دونوں سروں پر ایک یا کئی حروف ہجا بڑھ گئے ہیں اور خود ریشہ کی صورت بھی بعض حالتوں میں تبدیل ہوگئی ہے تاکہ بعد والے حروف سے ممتزج ہوجائے جیسے "روشا" "واوُت" کے واسطے سے (ف) ہیں بدل گیا اس نکتہ کا بھی دھیان رہنا چاہیئے کہ کلمہ کی ترکیب میں مصمّت یا بے آواز حروف پر توجہ دی جاتی ہے یہی حروف لغت کی ہڈیاں سمجھے جاتے ہیں۔ رہے صدا والے یا مصوّت حروف وہ زیر وزبر کے قبیلے سے ہیں اور اسی کے رگ و پٹھے سمجھے جاتے ہیں۔

پیوندی زبان سے مراد ہیں:-

۱- سامی زبانیں - جیسے عبری اور عربی، بابلی، اسوری، فینقی قرطاجینہ اور حمیری

۲- ہندوستانی اور یوروپین ملتوں کی زبانیں، ہندی ایرین، ایرانی ایرین، یونانی اطالی وغیرہ۔

قدیم زبان کے محققین اور فقہ اللغات کے نکتہ رس اصحاب متفق ہیں، کہ زبانیں بھی مختلف دور سے ہوکر بنتے بنتے اسی موجودہ حسن وصحت کی منزل پر پہونچی ہیں مگر یہاں بھی مشاہدہ بتاتا ہے کہ ہر زبان کے ساتھ زمانے نے یکساں سلوک نہیں کیا۔ بعض پہلے یا دوسرے دور میں فنا کی گود میں سوگئیں اور ایسی زبانیں بھی ملتی ہیں جن کی حیثیت سموئے ہوئے سرد و گرم پانی کی سی ہے اور جن کو ہم آسانی سے مختلط یا مخلوط (ملی جلی) زبان کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ کے رو سے ترقی یافتہ ملتیں وہی رہی ہیں جن کی زبانیں مکمل تھیں اکثر یہی ہوا ہے کہ جس ملت کی زبان کامل تر تھی وہ دوسری ملت پر غالب آئی ہے۔ جب تاریخ گہوارہ میں تھی تو کلدہ تمدن کا مرکز تھا، اس تمدن کے موجد سومری تھے جن کی زبان ملتصق تھی۔ اس کے بعد سامی آئے جن کی زبان پیوندی تھی وہ کلدہ والوں پر چھا گئے ملتصق زبان والے عیلامی بھی ایک دفعہ تو کلدیوں کے پنجہ تسلط میں لئے اور چھوٹ گئے مگر دوسری بار آسوریوں سے اس طرح مغلوب ہوئے کہ کمر بھی سیدھی نہ کرسکے۔ بربری بھی سامیوں کے پرچم تلے آگئے دولت فراعنہ کی بنیادیں پڑ گئیں۔ فینیقیوں نے تمام دنیا میں نادر الوجود عمارتیں بنائیں اور ان کی عمارتوں کی غالب تعداد ان مقامات پر تھی جن کی

زبانیں یونانیوں سے پست تھیں۔ جیسے قرطاجنہ، سسیل اور اسپانیا۔

ایشیائے غربی اسور، مصر اور کلدہ کے سامی مدتوں تک حکمراں رہے مگر مادیوں اور پارسیوں کے مقابل ہوئے تو مغلوب ہوگئے۔ وہ زبان جو سنسکرت اور اوستا کی ہم جلیس تھی اسوری اور بابلی پر چھا گئی اور روم کے امپراطوری خرابوں سے یورپ اُٹھ کھڑا ہوا جس کی عظمت آج بھی آئینہ ہے۔

جس وقت ایرین اور یونانیوں کی مڈھ بھیڑ ہوئی، یونانی کو ایسا غلبہ ہوا کہ اسپانیا سے باختر تک اسی کا دور دورہ تھا اطالی جو مدنی زاویہ نگاہ سے یونان زادی تھی عالمگیر ہوگئی۔ وحشیوں نے بہت توڑا مروڑا لیکن وہ لچک لچک کر ابھرتی رہی اور آغاز یورپ کا ستون بن گئی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ حسن اتفاق سے نیم مہذب یا وحشی مہذب ملتوں پر عارضی طور پر غالب ہوگئی ہیں مگر اس غلبہ نے بہت تھوڑی عمر پائی اور کامل تر زبانوں کا پانسہ پلٹا تو مغلوب غالب بن گیا اور آج بھی کرہ زمین پر وہی ملتیں غالب نظر آتی ہیں جنکی زبانیں کامل تر ہیں۔

فقہ اللغۃ والوں نے قرابت داری کی حیثیت سے زبانوں کی طبقہ بندیاں کی ہیں مگر ہم کو بھول کر بھی یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ تمام زبانیں گھیروں میں آجاتی ہیں۔ ایسی زبانیں بھی ہیں جو کسی طبقے کے دائرے میں نہیں آتیں۔

بات یوں ہے کہ ایسی زبانیں ان زبانوں سے نکلی ہیں جن کے آثار بھی مٹ چکے ہیں اور وہ ملتیں بھی فنا ہوچکی ہیں جن کی یہ زبانیں تھیں۔ گوشوارہ پر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ سامی، ایرین اور یوروپین زبانیں اوّل درجہ کی ہیں اسی لئے کہ ان زبانوں کے نہایت قدیم آثار موجود ہیں اور قبل مسیح ۴۰ صدی بیشتر تک کا مواد ہم کو مل جاتا ہے۔ یہ خصوصیت ایرین زبانوں کے واسطے مخصوص ہے، ہندی اور یوروپین زبانیں بہت قریب زمانہ کی ہیں۔ اسی لئے ایرین کا شعبہ اور درجہ پہلا ہے۔

ریشئی زبانوں میں صرف چینی زبان ایسی ہے جس میں محقق کیلئے کافی مواد اور مسالہ موجود ہے۔ یوں تو اس زبان نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر چالیس قرن گزرنے پر بھی ریشئی مرحلے سے باہر نہیں آسکی زبانیں

بھی انسانوں کی طرح حیات رکھتی ہیں، بہرکیف اب السنہ والوں کا اتفاق ہے کہ کوئی جدید زبان وجود میں نہ آئے گی۔ اس لئے کہ تمام کرۂ زمین پر کوئی جگہ نہیں ملتی جہاں کے باشندے اتنی ابتدائی منزل میں ہوں کہ آپس میں بات چیت بھی نہ کرسکیں۔ یہی زبانیں جو اس وقت بروۓ ہستی ہیں ترقیاں کرتی جائیں گی اور ہر شاخ سے نئی نئی کونپلیں پھوٹتی آئیں گی۔ یہ لسانی ترقی ذاتی بھی ہوسکتی ہے اور خارجی زبانوں کے اثر سے بھی ہوسکتی ہے۔ خاص کر اب موخرالذکر صورت زیادہ کارگر ہوگی اس واسطے کہ بین الملی روابط بہت بڑھ گئے ہیں اور وائرلیس، ٹیلی ورن، ٹیلی گراف، الٹراوائیلٹ ریل، جہاز اور آبدوز سب کے سب معین و مددگار ہیں۔

خطوط

اہل زبان سے پوچھئے تو بے تکلف کہدیں گے کہ زبانوں کی طرح خطوط بھی مرورِ دہور کے شرمندۂ احسان ہیں اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے موجودہ منزل تک پہنچے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ تحریر کی ایجاد و ترقی میں تمام قوموں اور ملتوں نے ہاتھ نہیں بٹایا۔ اس لئے کہ بہت سے قوموں نے فن تحریر کسی اور قوم سے لے لیا ہے۔ خط کی ایجاد کب اور کیسے ہوئی یہ موضوع بنفس خود بہت وسیع ہے۔ مگر اس کی ترقیوں میں آپ کو پانچ اساسی منزلیں ضرور نظر آئیں گی۔

(۱) پہلی منزل وہ ہے جس میں اپنا خیال ظاہر کرنے کیواسطے بعض مخصوص چیزوں سے کام لیتے ہیں۔ آج بھی بعض جگہ نمک محبت کی علامت اور کالی مرچ کدورت کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ امریکہ کے بومی ریشم کی گرہوں اور پتوں کے سوراخ سے بعض خاص مفہوم سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔ اسکو ہم خط چوبیں کہہ سکتے ہیں۔

(۲) دوسری منزل تصویری تحریروں کا ہے۔ جب کسی چیز کا نام لینا مقصود ہوا اسکی تصویر کھینچ دی یہ خط امریکہ کے بعض بومیوں میں آج بھی رائج ہے۔

(۳) تیسری ایڈوگرافی ہے، یا مفہوم نویسی۔ اب پوری صورت کی جگہ اسکے کسی اہم جزو کی تصویر بنانے لگے۔ یہاں تک کہ جزو بھی گھٹتے گھٹتے صرف علامت ہوکر رہ گیا اور حقیقی معنوں سے بڑھ کر مجازی معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا، اس ترتیب سے جو حروف یا علامتیں لکھی جانے لگیں ان سے کلمہ بننے لگا مصریوں کا قدیم خط سوسبو ایسا ہی تھا، سومری، بابلی اور قدیم پارسی میں آج بھی بعض علامتیں اسی قسم کی ملتی ہیں جیسے تیمی پارسی میں چار علامتیں ایسی ہیں کہ ہر ایک سے ایک کلمہ بن جاتا ہے ہم لکھتے ہیں اور اسکو مبتت پڑھتے ہیں۔

(۴) چوتھی منزل۔ ہجائی یا تقطیعی خط، اس منزل میں ہر آواز کے واسطے نہیں بلکہ ہر ہجا کے واسطے ایک علامت ہے۔ ہماری تحریر بھی بیشتر ہجائی ہے اور تھوڑی سی الف بائی ہے۔ سومری، بابلی اور عیلامی ہجائی اور ایڈوگریفی کا گلدستہ ہیں۔

(۵) پانچویں منزل الف بائی تحریر کی ہے جس میں ہر آواز کے واسطے ایک مخصوص علامت ہے، قدیم خطوں میں اوستائی خط خالص الف بائی تھا۔ انگریزی اور ار ۔وکھی الف بائی اور ایڈوگریفی سے مرکب ہیں۔ فنیقیوں نے اپنا [illegible] یوں سے لیکر یورپ میں پھیلایا بعض کہتے ہیں مصریوں سے لیا ہے، عبری خط کو آرامی اور نبطی نے بھی شکلیں بدل کر لیاہے اور پھر آرامی خط سے بہت سی تحریریں نکلیں جیسے پہلوی اور نبطی د ایشیا اور افریقہ کے بیشتر اسی خط کے مرہون منت ہیں، اسی طرح جاپانی اور سیامی تحریریں چینی تحریر کی شاخیں ہیں

وہ سندیں جن پر تاریخ کی بنیادیں قائم کی جاتی ہیں چار قسم کی ہیں
(۱) معاصرین کی تحریریں۔ کتبے، سکے اور سالنامے
(۲) رو [illegible] زمین اور [illegible] زمیں سے [illegible] آثار۔
(۳) غیر معاصرین کی کتابیں جنہیں کسی واقعہ کی شرح کی گئی ہو
(۴) ملت، مذہب، زبان، صنعت و حرفت [illegible] متعلق کے حوالے پارے جن سے قوم کے درجہ تمدن کا پتہ چلتاہے۔

ان چار [illegible] معاصرین کی تحریریں سب سے زیادہ اہم اور قابل اعتماد ہیں، آثار عتیقہ [illegible] گویا [illegible]۔

اس کی [illegible] بدلتی رہتی ہیں۔ اس کے [illegible] تردید آمیز ہوتے ہیں۔ غیر معاصرین کی کتابیں ہمیشہ قابل اعتبار نہیں ہوتیں۔ اور جب تک ان کے مخارج کی تحقیق نہ ہوجائے یقینی نہیں ہوسکتیں۔

کیتوں میں بھی رنگ آمیزیاں ہوئی ہیں۔ اسوری بادشاہوں نے اپنی روداد میں کافی اغراق سے کام لیا ہے ۔ اب اگر خارجی سندیں بھی مل جائیں اور مقالہ میں ٹھیک اتریں تو درست سمجھی جا سکتی ہیں۔ غالب ہمیشہ اپنی فتح کو غلو کے ساتھ اور مغلوب سکوت کیساتھ دکھایا کرتے تھے۔ مصری بابلی اور آسوری جب کسی شہر کو دشمن سے جیتتے تھے تو اس کے آثار کو بھی ناپید کر دیتے تھے ۔

عیلامیوں نے ذرا کم وحشت دکھلائی ہے ۔ وہ مفتوح شہر کے آثار کو اٹھا کر اپنی مملکت کی زینت بناتے تھے اسی لئے آج بھی شوش کے حضریات میں کلدہ اور بابل کے متعلق بہت سا مسالہ موجود ہے ۔

مصر بابل آسور اور ایران میں بہت سے آثار ڈھونڈھ نکالے گئے ہیں مصر میں حمیری کاغذ اور ہرن کی کھال پر بہت سی تحریریں لکھی گئی ہیں اور وہاں کی ہوائے خشک نے ان کو روئے زمین اور زیر زمین ہزاروں برس تک بے داغ محفوظ رکھا ہے ۔

بابل اور آسوری خاک رس کی تختیوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے یہ تختیاں نویں صدی سے اب تک برابر نکل رہی ہیں ۔ ایران کے اکثر کتبے ایسے مقامات پر ہیں جہاں انسانی پاؤں یا تو پہونچ ہی نہیں سکے یا بڑی مشکل سے پہونچ سکے ہیں اس کے باوجود بھی جاہلوں نے توپ کے گولوں سے اکثر کتبوں کو سالم نہیں چھوڑا ہے ۔

شوق کی ہنگامہ

اضطراب شوق کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
رنگ کیا لائی ہے میری ناشکیبائی نہ پوچھ

میری خاموشی بھی اک تھی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
واقعاتِ کاروبارِ شامِ تنہائی نہ پوچھ

اور بھرے شوخیاں کچھ انکے حسنِ شوخ میں
میرے دل کا حال اے ذوقِ خودآرائی نہ پوچھ

صبر آتا ہے نہ قابو ہے دلِ بیتاب پر
اضطرابِ جذبۂ شوقِ تمنائی نہ پوچھ

ماورائے گلشن و صحرا ہے اب میرا جنوں
کونسی منزل پہ ہوں اے ذوقِ صحرائی نہ پوچھ

مسکراتے ہیں خیالوں میں وہ سوتے جاگتے
شانِ جلوت دیکھ سعدی نقشِ تنہائی نہ پوچھ

سعدی جعفری

جنگ کے جراثیم

دوسری قسط

سلسلہ کیلئے "ایشیا" دسمبر ۱۹۳۹ء ملاحظہ کیجیے

اس سے پہلے کہ میرا مضمون ختم ہوتا، ایڈیٹر ایشیا نے اپنی رائے شاعرانہ جذبات سے بےچین ہو کر ظاہر کر ہی دی حالانکہ جیسا کہ انھوں نے خود ہی آخر سطر میں لکھا ہے چاہیئے یہ تھا کہ جب مضمون ختم ہو جاتا اسوقت تبصرہ ہوتا۔ مضمون نگار پر اس سے زیادہ ظلم شاید نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے شکایت نہیں ہے لیکن تکلیف ضرور پہونچی جس کا اظہار یہاں اس لئے ضروری ہے تاکہ جنگ کے جراثیم کے کھائے ہوئے حضرات اب اسوقت تک صبر اور برداشت سے کام لیں جب تک کہ میرے مضمون کی آخری قسط نہ شائع ہو جائے۔

٦١

ایڈیٹر ایشیا نے غالباً میرے مضمون کو غور سے پڑھا بھی نہیں اور صرف ایک جملہ پڑھ کر کہ "جنگ کے مرض کی بڑی وجہ ۔ ۔ وطنیت ہے"، سارے مضمون پر رائے زنی کر دی۔ بیچارے شانتی نے تو وطنیت کو جنگ کے مرض کی بڑی وجہ ضرور بتائی ہے لیکن "اصلی وجہ" کہیں نہیں کہا ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ شانتی کیلئے وطنیت جنگ کے اسباب میں پہلا اور آخری سبب ہے۔ میرے مضمون میں موجودہ جنگ یورپ کا بھی ذکر نہیں ہے۔ میرا مضمون جنگ کے فلسفہ اور ماہیت پر مفکرانہ بحث ہے۔ آج کی جنگ یا آج سے پہلے کی دو ہزار جنگوں پر تاریخی زہر پاشی نہیں ہے۔

مجھ پر یہ بڑا ظلم ہے کہ ابھی میں نے دوسری قسط شروع بھی نہیں کی اور ایڈیٹر نے نہایت عالمانہ انداز میں لکھ دیا کہ ۔ ۔ "لیکن انھوں نے وطنیت کو امراض مزمنہ سے مثال دیتے ہوئے یہ حقیقت قطعی فراموش کر دی کہ جنگ کی اصلی وجہ محض وطنیت نہیں ہے بلکہ سامراجی نظام حکومت اور سامراجی تمدن ہے" غالباً ایڈیٹر پیغمبر نہیں ہے اور اسے الہام نہیں ہوا کرتا ورنہ وہ سمجھتا کہ اشتراکی ادیب اس اہم حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بلاشبہ جنگ کے مرض کی دوسری بڑی وجہ سامراجی نظام حکومت اور سامراجی تمدن بھی ہے۔ اور آئندہ قسط میں مجھے صرف اسی چیز سے بحث کرنی ہے۔

میں حیران ہوں کہ ایڈیٹر ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ "اگر واقعی کوئی خدا رسیدہ (شانتی کیلئے شاید خدا رسیدہ ہونا ضروری ہو) دنیا میں امن، راحت کی بحالی چاہتا ہے تو اسکو سامراج اور اس سے پیدا شدہ تمدن کو ختم کرنے کیلئے جدوجہد کرنی چاہیئے" دوسری طرف
ایشیا

یہ بھی کہتے ہوئے نہیں گھبراتا کہ ہندوستان کی نوعیت قطعی مختلف ہے۔ یہاں برسوں ابھی صوفامی قوم پرستی پر عمل کرنا ہوگا، گویا کہ ایڈیٹر کے نزدیک دفاعی قوم پرستی سامراجی تمدن کی مرہون منت نہیں ہے

اس سے پہلے کہ آپ میرے مضمون کی موجودہ قسط پڑھیں آپ کو بنیادی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قوم پرستی اور وطنیت اشتراکی نظام اور تمدن کے بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ مارکس نے ایک بار نہیں ہزار بار کہا ہے کہ اشتراکی انقلاب کا مقصد ONE PROLETARIA OF THE WORLD ہے "یعنی" دنیا کی ایک جنتا"

وطنیت کے جذبہ کی پیداوار سامراجی تمدن ہی سے ہوتی ہے جس طرح یہ کہنا دنیا کی موجودہ کروٹ سے بے خبری ہوگی کہ سامراجی تمدن اس لئے فطری ہے کیونکہ دنیا کے قیام سے ابتک دنیا کا تمدن سامراجی رہا، اوسی طرح یہ کہنا بھی انتہائی بھولے پن کا ثبوت ہوگا کہ حب وطن انسان کیلئے فطری چیز ہے۔ سامراجی تمدن میں پلے ہوئے دماغ وہی کچھ سوچیں گے جو انھیں سوجھایا جاتا رہا ہے۔ ایڈیٹر نے یہ رائے بھی ذرا جلدی ظاہر کردی ہے کہ " وطنیت کی مخالفت سے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں کھوٹ اور رکاوٹ پیدا ہونیکا خدشہ ہے" بین الاقوامی اشتراکیت کے تحت جو انقلاب ہندوستان اور دوسرے سامراجی غلامی میں جکڑے ہوئے ممالک میں آئیگا وہ جنتا کیلئے حقیقی سوراج لائیگا۔ وطنیت سے جو سامراجی رہنماؤں کا آلہ ہوا کرتی ہے، جو انقلاب بھی آئیگا وہ جنتا کیلئے اور زیادہ تباہی اور زیادہ غلامی لائیگا۔

مارکس نے بھی شست وخون کی کئی جگہ کھلی ہوئی دعوت دی ہے لیکن وطنیت کے نشہ میں متوالے کم نظر سورماؤں کو (جن کی حقیقت شکار کے بکر ےسے زیادہ نہیں، نہیں بلکہ دنیا کے مزدوروں کسانوں اور زخم خوردہ جنتا کو سارے سامراج اور سرمایہ دار دنیا کے خلاف —— میں آخری قسط میں اس مسئلہ پر بھی تفصیل سے لکھوں گا۔

ایڈیٹر نے یہ بھی لکھدیا کہ " جب اسکی تمام قسطیں شائع ہوجائیں گی تو اس کے سلسلے میں آئے ہوئے موافق اور مخالف مضمون شائع کئے جائیں گے اور ثابت کیا جائیگا کہ جنگ انسانی فطرت ہے"

موافق مضامین تو کیا یہ ثابت کریں گے کہ جنگ انسانی فطرت ہے۔ اور مخالف مضامین کیلئے یہ راستے دشوار ہوگئے ہیں۔ تو میں خود ثابت کر رہا ہوں کہ جنگ انسانی فطرت میں صرف سامراجی تمدن کی وجہ سے گھٹ کر دہ گئی ہے۔ میں نے "جنگ اور کھلونے"، "جنگی یادگاریں"، "جنگی وردیاں" "جنگی کتب خانے" اور "لڑکیوں کی تعلیم" وغیرہ عنوانات کے تحت یہی تو لکھا ہے! اگر آپ جنگ کو انسانی فطرت مانے لیتے ہیں تو سامراجی تمدن کو انسانی فطرت کیوں نہیں مانتے۔

خدارا میرے مضمون کی پہلی قسط دوبارہ غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ میں نے وطنیت اور جنگ کے جذبوں کی "اصلی" وجہ کیا بتائی ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے، اسوقت سے لیکر جب وہ اسکول، کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوتا ہے اور سامراجی تمدن کی گاڑی کھینچنے لگتا ہے، اسوقت تک وطنیت کا جذبہ [illegible]

[illegible]

یہ نوٹ بھی بہت سخت تقاضہ کرتا ہے کہ اظہار خیال کیا جائے لیکن شانتی صاحب نے لبوں پر مہر لگادی ہے اس لئے چپ ہوں البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ انسان نے درجہ بدرجہ ترقی کرکے حیوانی درجہ حاصل کیا اور کروروں برس میں ہونے والی تکمیل کے بعد متمدن بن سکا۔

ایشیا

ظاہر ہے کہ یہ "جدوجہد" اس نے خود ہی کی جس میں وہ اپنے ماحول سے بھی جنگ آزما رہا اور قدرت سے بھی۔ اس کی فطرت میں جہد اور بچاؤ دونوں عنصر شامل ہیں؛ دور کیوں جایئے، میرے دعوی کیلئے صرف وہ الفاظ کافی ہیں جو "تا نتی" (؟) صاحب نے اپنے نوٹ میں استعمال کئے ہیں، اور میں نے جن پر ایک ؎ سے لیکر چھ ؎ تک نشان لگادئے ہیں کیا یہ "حملہ" اور "مدافعت" کا بہترین ثبوت نہیں! ؟
اچھا اب آپ ان کا مضمون دیکھئے جس کی خوبی کیلئے وہ خود ہی اپنی ضمانت ہے۔

ساغر

قومیت اور جنگ

انسان اپنے جبر و قوت کا مظاہرہ، کئی طریقوں سے کرتا ہے، ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کمزور قوموں پر حکومت کرے، جہاں حکومت اور ماتحتی کا سوال ہے وہاں دلوں کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہوجانی لازمی ہے یہی خلیج قوموں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتی ہے اور اس خلیج سے قوموں کے اتحاد کا رشتہ ٹوٹتا ہے اور اسی خلیج کی بنا پر ایک دوسرے سے نفرت اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

قومی دشمنی اور بغض و عناد کے جذبات کا زہر پھیلا کر ملکوں کی جنتا میں گروہ بندی کا احساس پیدا کیا جاتا ہے اور یہی احساس ہوتا ہے جو انھیں دنیا کی دوسری جنتاؤں سے منسلک کرنے سے روکتا ہے۔ وطن پرست رہنما جو چاندی اور سونے کے ایک انبار پر بیٹھ کر حکومت کرنیکے عادی ہوتے ہیں محدود قومیت اور دوسری قوموں سے نفرت کا جذبہ اسی لئے پھیلاتے ہیں تاکہ قوم محدود نظریات کے تحت پروان چڑھے اور اس سے آگے کچھ نہ سوچے؛ ان کا مفاد ذاتی ہوتا ہے اور وہ جو چیز اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اسمیں بھی خود غرضی جھلکتی ہوتی ہے۔

ایک قوم کی تعریف کیا ہے ——— ؟ دنیا کے مورخین اسکی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ ایک قوم وہی ہوسکتی ہے جس کی زبان ایک ہو اور جو ایک خاص جغرافیائی حدود میں رہتی ہو، یہ دو نہایت اہم خصوصیات ہیں جن کی بنیادوں پر قومیت کی عمارت تیار ہوتی ہے؛ لیکن موجودہ زمانہ میں دنیا کی تدریجی ترقی کیساتھ ساتھ یہ تعریفیں بھی اہم نہ رہ سکیں؛

ایک زمانہ گذرا کہ یہودی قوم مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر رہتی تھی اور اس کی ایک ہی زبان تھی؛ آج وہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اس قوم کے بیشتر افراد اپنی قدیم زبان بھول چکے ہیں سامراجی ملکوں میں یہودی قوم اب بھی یہودی ہی کہلاتی ہے لیکن روس میں روسی باشندوں کی نگاہ میں وہ صرف روسی ہے اور ان کی زبان بھی سوویٹ یونین کی مقامی زبانیں ہیں۔ اسی طرح خانہ بدوشوں کی ساری دنیا میں ایک زبان ہے۔ ماحولی اثرات کی وجہ سے کسی قدر فرق ضرور ہے لیکن لغت کے اعتبار سے زبان ایک ہی ہے؛ مگر وہ خانہ بدوش ہیں اور کسی حدود میں نہیں بستے۔ سائبریا کی مشہور قوم ٹنگوسیس (TUNGUSES)، جو دنیا کی قدیم ترین قوموں میں سے ایک قوم ہے۔ اب بھی اس حصہ زمین پر بسی ہوئی ہے جہاں وہ ہزارہا برس پہلے بستی تھی، لیکن اب وہ اپنی مخصوص زبان بھول چکی ہے اور سائبریا کی روسی زبان اس کی مادری زبان ہوگئی ہے۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں اور ابھی قومیت کی یہ تعریف کہ کسی قوم کی زبان ایک ہونی چاہیئے اور اسے مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر رہنا چاہیئے قائم ہے

اس سے پہلے کہ میں قومیت کے مسئلہ پر بنیادی بحث کروں مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ پہلے یہ بتاؤں کہ ایک قوم کے دوسری قوم پر حکومت اور ایک قوم سے دوسری قوم کے نفرت کرنیکے وجوہ و اسباب کیا ہیں۔ ؟

میں اس چیز کو مثالوں سے سمجھاؤں گا۔ زار روس کی حکومت نے یہودیوں پر بڑے مظالم کئے۔ ان کو روس کے صرف چند مخصوص حصوں میں بسنے کی اجازت دی حکومت کے عہدوں سے انھیں محروم رکھا؛ روسی اسکولوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا؛ اور یہودیوں کے خلاف

مخالف انجمنوں کی ہمت افزائی کی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ زارِ روس کی حکومت نے اکرین (UKRAIN) والوں کو اس کی اجازت نہیں دی کہ اسکولوں میں اپنے بچوں کو اکرین زبان میں تعلیم دیں یہاں تک کہ اکرین زبان میں اخبارات کی اشاعت بھی ناممکن تھی۔ زارِ روس کی دوسری محکوم قوموں کو اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ وہ اس کا بھی فیصلہ کرسکیں کہ وہ روسی حکومت سے اپنا رشتۂ قومیت قائم کریں۔

جرمن حکومت نے بھی جرمن میں پول مدارس قانوناً بند کردیئے تھے۔ آسٹرین حکومت نے بھی اپنے ملک میں چیک زبان کے استعمال پر پابندیاں عائد کردی تھیں، اور چیک قوم پر زبردستی جرمن زبان نافذ کردی گئی تھی؛ برطانوی سامراج آج بھی افریقہ اور ایشیا کے باشندوں کو اپنے سے کمتر اور ذلیل خیال کرتے ہیں؛ جو قومیں ان کے معیارِ تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔ اُن پر حکومت کرنا آج بھی ان کے لئے باعثِ فخر و امتیاز ہے اور جب یہ بے چاری کمزور قومیں سر اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں تو ان کو آج بھی سختی کیساتھ دبا دیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ جب کسی ایک حکومت میں ایک قوم کے لوگوں کو تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوتے ہیں اور دوسری قوم کے لوگوں کو صرف ایک قوم کا حصہ نصیب ہوتا ہے؛ جب ایک کمزور قوم کو زبردستی طاقتور قوم سے مربوط کردیا جاتا ہے، جبکہ طاقتور قوم کمزور قوم کی مرضی کے خلاف ایک خارجی زبان اور خارجی اصول و روایات اس کے سر منڈھ دیتی ہے جب کہ کمزور قوم کو اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مناسب حال زندگی بسر کرے تو قومیت کی صحیح تعریف ہمارے سامنے آجاتی ہے، دو لفظوں میں "قومی غلامی"!

اس مضمون میں کسی جگہ میں نے لکھا ہے کہ دنیا میں اتحاد کی صورت صرف ایک ہے "کہ دنیا کی ایک جنتا" ہو۔ دنیا کی ساری قوموں کو ایک ہوجانا چاہیئے، تاکہ پھر قومی دشمنی، نفرت، بغض و نفاق، حکومت اور محکومیت کا سوال ہی نہ اُٹھ سکے!؟

آپ مجھے ایک بات بتائیں۔ کیا ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کو ساری جرمن، فرانسیسی، برطانوی، یہودی، چینی یا جاپانی قوم کو دشمنی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ یا یہ کہ انھیں اسکا بھی خیال کرنا چاہیئے کہ وہ جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی روٹی کا جو وزن ہے اور جو پتھر اُن کے پیٹ سے بندھا ہوا ہے، وہ ان قوموں کے انھیں جیسے گروہوں کا بھی امتیازی نشان ہے؛ کیا ہندوستانی مزدور اور کسان اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ وہ دوسری قوموں کو صرف اس لئے شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھیں کہ وہ قومیں غیر زبانیں بولتی ہیں۔ ان کے رنگ کالے یا پیلے ہیں۔ اور ان کی روایات اور اصول ان سے مختلف ہیں!؟

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی مزدور اور کسان اسی طرح کی جنتا ہیں جس طرح کہ جرمن، فرانسیسی، روسی انگریز اور حبشی مزدور کسان کی زبانیں کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، لیکن مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کے مسائل سب جگہ ایک ہی جیسے ہیں؛ سرمایہ داری ہر جگہ انھیں اپنا تختۂ مشق بناتی ہے۔ سب کے سب بھوکے ہیں؛ ناانصافی اور مظالم کے سبھی شکار ہیں۔

کیا ہندوستانی مزدور کو ہندوستانی سرمایہ دار سے صرف اسلئے محبت کرنی چاہیئے کہ اس کا ہم قوم اسے ہندوستانی زبان میں گالی دیتا ہے؛ یا ہندوستانی کوڑے سے اس کی خبر لیتا ہے؛ بالکل یہی سوال دوسرے ممالک کے مزدوروں اور کسانوں کے سامنے بھی ہے۔ جرمن سرمایہ دار صرف اس لئے جرمن مزدوروں کی نگاہ میں کس طرح بہتر ہوسکتا ہے کہ وہ اُسے سخت وسست سناتا ہے۔ یا جرمن سانچے میں ڈھلے ہوئے مظالم کرتا ہے۔ ساری دنیا کے مزدور اور کسان دُنیا کے ہر ملک کے بھوکے اور غریب ایک ہی گروہ رکھتے ہیں؛ اور وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور وہ سب دنیا کے تمام ممالک کے سرمایہ داروں کے شاکی اور احتجاج کرنیوالے ہیں۔ بھلا ہندوستان کے غریب اور بھوکے کسانوں کو اپنے ان زمینداروں سے جو ان کا ہر لحہ خون چوستے رہتے ہیں۔ جرمنی یا انگلستان کے ان ہی کی طرح بھوکے اور غریب کسانوں سے زیادہ محبت کس طرح ہوسکتی ہے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کا زمیندار اس کی اپنی زبان بولتا ہے اور ہندوستانی رسوم و روایات کا عادی ہے؛ لیکن وہ جو ظلم و ستم کسان پر کرتا ہے۔ اسی قسم کے برتاؤ کا عادی جرمنی اور انگلستان کا کسان بھی ہوتا ہے؛ اس لئے نفسیاتی طور پر ہندوستان کا کسان جرمنی اور انگلستان کے کسانوں ہی سے محبت کرے گا۔ دلوں کا

قرب حقیقی قرب ہوتا ہے۔ دنیا کو اگر تقسیم ہونا ہی ہے تو دنیا صرف دو حصوں میں تقسیم ہو گی؛ ایک ستانے والوں کی دنیا ہو گی، اور دوسری ستائے ہوؤں کی" دراصل جو لڑائیاں اب تک دنیا میں ہوتی آئی ہیں۔ وہ اُسی قومیت اور وطنیت کے جذبات کی بنا پر ہوئی ہیں اور جو لوگ ان لڑائیوں میں لڑے ہیں وہ صرف سرمایہ داری اور سامراج کا شکار ہوئے ہیں؛ اگر دنیا کی یہ ساری جغرافیائی قومیں ایک ہو جائیں، پھر کوئی لڑائی کا سوال نہیں رہ جاتا؛ زیادہ سے زیادہ اگر لڑائی ہوئی بھی تو صرف ستانے والوں اور ستائے ہوؤں کے درمیان ہو گی، چونکہ اب تک ستانے والی دنیا کے سپاہی ستائی ہوئی دنیا ہی کے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ اس جنگ میں ستائی ہوئی دنیا جیتے گی اور وہ ستانے والی دنیا کو ہمیشہ کیلئے ختم کر کے امن کی ایک مستقل صورت پیدا کر دیگی جیسی کہ روس نے آج سے سترہ برس پہلے ایک چھوٹے سے پیمانہ پر اس کی ابتدا کی؛ روس سے سامراج شاہی اور سرمایہ داری دونوں کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا؛ اور روسی جنتا کی مستقل بھوک اور غریبی ہمیشہ کیلئے مٹ گئی۔ بالکل یہی صورت دوسرے ممالک میں بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ جنگ عظیم ترین ہو، اور اس کا سلسلہ آنیوالی نئی نسلوں تک جاری رہے لیکن اس خون کی ندی میں جو کنول کھلے گا وہ کہانی والی پری کی طرح امن کی دیوی کو ایک سدا بہار کنوارپن دیدیگا؛

جب قوموں کا اختلاف مٹ جائیگا۔ جو آج عالمگیر اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے؛ ساری دنیا میں ایک فوج ہو گی جس کا مقصد ایک ہی ہو گا اور جس کا سپاہی دنیا کا ہر باشندہ ہو گا؛ غالباً یہی سوچ کر آج سے ستر برس پہلے اشتمالیت اور اشتراکیت کے بانی مارکس اور انگلس نے اپنے مشہور اشتمالی منیفسٹو میں یہ نعرہ بلند کیا تھا؛ کہ تمام ممالک کے عوام کو متحد ہو جانا چاہیئے۔

نہ صرف اس لئے کہ دُنیا سے بھوکوں کی تعداد مٹائی جا سکے۔ اور دنیا والوں کو ایک ہمیشہ کا امتنان اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ جنگ کا فطری جذبہ انسان کے دل و دماغ سے مٹ جائے، یہ ضروری ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کے مزدور اور کسان قومی دشمنی اور نفرت کی بجائے محبت عقیدت کے نشہ میں ڈوب جائیں

ایشیا

اس کی صرف ایک صورت ہے یعنی دنیا کے ہر ملک کا اقتصادی نظام ایک ہی ہو؛ اور دنیا کو اس نظام کے ماتحت منظم کیا جائے۔ جیسا کہ اڈیٹر ایشیا نے اپنے نوٹ میں تحریر کیا ہے، یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے جس پر آئندہ اشاعت میں تفصیل سے بحث کی جائیگی۔

لیکن یہاں مختصر طور پر اس چیز کا اظہار کرنا نہایت ضروری ہے کہ دنیا کی کسی قوم کو اپنے سے کمتر۔ کمزور قوموں کو ستانے کا حق حاصل نہیں ہے اور نہ اس کا حق ہے کہ سرمایہ کے زور سے ان پر حکومت کریں اور انکی حکومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن کا رہا سہا اثاثہ بھی چھین لیں

دنیا کی دولت کے استعمال کیلئے دنیا کے ہر باشندے کو مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں؛ اگر کبھی دنیا میں ایسا انقلاب آگیا، جنگ وجدال کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو جائیگا؛ کیونکہ آخر لڑائیاں صرف اس تجارتی منڈی کیلئے تو ہوتی ہیں؛ جسے ہر قوم اپنے خودغرضانہ مفاد کی خاطر ہڑپ کر لینا چاہتی ہے۔ اور دوسری قوموں کے لئے اس کا دروازہ بند بھی کر دینا چاہتی ہے۔ جرمن اور انگریز مزدور کو اسی طرح ساری قومی دولت کو محفوظ خزانوں سے نکال کر جرمن اور انگریز جنتا میں تقسیم کر دینا چاہیئے جس طرح روس نے کیا۔ جرمن اور انگریز مزدوروں کے ذکر سے بار بار میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ صرف انھیں دونوں کے انقلاب سے دنیا کی حالت سُدھر جائے گی؛ میں ان کے نام صرف مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں اگر جرمن اور برطانوی قوموں کے پاس ان کا اپنا قومی خزانہ نہ رہیگا۔ ان کی ساری توجہ اپنے حصہ زمین پر بسنے والوں کی بھلائی اور اچھائی کیلئے ہو گی؛ دوسری قوموں سے نفرت اور مقابلاتی دوڑ کا سوال ہی باقی نہ رہیگا؛ پھر آخر جنگ کیوں ہو گی—!؟

اب میں اُن اسباب پر روشنی ڈالوں گا جن کی وجہوں سے قوموں کے درمیان دشمنی اور نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؛ اب تک ہم نے صرف علان حال کیا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم سے حسد کرتی ہے۔ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ تمام قوموں کو ایک بٹے ہوئے دھاگہ کی طرح متحد ہو جانا چاہیئے۔ ان کو صرف سرمایہ داری کو اپنا واحد دشمن تصور کر کے صرف اسی کے خلاف ایک

آخری جنگ کرنی چاہیئے؛ اور انکو ایک جیتی ہوئی جنتا کیلئے ایک عالمگیر اقتصادی نظام بنانا چاہیئے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ قومی فخر و غرور، لبغض و عناد کے جذبات قوموں کے دل و دماغ سے کس طرح مٹائے جاسکتے ہیں!؟

قوموں میں احساسِ برتری اور احساسِ کمتری کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ یہ تعریف اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب کہ دنیا کی تمام موجودہ قومیں چھوٹے چھوٹے خاندانی گروہوں کی شکل میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی مسئلہ اقتصادی ہی تھا، وہی روٹی جو آج بھی قوموں سے ایک دوسرے کا گلا کٹواتی ہے۔ اسوقت بھی دنیا کی مختلف آبادیوں کے لئے بلائے جان بنی ہوئی تھی؛ وہ وقت وہ تھا جب کہ مختلف قبائل صرف ایک دوسرے سے جنگ و جدال اور کھیت اور جنگل پر قبضہ کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے لوگوں کو منہ کا نوالہ بنا لیتا تھا؛ آج جو قومی فخر و غرور کا جذبہ ہم میں پایا جاتا ہے اسکی بنیاد اسی وحشیانہ جذبہ پر ہے جو ان قبائل میں پایا جاتا تھا۔

دنیا میں جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی۔ قبائل کی گروہ بندی بھی بڑھتی گئی۔ لوٹ کھسوٹ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ قبائل قوموں میں تبدیل ہوگئے۔ کھیت اور جنگلوں نے ملکیتوں کی شکل اختیار کرلی، جذبہ وہی ہے لیکن اب وہ چھوٹے چھوٹے خاندانوں اور قبائل سے نکل کر اقوام کے درمیان، نسلوں کے درمیان، حاکموں اور محکوموں کے درمیان پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن اس کا راز صرف یہ ہے کہ ہر ملک کا سامراجی طبقہ عوام کو اپنے مقاصد کا شکار اور ظلم و ستم کا عادی بنانا چاہتا ہے۔ جو قومیں ایسے نظام تمدن کے ماحول میں پلتی ہیں ظاہر ہے کہ ان کی گھٹی میں جنگ کا جذبہ لازمی طور پر ہونا چاہیئے۔ سامراجی طبقہ اپنے عوام کو ہر ممکن طریقے سے یہ یقین دلاتا ہے کہ عوام کے دشمن سامراجی خواص نہیں ہوتے بلکہ دوسرے ممالک کے لوگ ہوتے ہیں۔ جرمن سامراجی جرمن مزدور سے کہتا ہے "فرانسیسیوں کو مٹادو،" "انگریزوں کو مٹادو" برطانوی سامراج، برطانوی مزدور سے کہتا ہے "جرمنوں کو مٹادو" "روسیوں کو مٹادو" کچھ دنوں سے دنیا کے تمام ممالک کے سامراجی متحدہ طور پر یہ نعرہ بلند کر رہے ہیں کہ "یہودی قوم کو مٹا دینا چاہیئے"؛ مقصد ان ساری باتوں کا یہ ہے کہ مزدوروں کی توجہ ان کی اپنی جد و جہد کی طرف سے ہٹ جائے وہ سرمایہ داروں کے مظالم کی طرف سے بے پروا ہوجائیں؛ اور قومی جنگوں میں خود کو جھونک دیں؛

سامراجی طبقہ اپنے مقصدِ کار اور عوام میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے مادی ذرائع بھی پیش کرتا رہتا ہے؛ پچھلی جنگ میں جرمنی کا سامراجی اور سرمایہ دار طبقہ اپنے عوام کو یہ تعلیم دے رہا تھا کہ اُن کی جنگ اُن کے لئے بہتری کا باعث ہوگی اور اس کے لئے وہ جس قدر بھی خون بہائیں اور جتنا بھی لوٹیں کھسوٹیں جائز ہے۔ پچھلی جنگ سے پہلے خواص کے طبقے نے اپنی عادت بنالی تھی کہ وہ مزدور جماعت کے رہنماؤں کو رشوت دے دے کر یہ سمجھائیں؛ کہ نوآبادیات میں لوٹ مار کرنا ان کی اپنی آسائش کے لئے ثواب کا کام ہے؛ وہ یہ کہتے تھے کہ کمزور اور ناتربیت یافتہ اقوام کو سر اٹھا کر دنیا وی جد و جہد میں حصہ لینے کا حق نہیں ہے؛ پچھلی جنگ کے موقع پر ساری دنیا میں شیخی باز وطن پرستوں (SOCIALIST JINGO) کا ایک گروہ پیدا ہوگیا تھا؛ جو مزدور جماعتوں کے سب سے زیادہ اُجرت پانیوالے رہنما تھے؛ یورپ کی طاقتور قوموں میں ان رہنماؤں نے سرمایہ داری کے سامنے سپر ڈالدی؛ اور عوام کو یہ یقین دلایا کہ ان کے لئے ایک مادرِ وطن کا ہونا ضروری ہے۔ اور مادرِ وطن کو زندگی کی نئی روح دینے کیلئے نوآبادیات میں قتل و غارتگری اور کسی قدر محتاج قوموں کی محکومیت نہایت ضروری ہے؛ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سامراجی نظام کے تحت بے چارہ مزدور تانبے یا چاندی کے ایک دو سکوں کے عوض حُبِّ وطن کے پیدا کئے ہوئے جوش میں بہہ کر اپنی حقیقی مادرِ وطن کو فروخت کر دیتا ہے۔ یہ مادرِ وطن دنیا کی وہ دھرتی ہے جسکی چھاتیوں پر ایک ہی طرح سانس لینے والے بستے ہیں۔

دنیا میں حکومت صرف مرکزی فیڈریشن کے ذریعہ ہونی چاہیئے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا قومیں ایک دوسرے کے گلے پر چھری پھیرتی ہی رہیں گی؛ مساوی حقوق تسلیم نہیں ہوتے اور مساوی حقوق کی خاطر انسانیت ہمیشہ سرگرم پیکار رہیگی؛

سامراجی طبقے کی بقا کیلئے انسانیت کی تقسیم مختلف قوموں کی شکل میں ضروری ہے؛ کیونکہ سامراجی طبقہ سطحی جذبات قوموں میں پیدا کرکے انھیں ان کے مستقل مرض "بھوک" اور فلاکت کی طرف متوجہ

نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب روس میں عوام کی جماعتوں نے اپنی حکومت قائم کر لی اور خواص کے طبقے کو ہمیشہ کیلئے فنا کر دیا، دنیا کی سامراجی قومیں لرزہ براندام ہو گئیں اور دنیا کے تمام سامراجی رہنما اس فکر میں رہنے لگے کہ روس کی زمین سے اٹھا ہوا، یہ نیا طوفان کہیں انھیں بھی تنکے کی طرح اڑا نہ لیجائے۔ عالمگیر امن کیلئے یہ ضروری ہے کہ دنیا کی ہر ملک کی بنائی ہوئی جنتا ایک دوسرے سے بیر نہ رکھے، ایک دوسرے کو شک وشبہ کی نگاہ سے نہ دیکھے، ایک دوسرے پر بھروسہ کرے۔ جس وقت کہ ایک ملک دوسرے ملک پر مظالم ڈھاتا ہے۔ مظلوم ملک والوں کو یہ نہ سوچنا چاہیئے، کہ ظالم ملک کا ہر باشندہ یا ہر طبقہ اس پر ظلم کرنا چاہتا ہے؛

جس وقت کہ چیک قوم پر آسٹریا کے سامراجی جرمنوں نے مظالم ڈھائے چیک قوم نے ساری جرمن قوم کو ظالم اور جابر سمجھا زار روس کی حکومت نے پولش قوم پر بے انتہا مظالم کئے تھے؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک پولش قوم تمام روسیوں کو نفرت اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اس کی نفرت جتنی زار سے یا زار کے زمانہ کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے تھی اتنی ہی موجودہ عوام اور انھیں کی طرح غریب لوگوں کی حکومت سے بھی ہے بالکل یہی حال یہاں وہاں دنیا میں ہر جگہ ہے؛

اشتراکی نظام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر قومیت کے مرض کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ تاریخ کی بنائی ہوئی جو قومیں اس نظام کے تحت بستی ہیں ان کو زبان، تعلیم، اور تہذیب اور تمدن کے سلسلے میں مساوی حقوق حاصل ہیں۔ جس فیڈریشن کی میں دعوت دے رہا ہوں اس کا بھی نظام کچھ ایسا ہی ہوگا۔ سب سے پہلے تو قوموں کو تہذیب اور معاشرت کی کُلّی آزادی دی جائے گی، صرف اقتصادی نظام ایک ہوگا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دھیرے دھیرے رہن سہن کا معیار خود بخود بلند ہوتا چلا جائیگا اور اس کے بعد قوموں کو ایک دوسرے سے حسد کرنیکی کوئی وجہ ہی نہ رہ جائیگی جس طرح آج روس میں دو سو کے قریب مختلف زبانیں ہیں اور اتنے ہی تہذیبیں، پھر بھی معلوم یہ ہوتا ہے کہ سارا روس ہم رشتہ اور متحد ہے اسی طرح زیرغور فیڈریشن میں بھی اقوام کی پوزیشن اسی سے ملتی جلتی ہوگی

قوم پرست سامراجیوں کا یہ کہنا ہے کہ ان کی آواز قوم کی آواز ہے حالانکہ قوم کی آواز وہی ہو سکتی ہے جو عوام کی اکثریت کی آواز ہو، نہ کہ چند انگلیوں پر گن لئے جانے والے خواص رہنما، جس وقت کہ ہم ایک قوم کی فلاح و بہبود کے متعلق سوچ و بچار کرتے ہیں، ہمارا مقصد قوم کی عام اکثریت سے ہوتا ہے نہ کہ چند جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے! ؛ لیکن اب سوال یہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی محکوم قومیں، زیرغور فیڈریشن میں کس طرح شامل ہو سکتی ہیں؛ اسکی دو صورتیں ہیں:۔

(۱) ایک تو یہ کہ وہ اپنے ملک کے سامراجی طبقوں کی کمر ہمیشہ کیلئے توڑ دیں؛ جس کے بعد ان کا حاکم خود بخود کمزور پڑ جائے گا اور ان کو فطری آزادی دینے کیلئے تیار ہو جائیگا؛ یا تھوڑی سی جدوجہد کے بعد تیار ہونے پر مجبور ہوگا؛

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جہاں جہاں عوام نے طاقتیں حاصل کر لی ہوں ان کے ساتھ شامل ہو کر اپنے ملک اور حاکم کے سرمایہ کے جال سے آزاد ہو کر زیرغور فیڈریشن کی طرف دھیرے دھیرے بڑھا جائے۔ موجودہ صورت میں اس فیڈریشن کا مرکز یا تو کوئی ایسا ملک ہو سکتا ہے جیسے سوئٹزرلینڈ جہاں اتفاقاتِ زمانہ نے ایک بین الاقوامی مرکز پیدا کر دیا ہے اور جہاں عوام کو امید افزا مراعات حاصل ہیں، یا کسی ایسے ملک میں کہ جیسے امریکہ جہاں اندر اندر فیڈریشن کو پھیلایا جا سکتا ہے؛ اور جہاں دنیا کے سرمایہ کی مرکزی منڈی پر صرف اخلاقی اور اقتصادی جدوجہد کے بعد قبضہ کیا جا سکتا ہے یا پھر کوئی ایسا ملک جہاں عوام کے پاس وطن پرستوں کی جنگی سوداگری کے آخری کریاکرم کے لئے تمام سامان موجود ہوں۔

(۳) ایک صورت اور بھی ہے کہ پہلے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں جو دراصل تجارت کی بڑی منڈیاں ہیں۔ اس فیڈریشن کی شاخیں قائم کی جائیں؛ جس وقت کہ تمام ایسی تجارتی منڈیوں پر اس فیڈریشن کا نظام چھا جائیگا، دنیا کی ایک دو بڑی قومیں جو باقی رہ جائیں گی وہ خود ہی ایک دمہ کے مریض کی طرح دم توڑ دیں گی۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وطنیت اور قومیت کا جذبہ لوگوں کے دلوں سے مٹا دیا جائے۔ اس کے بعد ایک عالمگیر اقتصادی نظام کی طرف توجہ

کی جائے۔ جس نظام میں ہر ملک کے باشندوں کا مفاد مضمر ہو۔ جس سے انھیں نفسیاتی طور پر دلچسپی اور تعلق پیدا ہونے لگے۔

شروع کے باب میں میں نے وطنیت اور جنگ کے مسئلہ پر نفسیاتی بحث کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اس کا خیال بچوں کے دل و دماغ میں نہیں بٹھانا چاہیئے تاکہ اُن سے جو نسل تیار ہو وہ انسانیت کو تباہ کرنے کی بجائے اس کی تعمیر کیطرف رجوع ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اسی وقت ہوسکتی ہے جب زیر غور فیڈریشن کا نفاذ ہوجائے۔ کیونکہ موجودہ سامراجی نظام و تمدن کے ماتحت اُس کی مضبوط بنیاد پڑنی ناممکن ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ سب سے پہلے ہمیں قومی دشمنی اور حسد کا جذبہ لوگوں کے دلوں سے مٹانا چاہیئے۔ اس کے بعد اقتصادی تعلق لوگوں میں پیدا کرنا چاہیئے۔ جب یہ جذبات لوگوں کے رگوں میں دوڑ جائیں گے، اس کے بعد جنگ کا سوال ہی نہ رہ جائیگا۔ پھر جو ننھے بچوں کی نسل ہمارے سامنے ہوگی اُسے ہم ایک مستقل بین الاقوامی محبت کے سایہ میں پرورش کرسکیں گے۔

تاریخ سے قومیت اور وطنیت کی عجیب ہی کہانی ملتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ عوام کی طرح خاص طبقہ بھی شہنشاہیت کا غلام تھا۔ شہنشاہیت اس وقت اُسے اُسی طرح ستاتی تھی جس طرح آج وہ خاص طبقہ برسرِ حکومت ہوکر دنیا کی کثیر آبادی کو ستا رہا ہے؛ اس وقت بادشاہ نہایت آسانی سے ایک قوم کی قوم کو اپنی بیٹیوں کے جہیز میں دیدیا کرتے تھے؛ اسوقت یہی خاص طبقہ نہ وطن کی آزادی کے گیت گاتا تھا نہ اپنی قومیت پر فخر اور غرور کرتا تھا دھیرے دھیرے جب ان میں مقابلہ کی سکت پیدا ہوئی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تجارتی خزانوں کی کنجی ان کے ہاتھوں میں تھی اس وقت وطن کی آزادی کے لئے خاص طبقے نے جدوجہد کی، وطن کی آزادی سے اس وقت بھی ان کا وہی مقصد تھا جو آج ہے؛ یعنی اپنی ذاتی آزادی اور ذاتی استعماریت، مثال کے طور پر جس وقت کہ اٹلی پر آسٹرین حکومت تھی اسوقت اٹلی کے خاص طبقے نے قومی آزادی کی تحریک شروع کی جس کا ظاہر میں تو مقصد یہ تھا کہ اٹلی کو غیروں کی محکومیت سے آزاد کیا جائے؛ اور اُسے ایک علیحدہ حکومت کی شکل دی جائے لیکن جب یہ آزادی حاصل ہوگئی؛ خواص کا طبقہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے بیٹھا۔ طرزِ حکومت وہی رہا آزاد خواص کا طبقہ ہوا، بیچارے عوام غلام کے غلام رہے۔ بالکل یہی کہانی فرانس اور جرمنی کی بھی ہے۔ فرانس کا مشہور انقلاب عوام کی تحریک نہیں تھی۔ بلکہ طبقۂ اعلیٰ کی تحریک تھی۔ عوام جس طرح ہمیشہ صرف سپاہی بن کر لڑے اسی طرح اُس جنگ آزادی میں بھی لڑے؛ مشہور ترانۂ آزادی مارسیلز جو آج بھی ہر مظلوم آدمی کی زبان پر ہے۔ اسی بورژوا جماعت کی پیداوار تھا۔ اس چیز سے صرف ایک فائدہ دنیا کو ہوا؛ کہ دنیا کے سامنے نہایت ہی بلند قومی ادب اور آرٹ آیا، ان قومی تحریکوں نے بیشتر ذہین انسان پیدا کئے جن میں ادیب، شاعر، فلسفی، صناع، مصوّر اور نقاش بھی تھے؛ یہ اس وقت کی بات ہے جب صرف طبقۂ اعلیٰ ہی مظلوم سمجھا جاتا تھا، کیونکہ اس وقت عوام کی حالت بے زبان جانوروں سے بہتر نہ تھی۔ آج اگر ہم بورژوا شاعروں، ادیبوں، مصوّروں کے کارنامے پڑھیں اور دیکھیں۔ ہمیں اُن میں صرف ایک چیز ملیگی، قومی حسد، قومی نفرت اور قومی مظالم کے لئے تعلیم و تلقین خودی، ——— خودی اور صرف ——— خودی!

جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا مقصد جنگِ آزادی سے یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ عوام کے لئے ایک دائمی مسرت کے سامان مہیا کریں بلکہ صرف اپنی تجوری کو زیادہ سے زیادہ بھاری کرنا؛ صرف اس لئے کہ جو پیداوار غریب اور فاقہ کش مزدوروں اور کسانوں کی بے دریغ محنت کا نتیجہ ہو اُسے شہنشاہی چنگل سے نکال کر نام نہاد جمہوری توندیں بھر لیں جس کے بعد دولت کی مقابلاتی جنگ کے لئے بھی وہ انھیں بیچارے مزدوروں اور کسانوں کو استعمال میں لائیں؛

(باقی)

شانتی پریاگی

ترکی صنعت و حرفت پر ایک نظر

اٹھارھویں صدی کے اختتام اور اُنیسویں صدی کی ابتدا میں صنعتی انقلاب نے دنیائے صنعت میں انقلاب عظیم برپا کیا، صنعتی اعتبار سے ذرائع پیداوار میں ہلچل مچادی۔ صنعت و حرفت کے پہلے طریقے مہمل، بیکار اور عہد گزشتہ کی قدامت پرستی کی یادگار معلوم ہونے لگے۔ دست کاری پر ضرب کاری لگی اور وہ پھر نہ اُبھر سکی مشین کا دور دورہ شروع ہوا اور ہر چیز مشین سے بنائی جانے لگی مشین سے کسی چیز کو بنانے میں ہاتھ سے بنانے کی بہ نسبت کم وقت اور کم محنت درکار ہوتی ہے اس لئے مشین کا استعمال روز بروز بڑھتا گیا مشین کی تیار کردہ چیز ہاتھ کی بنی ہوئی چیز سے نسبتاً ارزاں ہوتی ہے آجکل کا زمانہ اُنیسویں صدی کے زمانے سے بہت مختلف ہے۔ اُس زمانے میں اگر کوئی ملک زرعی اعتبار سے زرخیز تھا تو اُسے صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، مگر موجودہ ضروریات بالعموم اور مُلکی مدافعتی ضروریات بالخصوص اب صرف زراعت سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ اور ملک کی حفاظتِ خود اختیاری کی لڑائی صنعت و حرفت کو فروغ دیئے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتی۔ ملک کی ترقی کے لئے زراعت اور صنعت و حرفت لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح زراعت کا دارومدار زمین کے خواص اور آب و ہوا پر ہے اسی طرح صنعت و حرفت کا بھی چند چیزوں پر انحصار ہے یعنی معدنیاتی پیداوار مثلاً کوئلہ لوہا اور دیگر دھاتیں، سرمایہ اور محنت معدنیاتی پیداوار کے اعتبار سے جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، ترکی محروم نہیں۔ سب سے بڑی دقت جو صنعتِ ترکی کی ترقی کی راہ میں حائل تھی وہ سرمایہ کی قلت تھی۔ ذاتی سرمایہ ملک میں بہت کم تھا اور حکومت کو صنعت کی ترقی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اِس لئے ترکی میں صنعت و حرفت کی ترقی خاطر خواہ نہ ہوئی اور جو بھی کچھ ہوتی وہ اغیار کے سرمایہ سے جنھوں نے اقتصادی اقتدار حاصل کر کے سیاسی و انتظامی رنگ جمایا۔ اور غیر واجبی اثر حاصل کیا جیسا کہ ہم مالیات کے باب میں بتائیں گے کہ غیروں نے کس طرح اپنا اصل و سود حاصل کرنے کے لئے Council of Ottoman Public Debt کے ذریعے ذرائع آمدنی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا گویا "مریضِ یورپ" اقتصادی حیثیت سے عقاب ہائے یورپ کے چنگل میں تھا اور رہائی حاصل کرنے کیلئے کوشاں مگر قرض کی بیڑیوں نے اسے مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ ترکی یورپ کے سوداگروں کی ایک اچھی زرخیز شکارگاہ بنی ہوئی تھی۔ جس کو اہل یورپ نے اس قدر تختۂ مشق بنایا تھا کہ ترکی باوجود قدرتی ذرائع اور محنت کے دوسروں کا دست نگر ہو کر رہ گیا تھا۔ باوجود سخت جد و جہد کے اقتصادی حیثیت سے ان سے نجات نہ پا سکا۔ ملک کی دولت اور پیداوار کھنچ کھنچ کر ملک کے باہر جاتی رہی۔ ترک گھڑیاں گھونٹ کر رہ جاتے اور ترکی صنعت و حرفت میں ترقی کرنے کی بجائے پستی کے غار میں گرتا چلا گیا۔ نیز صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے ایک اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے یعنی ملک میں امن و امان کا قیام اور بیرونی مداخلت سے نجات۔ جو جنگِ عظیم سے پہلے ترکی کو نصیب نہیں تھی۔

فطرت کا اصول ہے کہ ہر عمل کے لئے ردِّ عمل ہوتا ہے جوں جوں ٹھوکریں لگتی ہیں انسان خواہ کتنا ہی خوابیدہ کیوں نہ ہو بیدار ہو جاتا ہے۔ انگڑائیاں لے کر اُٹھتا اور مدافعت کی تدبیریں سوچتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ جرمنی کے ساز بازنے

ترکی جرمنی کے دھوکے میں آگیا اور غلطی[1] سے برطانیہ اور فرانس کے خلاف جنگ میں شامل ہوا۔ عرصہ سے قبضۂ اغیار میں رہا تھا، اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور اپنی حفاظت آپ کرنا بھول چکا تھا صنعت وحرفت کو ترقی نہ دی تھی۔ زراعت وکاشتکاری کی دیکھ بھال سے مستغنی ہوگیا تھا۔ نتیجہ صاف تھا کہ جرمنی ترکی کو خاطر خواہ آلات جنگ وجدل مہیا نہ کرسکا۔ فوج کی نقل وحرکت میں بہت وقت ضائع ہوتا تھا۔ بغداد (Baghdad) ریلوے لائن کے علاوہ آمدورفت نقل وحمل خچروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ترک پیدائشی سپاہی ہیں اور جنگ عظیم میں جن جن مورچوں پر ترکی کے پاس طرزِ جدید اسلحہ جات تھے وہاں اُس نے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ ناک چنے چبوادیئے۔ مگر آخرالامر ترکوں کو شکست کھانی پڑی۔ ترکی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ قوم میں افسردگی ومایوسی کی لہر ابھی دوڑنے نہ پائی تھی کہ کمال اتاترک نے ترکی کی قیادت کی اور ترکی کو محض ترکوں کے لئے مخصوص کرنیکا ذمہ لیا۔ اور ملک کو لسانی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ سیاسی الغرض ہر حیثیت سے آزاد کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

صنعت وحرفت کی ترقی میں قدرتی ذرائع معدنیات اور دھات کاری کو بڑا دخل ہے۔ اس لئے پہلے ہم ترکی کے معدنیاتی ذرائع پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

جنگِ عظیم سے قبل معدنیاتی صنعت ترکوں کے لئے غیر نفع بخش اور غیر منظم تھی۔ کیونکہ سب کی سب غیر ملکی کمپنیوں نے جن میں بعض نے (Council of Ottoman Publei Delt کے ذریعہ اور بعض نے براہ راست دولت عثمانیہ سے کانوں میں کھدائی کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا تھا۔ چنانچہ منافع میں ترکوں کا کوئی حصّہ نہ تھا اس لئے یہ ضروری محسوس کیا گیا کہ غیر ملکیوں کے ٹھیکے منسوخ کرکے اور صنعتوں کی طرح حکومت اسے بھی اپنی نگرانی میں لے لے۔ چنانچہ دورِ جمہوریت میں ایک سرکاری محکمہ، محکمۂ تحقیقات معدنیات کے نام سے قائم کیا گیا جو غیر ملکی ماہرانِ فن کی نگرانی میں معدنیات اور دھات کاری سے متعلقہ معلومات فراہم کرتا ہے۔ اصطلاحی اور اقتصادی اعتبار سے تمام معلومات کی تحقیقات کرتا ہے اور قابلِ عمل تحقیقات کا ایک لائحہ عمل بناکر اِتی بینک (Iti Bank) کے حوالے کرتا ہے۔ جو محکمہ تحقیقات کے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرمایہ لگاتا ہے اور اپنے کارکنوں کے ذریعہ جن میں بیشتر انجینیر ہوتے ہیں محکمۂ تحقیقات کی تحقیقات کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس کے نفع بخش ہونے کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور اپنے سابقہ تجربے کو کام میں لاکر محکمہ کے فراہم کردہ لائحہ عمل میں ترمیم وتنسیخ کرکے اس پر عمل کرتا ہے۔ چنانچہ سرکاری گزٹ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سال حال کے شروع تک معدنیات کی کیا حالت تھی اور کیا کیا تجربے دھات کاری کے کئے گئے۔

جیسا کہ پیشتر بتایا گیا ہے کہ صنعت جدید کو کسی ملک میں فروغ دینے کے لئے کوئلہ، لوہا نہایت ضروری عناصر ہیں۔ جہاں یہ دونوں

بہت سی کانیں ہیں۔ جو ترکی کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ سب سے بڑی کان (Ereg نلی) میں جو قسطنطنیہ سے ایک سو پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے اس کے سالانہ محاصل تقریباً ۱½ ملین ٹن ہیں۔ محکمہ تحقیقات معدنیات کی ہدایت کے مطابق اِتی بنک نے اس کان میں جدید ترین مشینوں کے ذریعہ تجربے شروع کردیئے ہیں، امید کی جاتی ہے اس کان کی پیداوار میں جو سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک ملین سالانہ سے ترقی کرکے سنہ ۱۹۳۹ء میں ۱¼ ہوگئی تھی۔ ترقی کا بڑا امکان باقی ہے۔ کازلو (Kazlu) اور زن ڈل دَق (Zunguldak) دو اور کانیں ہیں جو سمندر کے قریب واقع ہیں اس کے کوئلے کو بحری ذرائع نقل وحمل کام میں لاکر ایک طرف سے دوسری طرف کو لے جاتے ہیں۔ اندرونِ ملک میں ارزیرم (Erzerurm) میں کوئلہ کی بہت بڑی کان ہے جو روسی سرحد کے قریب واقع ہے۔

۲۹ر فروری سنہ ۱۹۴۰ء کو فرانس کے اخبار (Petit de Tarisan) کا نامہ نگار سیاسی انقرہ سے خبر دیتا

[1] !؟! سوانح حیات اتاترک !؟! "ادارہ"

ہے کہ ترکی میں کوئلہ کی صنعت کو حکومت نے اپنے زیر انتظام لے لیا ہے بحر اسود کے قریب ارگلی فرولگلڈاک کے کوئلے کی کانوں میں مزدوروں کی جدید بھرتی سے کام لیا جائے گا اس طریقے پر ایک سال کے اندر کوئلے کی پیداوار میں ۳۵۰۰۰۰ ٹن کا اضافہ ہو جائے گا۔

قرابک (Karabak) میں لوہے کی کانیں ہیں۔ کوئلے کے قرب میں پائے جانے کی وجہ سے لوہے اور فولاد کی مشینیں بنانے کے کارخانے قرابک میں قائم ہو گئے ہیں جو ترکی کا جنگی سامان بناتے ہیں۔ تانبہ کی ایک ایسی دھات ہے جو ترکی میں بکثرت پائی جاتی ہے جا بجا چھوٹی موٹی کانیں ہیں، مگر سب سے بڑی کان ارغانہ (Arghana) میں واقع ہے تانبے کی کچی دھات کو سب سے پہلے ارغانہ ہی کی بھٹی میں گلایا جاتا ہے اور پھر توکت (Tokat) میں صاف کیا جاتا ہے۔ صاف شدہ دھات کو سام سوم (Samsum) کی راہ سے بحر اسود تک لے جاتے ہیں جہاں سے مختلف جگہ بھیج دیا جاتا ہے۔

دوسری مشہور کانیں مرغل (Murghal) قارز (Kars) تری بی زون (Tribizond) سی ناپ (Sinope) اور سمرنا (Sumyrna) ہیں۔

کیمیائی کمیاب اور قیمتی دھاتیں بھی ترکی میں پائی جاتی ہیں سونا کوہ ٹورس (Taurus) سمرنا اور بروسا (Brusa) میں پایا جاتا ہے۔ چاندی صرف ٹارس (Taurus) میں دستیاب ہوتی ہے جست، رانگ، ٹین وغیرہ بولگر (Bolgar) میں اور پیٹرول رزیم میں نکلتا ہے۔ گندھک کی کان۔ کی سی برلو (Keciburlu) میں واقع ہے۔ میرشام کی جو دنیا میں سب سے زیادہ تعداد میں ترکی میں پائی جاتی ہیں۔ کان دریائے پرسک (Pursok) کی وادی اس کی شہر (Eskishehir) میں واقع ہے۔ اس کی مانگ یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں ہے۔ اتی بینک کے زیر اہتمام آنے سے اس کا حصول بہتر اور زیادہ ہو گیا ہے۔

جنگ کے بعد معدنیاتی اعتبار سے ترکی جیسا پہلے تھا ویسا ہی رہا۔ لیکن صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے جو دیگر لوازمات ہیں وہ ترکی کو خاطر خواہ حاصل نہ تھے، سرمایہ اور ہوشیار کاریگروں کی قلت تھی۔ ملک میں امن و امان قائم نہ ہونے اور بیرونی مداخلت کی وجہ سے پہلے ہی سرمایہ کی کمی تھی اور آئے دن کی جنگ و جدل حکومت کے خزانے پر بڑا بار تھی اس لئے ترکی حکومت کو ایک عرصہ سے خسارا ہوتا تھا۔ جان و مال کی حفاظت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بجائے سرمایہ لگانے کی بجائے ہندوستان کے بنیوں کی طرح اپنی دولت کو زمین میں گاڑ کر بڑی احتیاط سے محفوظ رکھتے تھے تاکہ آن کے آڑے وقت کام آئے اس لئے ملک سرمایہ سے محروم رہا کرتا تھا۔ سرمایہ کی قلت کی وجہ جمہوریت ترکیہ نئی حکمت عملی میں بھی مضمر ہے۔ بیرونی سرمایہ کی تو کمی نہ تھی لیکن حکومت بیرونی سرمایہ کے ذریعہ ملک و ملت کی صنعت و حرفت کو ترقی دینا مناسب نہیں سمجھتی تھی کیونکہ بیرونی سرمایہ سے بیرونی اثر قائم نہ ہونا ناممکن تھا۔ اسلئے ترک اپنی سیاسی آزادی کو اپنی صنعتی ترقی کے لئے قربان کرنے کو تیار نہ تھے

جمہوریت ترکیہ کو اپنے ابتدائی دور میں ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ معاہدہ لوزین (Lausane) کی رُو سے یونانی ... اور ارمنی کاریگروں کو ترکی کو خیر باد کہنا پڑا۔ ترکی ان مشاق ماہران فن سے محروم ہو گیا۔ ابتدا میں یہ نقصان کچھ ناقابل تلافی معلوم ہوتا تھا مگر رفتہ رفتہ صنعتی تعلیم تمام ملک میں رائج ہو جانے کی وجہ سے ترکی کاریگروں نے بخوبی خانہ پُری کی اور اپنے جذبۂ قومیت کی بنا پر بہت کامیاب رہے۔

جمہوریت کے ابتدائی دور میں مندرجہ بالا مشکلات کی وجہ سے ترکی کارخانے بہت کم تھے اور جو کچھ تھے بھی وہ دقیانوسی طرز کے تھے جو ترکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناکافی تھے اس لئے وہ اقتصادی اور معاشی نظریہ جو جنگ عظیم کے بعد یورپ کے بیشتر ملکوں میں رُونما ہوئے، ترکی میں بھی اپنا اثر دکھانے لگے۔ چنانچہ حکومت نے بہت سے کارخانوں اور صنعتوں کو قومی رنگ دینا شروع کیا اور بہت سی صنعتوں پر اپنا قبضہ جمایا۔ نمک پر ٹھیکہ قائم کیا۔ تمباکو اور ماچس کے کارخانوں کو اپنے انتظام میں لیا۔ ۱۹۲۳ء میں ترکی میں شکر کی صرف ایک فیکٹری اوشق (Ushaq) میں تھی مگر جب سے حکومت نے شکر کی صنعت کو اپنے زیر اہتمام لیا اس صنعت نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کی ہے۔ چنانچہ اب ترکی میں اوشق کے علاوہ تین بڑے کارخانے ہیں۔ یہ

اُل پولو (Alpollu) اِس کی شہر اور طرحل (Tarhal) میں واقع ہیں۔ بلک، چمڑے اور سیمنٹ کی صنعتوں نے بہت ترقی کی ہے۔ سلک اور چمڑے کی مانگ بیشتر ترکی اجناس خام ہی سے پوری ہو جاتی ہے اور سیمنٹ ملکی ضروریات سے زیادہ ہوتی ہے اس لیئے زاید پیداوار کو ملک کے باہر بھیجدیا جاتا ہے۔ شراب سے متعلقہ صنعتوں کے لیئے محکمۂ آبکاری قائم کیا ہے۔ علاوہ ازیں انفرادی صنعتوں کو بھی ترقی دینے میں بڑی مدد کی ہے۔ درآمد مشینوں اجناس خام نئی فیکٹریوں اور ملوں پر لگان معاف کر کے دوکانداروں کی ہمت افزائی کی ہے جس سے تاجروں کو کثیر منافع ہوا۔ کارخانوں کے لئے temette (پیشہ کا حصول) Real property Tax) معاف کیا۔ بہت سے بینک جن کا ذکر ہم بینکنگ کے باب میں کریں گے صنعت وحرفت کو فروغ دینے کے لئے قائم کئے گئے جن میں Banque Turque Pour le commerce et l'Industries تجارت کو ترقی دینے میں بہت کامیاب ثابت ہوا۔ جمہوریت ترکیہ نے ابتدا ہی سے مچھلیاں پکڑنے کی صنعت پر توجہ کی تھی اور بطانوی ماہرین کی نگرانی میں اس کو دوبارہ منظم کیا ہے اور اس کا ایک علیحدہ محکمہ کھولا ہے جو اس بات کی تحقیقات کر رہا ہے کہ وہ مچھلیاں جو ترکی ساحل کے قریب پائی جاتی ہیں کھانے نمک دینے اور ٹین کے ڈبوں میں بند کر کے بھیجنے کے لئے کس حد تک موزوں ہیں اور اس صنعت کو کس قدر ترقی دی جا سکتی ہے اخبار "اتشام" رقم طراز ہے کہ یکم جنوری ۱۹۳۹ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۳۹ء تک ترکی نے آٹھ ہزار ٹن مچھلیاں ترکی سے باہر بھیجی ہیں۔ بحر اسود ساحل باسفورس وغیرہ پر فیکٹریاں قائم کی ہیں۔ جہاں ماہی اچار مچھلی کا تیل اور دیگر اشیاء جو مچھلیوں سے تیار کی جاتی ہیں، بنائی جاتی ہیں۔ اِن کارخانوں میں جدید ترین مشینیں استعمال کی جاتی ہیں جو ترکی ہی کی خود ساختہ ہیں۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ معاہدہ لوزین کی رُو سے ۱۹۲۳ء میں ترکی سے یونانی اور ارمنی کاریگروں کو نکال دیا گیا تھا۔ اس کا اثر ترکی صنعتِ قالین بافی پر بہت بُرا پڑا۔ کیونکہ ترکی کے بہترین قالین باف یونانی تھے۔ گو اتنے اچھے قالین پھر نہ بُنے جا سکے تاہم حکومت نے اس صنعت کو دوبارہ منظم کیا ہے اور ۱۹۳۱ء تک آٹھ دس ہزار ملین ترکی لیرے کی قیمت کے قالین ترکی سے باہر بھیجے جا چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکی کی یہ قدیم صنعت پھر اپنی حالت پر آجائے گی۔ مگر ۱۹۳۱ء کی اقتصادی پیچیدگی کی وجہ سے اس صنعت پر ضرب شدید لگی جس سے پھر نہ سنبھل سکی۔ چنانچہ یکم مئی ۱۹۳۵ء سے ۳۰ اپریل ۱۹۴۰ء تک کے مالی سال میں صرف پانچ ملین ترکی لیرے کی قیمت کے قالین ترکی سے باہر بھیجے گئے۔

حکومت کی اس جد و جہد کے علاوہ دوسرے طریقے سے بھی اِس صنعت وحرفت کی مدد کی گئی۔ قانون کے ذریعہ صنعت وحرفت کو فروغ دینے کے لئے کارخانوں کو ہر ممکن سہولت بہم پہونچائی گئی اور ہر انفرادی فیکٹری کی ہمت افزائی کی گئی۔ چنانچہ سرکاری کاغذات کے مطالعہ سے مظہر ہے کہ دس سال کے عرصہ میں یعنی ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۴ء تک کارخانوں کی تعداد ۱۴۰۰ ہو گئی تھی۔ اور ۶۵،۹۴۰،۰۰۰ ترکی پونڈ سرمایہ لگا ہوا تھا۔

۱۹۳۳ء میں جرمنی میں ہر ہٹلر نے روسی اور اٹلی کی اقتصادی تجاویز سے متاثر ہو کر جرمنی میں چہار سالہ منصوبہ کا اجرا کیا جس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نیوڈیل (New Deal) کی طرح ہر اقتصادی اور معاشی مسئلہ کو حل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ ترکی نے بھی جرمنی کی مثال سے متاثر ہو کر اپنے یہاں ایک پنج سالہ منصوبہ کا اعلان کیا جس پر ۱۹۳۴ - ۳۹ میں عمل درآمد کیا گیا اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۴۴،۰۰۰،۰۰۰ ترکی پونڈ کا سرمایہ اِش بینک (Ish Bank) اور سمر بینک (Sumar Bank) میں لگایا۔ اس پنجسالہ منصوبہ کی تشکیل میں ترکی نے روسی اقتصادی تجاویز اور ہر ہٹلر کے چہار سالہ منصوبے سے بہت استفادہ کیا اور ان سے مدد لی۔ چنانچہ دو تہائی سرمایہ جو سوتی کپڑے کے بُننے اور فولادی مشینوں کے لئے مختص کیا گیا تھا روسی اور جرمنی ماہران فن کی نگرانی میں صرف کیا گیا۔ پارچہ بافی کے بہت سے کارخانے قائم کئے گئے جن میں سے دو سمر بینک نے روسی ماہران صنعت سے تیار کرائے اور باقی جرمنی سے یہ کارخانے خانہ داری

کی ضروریات سے متعلق چیزیں تیار کرتے ہیں۔ غیر ملکی ماہران صنعت کے نگراں مقرر کرنے پر اعتراض کیا جا سکتا ہے مگر اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے صرف دو ہی صورتیں تھیں یا تو غیر ملکی مدد حاصل کی جائے اور اُن کو موجودہ کاروبار میں شریک کیا جائے اور یا اپنے کارخانوں میں دوسرے ملکوں کے ماہرین صنعت کو ملازم رکھا جائے پہلی صورت جس میں انقلاب سے پہلے زمانے کی جھلک پائی جاتی تھی ناقابل عمل تھا۔ چنانچہ دوسرے طریقے پر عمل کیا گیا۔ اور بیرونی ماہران صنعت اور کاریگروں کو کارخانوں میں ملازم رکھا گیا۔ اُن کی سخت نگرانی کی جانے کی وجہ سے حکومت کے اس لائحہ عمل میں جس سے وہ ترکی کی اقتصادی آزادی قائم رکھنا چاہتی تھی سرِ مُو بھی فرق نہ آیا۔ اس کی وجہ ایک اور بھی تھی کہ یہ ماہرانِ فن بیشتر جرمنی کے تھے جو سیاسی اقتصادی پالسی کی وجہ سے جرمنی سے جلا وطن کئے گئے تھے اور انھوں نے ترکی کو اپنا وطنِ ثانی بنایا اور اپنے پیدائشی وطن سے اُن کو کوئی تعلق نہ رہا۔ اس لئے ان پر جاسوسی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان ماہرینِ فن کے مددگار ترک ہوتے ہیں جو ان ماہرینِ فن کے معاہدے کے اختتام کے بعد ان کی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔

اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اخبار "اولوس" کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ ازمد (Azmud) میں کاغذ کی فیکٹری، اسپارٹا میں گلاب کے عطر بنانے کا کارخانہ اور پاشا باغچی (Pasha Baghchi) میں شیشے اور کھاہٹا (Kuhatia) میں چینی کے برتن بنانے کے مل کے علاوہ مندرجۂ ذیل اہم صنعتوں کے کارخانے، بنانے اور اُن کو فروغ دینے کے لئے حکومت نے مندرجہ ذیل رقم جو اس صنعت کے سامنے لکھی ہوئی ہے، خرچ کرنے کا اعلان کیا ہے۔

معدنیاتی صنعتیں

لوہا، فولاد کے قرابک والے کارخانہ میں —— ۵۹۰۸۰۰۰ ترکی پونڈ

ارگنی میں تانبے کے کارخانہ پر —— ۶۳۳۰۰۰ ترکی پونڈ

زون ڈل دق میں نیم سوختہ کوئلہ کی فیکٹری پر —— ۱۷۲۵۰۰۰ ترکی پونڈ

صنعت پارچہ بافی

قیصریہ Kayaseria ارگنی Eregni
نذیلی Nazilli اور ملاشیا Malatia میں سوتی کپڑے کے کارخانوں پر —— ۱۹۴۲۰۰۰ ترکی پونڈ

بروزہ میں ملینیہ کے کارخانہ پر ۵۹۰۸۰۰۰ 〃 〃

گیمبک (Gembik) میں نقلی سلک کے کارخانہ پر ۴۸۸۰۰۰ ترکی پونڈ

کاسٹامونی (Castamoni) میں سن کے کارخانہ پر ۱۵۶۳۰۰۰ ترکی پونڈ

متفرقات

ترکوں کو غیر ملکوں میں صنعتی تعلیم دینے کا خرچ ۴۴۴۰۰۰ ترکی پونڈ

یہ منصوبہ اپنی جامعیت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے ترکی میں صنعت و حرفت کو فروغ دینے میں بہت کامیاب رہا۔

فن ہوا بازی اور جہاز رانی کے باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ ترکی نے مدافعتی آلاتِ جنگ و جدل اپنے یہاں تیار کرنے کے لئے فوجی فیکٹریاں قائم کی ہیں، بحری جہازوں کے بنانے کا ابھی تک کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا۔ البتہ قیصریہ ہوائی فیکٹری ترکی کی فنی، فوجی فیکٹری میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ فیکٹری جنگی طیارے اور تجارتی ہوائی جہاز بناتی ہے۔ اخبار "افشام" نے ماہ جنوری ۱۹۴۰ء میں اطلاع دی تھی یہ فیکٹریاں دو سو طرزِ جدید کے معیار ہوائی جہاز ترکی مدافعت کے لئے تیار کر رہی ہے اس فیکٹری میں تقریباً ۱۲۰۰۰ کاریگر کام کر رہے ہیں۔ مشین اجناس خام۔ دھاتیں۔ محنت۔ سرمایہ۔ الغرض ہر چیز ترکی ہے۔

آخیر میں اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی ملک کی صنعت و حرفت کی ترقی کا راز صرف قدرتی ذرائع۔ معدنیات، سرمایہ اور محنت کے استعمال میں مضمر نہیں بلکہ اچھے ذرائع نقل و حمل اور وسائل آمد و رفت کو بڑا دخل ہے۔ ان کے بغیر نہ تو اجناس خام اور مشینیں ایک

جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جا سکتی ہیں اور نہ ملکی بچاؤ میں سرعت سے کام لیا جا سکتا ہے۔ جو حفاظتِ خود اختیاری کی جان ہے۔

سڑکوں اور ریلوں کے باب میں ہم نے بتایا تھا کہ حکومت نے تمام ملک میں پختہ ونگیں سڑکوں اور ریلوں کی پٹڑیوں کا جال بچھا دیا ہے جن کی مدد سے سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑی تیزی کے ساتھ لے جایا جا سکتا ہے اور فوجی نقل و حرکت بڑی سرعت کے ساتھ عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ سڑکیں اور ریلیں تو ترکی میں یہ خدمات انجام دیتی ہیں اور ترکی سے باہر مال لانے اور لے جانے کے لئے اور سفر کے لئے بحری اور ہوائی تجارتی بیڑہ ہے۔

ترکی صنعتی اعتبار سے اب ابتدائی دور سے گزر چکا ہے، صنعت و حرفت نے ہمہ گیر ترقی کی ہے اور ہر ممکن کوشش اس امر کی کی گئی ہے کہ ترکی اپنی اجناس خام کو اپنے ہی ملک میں صاف کرے۔ مگر ترکی صنعت زدہ نہیں ہوا ہے۔ ترکی اور یورپ کے بہت سے صنعت زدہ ملکوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ترکی میں ہمہ گیر صنعتی ترقی میں زراعت و کاشتکاری کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ کما حقہٗ اس میں بھی عہدِ جدید کی معلومات اور تجربوں کو کام میں لا کر ترقی کے باب کھولے ہیں، چنانچہ ترکی میں ممکن ضروریات سے زیادہ اشیائے خوردنی پیدا ہوتی ہیں۔ انگلستان کی طرح نہیں جو اپنی ضروریات اور اجناس خام کے لئے دوسروں کا دست نگر ہے اور نہ جرمنی کی طرح جو محاصرہ کی حالت میں بہت عرصہ تک دشمن کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا زراعت اور صنعت و حرفت میں ترقی کی بدولت ترکی اقتصادی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کے ملکوں سے بے نیاز ہو گیا ہے اور محاصرہ کی صورت میں مدت تک دشمن کے مقابلے میں ڈٹا رہے گا۔

ایم حامد علی، ایم، اے

عالمِ دیوانگی میں!

۴۷

انقلاب کے انتظار سے انقلاب کی اُمید رکھنے والے کس قدر سادہ لوح ہوتے ہیں، انقلاب دیوانگی ہے! انتظار واماندگی! دونوں کا ساتھ کس طرح ہو سکتا ہے۔ یا انتظار کی ساعتوں کو ختم کیجئے یا انقلاب کا نام نہ لیجئے۔

*

محبت کو اگر "کاروباری حیثیت" دیدی جائے تو زندگی کے بہت سے قیمتی لمحات ضائع ہونے سے بچ جائیں۔

*

زندگی کیا ہے؟ سعیِ عمل! اور دیوانگی؟ جوشِ عمل! گویا زندگی اور دیوانگی لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے اگر آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں اور "دیوانے" نہیں ہیں تو گویا آپ زندگی کے ساتھ ایک ایسا مذاق کر رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ آپ کی موت کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔

مُفکّر

ہندوؤں اور مسلمانوں کے علمی اور تاریخی تعلقات

(پروفیسر ایم اے شاستری)

ہمیں افسوس ہے کہ ایشیا کی گذشتہ اشاعت میں اس مضمون کا صرف ایک صفحہ شائع ہوگیا اور بقیہ مضمون سہواً شائع ہونے سے رہ گیا۔ موجودہ اشاعت میں اگر صرف بقیہ مضمون شائع کیا جاتا تو مضمون کی خوبی جاتی رہتی اس لئے دوبارہ مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ اڈیٹر

خلفائے عباسیہ کے عہد حکومت میں مسلمانوں کا پایۂ تخت دمشق سے بدل کر بغداد میں منتقل ہوگیا۔ اور بغداد علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز بن گیا۔ خلفائے عباسیہ نے تمام اطراف وجوانب سے علماء وفضلاء کو بغداد میں لاکر اسلامی علوم وفنون کو مالا مال کرنے کی مبارک سعی کی۔ ہندوستان کی ترجمانی کے لئے جو علماء اور ماہرین فن بغداد میں پہنچے تاریخ سے ان کا تذکرہ اور حال معلوم ہوتا ہے۔ حسب ذیل ہندو نام خاص طور پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ منکا" (یا منی کا (؟) مانک ؟) جو ایک مشہور طبیب اور صاحب فلسفہ تھا۔ وہ سنسکرت کے علاوہ فارسی زبان کا بھی ماہر تھا۔ اس نے ایک اور ہندو طبیب "شانک" کی کتاب "زہر" کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب سمیات اور زہروں کی تحقیق پر مکمل کتاب مانی جاتی ہے۔ وہ عراق میں خلیفہ ہارون رشید کے عہد زریں میں پہونچا۔ بادشاہ بہت سخت بیمار ہوگیا۔ اور مقامی حکماء اس کے مرض کے ازالہ سے عاجز آئے تو اس ہندو طبیب کی تدبیر سے کارگر علاج ہوا۔ اور اسکے بعد اسے بغداد کے علماء میں قابل رشک فخر حاصل ہوگیا۔

۲۔ خلیفہ ہارون رشید کے بھتیجے شہزادہ ابراہیم کو کوئی بہت مہلک مرض ہوا۔ مقامی طبیبوں نے اسے دیکھ کر لا علاج قرار دیدیا لیکن ہندوستان کے ایک طبیب نے جو ایورویدیک طب کا مشہور ماہر مانا جاتا ہے اور جس کا نام "سالحہ" تھا۔ اور اس کے باپ کا نام "سپاہلاہ" تھا۔ اس شہزادے کا علاج کیا اور دفن ہونے سے بچ گیا ورنہ اسکی موت کا سب کو یقین ہوگیا تھا "صالحہ" کی بڑی عزت وتوقیر ہوئی اور آخر کار اس نے اسلام قبول کرلیا اور عرصہ دراز تک دربار عباسیہ کا معتمد طبیب رہا۔

۳۔ بغداد کے مشہور ہسپتال "برمکیہ" میں ایک اور ہندو طبیب دہآن نامی کام کر رہا تھا اس کا لڑکا ہسپتال کا افسر اعلیٰ بن گیا اور سنسکرت کی کئی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔

۴۔ شانک چانکیہ ایک مشہور فلسفی اور طبیب تھا۔ اس نے بہت سے مضامین کی کتابیں سنسکرت سے عربی وفارسی میں ترجمہ کیں۔

عربی زبان میں ہندوؤں کی جن مشہور و اہم کتب کا ترجمہ ہوا ان کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ مگر مختصراً یہ نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) تیمور یہ سدانت علم ہیئت پر مشہور کتاب اور مسلمان علمائے ہیئت میں اس کتاب کا بہت بڑا چرچا رہا۔ یہ کتاب رفتہ رفتہ ہسپانیہ پہونچی جہاں مسلمانوں کی بڑی زبردست حکومت تھی اور اس کے بعد اندرون یورپ تک اس کتاب کی رسائی ہوگئی۔ اور اس سے لوگ عرصہ دراز تک فائدہ اٹھاتے رہے اس کتاب کے چار ابواب تھے۔

(۲) "چرک" اس کا پہلا ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا اور بعد میں عبداللہ بن علی نے اسے عربی میں منتقل کیا۔

(۳) کھنڈا کھوڈیکا۔ علم ہیئت کی مستند کتاب

(۴) سندھاسن علم کاسیابی پر ایک کتاب ہے جسے پنڈت وہاں کے لڑکے نے عربی میں ترجمہ کیا۔

ازمنہ وسطیٰ سے لیکر سترہویں صدی عیسوی تک عربی علوم کا یورپ پر حکم جاری رہا۔ عربی کتابوں کے ذریعہ ہندو اطبار اور حکمار کا حال یورپ تک پہنچا۔

سوریہ سدہانت کے علاوہ اور علم ہیئت کے ماہرین مثلاً ورہم بیرا۔ سریشا اور آریہ بھاتا کے نام مسلمان مصنفین و علمار کے علم میں تھے بالخصوص اسوقت جب کہ سلطان محمد کے حملے ہندوستان پر ہوئے اور مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ رابطہ بڑھا تو علوم وفنون نے بھی تبادلہ کیا اور یہ رابطہ تمدن وعلم خلجیوں، تغلقوں اور لودھیوں کے عہد میں برابر ترقی کرتا رہا۔

ہندوستانی ادب وفلسفہ کے مشہور مسلمان علمار میں ابوریحان البیرونی کا نام خاص طور پر نمایاں ہے۔ وہ سنسکرت کا ماہر اور پنجاب کی جملہ مقامی بولیوں سے بھی آگاہ تھا۔ اور ہندوستانی علم وادب میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ ہندو علمار میں اسکا وقار تسلیم کیا جانے لگا۔ اور رائے ودیا ساگر (بحرالعلم) کا خطاب دیا گیا۔ اس کی کتابیں تاریخ، فلسفہ، رسوم وعبادت ہنود وغیرہ پر نہایت وسیع معلومات کی حامل ہیں۔

اس وقت تک ہندوؤں کی جن کتابوں کا ترجمہ عربی وفارسی میں ہوا ہے وہ زیادہ تر، ہیئت، نجوم، موسیقی، ریاضی، افسانہ، اخلاقی نصائح داستان پر تھیں۔ مگر بعد کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں بیرونی کے وقت سے لیکر مغلوں تک اور بھی علوم عربی وفارسی میں منتقل کئے گئے فلسفہ اصنامیات (دیو مالا)، تاریخ مذہب وغیرہ

امیر خسرو مشہور مسلم عالم وشاعر گذرے ہیں ان کو زبان ہندی پر بڑا عبور تھا۔ انھوں نے ہندی میں شعر کہے ہیں۔ اور ایسی طباعی ظاہر کی ہے کہ لوگ سن کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

زندگی

زندگی میں ایک دور ایسا آیا جب دل اور دماغ دونوں ہم نوا تھے، دونوں زندگی کو کھیل سمجھتے تھے اور کونین کی ہر جنبش کو مسکراہٹوں اور قہقہوں میں گم دیکھنے کے آرزومند تھے۔ یہ زمانہ بچپن کا تھا۔

پھر ایک دور ایسا آیا جب دماغ اور دل کی راہیں ذرا مختلف ہوگئیں۔ دماغ مظاہرات کا جائزہ لینے کیلئے بیتاب تھا اور دل زود رِح مظاہرات" کا۔ یہ زمانہ نوجوانی کا تھا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد دماغ فلسفی ہوگیا اور دل پریمی۔ یہ زمانہ جوانی کا تھا۔

پھر ایک دور ایسا آیا کہ دل اور دماغ پھر ایکبار ہم خیال ہوگئے۔ مگر اس مرتبہ وہ مظاہرات، فلسفہ، پریم سب سے متنفر اور بیزار تھے۔ لوگ اس زمانہ کو پیری کہتے ہیں اور میں موت!

ایشیا

جرمنی اور فرانس کا انقلاب ۱۸۴۸ء

انقلابِ فرانس اور ۱۸۴۸ء کے درمیانی زمانے میں مغربی یورپ کے ممالک میں صنعتی انقلاب ہُوا۔ اگرچہ "چھوٹے پیمانے کی پیداوار" کی جگہ "بڑے پیمانے کی صنعت وحرفت" کی رفتار تمام برِّ اعظم میں سوائے انگلستان کے زیادہ سُست ہو چکی تھی اور کہیں بھی اس کو ایسی استحکامی حیثیت حاصل نہیں تھی تاہم قلیل پیداوار پر سرمایہ دارانہ صناعی کی کامیابی۔ بڑے بڑے کارخانوں اور مشینوں کی ترقی اور زراعت میں سرمایہ داری کا دخل۔ ان سب کا نتیجہ طبقاتی قوتوں کی ایک نئی اہم تنظیم کی صورت میں برآمد ہُوا۔

چھوٹے چھوٹے صنعت کار جو دیہات اور اپنی دستکاری سے محروم کر دئیے گئے تھے، بڑی تعداد میں پرولتاریوں (Proletariat) میں شامل ہو گئے تھے۔ کام کرنے والوں کا معیارِ زندگی، خصوصاً اقتصادی بدحالی کی وجہ سے، کافی گر گیا تھا۔ ہوشیار دستکار مشین چلانے والے بن گئے تھے مزدوروں میں عورتوں اور بچوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی اس لئے اُجرتوں کی شرح بھی گر گئی تھی۔ خود مزدوری خاص طور پر ان کام کرنے والوں کے لئے جو صنعت میں نئے نئے داخل ہوئے تھے بڑی تکلیف دہ اور تباہ کن ہو گئی تھی کام کرنے کے اوقات بارہ چودہ گھنٹے روزانہ تھے۔ نئے صنعتی شہروں میں رہائشی حالات ناقابلِ برداشت تھے اور وہ اضلاع جن میں مزدور کام کرتے تھے شاذونادر ہی میعادی بخار، اور ہیضہ کے وبائی امراض سے محفوظ رہتے تھے۔ بے روزگاری افلاس اور جرائم کی زیادتی تھی۔

مشہور اٹوپی (Utopist) فوریر (Fourier) نے اس سے متعلق لکھا تھا کہ "زیادتی پیداوار، افلاس اور مصیبت کا ذریعہ بن گئی ہے۔"

اس زمانہ میں پرولتاریوں کی ترقی نے جنھیں اپنی قوت کا کافی احساس ہو چکا تھا۔ طبقات کی نسبتی طاقت میں ایک بہت اہم تبدیلی کی صنعتی انقلاب کی ترقی کے ساتھ ساتھ متعدد فسادات اور بغاوتیں ہوئیں، انگلستان میں لوڈائٹس (Luddites) اور چارٹسٹ (Chartist) تحریکیں فرانسیسی ریشم کی دستکاری کے مرکز لائنس (Lyons) میں ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۴ء کی دو بڑی بغاوتیں اور ۱۸۴۴ء میں سائیلیشیا (Silesian) کے جولاہوں کا اضطراب۔ یہ تمام واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ مایوس و پُرجوش مزدوروں میں انقلابی جذبات نشوونما پا رہے تھے۔ انھوں نے پرولتاریوں نے کب سے پہلے فطری کوششوں کا اظہار اس طرح کرایا کہ انھیں متوسط طبقہ کے خلاف ایک علیحدہ جماعت کی صورت میں منظم کر دیا۔

افلاس کی زیادتی اور پرولتاریوں کے جوشِ عمل کا نتیجہ یہ ہُوا کہ نئی جماعت کے ساتھ زیادہ لگاؤ اور دلچسپی کا اظہار ہونے لگا۔ نئی صنعت کے تباہ کئے ہوئے تعلیم یافتہ۔ چھوٹی پیداوار والے اور دستکاریوں میں سے ایسے لوگ سامنے آئے جو اس خیال سے متفق تھے کہ نئے زمانہ کا بنیادی مسئلہ صرف ایسے سیاسی سوالوں پر مشتمل نہیں ہے جیسے "شہنشاہیت کے بجائے بالائی طبقے کی جمہوریت کا انتخاب" "یا شخصی آزادی اور آزاد تجارت کا مطالبہ" بلکہ وہ ایک سماجی مسئلہ ہے جس کا مقصد پرولتاریوں کی خوفناک عدم مساوات اور افلاس کو ختم کرنا ہے یہیں سے اٹوپین سوشلزم (Utopian Socialism) کی ابتدا ہوئی ہے۔

اٹوپین سوشلزم

اٹوپیون (Utopians) کی اکثریت تعلیم یافتہ لوگوں یعنی وہ جو آبادی کے درمیانی طبقے سے تعلق رکھتے تھے، کی نمائندگی کرتی تھی یہ وہ لوگ تھے جو سماجی ابتری کے بڑھ جانے سے خوف زدہ اور پرولتاریوں کے انقلابی جذبات اور عمل سے پریشان ہو کر مصائب اور سماجی عدم مساوات

ایشیا

کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ بعض اٹوپی ایسے فنا پذیر قلیل پیداوار والوں کے مفاد کی نمائندگی کرنا چاہتے تھے جو بڑے پیمانے کی صنعت و حرفت، اور سرمایہ کی یکجائی، کے مقابلے کی وجہ سے پرولتاریوں میں شامل ہو جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اٹوپیوں میں رابرٹ اوین (Robert Owen 1771-1858) چارلس فوریر (Charles Fourier 1771-1837) اور سینٹ سائمن (Saint Simon 1760-1825) کے نام بہت مشہور ہیں ان کی ابتدائی تحریریں کافی حد تک اہل صنعت و حرفت کی بے چینی کا اظہار کرتی ہیں مگر پھر بھی وہ رفتہ رفتہ سوشلزم کے قریب ہوتے چلے گئے۔ اٹوپیوں نے سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ سب سے پہلے جدید نظام سرمایہ داری پر مفصل اور سخت نقصان دہ نکتہ چینی کی۔ فرانس کے انقلاب عظیم سے پہلے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ذی علم مفکرین کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ جاگیرداری کے خاتمے اور سیاسی آزادی کے استحکام سے بنی نوع انسان کی ترقی اور بھلائی ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف فوریر اور اوین نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ توقعات بے بنیاد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ خواص کے ہاتھوں میں سیاسی قوت پہونچ جانے کے بعد کام کرنے والوں کی حالت مقابلتہً زیادہ خراب ہو گئی مثلاً فوریر نے موجودہ سماجی نظام پر گہری تنقید کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ یعنی سوداگر۔ تھوک فروش۔ قانون داں ٹیکس کلکٹر فوجی۔ شہروں میں رہنے والی عورتیں۔ شوقین مزاج لوگ یہ سب عیش پسند ہیں اور انھوں نے کوئی مفید کام نہیں کیا ہے۔ فوریر نے خواص کی مالی اور اخلاقی ابتری۔ ریاکارانہ ازدواجی اصول۔ اور خاندانوں کے علم تواریخ کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ فوریر اور اوین دونوں یہ چاہتے تھے کہ شہر اور دیہات کے فرق کو مٹا دیا جائے اور ایک ایسے نظام تعلیم پر زور دیا جائے جس کی بنیاد "تعلیم" اور "محنت" کے اتحاد پر ہو۔ انگلز (Angels) کہتا ہے کہ سینٹ سائمن (Saint Simon) تخیل کے ایک مخصوص رجحان کا مالک ہے۔ وہ اس سے کم واقف ہے کہ اقتصادی حالات ہی سیاسی آوازوں کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ہم اس کی تحریروں میں بھی آخری مقصود کے متعلق اس کا یہی خیال پاتے ہیں کہ انسانوں پر سیاسی حکومت کی جگہ کاروبار کی تنظیم اور پیداوار کے ذرائع کی نگرانی ہو جائے اور ایسے جاگیرداری

کے نظام کو ختم کرنے کا خیال صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ سوسائٹی کے موجودہ نظام پر اٹوپیوں کی تنقید بہت پرجوش اور مضبوط تھی مگر سوسائٹی کے مستقبل کے متعلق ان کی جو تجویزیں تھیں وہ زیادہ سے زیادہ تخئیلی (Utopian) تھیں، کیونکہ ان کی بنیاد میں اقتصادی ترقی کے متعلق کوئی صحیح غور و فکر نہیں پایا جاتا تھا۔ آنے والے سماج کے متعلق کافی تفصیل سے کام لیا گیا تھا۔ مثلاً فوریر کی تجویز تھی کہ فرقہ وارانہ نو آبادیات قائم کی جائیں جنکا نام اس نے فیلانسٹیریز (Phalanstries) رکھا تھا (یہ لفظ ایک فوجی اصطلاح "فیلنکس" (Phalanx) سے لیا گیا ہے) ہر ایک نو آبادی ۱۶۰۰ لیکر ۱۸۰۰ آدمیوں تک پر مشتمل ہو۔ نو آبادی کا ہر ممبر باری باری سے زراعت اور صنعت و حرفت کی مختلف شاخوں میں کام کرے۔ فوریر نے سرمایہ داری کے استیصال کی کوئی صورت نہیں بتائی بلکہ یہ بتایا کہ نو آبادیات میں جو کچھ پیداوار ہو اس کو مزدوروں میں ۱۲/۵ حصہ، سرمایہ داروں میں ۱۲/۴ حصہ اور منتظمین میں ۱۲/۳ حصہ کے حساب سے تقسیم کر دیا جائے۔ اس طریقے پر اس نے ذرائع پیداوار کی "مکمل ملکیت" کو نامنظور کر دیا۔ وہ یہ توقع کرتا تھا کہ ہر نو آبادی میں مزدوروں کی جماعت، مقابلہ کے جذبے کا باقاعدہ اطلاق، کاروبار میں تبدیلی اور قوتوں کا ایک جگہ جمع ہونا ان سب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزدوری کی پیداوار میں بڑی ترقی ہو جائے گی ان حقیقی اور سماجی بنیادوں پر طریقہ زندگی اور انسانی زندگی کی قوت و وسعت سب بالکل بدل جائیں گی۔ فوریر نے اس تبدیلی کو بھی تخئیلی رنگ دیا ہے۔

اٹوپیوں کی سرگرمیاں

اٹوپی جانتے تھے کہ سرمایہ داری کی ترقی سے جو حالات پیدا ہو گئے ہیں وہ ناقابل برداشت ہیں، لیکن انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ تبدیلی آسانی سے ہو جائے گی اور اس کے لئے وہ صرف ان تدبیروں کے پروپگنڈہ کو کافی سمجھتے تھے جو انھوں نے آنے والے سماج کے متعلق سوچی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنا فرض یہ قرار دے دیا تھا کہ وہ متعلقہ طبقوں کو اور ان لوگوں کو جو آئندہ سماج کے خاکے بنانے میں اپنی سیاسی قوتوں کو بھی کام میں لانے کو تیار تھے، ترغیب دیں، ان کا خیال تھا کہ ایسی تمثیلی نو آبادیات کا اثر دنیا کی

بقیہ انسانوں پر بہت تیزی کے ساتھ ہوگا۔ اُن کے خیال میں انقلاب اور سیاسی جدوجہد کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ ایک فرانسیسی سوشلسٹ کیبٹ (Cabit 1788-1856) جس نے ۱۸۴۸ء کے انقلاب سے قبل پہلے مزدوروں کو امریکہ میں آباد ہوکر وہاں سوشلسٹ نوآبادیاں قائم کرنے کی دعوت دی تھی، وہ اپنے خیال کا اس طرح اظہار کرتا ہے کہ

"اگر انقلاب میری مٹھی میں ہوتا تو میں اُس مٹھی کو کبھی نہ کھولتا۔"

ایک انگریز اٹوپی سوشلسٹ نے اپنی رائے کا اِس طرح اظہار کیا تھا۔

"ہمیں طاقت کے استعمال کے خلاف اپنی نگرانی سب سے پہلے کرنی چاہئے۔ جب فیصلہ کا وقت آئے تو نہ ہماری کوئی تلوار میان سے باہر نکلے اور نہ ہماری کوئی اُنگلی اُٹھے۔"

اٹوپی یہ سمجھتے تھے کہ مزدوروں کا طبقہ آبادی کا سب سے زیادہ مظلوم طبقہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اِس طبقے کو آزاد قدم اُٹھانے کا نااہل بھی یقین کرتے تھے۔ اِسی لئے وہ اوپر کے طبقے سے امداد چاہتے تھے اور اُنھیں حکومت کرنے والوں کی فیاضی پر اعتماد کرنا پڑتا تھا کیبٹ نے اِس سوال کا کہ "آیا اُمَراء کو سب سے پہلے صحیح راستہ پر لانے کی ضرورت ہے یا نہیں؟" جواب اِس طرح دیا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ ان سے کام شروع کرنا مفید ہوگا۔ کیونکہ اُمراء اور تعلیم یافتہ لوگوں کا امیروں اور غریبوں میں کافی اثر ہے۔ بہرحال کیا ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ ہم اُمراء میں کامیابی کے ساتھ کام انجام دے سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہمیں اس معاملے میں شک کیوں کرنا چاہئے۔ کیا اُمراء میں روشن خیال انصاف پسند اور فیاض لوگ نہیں ہوتے ہیں؟"

فورئیر کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کئی برس تک وہ مختلف اوقات میں اپنے گھر زیادہ رہا کیونکہ اُسے یہ اُمید تھی کہ کوئی لکھ پتی اسے پہلی نوآبادی قائم کرنے کے لئے ایک بڑی رقم عطا کرنے والا ہے۔

اِس زمانے میں جبکہ بڑے بڑے اٹوپی اُمیدیں کر رہے تھے کہ ترم دل سرمایہ داروں اور سمجھدار جاگیرداروں کی امداد سے وہ اپنے سوشلزم کی دنیا میں بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اسی زمانے میں دوسرے سوشلسٹوں نے چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کے ساتھ

مل کر تبدیلی کے درمیانی وقفہ کی کارروائیوں کے متعلق ایک مفصل پروگرام شائع کر دیا جو چھوٹے سرمایہ داروں کے مفروضات اور مطالبات سے بھرا ہوا تھا۔

پرودھن (Proudhan 1809-1865) اور لوئیس بلنک (Louis Blanc 1811 - 1882) نے منافع کے باہمی اداروں اور ہمہ گیر کوپرآٹیو ایسوسی ایشنز (انجمن ہائے امداد باہمی) کے قیام پر زور دیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ قابلِ حصول اور اصلاح شدہ کریڈٹ اِن چھوٹے سرمایہ داروں کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا تھا جو مہاجنوں اور بینکوں کے قائم کردہ سود کو ادا نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ ذاتی ملکیت کو فنا کرنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے مالکوں کی حیثیت کو اور بڑھا دیتا۔

اُنیسویں صدی کی ابتدا میں چھوٹے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی تنظیم کے لئے یہ سوشلسٹوں کے بنیادی مطالبے تھے۔

سنہ ۱۸۴۰ء اور سنہ ۱۸۵۰ء کے درمیان لوئیس بلنک فرانس کا ایک بڑا ذی اثر سوشلسٹ تھا۔ اٹوپیوں کی طرح وہ بھی انقلاب اور طاقت کے استعمال کا مخالف تھا اور پیداوار والوں کی باہمی امداد کو خدائی قوت سمجھتا تھا۔ بلنک نے اِس کے متعلق لکھا ہے۔

"لوگ اپنی آزادی کو اپنی فطری قوت میں نہیں دیکھتے بلکہ قاعدے میں دیکھتے ہیں۔ ہمیں قوت کا استعمال اپنے دشمنوں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے مجموعی حیثیت سے سماج جس میں خواص بھی شامل ہیں سوشلزم کے قیام کی موافق ہے۔ اگر خواص کو ارادوں کے ساتھ بٹھا دیا جائے تو اِس سے ملک میں تعمیر جدید ہوسکتی ہے۔ اِنھیں عوام میں شامل ہونے دیا جائے اور مقابلہ کی بجائے اتحاد کے رواج دینے میں سب سے پہلے حصہ لینے دیا جائے۔"

لوئیس بلنک کے خیالات میں وہ نئی بات جس پر آج کے مصلحین بھی اس سے متفق ہیں یہ تھی کہ وہ جمہوری ریاست کو بدل کر "انجمن امداد باہمی" بنانے پر زور دیتا تھا۔ پہلے اٹوپی "جاگیر" کی اہمیت سے قطعی منکر تھے۔ لوئیس بلنک یہ سمجھتا تھا کہ حق رائے دہی کے ساتھ عوام جاگیروں پر صنعتی اثر مرتب کر سکتے ہیں، اور اِس طرح امداد باہمی کے ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ مفاد عامہ کے کام کئے جا سکتے ہیں اور اُن کو جاری رکھنے کے لئے نجی سرمایہ استعمال کر سکتے ہیں

نجی معاہدوں کے خلاف آزادمقابلہ سے پبلک متعلقات اپنی برتری کو ثابت کرسکیں گے اس سلسلے میں نجی اقدامات کو فنا کردینے کے لئے طاقت کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اس زمانہ کے فرانس میں پیداواروالوں کی تحریک اتحادِ باہمی کافی وسعت اختیار کرچکی تھی۔ لیکن چونکہ بڑے پیمانے کے سرمایہ داروں کی کارروائیوں کا مقابلہ کرنا تھا اس لئے امدادِ باہمی کی انجمنیں یا تو ناکام ہوجاتی تھیں یا شرحِ مزدوری کی مہم میں کام آجاتی تھیں۔

اٹوپیا اور سائنس کا تعلق

سائنٹفک سوشلزم (Scientific Socialism) کے بانی مارکس اور انگلز کا تاریخی کارنامہ اُن کے اس نظرئیے میں پوشیدہ ہے کہ سوشلزم تاریخی ارتقا کی ایک ضروری پیداوار ہے اور یہ اقتصادی ترقی سرمایہ داری کی جگہ سوشلسٹ طریقۂ پیداوار کو ناگزیر بنادیتی ہے اور اس کی تیاری کرتی ہے۔ مارکس اور انگلز نے فلسفہ۔ اقتصادی اصول اور زمانے کی اقتصادی اور سیاسی تاریخ کی باقاعدہ اور مفصل تحقیقات سے آغاز کرکے تاریخ کے حقیقی نظرئیے کو وسیع کردیا۔ اُنھوں نے انسانی سماج کی ترقی کو سمجھنے کا راز بتایا ہے۔ مارکسزم (Marxism) نے دنیا اور اس کی تاریخ کا جو سائنسی نظریّہ (Scientific Couception) پیش کیا ہے جسے ڈائیلیکٹیکل میٹریلزم (Dialectical Materialism) بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے تاریخ کے عمل کو سمجھنے کا امکان پیدا ہوتا ہے اور عوام کی طبقاتی جدوجہد کے لئے جو صحیح ترکیبیں ہونی چاہئیں۔ اُن کی تعریف سمجھ میں آتی ہے۔ مارکس سے پہلے جو اٹوپی گزرے ہیں وہ سوشلزم میں تبدیل ہوجانے کے امکان کو پُرجوش دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے انفرادی حکومت کرنے والوں کی نیک نیتی پر اعتماد کرتے تھے اور اپنی اُن تجویزوں کو بہت اہمیّت دیتے تھے جو وہ آئندہ زمانہ کے لئے مرتّب کرتے رہتے تھے۔

مارکس نے یہ بتایا کہ پیداوار کا نظامِ سرمایہ داری کیسے وجود میں آتا ہے اور اپنی ترقی کے دوران میں کس طرح پیداوار کے ذرائع پر قابو پانے کے لئے زمین تیار کرتا ہے اور اگر سماج کی خلاق قوتوں کی ترقی برابر جاری ہے تو کس طرح ایک زمانے کے بعد ذاتی ملکیّت کا خاتمہ ضروری ہوجاتا ہے۔ اٹوپین کا یہ خیال ہے کہ پرولتاریوں سے کوئی آزادعمل ظہور میں نہیں آتا۔ اس کے برخلاف مارکس اور انگلز یہ بتاتے ہیں کہ ذرائع پیداوار میں ذاتی ملکیت کا خاتمہ، جو سوشلزم کو جاری کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ نئے سماج کے صرف ایک انقلابی طبقے کے ذریعہ ہوسکتا ہے اور وہ پرولتاریوں کا طبقہ ہے۔ سوشلزم کی کامیابی خواص .... کے طبقے کو شکست دینے اور پرولتاریوں کے ہاتھوں میں سیاسی طاقت پہونچانے یعنی انھیں خودمختاری دینے میں ہی ہے۔ چنانچہ سیاسی جدوجہد اور انقلاب کی تیاری کے لئے پرولتاریوں کی امداد حاصل کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

کمیونسٹ لیگ اور کمیونسٹ مینی فیسٹو

سنہ ۱۸۴۲ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک مارکس اور انگلز نے اپنے نظریوں کو مستقل شکل دیدی مگر وہ صرف سماجی مفکر ہی نہیں تھے بلکہ مزدوروں کی تحریکوں میں حصّہ لینے والے اور منتظمین بھی تھے۔

سنہ ۱۸۳۴ء میں جرمنی کارخانہ داروں اور سیاسی پناہ گزینوں (Emigres) نے پیرس میں ایک لیگ (League of Outlaws) قائم کرلی تھی جو سنہ ۱۸۳۶ء میں ایک بڑی انجمن (League of Just) بن گئی جو کمیونسٹ انقلابیوں کی ایک خفیہ انجمن تھی۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں اس انجمن کا ہیڈکوارٹر لندن بنالیا گیا۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں مارکس اور انگلز اس انجمن میں شامل ہوگئے اور اس کا نام بدل کر ”کمیونسٹ لیگ“ رکھا۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں لیگ کے لئے ایک پروگرام بنایا جو ”کمیونسٹ مینی فیسٹو“ کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہے اس پروگرام میں لیگ نے سائنٹفک سوشلزم Scientific Socialism کے اصولوں کی مکمل پیروی کا اظہار کیا تھا۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں مارکس نے وٹیلنگ (Weitling 1808-1871) سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ وٹیلنگ لیگ آف جسٹ کا محرک اور مضمون نگار تھا۔ اس کا سوشلزم پرجوش تھا اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ جرمن دستکاروں کی نمائندگی کرتا تھا۔ وٹیلنگ نے اپنی اُمیدوں کا انحصار اس پر رکھا تھا کہ بیس ہزار چور اور لپاڈی پرولتاری (Lumpen Proletarians) فیسے رہائی کے لئے بغاوت کریں۔ سوشلزم کے لئے اس کی تمام دلیلیں مسیح کی زندگی اور اُن کی تعلیمات سے ماخوذ تھیں۔ مارکس اور انگلز

نے بھی جرمن سوشلسٹوں (جو اپنے آپ کو حقیقی سوشلسٹ سمجھتے تھے) پر سخت تنقید کی۔ یہ جرمن سوشلسٹ "حقیقی ضرورتوں" کی حفاظت کی بجائے "صداقت کی ضرورت" پر زور دیتے تھے اور پرولتاری (Proletarian) مفاد کی حمایت کی بجائے اُن انسانوں کے جوہر انسانی کے مفاد کے حامی تھے جو کسی جماعت یا فرقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے (ملاحظہ کیجیے کمیونسٹ مینی فیسٹو)

اُن کا خیال تھا کہ جس طرح فرانس میں غریب مزدوروں نے سوشلزم کی طرف قدم بڑھایا تھا اسی طرح جرمنی میں تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کے لوگ تھے جو اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس لئے اُنھوں نے مزدوروں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ سیاسی انقلابات میں کبھی حصہ نہ لیں۔ مارکس اور انگلز جب ان جرمنی فلسفیوں۔ ہونے والے فلسفیوں اور معشوقوں سے نجات حاصل کر چکے تو انقلابی عوام کے مختلف مراکز (جو بروسل اور پیرس میں تھے) کے درمیان رابطے قائم کرنے کے انتظامات میں منہمک ہو گئے۔

ایک کمیونسٹ (اشتراکی) مراسلاتی ادارہ قائم کیا اور ۱۸۴۷ء میں کمیونسٹ لیگ کی ذہنی رہنمائی حاصل کر لی۔

دنیا کے سیاسی ادب کے شاہکار "کمیونسٹ مینی فیسٹو" کا بنیادی تخیّل حسب ذیل ہے۔

> تاریخ کے ہر دور میں طریقۂ پیداوار اور اس سے بنی ہوئی سماجی زندگی ہی وہ بنیاد ہے جس سے اس زمانہ کی سیاسی اور ذہنی تاریخ مرتّب ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کی تمام تاریخ مختلف زمانوں میں سماج میں طبقاتی کشمکش حاصل کرنے والوں اور حاصل کئے ہوؤں اور حاکموں اور محکوموں کے درمیان جنگ کی داستان ہے۔ یہ جھگڑا ترقی کرتے کرتے اب اس درجے پر آ گیا ہے، جبکہ حاصل کئے ہوئے مظلوم پرولتاری حاکموں اور ظالموں کے نیچے سے اُس وقت تک نکل ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ ظالم اور طبقاتی کشمکش رکھنے والے سماج سے نجات حاصل نہ کریں۔
>
> (اقتباس از مقدمۂ انگلز مینی فیسٹو ایڈیشن ۱۸۸۸ء)

۸۱

اٹوپنیزم (Utopianism) کی جگہ اس پرولتاری اشتراکیت نے لی جو ناقابلِ تفریق کشمکش اور مزدوروں کی تنظیم سے گھری ہوئی تھی" یہ کام ذہنی سلجھاؤ اور امتیاز کے ساتھ دنیا کے سامنے ایک نیا نظریہ سماجی زندگی کے تمام ماحول سے قربت رکھنے والی مستقل مادیت۔ منطقی مادیت مثلاً ارتقاء کا مفصّل اور حقیقی نظریہ۔ طبقاتی کشمکش کا اصول نئے اشتراکی سماج کے پیدا کرنے والے پرولتاریوں کی عالمگیر تاریخی و انقلابی سرگرمی ان سب باتوں کو پیش کرتا ہے (لینن کارل مارکس)

چھوٹے چھوٹے تعلیم یافتہ برطانوی فیبی (Fabians) اور ان کے خیالی پیرو۔ برطانوی لیبر پارٹی اور آئی ایل۔ پی (I.L.P) کے لیڈر خصوصاً میکڈانلڈ اسکول سے تعلق رکھنے والے یہ سب مارکس اور کمیونسٹ مینی فیسٹو کی مخالفت میں ہمیشہ "نمائشی" رہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ یہ تمام اصول زمانے کے مطابق نہیں ہیں تاہم یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان کا بنیادی نقطہ اور پروگرام حقیقی طور پر مارکس کے پیشتر کے لوئس بلنک کے سے ہیں۔ اور جس طرح لوئس بلنک "جمہوریت" کے پردے میں ۱۸۷۱ء کے کمیون (Commune) کو بدنام اور رسوا کرتا ہے اور اس کے مخالفوں کو امداد دے کر ان کی ہمت افزائی کرتا ہے اسی طرح فیبی اور میکڈانلڈی (Fabians and Mac-Donaldites) روسی انقلاب کو بدنام اور رسوا کرتے ہیں اور اس کے مخالفوں کو علی الاعلان اور پوشیدہ طور پر امداد دیتے ہیں اور اُن کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

جرمنی سماجی جمہوریت جس کو کسی زمانے میں برطانوی سوشلسٹوں کے مخالف مارکس (Anti Marx) رویّہ نے بہت بدنام کیا تھا۔ اب قطعی طور پر اپنے بنیادی اصول پر آ گئی تھی۔ اب اس نے کھلم کھلا یہ اعلان کر دیا تھا کہ مارکس اور انگلز نے ۱۸۴۸ء میں جو پالیسی تجویز کی تھی اُس سے دہشت انگیزی کا امکان ہے

یوں اس راستے کی سوشلسٹ جماعت جو جنگ سے قبل زمانے تک اپنے بنیادی اصول میں کم و بیش مارکسی (Marxist) تھی۔ جنگ کے زمانے سے اور پیونیٹڈ نارمن تھامس کی رہنمائی میں مارکس کے بنیادی اصول کے تحت رجعت کے طریقوں میں بالکل برطانوی اور جرمنی انداز اختیار کر گئی تھی۔

۱۸۴۸ء میں مینی فیسٹو کے خیالات زیادہ عام نہیں ہوئے تھے لیکن یہ ہو ہی رہا تھا کہ پیرس کا انقلاب شروع ہو گیا اور انقلابی موجیں یورپ کے ایک بڑے حصے کو اپنے اثر میں لے چکی تھیں۔ اس "خونی سال" کے طوفانوں میں مزدوروں نے

ایشیا

ہر جگہ نمایاں پارٹ ادا کیا۔ لیکن اپنے رہنماؤں کی غلطیوں اور اپنی ناکامیوں
کی وجہ سے وہ صرف اس قابل ہو سکے کہ اپنی جماعت کے حقیقی کاموں سے
آگاہ ہو جائیں اور عوام کی اس تحریک سے جو سبق حاصل ہو اُن سے کام کرنے
کی صحیح ترکیبیں سیکھیں۔ انقلاب کی رہنمائی کرنے والے ملک یعنی فرانس میں
مزدوروں کے سب سے زیادہ ممتاز لیڈر لوئس بلنک جیسے بورژوا سوشلسٹ
(Bourgeois Socialists) ہی تھے۔

آگسٹ بلنکی اور بلنکزم

ان چھوٹے چھوٹے بورژوا سوشلسٹوں کا ایک ترقی یافتہ نمونہ آگسٹ
بلنکی (August B. Lanqui 180) تھا ایک انقلابی اشتراکی
جس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ (چھتیس ۳۶ سال) قید خانے میں گزارا۔ بلنکی
کی قوتِ نظامِ سرمایہ داری کا تجزیہ کرنے کی قابلیت ہی میں پنہاں نہ تھی کیونکہ
اس معاملہ میں تو بڑے اٹوپی (Utopinnts) اس سے کہیں آگے تھے۔
بلکہ وہ مخالفوں سے مقابلہ کرنے کی ترکیبوں سے خوب واقف تھا۔ اور ایک منطقی
انقلابی تھا۔ وہ آئندہ سوسائٹی کے متعلق تجویزیں سوچنے کے خلاف تھا
اور سوشلزم میں پُرامن ترقی کے خیال سے ہمیشہ لڑتا رہا۔ وہ اس خیال کے
خلاف بھی لڑا کہ جب تک سرمایہ دارانہ سوسائٹی موجود ہے۔ "امداد باہمی" کے
اداروں کو کوئی حقیقی قوت مل سکتی ہے۔ سیاسی جدوجہد اور سوشلزم کو ناقابلِ تفریق
رشتہ میں منسلک کر دینا وہ اپنا حقیقی فرض سمجھتا تھا۔ اس خیال میں سوشلزم
کا امکان صرف اسی طرح تھا کہ مسلح ترقیوں کے ساتھ ایک طوفانی انقلاب ہو
اور عارضی طور پر ڈکٹیٹری قائم کر دی جائے۔

بلنکی نے عمر بھر مسلح بغاوت کی تنظیم کے لئے اَن تھک جدوجہد کی۔
اس کا خیال تھا کہ ایک کم تعداد کو باقاعدہ غیر قانونی انقلابی تنظیم کی سخت
ضرورت ہے۔ بلنکی نے جولائی کی شہنشاہیت (July Monarchy)
کے دوران میں ایک ایسے نظام کی ابتدا کی اور سکنڈ ایمپائر (Second
Empire) کے ماتحت کام کو جاری رکھا۔ یہ نظام دس دس آدمیوں کے
حصوں میں منقسم تھا۔ ان حصوں کے صرف رہنما ہی مختلف اضلاع کی رہنمائی
کرنے والوں سے متعلق رہتے تھے۔ کل جماعت کے صرف چند ممبر مرکزی ادارہ اور
خود بلنکی سے ملتے رہتے تھے۔ لافارگو کا بیان ہے کہ جب سکنڈ ایمپائر کا زوال ہوا
تو بلنکی نے دو ایک مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ پیرس میں کام کرنے والوں
کی باقاعدہ حاضری لی جایا کرے۔ دس دس آدمیوں کے گروپوں کے
لیڈروں سے درخواست کی جایا کرتی تھی کہ وہ شہر کے باہر کسی مقام پر جمع
ہو جائیں اور پھر ان لوگوں کے درمیان سے ایک بوڑھا آدمی۔ دائمی قیدی
بورژوا اور غیر جمہوری فرانس کا بدترین دشمن بغیر شناخت ہوئے گذرتا تھا
ایک مسلح بغاوت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے۔ بغاوت کی تنظیم اور
پیشہ ور انقلابیوں کی ایک جماعت پیدا کرنے کے لئے بلنکزم نے تبدیلی کے
اس زمانہ کا اظہار کیا جو اٹوپین سوشلزم اور انقلابی مارکسزم کے درمیان
گذرا ہے۔ انقلابی پرولتاریوں کے سب سے بڑے مفکرین مارکس اور
لینن نے بلنکی سے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن چونکہ بلنکی اور اس کے ساتھی بین الاقوامی
انقلابی تحریک میں فرانس کی اس جمہوریت اور کام کو بہت اہمیت دیتے
تھے اور اُن کے متعلق بہت مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ ان کا "رفعت مداحِ
وطن"، کا طریقہ اور بلنکی کی جرمنوں کے متعلق "جنگی مبالغہ آمیزی" اسی
کا نتیجہ تھی۔ اگرچہ بلنکی کی پیروی کرنے والے خود بھی نہیں سمجھتے تھے کہ اُن کی
پارٹی اور عوام کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ مگر بلنکی کے متعلق عام
اندازہ یہ لگانا کہ وہ محض سازشی اور . . . . تھا قطعی غلط ہے۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ بلنکزم نے انقلابی تحریک میں ایک قدم آگے بڑھایا اور مزدوروں
کی تحریک پر ایک گہرا انقلابی اثر ڈالا۔ بلنکی اور اس کے پیروؤں کے متعلق مارکس
بہت بلند خیال رکھتا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں مارکس اور انگلز نے بلنکیوں سے ایک
باقاعدہ معاہدہ کر لیا۔ بلنکی اس زمانے میں قید خانہ میں تھا۔ اس معاہدہ
کی وجہ "انقلابی اشتراکیوں کی عالمگیر انجمن" (Universal
League of Revolutionary Commimists)
قائم کرنا تھا اور اس پر مارکس۔ انگلز اور بڑے بڑے بلنکی رہنماؤں کے
دستخط ہوئے۔

انقلاب فرانس ۱۸۴۸ء

فرانس کے انقلابِ عظیم ۹۴-۱۷۸۹ء نے بھی بورژوا جمہوری تبدیلی
ہئیت کی تکمیل نہیں کی تھی۔ تھرمیڈار نہم (۱۷۹۴ء Thermidor
9 th) کے سیاسی ہنگامہ کے بعد جاکوبن (Jacobin
Dictatorship)

کی بنیادی جمہوری سرگرمیاں سرد پڑنا شروع ہوگئیں۔ چھوٹے چھوٹے شہری بورژواؤں اور مزدوروں کی قوتیں بکھر چکی تھیں۔ ۱۷۹۹ء کے سیاسی ہنگامہ کے بعد ڈائریکٹری (Directory) پہلے جاکوبنس (Jokobins) کی رہنمائی میں پانچ کی حکومت کنسولیٹ (Consulate) میں بدل چکی تھی۔

پہلا قونصل نپولین بوناپارٹ ایک سابق جاکوبن اور انقلابی فوجوں کا کامیاب ترین جنرل ۱۸۰۴ء میں شہنشاہ ہوچکا تھا۔ پہلی ایمپائر میں (First Empire) پالیسی کو سمجھا اور کسانوں کے انقلاب سے حاصل کئے ہوئے فائدوں کی حفاظت کی۔ مگر جیسے ہی فیوڈل یورپ کی اجتماعی قوت نے نپولین کے فرانس کو شکست دی پُرانی بوربن شہنشاہی (Bourban Monarchy) جس کو کسی زمانے میں عوام نے ختم کردیا تھا پھر اُبھر آئی۔ فرانس سے بھاگے ہوئے اُمرا واپس آگئے اور اپنے کھوئے ہوئے اختیارات پھر حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اُن کی جو زمینیں اُن سے لے لی گئی تھیں اُن کے معاوضہ میں اُنھیں لاکھوں روپیہ دیئے گئے اور وہ پُرانے نظام کے واپس آنے پر بہت زیادہ مطمئن تھے۔

جولائی ۱۸۳۰ء میں پیرس میں ایک انقلاب ہُوا۔ بوربون خاندان کا اقتدار ختم ہوگیا۔ لیکن عوام جمہوریت کو دوبارہ قائم کرنے میں ناکامیاب رہے بوربون کی جگہ آرلین خاندان نے لیلی۔

بادشاہ لوئس فلپ (Louis Philippe) (ڈیوک آف آرلینس جس نے انقلاب میں حصّہ لیا تھا اور جو بعد میں قتل ہوا تھا کا بیٹا تھا) نے بڑے بورژواؤں میں سب سے زیادہ دولتمند، یعنی مالی اعتبار سے جاگیردار لوگوں کے حقوق کا تحفّظ اور ان کی ترجمانی کی۔ جب لوئس فلپ تخت پر بیٹھا تھا تو ایک بینکر لیفیٹ (Ban Ker Laffitte) نے یہ کہا تھا کہ "اب فرانس میں بینکروں کی حکومت ہوگی"

انگلستان کے مقابلہ میں جہاں صنعتی انقلاب نے تمام قومی اقتصادیات کی صورت بدل دی تھی فرانس ابھی تک ایک زراعتی ملک تھا۔ انگلستان میں کسان ۲۳ فی صدی تھے جبکہ فرانس میں ان کی تعداد ۷۵ فی صدی تھی فرانس کے انقلابِ عظیم کے بعد چھوٹی چھوٹی جاگیروں نے مخصوص نظام جاگیرداری اختیار کرلیا تھا۔ لیکن اقتصادی حیثیت سے ایک چھوٹا کسان جس پر ٹیکس کا بار تھا اپنی ترقی کا کوئی ذریعہ نہ نکال سکا۔ وہ یا تو لین دین کے لئے مجبور تھا۔ یعنی بہار میں قرض لے اور خزاں میں ادا کرے اور پھر موسم سرما میں قرض لے یا پھر وہ زیادہ زمین کرایہ پر لینے اور کاشت کو وسعت دینے کی کوشش کرنے پر مجبور رہتا تھا۔ ہر صورت میں اُسے قرض لینا پڑتا تھا یا دوسرے الفاظ میں اُسے اپنی زمین رہن رکھنی پڑتی تھی۔ اس طرح ہر سال ایک کسان کو سود بھی ادا کرنا پڑتا تھا اور زرِ اصل میں سے بھی کچھ دینا پڑتا تھا۔ چالیسویں سال میں (یعنی ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء تک) کل ایسی رقم جو اس طرح کسانوں کو ادا کرنی پڑتی تھی ۵۵۰ ملین سالانہ تک تھی جو تمام فرانسیسی کسانوں کی کل آمدنی کا ½ حصّہ تھا۔

کسان کی زمین پر بار بڑھتا گیا اور مہاجنوں نے زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کئے۔ دیہات میں سود خوروں کی حکومت تھی مگر بحیثیت مجموعی تمام فرانس میں اقتصادی سرمایہ دار یعنی بینکر (Ben Ken) کی حکومت تھی۔ زمین کا رہن رکھنا۔ آراضیات کی فروخت اور پھر اور زیادہ قیمت پر دوبارہ فروخت کرنا۔ ان ذریعوں سے بہت زیادہ نفع کمایا جاتا تھا بینکر کے لئے آمدنی کا ایک ذریعہ ریاست کے بجٹ کی کمی بھی تھی طویل جنگوں کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ بجٹ کا کافی توازن قطعی تباہ ہوچکا تھا۔ آفیسروں اور عہدہ داروں کے اخراجات خصوصاً چھوٹے کسانوں کے علاقوں میں بہت بڑھے ہوئے تھے اور ان کی وجہ سے ریاست بہت مقروض ہوگئی تھی۔ کمی کو پورا کرنے کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ قرضے لئے جائیں اور یہ قرضے مہاجن بڑی بڑی شرحوں پر دیتے تھے۔ اس طرح ریاست کا قرض مالی (Aristoracy) کے اجتماع کا ایک بہترین سبب بن گیا جنھوں نے خود بخود متوسط طبقے کے لوگوں کو اپنا دشمن بنالیا۔

صنعتی بورژواؤں نے ابھی متوسط طبقے میں نمایاں حیثیت حاصل نہیں کی تھی تاہم صنعتی سرمایہ داری ترقی پر تھی۔ آٹھ سال کے عرصہ میں اسٹیم انجنوں کی تعداد تقریباً دوگنی ہوچکی تھی۔

	اسٹیم انجن	مزان بارس پاور
۱۸۳۹ء	۲۵۴۰	۳۳۰۰۰
۱۸۴۷ء	۴۵۸۳	۶۲۰۰۰

اسی زمانہ میں کوئلے کی پیداوار ۱۸۰۰۰ ٹن سے ترقی کرکے ۵۰۰۰۰۰ ٹن سے بھی زیادہ ہوگئی اور پہلے پہل ریلیں جاری ہوئیں لیکن بڑے پیمانے کی صنعت میں وسعت۔ مشینوں کا استعمال یکم پلہ داروالوں کی بڑوں کے سامنے اطاعت۔ بڑی تجارت کی ترقی جنہوں نے چھوٹے کاروبار کو بری طرح کچل دیا تھا ان سب باتوں نے مل کر شہری متوسط طبقہ کے لوگوں میں بہت بے اطمینانی پھیلادی تھی (حالانکہ ابھی اس کارروائی کی تکمیل میں کافی کمی باقی تھی)

سرمایہ داری کی ترقی کے ساتھ پرولتاریوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ بڑے پیمانے کی صنعت میں ان کی بہت تھوڑی تعداد کام کرتی تھی اُن کی زیادہ تعداد ایسے چھوٹے کاموں میں لگی ہوئی تھی جو بڑے تاجروں اور بیوپاریوں کے زیر اثر جاری تھے۔ ان پرولتاریوں کو بری طرح لوٹا جارہا تھا۔ اِن کے ساتھ ہی کچھ ایسے بھی پرولتاری تھے جو گھر پر کام کرتے تھے (مثلاً درزی۔ کشیدہ کاڑھنے والی عورتیں جو خصوصاً پیرس میں پائے جاتے تھے) صرف پیرس میں تقریباً ۳۰۰۰۰ کام کرنے والے تھے جن میں سے ۰۰۰۰، عمارتوں اور کپڑوں کی تجارت میں معروف تھے۔ تاہم کام لینے والوں اور کام کرنے والوں کے درمیان ابھی تک کوئی امتیازی نشان نہیں پایا جاتا تھا۔ یہ فرق تو صرف سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان ہی صاف طور پر نظر آتا ہے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والے ان کام کرنے والوں سے قریبی تعلق خاطر محسوس کرتے تھے۔ جنھیں اپنے آزاد ہونے کی ابھی تک کافی امید تھی۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے مالک اور ان کا کام کرنے والے بڑے پیمانہ کے سرمایہ والوں کے مخالف تھے۔ پیرس میں تقریباً ۶۴۰۰۰ آدمی کاروبار کرتے تھے۔ جن میں سے تقریباً نصف تنہا یا صرف ایک ماتحت کی مدد سے کام کرتے تھے۔ اس طرح جو سماجی تضاد بڑھا اسے سیاسی حالات نے اور بھی ناقابل برداشت بنادیا۔ فرانس کی چوبیس ملین آبادی میں سے صرف ۲۴۰۰۰۔ امراء اور زمینداروں کو رائے دینے کا حق حاصل تھا۔

(ادارہ)

شہباز

بلند آب و دانہ سے کرلے نظر کو — کہ دامِ نظر ہے یہی آب و دانہ
میں اُڑتا رہا ہوں، میں اُڑتا رہوں گا — کہ دوشِ ہوا ہے مرا آشیانہ
سکوں کی تمنا تجسس کی دشمن — تجسس مرا دائمی آشیانہ
خرامِ کواکب میں وہ لوچ کب ہے — جو ذرّوں کو بخشے رمِ دلبرانہ
مرے پنجۂ شوق پر ہو نہ حیراں — کہ یہ قُرب کا ہے فقط اک بہانہ
مری زندگی کی دو عملی نہ پوچھو
کبھی کافرانہ، کبھی راہبانہ

پرواز

ایشیا

انّا کرینینا

تلافیٔ مافات

ٹالسٹائی کا مشہور شاہکار اردو میں

(بہ سلسلۂ "ایشیا" جون ۱۹۳۹ء)

(جملہ حقوق محفوظ)

اسٹیفن ارکیڈی وچ نے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
"ہم تمہارا انتظار ہی کر رہے تھے"۔
یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ خطرہ گذر چکا ہے اُس نے اپنے دوست کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی" اُس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھا "ہاں یہ تو بتاؤ تمہارا حال کیا ہے اور تم کب آئے ؟"

'لیون' خاموش کھڑا ہوا 'ابلانسکی' کے دونوں ساتھیوں کے چہرے دیکھ رہا تھا وہ خصوصیت سے 'گرین وچ' کو دیکھ کر ایسا مبہوت ہو گیا گویا۔ اس کے لانبے لانبے سفید ہاتھوں۔ بڑے بڑے زرد ناخونوں (جو انگلیوں کے سرے پر مڑے ہوئے تھے) اور قمیص کے بڑے بڑے چمکدار بٹنوں نے اس سے قوت گویائی بالکل چھین لی ہے۔

"ابلانسکی" نے مسکراہٹ کے ساتھ 'لیون' کی اس حالت کو محسوس کیا۔

"اجازت دیجئے کہ میں آپ صاحبان کا تعارف کرادوں۔ — میرے دوست 'قلب ایوَنچ نکیشن' اور 'امیٹل اسٹینلیو تج گرائینو تج' — اس کے بعد وہ لیون کی طرف مڑا۔ "اور یہ میرے دوست 'کانسٹنٹن ڈمیٹری وتج لیون' ہیں"۔

"ایک تعلقہ دار۔ مقامی کونسل کی ایک بڑی شخصیت۔ شاندار کھلاڑی دو ہنڈرڈ ویٹ ایک ہاتھ میں اٹھا لینے والے۔ بہترین شکاری اور مشہور 'سرگی آئیوتج کاسنی شیو' کے بھائی!"

"مجھے آپ سے ملکر بہت خوشی ہوئی" نکیشن نے کہا
"مجھے آپ کے بھائی صاحب سے بھی ملاقات کا فخر حاصل ہے"
'گرین وتج' نے اپنے دُبلے ہاتھوں کو معہ بڑے بڑے ناخونوں کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیون" کچھ خوش نہیں ہوا۔ بیدلی سے مصافحہ کر کے "ابلانسکی" کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے بھائی کا بہت احترام کرتا تھا جو اپنے علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے تمام روس میں مشہور تھا۔ لیکن اسے یہ بات پسند نہ تھی کہ اس کی وقعت بجائے "کانسٹیٹن" ہونے کے "جو"گا سینشو" کا بھائی ہونے کی حیثیت سے کی جائے۔

"میں اب کونسل میں نہیں ہوں۔ وہاں ہر ایک سے میری لڑائی ہو چکی ہے اور اب میں اس کے جلسوں میں بھی شریک نہیں ہوتا ہوں" اس نے کہا

"کیا واقعی؟ "ابلانسکی نے تعجب انگیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا" لیکن کیسے؟ ۔ کیوں؟

"اوہ۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی پھر سناؤں گا۔"

"لیون" نے جواب دیا۔ "مختصراً" اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا "میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کبھی اس کونسل سے کچھ مطلب ہو سکتا ہے۔ وہ تو پارلیمینٹ کا ایک کھیل سا ہے۔ میں نہ ایسا نوجوان ہوں نہ ایسا بوڑھا کہ کھلونوں سے خوش ہو سکوں۔ اس کے علاوہ" اس نے ذرا سوچتے ہوئے کہا " وہ مخصوص قسم کے لوگوں کے زیر اثر ہے۔ وہ اس سے جیسا چاہتے ہیں کام لے لیتے ہیں۔ پہلے اس میں کلرک، جج اور تحفے قبول کرنے والے تھے۔ اور اب تو وہاں ایسے آدمیوں کا اک گروہ ہے جو مفت کی تنخواہیں پاتے ہیں"

اس نے آخری جملہ کچھ ایسی درشتی سے کہا گویا وہ توقع کر رہا تھا کہ کوئی اس کی تردید کریگا۔

"تمہارے لئے یہ کوئی نئی بات ہے! تم قدامت پسند ہوتے جاتے ہو" اسٹیفن ارکیڈی وچ نے کہا "ہم اس کے متعلق پھر گفتگو کرینگے۔"

"میں تم سے خاص طور پر ملنا چاہتا تھا" لیون نے کہا اور گرین وچ کے ہاتھ پر حقارت سے نظر ڈالی۔ اسٹیفن ارکیڈی وچ کے چہرہ پر ہلکا سا تبسم دوڑ گیا "کیوں۔ ہم نے تو یہ کہا تھا کہ تم اب کبھی یورپین کپڑے نہیں پہنو گے؟" اس نے لیون کے نئے سوٹ پر جو غالباً کسی فرانسیسی درزی کا تیار کیا ہوا تھا نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا "یہ واقعی ایک نئی بات ہے"

"لیون" کے چہرہ پر سرخی دوڑ گئی۔ معمر آدمیوں کی سی غیر مرئی سرخی نہیں بلکہ خود آگاہ طالب علم کی سی سرخی!۔ اس نے "لیون" کے ذہین و مردانہ چہرے کو ایسا پر شباب رنگ دیا کہ "ابلانسکی" کو رخ بدلنا پڑا۔

"تم مجھے کہاں مل سکتے ہو؟ مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں" لیون نے کہا

"ابلانسکی" نے ذرا غور کیا۔

"چلو ہم گورنس چل کر لنچ کھالیں۔ میں تین بجے تک فارغ ہو جاؤں گا۔"

"معاف کیجئے میں ابھی نہیں چل سکتا" لیون نے جھجکتے ہوئے کہا

"اچھا تو ہم ڈنر ساتھ کھائیں گے۔"

"ڈنر؟ مجھے کوئی خاص بات تو کہنی نہیں ہے۔ میں تو صرف دو باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن ہم اس کے متعلق پھر کبھی گفتگو کریں گے"

"آؤ تو وہ دو باتیں ابھی کریں اور باقی باتیں ڈنر کے وقت کیلئے اٹھا رکھیں۔"

"بات یہ ہے دیکھئے ۔۔۔۔ ۔۔۔۔ بہرحال یہ کوئی بہت اہم بات نہیں ہے۔" اس نے اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کی جس سے اس کے چہرہ پر سختی سی آگئی۔

"شربسکی کیا کر رہے ہیں؟ کیا وہی حال ہے جو پہلے تھا" اس نے پوچھا۔

اسٹیفن ارکیڈی وچ کو تھوڑا عرصہ ہوا یہ معلوم ہو گیا تھا کہ "لیون" اسکی سالی "کٹی" سے محبت کرتا ہے۔ اسکی آنکھیں زیادہ روشن ہو گئیں اور اس کے ہونٹوں پر بمشکل محسوس ہونے والا تبسم دوڑ گیا۔ "میں اس کا جواب جلد نہیں دے سکتا" اس نے کہا۔

"کیونکہ ۔۔۔ ۔۔۔ ایک منٹ کی معافی چاہتا ہوں"

اسی وقت اس کا سکرٹری داخل ہوا اور ایک شناسا مگر مؤدبانہ انداز کیسا تھ جو عموماً ان سکرٹریوں میں پایا جاتا ہے جن کو یہ خیال ہوتا ہے کہ کاروبار کے متعلق ان کا علم ان کے افسروں سے زیادہ ہے۔ کوئی کاغذ "ابلانسکی" کے سامنے پیش کیا اور استفسار کی صورت

میں کسی مشکل کی تشریح کرنے لگا۔ اسٹیفن ارکیڈی وچ نے بات ختم ہونے سے پہلے ہی نہایت مہربانی سے اپنا ہاتھ سکریٹری کے بازو پر رکھ دیا۔

"نہیں — تم اسے اسی طرح کرو جس طرح میں نے تمہیں بتایا تھا" اس نے اپنی بات کو ایک خوشگوار تبسم سے نرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے متعلقہ معاملہ کی مختصر تشریح کی اور کاغذات سامنے سے ہٹا دیئے۔ "اسے اسی طرح کرو" زاہر نکیتچ" اسنے مزید کہا۔

سکریٹری ایک الجھن میں مبتلا ہو کر چلا گیا۔ 'لیون' نے اس درمیان میں اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور ایک کرسی کی پشت کا سہارا لئے ہوئے کھڑا ہوا بیدلی کیساتھ باتیں سنتا رہا۔

"میں سمجھا نہیں — میں سمجھ ہی نہیں سکا" اس نے کہا

"کیا نہیں سمجھ سکے" ابلانسکی نے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے خوش مزاجی سے پوچھا۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ کوئی نئی بات 'لیون' سے معلوم ہونیوالی ہے۔

"میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم کر کیا رہے ہو" 'لیون' نے اپنے کندھوں کو حرکت دیتے ہوئے جواب دیا "تم اس معاملہ میں اسقدر سنجیدگی کیسے برت سکتے ہو"

"لیکن کیوں نہیں ؟"

"کیوں — اس لئے .... اس لئے .... کہ یہ کام کا طریقہ نہیں ہے"

"کیا تم ایسا خیال کرتے ہو ؟ اور پھر بھی ہم کام میں دن و رات مصروف ہی رہتے ہیں"

"کاغذی کام میں ! بہرحال تمہارے اندر اس قسم کی باتیں کرنیکا جوہر موجود ہے"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میرے اندر کسی بات کی کمی ہے۔"

"ہاں شاید ہے" لیون نے کہا" پھر بھی میں تمہیں پسند کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور مجھے ناز ہے کہ تم سا اہمیت رکھنے والا انسان میرا دوست ہے۔ — لیکن تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا" اس نے 'ابلانسکی' کے چہرے پر نظر جمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ اچھا سو وہ بھی تمہیں وقت پر مل جائیگا

یہ اچھا ہے کہ کیرلینک، میں تمہاری چند ایکڑ زمین ہے اور تم ایسا جسم اور بارہ برس کی دوشیزہ کا سا رنگ رکھتے ہو لیکن آخر میں تم ہمارے پاس ہی آؤ گے۔ رہی وہ بات جو تم مجھ سے پوچھ رہے تھے تو حقیقتاً اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ مگر یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ تم اتنے عرصہ تک نہیں آئے"

"کیوں ؟" 'لیون' نے خوفزدہ ہو کر پوچھا

"اوہ۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہم اس کے متعلق ابھی گفتگو کرینگے" 'ابلانسکی' نے جواب دیا

"تم کس غرض سے آئے ہو ؟"

"اوہ۔ ہم اس کے متعلق بھی بعد میں گفتگو کریں گے"

'لیون' نے نہایت آہستہ سے جواب دیا۔

"اچھا۔ میں سمجھ گیا" 'اسٹیفن ارکیڈی وچ' نے کہا" مجھے تم سے گھر آنے کیلئے کہنا چاہیئے تھا۔ مگر میری بیوی کی طبیعت خراب ہے۔ کیا تم انھیں دیکھنا پسند کرو گے۔ وہ چار اور پانچ بجے کے درمیان زولاجیکل گارڈن میں ملیں گے۔ 'کٹی' اسکیٹنگ کو گئی ہے۔ بہتر ہے تم بھی وہیں چلے جاؤ اور میں تمہیں ذرتت پہلے ملوں گا۔

"اچھی بات ہے۔ آداب عرض"

"لیکن اس کا خیال رکھنا کہ بھول نہ جانا۔ کبھی گاؤں کو یا کہیں اور چلے جاؤ" 'اسٹیفن' نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میں وہیں ملوں گا"

'لیون' چلا گیا۔ جب وہ دروازہ سے باہر نکل گیا تو اسے یاد آیا کہ وہ 'ابلانسکی' کے دونوں ساتھیوں سے رخصت ہونا بھول گیا۔

'لیون' کے جاتے ہی گرین وچ نے کہا "میں خیال کرتا ہوں کہ یہ شخص بہت ذہین ہے"

'اسٹیفن' نے سر ہلاتے ہوئے تائید کی "وہ ایک خوش قسمت انسان ہے۔ کیرلینک کی تمام زمین اور اس کا اپنا مستقبل اسکے سامنے ہے"

"لیکن اسٹیفن ارکیڈی وچ ، تمہیں شکایت کیا ہے ؟"

"میرے ساتھ معاملہ زیادہ بہتر نہیں ہے" اسٹیفن نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

جب 'ابلانسکی' نے لیون سے یہ پوچھا تھا کہ وہ ماسکو کس لئے آیا ہے۔ تو 'لیون' کو خجالت بھی ہوئی اور اسے خود اپنے اوپر غصہ بھی آیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن وہ اُسے یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ اس مقصد کو لیکر آیا ہے کہ اس کی سالی 'کٹی' سے شادی کی درخواست کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ 'لیون خاندان' اور 'شربسکی خاندان' ماسکو کے دو بڑے خاندان تھے اور دونوں میں بہت اتفاق و اتحاد تھا۔ یہ اتحاد اس وقت اور بڑھ گیا جبکہ 'لیون' یونیورسٹی میں تھا اور 'ڈولی' اور 'کٹی' کے بھائی 'پرنس شربسکی' سے اس کی دوستی گہری ہوگئی تھی۔ اس زمانہ میں 'لیون' شربسکی خاندان میں اکثر آتا جاتا تھا اور تمام خاندان سے اسے محبت تھی خصوصیت کے ساتھ خاندان کی خواتین سے۔ 'لیون' کی ماں کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا اور چونکہ اس کی بہن اس سے کافی بڑی تھی اس لئے اس نے سب سے پہلی مرتبہ شربسکی خاندان میں وہ مہذب۔ دلکش اور شرافت سے معمور زندگی پائی جو ماں باپ کے انتقال کے بعد اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس خاندان کے تمام افراد خصوصاً خواتین ساحرانہ اور شاعرانہ تجلّیات سے معمور ہوں۔ یہی نہیں کہ وہ ان میں کوئی نقص نہیں نکال سکتا تھا بلکہ وہ انھیں بلند ترین جذبات اور بہترین صفات کا حامل سمجھتا تھا۔ اس خاندان کی تینوں خواتین کو ہر دوسرے روز فرانسیسی اور انگریزی زبان کیوں بولنا پڑتی ہے۔ انھیں بعض اوقات کئی کئی گھنٹے پیانوں پر گانے کی کیوں مشق کرنی پڑتی ہے جس کی آواز ان کے بھائی کے کمرے میں بھی جہاں نوجوان طالب علم کام کرتے ہیں جاتی ہے۔ فرانسیسی ادب، موسیقی اور رقص کے ماہرین انھیں تعلیم دینے کیوں آتے ہیں۔ وہ مقررہ وقت پر 'مائل لینن' کے ساتھ 'ورسکائی بالیورڈ' پر سیر کرنے کیوں جایا کرتی ہیں اور وہاں اپنے ریشمیں کوٹوں میں 'ڈولی' اپنے لانبے کوٹ میں 'نیٹالی' اس سے چھوٹے کوٹ میں اور 'کٹی' سب سے چھوٹے کوٹ میں ملبوس کیوں ٹہلا کرتی ہیں اور اس چہل قدمی میں ایک نوکر اپنا ملازمانی لباس پہنے اور اپنے ہیٹ میں سنہری ربن لگائے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ کیوں رہتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں 'لیون' کیلئے قطعی ناقابلِ فہم تھیں مگر وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ لوگ اپنی طلسماتی دُنیا میں جو کام بھی کرتے ہیں وہ مکمّل ہوتا ہے اور وہ ان کے ہر کام کی طلسماتی حیثیت کو پسند کرتا تھا۔

جب وہ صرف طالب علم تھا تو اُسے 'ڈولی' سے محبت ہوگئی تھی مگر ڈولی کی شادی جلد ہی 'ابلانسکی' سے ہوگئی۔ اس کے بعد اس کی توجہ دوسری بہن کی طرف مبذول ہوگئی لیکن 'نیٹالی' جیسے ہی باہر آنے جانے کے قابل ہوئی اس کی شادی ایک مدبّر کے ساتھ ہوگئی۔ جب 'لیون' نے یونیورسٹی کو خیر باد کہا تو اس زمانہ میں 'کٹی' بچّی تھی۔

نوجوان شربسکی، بحری فوج میں شامل ہوگیا اور بحر بالٹک میں ڈوب گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لیون کی 'ابلانسکی' سے دوستی کے باوجود 'لیون خاندان' اور 'شربسکی خاندان' ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ لیکن شروع سال میں جب 'لیون' پورے ایک سال کے بعد ماسکو آیا اور شربسکی خاندان میں ملنے کیواسطے گیا تو اسے سب سے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ تینوں بہنوں میں سے کس کی محبت اس کے مقدر میں تھی۔

۳۲ سال کے ایک انسان کیلئے جو خوش قسمت بھی ہو اور خاندان بھی اچھا رکھتا ہو خاندان 'شربسکی' کی شہزادی سے شادی کی درخواست کر دینا کچھ مشکل نہ تھا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ ایک پسندیدہ محبت کرنے والا ہے۔ لیکن 'لیون' محبت کرتا تھا اور اس کی نگاہ میں 'کٹی' ہر نقطۂ خیال سے انسانیت کا ایک ایسا مکمل نمونہ اور دُنیا کی ہر چیز سے اسقدر بلند و بالا تھی کہ اس کے خیال میں نہ تو کٹی خود اور نہ کوئی اور اُسے 'کٹی' کے لیے مناسب خیال کر سکتا تھا۔

آخر کار ماسکو میں دو مہینے مسلسل تشویش کے عالم میں گذارنے اور سوسائٹی میں 'کٹی' سے روزانہ ملاقات ہونے کے بعد وہ اس

نتیجہ پر پہونچا کہ "اتحاد" ناممکن ہے اور اسی کے بعد وہ ماسکو سے گاؤں کو روانہ ہوگیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ 'کٹی' کے عزیز و اقارب اس کے ساتھ 'کٹی' کے رشتہ کو اچھا نہیں سمجھتے ہیں اور خود 'کٹی' بھی اس سے محبت نہیں کرتی ہے۔ 'کٹی' کے خاندان والوں کی نگاہ میں اس کا کوئی ایسا کاروبار بھی نہ تھا جو اس کے شایان شان ہو۔ اس کے ہمعصروں میں کرنل بھی تھے۔ ایڈ یکانگ بھی۔ پروفیسر بھی تھے اور بنک یا ریلوے کے ڈائرکٹر بھی یا سرکاری محکموں کے صدر جیسا کہ 'ابلانسکی' تھا۔ ان سب کے برخلاف وہ گاؤں کا ایک معمولی زمیندار تھا۔ (وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اسے ایسا ہی سمجھتے ہیں، جس کا تمام وقت مویشیوں کی دیکھ بھال۔ اناج گھروں کی تعمیر اور شکار وغیرہ جیسے غیر دلچسپ کاموں میں گذرتا تھا جن کے متعلق سوسائٹی کا یہ خیال تھا کہ انھیں وہی کرسکتا ہے جو ایک ناکام انسان ہو۔ پھر پاکیزہ 'کٹی' ایسی معمولی اور غیر دلچسپ جگہ کے رہنے والے (جیسا کہ خود اس کا اپنا خیال تھا) انسان سے کیسے محبت کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ جس زمانہ میں 'لیون' اور 'کٹی' کے بھائی دوست تھے اس کے اور کٹی کے تعلقات بالکل ایسے تھے جیسے ایک معمرانسان کے کسی بچّی سے ہوں جو یقیناً محبت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔

"ایک انسان جو اس کی طرح سیدھا سادہ ہو" اس نے سوچا "ایسی محبت سے جیسی وہ 'کٹی' سے کرتا تھا وہ ایک خاتون کو متاثر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک دوست کی طرح محبت کرسکتی تھی۔ اس نے ایسے واقعات بھی سنے تھے کہ عورتوں نے غیر دلچسپ اور بدصورت مردوں سے محبت کی لیکن اُسے یقین نہ آتا تھا۔ یہ اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کسی ایسی خاتون سے محبت کرتا جو خوبصورت شعریت آفریں اور نمایاں ہستی نہ ہو۔

گاؤں میں دو مہینے تنہا گذارنے کے بعد اُسے یہ اندازہ ہوا کہ اس کی تمنا ایسی نہ تھی جس کا تجربہ اسے نوجوانی میں ہوا تھا۔ اب تو اسے ایک لمحہ بھی چین نہ تھا۔ وہ یہ معلوم کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ 'کٹی' اس سے درحقیقت شادی کرسکتی ہے یا نہیں۔ یہ بات بھی تو کچھ یقینی نہ تھی کہ وہ اس سے شادی کرنے کو منع ہی کردیگی۔ اسی لئے وہ پھر ماسکو آگیا اور یہ مصمم ارادہ کرکے آیا تھا کہ اگر 'کٹی' رضامند ہوگئی تو وہ اس سے شادی کرلیگا۔ اور اگر رضامند نہ ہوئی تو .... وہ اس قسم کا خیال بھی نہ کرنا چاہتا تھا کہ اگر اس نے انکار کردیا تو کیا ہوگا۔

(۷)

'لیون' صبح کی گاڑی سے ماسکو پہونچا اور سیدھا اپنے سوتیلے بھائی 'کاسنیشو' کے پاس گیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے بدلے اور اپنے بھائی کے دارالمطالعہ کی طرف چل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بھائی سے سب حال کہہ کر اس معاملہ میں اس کی رائے لیگا۔ لیکن اسے "کاسنیشو" تنہا نہیں ملا۔ وہ فلسفہ کے ایک پروفیسر سے مصروف گفتگو تھا جو "کھارکو" سے فلسفہ کے ایک نکتہ کو جس کے متعلق ان دونوں میں اختلاف تھا۔ سمجھنے کیلئے آیا تھا۔ پروفیسر "مادیت" کے خلاف مضامین کا ایک سلسلہ لکھ رہا تھا اور 'سرگی کاسنیشو' نے جوان مضامین کو غور سے پڑھ چکا تھا اسے لکھا تھا کہ وہ اس کے آخری نکتہ سے اتفاق نہیں رکھتا تھا اور اس پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس نے "مادیت پرستوں" کی شکست کے لئے بہت نرمی سے کام لیا۔ اسی وجہ سے پروفیسر اس کے پاس آیا تھا اور وہ اس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس سے اس کا کیا مطلب ہے۔ وہ دونوں اس پر بحث کررہے تھے کہ وہ امتیازی نشان کون سا ہے جو انسانی اعمال میں نفسیات اور علم الاجسام کے درمیان فرق ظاہر کرسکے۔

"سرگی ادنیوونچ" اپنے بھائی سے حسب معمول پسندیدہ مگر ذرا سرد مسکراہٹ کے ساتھ ملا۔ پروفیسر سے اس کا تعارف کرایا اور پھر بحث میں مصروف ہوگیا۔

پروفیسر عینک لگاتا تھا۔ اس کا قد چھوٹا اور پیشانی تنگ تھی۔ اس نے ذرا سوقف کر 'لیون' سے ہاتھ ملایا اور مزید توجہ کئے بغیر پھر گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ 'لیون' جو اس فکر میں تھا کہ کسی طرح پروفیسر چلا جائے خود بھی بحث میں محو ہوگیا۔ جن مضامین کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی وہ اس کی نظر سے گذر چکے تھے۔ اور ان سے اسے تھوڑی سی دلچسپی بھی

تھی بالکل ایسے ہی جیسے کہ ایک شخص جس نے یونیورسٹی میں سائنس کی تعلیم حاصل کی ہو لازمی طور پر جدید معلومات کا متمنی رہتا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ انسانی تخلیق بیالوجی علم المعیشت اور موت وحیات کے وہ اہم سوالات جو ایک عرصہ سے اس کی توجہات کا مرکز تھے ان سب کے بارے میں سائنس کے نظریوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے اس نے محسوس کیا کہ اس کا بھائی اور پروفیسر سائنس اور روح کے مسائل کو علیحدہ علیحدہ نہیں دیکھتے۔ وہ دونوں ایک یا دو مرتبہ اسی نکتہ پر ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے لیکن پھر وہ ایکدم علیحدہ ہو گئے اور پھر اپنی مفروضہ اصطلاحات اور امتیازات میں جنکو وہ مشکل سے سمجھ سکتا تھا کھو گئے۔

" میں یہ نہیں مان سکتا" سرگی او نیووتج نے اپنے واضح اور صاف انداز گفتگو میں کہا " میرے لئے یہ مان لینا ممکن ہی نہیں ہے کہ کیز د Kaus ، کا یہ کہنا صحیح ہے کہ بیرونی دنیا کا تمام علم احساسات کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ وجود کا تخلیقی شعور احساسات کے ذریعہ نہیں ہوتا اور ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جو اس شعور کو ہم تک پہونچانے کا سبب کہا جا سکے۔ ہاں لیکن ورسٹ Wurst ونالس Knaus اور پرپاسو Prepasue یہ بتاتے ہیں کہ اپنے ہونیکا ادراک تمام حواس کے اجتماع سے ہوا ہے اسے درحقیقت تاثرات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ ورسٹ Wurst تو یہاں تک کہتا ہے کہ بغیر تاثر کے اپنے وجود کا شعور پیدا ہو ہی نہیں سکتا "

" دوسری طرف میں خیال کرتا ہوں کہ ...."

سرگی ایئووتج نے کہنا شروع کیا۔ یہاں لیون نے یہ محسوس کیا کہ وہ پھر اپنے اصل مبحث سے ہٹ رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ وہ بھی پروفیسر سے ایک سوال کرے۔

" لیکن کیا انجام ہو" اس نے کہنا شروع کیا " اگر میرے تمام حواس غائب ہو جائیں اور میرا جسم مردہ ہو جائے۔ کیا ایسی صورت میں میرے وجود کا خاتمہ ہو جائیگا ؟"

پروفیسر اس دخل درمعقولات سے ذرا سا گھبرا گیا۔ اس نے دخل دینے والے کی طرف دیکھا لیکن وہ اسے فلسفی ہونے کی بجائے دیہاتی معلوم ہوا۔ وہ پھر سرگی او نیووتج کی طرف متوجہ ہو گیا گویا وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کا خیال کیا ہے۔ لیکن سرگی پروفیسر کی طرح تنگ خیال نہیں تھا۔ اس نے لیون، کے سوال کا مفہوم سمجھ لیا تھا چنانچہ اس نے کہا

" میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں اس سوال کے جواب کا ابھی کوئی حق حاصل ہے "

" ہمیں کافی علم نہیں ہے " پروفیسر نے تائید کی اور اپنی دلائل کو پھر شروع کر دیا۔

" نہیں" اس نے کہا " میرا خیال ہے کہ اگر پرپاسو Pre- Pasue - صاف طور پر یہ کہتا ہے کہ تاثر کی بنیاد احساس ہے تو ہمیں دونوں مختلف نظریوں کو نہایت غور سے جانچنا چاہیئے ......"

لیون، نے کچھ نہیں سنا وہ تو پروفیسر کے رخصت ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

(۸)

پروفیسر کے جاتے ہی سرگی اونیووتج، اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوا " مجھے تمہارے آنے سے کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ کیا تم کچھ دن ٹھہرو گے ؟"

" ریاست کا کیا حال ہے ؟"

دلیون، جانتا تھا کہ اس کے بھائی کو جائداد کے معاملات سے بہت کم دلچسپی تھی اور یہ سب کچھ وہ اخلاقاً پوچھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی جواب میں کچھ گیہوں کی فروخت اور ان کی قیمت وغیرہ کا ذکر کر دیا۔

دلیون، چاہتا تھا کہ اپنے بھائی سے ذکر کر دے کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے اور اس بارے میں اس سے رائے لے لیکن پروفیسر سے گفتگو ہو جانیکے بعد اور جائداد د لیون ریاست میں اپنے اور اپنے بھائی کے حصہ کا جو انھیں اپنی ماں سے ورثہ میں ملا تھا انتظام خود ہی کرتا تھا) کے متعلق اس نے جس محبت آمیز انداز میں پوچھا تھا ان سب باتوں کو محسوس کر کے وہ دل کی بات زبان تک نہ لا سکا۔

اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا بھائی معاملہ کو اس طرح نہیں دیکھے گا۔ جس طرح کہ وہ چاہتا ہے۔

"اور ہاں تمہاری کونسل کا اب کیا حال ہے؟" سرگی اونیوچ نے پوچھا۔ اس کی نگاہ میں کونسلوں کی بڑی اہمیت تھی اور وہ ان میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔

"مجھے حقیقت میں کچھ علم نہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تم اب کونسل کے ممبر نہیں؟"

"ہاں میں اب ممبر نہیں ہوں۔ میں نے استعفیٰ دیدیا ہے اب میں اس کے اجلاسوں میں بھی شریک نہیں ہوتا۔"

"کس قدر افسوس کی بات ہے۔" سرگی اونیوچ نے ذرا ترش رو ہوکر کہا۔

لیون نے مدافعت کرتے ہوئے اپنے ضلع کی اسمبلی کے اجلاسوں کا ذکر کیا اور وہاں کے کچھ واقعات سنائے۔

"لیکن یہ تو ہمیشہ سے ہوتا ہی آیا ہے" سرگی اونیوچ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "ہم روسی ہمیشہ کے ایسے ہی ہیں۔ اپنی کمزوری کو محسوس کرنا اچھی بات ہے مگر ہم اس معاملہ سے بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور ہر بات پر جھگڑنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

یورپ کی دوسری قومیں مثلاً جرمن انگریز ہماری انھیں مقامی کونسلوں سے عجیب عجیب کام لے سکتے ہیں۔ وہ ان کے ذریعہ سے آزادی حاصل کر سکتے ہیں مگر ہم سوائے جھگڑنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

"لیکن ہم کریں کیا" لیون نے ذرا خجالت سے پوچھا۔ "وہ میری آخری کوشش تھی۔ میں واقعی کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا امکان ہی پیدا نہ ہو سکا۔ میں کافی ہوشیار نہیں ہوں۔"

"یہی نہیں کہ تم کافی ہوشیار نہیں ہو بلکہ تم معاملات کو صحیح جذبہ کے ماتحت دیکھتے بھی نہیں ہو۔" سرگی اونیوچ نے کہا۔

"شاید ایسا ہی ہو" لیون نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ بھائی نکولے پھر واپس آگئے ہیں" سرگی اونیوچ نے پوچھا۔

نکولے، لیون کا بڑا بھائی اور سرگی اونیوچ کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ ایک تباہ و برباد انسان تھا۔ وہ اپنی ریاست کا بڑا حصہ صرف کر چکا تھا اور ہر قسم کے بدقماش انسانوں سے میل جول رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے بھائیوں سے اس کی کبھی نہیں بنتی تھی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" لیون نے ذرا خوفزدہ ہوکر پوچھا، "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"پروکافی نے اسے ایک گلی میں دیکھا تھا۔"

"یہیں۔ ماسکو میں؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ٹھہرا ہے؟"

لیون کرسی سے ایکدم اٹھ کر کھڑا ہوا گویا وہ اسی وقت اپنے بھائی کے پاس جانا چاہتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں کیوں بتادیا" سرگی اونیوچ نے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس خبر سے اس کے بھائی پر کیا اثر پڑا ہے۔ "میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے اور ٹربن کے نام اسکا مسودہ بھی بھیجا ہے جس کی رقم میں نے خود ادا کی ہے۔ مگر دیکھو اس نے جواب میں یہ لکھا ہے"۔ سرگی اونیوچ نے اپنے بھائی کو ایک پرچہ دیا جو پیپرویٹ کے نیچے دبا ہوا رکھا تھا

لیون نے پرچہ کو دیکھا اور وہ اس عجیب خط کو پہچان گیا جس سے وہ خوب اچھی طرح آشنا تھا۔

"براہ مہربانی مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔ میں اپنے مہربان بھائیوں سے صرف اتنا ہی چاہتا ہوں۔

"نکولے لیون"

کانسٹینٹن لیون اپنے بھائی کی تحریر ہاتھ میں لئے ہوئے سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو رہا تھا کہ بدقسمت بھائی کے تمام گذشتہ واقعات کو بھول جانا چاہیئے لیکن پھر اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک غلطی ہوگی۔

"اس نے میری صریحاً توہین کرنی چاہی تھی"، سرگی اوینودتچ نے سلسلہ کلام کو جاری کیا۔ "لیکن وہ ایسا کر نہیں سکا۔ یہ میری دلی خواہش تھی کہ میں کسی طرح اس کی مدد کر دیتا لیکن مدد کرنے کا کوئی طریقہ بھی تو معلوم ہو"

"ہاں ہاں" لیون نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "اس کے متعلق تمہارے جو احساسات ہیں میں ان کو پسند کرتا ہوں۔ لیکن میں اس سے ملنے جا رہا ہوں"

"اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو جا سکتے ہو مگر میں تمہیں ایسی رائے نہیں دے سکتا" سرگی اونیودتچ نے کہا۔ "مجھے اس بات کا بالکل خیال نہیں ہے کہ وہ تمہیں میرے خلاف بھڑکا دیگا بلکہ میں جو تمہیں وہاں جانے سے روک رہا ہوں وہ صرف تمہاری ہی بھلائی کیلئے ہے۔ نتیجہ تو بہتر ہو نہیں سکتا مگر خیر تم اپنے آپ کو خوش کر لوگے"

"اس کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو مگر میں اپنے جذبہ سے مجبور ہوں خصوصاً اس وقت - - - - - - - - خیر وہ دوسری بات ہے اگر میں اب نہ گیا تو مجھے تکلیف ہوگی"

"میں اسے سمجھ نہیں سکا" سرگی اونیودتچ نے کہا۔ "میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ میرے لئے ایک توہین آمیز درس ہے اور میں اس معاملہ میں زیادہ ہمدردی سے بھی غور کر سکتا ہوں۔ اگر ونکولے، ویسا ہی ہو جائے جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس نے کیا کیا ہے"

"وہ بڑی خوفناک بات ہے۔ بڑی خوفناک" لیون چلایا

لیون نے اپنے بھائی کے نوکر سے "نکولے" کا پتہ پوچھا تاکہ وہ جلد از جلد اس سے ملنے چلا جائے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر شام تک کیلئے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے سوچا کہ دماغ کو سکون دینے کیلئے اسے سب سے پہلے اس معاملہ پر غور کرنا چاہیئے جس کی وجہ سے وہ ماسکو آیا تھا۔

چنانچہ وہ سیدھا "ابلانسکی" کے دفتر میں پہونچا۔ سر بسکی خاندان کے متعلق معلومات حاصل کیں اور "ذولاجیکل گارڈنز" کی طرف روانہ ہوگیا جہاں اسے یہ امید تھی کہ "کٹی" سے ملاقات ہو جائیگی۔

(باقی)

ادارہ

ایک صحافی کے نفسیات

تہذیب کی ترقّی زندگی کے ہر پہلو کو پیچیدہ بنا دیتی ہے تمدّن کے عروج کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اہمیت پیدا ہوجاتی ہے۔ تہذیب و تمدّن کی ترقّی میں انسانی زندگی مشین کی طرح بے روح ہوکر کام کرنے لگی ہے۔

اس زمانے میں پریس کی اہمیّت جتانے کے لئے یہ بتا دینا کافی ہے کہ سامراجی حکومت کے چار کھمبوں میں ایک کھمبا پریس بھی ہے۔ پریس کو یہ طاقت اس وجہ سے ملی کہ اخبار بینی اس عہد کی زندگی گزارنے کے لئے لازمی چیز بن گئی ہے، ہر مہذب انسان کو اخبار بینی کی لت ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک اخبار کے دیکھنے والے کو اگر کسی روز دوسرا اخبار دیکھنے کو ملے تو "طلب نہیں بجھتی" اور اس طرح اخبار رائے عامہ کو تیّار کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

اب چونکہ لوگ اخبار پڑھتے ہیں اس لئے چھاپے خانوں کا پیٹ بھرا جانا بھی ضروری ہوتا ہے، اور چونکہ چیزیں اتنی کثرت سے مہیّا نہیں ہوسکتیں، اس لئے پرانی باتوں کو نیا دکھا کر اخبار کے کالم بھرے جاتے ہیں، اور چونکہ اخبار بینی کی عادت غیر معمولی بات کے سننے کو بے چین رہتی ہے ...... اس لئے ہر معمولی چیز کو چٹ پٹا کرکے پیش کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اور اس لئے کہ ہم مشین کی یکساں زندگی جیتے ہیں۔ ہم کو ہیجان آفریں چیزیں زیادہ پسند ہوتی ہیں جن سے کہ ہماری فطرت کی تنوع پسندی تسکین پاسکے۔

چنانچہ مانگ اور بہم رسانی کا اصول اخبار نویسی کی دنیا میں بھی اُسی طرح کام کرتا ہے۔ جس طرح دوسری چیزوں کی منڈیوں میں کرتا رہتا ہے، اور اخبار کی کامیابی یا زندگی کا مدار اس پر ہے کہ اخبار نویس ہر گھڑی اور ہر لحظہ سنسنی پیدا کرنے والی خبروں کی ٹوہ میں لگے رہیں اور اس لئے اخباری ادارے کو ایسے اخبار نویسوں کی ضرورت رہتی ہے جو میل کا بیل بنا سکتے ہوں اور جن کو مسالہ دار چٹپٹی ڈال دینے والی تحریر لکھنا آتی ہو۔ اب چونکہ یہ خصوصیّت ہر اخبار نویس کی انشا میں نہیں ہوسکتی، اس لئے جس کو یہ کمال حاصل ہوتا ہے اُس کی بڑی قدر ہوتی ہے۔

اس تمہید کی غرض یہ تھی کہ آپ جاؔلی کو ایک مکمّل اخبار نویس سمجھ سکیں، ہر چند وہ اپنے نام کے ساتھ "جرنلسٹ" ہی لکھنا پسند کرتا تھا۔ ایسی اخبار نویسی کو اگر آپ اخلاقیات کی ترازو میں تولیں گے تو آپ اس پیشے کو جس میں لوگوں کی کمزوریوں کو جائز و ناجائز طریق سے معلوم کرکے اُن کا فضیحتہ کیا جاتا ہے، ایک ذلیل پیشہ سمجھیں گے۔ مگر ہر زمانے کی تہذیب کا اخلاقی معیار مخصوص ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ایک کلیّہ یہ بھی مسلّمہ ہے کہ جس بُرائی کو دُور کرنا ہو اس کو عریاں کرکے پیش کردو، اس کی کراہت کو پوری طرح نمایاں کردو، لیکن اگر آپ قدیم اخلاق ہی پر اڑے ہوئے ہیں تو ایسے تمام پیشوں کو مردود قرار دینا پڑے گا۔ جو انسانی کمزوریوں سے نفع اُٹھاتے ہیں۔ چنانچہ غور کیجیے کہ اس قسم کی اخبار نویسی، وکالت اور بیسوا کے پیشے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

غرض جاؔلی کو اپنی اس قابلیت پر کہ وہ لوگوں کی معمولی غلطیوں کا پتہ چلا کر اُن کو ایک "فضیحتہ" کی صورت دے سکتا ہے،

گھمنڈ بھی تھا اور بلا شبہ اخباری زبان میں جس چیز کو خبر بنانا کہا جاتا ہے۔ جمالی اس میں جبلّی طور پر باکمال تھا، اُسے اس بات کا کبھی احساس نہیں ہوا کہ اس کا پیشہ یا کمالِ فن کتنی اور کیسی زندگیوں کو تباہ کر دیتا ہے یا ہمیشہ کے لئے غمناک بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے "فرضِ منصبی" کو ایک ضابطہ سمجھ کر انجام دیتا تھا ——— بالکل مشین کی طرح۔ انسانی عنصر کو کبھی دخل نہ دیتا تھا۔ مگر جمالی کے کردار کے اس پہلو کی داد دینا پڑے گی کہ جب وہ خود اُسی گڑھے میں گرا جو دوسروں کے لئے کھودا کرتا تھا، یعنی اُسے وہی سزا ملی جو وہ اپنے آپ سے زیادہ بے گناہ انسانوں کو دیا کرتا تھا۔ تو اُس نے نہ تو کسی سے رحم و ہمدردی کی توقع کی اور نہ اُسے شکایت ہوئی۔ مگر "جو بوؤ سو کاٹو" کا تجربہ کرنے کے بعد اُسے اپنے پیشہ کی اصلیت و حقیقت ضرور معلوم ہو گئی۔

وہ ایک نامور صحافی تھا اور تھوڑی ہی مدّت میں ترقی کر کے اخبار نویسی کی دنیا میں ایک اونچی جگہ حاصل کر لی تھی، کامیابی کا جگمگاتا تاج اس کے سر پر تھا جو بالآخر اُس کے لئے کانٹوں کا تاج ثابت ہوا۔

جمالی، لاہور کا رہنے والا تھا۔ بی۔ اے کرنے سے پہلے ہی اس کی ادبیّت اور شعر گوئی مسلّم ہو چکی تھی وہ ایک دلکش طرزِ انشا کا مالک تھا۔ امتحان دیتے ہی تلاشِ معاش میں اُسے دہلی کے روزنامے "شہری" کی نامہ نگاری مل گئی۔ یہ وہ اخبار تھا جو لوگوں کی پگڑیاں اُچھالنے کے لئے مشہور تھا۔ جمالی کو کساد بازاری اور بے روزگاری کا احساس تھا اور ساتھ ہی اُسے قلم کا پیشہ مرغوب بھی ہو سکتا تھا، اس لئے اُس نے اس بات کی بالکل پروا نہ کی کہ "شہری" کو دنیا ایک نہایت ذلیل اخبار سمجھتی ہے۔ ہفتے میں ایک مراسلہ لکھ بھیجنا اور گھر بیٹھے بیس روپے مل جانا اس کی نظر میں بسا غنیمت تھا۔ جبکہ اس تنخواہ پر بہت سے گریجویٹ بارہ گھنٹے کام کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔

نامہ نگار بن جانے کے بعد جمالی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ اخبار کے مستقل عملے میں شامل ہو جائے۔ اور مراسلے لکھتے وقت یہ چیز خاص طور پر اُس کے سامنے رہتی تھی۔ اس لئے جمالی کو اپنی ترقی کے لئے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور رپورٹر کی حیثیت سے چالیس روپے ماہوار پر دہلی بُلا لیا گیا "امپیریل سٹی" کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کی رپورٹری کوئی معمولی اور آسانی سے مِل جانے والی اسامی نہ تھی، اس کے بعد اُسے اپنی ذات پر زیادہ بھروسا ہو گیا اور ترقی کا یقین بھی، اور اُس کا خیال غلط بھی نہ تھا وہ بہت جلد "چیف رپورٹر" بنا دیا گیا اور اس کی کامیابی مستقل اور مستحکم ہو گئی۔

مگر مقدر کی ستم ظریفیاں عجیب ہوتی ہیں، جمالی غریب کو ہوش نہ تھا کہ جو جتنا اونچے سے گرتا ہے چوٹ اتنی ہی زیادہ لگتی ہے۔ انسان کی نظر مستقبل کو زیادہ دُور تک نہیں دیکھ سکتی اور یہ کچھ اس کے لئے اچھا ہی ہے۔ زندگی کا کھیل کھلاڑی کے سوا اور سب کے لئے بہت دلچسپ ہے۔ لیکن اگر گزرنے والی پہلے سے نظر آ جائے تو پوری زندگی ہی تلخ اور بدمزہ ہو کر رہ جائے!

جمالی کے باپ سیدھے سچے آدمی تھے اور عدالت کے منصرم رہے تھے۔ اب پنشن پا رہے تھے۔ ان کے مکان سے ملا ہوا ظفریاب خاں کا مکان تھا۔ ظفریاب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور جمالی کے والد اُن کا ساتھ رہ چکا تھا۔ تعلقات بڑھ گئے تھے، جمالی کے والد کے ذریعہ سے اُنھوں نے یہ مکان خریدا تھا۔ کیونکہ پنشن لینے میں دو تین سال کی دیر بھی اور ریٹائر ہونے کے بعد وہ لاہور میں سکونت اختیار کرنا چاہتے تھے۔

ظفریاب خاں نے اپنے اصل وطن سے کبھی کوئی تانا نہ رکھا نہ کبھی وطن گئے۔ اور نہ وہاں سے کوئی عزیز و اقربا اُن کے پاس آتے تھے، جمالی کے والد کو اُسی زمانے میں اس پر حیرت ضرور ہوئی تھی لیکن کھوج کبھی نہ نکالنا چاہا۔ اُن کی لڑکی زہرہ اور جمالی جب کہ دونوں کے والد ایک جگہ تعینات تھے کئی سال ایک ساتھ کھیلے کودے اور ساتھ پڑھے تھے۔ اب جب ظفریاب نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور وہ پہلی چھٹی گزارنے لاہور آئے تو اپنی جگہ طے کر چکے تھے کہ زہرہ کے لئے بَر کی تلاش نہ کرنی پڑے گی اور یہی وجہ تھی کہ زہرہ اور جمالی کے ملنے ملانے پر کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، بلکہ ظفریاب سماجی رسم و رواج میں جس حد تک آزاد خیال ہو سکتے تھے، اِن دونوں کو اس سے کچھ زیادہ آزادی حاصل تھی اُن کا منصوبہ یہ تھا کہ جمالی کو کوشش کر کے کوئی نوکری دلا دیں تو شادی کی چھیڑ چھاڑ کریں۔ تاکہ احسان کے بدلے میں انکار کا موقع کم رہ جائے چنانچہ اُن کی کوشش سے جمالی ایک مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کے لئے

الشا

نامزد بھی ہوگیا۔ مگر امتحان کے دنوں میں جمالی اتنا بیمار پڑ گیا کہ شریک نہ ہو سکا اور جمالی نے کسی سے ذکر کئے بغیر دہلی کے اخبار کی نوکری کر لی۔ ظفر آب نے بہت کچھ چاہا کہ جمالی اپنا ارادہ بدل دے مگر کامیاب نہ ہوئے۔

زہرہ کی خشربتی آنکھیں، لاکھی بال، اور بے دھڑک پن ایسی خصوصیتیں تھیں کہ کوئی بھلا نہ سکتا تھا چہ جائیکہ جمالی کی شاعرانہ طبیعت جسے زہرہ سے محبت بھی تھی۔ لیکن ہر وقت ملنے جلنے کی حالت میں اِن دونوں کو اپنے دلوں کا جائزہ لینے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ اب جو جمالی کا دہلی جانا قرار پایا تو زہرہ کو پورا احساس ہُوا اور جمالی کو ادھورا، اِس لئے کہ احساسِ محبت پر اُس خوشی کا سایہ پڑ رہا تھا جو ایک گریجویٹ کو کالج سے نکلتے ہی حسبِ پسند نوکری مِل جانے سے ہو سکتی ہے۔

جس روز روانگی تھی، زہرہ اس کی ماں سے ملنے آئی، وہ کوٹھے پر جمالی کے سفر کا سامان درست کر رہی تھی، بیٹھک میں جمالی اکیلا تھا دونوں تنہائی میں آمنے سامنے ہوئے تو دلوں کے پردے ہٹ گئے، ایک نے دوسرے کو اپنے دل کے شوالے کی مورتی پیش کی، جمالی کے ہاتھ میں اپنا مجسمہ تھا اور زہرہ کے ہاتھ میں اپنی مورتی، اِن مورتیوں پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کئے گئے، محبت کی مُہریں لگائی گئیں اور پھر اپنے اپنے استھان پر بیٹھا دی گئیں۔

ہونٹوں پر ایک غیر ارادی مسکراہٹ اور بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے زہرہ بولی:۔

"جمالی! بھلا تو نہ دوگے؟"

"کوئی اپنی زندگی کو بھلا سکتا ہے؟ تمہارا خیال ہی مجھے زندگی میں کامیاب بنائے گا۔"

جمالی کو دہلی پہونچے تین ہی روز ہوئے تھے کہ شہر کا رپورٹر بیمار پڑ گیا اور ایک قتل کا کیس جمالی کو سپرد ہُوا۔ قتل کی نوعیت نہایت معمولی اور ناشائستہ تھی۔ اور واقعہ کوئی خاص دلچسپی کی چیز نہ تھا مگر اُس کی خوش قسمتی کہ اُسے دوسرے رپورٹروں اور پولس کے مقابلے میں ملزم سے ایک خاص نکتہ ہاتھ لگ گیا، اور اُس قتل کی تہ میں ایک منظم سازش برآمد ہوگئی۔ جمالی نے اس کو ایک "دلچسپ قصّہ" بنا کر اخبار میں دیا۔ اور سارے شہر کو واقعے سے دلچسپی ہوگئی۔ پولس کی غفلت اور سہل انکاری ثابت ہوئی اور وہ بھی جمالی کی سُجھائی ہوئی راہ پر چلنے کے لئے مجبور ہوئی۔ پولس کو جمالی کی مدد بھی حاصل کرنا پڑی۔ مقدمہ میں شہر کے بعض معزز آدمی ماخوذ ہوئے۔ کیونکہ اصل راز یہ کھلا کہ ایک بڑے آدمی کے گھر لمبا جوا ہوا کرتا تھا۔ ایک دوسرے بڑے آدمی نے بعض بدمعاشوں کی مدد سے اس جوئے کو اپنے یہاں منتقل کرالیا، اور پھر چند بدمعاش اِدھر ہوگئے چند اُدھر اور ایک قتل ہوگیا۔

اِس کیس کے بعد جمالی کی پولس سے دوستی ہوگئی، جہاں کوئی اخبار نویس نہ پہونچ سکے، جمالی کو موقع مِل جاتا تھا، اور سب سے پہلے معاملے کی تفصیلات "شہری" میں نکل جاتی تھیں۔ اُس نے جب اپنا پہلا "قصّہ" لکھا تو ایسی افسانوی شکل میں پیش کیا کہ ایڈیٹر کی نظر میں کُھب گیا، ایڈیٹر نے جمالی کو طلب کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے پہونچا، ایڈیٹر نے اُس سے کہا:۔

"مسٹر جمالی! میں خوش ہوں کہ آپ نے اپنا پہلا کام کمال احساس ذمّہ داری سے انجام دیا۔ خوب ہی رنگا ہے!"

دو مہینے کے بعد جمالی کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ ہوگیا، چند دن بعد ایک "بلیک میل" کا مقدمہ اُس کے سپرد ہُوا جس میں ایک ایڈیٹر نے کسی رئیس کا کوئی خط اُچک لیا تھا اور اس دباؤ میں رقم اینٹھنا چاہتا تھا۔ اِس مقدمے کی کارروائی "شہری" میں چھپتی رہی اور بہت مقبول ہوئی۔ اب جمالی کو خیال ہوا کہ اُس نے اپنی قابلیت اور اخبار نویسی کے جوہر کے متعلق جو اندازہ لگایا تھا وہ کم تھا۔ اِس مقدمے کی کارروائی نے اس کو اپنی اِنشا اور عبارت کو تسلیم کرانے کا موقع دیا اور اس کی صحافی حیثیت مستحکم ہوگئی۔ غرض ایک سال کی مدّت میں وہ اوّل نمبر کا اخبار نویس سمجھا جانے لگا تھا اور تنخواہ بھی پچھتّر روپیہ ہوگئی تھی، "شہری" کی خصوصیّت اور مقبولیّت میں اب پچاس فیصدی کا ذمّہ دار جمالی تھا۔

آپ واقف تو ہوں گے کہ کامیابی حاسدوں کو ساتھ لاتی ہے، جمالی "شہری" سے متعلق ہو کر جتنا مشہور ہوا اُسی قدر نفرت اور خوف کی چیز بھی بن گیا تھا۔ اُسے معلوم ہُوا کہ جن لوگوں کے ساتھ اُسے ہر وقت

الشعا

کام کرنا پڑتا ہے وہ سب اور خود اخبار کا ایڈیٹر بھی اُس سے جلنے لگے ہیں۔ مالکِ اخبار کا اُسے قدر کی نگاہوں سے دیکھنا، اُسے داد دینا اور خاص خاص معاملات پر اُس کی رائے لینا، ایسی باتیں تھیں کہ ایڈیٹر کو اپنی کُرسی کا خطرہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ جمالی اگر تن توش کا بھاری نہ ہوتا تو شاید دفتر میں دوچار دفعہ ہشت مشت ہوچکی ہوتی۔

جمالی نے اس صورت حال کو ہندوستانی طبیعت و مزاج کے عین مطابق سمجھا، مگر اس سے خوف زدہ نہ ہوا۔

ایک دو مرتبہ مالک کے پاس شکایت بھی گئی مگر کوئی خاص باز پُرس شاید اس بنا پر نہ ہوئی کہ اخبار کی بِکری میں جمالی کے مضامین اور نوٹ سب سے زیادہ کشش کی وجہ مان لئے گئے تھے۔ اس سے جمالی کو غرور بھی ہوگیا تھا اور اُس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی ذات "شہری" کے لئے ناگزیر ہے۔ ممکن ہے یہ "سیر کی ہانڈی میں سوا سیر" قصہ ہو۔ مگر اُسے گھامڑ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی کامیابی سوجھ بوجھ اور جان مارنے کا نتیجہ ہے اور اُس کی کامیابی اُس کے لئے زندگی کا مفہوم رکھتی ہے۔ جب تک وہ اپنا کام اسی محنت و قابلیت سے انجام دے سکتا ہے۔ مالک اخبار گدھا نہیں جو اُسے الگ کرکے اخبار کے فیل ہونے کی جوکھم اُٹھائے۔ پیسے لگانے والا مالک نہ ایڈیٹر کا دوست ہے نہ رپورٹر کا وہ اُس کو چاہے گا جو اخبار کو چلا سکے غرض اُسے کامیابی کا نشہ چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جیسے جیسے اُس کی حیثیت بڑھتی رہی زہرہ کا نقش دھندلا پڑتا گیا۔

مگر یہ بھی ایک قدرتی بات ہے کہ انسان کامران و بامراد ہوکر بہت سوں کو بھول جاتا ہے تو بعض بھولے ہوؤں کی یاد بھی تازہ ہوجاتی ہے اس کی نفسیاتی توجیہ یہی ہوسکتی ہے کہ سربلند ہوکر انسان میں یہ آرزو پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی اس سرفرازی کا سکہ کسی دوسرے پر بٹھائے چنانچہ جب اس کی حیثیت پوری طرح یا اس کے اطمینان کے مطابق قائم ہوگئی اور وہ نامور اور مشہور ہوا تو زہرہ یاد آنا ہی تھی۔ لیکن زہرہ نے اس کے اس پلٹا کھانے کا کوئی خیر مقدم نہ کیا، اور شادی کے اشارے کا اس نے دوٹکڑے جواب دے دیا۔ اس جواب کی تو توقع بھی نہ ہوسکتی تھی۔ یہ بات وہ زہرہ کو اِس طرح یاد نہ کرسکا جو ایک محبت کرنے والے کو کرنا چاہئے۔ اسے محسوس بھی نہ ہوئی تھی۔ گاہے ماہے خط لکھ دینا ہی اُس کی نظر میں کافی اظہارِ محبت تھا۔ وہ کبھی احساس نہ کرسکا تھا کہ ایک محبت کرنے والی لڑکی اپنے ہونے والے شوہر سے کیا توقع کرسکتی ہے۔

لیکن جس شخص کو اپنی کامیابی اور ناموری کا نشہ ہوسکتا ہے اُس کی اگر کوئی محبوبہ بھی ہے تو ہمیشہ دوسرا نمبر پائے گی۔ جمالی ایک کامیاب زندگی کو زہرہ سے زیادہ چاہتا تھا۔ مگر جب زہرہ نے شادی سے انکار کردیا تب اُسے معلوم ہُوا۔ جس شئے کو وہ دنیا میں سب سے زیادہ اہم باور کرتا ہے اُس نادان لڑکی کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس چیز نے اُس کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ مگر غور کرنے کے بعد بھی اُسے اپنی کامیابی ضروری اور اہم دکھائی دی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا تحت الشعور شکست کا احساس کررہا تھا۔ اور ایسا آدمی جب کبھی کسی بات میں شکست کھاتا ہے تو پھر کسی دوسری مشغولیت میں زیادہ منہمک ہوجاتا ہے، چنانچہ وہ اپنے کام میں پہلے سے زیادہ انہماک رکھنے لگا اور اس کا یہ بڑھا ہُوا انہماک درحقیقت انتقام کی ایک صورت تھی، اس کے سامنے یہ حقیقت ہر وقت رہنے لگی کہ وہ اتنا بڑا جرنلسٹ ہے کہ اُسے بڑے بڑے گھروں سے دعوتیں آتی ہیں!

زہرہ کے والد جمالی کی طرف سے مایوس ہوئے تو کہیں اور بات ٹھیرانا چاہی۔ ایک جگہ قرار داد ہوکر اِس وجہ سے ٹوٹ گئی کہ لڑکی کی ماں خاندانی نہ تھی، شاید یہی سبب تھا کہ ظفریاب اپنے وطن و خاندان سے اس قدر بے تعلق ہوگئے تھے اور یہی وجہ ہوسکتی تھی کہ اُنھوں نے جمالی کو منتخب کرلیا تھا کیونکہ اُن کو یقین تھا کہ جمالی کے والد گڑے مردے اُکھیڑنے نہ پہنچیں

خان بہادر ظفر حیدر زینے سے گرے اور مرگئے۔ پولس نے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ میاں بیوی میں ہمیشہ ناچاقی رہتی تھی۔ ماما کے بیان سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ تکرار ہوئی اور بیوی نے دھکا دیا تو وہ گرگئے۔ بیوی نے اقرار کیا کہ وہ اوپر کمرے میں جانا چاہتی تھی، میاں نے ہاتھ پکڑا اُس نے چھوڑایا تو وہ زینے پر سے گرگئے۔

جمالی کو واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اُس نے پولس کے بیانات پر ایک "قصہ" مرتب کیا۔ لیکن دریافت حال میں جب اُس نے بیوی کا نام زہرہ خاتون سُنا تو اپنی زہرہ کو بھی یاد کیا۔ مگر انہماک میں اُس نے اس خیال

ہی کو برطرف کر دیا۔ اُس نے اپنے قصّے میں جو پولس کے بیانات بے ترتیب دیا گیا تھا۔ میاں بیوی کی عمروں کے فرق پر زور دے کر اس معاملے میں ایک تیسرے زاوئے کے امکان پر بڑا زور دیا اِس وقت بھی اُسے اپنی زہرہ کا خیال آیا، لیکن بلا دلیل اُس نے اپنے خیال کو لغو سمجھ لیا۔ جمالی نے جب مضمون اخبار کے دفتر کو بھیج دیا تو مزید تحقیقات کے لئے زہرہ خاتون سے خود گفتگو کرنا چاہی۔ سامنا ہوا تو وہ اپنی کی زہرہ نکلی۔ نظریں ملتے ہی دبے ہوئے جذبات اُبھر آئے زہرہ زار و قطار رونے لگی اور جمالی بدحواس اخبار کے دفتر پہونچا کہ اپنے مضمون کو روک دے۔ لیکن اخبار چھپ کر تقسیم ہو رہا تھا۔

جمالی پھر واپس پہونچا۔ پولس والوں سے اس کے تعلقات اچھے تھے۔ معاملہ یہیں ختم ہو گیا کہ موت اتفاقیہ ہوئی۔ خود اُس نے بھی دوسرے دن ایک مختصر نوٹ شائع کیا کہ شادی بے جوڑ ہوئی تھی۔ موافقت ہو نہ سکتی تھی، میاں بیوی کے ملتفت نہ ہونے کے سبب سختی کا برتاؤ کرتے تھے۔ بیوی تکرار سے بیزار ہو کر اوپر کے کمرے میں چلی جانا چاہتی تھی میاں نے غصّے میں اُس کو پکڑنا چاہا، اُس نے ہاتھ چھڑایا، میاں سیڑھیوں پر سے گر گئے۔

اُس نے اپنے دانست میں معاملے کو ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن ایک دوسرے اخبار کے رپورٹر کو سُن گُن مِل گئی۔ اُس نے ایک نہایت چٹ پٹا "قصّہ"، تیار کیا۔ ظفر یاب خاں کو بھی بگھانا اور زہرہ کی کالج کی زندگی کی داستان بھی رنگی اور یہ بھی بتایا کہ زہرہ مسٹر جمالی کی منگیتر رہ چکی تھی۔

ظفر یاب لاہور میں سخت علیل تھے، جمالی کو اپنا فضیحتہ اتنا بڑا فضیحتہ معلوم ہوا کہ وہ خود کسی کا ایسا فضیحتہ نہ کر سکا تھا۔ لیکن اُسے محسوس ہو گیا کہ زہرہ کا ساتھ اور رفاقت اس کی اپنی کامیابیوں سے زیادہ سکون بخش اور مسرّت آفریں ہے۔

آزادی

ل احمد اکبر آبادی

ملّت کو پیامِ ارتقا آزادی   مایوس دلوں کا آسرا آزادی
ساون کے برستے ہوئے بادل کی قسم   ساون کی ہے گھنگھور گھٹا آزادی

ڈس لے جو غلامی کو وہ ناگ آزادی   گرمائے جو باطن کو وہ آگ آزادی
اک مطربِ نوخیز یہ کل کہتا تھا   آزاد جوانی کا ہے راگ آزادی

خنجر سے کبھی کٹی نہیں آزادی   میداں سے کبھی ہٹی نہیں آزادی
ہر چند تشدد نے دبانا چاہا   بڑھتی ہی رہی گھٹی نہیں آزادی

نہال سیوہاروی

تصویریں

گلی کے پتھریلے فرش پر کھڑکھڑاتی ہوئی چھکڑا گاڑی، لنگڑاتا ہوا مریل گھوڑا، گاڑی میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے دودھ کے برتن، کھدّر کی پھٹی ہوئی چادر میں بے ڈھنگا گٹھڑ سا بنا ہوا دودھ والا، دس بارہ برس کا ایک سوکھا سہا لڑکا، ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ، ایک بھیانک چیخ، شور مچاتے بھاگتے ہوئے لوگ، گالیاں، گھونسے ٹھوکریں، یہ سب ایک ساتھ آصف کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے مگر یہ تصویر جو ایک لمحے میں کھنچ گئی تھی سمجھ میں اس قدر جلد نہ آسکی گھر کے دروازے میں کھڑے ہوئے آصف کو یہ ایسی معلوم ہو رہی تھی گویا اوپر سے ہوا میں تیرتی ہوئی آ رہی ہو، رفتہ رفتہ یہ قریب آگئی۔ اب وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا، اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

اس وقت بھی جبکہ آصف اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اس تصویر نے اس کے ماتھے پر بل ڈال دیئے قصور سراسر دودھ والے کا تھا۔ لڑکا گاڑی سے بچنے کے لئے راستے سے ہٹ کر دیوار سے جا بھڑا تھا مگر گاڑی والے نے اُسے یہاں بھی نہ چھوڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکے کو کچلنے کا تہیّہ کئے ہوئے ہے، شاید گاڑی میں لوہے کے ٹائر اسی لئے چڑھائے گئے تھے کہ اس لڑکے کی ٹانگ ٹوٹنے میں کوئی کسر نہ رہے۔

آصف نے کرسی کے بازو پر بے چینی سے انگلیاں چلاتے ہوئے سگریٹ کا کش لیا ہاں تو اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ ایک دوسری تصویر تھی، پہلی کی طرح اس میں بھی حرکت اور آواز تھی، عناصر بھی کم و بیش وہی تھے، فرق یہ تھا کہ میں پہلی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری کو سمجھنے کا ہوش ہی نہ تھا۔ کس بلا کا غصہ تھا۔ تصویر کی ہر شے ایک بگولے کی طرح چکر لگا رہی تھی، دودھ والا اس بگولے میں گم ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر گم نہ ہو سکتا تھا۔ میرے دماغ میں صرف ایک خیال تھا۔ دودھ والا قصوروار ہے اور صرف ایک ارادہ۔ اس کو سزا ملنی چاہئے۔ میں مجمع کے قریب پہونچ جاتا ہوں مجھے دیکھ کر لوگ پرے ہٹ جاتے ہیں گویا وہ سمجھتے ہیں کہ مجرم کو سزا دینے کے لئے بالکل موزوں انسان آ پہونچا ہے۔ دودھ والے نے سر پر چادر لپیٹ رکھی ہے۔ ایک شخص چادر گھسیٹتا ہے۔ کون؟ شاید میں خود۔ دودھ والا آنکھیں کھولتا ہے، دہکتے انگاروں جیسی آنکھیں پھر فوراً بند کر لیتا ہے "میاں صاحب! میری آنکھیں دُکھ رہی ہیں، دکھائی نہیں دیتا،" کتنی غلط صفائی تھی، آنکھیں دُکھ رہی تھیں تو وہ سرے سے گاڑی لے کر آیا ہی کیوں تھا؟ قریب ہی ایک شخص سرکاری وکیل کی طرح جرم کی شدید نوعیت بیان کر رہا ہے، میں دودھ والے کو مار رہا ہوں بے تحاشہ۔

آصف نے زور سے ہاتھ جھٹکا۔ اُس کی اُنگلی میں جھٹکا لگ گیا تھا جلتا ہوا سگریٹ قالین کے حاشیے پر جا پڑا۔ کرسی سے اُٹھ کر آصف نے اُسے بجھایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تسکین کے لئے جلی ہوئی اُنگلی ہونٹوں میں دبالی تھی۔

یہ دوسری تصویر بھی کیسی پیچیدہ تھی، بڑی دیر تک غور کرنے کے بعد آصف اس کے صرف چند ہی نقوش دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس بگولے میں اور بھی تو بہت کچھ ہوگا۔ لڑکے کے بہت سخت چوٹ آئی تھی وہ کافی دیر تک خاموش نہ پڑا رہا ہوگا خیر اس میں ہیرو تو صاف نظر آ رہا تھا۔ خود آصف اُسے اس تصویر پر ناز تھا۔ میں نے وہی کیا جو ایسے موقعوں پر ہر منصف مزاج

انسان کو کرنا چاہئے۔ میں تو پھر یہی کہوں گا کہ قصور دودھ والے کا تھا اور کسی کا کیونکر ہو سکتا ہے۔ اُس کی آنکھیں دُکھ رہی تھیں تو وہ کیوں گاڑی چلا رہا تھا۔ اُسے چاہئے تھا کہ ایک اندھیرے کمرے میں آنکھیں بند کئے لیٹا رہتا، کسی ڈاکٹر سے علاج کراتا —— وہ ایک ڈھچر گاڑی اور مریل گھوڑے کا مالک دودھ والا، کیسا مضحکہ خیز خیال ہے۔

آصف نے قہقہہ لگایا۔ کیسا خشک قہقہہ تھا! کیا مجھے ہنسنا چاہئے تھا؟ اُس دودھ والے کی حالت پر جو ایک دن بھی دودھ نہ بیچتا تو بھوکا مرجاتا؟ کیا واقعی دودھ والا قصوروار تھا؟

آصف پھر کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اُسے اِس تصویر سے نفرت ہوگئی، اُس تصویر سے جس پر وہ ابھی ناز کر رہا تھا، خود کو اِس کا ہیرو سمجھ رہا تھا۔

تیسری تصویر سامنے آئی۔ وہ لڑکا نالی پر پڑا ہے، اُس کے جسم پر ایک کُرتے کے سوا کچھ نہیں، اس کی ٹانگیں کیچڑ میں سَنی ہوئی ہیں، وہ بہت رو چکا ہے، اب ہچکیاں لے رہا ہے ہچکیوں کے درمیان بار بار اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں "بہت غریب ہوں، بہت غریب ہوں"، لوگ اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں —— صرف کوشش —— اُس کی حالت پر رائے زنی کر رہے ہیں۔ سامنے گیراج میں سے میرا ملازم روئی نکال کر لایا ہے، لڑکے کا جسم پکّا پھوڑا بنا ہوا ہے۔ ٹانگ کو ذرا سی جنبش ہوتی ہے تو اُس کی جان سی نکل جاتی ہے۔ موٹر ہسپتال کی طرف جا رہی ہے۔ لڑکا اب بھی وہی الفاظ کہے جا رہا ہے "بہت غریب ہوں —— بہت غریب ہوں"

آصف نے ایک اور سگریٹ جلایا، یہ تصویر واقعی قابلِ فخر تھی میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اِس بات کی بالکل پروا نہ کی کہ لڑکے کی ٹانگیں کیچڑ میں سَنی ہوئی ہیں، اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر اُسے موٹر میں ڈلوایا۔ اپنے کپڑے خراب کئے۔ موٹر کے گدّے خراب کئے، وقت ضائع کیا، مگر کیوں؟ اس لئے کہ بیکسوں پر ترس کھانا، گرے ہوؤں کو اُٹھانا انسانیت کا شیوہ ہے۔ ہاں اُس وقت ذہن میں ایک مبہم سی تصویر اور بھی تو تھی اس میں کئی آدمی نیچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ اِن کی آواز میں حیرت بھی تھی۔ عقیدت بھی۔ دعا کر رہے تھے، "میاں صاحب کتنے اچھے آدمی ہیں، اتنے امیر مگر غرور نام کو نہیں لڑکے کو خود ہسپتال پہنچایا۔"

کنپٹیوں پر ہاتھ رکھ کر آصف کمرے میں ٹہلنے لگا۔ چھوڑو اِس خیال کو اِس سے نیکی کی عظمت کم ہوتی ہے۔ یہ تصویر ذہن میں موجود ضرور تھی، شاید یہ نہ ہوتی تو تیسری تصویر بنتی ہی نہیں، مگر ہمارا کونسا فعل خود غرضی سے خالی ہے؟

ہاں، تو وہ لڑکا بھی کیا احمق تھا، کھاتے پیتے گھرانوں کے اتنے بڑے بچے تو خاصے ہوشیار ہوتے ہیں، بھلا بار بار "بہت غریب ہوں، بہت غریب ہوں" رٹنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ایسی حالت میں! حد تو یہ ہے کہ لوگ پوچھ رہے ہیں چوٹ کہاں لگی ہے اور وہ جواب دے رہا ہے "بہت غریب ہوں"، کمال ہے۔ چوٹ کی بجائے غربت یاد آ رہی ہے۔ گویا وہ اِس سے بھی بڑی چوٹ ہے۔ گویا؟

چھوڑو بھی، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں گو معلوم تو ایسا ہی ہو رہا ہے عجیب بات ہے، خیر یہ تو انسان کی طبیعت پر منحصر ہے۔ بہتیرے لوگ ظلم کرتے ہیں اور ہنستے ہیں اور ایک تم ہو آصف کہ کرم کر کے بھی افسوس کر رہے ہو۔ اِس طرح غور کرو تو زندگی تلخ ہو جائے۔ مگر آخر مجھے ہوا کیا ہے؟ ایسے موقعوں پر ایک طویل قہقہہ۔ گردوپیش سے بیگانہ ہو کر، طبیعت پر سے بوجھ اُتار دیتا ہے۔

آصف کا قہقہہ کمرے میں گونجنے لگا۔ کیسا بے کیف؟ یہ قہقہہ تو نہ تھا۔ اگر یہ کسی شے سے مشابہ ہو سکتا ہے تو صرف چرخے کی آواز سے —— واہ! اب یُوں تو ہر آواز کو چاہے جس کی بُری سے بُری آواز سے مشابہ کر دو۔ یُوں تو آج ہسپتال سے آتے وقت سڑک پر پڑے ہوئے سوکھے پتّوں کی آواز ایسی معلوم ہوتی تھی گویا موٹر کے نیچے لاکھوں ہڈّیاں کچلی جا رہی ہوں۔

لاحول ولا۔ حد ہوگئی۔ تسکین کی باتوں میں بھی تکلیف کا پہلو نکل رہا ہے، چھوڑ دو، چھوڑو، اِن خیالات کو دماغ سے نکال دو، اِن تصویروں کو پھاڑ کر پھینک دو، مجھے اِن سے نفرت ہے، ہر شے سے نفرت ہے۔

مگر ایسا نہیں ہو سکتا، اِس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ انسان کے خیالات اُس کے قابو میں نہ رہیں خود اپنا ہی دماغ بھی بن کر سارے جسم کو پھونک ڈالے۔ میری حالت اُس پرانے مریض جیسی ہے جو گرد و پیش کی ایک ایک شے پر نظر جمائے رہتا ہے، سب سے متنفر ہو جاتا ہے، آخر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ حسین و محبوب چیزوں کے تصور سے دل کو تسکین دینی چاہتا ہے، مگر اُن سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔

آصف یکایک رُک گیا اُس کے سامنے ایک قدِ آدم آئینہ تھا یہ چکتی ہوئی مہاگنی کے چوکھٹے میں ایک اور تصویر تھی، اس میں ایک شخص ڈریسنگ گون پہنے ایک وسیع کمرے میں کھڑا تھا۔ اُس سے ذرا فاصلے پر چیتے کی کھال بچھی تھی۔ اعلیٰ درجے کی کرسیاں رکھی تھیں اور خوبصورت جلد والی کتابیں پڑی تھیں۔

آصف نے غصے سے دانت بھینچ لئے۔ پاس ہی ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ سر سے بلند کر کے اُسے آئینے پر کھینچ مارا۔

احترام اللہ

صنفِ نازک

جو عورتیں اپنی ذاتی قابلیت کا عملی ثبوت دینا چاہتی ہیں اُنھیں سوسائٹی نے کیوں مجبور کر رکھا ہے کہ وہ اپنے محدود دائرے سے باہر نکل کر کچھ نہ کرنے پائیں۔ انسان کی راحت بہت کچھ اس میں مضمر ہے کہ اُسے اس کے مذاق کے مطابق مشغلہ اختیار کرنے کا موقع حاصل ہو یہی سبب ہے کہ دنیا کے بہت سے لوگ جو اپنی مرضی کا مشغلہ اختیار کرنے نہیں پاتے وہ ہمیشہ پریشان اور تباہ حال رہتے ہیں۔ اگر سوسائٹی کو یہ مقدور نہیں کہ ہر ایک کے لئے اُس کی طبیعت کے مطابق مشغلہ مہیا کرے تو سوسائٹی کو یہ بھی نہ چاہیئے کہ کسی کو اُس کی مرضی کے خلاف مشغلہ اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ بہت سے لوگ خواہ والدین کی ناعاقبت اندیشانہ ضد یا دیگر حالات سے مجبور ہو کر اپنی مرضی کے خلاف کام اختیار کر لیتے ہیں مگر عورتوں کے لئے تو گویا دستور ہی یہی بنا دیا گیا ہے کہ جو کچھ بھی ہو لیکن انھیں کرنا وہی پڑیگا جو وہ اب تک کرتی آئی ہیں۔ خواہ اس کو رواج کہیئے یا قانون بہر نوع اُن پر اس کی پابندی فرض ہے۔ غیر ترقی یافتہ سوسائٹی میں رنگ، نسل، مذہب (اور مفتوح ممالک میں قومیت) وغیرہ کے امتیازات کا جو اثر لیا جاتا ہے وہی اثر عورت کے خلاف ترقی یافتہ سوسائٹی میں بھی (جنس کے امتیاز کا) لیا جاتا ہے اور عورتوں کے لئے وہی مشاغل چھوڑ دیئے جاتے ہیں جن کے یا تو مرد اہل نہیں ہیں یا جنھیں اختیار کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں یہ وہ صورت ہے جس سے ہزاروں قابلِ قدر زندگیاں تباہ ہوتی رہتی ہیں اور اُس سے جو مصائب پیدا ہوتے ہیں اُن کا اندازہ کرنا خاص ہی خاص لوگوں کا کام ہے۔ اگر عورتوں کی تربیت کی بابت دنیا کا نقطۂ نظر نہ بدلا تو دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس قسم کے مصائب اور بھی بڑھیں گے۔ کیونکہ زمانے کا رنگ یہ ہے کہ عورتوں کی نظر وسیع ہوتی جاتی ہے۔ لیکن دنیا اُن کو اتنی تیزی سے آگے بڑھنے میں نامناسب حد تک مزاحمت کے درپے ہے۔

جان اسٹوارٹ مِل

نیا شوالہ

فرید جعفری کا تازہ شاہکار

عارضِ انور پر جگہ جگہ چپکے ہوئے دھاگے، اتباعِ سنت نشانِ مردانگی اور شرعی قینچی سے کتری ہوئی مونچھ چکنے بیل کی طرح پاٹ سر پر ایک گول ٹوپی، کاندھے پر چارخانے کا ایک رومال، گھٹنوں سے نیچے تک لٹکا ہوا کرتہ اس پر ایک ڈھیلی بنڈی ٹخنوں سے اوپر ڈھیلی گرہ سے چپٹا ہوا پائجامہ اور ایک پھول کا دلی کا جوتہ پاؤں میں۔ یہ تھے وہ بزرگِ محترم جنکے ہاتھوں میری زندگی کا بیوپار کیا گیا تھا۔ تاریخ کی دیمک سے چاٹے ہوئے خاندان کیلئے آج کی رات بڑے جشن و مسرت کی رات تھی۔ خاندان کو ایک زمانہ کے بعد ایک تاریخی سودی داماد ملا تھا۔ خاندان کی آخری کنواری کو نہایت آسانی سے ایک پیرِ طریقت بزرگ کے آخری سانس لیتی ہوئی تندور میں جھونک دیا گیا تھا۔

الخاموشی نیم رضا کے تحت جب میری قسمت کا فیصلہ ہوگیا، میں ایک اچانک حادثہ کی طرح سہم گئی۔ جوانی کی سرشاری ہو یا آگ پر ٹھنڈا پانی، ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ تھوڑی دیر کیلئے میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ یکایک ابا جان کا دھندلا نقش نظر پڑا، ایک خواب جیسا پسیجا ہوا، وہ مجھے تھپک رہے تھے۔ میں ان کی نورِ نظر معلوم ہو رہی تھی، ہاتھوں میں ایسی خنکی تھی جیسے ایک من برف کی سِلّی کے نیچے میں دبائی جا رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں، مجھے خود محسوس ہو رہا تھا کہ میرا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ دل نکلا پڑتا تھا۔ میں ذرا سا کراہی، ٹھٹھری ہوئی انگلیاں میرے سارے بدن میں دوڑ گئیں۔ وحشی ہرنی کی طرح میں تڑپ اٹھی۔ میری آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ میں نے گھور کر دیکھا میرے ابا جان کا نقش ضرور تھا مگر ابا جان نہیں تھے۔ میں نے ان کا گلا گھونٹ دینا چاہا۔ وہ اپنی جوانی کی فریب نما نمائش کے لئے لال کبوتر بنے ہوئے تھے۔ اپنے گوشت و پوست کی گئی گذری کساوٹ چھپانے کیلئے ڈھیلی بنڈی کا جھولا لٹکائے ہوئے تھے۔ میز پر موٹے دانوں کی تسبیح رکھی ہوئی تھی کہ اس کا ڈھونگ رچا کر رعشہ کو چھپا سکیں۔ میں بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی کہ بڑے میاں زندگی کی پہلی تصویر کو کیسی دکھاتے ہیں۔

"بیوی ... شرماؤ نہیں، بیوی! بیوی۔" مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ میں چیخ پڑی۔ "چپ رہئے اور میرے پاس سے چلے جائیے۔" میں نے ابا جان کو امی کیلئے بیوی کہتے سنا تھا یا خانساماں کو بڑی بیوی اور چھوٹی بیوی کہتے سنا تھا۔ گئی ہوئی جوانی کی صرف یاد تازہ کرنے کیلئے، بجھی ہوئی کیفیات پر وقت کا مرثیہ پڑھنے کیلئے عورت کو بیوی سے خطاب کرنا شاید جھوٹ نہ ہوتا مگر ابھی تو میری جوانی کی شمیم بھی نہ مہکی تھی۔ بھورے بادلوں میں سے چھنتی ہوئی دوپہر تھی وہ پیچھے ہٹے اور میں ایک سیلابی موج کی طرح آسمانی بلندیوں تک اٹھ کر دفعتاً نیچے گر گئی۔ میرے جذبات میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ آنکھوں میں ہزار بادہ و ساغر سمو گئے۔ میری رگ رگ پھڑک اٹھی۔ میں نے انھیں بھرے جام کی سنہری حبابی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ پھر میرے پاس بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میری رات نے ابھی چاندنی کی گنگا جمنی چادر میں منہ بھی نہ چھپایا تھا اور وہ اس طرح کپڑوں کو برابر کرنے لگے تھے جیسے نشہ ختم ہو چکا ہو اور خمار انگڑائیاں لے رہا ہو۔ میں نے انھیں پھر دیکھا۔ اُن کی نظر تسبیح کی طرف تھی اور داڑھی

میں اُنگلیاں سوتے جاگتے کا کھیل کھیل رہی تھیں ۔ میرے ہاتھ آپ ہی آپ
ان کی طرف بڑھے مگر بڑھتے بڑھتے یکایک رُک بھی گئے ۔ غالباً ان کی ہوشیار
تمنا نے میری حرکت دیکھ لی ۔ انھوں نے میری کلائیاں پکڑلیں ۔ مگر میں دہک
رہی تھی اور ان کے ہاتھ ایسے تھے جیسے پہاڑی برف کی گیند ۔ آگ پر جس طرح
پانی کا چھینٹا دھواں اڑاتا ہے ، اُسی طرح میری تمناؤں کا دھواں نکلا ۔
میں جیتے جیتے ہارگئی ۔ میں نے تکیہ میں منہ چھپاکر رونا شروع کیا مگر وہ گر
گرکر بھی اُبھر رہے تھے ۔ انھوں نے مجھے گھسیٹ لیا میں خود ہی ان کی گود
میں گرگئی ۔ وہ میرے بال سہلانے لگے ۔ میں انتظار کرنے لگی ۔ جب ان کی
ہاتھ ذرا بھیگے ، میں خود ٹھنڈی پڑچکی تھی ۔ تھوڑی دیر بعد پڑوس کی مسجد
سے نفیرِ صبح بلند ہوئی اور وہ شرح وُلائی مجھ پر ڈال کر اپنی غیر استواری داڑھی
کھجاتے ہوئے باہر گئے ۔ اُن کے چلے جانے کے بعد میں نے اُٹھ بیٹھنے
کی کوشش کی ۔ میں بڑی تھکن محسوس کر رہی تھی ۔ نہ بیٹھا جاتا تھا نہ اٹھا جاتا تھا ،
وہ تسبیح بھول گئے تھے ۔ میں پھر لیٹ گئی اور دانوں کو گِننے لگی ۔ گنتے ہی
گنتے شاید سوگئی ۔

(۲)

دن گذرے راتیں بیتیں ۔ ساون گیا ۔ بھادوں گیا ۔ مہینے منٹوں
کی طرح ختم ہوئے ، کنوار بھی گذر گیا اور کاتک آیا ، وہ بھی مجھے بیدار کئے
بغیر گذر گیا ۔ پوس نے مجھے راتوں کو بیدار کرنا شروع کیا اور ماگھ میں لحاف
میں بھی مجھے چین نہ پڑتا ۔ نئے گھر میں پورا ایک سال گذر گیا ، شادی کی رات
کو جو بیکلی میری روح میں سمائی تھی اب پوری مستی میں ڈوب چکی تھی ۔ فکر ہی
فکر میں میری جوانی نے انگڑائیاں لینی شروع کیں ۔ بدن بات بات پر
ٹوٹنے لگا ۔ ہوش کا ہر لمحہ ارغواں کی طرح چھلکنے لگا ۔ سورج کی پہلی کرن
جب کھڑکی کے شیشوں سے چھن کر مجھے چومتی ، میں مولوی صاحب کی تسبیح
کو دیکھتی اور متزلزل ہو جاتی ، صبح کے ہلکے دھندلکے میں جب میری نیند
سے مجھے جھنجوڑ کر میرے مولوی صاحب محلہ کی مسجد میں بانگِ سحر دینے چلے
جاتے منڈیر پر گورا ، گوری کو پیار کرتے دیکھتی ، اور میری زندگی کی مخمور موج
مجھے آسمانوں کی سیر کرا آتی ، پھر جب مولوی صاحب کھنکھارتے واپس آتے
جینیو ڈی کی طرح اپنے کو مسلا ہوا محسوس کرتی ، کبھی رنگ و بہار سے کھیلنا چاہتی
کبھی کانٹوں پر سو جانا چاہتی ، جوانی دن بدن دل ربائی اختیار کرتی جا رہی تھی
اور دُکھی دل کی مزاج پرسی کیلئے آنکھیں انتظار ہی کرتے کرتے تھکی جا رہی تھیں
میری شادی زندگی کا سارا سکھ اپنی یاد کی موجوں میں بہا لیگئی تھی
میں ایک بیوہ سے بدتر تھی ۔ زمانہ میرے کان میں کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ
میں لٹی ہوئی بہار ہوں اور مرجھائی ہوئی زندگی کا بیوہ پن دل پر یہ تھپکیاں
دیتا تھا کہ جوانی کی آندھی میں اپنے کو پھینک دوں ۔ چھاتیوں کے اندر دہکتی
ہوئی آگ میں پروانہ کی طرح گروں اور راکھ ہو جاؤں پھر سرشاری کے
گھونگرو بجاتی ترلوک اور آکاش پر اپنی راکھی کی ایک چادر سی بچھا دوں ۔
تمام اعتباراتِ قدیم کی ایک چتا بناؤں اور اُس کے ہانپتے کانپتے شعلوں
میں اپنے آپ کو جھونک دوں ۔

اپنے باپ کے گھر میں تو سہیلیوں ہی سے دل بہلالیتی تھی ، کبھی چھپ
چھپاکر سیر سپاٹا بھی کرآتی تھی ، سہیلیوں کے گھران کے بھائی بندوں سے
آنکھوں کے ڈورے بھی پرولیا کرتی تھی ۔ چٹکیوں اور گدگدیوں میں زندگی
بسر ہوتی تھی ۔ مولوی صاحب کے گھر میں مُرجھائے ہوئے گلاب کی طرح
آئی تھی ۔ صرف گھر کا سہاگ تھی ، باورچی خانہ اور جانماز سے آگے تمناؤں
کی دُنیا نہ نکل سکتی تھی ۔ آخر زندگی کے اِس مد و جزر میں اپنی جگہ پر نہ قائم
رہ سکی ۔ پہلے مسلسل دردِ سر کی شکایت رہی ۔ جب چھاؤں سے باہر
ہوکر دھوپ میں مستقل ٹھنڈے بدن کو تاپتی ، چھاتیوں میں دھڑکن
پیدا ہوتی اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ۔ رفتہ رفتہ مرض مستقل ہوگیا ۔ اور اپنے
ہی آگ میں ہر دم پکنے لگی ، کبھی ہاتھ پیر اتنے ٹھنڈے ہو جاتے کہ نیلی
پیلی پڑجاتی ، کبھی ایسی آگ نکلنے لگتی کہ خود بخود دہک اٹھتی ۔

ایک دن پانی برس رہا تھا ۔ سلونی دھرتی پر بچھوے سے بج رہے
تھے ۔ موتی چھم چھم برسے جا رہے تھے ۔ منڈیر پر گورا گوری چمٹے جا رہے
تھے ۔ میرا ہاتھ کبھی دل پر جاتا ، کبھی آپ ہی آپ اینٹھنے لگتا ۔ کبھی جمہائیاں
آتیں کبھی بھیگی بھیگی آہیں اٹھتیں ۔ زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ،
مجھے مدہوش کئے جا رہی تھی ۔ اُس وقت پڑوس سے گانے بجانے کی
آواز آئی ۔ میں چونک گئی ۔ میں نے اپنے دل کے ٹوٹے آئینہ میں اپنے
آپ کو دیکھا اور تڑپ کر رہ گئی ۔ نہ معلوم کیوں مجھے اپنی بیکلی یکا یک
دور ہوتی معلوم ہوئی ۔ یہ مدھر آوازیں اِدھر چند ہی دن سے اپنی چھاگل
کا جال مجھ پر ڈال رہی تھیں ۔ مگر اب تک گھڑی کی ذرا ذرا سی دیر کی لوری

کی طرح میں نے کبھی اُن پر دھیان نہ لگایا تھا۔ اس دن نہ معلوم کیوں میں
اُن کی طرف بے اختیار کھنچ گئی۔ میں نے دل کے ذرّوں کو ایک جگہ جمع کر کے
فضا کی مدھ پر اپنے کو تصدق کر دیا۔ دل کے ایک ایک ٹکڑے پر سو دنیائیں
بس گئیں۔

میں نے اپنی پیاسی زندگی کو مدھ کے چھلکتے ہوئے جام میں بے
اختیار ڈال دیا۔ آپ ہی آپ قدم اٹھے اور میں ڈیوڑھی پر جا کھڑی ہوئی۔
کچھ دیر بھیگے ہوئے پردوں کو تمتمائے ہوئے رخساروں سے لگائے ستی
رہی اور جھومتی رہی۔ پھر پاؤں ڈگمگائے اور ڈرتے ڈرتے میں نے پردہ
اٹھایا۔ باہر بارش اٹھلاتی جا رہی تھی۔ ہزار ناز و انداز سے دھرتی پر نثار ہوتی
جا رہی تھی۔ کبھی اٹھلاتی، کبھی ٹھوکریں کھاتی، کبھی سنبھلتی کبھی جوتی، کبھی لپٹتی
کبھی جوش میں سرشار ہو کر دھرتی کو بھینچ لیتی۔ سڑک کے دوسری طرف میرے
دروازے کے بالکل سامنے والے مکان میں بڑی اُدھم مچی ہوئی تھی۔ باہر
کی طرف کمرے کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ کھڑکیوں میں سے کئی نوجوان
اچھلتے کودتے نظر آ رہے تھے۔

کوئی ناچ رہا تھا، کوئی گا رہا تھا، کبھی کبھی ایک گلابی چندری بھی
بجلی کی طرح کوند جاتی، اُسوقت کئی نوجوان ناچتے نظر آنے لگتے۔ میں کھڑی
بھیگتی رہی۔ زندگی نئی انگڑائی لیتی میرے سامنے آ رہی تھی، میں ہوش
کھو چکی تھی، میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ مجھے ان نوجوانوں سے، اپنے
سے، قدرت کی شرابی بارش سے، مولوی صاحب سے۔ اپنے والدین
سے، ساری دنیا سے نفرت ہو گئی۔ رنج و غم کے بادلوں میں خود کو گھرتا
ہوا محسوس کرنے لگی۔ غصہ میں تھنسنے لگی پاؤں پھر ڈگمگائے۔ اسی
وقت میں نے مولوی صاحب کو دور سے آتے دیکھا۔ میں گھبرا کر بھاگی
اور اندر آ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔

(۳)

دن پھر گذرنے لگے، راتیں پھر بیتنے لگیں۔ دم گھٹنے کا بہانہ کر کے مولوی
صاحب سے میں نے خلوت کی مقفل کھڑکی کھلوا دی گئی اب سڑک اور سامنے
کے مکان سے صرف ایک ٹاٹ کا پردہ میری آنکھوں کا نقاب بنا ہوا تھا۔

جسے جب مولوی صاحب چلے جاتے۔ اٹھا دیا کرتی۔ سامنے کے مکان میں
بیا کی اکثر تھرکتی تانیں دیتی حسین اور رسیلے قہقہے میرے کان میں گونجتے
اور مجھے بےچین کرتے لیکن پچھلے دن کا منظر آنکھوں میں دوڑ جاتا اور شوق
پر نفرت غالب ہو جاتی کبھی کبھی تجدید شوق کی فراوانی میں آنکھ مچولی
کو جی چاہتا تو پردہ اٹھائے دیر تک سڑک پر چلنے والوں کو دیکھتی رہتی کبھی
کبھی نوجوان بھی نظر پڑتے، میں پہلے پہلے تو منہ پھیر لیا کرتی تھی، پھر صرف
دوسری طرف دیکھنے پر اکتفا کرنے لگی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ انھوں نے
بھی مجھے دیکھ لیا ہے اور وہ بھی آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتے ہیں اکثر میں نے
دیکھا کہ دو تین نوجوان اپنی کھڑکی میں کھڑے میری جانب گھورتے رہتے
ہیں۔ جب میں یہ دیکھتی تھوڑی دیر کیلئے ٹل جاتی لیکن پھر جب پردہ اٹھاتی
نوجوان اسی طرح گھورتے نظر پڑتے۔ رفتہ رفتہ میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈالنے کی خود بھی کوشش کرنے لگی یہ جذبہ اسوقت اور زیادہ ہو جاتا جب
وہاں ایک دو لڑکیوں کو بھی دیکھتی مجھے ان لڑکیوں پر بڑی حیرت ہوتی،
انہیں شرم و حجاب ذرا بھی نہ معلوم ہوتا۔ وہ بھی مجھے گھورا کرتیں جیسے کہ
مجھے صرف گھورے جانے کیلئے مولوی صاحب بیاہ لائے تھے۔

نوجوان عجیب عجیب حلیوں کے تھے۔ کسی کے بال کاندھوں تک
لٹکے ہوئے سنہرے لیکن ننگے، لہراتے ہوئے لیکن بے رنگ و نور، رخسارے
پچکے ہوئے، پیلے پیلے، لانبے لانبے، دُبلے دُبلے۔ کمزور و نازک اتنے کہ
رُلت کرتے لڑکھڑا جاتے، کوئی نہایت کالا اور موٹا۔ کوئی بہت گورا اور
کمسن، کوئی اجڑ، کوئی کھویا کھویا سا۔ لباس سب کے انگریزی ہوتے او پچ
تنگ پاجامے اور بہت ڈھیلے کوٹ۔ پیلے پیلے سرمئی پتلون، قمیص کے
بٹن کھلے ہوئے، ایسے کہ بنیائنیں نظر پڑتیں، لڑکیاں کبھی انگریزی لباس
پہنے ہوتیں، کبھی ساری۔ انہیں کوئی گوری تھی، کوئی کالی تھی، کوئی اتنی
سرشار کہ کپڑوں میں پھوٹی پڑتی۔ کوئی ایسی مرجھائی ہوئی کہ ذرا سی
پھونک سے اڑ جائے۔

میں انہیں دیکھتی اور پھر گھنٹوں سوچا کرتی کہ وہ کون ہیں کیا کرتے
ہیں، لڑکیاں کون ہیں اور کیوں دن رات اتنے مردوں میں اُدھم مچاتی رہتی
ہیں، جتنا سوچتی اتنا ہی زیادہ پردہ کو اٹھاتی اور انکی طرف ہی دیکھا کرتی۔
آخر کھڑکیوں کی اس مٹھوں میں پیام و سلام کی نوبت آ ہی گئی۔ ایک دن

جب مولوی صاحب حسبِ معمول باہر چلے گئے اور میں پردہ اٹھا کر سڑک کا نظارہ کرنے لگی۔ میرے رُخسارہ پر کوئی چیز آکر لگی۔ چوٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے پہلے اپنے پیچھے دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ پھر سڑک پر نظر دوڑائی، اسوقت وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ مکان کی طرف آنکھیں اٹھیں۔ دو نوجوان اور ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ تینوں مسکرا رہے تھے۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے پردہ چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے اس چیز کو تلاش کرنا شروع کیا جس سے مجھے نشانہ بنایا گیا تھا۔ "کاغذ کی گولی"۔ میں نے گھبرا کر اُسے اٹھایا۔ کاغذ کی سلوٹیں برابر کیں۔ لکھا تھا "ہم سے آکر ملو۔ دن بھر کھڑکی میں کھڑی کیا دیکھا کرتی ہو"۔ میں ڈر گئی اور پھر سارا دن کھڑکی کے پاس نہیں گئی۔ رات کو جب مولوی صاحب آئے، اُن سے بھی آنکھیں نہ چار کر سکی۔ اب تک وہ آنکھیں ملاتے گھبراتے تھے، اب میری آنکھیں نہ اٹھتی تھیں۔ بڑی مشکل سے کروٹیں بدلتے اور آہیں بھرتے نیند آئی۔ رات کو کئی بار چونکی لیکن مولوی صاحب کو خراٹے بھرتے دیکھ کر پھر سو گئی۔

صبح دیر میں اٹھی، مولوی صاحب مجھے نماز کیلئے اٹھاتے اٹھاتے مایوس اور جھنجھلاتے ہوئے روز کی طرح چلے گئے تھے۔ اپنے ساتھ دُنیا مجھے انگڑائی لیتی دکھائی دی۔ آنکھیں میچتے میچتے سارا دھند دور ہو گیا۔ نیا قانون نیا نظام نئی سماج نئے اعتبارات نئی دلکشیاں اور نئی رعنائیاں دکھائی دیں میں نے سوچنا شروع کیا کہ محبت اور انسان کی فطرت ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے دو گلاب کے پھول ہیں جو کانٹوں سمیت پروئے گئے ہیں۔ اگر انسان انھیں اپنے نازک دل سے لگائے اور جو خون کی گرم گرم بوندیں ٹپکیں ان سے انھیں سینچے۔ لذت کی عجیب کیفیت اور نفس کے اطمینان کا عجیب نشہ اس پر چھا جائے گا۔ اُسوقت اگر ساری دنیا بھی اُس پر تھوکے، انگلیاں اٹھائے، دنیا کی اعتباری شرافت اس پر ہنسے، وہ صرف نشیلی آنکھیں اٹھا کر رہ جائیگی۔ میں نے آئینہ اٹھا کر اپنے کو دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سارے سنسار نے مل کر مجھے دھکا دیدیا ہو۔ مجھے خیال ہوا کہ میں کہیں بھی چھپ جاؤنگی، سماج کا چنگل مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ بگڑے ہوئے نوجوانوں اور اس چنچل کے پاس جا کر اپنے پانی میں تھرتھراتے ہوئے چاند جیسے دل اپنے ہی دل لبھانیوالے حواب، اپنی زبان، اپنی نسائیت سب کچھ کھو دوں گی۔ آئینہ کے اندر خو میرا کھلایا ہوا پر تو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ دنیا کے انسان، اپنے کتوں سے زیادہ بلند و بالا نہیں ہیں۔ ہوس اور نفس کی پیاس بجھا کر بھی ہر پانی میں غوطے لگاتے ہیں۔ ہر ہڈی کو دیکھ کر اُسے کھرچنے کے لیے دوڑتے ہیں۔ پھر یکایک منڈیر پر نظر گئی۔ گورا گوری روز کی طرح ایک دوسرے سے چمٹے جا رہے تھے، میں نے اپنے خالی بستر کو دیکھا۔ دل مسوس کر رہ گئی۔ باہر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری اپنی جوانی گھنگھور گھٹا سے رس کی بوندیں ٹپکاتی واپس مڑی اور اُس نے میرے دل کو بہلاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ زندگی اگر تڑپے نہیں، زندگی نہیں ہے۔ میں ضرور جاؤں اور کسی طرح اسی نئی فضا کا امرت پی لوں۔ میرے دل بہلنے کے وہیں سامان ہیں۔ اعتبارات قدیم کی اس دُنیا کی دھجیاں بکھیر دوں اور کہدوں دنیا سے، اپنے بوڑھے والدین سے اپنے مولوی صاحب سے کہ ایک ہی ہستی ایک ہی وقت میں بیوی اور خواہشات کی ساقن، دونوں ہو سکتی ہے۔ اگر دل چاہے اور محسوسات دھکے دیں جس رُخ بھی لڑ کھڑے، لڑ کھڑے چلا جانا چاہیئے۔ دل کی اس حالت پر لاکھ قابو کرو لیکن نہیں ہوتا، جوانی مسکرائے تو ناقابل برداشت گدگدی اٹھتی ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف دو دلوں کے اشتراک معنوی کا نام ہے۔ اسلیے کہ خود مولوی صاحب ہر دم نظام معنوی کی مالا جپتے رہتے ہیں اور اس کیلئے صرف کاروبارِ حیات میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا کافی ہے۔

میں چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دل نے کہا ننھی کلی! وقت آئیگا کہ تو سبدِ گل ہو گی، پھر جوانی نے پر پھیلائے اور پھر دوبارہ اپنے فردوس کی طرف اڑ چلی۔ میرا ہیجان بڑھتا ہی گیا۔ ماما نے ناشتہ لا کر دیا۔ مزاج پرسی کی۔ بالوں میں تیل کنگھی کرنیکو کہا میں کچھ نہ سمجھی، کسی چیز پر دھیان نہ دیا۔ بادل چھٹ گئے سورج نکل آیا۔ دن چڑھنے لگا، دھوپ پھیلنے لگی مگر مجھے اٹھتے بیٹھتے کسی حال میں بھی چین نہیں تھا۔ کئی بار پردہ اٹھانا چاہا مگر آپ ہی آپ ہاتھ گر گیا اور میں چارپائی پر واپس چلی آئی۔

میں پھر سوچ میں پڑ گئی۔ دل پر دھکے سے لگنے لگے۔ میں اپنی قسمت پر رونے لگی۔ میری شادی کر دی گئی اور میں نے کر لی اور کرتے ہی ایک عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ ابھی الجھن ہی میں پھنسی ہوئی تھی کہ ایک آہٹ ہوئی میں چونک کر اٹھ بیٹھی اور سکتہ میں پڑ گئی۔ میری بھابی جان! میری اپنی بھابی جان! سجاد بھیا کی دلہن۔ مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔ میں نے بولنا

چاہا مگر زبان نے یاری نہ دی، انگلیوں کے اشارے سے پوچھنا چاہا کہ وہ اس طرح یکایک کیسے آگئیں مگر وہ بلیں بھی نہیں۔ آنکھوں کی حرکت سے میں نے اپنے اندر کشمکش کے اظہار کی کوشش کی کہ میری لاپتہ بھابی اچانک کہاں سے ٹپک پڑیں۔ میں نے رونا چاہا مگر کمبخت آنسو بھی نہ چھلکے۔ بھابی مجھے گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ یکایک قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا، دل اُبل پڑا، بدن میں جھُرجھُری سی آئی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بھابی میرے پاس آکر مسہری پر بیٹھ گئیں اور میرے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ پھر ان سے نہ رہا گیا، ایک دو آنسو اُن کی آنکھوں سے بھی ٹپک پڑے۔ مگر میں نے اپنی بے اختیار حالت میں بھی محسوس کر لیا کہ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ سارے جھلملاتے آنسو پی گئیں۔ میرے آنسو یکایک ختم ہو گئے۔ میں انھیں دیکھنے لگی۔ میری ٹکٹکی بندھ گئی۔ وہی ہیرے جیسے چمکتے ہوئے دانت، وہی بڑی بڑی رس بھری آنکھیں وہی بھولا پن، وہی پیارا پیارا پھول سا چہرہ لیکن مرجھایا ہوا۔ ماضی ایک متحرک فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے دوڑنے لگا۔ بھائی جان کی انگلستان سے واپسی، انگریزی حکومت سے شدید نفرت کے جذبے، پھر بھی آئی، سی، ایس کی نوکری، بچپن کی منسوبہ میری چچا زاد بہن سے شادی سے انکار، ابا جان سے لڑائی، خاندان کی نفرت اور دشمنی، آئی سی، ایس سے مستعفی ہونا، ایک ہندو لڑکی سے ہم سے پہلے دوست کی حیثیت سے ایک دن متعارف کرانا، پھر یکایک شادی کی خبر سنانا، گھر میں کہرام۔ ابا جان کی خفگی اور لڑکی کے مسلمان ہونے پر اصرار، بھائی جان کا انکار اور پھر گھر چھوڑ دینا، لاپتہ ہو جانا ... اور آج ...

آج بھابی بھائی جان کی ہندو بیوی میرے مکان میں اس طرح، اچانک کوئی سان نہ گمان ...... میں اُن کو دیکھے جا رہی تھی، اور سوچے جا رہی تھی، میں نے ابا جان کو کہتے سنا تھا کہ اُن کی شادی خالق اعظم کی بارگاہ میں کبھی قبول نہیں ہو سکتی۔ غیر مذہب کی لڑکی سے اُن کا انگریزی قانون سے نکاح کبھی جائز نہیں ہو سکتا ...... اور .... اور کسی نے خاندان میں سادات سے گر کر شادی نہیں کی، ہمارا خاندان اُن علمائے کرام کا خاندان ہے جن کے علم و جاہ کا ڈنکا سارے اقصائے عالم میں مچا ہوا تھا ... اور ..... اور ... ۔ اس کے حسب و نسب کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی نظام نہیں ہے وہ شریف نہیں ہے۔ اگر بھائی جان نے یہ شادی کی، سب خاک میں مل جائیگا۔ اُن کی پوزیشن خاک میں مل جائیگی، انھیں اپنے اعزا و اقربا کو آخری سلام کہنا ہوگا، وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور ان کا مستقبل ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائیگا ...... مجھے اپنے بھائی جان کا بھی جواب ایک ایک کر کے یاد آ رہا تھا ... .. مجھے ابا جان کے پوزیشن، ان کے مذہب اور ان کے خاندان سے دور رہ کر ہی اطمنان ہو سکیگا۔ شرافت شرافت کی آخر تعریف کیا ہے؟ شریف کہلانے کا کون مستحق ہے؟ اُس لڑکی میں آخر کونسی بات ایسی دیکھی گئی، جس سے اس کی شرافت پر شبہ کیا جاتا ہے، اگر باعصمت ہونا ایک شریف کیلئے ضروری ہی ہے تو ان کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ باعصمت نہیں ہے؟ اگر حیا اور شرم شرافت کا طرۂ امتیاز ہے تو ان کو کیسے معلوم ہوا کہ اس کے دیدہ کا پانی مر گیا ہے؟ پھر کیا محبت کی تعمیر تعینات کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ کیا محبت کے مذہب میں انسان، انسان میں تمیز ہو سکتی ہے، نسلی شرافت، محبت کے نظام کے تحت بے معنی چیز ہے۔ صرف ذاتی شرافت قابل قبول ہو سکتی ہے۔ خون کا بھی اثر ہوتا ہے لیکن تعلیم اور تربیت اس اثر کو زائل کر دیتی ہے۔ اس لڑکی سے شادی میرے مستقبل کیلئے کس طرح مہلک ہو سکتی ہے، اعزا و اقربا مقاطعہ کر دیں گے، سماج تھوکے گا، لوگ انگلیاں اٹھائیں گے سب خود غرض، سب مہمل ایسے لوگوں سے خود ہی تعلق کیوں رکھا جائے، اس بیدرد ماحول میں زندگی ہی کیوں بسر کی جائے، میں اپنا نیا شوالہ کیوں نہ تعمیر کروں؟

۔ یہ کہتے کہتے میرے بھائی جان چلے گئے اور پھر اُن کا پتہ نہ لگا ... ا[illegible] بھابی جان، اُن کی وہی ہندو بیوی، میری دوست، میری مرحومہ بہنوں کی سہیلی، میرے پاس اس طرح آتی ہے۔

میں جیسے خیالات میں کھو گئی، میری زبان پر قفل لگ گیا۔ انھوں نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا

تمہاری شادی ہو گئی؟ اور ہمارے شہر کے ایسے نامی گرامی مولوی صاحب سے؟؟

میں نے اُن کی طرف اپنے چوٹ کھائے دل پر قابو کرتے ہوئے

دیکھا مگر نہ رہا گیا۔ رُو پڑی۔

انھوں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا:

یہ اتفاق کی بات ہے کہ سامنے کے مکان میں ایک دن آئی ہوئی تھی کہ تمہیں کھڑکی سے جھانکتے دیکھ لیا۔ پہلے تو نہ پہچان سکی مگر جب کئی بار دیکھا پہچان گئی۔ میرا جی بے اختیار چاہا تھا کہ دوڑ کر تمہارے پاس آؤں۔ مگر پھر میں نے خیال کیا کہ اگر کہیں تمہارے میاں سے سامنا ہو گیا، تم پر مصیبت پڑ جائے گی وہ بھلا بے پرواہ اور بے باک، غیر مذہب کی لڑکی کا اپنی "ملانی" سے ملنا کس طرح گوارا کریں گے؟ جب کئی دن دیکھ کر مولوی صاحب کے اوقات کا اچھی طرح یقین کر لیا، چلی آئی.....

وہ بہت کچھ کہہ گئیں مگر میرے جذبات میں جیسے بجلی سی کوند گئی تھی، میں نے بہت کم سنا اور جو سنا بھی اس پر دھیان نہ دیا۔ بھائی جان میری آنکھوں میں تھے، میرے دماغ میں تھے، میری زبان پر تھے، میں جیسے خواب میں بھائی جان بھائی جان پکار رہی تھی، ان کی آواز بھی میرے کانوں میں آ رہی تھی، انھوں نے کہا تھا کیا محبت کی تعمیر تعینات کی بنیاد پر ہو سکتی ہے؟ اگر بھائی جان ہوتے، میری یہ درگت نہ بنتی۔ میری بھی میرے والدین زبردستی شادی نہ کر پلتے، میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"اور بھائی جان؟ سجاد؟ وہ تین مہینے سے باہر گئے ہوئے تھے، ایک دو دن میں آ جائیں گے! میں نے اسی بیقراری سے کہا۔"

"بھائی جان سامنے کے مکان میں رہتے ہیں؟ اور مجھ سے نہیں ملے؟ مگر انھیں میری کیا خبر! آپ نے کہا کہ وہ تین مہینے سے باہر گئے ہوئے ہیں مگر، مگر میں نے اس مکان میں کئی نوجوانوں کو ناچتے کودتے دیکھا ہے اور رنڈیاں! رنڈیاں بھی، بھائی جان کو کبھی نہیں دیکھا اور آپ کو بھی نہیں دیکھا۔"

بھابی نے اسی اطمینان سے رُک رُک کر مسکراتے ہوئے جواب دیا:-

"ہم دو ہی تین مہینہ سے اس مکان میں آئے ہیں۔ سجاد مکان میں آتے ہی ملوں کی ہڑتال کے سلسلہ میں کانپور چلے گئے اور میں بھی دیہاتوں وغیرہ کے چکر میں رہی، کبھی کبھی آتی تو رہتی تھی لیکن تمہیں چند ہی دن ہوئے دیکھا۔"

میں نے چھان بین کرتے ہوئے پوچھا:

"اور ان میں یہ نوجوان کون رہتے ہیں اور عورتیں؟ رنڈیاں؟"

بھابی بلند آواز سے بولیں۔

"یہ سب دوست ہیں۔ ہم انھیں کامریڈ کہتے ہیں اور عورتیں بھی سب ایک دوسرے کی سہیلیاں ہیں۔ رنڈیاں تو نہیں ہیں۔ تم نے انھیں رنڈیاں کیسے سمجھا؟ وہ کبھی کبھی جب اپنے کاموں سے تھکی اور بجھی ہوئی لوٹتی ہیں تو ہنستی کھیلتی ہیں، وہ یہ چند دن کی جوانی رو رو کر نہیں گذارنا چاہتیں"۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا:

"مگر بھابی میں نے تو انھیں...... بس کیا کہوں، کس کس رنگ میں دیکھا ہے۔ اُن کی شادیاں ہو گئی ہیں؟"

بھابی نے لکچر دے ڈالا:

ہاں چند شادی شدہ بھی ہیں، میری تمہاری جیسی مگر زیادہ تر کنواری ہیں۔ وہ شادی کو جنجال سمجھتی ہیں۔ پابندی اور غلامی سمجھتی ہیں، وہ ایک رسم کیلئے اپنی بھینٹ نہیں دینا چاہتیں۔ انھیں لونڈی اور باندی بننا نہیں پسند۔ رسمی شادی کا مقصد آخر کیا ہے؟ تم اپنی حالت دیکھو کیا تمہاری زندگی کا مقصد اس سے کچھ زیادہ بھی ہے کہ مولوی صاحب کے چولہے میں اپنے ہاتھ جھلساؤ، ان کے لئے مرغن کھانے پکاؤ، ان کی نفسانی خواہشات پر اپنی جوانی اور جوبن کی بھینٹ چڑھاؤ، بچے پیدا کرو اور زندگی کے باقی دن ایک قید سخت میں گھل گھل کر، گھٹ گھٹ کر کاٹ دو، وہ کہتی ہیں کہ جب تک وہ پابند ہوئے بغیر زندگی کے "سوم رس" سے لطف اٹھا سکیں گی، اٹھائیں گی، میں خود بھی تمہاری جیسی شادی کی قائل نہیں، میرے نزدیک شادی کرنا صرف کاروبار زندگی میں مدد کا ایک ہاتھ حاصل کرنا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی جگہ آزاد ہوتے ہیں، اسی طرح میاں اور بیوی کو بھی ایک دوسرے سے آزاد ہونا چاہیے۔ میری اور سجاد کی شادی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ میری قریب ترین رفیق ہیں اور میں اُن کی قریب ترین رفیقہ۔

تمہاری جیسی شادی میں مرد بالکل آزاد ہوتا ہے۔ وہ جو چاہتا

کرتا ہے، وہ کبھی ایک بیوی کا ہو کر نہیں رہتا۔ مگر بیوی کو صرف انھیں کا ہو کر رہنا پڑتا ہے اور قانون اور مذہب مرد کا پشت پناہ بن جاتا ہے۔ مرد کا جب دل بھر جاتا ہے، وہ اُسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتا ہے اور ..... اور........"

میں نے بات کاٹکر بےچینی سے پوچھا:

"اور غیر مردوں سے اس طرح بیباکی اور بےحیائی سے ملنا کیا گناہ نہیں ہے؟ بھابی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ کیا آپ اسے پاپ نہیں کہیں گی؟ کیا یہ بےعصمتی کی بات نہیں ہے؟"

بھابی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک عجیب نشہ سے کہا:-

"بہن! گناہ کا معیار صدیوں کی پرانی سوسائٹی کا بنایا ہوا ہے۔ آخر عصمت کے معنی کیا ہیں؟ ہماری آنکھیں ملتی ہیں، پھر عصمت کا شیشہ کیوں نہیں چور ہوتا۔ دلوں کا سنگم بنتا ہے، پھر عصمت کو کیوں نہیں داغ لگتا۔ میاں بیوی، وہ میاں بیوی جو محبت کے دو پجاری ہونے کے عوض دو کاروباری ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں انکی عصمت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچتا، اور جب محبت کے دو پجاری جن کے جذبات میں ساری خدائی موجیں مارتی ہے، اسی طرح زندگی کو کھیلانا چاہتے ہیں تو اعتبارِ عصمت ٹوٹ جاتا ہے؟"

بھابی نے مجھے چپ کر دیا، لاجواب ہو گئی، تھوڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

"اور کنوارپن بھی آپ کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے؟"

بھابی نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا:

کنوارپن اگر کوئی چیز ہے تو صرف اُن کے لئے جو بچپن سے کنوارپن کی مہمل تشریحات سے متاثر ہوتے آئے ہیں ورنہ دراصل بیاہ نام ہی ہے اس وقفۂ آرام کا جس کی خواہش بہت زیادہ کھیل کر تھک جانے کے بعد ہوا کرتی ہے۔"

میں نے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہا:

"مگر بھابی ہر مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے کنواری بیوی ملے۔"

بھابی نے میرے دل لگتی بات کہی:

"کورے گھڑے میں پانی پیئے، نئے برتن میں کھانا کھانے اور روز نئے لباس پہننے کی خواہشیں بھی ہوتی ہیں۔ اور جس طرح مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کو کنواری بیوی ملے، اُسی طرح عورت کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کو کنوارا شوہر ملے۔ مگر بیوی ننانوے فی صدی کنواری ہی قبول کی جاتی ہے اور شوہر سو فیصدی ان گنتی بیاہ کیا ہوا۔ رہا بیوا اور بازاری رنڈی کا سوال تو بہن بازاری رنڈی اور گھرست بیوی میں کیا فرق ہے؟ ایک کے پاس عیاشی کا مذہبی یا سپورٹ یا لائسنس ہوتا ہے، دوسرے کے پاس اُسی چیز کا سوشل حکمنامہ۔ بازاری رنڈی بھی گھرست ہوتی ہے اور محلوں کی بیگم بھی گھرست ہوتی ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ پہلی صرف ایک جام پی کر بدمست بنتی ہے، دوسری خم پر خم لنڈھاتی ہے۔ بازاری رنڈی بھی سوسائٹی ہی کی پیداوار ہے۔ گھرست شریف عورت بھی بیوپار کرتی ہے۔ جہیز، نقدی، مہر، استری دھن، کنیا دان، کیا یہ سب بیوپار نہیں ہے؟ کون بیوپار نہیں کرتا۔ سب بیوپاری ہیں۔ صرف طریقہ میں فرق ہے۔ بعض کو ہماری صدیوں کی بنی ہوئی سوسائٹی کے قوانین نے پاپ اور حرام بنا رکھا ہے اور بعض کو حلال، حالانکہ بیوپار تو بیوپار، خوبصورت کنیا کیلئے دان اور مہر کی بڑی رقم مقرر ہوتی ہے بعض لڑکیوں کو استری دھن میں کافی رقم ملتی ہے، بعض کو کم، کیا یہ بیوپار نہیں ہے.....؟"

بھابی اٹھ کھڑی ہوئیں اور یہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔

"اب کل تمہارے بھائی جان کیساتھ آؤں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ مولوی صاحب کے آنیکا وقت آگیا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے دیکھیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے نہ ملنے دیں گے۔ آج شام کو سامنے کے مکان سے ہم جلوس نکالیں گے۔ تمہارے بھائی جان بھی ہوں گے، مولوی صاحب اس وقت شام اور رات کی نماز کیلئے چلے جاتے ہیں، تم اپنی کھڑکی سے دیکھنا، تمہیں بھی اسکا اندازہ ہو جائیگا کہ ہم کیا کام کرتے ہیں اور تمہارے بھائی جان کا کیا شغل ہے؟"

میں اُنھیں روکتے روکتے رہ گئی اور وہ چلی گئیں۔

ساجد ہی بھیا۔ تقریر کر رہے تھے، میرے بھائی جان ایک کرسی پر کھڑے ہوئے بالکل پہلے جیسے انداز میں اسی طرح جھوم جھوم کر گردن اور انگلیوں کو ہلا ہلا کر مجمع کے سامنے گرج رہے تھے۔ بھابی ایک لال لال جھنڈا لئے پاس کھڑی تھیں، لوگ رہ رہ کر انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ مجمع زیادہ نہیں تھا مگر دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ سڑک پر راستہ چلنا لوگوں کیلئے مشکل ہو رہا تھا، میرے بھائی جان پہلے سے زیادہ سیاہ ہو گئے تھے، دُبلے بھی بہت تھے۔ مجھے اُن کا بھرا بھرا گورا چٹا بدن یاد آنے لگا، آنسو میری آنکھوں میں دوڑنے لگے۔ کہاں وہ لندن کے سِلے سوٹ اور کہاں یہ خاکی کرتا اور میلا سا پائجامہ، ننگے سر، بھائی جان کے گھونگھریالے بال سارے خاندان میں مشہور تھے، کتنی میری سہیلیاں ان کے بالوں کی تعریف کرتی رہتی تھیں اور اب وہی کالے ناگ جیسے لہریں لیتے بال صفاچٹ ہو گئے۔

بھائی جان کے سر پر ایک بال بھی نہ تھا۔ میرے آنسو چھلک پڑے، میں زار و قطار رونے لگی۔ بھابی نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا، بھائی جان کی آواز اب زیادہ صاف سُنائی دینے لگی ——

آؤ اس سامراج کی زنجیریں توڑ دو —— ظلم و استبداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دو —— تمام رسوم سارے رواج مٹا دو —— انقلاب، انقلاب عظیم پیدا کر دو —— اپنی موجودہ تہذیب کو الٹ دو —— اپنی معاشرت کو بدل دو —— اپنے علم و ادب —— اپنی زندگی کے ہر رُخ کو بدل دو —— جاگو، خواب خرگوش کے متوالو اٹھو —— اپنا مذہب بدل دو —— ایک دین نو کی بنیاد ڈالو جس کے ذریعے حقیقی مساوات حاصل ہو سکے، انسان کا انسان سے فرق کرنا مٹ جائے —— انسان انسان کو ذلیل کرنا چھوڑ دے —— آبائی جاہ و مرتبت، عہدہ و دولت کی بچھوڑی ہوئی ہڈیوں پر جان دینا چھوڑ دے اور پھر نئے ذہن و خیال کے نئے انقلاب سے کام لیکر ارض ہندوستان کو الٹ دو، یہ اس[1] غلام آسمان کو الٹ دو۔ ساری دنیا کو الٹ دو، سرمایہ داروں کے اُن فلک پیما محلات کو ڈھا دو جن کی تعمیر میں فاقہ کش مزدوروں کی ہڈیاں ہیں —— زمینداروں کی ان ریاستوں کو پھونک دو جن میں بھوکے کسانوں کی کھیتی لہلہاتی ہے —— اس بڑے محل پر اپنا پرچم لہراؤ جہاں تمہاری مستقل غلامی کیلئے منصوبے ہوتے ہیں —— جہاں سے استبداد کی گھٹائیں اٹھتی ہیں اور تمہاری جھونپڑیوں پر بجلیاں گراتی ہیں —— وہ دیکھو —— وہ انقلاب کا بادل پیچ و تاب کیساتھ اٹھ رہا ہے —— تم چھا جاؤ اس میں —— گولیوں کی بوچھار ہو گی۔ —— تم کود پڑو اس میں —— تلواروں کی باڑ چلے گی —— تم اپنے سروں کا چراغاں بناؤ —— توپیں دغیں گی —— تم اپنے سینے سامنے کر دو —— پھانسی کے تختے تم پر لبیک کہیں گے —— تم بے دھڑک جاؤ —— ظلم و ستم کے انگارے دہکینگے گے —— تم راکھ ہو جاؤ —— یتیموں کی چیخیں بلند ہوں گی —— آنیوالی نسلوں کا خیال کرو —— بیواؤں کے بین سے دل شق ہوں گے —— مستقبل کی ماؤں کے لئے فضا بناؤ —— آؤ نوجوانو —— آؤ اپنے پری محلوں سے نکل آؤ —— ریشم کے ان کرتوں کو اتار پھینکو —— خون میں نہا جاؤ —— عورتو —— اپنی خلوتوں سے باہر آجاؤ —— چوڑیوں کو توڑ ڈالو —— سُرخ کپڑے پہن لو .... انقلاب... انقلاب زندہ باد۔

ڈنڈے۔ لاٹھیاں۔ شور، چیخ۔ پکار۔ انقلاب۔ انقلاب بھابی ارے بھابی کو کیا ہوا اور بھائی، بھائی جان کہاں گئے۔ یہ کیا ہو گیا، پولیس۔ پولیس۔ ہر طرف پولیس۔ ڈھیلے۔ ہر طرف ڈھیلے اینٹ۔ پتھر۔ کنکر۔ توبہ میں نے گھبرا کر پردہ گرا دیا۔ کھڑکی بند کرلی میں کانپنے لگی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میرا سر گھومنے لگا۔ میں بیں چکرا کر گری اور بیہوش ہو گئی۔

---

[1] ساغر کا مصرع۔ فرید

(۷)

مولوی صاحب میرے سر پر کپڑے بھگو بھگو کر رکھ رہے تھے، بیقراری سے پوچھ رہے تھے۔ بیگم کیا ہوا تمہیں کیا ہوا، اور یہ کمبخت ماما اتنی دیر ہو جانے پر بھی نہیں آئی۔ اور میں سوچ رہی تھی۔ بھابی جان نے کہا سامراج کی زنجیریں توڑ دو۔ یہ سامراج کیا بلا ہے۔ میرا سر پھنک رہا تھا۔ رہ رہ کر درد کی ہوک اٹھتی تھی مگر میں سامراج کے معنی جاننے کیلئے ہمہ تن گوش رہی تھی۔ اور بھائی جان نے یہ بھی کہا تھا۔ تمام رسوم سارے رواج مٹا دو، اس تمام دنیا کو الٹ دو، اپنی زندگی کے ہر رُخ کو بدل دو بھائی جان۔ ڈنڈے۔ لاٹھیاں۔ شور۔ چیخ۔ پکار۔ بھابی۔ بھائی جان۔ بھابی۔ بھائی جان۔ پولیس۔ پولیس۔ ارے یہ بھابی کو کیا ہوا۔ بھائی بھائی جان کہاں گئے۔ پولیس پولیس ..... مولوی صاحب میرا سر تھپکنے لگے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں قہقہے مار کر ہنسنے لگی۔ ہنسی سے دُہری ہو ہو گئی۔ گھگھی بندھ گئی۔ پھر رونے لگی۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور پھر بیہوش ہو گئی۔

مولوی صاحب آج دن بھر گھر ہی پر رہے۔ آسیب کا عمل کیا رہ رہ کر کچھ پڑھ کر پھونکتے رہے، حکیم صاحب بھی دن میں دو بار آئے مگر میں تمام دن دروازہ کی آہٹ سی سنتی رہی۔ کوئی آواز آتی اور میں چونک جاتی۔ بھابی کے سر پر لاٹھی پڑی تھی۔ وہ تیورا کر گر پڑی تھیں اور بھائی یکایک غائب ہو گئے تھے۔ میں نے سارا دن بھابی کا انتظار کیا مگر وہ نہ آئیں اور مولوی صاحب ایک منٹ کیلئے نہ ہٹے۔ میں بھائی کی تقریر پر غور کرتی رہی۔ بڑے بڑے محل، ان کی تعمیر میں مزدوروں کی ہڈیاں۔ زمینداریاں جن میں بھوکے کسانوں کی کھیتی لہلہاتی ہے۔ یتیموں کی چیخیں بیواؤں کی آہیں۔ مزدوروں کے فاقے۔ کسانوں کا خون پسینہ۔ ٹوٹی ٹوٹی، بکھری بکھری، گرم گرم آہیں، مزدوروں کے بازوؤں کی پھولی پھولی، ابھری ابھری مچھلیاں، ٹھٹھری ہوئی راتیں اور جھلسے ہوئے دن۔ ظلم و حسد، بربریت ......، غلبہ اور پندار کے زہریلے ناگ۔ رئیس زادے۔ نواب زادے۔ میرے ابا جان کے دوست نواب یوسف خاں۔ میرے قصبہ کے رئیس ظہور خاں کے صاحب زادے۔

ان کے محل جن کی تعمیر میں بھائی جان نے سچ کہا تھا کہ کھرچی ہوئی ہڈیاں اور جھلسے خون کا گارہ لگا تھا۔ یہ مصنوعات میں لپٹی ہوئی۔ نگمین دنیا میرا دل نہیں بہلا سکتی۔ میرے مولوی صاحب میرے قبلۂ حاجات، کبریائے مکرم۔ میرا دل نہیں بہلا سکتے۔ میرے آقائی، مولائی، مرشدی کا رہ رہ کر عیاذاً باللہ اور الحمد اللہ میرا دل نہیں بہلا سکتا۔ سڑک پر گذرنے والے رئیسوں اور سیٹھوں کی موٹروں کی جھنکار۔ گھوڑا گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ۔ ہٹو بچو کی چیخیں، کبھی کبھی کان میں گونج جانے والی غریبوں کی اللہ کے نام پر بھیک مانگنے کی دلخراش صدا، یہ سب کے سب مجھے بیچین کرتے رہتے ہیں۔ میرے قلب و جگر پر چیونٹیاں سی رینگتی ہیں۔ اور پھر میری جوانی، میری مرادیں۔ میری تمنائیں میری بھوک، میری پیاس۔ یہاں رہ کر کبھی نہیں مٹینگی۔ میرے حنائی داڑھی والے خمیدہ کمر، جھریوں اور رعشہ سے لرزہ براندام مولوی صاحب جو صبح سے جاڑے کی راتوں کی تھرتھراتی ہوئی چاندنی کی طرح مجھ پر مسلط ہیں اور حق سرہ کا نعرہ یا۔ بار لگا رہے ہیں، ان سے میری وحشت کبھی نہ جائیگی۔ میرے بھائی جان اور بھابی نے نیا شوالہ بنایا ہے۔ میرا وہیں مقام ہے۔ وہاں کا انگڑائیاں لیتا ہوا نشہ، جوانی کی پھواریں۔ محبت کی چنگاریاں۔ بیباکیاں۔ آزادیاں اور بلا سے دست درازیاں۔ حقیقی محبت کی دیوانگی۔ صحیح زندگی کے نغمات۔ شباب و حیات کے جادو۔ مجھے وہیں جانا چاہیئے۔ میں نے اُسے اپنے دل کے ایک گوشہ کی کھلی ہوئی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیا ہے — نہیں مولوی صاحب میں سکرات میں نہیں ہوں۔ میں مر نہیں رہی ہوں۔ وہ دیکھئے۔ وہ جوانی جھومتی چلی جا رہی ہے۔ میں اس کے پیچھے ضرور جاؤں گی۔ اب مجھ سے نہیں رُکا جاتا۔ میں اب تک فرض اور مذہب کے غلط اعتقاد کے تحت۔ ابا جان اور مولوی صاحب آپ کے بے معنی بہلاؤوں میں پھنس کر اپنی جوانی کو تباہ و برباد کر رہی تھی۔ اب میں بھابی اور بھائی جان کیساتھ ملکر زندگی کے طیارہ کو اڑاؤں گی۔ میرے پریم کنج میں نئی بہار آئے گی۔ اٹھنے دیجئے مجھے اٹھنے دیجئے۔ آج میرے پریم سپنے کی سالگرہ ہے۔ دھنش کے بہتے ہوئے رنگ کی پچکاریاں چل رہی ہیں۔ ہوا بھی رنگوں میں

نہاتی اپنی تمام رعنائی، سرمستیوں کیساتھ بہہ رہی ہے۔ جوانی ایک اتھاہ
سمندر ہے۔ اس میں کسی کی خصوصیت نہیں ہوا کرتی۔ نہیں مولوی صاحب
مجھے اٹھنے دیجئے۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ میرا دماغ نہیں خراب ہوگیا۔
آہ — میں — پھر بیہوش ہوگئی۔

تین دن بعد میری حالت سنبھلی۔ مولوی صاحب مطمئن ہوکر
تھوڑی دیر میں لوٹ آنیکا وعدہ کرکے چلے گئے۔ ان کے چہرے کے کرب
یہ صاف بتا رہے تھے کہ وہ میری صحت کی طرف سے تو مطمئن ہوچکے
لیکن بیماری میں میرے ہذیان نے، میری سرشار جوانی کے سرمست
بول نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ پہلے سے زیادہ بوڑھے لگ
رہے تھے۔

مولوی صاحب کے جاتے ہی ماما نے آکر کہا کہ کوئی ہندو عورت
تجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ماما اچنبھے میں تھی۔ اس سے پہلے میرے پاس
کوئی نہ آیا تھا۔ میں یکایک کھل پڑی، دن بھر کے کمھلائے ہوئے پھول
پر جیسے شبنم کے چھینٹے پڑگئے ہوں۔ میں اٹھ بیٹھی۔ مجھ سے ملنے والی
خاتون فوراً ہی آگئیں مگر وہ میری بھابی نہ تھیں، میرا چہرہ پھر مرجھا گیا۔

انھوں نے مسکراتے ہوئے، مجھے ایک خط دیا۔ خط بھابی جان کی طرف
سے تھا۔ مجھے بھائی کے نئے شوالہ میں بلایا تھا۔ میں نے خاتون سے
آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کی۔ وہ مسکراتی ہوئی واپس گئی۔ ماما
میرے سامنے سوالیہ نشان بنی کھڑی تھی۔ مجھ سے آنکھیں بھی نہ چار
کی تھیں تھوڑی دیر میں مولوی صاحب بھی واپس آگئے میں
نے ماما کو اس کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ مولوی صاحب سے بات چیت
کرسکے۔ آخر وہ تھک کر اپنے روز کے معمول سے کچھ دیر میں اپنے گھر چلی
گئی۔ میں آنکھیں بند کرکے سونے کا بہانہ بنا کر پڑ رہی۔ مولوی صاحب
تین دن کے تھکے ہارے جلد ہی سوگئے۔

جب مولوی صاحب کو صبح کی اذان نے مسجد کیطرف کھینچا
میں ایک تیز موٹر پر بیٹھی ہوا سے باتیں کرتی نئے شوالہ کو جا رہی
تھی۔

رکھشا والوں کی سیر

پھول والوں کی سیر گذشتہ زمانہ کی یادگار تھی تو رکھشا والوں کی سیر عہدِ حاضرہ کی لعنت!

رکھشا کی لعنت سنہ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں آئی تھی جو سنہ ۱۹۸۰ء میں یہاں تک ترقی کر چکی تھی کہ رکھشا والوں کی سیر ہر مہینے پھول والوں کی سیر کو مات کرتی تھی،

زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ رکھشا کی بناوٹ میں بھی ترقی ہو گئی تھی اب وہ ابتدائی زمانے سے زیادہ آرام دہ تھی، اُس پر دو آدمی پہلو بہ پہلو آسانی سے بیٹھ سکتے تھے اس کے بعض پیچ اور کمانیاں کھول دینے سے وہ لیٹ جانے کے لئے پورا بستر بن جاتا تھا۔ اب اُسے آدمی کھینچتے نہ تھے بلکہ ہر رکھشا کے آگے سائیکل کے پہیئے تھے جن پر رکھشا والے بیٹھ کر اُنھیں پاؤں سے چلاتے تھے۔ رکھشا والوں کی سیر ہر قمری مہینے کی آخری تاریخوں میں ہوا کرتی تھی جبکہ رات تاریک ہوتی اور دنیا نئے چاند کے انتظار میں۔

نئی دہلی سے آگے دو میل کے فاصلے پر ایک گھنا جنگل تھا جو رکھشا والوں کی سیر کے لئے مخصوص تھا۔ درختوں کے جھنڈ تھے جن کے درمیان چھوٹے چھوٹے قطعے تھے، اِدھر اُدھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھشا کھڑے نظر آتے تھے، دو یہاں۔ چار وہاں اِس طرح سارے جنگل میں ہزار بارہ سو رکھشا پھیلے ہوئے تھے۔ ہر رکھشا کی روشنی بجھا دی جاتی تھی، کیونکہ تاریکی اور سکوت اِس سیر کی خصوصیت تھی۔

دُور سڑک کے کنارے خونچہ والوں کے ٹمٹماتے چراغ نظر آتے تھے جو اِس میلہ پر اشیائے خورد و نوش فروخت کرنے آتے تھے مگر اُنھیں سڑک کے آگے بڑھنے کی اجازت نہ تھی۔

رکھشا کی سیر میں عورت اور مرد بھی شامل ہوتے۔ خصوصاً تین چار سو ڑے چلن کی عورتیں تو ضرور شامل ہوتیں جو سب کی سب نقاب پوش ہوتی تھیں

ایک مرد ایک رکھشا میں بیٹھا ہوا اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ رکھشا والا تاریکی میں آہستہ آہستہ قدم جمائے چلا جا رہا تھا۔ دوسری سمت سے ایک دوسرا رکھشا آیا جس میں ایک عورت برقع اوڑھے بیٹھی تھی۔ رکھشا والوں نے آپس میں اشاروں میں کچھ باتیں کیں اور پھر دونوں رکھشا باہم جوڑ دیئے۔ اُن کی سیٹیں سیدھی کر دیں۔ پردے چھوڑ دئے اور خود کچھ فاصلے پر جا بیٹھے اور لگے بیڑی پینے!

مرد نے سرگوشی کے انداز میں عورت سے پوچھا!

تمھارا نام؟

عورت سکڑ سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے سوچتے ہوئے کہا

میرا نام خاتون ہے۔

مرد نے پوچھا کہاں رہتی ہو تم؟

عورت۔ شہر میں! مگر آپ کا نام؟

مرد۔ یہاں نہ مرد کا نام ہے نہ عورت کا میں جانتا ہوں کہ تم اپنا نام ٹھیک نہیں تبلاؤ گی۔ نہ میں اپنا نام صحیح تبلاؤں گا اور پہلی ملاقات میں تبلاتا بھی کون ہے۔ اجی یہ آپ پیچھے کیوں ہٹ رہی ہیں؛ ایک تو بلا کی تاریکی ہے اس پر ان پردوں نے اندھیرے کو اور بڑھا دیا ہے یہاں تو ہاتھ کو ہاتھ بھی سوجھائی نہیں دیتا اور آپ ہیں کہ خوف زدہ ہو رہی ہیں'

عورت۔ جی ہاں مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔ رات کا وقت۔ خوفناک تاریکی گھنا جنگل۔ میں تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔

مرد۔ اس جنگل میں تم تنہا نہیں ہو۔ سیکڑوں موجود ہیں۔ دیکھو چاروں طرف دُھندلے دھبے سے جو ہیں یہ سب رکھشا ہیں جو چار دانگ ف

پھیلے پڑے ہیں۔ تاریک آسمان پر ستاروں کے دُھندلے نقوش ہیں
ہوا بھی سرسراتی معلوم نہیں ہوتی۔ کسی متنفس کی آواز بھی سُنائی نہیں
دیتی۔ سوائے سرگوشیوں کے جو ہوا کے دوش پر اِدھر اُدھر پھیل کر مِٹ
جاتی ہیں، اور پھر میں جو تمھارے پاس موجود ہوں۔ تنہائی کا تصوّر بھی
کیسا! لو میرے قریب آجاؤ! میری ایک رات کی دلہن!!
عورت۔ (آہ سرد بھرتے ہوئے) افسوس ہے کہ میں کچھ اطمینان اور سکون
نہیں پاتی۔ میرا دل دھڑک رہا ہے اور میں سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہو
مرد۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اِس میدان میں نئی نئی داخل ہوئی ہو
عورت۔ جی ہاں۔ میں رکھشا والوں کی سیر میں پہلی دفعہ ہی آئی ہوں۔
مرد۔ یہی بات ہے! (سرگوشی کے انداز میں) لو اب اِن تمام باتوں کو
بھول جاؤ۔ ہمارے پاس جو تھوڑا سا وقت ہے اُس سے لطف
اندوز ہونا چاہیے (مرد اُسے اپنی آغوش میں کھینچ لیتا ہے)!
رکھشاؤں کے اِس جنگل میں کامل سکوت چھایا ہوا ہے کبھی کبھی سگرٹ کے
سلگانے سے آگ کی ہلکی سی چمک بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔ یا دُور سڑک پر خونچہ
والوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی رکھشا آہستہ آہستہ احتیاط
سے قدم رکھتا ہُوا پاس سے گذر جاتا ہے۔ ایک طلسم زا سکوت مُسلّط ہے،
عورت اور مرد پیار محبّت میں مصروف تھے۔ بوسے تھے، محبّت بھری
باتیں تھیں، عشق و محبّت کی گھاتیں تھیں،
مرد آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔
"میری پیاری ——— خاتون ———! مجھے ساری عمر میں ایسا لطف
کبھی حاصل نہیں ہُوا، جیسا کہ آج تمھاری ملاقات سے ہوا ہے،
تُم اپنا صحیح نام اور پتہ مجھے تبلاؤ، میں تمھارے بغیر اب زندہ نہیں
رہ سکوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اور ہم دونوں کسی جگہ آزادانہ
ملا کریں۔ میں تمھیں حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں
عورت نے کہا۔
"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، میں پھر تم سے نہیں مِل سکوں گی،
شاید پھر اِدھر کبھی نہ آؤں گی!" مرد اصرار کئے جا رہا تھا۔ عورت
انکار پر انکار۔
بالآخر مرد نے رکھشا والے کو آواز دی۔ اور اُس سے سرگوشی کے انداز میں

پوچھا۔ ——————— بھئی کیا تم اِسے جانتے ہو؟
رکھشا والے نے کہا ـــ نا حضور ہم کو معلوم نہیں۔
اور نہ ہی میرے ساتھی کو۔ اُس نے اِسے اجمیری دروازہ کے باہر کھڑے
پایا تھا اور میلہ میں لے آیا۔
مرد نے پوچھا۔ تمھارے پاس بجلی کا ٹارچ ہے؟
ہے حضور ـــ یہ لیجئے۔ رکھشا والے نے کہا۔
مرد نے ٹارچ لے لی اور پھر عورت سے باتیں کرتے ہوئے یکایک اُس پر
ٹارچ کی روشنی ڈال دی۔
روشنی ایک ہلکی سی چیخ کی آواز کے ساتھ بجھ گئی۔ مرد کی گرفت
ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ عورت مرد کے پاؤں پر گری ہوئی سسکیاں لے رہی تھی!
میرے آقا میں لُٹ گئی، میں برباد ہو گئی۔
مرد کا سانس تیز تیز تھا۔ قلب کی حرکت اختلاج کی حد سے گذر
چکی تھی وہ اُس کے دھڑکنے کی آواز سُن رہا تھا۔
میری بیوی!
عورت زار و قطار رو رہی تھی۔
آپ مجھے قتل کر دیں گے! آپ مجھے گھر سے نکال دیں گے!!
مرد نے کہا۔
نہیں میں نے ایک نئی عورت پالی ہے جس سے میں بے خبر تھا۔ تم ہزار
میری آغوش میں تھیں لیکن بجلی کی روشنی میں تمھارے حُسن کو نہ پا سکا۔ افسوس
ہے کہ میں اپنی ملکیت کے جوہر کو نہ پرکھ سکا۔ لیکن اِس تاریکی اور خاموشی میں
تمھارا جوہر پنہاں اور تمھارا حُسن مجھ پر روشن ہو گیا ہے۔
عورت نے روتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں میں واجب القتل ہوں،
میں تمھیں مُنہ دِکھانے کے قابل نہیں۔
مگر مرد اُسے برابر پیار کئے جا رہا تھا۔

یوسف حسن

چار آنے

سہیل عظیم آبادی

باپ کچہری چلا گیا تو ریاض نے اطمینان کی سانس لی۔ جیب میں ہاتھ دے کر چونی ٹٹولی اور مطمئن ہو گیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ کہیں اُس کی ماں خرچ کے لئے پیسے نہ مانگ بیٹھے۔ باپ اپنی جیب میں ہاتھ دے اور چونی غائب پائے۔ مگر اُسے یہ سوچ کر تھوڑی دیر کے لئے اطمینان ہو جاتا کہ باپ کی جیب میں پیسے کافی تھے۔ دوسرے یہ کہ سارے پیسے رشوت کے ہیں۔ پھر بازار سے خریداری کرتے آئے تھے کہاں یاد ہو گا۔ وہ اپنے باپ کی عادت کو جانتا تھا وہ کبھی بھولے سے بھی پیسوں کا حساب نہ رکھتا تھا مگر پھر بھی اُس کا دل خیال ہی سے دھک دھک کرنے لگا کہ کہیں چوری کھل نہ جائے۔ آخری سہارا بس ایک تھا اور وہ یہ کہ اگر کہیں اور کسی طرح چونی کے غائب ہونے کا پتہ چل گیا تو وہ صاف کہہ دے گا کہ معلوم نہیں۔ اور چونکہ کبھی چوری کا الزام اُس پر نہیں لگا اس لئے باپ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لے گا کہ چونی کسی طرح کھو گئی، اور اُسے اپنی بے پروائی پر افسوس آئے گا مگر پھر بھی یہ خیال کہ کہیں پتہ چل گیا، تو ...... خیر نہیں ——

لیکن یہ نوبت ہی نہ آئی۔ اُس کے باپ نے کچہری جاتے وقت اُس کی ماں کو روپئے دئے، ایک ایک پیسہ جیب سے نکال کر گنا اُس نے چونی غائب ہونے کی شکایت نہ کی۔ ریاض کا سارا ڈر مٹ گیا۔ اُس نے سوچا کہ آج خوب مزا آئے گا۔ اسکول میں بڑھیا سے چنیا بادام اور حلوائی سے مٹھائی لے کر کھائے گا۔ دوسرے لڑکے اُس کو رشک کی نظر سے دیکھیں گے جیسے اور روز وہ دوسروں کو دیکھتا ہے۔

اُس نے جلدی جلدی اپنی کتابیں درست کیں اور دروازے سے باہر نکل کر گلی میں آیا۔ بغل میں کتابوں کا بستہ تھا اور ایک ہاتھ جیب میں۔ وہ برابر چونی کو دیکھتا اور سوچتا جا رہا تھا کہ اسے کس طرح خرچ کرے گا کون کون سی چیزیں کھلائے گا اور اس دعوت میں کن کن دوستوں کو شریک کرے گا۔ اب پکڑے جانے کا ذرا بھی ڈر نہ تھا وہ اپنے خیالات میں اُلجھا ہوا۔ گلی سے باہر نکل کر پر آیا۔ بازار میں زندگی پوری طرح دوڑ رہی تھی۔ اُس نے چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا اور سوچنے لگا کہ کون سی چیز خریدی جائے۔ پاس ہی فٹ بال کی ایک دوکان تھی اُس نے ایک فٹ بال کو دیکھا اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا۔ اگر دو روپئے باپ کی جیب سے نکال لیتا تو وہ فٹ بال خرید سکتا مگر.....

اُس نے دل ہی دل میں سوچا ٹھیک ہے۔ لوڈو کا ایک سٹ خریدا جا سکتا ہے، چار ہی آنے کو ملتا بھی ہے، خرید کر اسکول لے جاؤں۔ وہاں سب دوست ساتھی میری خوشامد کریں گے کہ میں انھیں کھیل میں شریک کر لوں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لوڈو خریدنا چاہئے۔ وہ دوکان کی طرف بڑھا مگر...... مگر پھر جب گھر واپس آؤں گا تو کہاں رکھوں گا۔ ماں پوچھے گی۔ باپ کہے گا کہاں سے لائے؟ تو کیا جواب دوں گا۔

اُس کا خیال بدل گیا۔ لوڈو خریدنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ پھر اُس کا دماغ بالکل خالی تھا اور چاروں طرف بازار میں نظریں گھما گھما کر دیکھ رہا تھا۔ یکایک اُس کا ایک ساتھی نصیر آتا ہوا نظر پڑا۔ نصیر بھی دور ہی تھا ریاض نے اُس کو آواز دے کر بلایا۔

نصیر آیا۔ دونوں ساتھی اسکول کی طرف بڑھے۔ نصیر نے پوچھا۔

"اِدھر اُدھر تم کیا دیکھ رہے تھے"؟

ریاض کی نظر یکایک پان والے کی دوکان پر گئی۔ دوکان بڑے سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ پان وغیرہ کے علاوہ بہت سی بوتلوں میں رنگ برنگ کا پانی بھر کر رکھا تھا۔ پھر شربت، سوڈا، لیمونیڈ کی بوتلیں، ریاض کے دماغ میں ایک بات یکایک آ گئی "لیمونیڈ پینا چاہئے"۔ اُس نے نصیر کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا

"یار بڑی پیاس معلوم ہو رہی ہے۔ لیمونیڈ پینا چاہئے" —

نصیر نے جلدی سے کہا۔

"ہاں یار۔ ہم کو بھی پلاؤ گے نا؟"

ریاض نے ذرا مشفقانہ انداز میں کہا۔

"واہ یہ بھی کہنے کی بات ہے؟"

دونوں پان والے کی دوکان پر پہونچے۔ اب سوال یہ تھا کہ لیمونیڈ کی ایک بوتل خریدی جائے یا دو، ایک بوتل میں کیا ہوگا کون پیئے گا اور کون نہیں، ریاض سوچنے لگا۔ لیکن نصیر کو ایک بوتل پلا دیں۔ اُس نے تو کبھی کوئی چیز خرید کر نہیں کھلائی، بڑا کنجوس ہے، مگر بیچارے کے پاس پیسے ہی نہ ہوں گے، کہاں سے کھلائے بیچارہ۔

ریاض نے پان والے سے کہا۔

"دو بوتل لیمونیڈ دو" —

پھر وہ نصیر کی طرف مخاطب ہوا اور بولا۔

"یار نصیر! بڑی پیاس معلوم ہو رہی ہے، تم اپنی بوتل میں سے بھی تھوڑا سا ہمیں دیدینا"

نصیر نے بڑی خوشی کے ساتھ کہا۔

"ہاں یار ضرور"

پان والے نے بوتلیں کھول کر دیں۔ ایک بوتل ریاض نے اپنے منہ سے لگائی دوسری نصیر کو دی۔ ساتھ اتنا کہہ دیا۔

"سب مت پی جانا یار!!"

ریاض نے جلدی جلدی پانی پینا شروع کیا۔ ایسا نہ ہو کہ نصیر ساری بوتل ختم کر دے۔ نصیر نے بھی یہی سوچا۔ جتنا زیادہ پینے کا موقع ملے پی لے ریاض برابر تیزی کے ساتھ پیتا گیا۔ لیکن نصیر آدھی بوتل ختم کر کے آہستہ آہستہ پینا شروع کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ پی لے۔ مگر پھر بھی کچھ چھوٹ جائے ورنہ ریاض خفا ہو جائے گا۔ پھر کبھی کوئی چیز نہ کھلائے گا۔ ریاض نے جب اپنی بوتل خالی کر دی تو نصیر نے بادلِ ناخواستہ بوتل ریاض کی طرف بڑھا دی۔ بوتل میں ایک چوتھائی پانی موجود تھا۔ لیکن ریاض نے بوتل لیتے ہوئے کہا۔

"سب پی گئے نا یار!"

"کہاں تو، آدھا بھی تو نہیں پیا —"

ریاض نے زیادہ بحث نہیں کی۔ بوتل میں جتنا لیمونیڈ بچ رہا تھا اُسے پی گیا۔ اس کے بعد بوتل پان والے کو دے دی۔ اور جیب سے چونی نکال کر دی۔ پان والے نے دوآنی واپس کر دی۔ ریاض نے دوآنی لے کر پھر اُسے واپس کر دی اور بولا۔

"ہمیں پیسے دے دو —"

پان والے نے دوآنے پیسے دے دئے۔ ریاض نے پیسے جیب میں رکھے۔ دونوں ساتھ ساتھ اسکول کی طرف چلے۔ ریاض راستہ میں ہر چیز کو ایک خاص نظر سے دیکھتا جا رہا تھا۔ اگر اُس کا بس چلتا تو سارے بازار کو خرید لیتا۔ لیکن یہ بات اُس کے بس سے باہر تھی۔ ایک تو پیسے کم، دوسرے چوری کھلنے کا ڈر۔ بلکہ چوری کھلنے کا ڈر اُسے اتنا زیادہ تھا کہ دوآنے میں سارا بازار مل جاتا، تو بھی وہ نہ خریدتا۔

ریاض جب اسکول پہونچا تو دیر ہو چکی تھی۔ مار کھانا ضروری تھا۔ ریاض اور نصیر دونوں اسکول کے پیچھے ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر سوچنے لگے کیا کرنا چاہئے۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ آج اسکول سے غیر حاضر، دو تین گھنٹے کی بات ہے۔ سنیچر کا دن ہے، سویرے ہی چھٹی ہو جائے گی گھر چلے جائیں گے۔ سوموار کے دن ایک درخواست لیتے آئیں گے اس پر باپ کے جعلی دستخط بنا لیں گے۔ دونوں کا اطمینان ہو گیا۔ وہ دونوں پھر اسکول کے احاطے سے نکلے اور بازار کی طرف چلے۔

بازار میں پوری رونق تھی۔ ریاض کی نگاہیں ہر طرف بھٹکنے لگیں، اُس کا دل بڑھا ہوا تھا، وہ چاہتا تھا کہ پسند کی کوئی چیز نظر آئے۔ اس کی جیب میں دوآنے پیسے تھے وہ سارے بازار میں اپنے کو کسی سے کم حیثیت میں بھی نہ سمجھتا تھا۔ ہر چیز کو خرید لینے کے لئے اُس کا دل چاہتا تھا مگر دو مجبوریاں تھیں، ایک تو یہ کہ پیسے کم تھے۔ دوسرے کوئی ایسی چیز خریدنے پر کسی حال میں بھی آمادہ نہ تھا جس کو دیکھتے ہی اس کے ماں باپ سوال کر بیٹھیں کہ یہ کہاں سے لے آئے۔

وہ بازار میں چلتا گیا۔ نصیر اُس کے ساتھ تھا۔ بغل میں کتابوں کا بستہ تھا اور دو کانوں پر نگاہیں، ہر چیز کو وہ ایسی نظر سے دیکھتا جا رہا تھا جیسے ہر چیز کے متعلق اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن پاؤں کہیں نہیں رکتا تھا۔ اُس کے پاؤں تھکنے لگے۔ تو وہ ایک بڑی دوکان کے پاس رک گیا۔ ایک اطمینان کی سانس لی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

یکایک اُسے پکوڑیوں والا نظر آیا۔ معلوم ہوا جیسے ریاض کو وہ چیز مل گئی جس کی اُسے بہت دیر سے تلاش تھی۔ نصیر کا اُس نے ہاتھ پکڑا اور تیزی

کے ساتھ اُس طرف بڑھا۔ نصیر اُس کے ساتھ کھنچتا چلا۔ آخر دونوں پکوڑی
والے کے چبوترے کے پاس پہونچ گئے۔ ریاض نے ایک خاص انداز سے
پوچھا۔

"کیوں جی پکوڑیاں تازہ ہیں نا؟"

"ہاں بابو جی ——"

بوڑھے پکوڑی والے نے جواب دیا۔ ریاض نے شان کے
ساتھ کہا۔

"دو ایک ایک پیسے کی۔"

بوڑھے نے دونوں کو ایک ایک پیسہ کی پکوڑی دی، دونوں نے
کھائی، ریاض کا دل نہ بھرا۔ اُس نے کہا۔

"ایک پیسے کی اور دو ——"

بوڑھے نے دی نصیر اُس کا مُنہ دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں
شکایت تھی۔ اس نے کہا۔

"کیوں یار اکیلے ہی کھاؤ گے؟"

ریاض نے کہا۔

"نہیں یار ——"

اور پانچ پکوڑیوں میں سے دو نصیر کو دیدیں۔ دونوں نے کھائیں مگر
دل کسی کا نہ بھرا۔ ریاض نے ایک پیسے کی پکوڑی اور بھی خریدی۔ دو پھر نصیر کو
دیں۔ اُس نے شکایت کی۔

"یار ہم کو کم دیتے ہو ——"

"پیسہ جو ہم خرچ کرتے ہیں ——"

ریاض نے ذرا شان کے ساتھ کہا۔ نصیر چپ ہوگیا لیکن ریاض کو نصیر
کا اعتراض بُرا معلوم ہوا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ حد درجہ ناشکرا آدمی ہے،
کھلاتا ہوں، اُلٹی شکایت کرتا ہے۔ خود کبھی کچھ کھلاتا نہیں۔ اُس کا دل تھا
کہ اور بھی کچھ کھائے مگر وہ آگے بڑھا۔

اب اُس کی جیب میں چار پیسے رہ گئے تھے۔ مگر گھر پہونچنے سے
پہلے وہ سب کو خرچ کر دینا چاہتا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ جیب میں پیسوں کی آواز
ہو اور ماں باپ کوئی پوچھ بیٹھے۔ وہ اور آگے بڑھا اُس کا گھر بھی نزدیک
آتا جا رہا تھا وہ سخت پریشان تھا کہ ان پیسوں کو کس طرح خرچ کیا جائے

یکایک اُس کے دماغ میں بات آئی۔ پان کھانا چاہیے۔

دونوں پان کی دوکان پر پہونچے وہاں پان بنانے کو بھی کہہ دیا۔ پان
والا پان بنانے لگا تو خیال آیا کہ ماں مُنہ لال دیکھ کر پوچھے گی، پان کہاں
کھایا۔ اُس نے نصیر سے اپنی رائے کہہ دی۔ مگر نصیر کا دل چاہ رہا تھا اُس
نے سمجھایا کہ پان والا نہ مانے گا۔ دوسرے گھر جانے سے پہلے کلی کر کے مُنہ
دھولے گا۔ لیکن ریاض کی رائے سگریٹ پینے کی ہوئی۔ آخر دونوں نے پان
کھایا اور سگریٹ بھی خرید کر پینے گئے۔ انجن کی طرح بھک بھک دھواں
مُنہ سے چھوڑتے آگے بڑھے۔

تھوڑی دیر میں سگریٹ ختم ہوگیا۔ اسکول کا وقت بھی پورا ہوگیا،
ریاض کو جلد گھر پہونچنے کی فکر ہوئی۔ دیر ہوئی اور ماں نے سوالوں کی بوچھار سے
بدحواس کر دیا۔ وہ سگریٹ کا دھواں اُڑاتا ہوا سیدھا گھر کی طرف چلا۔ کبھی
وہ پوری شان کے ساتھ دھواں مُنہ سے چھوڑتا اور کبھی ڈر جاتا کہ کوئی بڈھا
بوڑھا دیکھ نہ لے اگر کسی نے شکایت کر دی تو مار کھانا ضروری ہے۔

اس طرح وہ اپنے مکان جانے والی گلی کے قریب پہونچ گیا۔ یکایک
اُس نے سگریٹ کو پھینک دیا۔ اب اُس کے گھر پہونچنے کا وقت ہو چکا تھا،
وہ تیزی سے بڑھا لیکن پان یاد آگیا وہ پانی کے نلکے پر کھڑا ہو کر مُنہ دھونے
لگا۔ خوب اچھی طرح دھویا، اُس کو مُنہ دھونے کا بے حد افسوس ہو رہا تھا مگر وہ
دھوتا رہا۔ مُنہ دھو کر ہٹا۔ اور گھر کی گلی کی طرف بڑھا۔ نصیر نے مُنہ نہیں دھویا
شاید اُسے کوئی ڈر نہ تھا۔ دونوں دوست الگ ہوگئے۔ ریاض گھر کی گلی میں گھسنا
ہی چاہتا تھا کہ یکایک اُسے یاد آگیا۔ دو پیسے ابھی اور باقی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ
یہی بھانڈا پھوڑ دیں، وہ بہت گھبرایا کہ ان پیسوں کو کس طرح خرچ کیا جائے
وقت بھی کم ہے۔ نصیر بھی جا چکا نہیں تو اُسی کو دے دیتا کہ رکھ دے۔ آس پاس میں
کوئی چیز بکتی بھی نہیں رہی تھی وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اُس کو
بار بار خیال آتا تھا کہ انہیں بھی خرچ کیوں نہ کر دیا۔ مگر اب کیا ہو!
وہ گلی کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا اور کوئی بات اُس کے دماغ میں نہیں آرہی تھی وہ بہت
گھبرایا ہوا تھا۔ وقت پر اُسے گھر پہونچ جانا چاہیے۔ یکایک ایک بڑھیا
دکھائی دی ریاض کو جیسے کوئی کھوئی ہوئی بات یاد آگئی وہ تیزی کے ساتھ بڑھیا کے
پاس پہونچا اور اُس کو جھنجھوڑ کر پوچھا "بڑھیا پیسے لے گی" "جیتے رہو بیٹا..." اُس نے ہاتھ
پھیلا دیا۔ بڑھیا دعائیں دینے لگی لیکن ریاض نے سنا تک نہیں۔ اُس نے دو نوں پیسے

رنڈی

خواجہ محمد شفیع دہلوی کا ایک شاہکار

بجلی آکاش کا سینہ چاک کر رہی تھی، جذبات میرا دل چیرے ڈالتے تھے، ابر پریم رس برسا رہا تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے تھے۔ دنیا پر سیاہ کاری، میرے دل کو جذبات کے دھوئیں نے گھیر رکھا تھا۔

برسات تھی بلبل کو گل کی تلاش تھی، شمع پروانہ کے لئے جل رہی تھی، سرو سر اُٹھائے قمری کو دیکھ رہا تھا میری طرف بھی بھونرے نے دیکھا۔ مدھو بانسری سُنائی، میں مست متوالی اس کے ساتھ ہولی، اس نے ایک ڈنک مارا، رس چوس لیا میری رگ رگ میں زہر سرایت کر گیا۔

برسات کا موسم تھا۔ ابر جھوم جھوم کر آتا تھا۔ زمین پر بوند پڑتی تھی یہ خاک کی دیوی اپنا سینہ چاک کر لعل اُگل دیتی اور بوند کے لئے جگہ بناتی تھی، نہ لعل رہتے نہ بوند، پھر وہی خاک کی خاک۔ برسات تھی پروانے شمع پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔ نہ چیونٹی رہی نہ پر،

بلبل گل کی طرف بڑھا، اُس نے سینہ چاک کر کے خیر مقدم کیا، بلبل ہری چگ تھا۔ چلتا ہوا۔ پھول کملا گیا۔ مر گیا۔ خاک میں مل گیا۔

سورج مغرب کی طرف بڑھا۔ مغرب نے اپنا خون اُس کے قدموں میں چھڑکا۔ اُس شوخ گرم گرم کو سینہ سے لگا لیا۔ سورج رات کی رات وہاں رہا۔ پھر مشرق سے جا نکلا۔ یہی لیل و نہار ہے۔ یہی روز و شب کی داستان۔

اب میں سرِ راہ سُلگتی ہوئی انگیٹھی ہوں، سرد مہر راہ گیر ہاتھ سینک کر جاتے ہیں۔ میں جلتی رہتی ہوں۔

میں ایک سڑک ہوں شارع عام۔ مجھ پر سے دنیا گذرتی ہے۔ لوگ روندتے ٹھکراتے، خاک اُڑاتے چلے جاتے ہیں۔ اور میں تنہا پڑی رہتی ہوں، جب میلے تماشے ہوتے ہیں زیادہ ٹھکرائی جاتی ہوں۔ دنیا کی عید میرے لئے عذاب ہے، راہ رو میرا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ آرام پاتے ہیں اپنی راہ چلے جاتے ہیں، میں خس و خاشاکِ سرِ راہ ہوں۔ مسافر سلگاتے ہیں۔ ہاتھ تاپتے ہیں اور مجھے جلتا چھوڑ جاتے ہیں۔ میں اپنی چنگاریاں ہوا میں اُڑا کر جنگل بھر پھونک دیتی ہوں، دنیا مجھے بُرا کہتی ہے اور آگ لگانے والا ہاتھ کہیں اور آگ لگانے معصومانہ چلا جاتا ہے۔

ایک الاؤ میں دو اینٹیں پکی ہیں۔ ایک گندی موری میں لگتی ہے دوسری قصر شاہی میں، ایک پھول کی دو پتیاں ہیں ایک نوشاہ کے سہرے میں جگہ پاتی ہے دوسری بوالہوس بدمستوں کے گھٹنوں کے نیچے پس کر سیجوں پر دم دیتی ہے۔ ایک ابر سے دو قطرے ٹپکتے ہیں ایک سیپی کی حفاظت میں موتی بن جاتا ہے دوسرا موجوں کی ٹھوکروں میں پامال ہو جاتا ہے۔ قطرہ بے بس ہے، حادثات کارساز و کارفرما۔

بیک وقت دنیا دو لڑکیاں دیتی ہے زمانہ ایک کو ماں بناتا ہے دوسری کو رنڈی ؎

در کوئے نیک نامی مارا گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

میں ماں بننے آئی تھی رنڈی بن گئی۔ امرت تھی زہر بنا دی گئی گھر تھی گھر والی تھی سرا بن گئی اور سرا کا بستر۔ ایک مرد نے مجھے تباہ کیا۔ میں اس نسل کو تباہ کر رہی ہوں۔ مرد میرا کھلونا ہیں۔ کٹھ پتلیاں کاٹھ کے گڈے، کاٹھ کے اُلو، میں دوست کو دوست سے لڑا دیتی ہوں بھائی کو بھائی سے۔ میرے لئے بیٹا باپ کا مرنا چاہتا ہے۔ میاں بیوی کا زیور چُرا لاتا ہے، میری آنکھوں میں نشہ ہے اور میں دنیا بھر کے مردوں کو

بدست بنارہی ہوں۔ میں رنڈی ہوں رنڈی، اگر بھنگن کو بھنگن کہو تو خفا نہیں ہوتی رنڈی کہو تو بگڑ بیٹھتی ہے۔

میری بہنیں مجھے ذلیل سمجھتی ہیں۔ ذلیل اُن کے عزت والے باپ ہیں، بھائی ہیں، میاں ہیں، جنھوں نے مجھے ذلیل بنایا۔ میں اُن کو ذلیل کرتی ہوں۔ اُنھوں نے میری زندگی تباہ کی میں ان کی دنیا تباہ کرتی ہوں، اُنھوں نے مجھے رنڈی بنایا۔ میں رنڈی بنی۔ قانونِ قدرت نے اُن کو اسی رنڈی کا غلام بنایا۔ اسی ذلیل کے ہاتھوں اِن مصنوعی عزت داروں کو ذلیل کرایا۔

چاہ کن   را چاہ درپیش

مرد میری بیماریوں سے ڈرتے ہیں، پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ مگر رکھتے ہیں۔ پچھتاتے ہیں، پھر آتے ہیں۔ میری آنکھوں میں ناگن کی سی کشش ہے۔ بھنگا آنا نہیں چاہتا پر آتا ہے۔ کبھی میں بھنگا تھی مجھے ایک سانپ نے ڈسا۔ اب میں ناگن ہوں اور بنی نوع مرد کو ڈستی ہوں۔

برسات آئی پیاسی زمین نے پانی پیا، میں دُکھیاری پیاسی

ہی رہی۔ لوگ آئے بوتلیں سُنڈھائیں۔ جنگلوں میں گئے۔ باغوں میں پہونچے، سب ہنسنے میں بھی ہنسی، زخم پھٹ پڑے، دنیا ہری بھری تھی۔ میرے زخم بھی بھرے، اِس کسک میں مزہ تھا۔ میں دیوانوں کی طرح ہنس رہی تھی، دنیا خوش تھی کہ میں خوش ہوں، میں خوش تھی کہ دنیا کو اندھا بنا رہی ہوں۔ کبھی میں مردوں کا تختۂ مشق تھی، آج مرد میرے تختۂ مشق ہیں۔

مجھ پر ایک خول چڑھا ہے، لوگ اِس خول تک رسائی پاتے ہیں اور خوش خوش چلے جاتے ہیں۔ کسی کے ہونٹ میرے رخساروں تک نہیں پہونچتے۔ میرے رخساروں پر سُرخی پاوڈر۔ کریم۔ فاوٴنڈیشن کے ردّے رکھے ہیں میرے ہونٹوں کی حفاظت کس پروف لپسٹک کر رہی ہے۔ میرے دل اور دماغ پر انتقام کا خول چڑھا ہے، نہ کوئی میرے ہونٹوں تک رسائی پا سکتا ہے نہ دل تک، طلبگار ظاہری میرے پاس آتے ہیں ظاہر پرستی کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں ایک حساس بانسری ہوں جو دور کے سانسوں سے بجائی جاتی ہے۔ دست کے ہونٹوں سے

ناآشنا دنیا سمجھتی ہے کہ یہ زیر و بم اس کی عنایت سے ہے۔ دنیا اندھی ہے پر خوش ہے کاش میں بھی اندھی ہوتی۔

دُنیا کو میرا گانا پسند ہے۔ دنیا کی نظروں میں میری حقیقت گرامو فون ریکارڈ سے زیادہ نہیں۔ دنیا نہیں جانتی کہ ریکارڈ کے سینہ میں سوئی چبھتی ہے جب نغمہ پیدا ہوتا ہے اس رو سیاہ کے دوران سر پر دنیا سر دھنتی ہے۔ یہ عصمت دریدہ ٹوٹا ہوا پیالہ لئے دنیا کے میلے میں بھیک مانگ چکی۔ یہ گوشت کی گڑیا کھیل چکی کھلا چکی۔ اپنی ایک بھول کا بدلہ دے بھی چکی لے بھی چکی یہ دریا کی بہتی ہوئی بٹیا امواج کا اتار چڑھاوٴ دیکھ چکی۔ یہ شمع رات کی گرم جوشی بھی دیکھ چکی اور صبح کی سرد مہری بھی۔ یہ سیپی آبرو لوٹ بھی چکی لٹا بھی چکی اب سکون کی طالب ہے۔ میلے کی ناچنے والی تھک گئی۔ تماشائی چلے آتے ہیں۔ یہ گردش کب ختم ہوگی یہ چکر کب نکلے گا۔

خوفناک وادی

عربی زبان کے بہترین فسانہ نگار لطفی منفلوطی مصری کے ایک شاہکار فسانہ کا ترجمہ

یہ ہماری . . . خوش قسمتی ہے کہ حضرت مہدی جعفری مچھلی شہری لطفی منفلوطی مصری کے افسانوں کا ترجمہ ایشیا کیلئے بڑی محنت سے کر رہے ہیں۔ مہدی جعفری صاحب عربی زبان کے مشہور عالم ہیں۔ ان کے مضامین مصر کے رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان کو عربی دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل ہے ہمارے اصرار سے انھوں نے اُردو میں عربی شہ پاروں کے تراجم کا بیڑہ بھی اٹھایا ہے۔ ایشیا کے آئندہ پرچہ میں ہم ان کا ایک تحقیقی مقالہ "اقبال نامۂ جہانگیری" اور اس کا مصنف" شائع کریں گے۔ اقبال نامۂ جہانگیری کا چوتھا حصہ برٹش میوزم نے شائع کیا ہے۔ مہدی صاحب کے قلمی کتب خانہ میں اس مشہور کتاب کے چاروں نسخے ہیں۔ وہ انھیں ہمارے لئے بڑی محنت سے ایڈٹ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ عربی شاعری بالخصوص جدید اور انقلابی شاعری کا ایک جامع انتخاب بھی تیار کر رہے ہیں۔ غالباً ہم آئندہ نمبر سے اس کا سلسلہ بھی شروع کر سکیں گے۔

عربی زبان کے شہ پاروں کے تراجم کے علاوہ ہم نے دوسری زبانوں سے بھی براہ راست ترجمہ کا انتظام کیا ہے۔ ڈاکٹر اختر امام ایم اے، پی، ایچ ڈی (بون)، جو ابھی جرمنی سے چار برس بعد واپس آئے ہیں ہمارے لئے جرمن ادب کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ سید فرید جعفری مچھلی شہری جن کے طبعزاد افسانے ترقی پسند دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل کر رہے ہیں، اطالوی زبان خوب جانتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے اطالوی ادب سے براہ راست ترجمے کر رہے ہیں نیز مرفیق قدیم اختر حسین رائے پوری سے اُمید ہے کہ وہ ایشیا میں سنسکرت اور فرنچ ادب کے ترجمے شائع کرنے کا موقع پیدا کرینگے اختر صاحب ابھی دنوں پیرس سے سنسکرت میں ڈی لٹ کی ڈگری لیکر آئے ہیں۔

اڈیٹر

زندگی کی گھڑیوں کا اتار چڑھاؤ بڑھنا گھٹنا حیرت خیز ڈرامہ ہے!

میری زندگی بہت طول طویل نہیں ہوئی، میں اس دنیا میں صرف ایک سال زندہ رہا ہوں اور وہ سال بھی اس طرح گذر گیا۔ جس طرح دمدار ستارہ آسمانِ عالم پر ایک رات میں گذر جاتا ہے پھر اس کے بعد لوگ اسے نہیں دیکھ پاتے۔

میں نے اپنی زندگی کا ایک حصّہ ایک ایسے دوست کی جستجو میں گزارا، جو اپنے رفیقوں اور دوستوں کو ایسی نگاہ سے دیکھے جو کسی سوداگر نے والے کی ان آنکھوں کے مشابہ نہ ہو جو متاع پر پڑتی ہیں، اور نہ وہ کسی کھیتیر کی ان آنکھوں کے مماثل ہو جو وہ اپنے چوپایوں پر ڈالتا ہے۔ لیکن میری یہ تلاش تمنا ختم نہیں ہوئی تھی کہ بارہ سال کے بعد ایک شخص سے میری شناسائی ہوئی میں نے اس شخص میں وہ چیز پائی جس کا میں متلاشی تھا۔ یعنی میں نے انسانی لباس میں بھلائی اور احسان کا ایک پیکر پایا، جو مکمل انسانیت کی تصویر تھا جس کی پیشانی میں مجھے ایک نور کی چمک معلوم ہوتی تھی، چنانچہ وہ میری نظر میں کھب گیا اور میرے دل میں اس کی ایسی منزلت ہوئی کہ اس سے پہلے کسی کی ایسی منزلت نہیں ہوئی تھی۔

پھر مجھ میں اور اس میں کدورتوں سے پاک اور خلوص و صداقت سے بھرے ہوئے تعلقات استوار ہو گئے۔

لیکن ہم دونوں کی یہ موافقت زمانہ کو نہیں بھائی، اور مجھے گردشِ افلاک سے اپنی قیام گاہ چھوڑنی پڑ گئی، جس وقت میں مصر سے مسقط کو کوچ کر رہا تھا میرے دل میں اس شریف دوست کی جدائی کے سوا کسی چیز کا قلق نہیں تھا، مجھ کو صرف اسی کے چھوٹنے کا افسوس تھا۔

اس کے بعد ہم دونوں میں ایک عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی، پھر میرے پاس اس کے خط کے تسلسل میں رکاوٹ ہونے لگی، یہاں تک کہ بالکل ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھ کو اس قطع تعلق سے بھی بڑا ملال ہوا اور طرح طرح کے گمان اور شبہے اس کے بارے میں میرے جی کو ہوئے مگر اس کی محبت و وفا میں کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔ بار بار دل میں ایک ہوک اٹھتی تھی کہ اس کے پاس پہنچ کر دریافت حال کروں اور یہ فکر بُری طرح میری طبیعت میں گھر کرنے لگی۔ یہاں تک کہ میرا رنگ بدل گیا۔ مگر مصر لوٹنے کی نوبت سات برس کے بعد نصیب ہوئی۔

مصر کی سرزمین پر اترتے ہی سب سے پہلے دل کی تمنا ہوئی کہ اس سے ملاقات کروں، چنانچہ فوراً میں رات ہی کے وقت اس کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر جو نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آیا آہ! اس کی حسرتناک یاد آج تک میرے دل کو مسوس ڈالتی ہے۔

میں اس مکان کو ایک چھوٹا سا بہشت بنا ہوا چھوڑ گیا تھا، جس میں مختلف قسم کی خوش نصیبیاں اپنی جلوہ ریزیوں سے دلوں کو لبھا رہی تھیں اور وہاں کے رہنے والوں کے رخسار مسرتوں اور خوشیوں سے کھلے جا رہے تھے، پر آج اس کی بہاریں یوں لٹ گئی ہیں کہ مجھے یہ خیال و احساس ہو رہا ہے گویا میں ایک تاریک اور بالکل سنسان مقبرہ کے سامنے کھڑا ہوا ہوں اس لئے کہ ہر طرف ایک سناٹا چھایا ہوا ہے نہ تو کوئی آواز سننے میں آ رہی ہے اور نہ اس کے کسی گوشہ میں کسی کی صورت دکھائی دے رہی ہے، روشنی کی ہلکی سی کرن بھی کہیں معلوم نہیں ہوتی۔

ان حالتوں سے مجھے ایک شبہ سا بھی ہوا کہ میں کہیں اپنے دوست کا مکان بھول تو نہیں گیا یا اسے سامنے چھوڑ آیا ہوں۔

میرے دل میں یہی خیالات آ رہے تھے کہ کانوں میں ایک چھوٹے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی روشن دان سے دھندلی سی روشنی بھی معلوم ہوئی۔ میں نے دروازہ کی طرف بڑھ کر کھٹکھٹایا پر کوئی جواب نہیں ملا، میں نے پھر دوبارہ کھٹکھٹایا۔ اس پر مجھے دروازہ کی دراز سے روشنی ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر چند لمحے بعد ایک چھوٹے سے لڑکے کی شکل بالکل پھٹے ہوئے کپڑوں میں، ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہاتھ میں لئے ہوئے میرے سامنے آئی، مجھ کو چراغ کی روشنی سے اس لڑکے کے چہرہ میں اس کے باپ کی شکل نظر آئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ چھوٹا سا ننھا وہی بچہ ہے جو کل اس گھر کی زینت اور اس عالم کے آسمان کا چاند تھا۔

میں نے اس سے اس کے باپ کو پوچھا تو اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا، اور مجھے روشنی لیکر چلا جب وہ مجھ کو لے کر ایک ایسے صحن میں پہنچا، جہاں کوڑا کرکٹ، گرد و غبار کے ڈھیر تھے نشست کی چیزیں اور پردے میلے کچیلے بوسیدہ پھٹے ہوئے تھے۔ اگر وہ نقش و نگار جنہیں میں پہلے سے پہچانتا تھا اور جو ہتھیلی کی مٹی ہوئی لکیروں کی طرح اب صرف بعض دیواروں پر باقی رہ گئے ہیں نہ ہوتے تو میں نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ وہی صحن ہے جس میں ہم نے عیش و مسرت کی بارہ چاندنی راتیں گزاری ہیں۔

119

پھر مجھ سے اور اس لڑکے سے مختصر سی گفتگو ہوئی اور میں نے اس کو پہچنوایا کہ میں کون ہوں اور دریافت کیا کہ کیا تمہارے باپ ابھی تک مکان واپس نہیں آئے؟ اور وہ کب لوٹتے ہیں۔

وہ بغیر کچھ جواب دیئے ہوئے مجھے چھوڑ کر چلا گیا، اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر کہنے لگا:

میری ماں آپ سے چند باتیں ابا جان کی بابت کہنی چاہتی ہیں۔

یہ سنکر میرے دل میں ایک رعب اور خوف کی لرزش پیدا ہوئی اور مجھے ایک نامعلوم فتنہ کا احساس ہوا، پھر میں نے جو نظر اٹھائی تو دیکھتا ہوں کہ ایک عورت سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی دروازہ کے بازو سے ملی ہوئی کھڑی ہے۔ میں نے اُسے سلام کیا، اس نے اسکا جواب دے کر مجھ سے پوچھا!

کیا آپ کو علم ہے کہ آپ کے جانے کے بعد زمانہ نے اس شخص کے ساتھ کیا کیا؟

میں نے جواب دیا: بالکل نہیں، یہ پہلا دن ہے کہ میں سات برس کی جدائی کے بعد آج اس شہر میں قدم رکھ رہا ہوں۔

ایشیا

اس نے کہا آہ! کاش آپ نے اس شخص کو نہ چھوڑا ہوتا تو آپ ان کو بچانے والے ہوتے اور ان کو ہر بُرائی سے روکے رکھتے، آپ کے جاتے ہی ایک شیطانی گروہ نے ان کو اپنے نرغہ میں لے لیا آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ وہ ایک سادہ لوح، ناتجربہ کار جوان تھے، دن بدن برائیاں لپٹتی گئیں اور وہ ان کے بہکاوے میں آتے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان کا شکار ہو کر رہ گئے اور ہم سب بھی اس بدنصیبی میں پائمال ہو گئے، جو آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔

میں نے پوچھا، عزیز بہن! برائی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اور وہ کون لوگ ہیں جن کے نرغہ میں وہ آ گئے ہیں، اور انھوں نے اُن کو بیکار بنا دیا ہے؟

اس نے کہا، میں ساری کہانی آپ کو سناؤں گی۔ سنئے:۔

ایک اچھے آدمی ہونے کی وجہ سے ان کا اپنے دفتر کے ایک رئیس سے میل جول ہوا۔ اور اس دوستی کا رشتہ اتنا بڑھا کہ وہ رئیس کے بہت گہرے دوست ہو گئے، وہ لوگ بھی ان کی مجلس کو چاہے وہ کہیں ہوں نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کے پیچھے صبح و شام ان لوگوں کی جوتیوں کی آواز سنائی دیتی تھی، کچھ دن کے بعد میرے شوہر کے برتاؤ میں تبدیلی نظر آنے لگی اور اس کی عادتیں ناپسند صورت اختیار کرنے لگیں وہ اپنے گھر اور بال بچوں سے کچھ کٹے کٹے سے رہنے لگے اور ہمیں گھنٹہ بھر یا آدھ گھڑی اپنی شکل دکھلاتے، مکان میں صرف رات کے پچھلے پہر آتے۔

میرے دل میں اس برتاؤ کے آغاز سے ایک غم کی آگ لگ گئی کہ کون سی ایسی خطا ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے انکی آنکھ سے یہ سارا گھر اتر گیا۔

میں ان کی بہتری اور بھلائی کی اور اس راہ سے جس کی وحشت غلجان بنی ہوئی تھی اور جو مجھ سے قطع تعلق کرنے اور ان کی نظروں کے پھیر دینے کا باعث ہو گئی ہے اور گھر کی یا بچوں کی حالتوں سے بے پروا بنا دینے کا سبب بنی ہے اس سے ان کی نجات کی دعائیں کیا کرتی۔

کہ ایک رات کو وہ درد سے بے چین بکتے ہوئے اور گلے میں سانس کو گھونٹتے ہوئے لہولہان زخمی لوٹے۔ میں انھیں نڈھال دیکھ کر ان کے نزدیک آ گئی تو ان کے منہ سے شراب کی باس میری ناک میں پہنچی پھر میں ہر چیز کو سمجھ گئی یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ اسی بڑے رئیس کی ریاست کی پیروی کا یہ کھیل ہے جس کی ریس بھلائی اور برائی میں کی جاتی ہے۔

میرے جوان کمزور طبیعت سادہ لوح شوہر پر برائی کا رنگ چڑھا اور اس نے خراب راہ اختیار کی۔ میں جو یہ سمجھے ہوئے تھی کہ رئیس ان کو اپنا دوست بنائے ہوئے ہے غلط تھا بلکہ وہ ان کو ندیم بنائے ہوئے تھا۔

پھر میں نے ان کی ساری پیاری چیزوں کے وسیلے دے دے کر اور ان کے سامنے زار و قطار رو رو کر وہ آنسو بہا بہا کر جو ایک امیدوار آنکھیں بہا سکتی ہیں ان سے کہا کہ خدا کے لئے اپنی اُس پہلی زندگی کی طرف لوٹ آیئے جس میں آپ اپنے گھر والوں کے درمیان مسرت و خوشی سے جیتے تھے۔ لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

اس کے بعد مجھ کو یہ بھی پتہ چلا کہ جو ہاتھ شراب کی طرف بڑھتا ہے وہ جوئے کی جانب بھی پھیلتا ہے۔ مجھ کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی اس لئے کہ میں جانتی بھی تھی کہ بدی کا صرف ایک ہی راستہ ہے جو اس سے آشنا ہوا پھر ممکن ہی نہیں کہ وہ گرے اور انتہا تک نہ پہنچ جائے۔

اُف وہی شریف، معزز جوان جو کل ایسی دوا کے پینے سے بچتا تھا جس میں اس کو شراب کی بو معلوم ہوتی تھی اور وہ ایسی مجلس میں بیٹھنے سے شرماتا تھا جس میں شرابی ہوا کرتے تھے، آج پیو کڑ جوئے کا لتی اور اپنی ان دونوں حالتوں میں بے باک ہو گیا ہے اور اب نہ تو اس کو آرائش کا شوق ہے اور نہ اپنی ستر پوشی کا کچھ خیال، شرمناک کام اور گناہ کی باتوں سے اس کو کچھ ڈر بھی نہیں رہا۔

وہ رحمدل باپ، اور قابل عزت شوہر جو کل اپنی اولاد پر ایک کنکری کے گرنے اور تھوڑی سی دھول لگ جانے کو گوارا نہیں کر سکتا تھا اور جس کو اپنی زوجہ پر دھوپ کی تیزی بھی تکلیف دینے لگتی تھی آج سخت اور کھرا باپ، بے رحم اور جابر شوہر بن گیا، وہ اپنے بچوں کو جب اس کے قریب وہ آتے ہیں مارتا ہے، اپنی زوجہ کو دیکھ کر گالیاں اور جھڑکیاں دینی اس کی خصلت ہو گئی ہے۔

وہ غیرت مند انسان جو اپنی ناموس اور عزت پر کسی قسم کی آنچ نہیں آنے دیتا تھا۔ اس کی یہ حالت ہو جائے کہ رات میں اپنے بدالمواد ساتھیوں کے جھرمٹ میں گھر لوٹ کر آئے، پھر انھیں لے کر اس حصہ میں لائے جہاں میں اور میرے بچے سوتے ہوں اور اسی کے کسی کمرہ میں محفل جما کر شراب پی پی کر تالیاں بجائی جائیں اور خوب بدمست ہو کر ناچیں اور ساری فضا کو چیخوں سے بھر دیں۔

پھر ایک دوسرے کے پیچھے برآمدوں اور دالانوں میں دوڑیں۔ یہاں تک کہ میرے کمرہ کے دروازہ میں گھس آئیں اور بارہا ایسا ہوا کہ وہ بیہودے میرے آس پاس آکر میرے چہرہ سے میری چادر میرے شوہر کے دیکھتے اور سنتے کھینچیں اور وہ کچھ نہیں بولتے اور نہ اسے ناپسند بات سمجھتے، میں ان لوگوں کے سامنے سے دوسری جگہ چلی جاتی اور کبھی بالکل ہی مکان چھوڑ دیتی۔ ایک مرتبہ بالکل برہنہ اندھیری رات کے پردہ میں نکلنا پڑا، اور اپنی ایک عیسائی پڑوسن کے مکان میں بقیہ رات گذاری۔

وہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ اس کی آواز بھرّا اٹھی اور بولتے بولتے فوراً رک گئی اور اُس نے اپنا سر بھی جھکا لیا۔ مجھ کو محسوس ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں بھی اس کے رونے سے جی ہی جی میں پھوٹ پڑا، پھر اس نے سر اٹھایا اور بات لوٹ کر کہنے لگی:-

چند ہی سال کی مدت میں انھوں نے اپنی ساری دولت جو کچھ تھی اڑا ڈالی۔ پھر سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ قرض لیں پھر ایسا بھی کیا جب بار بہت بڑھا تو رہن کیا اس سے بھی لاچار ہوئے تو ساری ملکیت حتیٰ کہ سکونتی مکان بھی بیچ ڈالا، ان کے ہاتھ اب صرف معمولی شہری تعلق باقی ہے، بلکہ یہ بھی نہیں ہے کیونکہ چند گھنٹوں کے بعد قرض خواہوں یا جوئے جیتنے والوں کی ملکیت ہوگا۔

زمانہ کا یہ وہ برتاؤ ہے جو اس نے ان پر کیا ہے، رہا مجھ پر اور میرے بچوں پر کیا گذری تو وہ زیوروں کے نتیجہ پر گذری جن کو میں پورے ایک سال تک بیچتی رہی اور افسوس وہ سب شرابیوں کی بھٹی اور رہن داروں کے کام لگے اور یہی حال میرے کپڑوں اور ساز و سامان کا ہوا، اور اگر میرے اعزہ میں سے ایک شخص ہماری حالت پر اپنی کثیر عیالداری کے ہوتے ہوئے ترس کھا کر کبھی کبھار خبر نہ لیتا رہتا تو میں اور میرے یہ بچے بھوکوں مرجاتے۔

میرے بھائی! شاید آپ اس قابل رحم شخص کی مدد کرسکیں اور اس کو بدنصیبی اور مصیبت سے جس میں اسے گھرا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ اپنی صحیح رہبری سے نکال سکیں۔

میں سمجھتی ہوں کہ آپ اپنے جس ذاتی رتبہ کی وجہ سے ان پر جو قدرت رکھتے ہیں دوسرے لوگ اس سے عاری ہیں، اگر آپ ایسا کریں گے تو ان پر اور ہم سب پر وہ احسان ہوگا جو مرتے دم تک نہیں بھلا سکیں گے۔

پھر اس نے سلام کیا اور چلی گئی، میں نے فوراً ہی لڑکے سے کہا کہ بیٹے! تمہارے باپ کس کمرہ میں ہیں کیا تم مجھے بتلا سکتے ہو، اس نے جواب دیا کہ آپ ان سے ان کے دفتر جانے سے پہلے صبح کو ملیں۔ میں عجیب کیفیت میں گھر لوٹا۔ میرے پہلو میں عجیب طرح کی تڑپ تھی، مجھے کسی کل چین نہیں ملتا تھا، رات گذرتی جاتی تھی، اور نیند میری آنکھوں سے ایسی اچٹ گئی تھی کہ میں نے ساری رات جاگ کر گذاری آخر صبح ہوگئی۔

پھر میں صبح کو چلا کہ اپنے اس قدیم دوست کو دیکھوں جو کل تک ایک خوش نصیب آدمی تھا اور کل آئندہ کی بابت نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ میرا معاملہ اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ میری طبیعت میں وہ قلق اور اضطراب بھرا ہوا تھا جو کبھی ایسے شخص کے دل میں ہوتا ہے کہ سبقت کے میدان میں وہ اپنی ساری متاعِ زندگی رہن کرکے جا رہا ہو اور اسے بالکل معلوم نہ ہو کہ کیا ہونیوالا ہے۔ گھڑی بھر کے بعد وہ خوش نصیب ہوگا یا دنیا کا سب سے بدتر بدنصیب انسان۔

آج مجھے ایک عینی مشاہدہ ہو رہا ہے کہ انسان کے چہرے، طبیعتوں کا آئینہ ہوتے ہیں۔ جو طبیعتوں کی روشنی سے روشن ہوتے ہیں اور انکی تاریکی سے تاریک بنے رہتے ہیں۔

مجھے ایک شخص سے ملے ہوئے سات برس کی مدت گذر گئی ہے زمانہ نے اس کی صورت کو بھی بھلا دیا ہے، میری یاد میں اس کے چہرہ کی چمک دمک اور اس کے فضل و شرف کی صرف وہ ضیاء باقی ہے جو اس کے مکھڑے پر آفتاب کے نور سے بڑھ کر درخشاں تھی، مگر اس وقت میں نے دیکھا تو میری آنکھوں نے اس ضیاء کی ایک کرن بھی نہیں دیکھ پائی، دل میں یہ خیال گذرا کہ کہیں میرے سامنے کوئی دوسری شکل تو نہیں آ رہی ہے اور یہ کوئی اور آدمی ہے جس کو میں پہچانتا نہیں ہوں۔

اس لئے کہ میں اپنے سامنے وہ جوان، خوبصورت، ہنس مکھ، جس کی صورت کے ایک ایک خط و خال شگفتہ تھے، جس میں تبسم اور کشش کی لہریں اٹھا کرتی تھیں، نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ دیکھتا ہوں کہ اس کی جگہ پر ایک ایسا شقی شخص ہے جس کی صورت پر نکبت برستی ہے جس پر قبل از وقت بڑھاپا چھا گیا ہے، جو تیس برس کا جوان ہوتے ہوئے ساٹھ سالہ معلوم ہو رہا ہے۔ جس کی بھویں ڈھیلی ہوگئی ہیں اور پلکیں موٹی، جس کی آنکھیں بیٹھ گئی ہیں

اور رُخسار پچکے ہوئے۔ پیشانی پر شکنیں آگئی ہیں اور دونوں بازو کھنچ گئے ہیں
اور کندھوں کے درمیان سر جھک گیا ہے۔

سب سے پہلا کلمہ جو میں نے اس سے کہا وہ یہ تھا کہ تم میں بڑی تبدیلی
ہوگئی، میرے دوست! تمہاری تو شکل ہی بدل گئی۔

مجھے معلوم ہوا کہ اس کو میرے مفہوم سے تکلیف ہوئی اور وہ سمجھ
گیا کہ میں اس کے معاملات کی ہر چیز سے واقف ہوں۔ چنانچہ اس نے اپنا
سر اس طرح جھکا لیا جیسے کوئی ایسا سمجھ کر کرے کہ زمین کا باطن اس کے ظاہر سے
بہتر ہے۔ وہ کچھ بولا نہیں تو میں نے اس سے اور قریب ہو کر اس کے کندھے
پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا:-

خدا کی قسم میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیا کہوں آیا تمہیں نصیحت
کروں اور پیتے ماضی اور اس سابق روشن کے روشن تارہ کی یاد دلاؤں،
جس سے میری زندگی کی تاریکیاں دور ہوں، یا میں تمہیں اس فرض کی رہنمائی
کروں جو اللہ نے تم پر، تمہاری جان اور تمہاری اولاد کے بارے میں واجب
کیا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ تم ان سے نادان ہو یا میں تمہیں تمہارے چھوٹے
چھوٹے کمزور بچوں پر اور تمہاری اس غریب اور مفلس زوجہ پر رحم دلاؤں
جن کی زندگی کا کوئی سہارا نہیں ہے اور نہ تمہارے سوا ان کا کوئی پشت
و پناہ ہے۔ تم ایک رحم سے بھرے دل والے ہو جو بارہا غیروں کی ہمدردی
کے لئے بےچین ہوا ہے، بہت ممکن ہے کہ اب وہ اپنوں کی ہمدردی کیلئے
بھی بیکل ہو جائے۔

میرے دوست! جو زندگی تم گزار رہے ہو، ایسی زندگی ان لوگوں
کا مقصود ہے جو بے کار اور اپاہج ہوتے ہیں جن کو غرض نہیں کہ کارگاہ عالم
میں کوئی نمایاں کام کریں۔ وہ شرم و خجالت کے باعث لوگوں کی نگاہوں سے
روپوش رہنے کے واسطے ایسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ان کی موت آتی
ہے تو انھیں ان کی اس ننگ و بدبختی سے خلاصی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن تم ایسے
لوگوں کے زمرہ میں نہیں ہو۔

میرے دوست! تم قبر کی طرف جانے والی راہ پر جا رہے ہو۔ حالانکہ
تم کو نہ تو دنیا پر عتاب ہے اور نہ اسکو برا سمجھتے ہو، تو پھر اس سے تمہاری یہ
قاتل مایوسانہ بے رغبتی کیوں ہے؟

تمہارا یہ عذر کہ اگر میں اپنی دوسری زندگی میں کامیاب نہیں ہوا

ایضا

تو میرے لئے ایک جگہ نکلتی ہے کہ ہم اپنی پہلی زندگی سے ناکام نہیں ہوئے
لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم دولت مند تھے اب نادار ہو گئے، تندرست
تھے بیمار بن گئے، بلند رتبہ تھے پست درجہ کے ہو گئے، اس کے باوجود
بھی اگر یہی سمجھتے رہو کہ خوش نصیب ہو تو پھر روئے زمین، بدبختوں سے
خالی ہو گئی۔

ہاں اگر تم اپنی زندگی کی ساری حسین چیزوں کے ہوتے ہوئے یہی
مراد لیتے ہو کہ زندگی میں موت کی جستجو کرتے رہو۔ تو تم زہر کے ایک گھونٹ کو
پی کر اس میں موت کو تلاش کرو، یہ تمھارے لئے اس نیم مردگی سے بدرجہا
بہتر ہے۔ جس میں طرح طرح کی دردناکیاں اور بےچینیاں ہیں، اور جس میں
تم اپنے گناہوں اور جرموں کو بھی بڑھا رہے ہو۔ ممکن ہے کہ تمھیں دوسری
زندگی میں پہلی زندگی سے بڑھ کر سزا کا سامنا کرنا پڑے۔

میرے دوست! میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی بدبختی یہ ہے کہ اس کی
وجہ سے ہم کو یہ قدرت حاصل نہ ہو کہ ہم نئی بدبختی سے دوچار نہ ہو سکیں اور ہم کو اپنے
نفع کی جانب سے اپنے نقصان کے لئے اس کو کھینچ لیں۔ اس لئے اپنا ہاتھ
لاؤ اور اس بات پر مجھ سے عہد کرو کہ تم آج سے میرے لئے ویسے ہی بن جاؤ گے
جیسے کل تھے، تو ضرور ہے کہ ہم سب جدائی سے پہلے خوش نصیب ہو جائیں۔ ہماری
جدائی ہماری بدبختی ہے۔ خوب سمجھ لو اگر ہم مل گئے تو ضرور ہم پھر عزت و شرف
کے سایہ تلے خوش نصیبی سے زندہ رہ سکیں گے۔

پھر میں نے اس کی جانب ہاتھ پھیلایا۔ مگر میں حیرت میں آگیا جب دیکھا کہ
اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت تک نہیں دی۔ میں نے پوچھا، اپنا ہاتھ میری طرف
کیوں نہیں بڑھاتے تو اس نے روتے ہوئے کہا، میں یہ پسند نہیں کرتا ہوں کہ
جھوٹا بنوں اور عہد کے خلاف کروں۔ میں نے کہا، تم کو وفاء عہد سے کون چیز
روک رہی ہے؟ اس نے جواب دیا، میری شقاوت ہی سدِ راہ ہے۔ نصیبے
والوں کی خوش نصیبی میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کل تو تمہیں یہ
استطاعت تھی کہ تم بدبخت بن گئے، اور آج یہ استطاعت نہیں ہے کہ تم خوش
نصیب بن جاؤ۔ اس نے کہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ خوش نصیبی ایک آسمان ہے
اور بدبختی ایک زمین، اور زمین کی طرف گرنا، آسمان کی جانب چڑھنے سے
زیادہ سہل ہے۔ میرا قدم گھاٹی کی چوٹی سے پھسل چکا ہے، اس کے رکنے کی کوئی
تدبیر نہیں ہے وہ اپنی حد تک پہونچ کر رہے گا۔ میں زندگی کے جام تلخ کا پہلا

گھونٹ پی چکا ہوں تو ضروری ہے کہ اس کی تلچھٹ بھی پیوں اور اب صرف
میری راہ میں یہی ایک چیز ہے ۔ اگر میں نے آج سے پہلے وہ پہلا ہی جام نہ
پیا ہوتا ۔ میں نے کہا اِس میں کوئی کشمکش نہیں ہے ۔ صرف تمہارے عزم صادق
کی بات ہے کہ تم نجات پا جاؤ ۔ اُس نے کہا ، عزم تو ارادے کی ایک شکل ہے
اور میں تو اپنے معاملے میں ایک مغلوب آدمی ہوں میرا کوئی ارادہ اور اختیار
نہیں ہے ، میرے دوست مجھے چھوڑ دو کہ تقدیر میرے ساتھ جو چاہے کرے ،
اور آج سے تم اپنے قدیم دوست پر آنسو بہاتے رہو اگر تم ایک کمین گنہگار پر ٹسوے بہانے
میں کوئی ہرج نہ سمجھو ، پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر بلند آواز سے روتا ہوا مجھ کو میری
جگہ پر چھوڑ کر بغیر کچھ اور کہے ہوئے حیران نکل گیا ۔ اور پتہ نہیں کہاں گیا ۔ میں
بھی حسرت زدہ اور اپنے پہلو میں ملال و غم لئے ہوئے لوٹ آیا ۔

دفتر کا وہ رئیس جو میرے دوست کو ایک مدت تک اپنا ہم کاسہ
و ہم پیالہ بنائے رہتا تھا اب اسے بارِ محض خیال کرنے لگا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ
اُس کے کرتوتوں سے متنفر ہو کر اس نے بے ترسانہ برتاؤ سے اس کی موجودہ
زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے بھی ملازمت سے علیحدہ کر دیا ہے اور اس کے اپنے
مکان کے اُس نئے مالک نے بھی بلا رعایت و خیال کہ وہ اس کا پہلا مالک ہے
چند ہی ماہ میں اس کو مکان خالی کر دینے پر مجبور کر دیا ، اور اب وہ اس کی زوجہ
اور دونوں بچے اسی مکان کی علیحدہ قطار کی ایک پست درجہ کی کوٹھری میں
رہ رہے ہیں اور اب وہ صرف شراب خانے کی طرف آتے جاتے ہی دیکھنے میں
آتا ہے ، اگر جاتے ہوئے میری آنکھیں اُس سے دوچار ہو گئیں تو وہ خجالت اور
ندامت سے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اگر میں نے کبھی اس کو لوٹتے
ہوئے پایا تو اُس سے لپٹ جاتا اور اس کے چہرے سے گرد و خاک اور اس کی
پیشانی سے بہتے ہوئے خونوں کو صاف کر کے اُس کے مکان تک پہونچا آتا ہوں
اسی رنگ ڈھنگ کے ساتھ دن اور سال اس شخص کے جسم و عقل کو
کھوتے رہے ، اب وہ دیکھنے میں ایک ڈھلتے ہوئے سایہ کی طرح معلوم ہو رہا ہے
یا گویا ایک رواں خواب ہے ۔ راہ چلتا ہے تو ایک بھولے ہوئے حیران کی طرح ،
اسے کوئی احساس نہیں ہوتا کہ اس کے آس پاس کیا ہے اور وہ قریب تک حائل
ہو جانے والی چیز سے بچتا ہے ۔ چلتے چلتے رُک جاتا ہے ۔ اور ارد گرد آنکھیں پھیلا کر
دیکھنے لگتا ہے ۔ گویا کسی گم شدہ کی تلاش میں ہے ۔ حالانکہ اس کے پاس گم ہونے
والی کوئی چیز نہیں ہے ۔ یا نگاہیں اپنے کپڑوں پر دوڑاتا ہے ۔ باوجودیکہ وہ کپڑے
پیوند دار اور پھٹے پہنے ہوئے ہے اور ہر سامنے سے آنے والے راہی کو اِس
تلخ نگاہی سے گھورتا ہے گویا ایک کینہ پرور دشمن کو دیکھ رہا ہے مگر نہ تو اس کا
کوئی دشمن ہے نہ کوئی دوست ، بسا اوقات بعض شرارتی لڑکے اس کے بازوؤں
کو پکڑ لیتے ہیں تو وہ انھیں اپنے ہاتھ سے نرمی کیساتھ بے جھڑکی کے اس طرح
ہٹا دیتا ہے جیسے نیند میں متوالا سوتا ہوا شخص اپنے جگانے والے کو ہٹا دیتا ہے
جب اِس کا یہ خمار اتر جاتا ہے اور اِس کے دماغ سے شراب کا بخار فرو ہو جاتا ہے
تو پھر وہ خمخانہ پہونچ کر تھوڑی بہت پی کر اسی حالت پر لوٹ آتا ہے ۔ لیکن افسوس
ہے ، اِس کی یہ کیفیت بھی نہیں رہی اور چند مہینوں کے بعد یہ حادثہ پیش آیا

اِس کی مصیبت زدہ زوجہ کا یہ حال ہے کہ اب قوت بسری بھی میسّر نہیں
ہوتی ۔ اس کو یہ حال رُلا رہا ہے کہ اس کے سامنے اس کا بچّہ اور اِس کی بچی ملک
رہے ہیں اور اس چیز کو ان کے آنسو کہہ رہے ہیں جس کے اظہار سے ان دونوں
کی زبانیں خموش ہیں ، لیکن اس کے باوجود وہ اس راہ پر لگنے سے گریزاں ہے
جس پر ہر مجبور اور افلاس کا مارا ہوا لگ جاتا ہے اس نے اپنے دونوں بچوں کو
کسی کے یہاں خدمت کے لئے بھیج دیا ہے کہ وہ دونوں اپنے لئے روٹیاں کمالیں
اور اس کو بھی کچھ کھلا سکیں ۔ اس لئے اب وہ اِس صورت کے بعد بچوں کو بہت
تھوڑی دیر دیکھ پاتی ہے اپنے شوہر کو بھی اُس وقت دیکھتی ہے کہ جب پولیس کی نگاہ ہو
سے بچ کر وہ رات کو آتا ہے اور کبھی اِس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے تو وہ اپنی
کوٹھری میں تن تنہا رہتی ہے نہ کوئی مونس ہوتا ہے نہ غم خوار ۔ کبھی کبھار اُس کی
ایک بوڑھی پڑوسن آ جاتی ہے جب وہ بھی نہیں ہوتی تو اکیلی بیٹھی ہوئی اپنی
خوش نصیبی کے ان بیتے ہوئے دنوں کو یاد کیا کرتی ہے جس میں اپنے شریف اور
محبت کرنے والے شوہر کے ساتھ اپنے گرد تارے لیسے چمکتے ، خوبصورت بچوں کو
لئے ہوئے ایک پُر مسرت اور سُکھ بھری زندگی گزارتی تھی ۔ پھر وہ سوچتی کہ کیسے
وہ مخدوم خادم بن گیا اور کس طرح وہ معزز اور شریف انسان ، ذلیل اور بے
عزت آدمی ہوا اور کیا اسباب پیدا ہوئے کہ وہ پروئے ہوئے چمکتے ہوئے
موتیوں کی مالا جو زمانہ کی گردن کا ایک حسین زیور تھی بکھر کر رہ گئی اور اس کے
بکھرتے ہی زمین کی سطح پر پڑے ہوئے سنگریزوں کی طرح جوتیوں سے اور پیروں سے
روندے جانے لگے ۔ پھر وہ بچھڑے ہوئے لوگوں کی یادیں مٹنے والے کی طلعت اپنی

روئی کہ گویا جان دے دے گی۔ مگر اِن ساری چیزوں کے ہوتے ہوئے
کبھی بھی اس نے اپنے دل میں اس شخص سے کینہ نہیں پیدا ہونے دیا جو درحقیقت
اس کی اور اس کی اولاد کی بدبختی کا سبب تھا اور نہ کبھی دن اپنے دل میں
اس سے خفگی یا جدائی کا خیال لائی اس لئے کہ وہ عورت ہے۔ کبھی اپنے مصیبت
زدہ شوہر سے بے وفائی نہیں کی۔ اس نے ہمیشہ اس پر ایسی نظر رکھی جیسے ایک
دردمند ماں اپنے چھوٹے بچے پر رکھتی ہے وہ اس کی جانب رحیمانہ انداز سے
جھکتی ہے۔ اگر وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے پہلو میں بیٹھ کر صبح کر دیتی ہے اور جب
کہیں سے زخمی لوٹتا ہے تو اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرتی ہے اور اگر کسی رات
خمار نے اس کو خمخانہ سے اس لئے نکلوا دیا ہے کہ اس کی جیب میں شراب کے
لئے دام نہیں رہے ہیں۔ اور وہ وہاں سے مضطرب ہو کر گھر لوٹ آیا ہے اور شراب
کی سخت طلب سے بدحواس ہوا ہے تو اس نے ترس کھا کر اس کے رہے سہے
ہوش وحواس باقی رکھنے کے لئے اپنی قوت بسر اور خوراک کے صرفہ کو بھی اس
کی شراب کی خریداری کے واسطے دے دینے میں دریغ نہیں کیا ہے۔

زمانہ بھی کیا ہے۔ اس کے کندھے پر موجودہ بار ہی کیا کم تھا کہ ایک اور
نیا بار اضافہ کیا وہ کسی ایک جان کے پیدا ہونے کا شعور ہے جس کی حرکت
وہ اپنے اندر محسوس کر رہی ہے وہ سمجھ گئی کہ حاملہ ہے اور عنقریب ایک نیا بدنصیب
بدبختی کے گھر لانے والی ہے۔ پھر وہ زور سے چیخ اٹھی! اے اللہ تیرے رحم کا صدقہ!
پھر جام لبریز ہو گیا اور ایک قطرہ کی گنجائش نہ رہی۔ وہ حمل کی تکلیفوں کو جو ایک
بیمار اور مصیبت زدہ عورت کے لئے جھیلنی ناگزیر ہوں اٹھانے لگی۔ یہاں تک کہ
وضع حمل کی گھڑی بھی آن پہونچی۔ اس کے پاس ایک بوڑھی ہمسائی کے سوا کوئی
اور نہیں ہو، پر اللہ نے اس کی مدد کی کہ وہ فارغ ہو گئی۔ مگر اس کے بعد وہ نفاس
کے بخار میں شدید طور سے بیمار پڑ گئی نہ تو کسی معالج کو پاتی ہے جو اس کے علاج
اس پر احسان کرے۔ اس لئے کہ یہ وہ ملک ہے جس کے طبیب ایسے ہیں جو مریض کی
موت کے بعد بھی اُن کے رشتہ داروں سے اپنے قاتل علاج کی فیس مانگتے نہیں
شرم نہیں کھاتے۔ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہاں کوئی بے غرض محسن معالج مل جائے
چنانچہ موت آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوتی گئی یہاں تک کہ اللہ کی رحمت اس
کے پاس پہونچ گئی اور اس کی مقررہ گھڑی پوری ہو گئی۔ اس کے پہلو میں بجز اس
کی چھوٹی شیرخوار بچی کے جو اس کے سینہ سے لپٹی تھی کوئی پاس موجود نہ تھا۔

اسی وقت وہ شخص مایوسانہ، مضطرب، شراب کا پیاسا داخل ہوا اور اپنی
زوجہ کی تلاش کرنے لگا کہ وہ اس کی طلب پوری کرے۔ کوٹھری کے ہر طرف
نگاہیں پھرائیں، دیکھا کہ ایک چٹائی پر وہ پڑی ہے اور اس کے پہلو میں اس
رو رہی ہے اس کو گمان ہوا کہ وہ سوتی ہے۔ قریب ہوا تو بچی کو اس سے جد
پھر اس کو زور زور سے ہلانے لگا۔ لیکن کسی حرکت میں زندگی نہیں پائی۔ وہ ڈ
ڈر اٹھا اور اپنے سارے اعضا میں لرزش اور کپکپی محسوس کی۔ پھر اس کا حل
آیا۔ اس کا صحیح کیف ہر چیز میں نمودار ہو گیا۔ پھر اس پر جھک گیا۔ اس کے چہ
پر اپنی آنکھیں گڑا دیں اور آہستہ آہستہ قریب تر ہوتا گیا۔ جب اس نے مو
کے پیکر کو محسوس کیا کہ اس کی زوجہ کی دونوں کھلی ہوئی اور پتھرائی ہوئی آنکھ
سے اس کو دیکھ رہی ہے تو خوف وہراس سے ٹھٹک کر رکا۔ اس جھٹکے میں اس ش
خوار بچی کا سینہ کچل گیا اور ایک دردناک کراہ اس کے منہ سے نکلی پھر اس
بھی کوئی حرکت باقی نہ رہی۔ اس کیفیت سے وہ چیخ اٹھا۔ ہائے بدبختی! اور ا
منہ پیٹتا ہوا راستہ میں سر کو ستونوں اور دیواروں سے ٹکراتا ہوا اور جو کو
انسان یا حیوان بیچ میں ملا ان سے بھڑتا ہوا، میری بچی! میری بیوی! میر
پاس آجاؤ! مجھ سے مل جاؤ! چیختا ہوا نکل گیا۔ حتیٰ کہ تھک کر گرا اور زمین پر
ایڑیاں رگڑنی شروع کر دیں اور ایک بسمل کی طرح جاں گداز کراہ اس کے منہ
سے نکلنے لگی۔ لوگ اس کے آس پاس کھڑے رو رہے تھے مگر اس لئے نہیں کہ
اس کو پہچانتے ہیں بلکہ اس واسطے کہ اس کے چہرے پر بدبختی کی نشانی نمایاں
پا رہے ہیں۔

اِن چند لمحوں کی مدت میں اس کو طویل غفلت سے جو افاقہ ہوا وہی
اس کے رہے سہے ہوش وحواس کی بربادی کا بھی سبب بنا۔

اور اب شاید وہ ایک گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ میں ہتھکڑیاں پہنے بیمارستان
کی چار دیواری کے اندر قید ہو جائے۔

اس پر، اس کی شہید زوجہ پر، اور اس کی شیرخوار مظلوم بچی پر،
اور اس کے بچھڑے ہوئے مسکین لڑکوں پر خدا کی رحمت ہو،

اور افسوس ہے ایسے انسان پر، ایسے سب لوگوں پر، حتیٰ کہ ایسی
موت پر۔

(ترجمہ از عربی لطفی منفلوطی مصری)

ہم اور وہ

از خواجہ محمد شفیع صاحب (دہلوی)

جب سے ہوش سنبھالا بڑے بوڑھوں سے پیش رفتگاں کی تعریف وتوصیف میں قصیدہ سنتے سنتے تھک گئے۔ اور اپنی ہجو سنتے سنتے آنکھ آگئی کان پک گئے نہ قصیدہ ختم ہوتا ہے نہ ہجو۔ اگر غور سے دیکھئے تو نہ قصیدہ میں کوئی مدعا نہ ہجو میں کچھ معنی۔ حقیقتاً قصیدہ مردہ پرست ذہنیت کا نتیجہ ہے اور ہجو خبثِ نفس۔

ہم بزرگ داشت کے تحت یہ بھی انگیز کیے لیکن اندیشہ ہے کہ بُرا سنتے سنتے ہم کہیں بُرے ہو نہ جائیں۔ اگلے اچھے تھے یا بُرے ہم کو اس سے کیا مطلب۔ داستان پارینہ قوم کو نجات نہیں دلا سکتی۔ حال سے بے خبر محوِ غم دوش رہنا جہالت کا ثبوت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اس لن ترانی کا جواب ترکی بہ ترکی دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ ہم ؤا ایسی بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں۔

ہم کو گل نہیں بننا۔ ہم بہت خوار ہو چکے۔ اب ہم کو خار بننا ہے۔ اگر گل بنیں گے تو قبروں پر چڑھائے جائیں گے۔ خاک میں مل جائیں گے۔ خار خود بھی محفوظ رہتا ہے اور دوسروں کی بھی حفاظت کر سکتا ہے۔

بڑے بوڑھوں کی باتیں اکثر قصہ کہانیوں کی سی ہوتی ہیں اس وجہ سے میں نے اس مقالہ کی ابتدا کہانی کی طرز پر کی ہے۔

مدتیں گذریں زمانے ہوگئے۔ ایک سپاہی بچہ تلاشِ معاش میں گھر سے نکلا۔ نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی نکل گھر سے راہ سیدھی جنگل کی لی۔ راہ کی عمر کوتاہ اور چلنے والے کی عمر دراز چلا چل۔ چلا چل دن سارا گذر گیا رات ہونے آئی آسمان کا مسافر سُرخ رو سرائے مغرب میں داخل ہوا سپاہی بچہ بھی ایک کوئیں کی مینڈھ پر ہو بیٹھا۔ کمر سے روٹی کھولی۔ نوالہ توڑا تھا کہ کوّے نے کائیں کائیں کی۔ ٹکڑا ڈال دیا۔ کوّا آڑا اور دم کے دم میں پھر موجود۔

اتنے میں سپاہی نے دوسرا نوالہ اٹھایا اور اس نے اپنی صدا لگائی۔ ہاتھ کا سخی دل کا غنی تھا یہ نوالہ بھی کوّے کو ڈالا۔ ابھی تیسرا نوالہ توڑنے نہ پایا تھا کہ وہ ناخواندہ مہمان آن کھڑا ہوا۔ سپاہی بچہ کو غصہ آیا اور بولا۔ یہ روسیاہ کوّا بھی بڑا بے صبرا جانور ہے۔ غضب خدا کا اس کو دو نوالہ ڈال چکا ہوں۔ میں نے ابھی ایک لقمہ بھی نہیں کھایا اور یہ کمبخت کان کھائے جاتا ہے۔ کوّے نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی کہ اس وقت میری قوم پر بات آرہی ہے مجھے۔ ایک دو گھڑی کو زبان عطا کر کہ اس سپاہی بچہ سے دو دو باتیں کروں پچھے وقت تھے سچے زمانے۔ کوّے کی دعا قبول ہوئی۔ وہ آگے بڑھا اور بولا۔ میاں سپاہی میں بے صبرا نہیں ہوں۔ ان دونوں ٹکڑوں میں سے اگر ایک بھورا بھی میرے منہ میں گیا ہو تو بُری شئے گئی ہو۔ ہاں لیجانے کا گناہگار ضرور ہوں۔

سپاہی نے کہا تو پھر تو نے وہ ٹکڑے سینت کر رکھے ہوں گے۔ کوّے نے جواب دیا نہیں۔ پہلا ٹکڑا تو میں نے اپنے اپاہج باپ کو دیا جس کی عمر چار سو برس کی ہے۔ دوسرا اپنے بے ماں کے بچوں کو دے آیا۔ اب اگر تم کچھ دوگے تو میرے منہ پڑے گا۔ سپاہی نے ایک ٹکڑا اور ڈالا اور کوّا وہیں بیٹھکر ٹھنگیانے لگا۔ شدہ شدہ ان دونوں میں باتیں ہونے لگیں سپاہی بچہ بولا میاں کوّے کوئی اگلے وقتوں کا ذکر کرو جو رات کٹے۔ کوّے نے جواب دیا۔ میرے باپ نے بیس بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے اسکو بڑی بڑی باتیں یاد ہیں۔ اگر تمہاری خوشی ہو تو اس کے پاس چلو۔ رات بھر تمہیں قصہ سناتا رہیگا۔ دو قدم پر گھونسلا تھا یہ دونوں وہاں جا پہنچے کوّے نے اپنے باپ سے کہا کہ اس سپاہی بچہ نے ہم کو روٹی دی ہے۔ اگلے وقتوں کے ذکر سننے چاہتا ہے۔ کوّا بولا میاں جوان پُرانے زمانہ کے

اچھوں کا ذکر سناؤں یا بُروں کا۔ سپاہی نے جواب دیا۔ باباجی جن کا تمہارا دل چاہے۔ کوا بولا میاں اچھے تو اچھے ہوتے ہی تھے تم بُروں کی باتیں سنو۔

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ اگلے وقتوں میں ایک بادشاہ راتوں کو بھیس بدل اپنی رعایا کا حال دیکھنے گداگری کو نکلا کرتا تھا۔ ایک رات ہونی شدنی بات بادشاہ ٹہلتا ٹہلتا دریا کنارے جا نکلا دیکھتا کیا ہے کہ سات چور کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک بولا کہ خبر رساں نے خبر دی ہے کہ ٹھیک رات کے آدھی بجے ایک نعش بہتی ہوئی آئے گی اور اس کے سینہ پر بیش بہا لعل ہوگا۔ سرغنہ نے آسمان کیطرف دیکھا اور کہا بارہ بجا چاہتے ہیں۔ اتنے میں دور سے دریا میں ایک سفید سفید چیز آتی دکھائی دی جب قدرے قریب آئی تو ایک نے اشارہ پاکر پانی میں چھال ماری اور نعش کو پکڑ کنارہ پر لایا۔ سردار نے خنجر سے کفن چاک کیا۔ سینہ پر ایک دہکتا ہوا انگارہ سات بادشاہتوں کی قیمت کا ایک لعل شب چراغ رکھا تھا۔ نعش کو دریا میں بہا دیا اب سرغنہ نے لعل ہاتھ میں لے ساتھیوں سے پوچھا۔ آج ہم نے کس کی چوری کی ساتھی یک زبان ہوکر بولے مردہ کی۔ سردار نے لعل دریا میں پھینک دیا اور کہا مرد مردہ کی چوری نہیں کیا کرتے۔ سو میاں صاحبزادہ بھلوں کا کیا پوچھنا۔ اس زمانہ کے تو بُرے بھی اچھے ہوتے تھے۔

جوان کوے نے جب یہ بات سُنی تو موجودہ زمانہ کی حالت پر اُسے افسوس ہوا اور دو آنسو ٹپک پڑے۔ ایک کالا اور ایک سفید۔ چشم خرد نے جب ان پر نظر ڈالی تو وہ آنسو ایک کتاب کی شکل میں نظر آئے جس کا ایک ورق سیاہ اور ایک سفید تھا۔ ورقِ سیاہ پر جلی قلم سے لکھا تھا ذی روز اور صفحۂ سفید پر فرداً تحریر تھا۔

سرورق پر "ہم اور وہ" لکھا تھا۔

اب مغرب کی جانب سے ایک ہوا آئی اور صفحہ الٹنے شروع ہوئے۔ پہلے پر موٹے بیل کے بڑے بڑے دیدے نظر آئے۔ دوسرے پر دور کے ڈھول سہاونے تحریر تھا۔

اب جو ورق الٹا تو صفحۂ سیاہ پر سفید پوش بزرگ نظر آئے۔ سامنے ایک نوجوان خستہ حال زبوں صورت سر جھکائے بیٹھا ہے۔ منہ پر سات قفل پڑے ہیں۔ اوپر سے مہریں ثبت۔ ان پر کندہ ہے ضعیف الاعتقادی مردہ پرستی۔ بزرگ داشت۔ رسم و رواج۔ لاعلمی اور جہالت۔ علم دشمنی۔ تنگ نظری۔

بڑے میاں بنکار رہے ہیں اور نوجوان ہمہ تن ندامت بیٹھا سن رہا ہے۔

اچھے لوگ تھے اچھی گذار گئے۔ اپنی وضع کے پکے جس سے ایک دفعہ جس طرح مل لئے ساری عمر اسی طرح نباہ دی۔ وضعداریاں تھیں دوستوں میں دوست داریاں۔ دشمنی بھی شرافت کیسا تھ۔ یہ آجکل کے چھوکرے نہ دوستی میں بھدرک نہ دشمنی کو قیام۔ آج یارانہ ہے کل بچ گئی آج دانت کاٹی روٹی کل خوں کے پیاسے۔

شکلیں دیکھئے زرد رو امراض کا شکار۔ بیماریوں کی پوٹ۔ چپٹی سے ہاتھ پر کبوتر سے سینے۔

انھیں آنکھوں نے آج کل کے چھوکروں کو بھی دیکھا اور اگلے وقتوں کے مرے گرے بچے کھچے بوڑھوں کو بھی دیکھا تھا۔ ہمارے دادا میر خادم علی آیا کرتے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے۔ ایک دفع نہیں سو دفعہ ناپی ہے۔ آٹھ انگل کی کلائی تھی یہ معلوم ہوتا تھا آدمی نہیں ہاتھی کا پاٹھا چلا آرہا ہے۔ اگلے لوگ معاملہ کے کھرے۔ موچھوں پر سودا کرتے۔ کیسی تحریر کہاں کی نوشت۔ جو منہ سے کہہ دیا پتھر کی لکیر تھی۔ جان جائے آن نہ جائے۔

دوست تھے تو پکے دوست۔ دشمن تھے تو ظاہر ظہور۔ آج کل منہ پر بھائی دل میں قصائی۔

بڑے میاں برس رہے تھے اور لڑکے کی آنکھوں سے جھڑی لگی تھی۔ ہوا کے جھونکے آئے ورق پر ورق الٹے مہریں ٹوٹیں۔ قفل کھل گئے۔ سرنگوں نوجوان نے سر اٹھایا اور کہا ... "یہ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں"۔

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہ + بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ سچ ہے کہ ہم بیمار ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم پابہ جولاں ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مہنوں پر قفل ہیں قفلوں پر مہریں ثبت ہیں۔ لیکن یاد رکھئے۔ آپ کو خدا کے روبرو جانا ہے۔ حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے۔

ایشیا

پیچ سے منہ نہ موڑیے۔ ایمان کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔ اس سے انکار نہ کیجئے کہ ہمکو بیماری ورثہ میں ملی اور بڑوں نے خریدی تھی۔ ہم پابجولاں ہیں اسلئے کہ ہمارے پیش رفتگاں کج رفتار تھے۔ ہم کو حکم زباں بندی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے اجداد کلمۃ الحق سے منحرف ہوئے دریدہ دہنی اختیار کی۔ ہم غلام ہیں۔ آزادہ منش بڑے بوڑھوں نے آزادی عیش و عشرت کی بھینٹ چڑھائی۔ ہم محکوم ہیں حاکموں نے حکومت بیچ دی۔

ان کے گناہوں کا عذاب ہم بھگت رہے ہیں۔ ان کی خطاؤں کی مکافات ہم کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ بزم مے میں خم کے خم انھوں نے لنڈھائے عالمِ رنگ و بو میں رنگ رلیاں انھوں نے کیں۔ بلانوشوں نے دردِ تہِ جام صبوحی کو بھی نہ چھوڑی۔ حریفاں بادہا خوردند و رفتند۔ تہی خمخانہا کردند و رفتند۔

موردِ الزام ہم ہیں یا وہ۔ خطاکار ہم ہیں یا وہ۔ مسلمانوں تم ہی ایمان سے کہدو خدا لگتی۔

خزانہ لٹا گئے۔ ہم کو بھکڑ بنا گئے۔ اچھے لوگ تھے اچھی گذار گئے ہم پر بُرا وقت ڈال گئے۔ تلوار کے بدلہ توہم پرستی۔ رجز کی جگہ مثنوئ عیش و نشاط۔ جرأت کی جگہ بزدلی۔ واقعاتِ رزم کے بجائے داستانِ بزم ورثہ میں دے گئے۔ پھر بھی قابلِ پرستش وہ اور موردِ الزام ہم

الٹے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کیساتھ ✣ ناطاقتی کے طعنہ ہیں عذرِ جفا کیساتھ

اچھا باپ دکان کا حساب بے باق کر کے اولاد کے حوالہ کرتا ہے۔ جائداد کی مرمت کرا کے بیٹے کو دیتا ہے۔ خزانہ بھر کر کنجیاں وارث کو سونپتا ہے۔ وہ دکان لٹا گئے۔ جائداد ڈھا گئے۔ خزانہ کی کنجیاں اغیار کے حوالہ کر گئے۔ ہم کو ایک بدنام شدہ نام اور غلامی کا طوق ورثہ میں دے مرے۔ پھر بھی متمنی ہیں کہ ہم ان کی شان میں قصیدہ پڑھے جائیں اور ان کی زبانِ مبارک سے اپنی ہجو سُن کر مرحبا اور صلِّ علےٰ کہتے رہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم اب ایسے اندھے نہیں رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اس ترکہ کی حقیقت کو جان لیا جو بزرگ چھوڑ مرے تھے۔ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے۔

زمانہ ہمارا اور ان کا آئینہ دار ہے۔ اعمال کراماً کاتبین لکھ رہے ہیں اور صفحۂ تاریخ بھی عکاس۔ افراد کیخلاف جرائم میدانِ حشر میں آشکار ہوں گے۔ ملک و ملت کیخلاف دنیا کے دُنیا میں نظر آجاتے ہیں۔ سزا وہاں دی جائے گی لعنت کے طوق یہاں پہنائے جاتے ہیں۔ تاریخ کی سیاہی کہیں روشنائی کا کام دیتی ہے اور کہیں روسیاہ کر دیتی ہے۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے اور ہمارے اعمال دیکھے جایئے اور اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے جایئے۔ یہ کہہ کر نوجوان نے ایک صفحہ الٹا

شعر و سخن کا چرچا ہے بزم سخن آراستہ تعریف و توصیف کا غلغلہ فلکِ ہفتم کی خبر لا رہا ہے۔ سمائے سخن کے ماہ و انجم جمع ہیں۔ بلند پرواز آسمان کے تارے توڑ کر لا رہے ہیں۔ اشعار کی بندش عقدِ پروین پر خندہ زن۔ نقادانِ سخن نقدِ سخن پر موتی نچھاور کر رہے ہیں۔ روشن خیالوں کے سامنے شمعیں روشن۔ بانکے ترچھے جوان بیٹھے ہیں۔ سال خوردہ ثقہ صورت بھی تشریف فرما۔

اتنے میں ایک حسن و عشق کے قصہ خواں۔ گل و بلبل کے قصیدہ گو۔ گلرنگ بدن پر شبنم کا کرتہ پہنے دو پلڑی ٹوپی لگائے۔ بہارِ عشق دکھاتے اور زہرِ عشق پلاتے تشریف لائے۔ شوقین مزاجوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ نواب مرزا شوق ہیں۔ حاضرین نے اظہارِ شوق کیا۔ انھوں نے شعر خوانی شروع کی۔

۲۷ } خدائے سخن نے بیتِ توبہ شکن لا کھڑا کیا حسنِ مرد افگن نے زاہدِ صد سالہ کو متوالا بنا دیا۔

شاعر نے حسن و شباب کا ساغر چھلکا دیا۔ جوان جھومنے لگے عشق سر پہ کھیلنے لگا۔ حسن بے پردہ دزدانہ سرِ بام کھڑا تھا۔ جوشِ شباب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ کہ اتنے میں۔

جب نظر سے نظر دو چار ہوئی	ایک برچھی جگر کے پار ہوئی
رنگِ رُخ دیکھتے ہی زرد ہوا	دل میں بے اختیار درد ہوا
منہ سے مشکل کشا کا نام لیا	یا علی کہہ کے دلکو تھام لیا

یار جھلک دکھلا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہاں دنیا آنکھوں میں اندھیر۔ حالِ عاشق تباہ ہونے لگا۔ ایک بار شاعر نے اپنی بساط کے مطابق کوشش کی کسی نہ کسی چال سے اس لالہ رُخ تک جا ہی پہونچا اور کہا۔

واسطے اپنے جس کی جائے جان	اسکی لازم ہے لے خبر انساں

قسیں دے کردو اپلاؤ انھیں　　چل کے منہ دیکھ آؤ انھیں
نام چیلنے کا سن وہ عاشق کش　　بولی تیوری چڑھا کے خیر منہ خوش
دل میں یہ کیا خیال آیا ہے　　خانگی کسبی کچھ بنایا ہے

آخر کار۔

بُت کو لائے وہ التجا کر کے　　کفر توڑا خدا خدا کر کے

گُل کو بُلبُل کے پہلو میں لا بٹھایا۔ سرو پر قمری کا آشیانہ بنایا۔

ہٹ گئے سب زنانہ کروایا　　باغ میں ان کو لا اتروایا
منہ دوپٹہ سے ڈھانپتی اتری　　خوف کے مارے کانپتی اتری
سب حیا سے بدن چرائے ہوئے　　پائنچے ناز سے اٹھائے ہوئے

اب پیاسا پانی کی طرف بڑھا۔ دست گستاخ اِدھر اُدھر پڑنے لگا۔ دلدار دل برداشتہ ہو کر بولا۔

توبہ کس درجہ بے حیائی ہے　　واہ کیا دیدے کی صفائی ہے
کیا کہوں اور بے حیا تجھ کو　　پھٹے منہ لعنت خدا تجھ کو

غرض کہ۔

وہ کہا کی بہت نہیں رہے نہیں　　دلِ بیتاب مانتا تھا کہیں

دستِ عیش سازِ ہستی پر زمزمۂ دل کشا بجا رہا تھا۔ مطربِ طرب زا وصل کے گیت سنا رہا تھا۔ شاعرِ سبز باغ دکھا رہا تھا۔ بہارِ عشق کی سیر کرا رہا تھا۔ کہ سحر البیان نے بیان کا رُخ بدلا۔ امرت کے بدلے زہر اگلا وصل مبدل بہ فراق ہوا۔ سازِ ہستی ٹوٹ گیا۔ شمعِ محفل بجھ گئی۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ زمردِ خط حرفِ غلط ہو چکا تھا۔ شبِ فراق پھن اٹھائے کھڑی تھی۔ زمانہ زہر اگل رہا تھا۔

دوست کے پاس دوست کا سلام آیا ہے۔ دنیا سے جانیوالے کا آخری پیام آیا ہے

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　یہی دُنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن باقی　　نہ کسی جا ہے نلدمن باقی
بوئے الفت تمام پھیلی ہے　　باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان　　پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
موت سے کسکو رستگاری ہے　　آج وہ کل ہماری باری ہے
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم　　تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم

سننے والے سر دھن رہے تھے۔ ہر چہار طرف سے ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں بلند تھیں۔ سازِ ہستی سے بروگ رس ٹپک رہا تھا۔ آنکھوں سے دریا بہہ رہے تھے۔ دلوں میں طوفان بپا تھا۔

ابھی نرگسِ چشم نونہالِ حسن کی تربت پر اشک پاشی کر رہی تھی۔ زبانِ سوسنِ حسنِ خموش پر نالہ کناں زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔

گر پیرِ نود سالہ بمیرد عجبے نیست　　ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

خارِ زہر آلود غنچہ کے دل میں چبھا تھا۔ بلبل زخم کرید رہا تھا۔ خاک کا سینہ چاک کرکے نکلنے والے گل خاک میں مل رہے تھے۔ لالۂ خونیں دہن سینہ میں سم سیاہ چھپائے کھڑا تھا۔ مارِ سنبل زہرِ عشق سے بیتاب پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ۔

ایک پری چھم برق دم چھما چھم کرتی محفل میں آئیں۔ چاند سے مکھڑے پر کتاں کا دوپٹہ۔ موتی سے بدن پر آبِ رواں کا کرتہ۔ شرمائے لجائے۔ بدن چرائے سو سو بل کھاتی آئیں۔ اہلِ محفل کی جان میں جان آئی۔ جان صاحب تشریف لائے۔

ہاتھوں میں مہندی پور پور چھلے۔ آنکھوں میں سرمہ۔ افشاں چنی ہونٹوں پہ لاکھا دانتوں پر مسّی۔ توبہ شکن۔ بدن سمیٹے محفل میں بیٹھے للچائی ہوئی نظریں پڑنے لگیں۔ درخواستیں گذرنے لگیں۔ قدردانوں کے اصرار پر بہت انکار کے بعد بصد ناز مرزا سودا کی جانب رُخ کرکے فرمایا۔

جان تک مجھ سے نہیں رکھتے ہو پیاری مرزا　　کس طرح بھولے مجھے یاد تمہاری مرزا
مجھ زلیخا کو خدا نے دیا تجھ سا یوسف　　شکر ہے تجھ میں سو جان سے واری مرزا
ساس نندوں کی محبت کے میں قربان گئی　　جاؤں میکے مجھے منگوا دو سواری مرزا
کروٹیں بدلیاں پر نیند نہ تم بن آئی　　کس مصیبت میں کٹی رات ہماری مرزا

شعر پڑھ کا غذ ماما کے حوالہ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ بولیں چل ری نرگس یہ موئے مردوے بدنگاہی کرتے ہیں۔

یہ اتنا کہہ جب دکھا چلتے ہوئے دل جلے دل تھام کر رہ گئے ایک سمت سے آواز آئی۔

کبھی کوچہ میں حسینوں کے گذارا نہ کرے
دل کو ہا رے قدم اس راہ میں مارا نہ کرے
خوش نگاہوں سے محبت کا اشارہ نہ کرے
جان دے غمزہ دیدار گوارا نہ کرے

آنکھ گر ابرو و مژگانِ ستمگر پہ جائے   تیغ سے کاٹے گلا مار کے چھریاں مرجائے

شاعرِ طبع شناس نے فرقت زدوں کو شربتِ وصل پلایا۔ امانت نے سرِ محفل امانتِ حسن دھڑی دھڑی لٹادی۔ رسے عیش لنڈھادی۔ سرشار کردیا۔ بن پلائے بیخود و گفتار کردیا۔ کہا

جب لگا نیند سے انگڑائیاں لینے وہ گل
چمنِ بزم سے سب اڑ گئے مثلِ بلبل
پھر تو خلوت میں لگا چلنے بہم ساغرِ دل
نشۂ مے سے وہ بیہوش ہوا جب بالکل
دست گستاخ بصد شوق بڑھایا میں نے
گھات سے داؤں پر اس گل کو چڑھایا میں نے

اہلِ محفل پر تعیش کا بھوت سوار تھا۔ آنکھیں چڑھی تھیں دل میں خمار تھا۔ برنا و پیر جھوم رہے تھے۔ عیش و نشاط کی دیوی کے قدم چوم رہے تھے۔ ساقی نے مینائے سخن لنڈھادی تھی۔ جذبات میں آگ لگا دی تھی۔ ظالم گھر پھونک تماشہ دیکھ رہا تھا۔ دو گھڑی کی واہ واہ نے اسے اندھا کر رکھا تھا اور وہ دنیا کو اندھا کر رہا تھا۔

جو قوت قدرت نے سوتوں کو جگانے کیلئے ودیعت کی تھی اس سے جاگتوں کو سلا رہا تھا۔ مقدر اسکو کہتے ہیں گھر کا چراغ گھر جلا رہا تھا۔ امانت دار امانت لٹا رہا تھا۔ کہ

آسمانِ سخن کے آفتاب حضرتِ داغ کے سامنے شمع آئی۔ بھاری بھرکم فربہ اندام۔ سیاہ رنگ سیتلا منہ ٔ داغ۔ تیز تیز آنکھیں طباق سا چہرہ۔ تن زیب کا کرتہ زیبِ تن کئے۔ لوہارو والوں کی چوگوشیہ ٹوپی سر پر رکھے بڑی سج دھج سے بیٹھے تھے۔ صدرِ محفل کا اشارہ پا نہایت پاٹدار آواز میں یہ غزل نذرِ سامعین فرمائی۔

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
دلوں پر سینکڑوں سکے ترے جوبن کے بیٹھے ہیں
کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں
الٰہی کیوں نہیں اٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں
یہ گستاخی یہ چھیڑ اچھی نہیں ہے اے دلِ ناداں
ابھی وہ رو ٹھ جائیں گے ابھی وہ من کے بیٹھے ہیں
سبک ہو جائیں گے گر جائیں گے وہ بزمِ دشمن میں
کہ جب تک گھر میں بیٹھے ہیں وہ لاکھوں من کے بیٹھے ہیں
فسوں ہے یا دعا ہے یہ معمّا کھل نہیں سکتا
وہ کچھ پڑھتے ہوئے آگے مرے مدفن کے بیٹھے ہیں
بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں
نگاہِ شوخ و چشمِ شوق میں در پردہ چھنتی ہے
کہ وہ چلمن میں ہیں نزدیک ہم چلمن کے بیٹھے ہیں
یہ اٹھنا بیٹھنا محفل میں ان کا رنگ لائے گا
قیامت بن کے اٹھیں گے بھبوکا بن کے بیٹھے ہیں
کسی کی شامت آئی ہے کسی کی جان جائے گی
کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
قسم دے کر انھیں سے پوچھ لو تم رنگ ڈھنگ اس کا
تمہاری بزم میں کچھ دوست بھی دشمن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

کالی گھٹا نے مے برسادی۔ ساقیٔ سخن ساز نے سرمستوں کو سیاہ مست بنا دیا۔ بلبلِ رنگیں بیاں نے اہلِ محفل کو رنگِ تعشق میں رنگ دیا۔

آزمودہ کار و نو گرفتار سب کو حسنِ بازاری کا مشتری بنا دیا زہرہ جبینوں کا اکھاڑا جما دیا۔ مریخِ فلک سپاہِ توبہ شکن لے آیا۔ دبیرِ فلک نے فلکِ انجم پر انجم سے لفظ عشق لکھا۔ ہر ہر کشش کشتیٔ عشق بن گئی دائرے زلفِ پر شکن کی شکن۔ زیر و زبر نے میزانِ دل زیر و زبر کردی۔ زمانہ عشق کا دیوانہ ہوگیا۔

محفل پر یہ کیفیتِ کیف طاری تھی۔ کہ میر حسن آئینہ دارِ حسن کھڑے ہوئے۔ شاعرِ بے نظیر نے ماہتاب کے روبرو بدرِ منیر کھڑا کیا۔ قصۂ زلف دوتا چھیڑ دیا۔ کالی گھٹا چھا گئی۔ کانوں میں لہ آ گئی

شاعر موشگاف نے یوں ارشاد کیا۔

پلا ساقیا ساغر مشک بو — کہ ہے مجھکو درپیش تعریف ہو
سر شام سے شے یہانتک شراب — کہ ستی میں دیکھوں رُخ آفتاب
کروں اسکے بالوں کا کیا میں بیاں — نہ دیکھا کسی رات میں یہ سماں
کہوں اسکی چوٹی کا کیا رنگ ڈھنگ — کہ جوں آخری شب ہو جھبکیکا رنگ
نمایاں تھی یوں اوڑھنی سے جھجک — کہ جوں ابر میں برق کی ہو چمک
موباف زری نے کیا ہے غضب — دیا ہے گرہ ان کو دنبال شب
الٹ کر نہ دیکھے اُسے ہوشیار — کہ وہ اک ستارہ ہے دنبالہ دار
کہاں تک کہوں اس کی چوٹی کی بات — کہ تھوڑا ہی سانگ اور بڑی ہے یہ رات

یہ زلف گرہ گیر بغیر دل دلگیر لئے رہتی۔ یہ مار سیاہ بغیر من کیوں جیتا۔ یہ چاند بغیر چکور یہ گل بغیر بلبل یہ سرو محروم قمری۔ یہ مست شباب بغیر دست مشتاق نہ رہنا تھا نہ رہا۔

بے نظیر چندن چکور بنا۔ قران السعدین ہوا۔ بدر منیر اور بے نظیر برج وصل میں جمع۔

غرض ہو کے آپس میں راز و نیاز — پئے دو پیالہ بصد امتیاز،
پھر آخر کو شہزادہ نے بھی اٹھا — دیا ساغر اس مہ کے منہ سے لگا
لگی ہونے بے پردہ پھر چھیڑ چھاڑ — در حسن کے کھل گئے دو کواڑ
لگے پینے باہم شراب وصال — ہوئے نخل امید سے وہ نہال
لبوں سے ملے لب دہن سے دہن — دلوں سے ملے دل دہن سے دہن
لگی آنکھ سے آنکھ خوش حال ہو — گئیں حسرتیں دل کی پامال ہو
اُٹھے پی کے باہم شراب امید — کوئی سرخ رو اور کوئی رو سفید
نشے سے وہ لذت کے بیہوش ہو — گئے بیٹھ مسند پہ خاموش ہو
عرق میں اُدھر غرق وہ مہ جبیں — کئے آنکھ نیچی ادھر نازنیں
یہ بیٹھے تھے خوش ہو کے باہم ادھر — کہ اتنے میں آیا ادھر سے پہر

صبح ہو گئی۔ نسیم سحر برائے صبوحی گلزار نسیم لائی۔ آنکھ اٹھائی تو نسیم لکھنوی مینا بدست سر محفل کھڑے تھے۔ مخمور آنکھیں۔ صراحی سی گردن۔ رنگ گلابی تھا رخسار میں۔ یہ مست کاکل سرمست پر شمع جھومتی آگے بڑھی۔ اس جوان نے۔ شراب شباب لنڈھا دی۔

شاعر فسوں ساز نے اندر کا اکھاڑا جمایا۔ ایک ایسا گل کھلایا کہ چشم کور کو بینا بنایا۔ پری نژاد کو آدم زاد کے پہلو میں لا بٹھایا۔

پیارا تھا نپے نبی کا جوڑا — خلوت میں دولہا دلہن کو چھوڑا
سیاں کہ ہزارہا بھری تھیں — ارمان سی سب وہاں سے نکلیں
بے پردگی ہوتی تھی جو ان میں — دروازوں نے بند کر لیں آنکھیں
طومار حجاب کو کیا طے — ساغر پہ جھکا وہ شیشۂ مے
مستانہ ملا دلہن سے نوشاہ — صحبت ہوئی دختِ رز سے دلخواہ
مست آنکھیں تھیں رشکِ جامِ سرشار — لبریز ہوئی شرابِ دیدار
ثابت وہ جو شب کو تھے ستارے — خورشید نکلتے ہی سدھارے
یعنی دولہا دلہن سحر گاہ — نکلے آرام گاہ سے دلخواہ

تاجدارِ مشرق خونی پرچم لئے سیاہ سیاہ رو کو کاٹتا سر پر چڑھا آرہا تھا۔ محفل اجڑ رہی تھی۔ نشہ گُھٹے تھے۔ شمع محفل اپنے آنسوؤں میں غرق خاک سے جا ملی تھی۔ اہلِ محفل کے سر پائے ساقی پر اور دماغ عرش پر تھے۔ میلا بچھڑنے کو تھا اور سیلانی بے خبر۔ دن نکل آیا تھا اور یہ پڑے سو رہے تھے۔ اس میکدۂ مشرق میں نسیم سحر بھی سامانِ صبوحی لائی تھی۔ بجائے جگانے سُلاتی ہوئی آئی تھی۔ اے وائے بختِ خوابیدہ۔

محفل پر یہ رنگ طاری تھا کہ ایک جانب سے آواز آئی

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا۔ ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

صفحۂ سفید کی طرف نگاہ پڑی تو چند برنا و پیر جمع ہیں۔ مولانا حالی نے ابھی مسدس حالی ختم کی ہے۔ سب دست بدعا ہیں۔ سیپی سے چہروں پر موتی سے آنسو گر رہے ہیں۔ مولانا خشوع و خضوع کیساتھ عرض حال کر رہے ہیں۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے — امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ — خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے — اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے
ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی — دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں — پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے — اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا ہاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

جو کچھ ہیں وہ خود اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانہ کا نہ قسمت کا گلہ ہے

فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہبان
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

کل دیکھئے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
ابتک تو ترے نام پہ ایک ایک فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

اب دن چڑھ آیا تھا۔ انجمن میں ہر چہار طرف ایک نئی روشنی سی پیدا ہو گئی تھی۔ شب پرک سرشت اس ضیاء سے خیرہ ہو گئے۔ صراطِ مستقیم سے بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے لگے۔ فلسفۂ مغرب کے سامنے مشرقی مذہبیت کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ نئے تخیلات نوخیز طبائع پر طاری ہو گئے حاکم کا رنگ چڑھنے لگا۔ محکوم اپنے رنگ ڈھنگ بدلنے لگا۔

اب اکبر الہ آبادی کھڑے ہوئے مزاحیہ انداز میں متنبہ کیا۔ فرمایا

ہمنشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا

نیشنل فیلنگ تو ہم سب میں کبھی تھی ہی نہیں
اتحادِ دیں فقط باقی رہا تھا اب گیا

ہے عقیدوں کا اثر اخلاقِ انساں پر ضرور
اس جگہ کیا چیز ہوگی وہ اثر گر دب گیا

پیٹ میں کھانا زباں پر کچھ مسائل ناتمام
قوم کے معنی گئے اور روح کا مطلب گیا

منقلب ہوتے ہیں ہم طالب العلموں کے کورس
کورس بھی رخصت ہوا اسکا زمانہ جب گیا

اتحادِ معنوی ان میں برائے نام ہے
دیکھتے ہو اک گروہ اک راہ ہو کر کب گیا

مجلسِ دنیا میں کس صف کی بنو گے مستحق
دور ہو اور اور وہ ڈرے اور پر تو یا رب گیا

ہم یہی کہتے ہیں صاحب سوچ لو انجام کار
دوسرا پھر کیا ٹھکانا ہے اگر مذہب گیا

فلسفیانِ مغرب نے دماغوں پر قابو پایا۔ لعبتانِ مغرب نے دلوں پر سکہ جمایا۔ نونہالانِ مشرق بوستانِ مغرب سے گلہائے علم چننے گئے۔ گلرخوں کے ہو رہے۔ عروسِ علم لینے گئے تھے۔ غولِ حسن کے گرفتار ہوئے۔

گوری گوری چلتی پھرتی چینی کی گڑیاں دیکھیں شیشۂ دل چور ہو گیا بھارت ورش کے سپوت حقِ نمک بھول گئے۔ حسنِ ملیح سے منہ موڑ لیا۔ حسنِ صبیح سے ناتا جوڑ لیا۔ شمع کے پروانہ بجلی کے دیوانہ ہو گئے۔ یہاں لو سے لو لگاتے تھے۔ وہاں شیشہ کی کپتی سے ٹکرا ٹکرا کر جان دینے لگے۔

قوم کی یہ حالت دیکھکر اکبر الہ آبادی پھر کھڑا ہوا اور کہا۔

اک لعبتِ چیں کو لندن سے جو بیاہ کے لائے مفاعیلن
احباب نے تیرِ مطاعن سے اُن کے دل کو مجروح کیا
باپ اُن کے یہ بولے کشتی مری واللہ ڈبوئی ہائے غضب
اس لڑکے نے صحبتِ بد پا کر یہ کارِ ابنِ نوح کیا
تعلیم کو میں نے بھیجا تھا تزویج کی اس نے ٹھیرائی
ممدوح تو بننا بھول گیا بس اپنے تئیں منکوح کیا
لڑکے نے جواب میں عرض کیا اے قبلہ و کعبہ سنئے تو
یہ کون برائی میں نے کی جو فاتح کو مفتوح کیا

حکومت اربابِ سیاست نے لے لی۔ عزت مجسٹریٹوں کے ہتھے چڑھی۔ خودداری محکمۂ فوجداری کے حوالہ ہوئی۔ اب لے دے کے اک خدا کا آسرا رہ گیا تھا۔ اس پر بھی بتانِ فرنگ کو چھاپا مارتے دیکھ کر اکبر کہہ اٹھا۔

رات اُس مس سے کلیسا میں ہوا میں جو دوچار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں
گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل جھپکے
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی
پہلوئے حسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق
بس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ایشیا

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یا حفیظؔ کا کیا درد مگر کچھ نہ ہوا
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں
مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد
دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی
عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانہ میں نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں
اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رف رف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف
ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پہ پڑھتے ہیں سبحان اللہ
جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینہ رو پہ نثار
اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک
موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد
مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھکو بھی راضی سمجھو

جگانے والا شفقت اور پیار سے جگا رہا تھا مگر یہ نیند کے ما
چیتنے والے نہ تھے۔ سمجھانے والا ہنس کر چمکار کر سمجھا رہا تھا۔ پر یہ خمیدہ و
سمجھنے والے نہ تھے۔ جب یہ بھوت باتوں نہ مانا تو زمانہ نے ٹھوکریں لگا
اب اقبالِ قومِ اقبالؔ نے سنبھالا۔ اہلِ محفل کو مخاطب کرکے لا

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا د
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا
تہذیبِ نوی کارگۂ شیشہ گراں ہے — آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھ

اب نوجوان نے پیرمرد کی جانب دیکھا اور کہا۔ ببیں تفاوتِ ر
کجاست تا بہ کجا۔ اور ایک ورق الٹا۔ (باقی آئندہ

مرزا غالب کا غیر مطبوعہ منظوم خط

تازہ نمبر اس لحاظ سے اور بھی اہم ہوا جاتا ہے کہ اس میں مشرق کے شاعرِ اعظم
مرزا اسداللہ خان غالب کی ایک غیر مطبوعہ منظوم خط شائع کیا جارہا ہے
اس عطیہ کے لیے میں محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کا شکرگذار ہوں، جو "ایشیا"
کی مستقل مضمون نگار ہیں اور جن کے افسانے آپ پڑھتے رہتے ہیں۔
اُردو ادب کی ترقی اور بلندی کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان خواتین
جس قدر اس سے علیحدہ تھیں اسی قدر اب مساوی طور پر اد بیں شریک ہیں۔

ساغر

مرزا اسداللہ خان غالب کا غیر مطبوعہ خط

میں ممنون ہوں، برادرِ مکرّم صاحبزادہ شمس الدّین احمد خان صاحب دیوان ریاست لوہارو اور نبیرۂ نوّاب علاؤ الدّین خان صاحب علائیؔ کی جنھوں نے مرزا غالبؔ کا یہ خط مجھے لوہارو کے کتب خانہ سے نقل کرکے عنایت فرمایا، اس کی حقیقت یہ ہے:۔

نوّاب علاؤ الدّین خاں علائیؔ والیٔ ریاست لوہارو، جو مرزا غالبؔ کے محبوب شاگرد تھے، امورِ ریاست کے اُلجھاؤں کی وجہ سے دہلی نہ آسکتے تھے لیکن اُستاد کی مفارقت گوارا نہ تھی، برسات کا موسم شروع ہوچکا تھا، علائیؔ کو لوہارو میں ساون کی جھڑیوں کے ساتھ مرزا غالبؔ کے دلکش نغمے یاد آکر بے طرح ستا رہے تھے، لیکن ریاست کی مصروفیتوں کی بنا پر لوہارو سے آنہ سکتے تھے، آخران

تاثرات کے تحت علائی نے مرزا غالب کو ایک منظوم خط لکھا جس میں لوہارو آنے کی دعوت بہت ترغیب انگیز الفاظ میں دی۔

لیکن حضرتِ غالب کو بھلا یہ کب گوارا تھا کہ برسات میں دلّی کی دلچسپیوں کو خیر باد کہہ کر لوہارو جیسے ریگستانی علاقہ میں جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی اس خط کا جواب منظوم ترکی بہ ترکی دیا اور ساتھ ہی لکھا، بیٹا تمھارا خط کیا آتا ہے بھانڈوں کا تماشا آتا ہے۔ ایسے بڈھے کو جو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے، سفر پر آمادہ کرتے ہو۔ قسم ہے علائی تیری جان کی اپنے میں اتنی ہمّت نہیں پاتا ہوں کہ تجھ تک اپنے کو پہونچاؤں، کاروبار ریاست سے فارغ ہو کر تم ہی دہلی آؤ اور میرے دل کو تقویت اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچاؤ۔

اب اِن دونوں حضرات کے منظوم خط دیکھئے اور لطف لیجئے۔

علائی اور غالب

علائی کا خط بنام مرزا غالب

خوشی ہے ہیں آنے کی آپ کے — کہ باہم پئیں بادہ اور آم کھائیں
سر آغاز موسم بھی کیا خوب ہے — کہ دلّی سے حضرت لوہارو کو آئیں
عجب لطف ہریاں کی برسات کا — کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سرَولی کے وہ ڈاک پر سبز آم — وہ دلّی کے انگور ہر شام آئیں
کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں! — ابھی جا کے ہر چیز جلدی پکائیں

ایشیا

وہ لیں باغ سے جاکے املی کے پھول — وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کا لحمِ طری — کہ کیا کیا اُسے کھا کے ہم حظ اُٹھائیں
کہیں اُن کو بے مہر و کاہل اگر
لوہارو وہ اِس بات پر بھی نہ آئیں

نوّاب علاؤالدّین خان علائی

مرزا غالب کا جواب

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے — پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں.
سر آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم — کہ دلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوبِ جاں — نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں! — ابھی جاکے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول — وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت ہی بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اُس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

۱۳۵

مرزا اسد اللہ خان غالب

(جملہ حقوق محفوظ)

ایشیا

سوزِ جگر

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

طبیعت آ کے پھر تا حدِّ امکانی نہیں جاتی
نہیں جاتی، نہیں جاتی، یہ دیوانی نہیں جاتی

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

اگر حل ہو گئی مشکل تو آسانی نہیں جاتی
بہر صورت مرے دل کی پریشانی نہیں جاتی

پشیمانِ ستم وہ دل ہی دل میں ہنستے ہیں لیکن
خوشا حسنے، کہ طرزِ ناپشیمانی نہیں جاتی

نگاہوں کو خزاں ناآشنا بننا تو آ جائے
خزاں میں بھی چمن کی جلوہ سامانی نہیں جاتی

مزاجِ اہلِ دل بے شورِ مستی رہ نہیں سکتا
کہ جیسے نکہتِ گل سے پریشانی نہیں جاتی

بلندی چاہئے انسان کی فطرت میں پوشیدہ
کوئی ہو بھیس لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

گئے وہ دن کہ دل سرمایۂ ابرِ دُرِ یتیم تھا
مگر آنکھوں کی اب تک سیر سامانی نہیں جاتی

نگاہِ شوق کی گستاخیاں، توبہ ارے توبہ
تلافی لاکھ کرتا ہوں پشیمانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

جسے رونق ترے قدموں نے دیکر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اُس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

مجھے تو کر دیا سیراب ساقی نے مرے لیکن
مری سیرابیوں کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

نہیں معلوم کس عالم میں حسنِ یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو آئینہ کی حیرانی نہیں جاتی

جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر، مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر اُن کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

شعاعِ بدر

اعتمادِ راہزن کی بیڑیاں ہیں پیر میں — ڈھونڈتا ہوں نقدِ گم کردہ دیارِ غیر میں

ہائے وہ تسکینِ آزادی غرورِ زورِ بال — جو نظر آتا ہے شاہینِ سریع السیر میں

سچ تو یہ ہے اے گلِ خوبی مجھے تیرے بغیر — لوٹنا پڑتا ہے کانٹوں پر چمن کی سیر میں

سو طرح سے قصۂ محبوب دہراتے رہے — عمر ساری کٹ گئی ہے ایک ذکرِ خیر میں

وسعتِ صحرا کی باتیں بھولی بسری ہوگئیں — اب تو جی سا لگ گیا ہے کچھ قفس کی سیر میں

آؤ کھائیں اضطرابِ زندگی کے کچھ مزے — اے سبکسارِ حرم ہنگامہ زارِ دیر میں

محتسب کی سبحۂ صد دانہ اے ساقی نہ دیکھ — استخارہ کی کہاں حاجت ہے کارِ خیر میں

کس طرح ان چکروں سے چین حاصل ہو سکے — ایک چکر آسماں میں ایک چکر پیر میں

وہ اگر آمادۂ انصاف ہو جاتے کبھی
جب مزہ اے بدرؔ آتا دشمنوں کے بیر میں

بدرؔ جلالی

اُف ری جوانی ہائے زمانے!

ہاتھ میں ساغر، سر پہ گھٹائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
سرد ہوائیں مست فضائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
ڈوبی ہوئی وہ مدھ میں نگاہیں، ہائے وہ گوری گوری باہیں
لب پہ تبسّم رخ پہ حیائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
حُسن کا نشّہ کیف کا عالم، آنکھ وہ بارِ ناز سے بوجھل
دیکھ کے درپن آپ لجائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
موسمِ گل میں پھول بسنتی، باغ بسنتی، جام بسنتی
اس پہ بسنتی مست ادائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
پھولوں کا اُبھرا ہُوا سینہ، اس پہ بلا ساون کا مہینہ
پھٹ گئی چولی مسکی قبائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
جھُوم کے وہ بادل کا برسنا، دل کا اِدھر پہلو میں دھڑکنا
دُور سے وہ کویل کی صدائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
گُل کا لچکتی شاخ پہ ہنسنا، صحنِ چمن کا عطر میں بسنا،
مہکی مہکی مست ہوائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
آم کے پیڑوں میں وہ جھُولا، آہ وہ رم جھم رم جھم برکھا
مور پپیہے شور مچائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
آؤ چمن میں بیاہ رچائیں، پھول کا پھر اک قصر بنائیں
پریم کا نغمہ مل کر گائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

(رنجور عظیم آبادی)

۱۳۹

الشما

شاعرہ کا عہد

ہند و مسلم کو بھائی کرکے دکھلاؤں گی میں
بن کے پیغام اخوّت ہند پر چھاؤں گی میں

فارغ البالی کا چشمہ لے گا لہریں ناز سے
مفلسی کا قصر ویراں کرکے دکھلاؤں گی میں

انتقام و جوش کی سینوں میں لگ جائیگی آگ
ایسے جوشیلے ترانے جھوم کر گاؤں گی میں

ہند، تیری گود میں جب تک نہ کھیلے گی خوشی
سُکھ نہ لینے دوں گی دنیا کو نہ سُکھ پاؤں گی میں

چھیڑ دوں گی ناخنِ وحشت سے سازِ انقلاب
خرمنوں پر دشمنوں کے برق برساؤں گی میں

قطع کر ڈالوں گی میں سرمایہ داری کا چمن
متّحد شاہ و گدا کو کرکے دکھلاؤں گی میں

شامِ حسرت آفریں کو دوں گی پیغامِ سحر
خار و خس میں نشترن کی روح دوڑاؤں گی میں

زلزلہ بن کر مٹا ڈالوں گی موجودہ نظام
شامِ غم کو صبحِ رنگیں کرکے دکھلاؤں گی میں

میرا طوفاں روک لے دنیا کی قوّت کیا مجال
رفتہ رفتہ اپنی منزل تک پہونچ جاؤں گی میں

(۲)

یادِ ماضی میں ہے کیوں اس درجہ غمگیں سوگوار
سُکھ کے سپنے پھر تجھے ہندوستاں دکھلاؤنگی

فاقہ کش مزدور کی مفلس جوانی کی قسم
تاج مزدوروں کے سر پر ایک دن پہناؤنگی

محفلِ پامال میں تیری مرے ہندوستان!
فتح و آزادی کے میں شیریں ترانے گاؤنگی

پھر تری محفل میں رقصاں ہوگی راحت کی پری
بخشدوں گی مفلسوں کو امن پرور زندگی

شمیم صاحبہ ملیح آبادی

باغی روحوں کا کورس

معتبر آج بھی ہے رطلِ گراں کیا کہنا
اب بھی قلقل ہے بہ از بانگِ اذاں کیا کہنا
قبضۂ بادہ میں ہے رُوحِ جہاں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہے پیرِ مغاں کیا کہنا
وہی دفتر ہے وہی مُہرِ نشاں کیا کہنا

برسرِ فتنہ ہے ایمان کا طوفاں کب سے !؟
آندھیاں جنّت و دوزخ کی ہیں رقصاں کب سے
فرعِ دانش ہے سرِ عرش پَر افشاں کب سے
عقل کی تُند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے
پھر بھی ہے شمعِ جنوں شعلہ فشاں کیا کہنا

۱۴۱ ایضاً

کب سے آنسو ہے طربناک تبسم کے خلاف
کب سے لکنت ہے شکر زیرِ تکلم کے خلاف
کب سے تمکین ہے آئینِ تلاطم کے خلاف
کب سے قرأت ہے مزامیر و ترنم کے خلاف
آج بھی نغمہ ہے آشوبِ جہاں کیا کہنا

کب سے ہے پنجۂ تبلیغ میں دامانِ سکوت
کب سے بے نغمہ شریعت ہے ثنا خوانِ سکوت
کب سے ہے سجدہ و تسبیح میں طغیانِ سکوت
کب سے خورشید کی حدّت میں ہے فرمانِ سکوت
پھر بھی جنبش میں ہے ذرّوں کی زباں کیا کہنا

خاک پر نوحۂ پیہم کی لگی ہیں مہریں
زیست پر دیدۂ پرنم کی لگی ہیں مہریں
دفترِ عیش پہ بھی غم کی لگی ہیں مہریں
ذرّے ذرّے پہ جہنّم کی لگی ہیں مہریں
پھر بھی دنیا پہ ہے جنّت کا گماں کیا کہنا

ایشیا

کب سے ذہنوں پہ ہیں پارینہ عقائد کے حجاب
کب سے اوہام کا انساں پہ نازل ہے عذاب
کب سے قدرت کے صحائف پہ مسلط ہے کتاب
کب سے رومان کی خشکی میں ہے تبلیغ سراب
وہی رونق ہے سرِ آبِ رواں کیا کہنا

دل اگر دوزخِ پہلو ہے تو سر آتشِ دوش
وہی آہوں کا تلاطم ہے وہی غم کا خروش
جلوہ آشفتگیِ چشم ہے لے آفتِ گوش
عقل کے دور میں بھی عشق نہیں ہے خاموش
وہی نالے ہیں وہی شورِ فغاں کیا کہنا

۱۴۳

کب سے نازل ہے حقائق پہ بلائے اوہام
ذہنِ نازک جنت میں ہے دوزخ کی لگام
کب سے فطرت کے جگر میں ہے خراشِ الہام
کب سے ہے ذوقِ نظر حکمِ شریعت سے حرام
وہی منظر ہیں وہی حسنِ جہاں کیا کہنا

ایشیا

آج بھی کاوشِ افسون و فسوں کاری ہے
آج بھی کاہشِ بدمستی و سرشاری ہے
آج بھی وسوسۂ شوخی و طرّاری ہے
آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلبگاری ہے
چشمِ انساں ہے یہ ہر سو نگراں کیا کہنا

دین میں عشوۂ بیباک ہے شایانِ عذاب
غمزہ و ناز پر اک عمر سے ہے چشمِ عتاب
دستِ ہمت شکنی میں ہے سرِ زلفِ شباب
پر بہ ایں شدّتِ آیات و احادیث حجاب
دستِ خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا

روح کے یخ کدۂ عالمِ افلاک میں بھی
وہمِ فردوس کے ٹھنڈے خس و خاشاک میں بھی
فقہ کی سرد و خنک انجمنِ پاک میں بھی
شبنم و برف کے اس حلقۂ نم ناک میں بھی
اٹھ رہا ہے دلِ انساں سے دھواں کیا کہنا

بند ہیں حرف و حکایت کے دریچے کب سے
تلخ ہیں برہمن و شیخ کے فقرے کب سے
تند ہیں اہلِ مناجات کے خطبے کب سے
ترش ہیں ممبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا

نغمہ و زمزمہ و جلوہ و شعر و مے و جام
ان میں اِک شے بھی نہیں جو نہ ہو ممنوع و حرام
دہر میں دیر و کلیسا میں بپا ہے کہرام
لیکن اس کوئے ہلاکت میں بھی ہیں گرمِ خرام
زلف بر دوش مسیحا نفساں کیا کہنا

آفریں باد بریں ہمتِ کونین شکار
نہ تو شکوے ہی سے واقف نہ شکایت سے دوچار
نشۂ عہدِ جوانی کا ہے ہر چند اُتار
کب سے قرنوں کا ہے شانوں پہ اٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہے جہانِ نگراں کیا کہنا

ایشیا ——

کب سے پانی کے عوض روز برستے ہیں شرر
کب سے رہتی ہے زمیں آٹھ پہر زیر و زبر
کب سے ذرّات کے سینوں میں ہیں روحیں مضطر
کب سے ہے منتظمِ باغ سموم و صرصر
پھر بھی ہے خاکِ چمن عطر فشاں کیا کہنا

اللہ اللہ یہ شوخی، یہ تبسّم، یہ بہار
یہ سِن و سال کی ہلچل یہ جوانی کے شرار
یہ لگاوٹ، یہ شرارت، یہ تلاطم، یہ ابھار
سینۂ دہر ہے گو تیرِ حوادث سے فگار
پھر بھی ابرو کی لچکتی ہے کماں کیا کہنا

کب سے تقویٰ کی حمایت میں ہے شمشیر و کتاب
کب سے کوشش ہے کہ دب جائے اذانوں سے رباب
تیغ در دست ہیں اک عمر سے آیاتِ عذاب
کب سے ہے نطقِ رسالت پہ رواں ہجوِ شراب
پھر بھی ہلچل ہے سرِ کوئے مغاں کیا کہنا

ایضاً

لِلّٰہ الحمد کہ سعیٔ فقہا کے با وصف
لِلّٰہ الحمد کہ جہدِ حکما کے با وصف
لِلّٰہ الحمد کہ خونِ شہدا کے با وصف
لِلّٰہ الحمد کہ خود حکمِ خدا کے با وصف
ہے وہی گرمیٔ بازارِ بتاں کیا کہنا

آفریں باد کہ اِس دین کی سطوت پہ بھی ہے
آفریں باد کہ اس نشرِ نبوّت پہ بھی ہے
آفریں باد کہ اس جورِ شریعت پہ بھی ہے
آفریں باد کہ اس جبرِ مشیّت پہ بھی ہے
دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

جوشؔ ملیح آبادی

شوق کی پرواز

تم جو چھیڑو مسکرا کے ساز ہے
ورنہ ساز اک تارِ بے آواز ہے

آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
دور تک آواز ہی آواز ہے

ناز ہے ہاں ہم کو دل پر ناز ہے
اس میں تم ہو اور تمہارا راز ہے

ہم کو اُن پر اُن کو ہم پر ناز ہے
راز ہے پھر بھی محبت راز ہے

دل نے کیا کہہ کر پکارا آج انھیں
خود محبت گوش بر آواز ہے

آیئے! دامن اُٹھا کر آیئے
دل ہمارا رہگزارِ ناز ہے

عشق میری آرزو کی اک اُڑان
حسن میرے شوق کی پرواز ہے

نالہ ہے گر اُن کو کر دے مضطرب
ورنہ یہ آواز ہی آواز ہے

کون اُٹھائے موت کے رُخ سے حجاب
زندگی خود رازِ اندر راز ہے

عشق میرا رازِ در پردہ سہی
تو بتا یہ حسن کس کا راز ہے

حاصلِ پرواز کیا ہے یہ نہ پوچھ
لامکاں اک مرکزِ پرواز ہے

ٹوٹ کر ساغر بنا کرتا ہے دل
ساز کا حاصل شکستِ ساز ہے

"تم"

سحر کی یاد ہو تم اور خیال شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

تمھیں خیال کی رعنائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں اُمید کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں کو روح کی گہرائیوں میں دیکھا ہے
جدھر بھی آنکھ اُٹھی ہے فروغِ بام ہو تم

ہر اک اُمید کا میری تمھیں ہو گہوارہ
تمھیں ہو جیسے ہر اک درد کا مرے چارہ
تمھیں پہ آکے ٹھہرتی ہے چشمِ آوارہ
ہر ابتدائے تمنّا کا اختتام ہو تم

میں کون؟ اک گلِ افسردہ و دلِ ناشاد
تم ایک بزم کی زینت تم اک چمن کی مراد
کہاں تم اور کہاں مجھ سا زندگی برباد
مرے نصیب کی جس میں نہیں وہ جام ہو تم

الشا

اُفقِ حیات کا پھر بھی تمھیں سے ہو زرّیں
ہر ایک بزمِ تصوّر تمھیں سے ہو رنگیں
تمھارے سمت ہے دل کی نگاہِ بازپسیں
اندھیری زلیست کی اک زرنگار شام ہو تم

کروں میں عرضِ تمنّا مری مجال نہیں
سوال دل میں ہے اور جرأت سوال نہیں
تمھاری یاد سے خالی مگر خیال نہیں
میں کچھ کہوں نہ کہوں حاصلِ کلام ہو تم

خموشیوں میں ہے دمساز کون؟ تم جو نہیں
نظر نظر کا مری راز کون؟ تم جو نہیں
نفس نفس کی ہے آواز کون؟ تم جو نہیں
پیامبر ہوں اگر میں مرا پیام ہو تم

کسی نگاہ کا جو دل غلام بن نہ سکا
جو سر کبھی کسی چوکھٹ پہ آج تک نہ جھکا
تمھارے در پہ وہی آج ہے جبیں فرسا
تو کیا جہان کا ملّاؔ سے انتقام ہو تم

آنند نرائن ملا

من کی بانسری

یہ کیا چیز شانوں پہ بکھری پڑی ہے
کہ وارفتگی ناز فرما رہی ہے

ذرا پھر تو کہیے یہ کیا زندگی ہے؟!
مری بے کسی کروٹیں لے رہی ہے

شکستہ دلی سی شکستہ دلی ہے
محبّت بھی احساسِ بیچارگی ہے

مبارک گلستاں کو بادِ بہاری
تخیّل میں یاں خاک سی اُڑ رہی ہے

نہ گل ہیں نہ کلیاں نہ کانٹے
تہی دامنی سی تہی دامنی ہے

چلا جا رہا ہے وفا کا مسافر
جدھر بھی محبّت لیے جا رہی ہے

نہ موجیں نہ طوفاں نہ مانجی نہ ساحل
مگر کشتیٔ دل بہی جا رہی ہے

لباسِ تبسّم میں تیرے لبوں پر
تبسّم نہیں میری دیوانگی ہے

ایشیا

ہو ساجد سے مسجود سجدوں سے کعبہ
مری بندگی سے تری داوری ہو

بجا عشرتِ داوری یا الٰہی
غمِ بندگی پھر غمِ بندگی ہو

جہاں ہے اسیرِ جنونِ محبت
زمانہ مرا عکسِ دیوانگی ہو

جھکے جا رہے ہیں وہ شانوں پہ میرے
کہ تکمیلِ شوق و وفا ہو رہی ہو

جو چاہوں تو کندن کو ہیرا بنا دوں
نظر کیمیا سے سوا ہو رہی ہو

ہے اک معجزہ اُن کی آنکھوں کا عالم
اشارہ خدائی نظر داوری ہو

مری خاک پر سازِ یک تار لیکر
اُمید اب بھی اک گیت سا گا رہی ہو

مرے من کے بہروپ مت پوچھ ساغر
یہی ہے کنھیّا یہی بانسری ہو

سنہ ۱۹۴۰ء

ساغر

۱۵۲

پیامِ آتشیں

ایک نیا جہاں بنا مرکزِ غم کو پھونک دے
پرچم تو بلند کر تاج و علم کو پھونک دے
آتشِ تر کا دور ہو، سوزشِ غم کو پھونک دے
عیش کو کیمیا سمجھ درد و الم کو پھونک دے
حسنِ بتاں قدم قدم اور قدم قدم ارم
تیرا جہاں ہے خود ارم یادِ ارم کو پھونک دے
دل ہی حرم ہی دل ہی دیر دل کو بنا مقامِ سیر
دیر و حرم قریب ہیں دیر و حرم کو پھونک دے
دامنِ غم کو یوں نچوڑ کھول دے دل کا جوڑ جوڑ
توڑ مناتِ غم کو توڑ پھونک دے غم کو پھونک دے

پرواز جعفری

عورت سے خطاب

(اٹھارہ برس کے بعد)

(وہ نظم جو ساغر نے آل انڈیا خواتین کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۷ جنوری ۱۹۴۰ء الہ آباد میں پڑھی)

میں نے یہ مانا کہ تو ہے مادرِ نوعِ بشر ایک اک ذرّے میں سو عالم بسا سکتی ہے تو

فطرتِ خلّاق کے جوہر دکھا سکتی ہے تو

گوتم اور عیسیٰ کو پھر دنیا میں لا سکتی ہے تو

رنگ و نسل و قوم کے قلعوں کو ڈھا سکتی ہے تو مشرق و مغرب کو اک کنبہ بنا سکتی ہے تو

آمنہ اور دیوکی نے جو پلایا تھا کبھی پھر وہی ساغر زمانے کو پلا سکتی ہے تو

مریم و سیتا کی شیریں مسکراہٹ کی قسم آج بھی سنسار کو جنّت بنا سکتی ہے تو

دشمنی کی آنکھ سے ٹپکے سرشکِ مادری　　جنگ کے میدان میں یوں مسکرا سکتی ہے تو

پھول کو تبدیل کر سکتی ہے معجز نمائیں　　موم کو اک آن میں لوہا بنا سکتی ہے تو

لالہ وگل!؟ لالہ وگل تو ہے تیری گردِ راہ　　مہر و مہ کو اپنے قدموں پر جھکا سکتی ہے تو

تیرے جلووں کی زمانہ تاب لا سکتا ہے کب　　صرف پرتو سے جہاں کو جگمگا سکتی ہے تو

لوگ زندوں کو لئے پھرتے ہیں اے روحِ حیات　　میں تو یہ کہتا ہوں مُردوں کو جِلا سکتی ہے تو

امن کے دیوتا سے لے سکتی ہے تو قاتل کا کام　　ڈاکوؤں کو رحم کا حامل بنا سکتی ہے تو

موڑ سکتی ہیں تری نظریں کلائی موت کی　　قُم باذنی کہہ کے مُردوں کو جِلا سکتی ہے تو

فتنۂ محشر کہ جس کی مدّتوں سے دھوم ہے　　ایسے سو فتنے تبسّم سے جگا سکتی ہے تو

قہر اُلٹ سکتا ہے تیرا رنگ و بو کی کائنات　　لہلہاتے باغ کو صحرا بنا سکتی ہے تو

مہر سے تیرے اچھل پڑتی ہے سینوں میں حیات　　آدمیّت کو سراپا دل بنا سکتی ہے تو

۱۵۵ ایشیا

شورشِ صورِ قیامت ہی تری ترغیبِ جنگ پتھّروں سے آبگینوں کو بھڑا سکتی ہی تو

زمزم و تسنیم و گنگا جس جگہہ سیراب ہوں آنسوؤں سے اپنے وہ سنگم بنا سکتی ہی تو

دہر میں جس عقل کی بیداریوں کی دھوم ہے اُس کو تو صرف ایک لوری میں سُلا سکتی ہی تو

لیکن اے رازِ ازل اے چیستانِ زندگی!
بھید اب تک اپنا پایا ہی نہ پا سکتی ہی تو

۱۵۶ بنتِ حوّا ابنِ آدم کو ذرا یہ تو بتا اپنے فطرت کے نہاں خانے میں جا سکتی ہی تو؟

تو نے خود ڈالی ہی اپنے رُخ پہ جو رنگیں نقاب
کیا اُسے بھی دستِ نازک سے اُٹھا سکتی ہی تو؟

ساغر

امواجِ ساغر

جو اک نغمہ بھی دل سے عندلیب زار ہو جائے
چمن کیسا چمن کی خاک بھی بیدار ہو جائے

مزاجِ دل جو ہم رنگِ مزاجِ یار ہو جائے
کہاں کی زندگی، مرنا ہمیں دشوار ہو جائے

جو گستاخ تماشا حسرتِ دیدار ہو جائے
نظارہ روک بن جائے نظر دیوار ہو جائے

وہ دوشیزہ خرامی سے جو گلشن میں چلی آئیں
کلی محجوب ہو جائے چمن سرشار ہو جائے

نظر بھر کر جو وہ دیکھیں کلی کو پھول بن جائے
جو وہ کانٹے کو چھو لیں رشکِ صد گلزار ہو جائے

جدھر وہ آنکھ اٹھ جائے اُدھر جام و سبو چھلکیں
جسے وہ مست نظریں دیکھ لیں میخوار ہو جائے

ترے سر کی قسم گر تو نہ ہو میرے تصوّر میں
مری نازک طبیعت پر یہ دنیا بار ہو جائے

اگر تو مسکرا کر روئے رنگیں سے نقاب اُلٹے
ابھی عریاں نظامِ پردۂ اسرار ہو جائے

نگاہِ شوق کی یہ ذوقِ گلچینی، ارے توبہ!
رہے آنکھوں میں اور تیرے گلے کا ہار ہو جائے

اسی لمحہ کو شاید یاس کی تکمیل کہتے ہیں
محبّت جب مزاجِ عاشقی پر بار ہو جائے

وہاں کیا لطفِ آزادی وہاں کیا کیفِ آزادی
کہ احساسِ غلامی بھی جہاں دشوار ہو جائے

قفس ہے یہ گلشن میں غلامی کا جہنّم ہے
الٰہی رنگِ گُل ہی آج آتشبار ہو جائے

مسافر کے لئے ہے ننگ، احساسِ تن آسانی
الٰہی راہِ منزل اور بھی دشوار ہو جائے

وہ زندانی ہوں گر مچلوں تو زنداں بھی قدم چومے
وہ دیوانہ ہوں گر تڑپوں رسن بھی دار ہو جائے

غلامِ بادہ و ساغر نہیں کچھ فطرتِ ساغرؔ
جوانی دیکھ لے تو بن پیئے سرشار ہو جائے

پنہاری

یہ نظم سیّد مطلبی فریدآبادی کا شاہکار ہے، جن کی ترقی یافتہ ادبی جدوجہد نے ملک کو ایک خیال دیا ہے۔ مطلبی اُردو ادب میں جو بنیادی تبدیلی چاہتے ہیں اُس کا بہت کچھ اظہار "پنہاری" سے ہوتا ہے۔ مگر اس سوچی ہوئی تبدیلی کے بارہ میں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ وہ عام زبان بھی یہی چاہتے ہیں جو "پنہاری" کی زبان ہے، یہ زبان تو انھوں نے "ماحول" اور "موضوع" کے لحاظ سے لکھی ہے لیکن جہاں تک واقعیت نگاری (Realism) کا تعلق ہے وہ شاعری کو بالکل "محسوس" اور "مرئی" بنا دینا چاہتے ہیں۔

"پنہاری" میں جو آفاقیت پائی جاتی ہے وہ بڑی سے بڑی نظم کی خصوصیت ہوا کرتی ہے اور جو لطیف شاعرانہ محاکات پائے جاتے ہیں وہ ہر زبان کی اعلیٰ و مقبول نظم کا جزو ہوتے ہیں۔

اس نظم کا لطف کچھ وہی اُٹھا سکتے ہیں جنھوں نے ہندوستانی گاؤں کی زندگی کا مشاہدہ و تجربہ کیا ہے۔ نظم پڑھتے پڑھتے، ریت سے بھرے ہوئے رستے، کچے جھونپڑے، الاؤ، پنگھٹ، غربت، افلاس اور ان سب میں دبی ہوئی فطرت کی چنگاری، سورج کی طرح روشن معلوم ہوتی ہے۔

یہی اصل میں شاعری ہے۔ زبان گنوارو سہی، لیکن موضوع کے جن تعلقات اور جزئیات کو مطلبی نے کمال حسن و کامیابی سے نظم کیا ہے وہ آج سے ۵۰ برس کے بعد جب ہندوستانی گاؤں کا نقشہ چمکیگا پڑھنے والوں کے خیال میں آج کے ہندوستانی گاؤں کی تصویر کھینچ دینگے ہر قوم کی شاعری اُس کے تمدّن و تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ لیکن اُردو شاعری کے "الہامات" کو اگر جمع کیا جائے تو اُن سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کس قوم کی شاعری ہے!؟

یہ نظم کتابی صورت میں زیرِ طبع ہے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) اس پر مقدمہ لکھ رہے ہیں۔

سٰ غ ل

پنہاری

پنگھٹ کو پنہاری چالی[۱] — باندھے پیلی ساڑھی چالی[۲]

سر پہ کلسہ، کلسے پہ گاگر[۳] — ہاتھ میں نیجو[۴] مونجھ کی بھابر

کالی اِنڈوی[۵] میں کوڑی چمکیں — ناگن کی جوں مُنڈ کی دمکیں

[۱] چلی
[۲] ریشمی کنارہ
[۳] مٹی کا برتن
[۴] پتلی رسی
[۵] اینڈوا جو سر پر رکھتے ہیں اور جس پر مٹکا وغیرہ رکھتے ہیں

ہٹا ہٹا گھونگٹ کو، جھانکے　　　آتے جاتے سے مُنہ ڈھانپے
گھونگٹ میں مکھڑا یوں دمکے　　　بادل میں جوں چندا چمکے
مِرگ سی نینوں میں ڈوری کالی　　　ہونٹوں پہ ناگر پان سی لالی،
ناگوری نا کالی اَبلا　　　بھوری پتلی بالی اَبلا
چال اَبلا متوالی چالے　　　گھنگرو بولے جھُومر ہالے
کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی　　　لپک جھپک پنگھٹ پر آئی

کنوئیں کی من پر سکھیاں پائیں　　　یہ سب پانی بھرنے آئیں
سُکھیا، چُنیا، راجَ، دُلاری　　　رکھّی، جلّو، رُوپ کُماری،
اک بولی " اری بھُریا آئی"　　　کیوں واری! تیں نے دیر لگائی"
"کیا بھُریا! ترا رسیا آیا؟　　　جو کاجل تیں نے نینوں سارا
لپٹ گئیں سب" بات بتادے"　　　بھُریا ڈری کیا بات بتادے؟
لمحہ بھر رہی بھُریا چپکی،　　　بولی تو، اینڈ لاکر بولی
"نا داری! رسیا نا آیا،　　　سُپنے میں بہنا دی کھا پایا"
"وہ گھر میں گھر والا آیا　　　میں لے چوسکھ تھال جگایا"
"پلنگ نوایا سیج بچھائی　　　رکتی لجتی سیج پہ آئی"
"آنکھ کھُلی اتنے میں داری!　　　ساری رین ردردمیں ہاری"
کتنی بھُریا نے بات بنائی،　　　کوئی سکھی ایمان نہ لائی
اس پر رُوٹھی پھر بھُریا پیاری　　　پانی بھرن لگی پنہاری

گھڑ گھڑ کر چکی بولی ٭ تریا نے من گھنڈی ناکھولی

پانی لے کر گھر کو چالی ٭ ڈر ڈر پگ ٹ دھرتی متوالی
پلٹ پلٹ کر بھریا دیکھے ٭ رام نہ کر یو آج پر یکھے
اِشور جگ کی لاج رکھیا ٭ بچا رہے مرا ناؤ کھِویا
ٹھہرے مالک وائے بچاوے ٭ میرا کھیوا پار لگادے
من ہی من میں کہتی پہونچی ٭ گھر کی جا کر سنکل کھولی
برتن مانجھے چوکا کینا ٭ گھی آٹا مٹکی سے لینا
دال پکائی ساگ بنایا ٭ گھی ہلکا روٹی پہ لگایا
اک ڈلیا میں روٹی راکھی ٭ پیاز کا گنٹھا بتون بھاجی
سر پہ دودھ کی مٹکی راکھی ٭ ہاتھ پہ روٹی کی ڈلیا لی
جنگل کو اب تریا چالی ٭ گھر کا کوئی نہیں رکھوالی
ڈرتی ڈرتی گاؤں سے نکلی ٭ پورب کی رگکھیا کی سُدھ لی
پلٹ پلٹ کر گاؤں کو دیکھا ٭ چاروں اُور نظر کو پھینکا

گاؤں سے رگکھیا یوں چمکی ٭ جیسے بنی ہو کجلی بن کی
اِدھر اُدھر نیلی سی پہاڑی ٭ بیچ میں پیڑوں کی ہریالی
سر پر گول چھتری سی لگائے ٭ لمبی پتلی نارٹیں اُٹھائے
چاروں کھونٹ کھجور کھڑے تھے ٭ کھیت کے ہوں جیسے رکھوالے

کدم کے روکھوں کی چھب نیاری — گہری سبزی پیاری پیاری
برگد نے تھا ڈیرا چھایا — لاکھ پکھیرو جس میں سمایا
پوکھر کا وہ نتھرا پانی — دُوب کنارے دھانی دھانی
دُوب میں سارس کا اک جوڑا — کدم کے ڈالے پر دو مورا
اُس کے نیچے آسن مارے — سادھو کا کچھ رُوپ سادھارے
گبرو بیٹھا اک متوالا — نیچے بچھائے مرگ کی چھالا
نینوں میں راتیں جاگی لالی — صورت تیکھی رنگت کالی
چاروں اُور لکھاتا جاوے — جتنا لکھا وے من گھبراوے
گھبرا دے تو گاوے سادھو — من کو یُوں بہلاوے سادھو
کچھ چھوڑے کچھ گاوے سادھو — انت کبیر سناوے سادھو

دم نکلے پیچھے گھڑی بھی ڈاٹے نا کوئے ..... دم نکلے ....
کنٹھ پکڑ واکی ماتا رووے مجھا پکڑ واکا بھائی
بھری جوانی میں تریا روئے چھوڑ اکیلا جائی .... دم نکلے ....
جدلک تیل دیے میں باتی جگ مگ جگ مگ ہوئے
پھنک گیا تیل نچڑ گئی باتی گھپ اندھیرا ہوئے ..... دم نکلے ....

لوگ کہیں سب لے چل لے چل دھیر دھرے نا کوئے
جاکی بات تو جانے لینے دنیا کائے کو روئے .... دم نکلے ....

پانچ چورو اکے گھر میں گھُس گئے ، نیاری پڑکر سوئی
کہت کبیرؔ سن بھئی سادھو جان مان بدھ کھوئی
دم نکلے پیچھے گھڑی بھی ڈاٹے نا کوئی . . . . دم نکلے . . . . . .

ایسا بے سُدھ ہو کر گایا — رگکھیّا میں سنّاٹا چھایا
سورج دیو نے مُنہ ڈُبکایا — رین نے بڑھ کر پنکھ پھرایا
موروں نے گردن نیوڑھائی — سارس نے جا پکڑی کائی
چلتی پَوَن نے آنکھ مُندائی — پنچھی سمجھے رتیا آئی
بند ہوئے پانی کے ہلورے — پتّوں میں سب چھپ گئے بھونرے
گھٹنوں پہ دونوں ہاتھ جمائے — پتھر کی مورت سی بنائے
آنکھیں میچے بیٹھا سادھو — سُدھ بُدھ جیسے بھولا سادھو

تھوڑی دیر رہا سنّاٹا — سوکھا پتّہ تک نا کھڑکا
دہنے ہاتھ پیوڑی بولی — رات کی رگکھیّا کی رکھوالی
سادھو نے بھی پلک اُٹھائی — لے کے جمائی، لی انگڑائی
سوکھی پیوڑ میں آہٹ آئی — سادھو نے واں نظر جمائی
کالا، چھوٹا سا اک سایا — جھاڑی سے نکلا آگے آیا
"کون ہے؟ ناری؟ اچھا بھرپایا! — تمہاری داسی نگر کنھیّا!"
مٹکی راکھی، ڈلیا راکھی، — سیّیں نوا، لی پیر کی ماٹی

ہاتھ جوڑ کر ہو گئی ٹھاری — بھوجن کر لے ہیں بلہاری

"بدھو گوا لے نے پاڑا بیورا — پھڑک گئی، میرا آیا بھونرا"

"پانی لائی چوکا کینا، — تا ول تا ول، بہے پسینا"

"کچی پکی روٹی پوئی — جلدی میں بندی بھی کھوئی"

"لپ جھپ کر میں رکھیا آئی — اِشور کر لی میری سُنائی"

"نا ترے بھیا کو بھید بتایا — نا کوئی مانس دگرڑے پایا"

"جیم لے سائیں تو ئے مناؤں — پھر لوٹے تو پیر دباؤں"

"تین مہینے بن تو ترسی — آج کہاں آ بدلی برسی"

"یوں ہی برسے نت نت برسے — ایشور! بھریا اب نا ترسے"

"دِن دِن دنیا نے بات بنائی — دن نکلے اور آئیں سپاہی"

"تیرا بیری بڑو باٹ لکھاوے — کب پکڑا کب مارا جاوے"

"ہوویں دن دن بنیا بٹلے — سُور جیسے موٹے، کٹھلے،"

"نمبر دار کے روز کمیٹی — رُووَں سب سُن لوٹی موٹی"

"رات دِنا ترا چرچا گھر گھر — تیری بہن گھر، میرے بھیا گھر،"

"دو ٹبیر دوڑ پولس نے ڈالی — دونوں بیر گئی پر کھالی"

"جنگل جنگل پھریں سپاہی — سہمی سُن سُن رام دُہائی"

"سیلی ہوئے کھاؤ ساجن — راتوں پھر بتلاؤ ساجن"

کندھے ڈال مرگ کی چھالا — کھڑا ہوا سادھو متوالا

کولی بھر لی، گود م ٹھائی — گود لئی چھاتی سے لگائی،

ایشیا

پھُول نرم سے جے ہنس کا بچّا — چکنی جے ریشم کا لچھّا"
پَچ پَچ جوبن میں مد۱؎ ماتی — لپٹ گئی ساجن کی چھاتی"
تریا نے گل بہیّاں ڈالیں — ڈالیں پر آنکھیں مچکالیں

پَوَن نے ہلکی سانس نکالی — ٹھنڈی ٹھنڈی سی کچھ چالی
کدم کے روکھ میں جُگنو چمکے — چمکاروں سے پتّے دمکے
مور مورنی لکھائے بیٹھے — پنکھ سے پنکھ بھڑائے بیٹھے
ناڑ اُٹھائے، آنکھ جمائے — کچھ گھبرائے، کچھ للچائے،
آہٹ سی کائی میں آئی، — سارس ٹہلیں جیسے سپاہی
چاروں آنکھ سادھو پہ جمائے — گردن ٹھائے پنکھ پھُلائے
رت۲؎ ساگر کا کالا گھیرا — ہوگیا پھر ویساہی اندھیرا
پہلی سی گم سُم، پہلی سی چُپ چُپ — سادھو کی گود میں تریا گُپ چُپ
تاڑ سا ٹھارا گُم سُم سادھے — اندھیاری میں پوٹ سی باندھے

پریم پجُارن، پریم پجُاری
پریم کی دنیا ہے اندھیاری

(باقی آئندہ)

مُطلبّی فریدآبادی

۱؎ نیچے
۲؎ شراب
تیسا بنفشی
۳؎ نجیبات
سفیدی رات

ہم تم

وہ دَور یاد ہے جب بیقرار تھے ہم تم
بکارِ دل ہمہ تن انتظار تھے ہم تم
وہ وقت یاد ہے جب نغمہ بار تھے ہم تم
وہ عہد یاد ہے جب کامگار تھے ہم تم

(الف)

وفا نصیب، محبّت شعار تھے ہم تم

قیودِ دُوریٔ منزل کو توڑ تاڑ گئی
جنوں کی سوئی ہوئی روح کو جھنجوڑ گئی
دلوں پہ نقشِ حیاتِ دوام چھوڑ گئی
جو پہلی بار مِلی اور دلوں کو جوڑ گئی

اُسی نگاہ کی اک یادگار تھے ہم تم

ایشیا

وہ وادیوں میں سفر اور وہ چاندنی راتیں
وہ گھاٹیوں میں شب و روز شوق کی باتیں
وہ آرزو کا مچلنا، وہ درد کی گھاتیں
بساطِ دل پہ مشیئت کو اَن گِنت ماتیں
فتوحِ عشق کے سرمایہ دار تھے ہم تم

کلی کلی سمنستاں کو ناز تھا جس پر
روش روش پہ گلستاں کو ناز تھا جس پر
چمن کہاں کا بیاباں کو ناز تھا جس پر
جہاں میں رُوحِ بہاراں کو ناز تھا جس پر
نسیمِ گُل کی قسم وہ بہار تھے ہم تم

جو میں تھا بُلبلِ گلشن، تو تم گُلِ رنگیں
جو میں تھا مہر، تو تم تھیں مثالِ ماہِ مُبیں
ہمارے پاؤں پہ جُھکتی تھی ساعتوں کی جبیں
جو میں تھا صبحِ منوّر، تو تُم شبِ زرّیں
جہانِ عشق کے لیل و نہار تھے ہم تم

(ب)

(ایضاً)

مَتاعِ طُور کا معدن تھا عالمِ امکاں
جمال و نور کا مخزن تھا عالمِ امکاں
ہمارے عکس سے گلشن تھا عالمِ امکاں
ہمارے نور سے روشن تھا عالمِ امکاں
سپہرِ عشق کے برق و شرار تھے ہم تم

رُلا رُلا کے محبّت میں دل کو روتا کون؟!
جہازِ زیست کو طوفان میں ڈبوتا کون؟!
اور آرزو کے کنول ارضِ دل میں بوتا کون؟!
جہانِ عشق کا پروردگار ہوتا کون؟!
جہانِ عشق کے پروردگار تھے ہم تم

ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی عاشقی بیعت
ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی ساحری بیعت
ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی زندگی بیعت
ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی شاعری بیعت
جہانِ شعر کا وہ شاہکار تھے ہم تم

(ج)
ایشیا

شرارِ گُل نے چمن کو کیا تھا خاکستر
صبا نے خاک اُلٹ دی تھی جام و ساغر پر
حسد سے شمع تھی محفل میں آتشِ یکسر
دلوں کا ذکر نہیں دل تو خاک تھی جل کر
کسی جگہ تو نگاہوں پہ بار تھے ہم تم

وہ حُسنِ عشق کی حکمت نے ہم کو بخشا تھا
وہ شوقِ حُسن کی فطرت نے ہم کو بخشا تھا
وہ ذوق، ساقیٔ قدرت نے ہم کو بخشا تھا
وہ ظرف، کیفِ محبّت نے ہم کو بخشا تھا
کہ آنکھ بند تھی اور ہوشیار تھے ہم تم

(د)

سمن سمن تھا بلاوا، سحر سحر آغوش
چمن چمن تھی تمنّا، شجر شجر آغوش
نفس نفس تھا تقاضا نظر نظر آغوش
نہ تھا نشانِ زمان و مکاں، مگر آغوش
قدم قدم پہ کبھی ہم کنار تھے ہم تم

ایشیا

ہمارے دم سے ندا تھی ہمارے دم سے ندیم
ہمارے دم سے صدا تھی ہمارے دم سے کلیم
ہمارے دم سے گھٹا تھی ہمارے دم سے شمیم
ہمارے دم سے سحر تھی ہمارے دم سے نسیم
کہ حاصلِ چمن روزگار تھے ہم تم

ہر ایک ذرّے سے کرتے تھے آسماں پیدا
ہر ایک نقطے سے کرتے تھے سو جہاں پیدا
ہر ایک چُپ سے ہماری تھے سو بیاں پیدا
ہر اک نگاہ سے کرتے تھے داستاں پیدا
قدم قدم پہ فسانہ نگار تھے ہم تم

(۵)

وفا کے نقش پہ قرباں تھی لالہ کاری بھی
وفورِ کیف سے رقصاں تھی کامگاری بھی
مٹی ہوئی تھی تعلق پہ دوستداری بھی
اثر سے وجد میں تھی روحِ جاں نثاری بھی
کچھ ایک دوسرے پر یُوں نثار تھے ہم تم

ایشیا

(۹)

تغیرات پہ گہرا سکوں سا چھایا تھا
دلِ حیات پہ ہلکا سکوں سا چھایا تھا
یہ کائنات تھی سادا سکوں سا چھایا تھا
ہر ایک شے پہ کچھ ایسا سکوں سا چھایا تھا
کہ جیسے سارے جہاں کا قرار تھے ہم تم

وہ ایک برقِ محبت، وہ صنعتِ قدرت
وہ ایک آیۂ ہستی، وہ رحمتِ قدرت
وہ ایک امرِ الٰہی، وہ حکمتِ قدرت
عطیۂ غمِ الفت، ودیعتِ قدرت
متاعِ عشق کے سرمایہ دار تھے ہم تم

قیامتیں تھیں بپا چرخ کی سیاست میں
ہمارے نام تھے سرنامۂ بغاوت میں
کھٹک رہے تھے بہت دن سے چشمِ فطرت میں
ہماری ذات تھی اک تیر قلبِ قدرت میں
ازل سے چشمِ مشیت میں خار تھے ہم تم

ایضاً

ہر ایک پردہ تھا مضرابِ سازِ الفت کا
کمال دیکھئے اک نغمۂ محبّت کا
طلسم ٹوٹ گیا تھا حریمِ قدرت کا
گلہ سا بیٹھ گیا تھا نفیرِ فطرت کا
چمن میں جھوم کے یوں نغمہ بار تھے ہم تم

وہ بھید ہے کہ کوئی اس کو پا نہیں سکتا
وہ نغمہ ہے کہ کوئی کھل کے گا نہیں سکتا
میں دیکھ سکتا ہوں پردہ اٹھا نہیں سکتا
میں سوچتا ہوں مگر لب پہ لا نہیں سکتا
کہ کس جنونِ وفا کا شکار تھے ہم تم

ساغر نظامی

بندۂ محبت

جنرل ذوالشان نواب معظم جاہ بہادر شجیع

خاموش تھے ہم، ضبط کا امکاں بھی نہیں تھا
مشکل نہ سہی غم مگر آساں بھی نہیں تھا

میں اُس کے ستم سے کہ پشیماں بھی ہوں خوش بھی
وہ مجھ پہ ستم کر کے پشیماں بھی نہیں تھا

(ح) جیسے ہی کیا ترکِ ستم عشق میں تم نے
ہم پر ستمِ گردشِ دوراں بھی نہیں تھا

موت آئی جو زنداں میں یہ تقدیر تھی میری
وحشی تھا مگر قابلِ زنداں بھی نہیں تھا

ہم جب سے اسیری کے مزے لوٹ رہے ہیں
کیا ذکر نشیمن کا گلستاں بھی نہیں تھا

وحشت ہمیں لے آئی کہاں راہِ طلب میں
جب آنکھ اُٹھائی تو بیاباں بھی نہیں تھا

تھا درد کی صورت میں خود احساسِ محبت
پنہاں جو نہیں تھا تو نمایاں بھی نہیں تھا

آخر نہ دیا ساتھ دمِ نزع کسی نے
دیکھا تو مرا حال پریشاں بھی نہیں تھا

بندہ تھا شجیع اور فقط عشق کا بندہ
کافر بھی نہیں تھا وہ مسلماں بھی نہیں تھا

کسوٹی

کائنات دل

از منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی
پبلشر رادھکا پرشاد سکسینہ بلبلی خانہ دہلی
قیمت مجلد عگر غیر مجلد عا

آج جو لوگ اپنی "عدم واقفیت" یا "سیاسی مصلحت" کی بناء پر اُردو زبان کو صرف مسلمانوں کی قومی زبان بتاتے ہیں اور اس طرح غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی برسہا برس کی محنتوں پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں وہ "کائنات دل" کا مطالعہ کریں جو منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی کا تقریباً سوا تین سو صفحات کا دیوان ہے۔ جس میں منور صاحب نے نہ صرف یہ کہ زبان کی صحت کا خیال رکھا ہے بلکہ خوش اسلوبی بیان اور جدّت خیال کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔

منوّر صاحب نے خود بھی "اُردو" کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

منزلِ اَوج پہ لہرائے نشانِ اُردو — ہر شرف کی ہے سزاوار زبانِ اُردو
زاویہ اپنی نگاہوں کا بدل دیتا ہے — نظر آئے نہ کوئی دشمن جانِ اُردو
کام سے اپنے جو دنیا میں لے کام رہا — مٹ سکیگا نہ کبھی نام و نشانِ اُردو

"کائنات دل" منوّر صاحب کی نظموں اور رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ منوّر اردو شاعری کے جدید ارتقائی دور اور اس کی ہمہ گیری سے متاثر ہی نہیں بلکہ رنگِ جدید کے پیرو بھی ہیں۔ اس مجموعہ میں تقریباً سو نظمیں متفرق عنوانات پر ہیں جیسے "مطربہ سے" "طاؤس" "ضمیر کی آواز" "پھولوں کی بہار" وغیرہ تقریباً تیس نظمیں عالمگیر شخصیتوں پر ہیں اور ان شخصیتوں میں جہاں مہاراج کرشن اور رام چندر جی نظر آتے ہیں وہاں پیغمبر اسلام صلعم اور حضرت علیؑ کے اسمائے گرامی بھی موجود ہیں۔

بارہ نظمیں "ذاتی اعتقادات" سے متعلق ہیں۔ تیرہ نظمیں "قومی جذبات" کی ترجمان ہیں۔ تقریباً پچیس نظمیں منظوم تراجم ہیں اور چند نظمیں ملک کے مقتدر و مرحوم رہناؤں کے مراثی ہیں۔

"محبت کا مذہب" کے ماتحت منوّر نے جو کچھ لکھا ہے وہ موجودہ ملکی فضا کیلئے ایک مستقل درس ہے۔

نہ کوئی یہودی نہ کوئی نصاریٰ — ہو بس ایک مذہب ہمارا تمہارا
محبت کی تنویر ہو عالم آرا — دکھائے یہ وحدت کا ہم کو نظارا

طریق پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

نہ مسجد میں جائیں نہ مندر میں جائیں — قدم اُٹھ کے گرجا کی جانب اٹھائیں
محبت کو معبود اپنا بنائیں — مسرّت کے عالم میں یہ راگ گائیں

طریق پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

"کشمکش" کا آخری شعر خوابیدہ دلوں کیلئے اذن بیداری ہے۔

تیرے لئے حیات کا دامن نہ تنگ ہو — دعوائے زندگی ہے تو مصروفِ جنگ ہو

"اک نیا پیغام" کو اس طرح شروع کیا گیا ہے۔

بانیٔ اسلام اے خورشید تابانِ عرب — اے محمد مصطفےٰ جانِ عرب شانِ عرب

اسی نظم میں آگے چل کر نہایت صداقت کے ساتھ ایک حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

بے خبر قرآن کے معنی سے کچھ میں بھی نہیں
عظمتِ اسلام سے واقف مسلماں بھی نہیں

اس میں شک بھی کیا ہے آج اگر مسلمان عظمت اسلام سے
واقف ہوتے تو ان کی اکثریت آزادی کے میدان میں تمام قوموں سے
آگے ہوتی اور سامراج شاہی کا آلۂ کار بنی ہوئی نہ ہوتی ۔
" راجپوتی حسن " میں ذیل کے اشعار پڑھئے اور لطف اٹھائیے ۔

تھی آن کی پجارن یہ بات کی دھنی تھی
عظمت میں لکشمی تھی عصمت میں پدمنی تھی
دامانِ بوالہوس کو پیروں سے روندتی تھی
خرمن پہ معصیت کے بجلی سی کوندتی تھی
بھولے سے بھی جو آکر اس کو وہ چھیڑ دیتی
پیراہنِ صبا کے بخئے اُدھیڑ دیتی
پاکیزگی کا جوہر کرتا تھا ضو فشانی   تھی جس کے گھر کی رانی تھی اسکے گھر کی رانی

قومی نظموں میں جذبہ وطن پرستی و حریت نوازی نمایاں ہے ۔

پسند آئے نہ کیوں ہم کو پرستار وطن ہونا
اسی کے دم سے وابستہ ہے موت اپنی حیات اپنی

ہندو اور مسلمانوں سے کیا خوب کہا ہے ۔

کیوں عقل کے دشمن بنتے ہو جس سے ہو بھلا وہ کام کرو
مطلب کے لئے ناحق لڑکر مذہب کو نہ تم بدنام کرو

ایک نظم کے یہ شعر بھی شاعر کے قومی تاثرات کے آئینہ دار ہیں ۔

دفتر مشاہدہ جاری ہے کتاب انقلاب   بند کرسکتا ہے کوئی خاک باب انقلاب
تم بھی ہوجاؤ ہم آہنگ رباب انقلاب   ورنہ خموشی سے جھکاکر سر جواب انقلاب
اس پہ قابو تم کسی عنوان پا سکتے نہیں
خود فنا ہو جاؤ گے اسکو مٹا سکتے نہیں
ستم و جور کو بنیادِ حکومت نہ بنائے   کون کہتا ہے کہ انسان حکومت نہ کرے

رباعیات بھی درس آموز ہیں ۔

یکساں ہر اک کی چال کیسے ہو جائے   تیرا جو ہے سب کا حال کیسے ہو جائے
ہے تیری پسند کچھ اور اسکی کچھ اور   دنیا تری ہم خیال کیسے ہو جائے

جتنی تری روح پاک و اطہر ہوگی   جتنی تجھے روشنی میسر ہوگی
اتنا ہی لطیف تیرا قالب ہوگا   اتنی ہی خوشی تجھے منور ہوگی

ہمیں امید ہے کہ منور صاحب کا مستقبل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لکھائی چھپائی اگرچہ معمولی ہے مگر نفاست لئے ہوئے ہے ۔ کتابت کی غلطیاں بہت ہیں اور باوجودیکہ چار صفحوں کا صحت نامہ شروع میں موجود ہیں مگر ان غلطیوں کے علاوہ بھی بہت سی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں ۔

رازونیاز   از حبیب اشعر دہلوی

دائرۃ الادب محلہ رودگراں دہلی و منزل بک ڈپو پی بکس نمبر ۱۰۷ بلی ماران دہلی ۔

حبیب اشعر صاحب ملک کے ان نوجوان شاعروں میں سے ہیں جن سے ہماری دنیائے ادب کی بہت سی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں ۔ رازونیاز ان کی غزلیات کا بہت مختصر مجموعہ ہے ۔ اشعر صاحب نے ان غزلیات کے متعلق خود اپنے قلم سے یہ لکھدیا ہے ۔

" اس ڈیڑھ جزو کے دیوان میں کیا کیا نقائص ہیں یا کیا کیا خصوصیات ہیں اس کا فیصلہ تو نقاد فن " ہی بخوبی کرسکتا ہے ۔ تاہم ایک خصوصیت جس کو قائم و برقرار رکھنے کیلئے میں نے امکان بھر کوشش کی ہے یہ ہے کہ تخیل پست ہو یا بلند لیکن الفاظ غیر مناسب نہ ہونے چاہئیں "

چنانچہ اشعر کے حسب ذیل اشعار اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں ۔

کرم میں کہاں لذتِ بیقراری   دل آزاریاں پھر دل آزاریاں ہیں
تری یاد دلمیں ترا نام لب پر   جنوں میں بھی اسدرجہ ہشیاریاں ہیں
نہیں ہے تو فکرِ دل و دیں نہیں ہے   اگر ہیں تو تیری طلبگاریاں ہیں

یہ جن دیوانوں سے ان کی توجہ بے تعلق ہے
یہی دیوانے ان کی بزم کے محرم بھی ہوتے ہیں

ان کو کیا معلوم ان کی اک نظر کیا چیز تھی
مجھ سے پوچھو اب مرا دل واقعی دل ہو گیا

ساقی حواس و ہوش کا ہنگامہ گرم ہے
ایسے میں ایک گردشِ پیمانہ چاہیے

لکھائی چھپائی صاف ستھری اور کتابت کی غلطیوں سے تقریباً پاک ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اشعر صاحب کا آئندہ مجموعہ جو شائع ہوگا وہ ہماری بہت سی امیدوں کو پورا کردے گا۔

معارفِ جمیل | از حکیم آزاد انصاری
کاشانہ باز۔ بازار گھانسی حیدر آباد دکن
قیمت مجلد ۱۲/ غیر مجلد ۱۰/

موجودہ زمانہ میں اردو ادب کے حقیقی مربی و نبض شناس اردو شاعری کو بین الاقوامی سطح پر پہنچانے کیلئے اس کے قدیم نظام کو ایک انقلابی گردش دے کر از سرِ نو ترتیب دینے کی سعی کر رہے ہیں اور اس سعی کا ایک جزوی مقصد یہ بھی ہے کہ "غزل گوئی" کے فرسودہ رواج نے ہماری شاعری میں جو "معنوی جمود" پیدا کر دیا ہے اس کو رنگین۔ پاکیزہ۔ موثر۔ بلند خیال نظموں کے ذریعہ آہستہ آہستہ ختم کر دیا جائے۔

اس جدوجہد کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں غزل گوئی کا رواج کم ہوتا چلا جائے اور غزل گو شعراء کو "مقبولِ عام" کی سند حاصل کرنے کیلئے قدرتی طور پر "نظم" کی پناہ لینی پڑے۔ غور کیجئے ایسے ادبی آشوب کے زمانہ میں ہندوستان کے کتنے غزل گو شاعر ایسے ہیں جو زمانہ کی آوازوں اور فضاؤں کے تقاضوں کے خلاف اپنے کلام کو "غزل گوئی" کی حدود میں رکھتے ہوئے اپنی قادر الکلامی کا سکہ دلوں پر بٹھا سکیں۔

ہمارے بزرگ دوست حکیم آزاد انصاری ہمارے ملک کے ایک ایسے ہی کامل فن شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ "غزل گوئی" کے دامن سے فرسودگی کا داغ مٹایا بلکہ اپنے نتائجِ فکر کچھ اس انداز سے دنیائے ادب کے سامنے پیش کئے کہ غزل گوئی بجائے خود حسین معلوم ہونے لگی۔ ان کے کلام کا مجموعہ "معارفِ جمیل" ہمارے پیش نظر ہے۔

آج کل کسی اہلِ ذوق کا "آزاد" سے واقف نہ ہونا "فقدانِ علم و ادب" کی دلیل ہے کیونکہ آزاد اسرارِ علم و رموزِ ادب کا راز داں ذوقِ سلیم کا نباض اور فنِ شاعری کا حکیم بے بدل ہے۔ یہ آزاد کے کلام کا اعجاز ہے کہ وہ غزل گو ہوتے ہوئے ہمارے ملک کے شعراء کی صفِ اولیں میں ہے اور بعض خصوصیات میں تو وہ اپنے ہمعصروں کو دو قدم پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ وہ اپنے اندازِ بیان کا خود ہی موجد ہے اس نے خود بھی اس حقیقت کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

دیوانِ جدیدِ شاعری لایا ہوں — قرآن مجیدِ شاعری لایا ہوں
ختم الرسلِ شعر ہوں، من جانبِ حق — فرقان حمیدِ شاعری لایا ہوں

جن لوگوں نے آزاد کے کلام کا غور سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ "ختم الرسلِ شعر"، مضمون آفرینی۔ پاکیزگی تخیل بحاورہ بندی اور ایک مخصوص اندازِ بیان کے اعتبار سے ایک جداگانہ ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ اس نے حسن کا جمالیاتی اور عشق کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اسی لئے وہ جب رموزِ محبت و اسرارِ جمال کو بے نقاب کرتا ہے تو اس خوبی سے کرتا ہے کہ شعر میں "فلسفیانہ خشکی" نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ اس کی بجائے سامع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

تمہارا ماننا طاقت سے باہر تھا مگر مانا — تمہارا جاننا امکاں سے خارج تھا مگر جانا
وہ اک حیرت فزا ساعت۔ وہ اک بالکل نئی حالت — وہ اک جلوہ نظر آنا۔ وہ اک عالم گذر جانا

بے کسی کی جستجو ہے فرض ہیں۔ تا زیست فرض
اب کسی کی آرزوئیں دین و ایماں ہو گئیں
ایک میں کیا ساری دنیا ان ادواں پر نثار
جو مجھے دنیا سے کھو کر اور نازاں ہو گئیں

۱۶۷

ایضاً

" اور نازاں ہوگئیں " حسن کی فطرت کی طرف کس قدر لطیف
اشارہ ہے ۔

آج ضبطِ غم کی خدمت کون سرانجام دے   میں بھی گھبرایا ہوا ہوں دل بھی گھبرایا ہوا
کون کہتا ہے کہ منہ مانگی مرادیں بخش دے   یہ گذارش تھی کہ اک سائل کا دل تھوڑا ہوا

جگہ جگہ آپ کو پاکیزہ محاورے ۔ نادر مضامین اور دلکش
اندازِ بیان ملیگا ۔

مرے شوقِ سزا کا خوفناک آغاز تو دیکھو   کسی کا جرم ہو اپنی خطا معلوم ہوتی ہے

اس " خوفناک آغاز " کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو
اس آغاز سے خود گذرے ہوں خشک فلسفیانہ نظریات کو آزاد کس
قدر سادگی سے ادا کرتا ہے ۔

کبھی عالم کی ہستی اصل پر مبنی سمجھتا ہوں   کبھی بالکل نمودِ سیمیا معلوم ہوتی ہے

ایک بے پناہ شعر یہ بھی سنئے

بس اب بیچارگی سے صلح کر لینی مناسب ہے
کہ اب بیچارگی اس کی رضا معلوم ہوتی ہے

ایک طرف زندگی کی پوری داستان ہے جس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ انسان بیچارگی اسی وقت قبول کر سکتا ہے جب کوئی اور چارۂ
کار ہی نہ رہے ۔ دوسری طرف صلح کر لینے کی جو توجیح کی گئی ہے ۔ وہ
انسانی فطرت کے نفسیاتی مطالعہ کیساتھ ساتھ عشق کا آئیڈیل بھی پیش
کرتی ہے پھر شعر کا آغاز کچھ اس طرح کیا گیا ہے گویا داستان ختم ہونے
کے بعد یہ ایک ضروری بات تھی جو کہنے سے رہ گئی تھی اور اس کے
بعد داستان ختم !

مناسب ہو تو اب پردہ اٹھا کر   ہمارا شک بدل ڈالو یقیں سے
زمانے بھر سے جو چاہو سو مانگو   مگر ان کو طلب کرنا انھیں سے

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دیگی   ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کر
اگر آزاد سا درویش آنکھوں میں نہیں جچتا   تو جا ۔ اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

محبت کے پیرو ! محبت سے شکوے   محبت کے مذہب سے غداریاں ہیں

آزاد صاحب کے کلام کی بڑی خصوصیت " ترصیع جدید " تو
ایسی ہے جس کے وہ اردو ادب میں تنہا مالک ہیں ۔ اس صنعت
کی تفصیل خود انھیں سے سنئے

" ترصیع جدید : اس صنعت کا موجد خاکسار
ہی ہے ۔ میں نے اس صنعت کا اکثر غزلوں نظموں
قصیدوں اور ترکیب بندوں وغیرہ میں استعمال
کیا ہے ۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مطلع تو
حسب دستور رواجِ قدیم ہی کے موافق ہوتا ہے
لیکن باقی اشعار میں کبھی مقطع کے علاوہ اور کبھی
بشمول مقطع تمام دو دو شعروں کے اول مصرعے
انگریزی نظم کی طرح ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر
دو شعر کے بعد اول کے دونوں مصرعوں کا قافیہ
بدل جاتا ہے ۔ مگر ثانی مصرعوں کا نہیں بدلتا ۔
بلکہ حسب رواج قدیم تمام اشعار میں آخر کے تمام
مصرعے آخر تک مطلع ہی کے ہم قافیہ و ہم ردیف
چلے جاتے ہیں "

اب اس صنعت کے سلسلہ میں حسب ذیل اشعار پڑھیے اور
غور کیجیے کہ آزاد اس مقام پر کس قدر بلند نظر آتا ہے ۔

آؤ پھر موقعہ ہے کچھ اسرار کی باتیں کریں   صورت منصور بے کیں دار کی باتیں کریں
آؤ پھر کون و مکاں کو قیدِ ظلمت سے چھڑائیں   آؤ پھر اس روئے مہر آثار کی باتیں کریں
آؤ پھر دونوں جہاں کو عطرِ جنت میں بسائیں   آؤ پھر اس زلفِ عنبر بار کی باتیں کریں
آؤ پھر ذکرِ جمیلِ دوست سے مسرور ہوں   آؤ پھر حسن و جمالِ یار کی باتیں کریں
آؤ پھر سارے جہاں کو لیکے غرقِ نور ہوں   آؤ پھر اس قلزمِ انوار کی باتیں کریں

حضرت آزاد سب نامحرمِ اسرار ہیں   کس سے بے خوفِ فساد اسرار کی باتیں کریں

آزاد کی اس خصوصیت نے ان کی غزلوں کو نظموں کا مرتبہ
دے دیا ہے ۔

جو آتا ہے دکھ کی دوا بن کے آ   قضا بن کے آنے سے کیا فائدہ

ستانا روا ہے تو بے شک ستا　　گر بھول جانے سے کیا فائدہ

سزا کے مزے لوٹنے دیجئے　　خطا بخشوانے سے کیا فائدہ

منظومات میں "خطبہ بہار" ایک مستقل اعلان جہاد ہے۔

مساجد نشینو۔ مساجد کو چھوڑو　　کہ طاعات سے جی چرانے کے دن ہیں
معابد گزینو۔ معابد کو چھوڑو　　کہ زہد و ورع بھول جانے کے دن ہیں
سمن رو نگاروں کو ہمراہ لے کر　　گلستاں میں چکر لگانے کے دن ہیں
سے آ شام یاروں کو ہمراہ لے کر　　چمن پر تسلط بٹھانے کے دن ہیں

اٹھو اور مکائد کی ہستی مٹا دو　　مکائد کی ہستی مٹانے کے دن ہیں
اٹھو اور مفاسد کی تعمیر ڈھا دو　　مفاسد کی تعمیر ڈھانے کے دن ہیں

اس کے بعد ہی آزاد خیام کے فلسفہ کو اردو میں اس طرح پیش کرتا ہے۔

جہاں تک ہے۔ زندگی شاد کا ٹو　　زمانے کو یہ گر سکھانے کے دن ہیں
جہاں تک ہے۔ زیست آزاد کا ٹو　　جہاں کو یہ نکتہ سمجھانے کے دن ہیں

اٹھ آزاد حق کوشش موقع ہے جلد اٹھ
کہ اوہام پر فتح پانے کے دن ہیں

دیوان کے آغاز میں خود آزاد صاحب نے اپنا "تعارف" لکھا ہے جس کا انداز "خطیبانہ" ہے جو شاعر کے متعلق خود اپنے قلم سے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آزاد صاحب کی تصویر کے اوپر یہ شعر درج ہے۔

اگر آزاد شاد رویش آنکھوں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے پہلے شعر کی پہچان پیدا کر

یہی شعر دیوان کی ایک غزل میں اس طرح موجود ہے۔

اگر آزاد سا درویش آنکھوں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

معلوم نہیں تصویر کے اوپر "اہل اللہ" کی بجائے "پہلے شعر" کیوں تحریر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے غزل تصویر کی اشاعت سے بہت پہلے لکھی گئی ہو اور اس درمیان میں شاعر کا دماغ کسی ایسے انقلاب سے گذر گیا ہو جس نے "اہل اللہ" کی اہمیت کو کم کر دیا ہو۔ بہر حال غزل میں شعر جس طرح ہے وہ تصویر والے شعر سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔

کتابت کی غلطیوں کے متعلق خود آزاد صاحب کو شکایت ہے اس لئے اس طرف اشارہ کرنا بیکار ہے۔ چھپائی اگرچہ بہت اچھی نہیں ہے مگر غنیمت ہے۔ جلد مضبوط اور پائدار ہے۔

ارمغان باز

از باز حیدر آبادی

کاشانہ باز بازار گھانسی میاں حیدر آباد دکن

قیمت ۳ ر

یہ مختصر سا مجموعہ کلام جناب باز حیدر آبادی کا نتیجہ فکر ہے۔ شروع میں محمد سردار علی رکن ادارہ "شیر دکن" کا پیش لفظ ہے جس میں مصنف نے خود مفصل لکھنے کی بجائے باز صاحب کے کلام کے متعلق اساتذۂ فن اور مستند رسائل کی آرار کے اقتباسات زیادہ پیش کئے ہیں۔ ان اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ باز صاحب کے کلام میں "صفائی۔ حسن بندش چستی اور بے ساختگی" پائی جاتی ہے۔ باز کے اشعار سے انکی صلاحیت شعر گوئی کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

۱۶۹

کبھی زاہد کیا ہے ترک وجود　　تو ہماری نماز کیا جانے
جس کی مسجد میں عمر گذری ہو　　بتکدہ کا وہ راز کیا جانے

کوشش کا صلہ اور نہ جنت کا ثمر مانگ　　اٹھ جائے ہر اک پردۂ حائل وہ نظر مانگ
آفت کو جو آفت نہ کہے دل وہ طلب کر　　تکلیف جو خوش ہو کے سہے ایسا جگر مانگ

تعینات کے پردے اٹھا نہیں سکتے　　خدا کو دیکھتے ہیں پر دکھا نہیں سکتے

کہیں کہیں فن کی ایسی خامیاں بھی نظر آتی ہیں

جنت جو نیکیوں سے ملے گر جناب شیخ　　میرا عمل ہوا یہ عنایت کہاں ہوئی

ایسی دو دن کی بہاروں سے خزاں اچھی ہے
ہم اجڑتے ہوئے دیکھے ہیں گلستاں کتنے

بہر حال یہ امید کی جا سکتی ہے کہ باز کے آئندہ دیوان میں

بازکی شاعری اس سے بلندتر نظر آئیگی۔

مثنوی سحر — از اقبال ورما سحر ہتگامی
ادبی پریس لاٹوش روڈ لکھنؤ
قیمت ۸ر

ایک زمانہ تھا جب "مثنوی" اُردو شاعری میں ایک مرتبہ عظیم رکھتی تھی۔ اُستادانِ فن اس صنف میں اپنی قدرت کلام اور کمالِ فن کے جوہر دکھاتے تھے مگر اب زمانہ کے انقلاب نے اردو شاعری کو مثنوی سے تقریباً محروم کر دیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ملک کا کوئی شاعر دُنیائے ادب میں کوئی مثنوی پیش کر دیتا ہے۔ لیکن زمانہ کے اس تغیر اور اُردو شاعری کے اس انقلاب کے یہ معنی کبھی نہیں ہیں کہ مثنوی کی مخصوص صنف کی اہمیت کچھ کم ہو گئی ہے۔ نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آج کل کے شاعر مختصر نظموں میں بلند سے بلند خیال اور پاکیزہ سے پاکیزہ مضامین منظوم کرنے کیطرف زیادہ متوجہ ہیں۔ مثنوی علم و فن شاعری کے کمال کیساتھ ساتھ کافی وقت بھی چاہتی ہے۔ آجکل کا شاعر صرف شاعری ہی نہیں کرتا بلکہ زمانہ کی اقتصادی تکلیفوں کو بھی برداشت کرتا ہے۔ وہ ان طوفانوں سے بھی کھیلتا ہے جو دنیوی آلام و افکار کی صورت میں اس کے دل و دماغ کے طرف آتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ قدرتی امر ہے کہ مثنوی کے لئے وقت نہیں نکال سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل مثنوی کا رواج کم ہو گیا ہے۔

"مثنوی سحر" جس کا دوسرا نام "دشینت و شکنتلا" ہے۔ اقبال ورما سحر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

اس مثنوی میں جو قصہ منظوم کیا گیا ہے وہ سنسکرت کے مشہور ڈرامہ نویس کالیداس کے ایک ڈرامہ سے ماخوذ ہے بلکہ یوں کہئے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ اس کے ایک ڈرامہ کا اُردو میں ترجمہ ہے اس ڈرامے کے ترجمے اور شاعروں نے بھی کئے لیکن اب تک جتنے ترجمے ہوئے ہیں ان میں اصل ڈرامہ کا ماحول بالکل بدلا ہوا ہے ورما نے اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ڈرامہ کی تقریباً تمام خوبیاں مثنوی میں قائم رہیں۔ اس کے علاوہ زبان کی سلاست و روانی کا بھی کافی خیال رکھا گیا ہے۔ شکنتلا فراق کی صعوبتوں سے گھبرا کر جب اپنے محبوب راجہ کے پاس جا رہی ہے تو رخصت کے وقت اپنے گھر والوں اور سکھیوں سے اس طرح مخاطب ہوتی ہے۔

روتی ہوئی بولی پھر وہ ذی ہوش — کرنا نہ کبھی مجھے فراموش
ہے سخت جو اس جدائی کا غم — خوش ہو کے کبھی ملیں گے باہم
دیوار سے در سے مل کے روئی — ہر ایک شجر سے مل کے روئی
رو رو کے کہا کہ اے گل باغ — ہیں یاد کو تیری، دل کے بس داغ
پھولے گا مدام تو اثر سے — سینچے جاتی ہوں اشک تر سے

پھر شکنتلا جب راجہ کے پاس پہونچتی ہے اور راجہ اس سے انتہائی بے اعتنائی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے جواب میں کہتی ہے۔

غربت میں ہوں خوار تیری خاطر — چھوڑا گھر بار تیری خاطر
میں مجلس عشق میں ہوں دل تنگ — سختی سہتی ہوں صورتِ سنگ
وابستہ ہے تجھ سے جانِ بیمار — ہیں مرگ و حیات دونوں دشوار

ان اشعار سے ہلکا سا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ورما صاحب نے باوجود فن کی خامیوں کے مثنوی کی خصوصیات کو حتی الوسع قائم رکھنے کی کوشش کی ہے

مُرقع بنارس — بہ چودھری نبی احمد سندیلوی
قیمت عہ۔ سلطانیہ برقی پریس نظیر آباد لکھنؤ

چودھری نبی احمد صاحب تاریخی کتابیں لکھنے میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ وقائع عالمگیر۔ تذکرہ مورخین ان کی کافی مشہور تصانیف ہیں۔ اب آپ نے بنارس کی ایک تاریخ تصنیف فرمائی ہے جو ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں خصوصیت کیساتھ بنارس کے مذہبی مقامات یعنی مساجد۔ مناور۔ مقابر اور دوسری زیارت گاہوں کا تذکرہ ہے۔

بنارس ہندوستان کے ایسے مقامات میں سے ہے جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تاریخی حیثیتیں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو کر گذری ہیں۔ اگر وہاں کے ان مذہبی مقامات پر ایک نگاہ ڈالی جائے جو مختلف فرقوں کیلئے مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں تو ان کا ماحول خود اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہاں ایک عرصہ تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر

قربت رہی ہے۔ اس قربت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہونا چاہیئے کہ جن مقامات کو مذہبی تقدس حاصل ہے وہی مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ بیگانگی کا سبب بن جائیں۔ ظاہر کہ جب دو مختلف قومیں مدتوں تک ایک دوسرے کے سایہ میں زندگیاں گذاریںگی تو یہ ناممکن ہے کہ ان کو تیتلی اتحاد میسر آجائے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب دو قوموں میں کوئی مذہبی بیزاری پیدا ہوجاتی ہے تو سب سے پہلے عبادت گاہیں ہی اس منافرت کی آماجگاہیں بنتی ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں ہے اگر بنارس میں مدتوں سے یہ جھگڑا چلا آرہا ہے کہ فلاں مسجد فلاں مندر کو توڑ کر بنائی گئی تھی اور فلاں مندر فلاں مسجد کو مسمار کر کے تعمیر کرایا گیا ہے۔

چودھری نبی احمد صاحب نے حتی الوسع مساجد اور مناور کی تعمیرات کے سلسلے میں تاریخی ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں تک ہوسکا ہے اپنی تحریروں کی دلیل میں شاہی فرامین، ہندو مسلمان اور انگریز مورخوں کے بیانات پیش کئے ہیں۔ مگر کہیں کہیں ذہانت سے بھی کام لیا ہے اور چونکہ اس کے متعلق ہمارے سامنے ہندو مورخوں کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ اسلئے نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے ان دلائل کو کہاں تک تسلیم کیا ہے۔

اس تاریخ میں ایسے واقعات بھی درج ہیں جن سے ہندوؤں کے مظالم اور مسلمانوں کی مظلومی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ میں اسی قسم کے واقعات ہمارے دلوں میں نا اتفاقی پیدا کرتے ہیں اور آج جب کہ ہمارے ملک کو ہندو مسلم اور دیگر فرقوں کے اتحاد کی سخت ضرورت ہے ہمیں ایسے تاریخی واقعات کے بیان کرنے سے جہاں تک ہوسکے پرہیز کرنا چاہیئے۔

آج ہندوؤں کی بہت سی کتابیں مسلمانوں کے مظالم کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ اور مسلمانوں کی بہت سی کتابوں میں ہندوؤں کی بدسلوکیوں کے تذکرے ہیں مگر ان دونوں قسم کی کتابوں سے چاہے انہیں کتنے ہی تاریخی ثبوت کیوں نہ ہوں۔ نتیجہ صرف ایک ہی نکلتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیانی اختلافی خلیج وسیع ہوتی جارہی ہے۔ کلکتہ کی کال کوٹھری کی بنیاد تاریخی دلائل ہی پر تھی مگر اس واقعہ کے اظہار سے انگریزوں کو جو کام لینا تھا لے لیا بعد میں چاہے وہ واقعہ سراپا جھوٹ ہی کیوں نہ نکلا ہو۔

بہرحال جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے بنارس کے تاریخی حالات اور مقامات سے جن لوگوں کو دلچسپی ہو اُن کے لئے "مرقع بنارس" بہت مفید کتاب ہے۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ تاریخی حالات کو زیادہ موثر بنانے کیلئے جو مواد بھی جمع کیا گیا ہے اس میں نبی احمد صاحب نے بہت قابل قدر سعی کی ہے۔

کاغذ۔ لکھائی چھپائی معمولی ہے مگر صحت کا کافی خیال رکھا گیا ہے۔

کالیداس اور ودیا

جوش انبالوی
قیمت ۸ر ودیا پباشنگ ہاؤس انبالہ چھاؤنی

آج ہندوستان میں "ہندوستانی ادب" کی ترقی کے متعلق جو مستقل "غور و فکر" کیا جارہا ہے۔ اس کا ایک اہم جزو "ڈرامہ نویسی" بھی ہے۔ ہماری ادبی ترقیوں کا رجحان ابھی تک ڈرامہ نویسی کی طرف کم ہے اور اس کمی کو بہت زیادہ محسوس کیا جارہا ہے۔ فلمی ڈرامے اس سلسلے میں جو کچھ بھی کررہے ہیں وہ ابھی تک قابل اطمینان نہیں ہے اور اس لئے ہمارے ادیبوں کو "ڈرامہ نویسی" کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ فن "ڈرامہ نویسی" اپنی افادیت کے لحاظ سے جس قدر اہمیت رکھتا ہے اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ آپ ایک اچھے ادیب ایک اچھے شاعر یا ایک بہتر فلسفی یا مفکر ہوسکتے ہیں مگر پھر بھی ایک بہتر "ڈرامہ نویس" نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ ڈرامہ نویس کیلئے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی ادبیت اور فکر کے لحاظ سے بلند درجہ رکھتا ہو بلکہ اس کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کردار نگاری، پلاٹ، ماحول، ڈائیلاگ غرض کہ ہر اس شعبہ پر جو ڈرامہ نویسی سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ کافی عبور رکھتا ہو وہ تمثیلات پر ہی دسترس نہ رکھتا ہو بلکہ نفسیات کا بھی ماہر ہو اس لئے ضروری ہے کہ جو لوگ بھی اس طرف متوجہ ہوں وہ خود اپنی اہلیت

ایشیا ۱۷

کو بھی نگاہ میں رکھیں۔

ہمارے پاس جوشؔ انبالوی کا ایک مختصر تعلیمی ڈرامہ آیا ہے جو ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نویس" کالیداس" کے نتائجِ فکر کا رہینِ منت ہے۔ یہ ڈرامہ اگرچہ مختصر ہے اور صرف "تعلیم" سے متعلق ہے۔ پھر بھی اس میں "فن ڈرامہ نویسی" کا کچھ خیال ضرور رکھا گیا ہے۔ زبان کے متعلق اگرچہ وقار انبالوی صاحب کا یہ خیال ہے کہ عام فہم ہندوستانی ہے مگر ہماری رائے میں اس کا رجحان "سنسکرت کی طرف زیادہ ہے ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ کالیداس سنسکرت کا ڈرامہ نویس ہے۔ بہرحال اس ڈرامہ سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اگر جوشؔ اس صنف ادب میں مستقل سعی سے کام لیں تو ایک دن وہ ہندوستانی ادب میں بہتر ڈرامے پیش کر سکیں گے۔ ہماری رائے میں انھیں اپنی اس صلاحیت سے ضرور کام لینا چاہیئے۔

بچّوں کو تعلیم کا شوق دلانے کیلئے یہ ڈرامہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔ جلد سادہ مگر مضبوط ہے۔

تان سین (گوالیار)

مدیر خلیل ہاشمی
چندہ سالانہ عہ

گوالیار کے اس ماہنامہ کے متعلق خود ادارہ "تان سین" کی یہ رائے ہے کہ وہ "علم و ادب اور فن موسیقی کا ترجمان" ہے۔ غالباً ہمارے زیر نظر پرچہ اس رسالہ کی پہلی اشاعت ہے۔ ابتداءمیں کارکنان نے علمی و ادبی مضامین کو فراہم کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ بڑی حد تک قابل داد ہے۔ موسیقی سے متعلق مضامین بھی موجود ہیں۔ گوالیار کو "موسیقی" سے تاریخی تعلق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس فن کے متعلق جس قدر بہتر معلومات وہاں فراہم ہو سکتی ہیں کسی دوسری جگہ مشکل سے ہونگیں۔ امید ہے کہ خلیل ہاشمی صاحب اس طرف مستقل توجہ کرینگے اور اپنے رسالہ کو فن موسیقی کا علمی و تاریخی حیثیت سے حقیقی ترجمان بنا دیں گے۔ اسوقت ہندوستان میں اس فن کے متعلق کوئی رسالہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس رسالہ میں ایک مضمون "خدا پرست فلسفی" بھی ہے جو ماہر القادری صاحب کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون کے آخر میں ماہر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"یورپ جس کو ملحد کا خطاب دیا جاتا ہے اور واقعی وہ اس خطاب کا سزاوار بھی ہے اس کا ایک مفکر فلسفی خدا کے وجود پر اس قدر شدت کے ساتھ یقین رکھتا ہے دوسری طرف ہمارے بے بضاعت اور پست نظر ادیب و شاعر" قوت و حیات" کی آڑ لیکر وجود باری کا انکار کر رہے ہیں اور فکر و یقین کی اس پستی اور آوارہ گردی کا نام" انقلاب" رکھا ہے اگر انقلاب اسی الحاد و زندقہ کا نام ہے تو ایسے انقلاب کو ہماری دور ہی سے ڈنڈوت!"

ماہر صاحب کی مراد "بے بضاعت اور پست نظر ادیب و شاعر" سے حضرت جوش ملیح آبادی ہیں ہمیں افسوس ہے کہ ان سطور سے ماہر صاحب کا منشا رکیا ہے۔ جوش پر یہ الزام کہ وہ خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ قطعی بہتان ہے اور نہ وہ اس سلسلہ میں "قوت و حیات" کی آڑ لیتا ہے اور نہ اس کو "انقلاب" کہتا ہے تعجب ہے کہ انسانی فکر جب نظام عالم کے اسرارِ پنہاں کو منکشف کرنا چاہتی ہے اور رسم و رواج (خواہ وہ مذہبی ہو یا سماجی) کی قیود کو توڑ کر حقیقت کو سمجھنا چاہتی ہے تو ہمارے "مذہب زدہ" برادران وطن چیخ اٹھتے ہیں کہ یہ تو الحاد و زندقہ ہے۔

اگر فطری قوتوں اور قدرتی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ بلند کام لینا زندقہ ہے۔ اگر انسان کو "غور و فکر" کی حقیقی کیفیتوں سے آشنا کرنا الحاد ہے اور اگر ادبار اور شعراء کے رجحانات۔ خیالات، احساسات اور جذبات کو صرف ظاہر پرستی۔ ریاکاری اور مذہب کی آڑ میں خود غرضی کے کام آنا چاہیئے اور ہزارہا سال کے پُرانے اور دقیانوسی مشاہدات اور ان کے نتائج پر قانع رہنا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کے ہر مفکر اور فلسفی کو اپنے فکر اور فلسفہ کی باگ ڈور ماہر اور اُن کے ہم خیال لوگوں کے ہاتھوں میں دیدینے میں ہی اگر کوئی انقلاب پوشیدہ ہے تو معاف کیجئے کہ اس کو ماہر صاحب کے وہ احباب تو گوارا کرلیں گے

جو خود قوت فکر کے لحاظ سے دیوالیہ ہیں اور کوئی صحیح الدماغ انسان تو ایسا کر نہیں سکتا۔ ہم آہر صاحب سے یہ عرض کرینگے کہ خدارا انسان کو اپنے فطری جوہروں سے کام لینے دیجئے۔ بر سہا برس کی روندی ہوئی راہوں پر نہ گھسیٹئے اسے قدرت کے رازوں کو سمجھنے دیجئے جہاں تک وہ سمجھ سکے اور اپنی صحیح صلاحیتِ کار کا کچھ اندازہ کرنے دیجئے۔ آپ کب تک سیدھے سادے لوگوں کو اس قسم کے "ارشادات" سے مستفید فرمائیں گے کہ وہ نظام عالم کی طرف نگاہ ہی نہ اٹھائیں یا خیال کو اس طرف رجوع ہی نہ ہونے دیں۔ دیکھئے زمانہ کدھر جا رہا ہے!! ہندوستان کے "مردہ انسانوں" کو بھی اپنے اندر کچھ زندگی کے آثار پیدا کر لینے دیجئے۔

"گنگا کے کنارے" جان نثار اختر صاحب کی نظم ہے جو غالباً جوش کی ایک نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اختر صاحب خود بہت کچھ "اختراعی قوت" رکھتے ہیں پھر نہ جانے کیوں انھوں نے اتنا بھی . . . گوارا کیا۔

رسالہ مجموعی حیثیت سے خوب ہے اور اس سے بہت سی بہتر امیدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ کتابت و طباعت اچھی ہے۔ ٹائٹیل میں "جدت" کی بجائے "قدامت" زیادہ ہے

اتاترک

از محمد مرزا دہلوی

قیمت مجلد دو روپیہ۔ کتب خانۂ علم و ادب دہلی

ایک مدت سے ہندوستان کے اہل ادب اپنے ملک کے لٹریچر کو دنیا کے بین الاقوامی ترقی یافتہ لٹریچر کے مساوی درجہ پر پہنچانے کے خواہشمند ہیں۔ ان ادبی شوریدہ سروں کا ایک گروہ ہے۔ جو دن رات اپنی ان تھک سعی عمل سے ملک کی علمی فضا کے گوشہ گوشہ میں بیداری کی روح پھونک رہا ہے۔ ان میں شاعر بھی ہیں ادیب بھی۔ افسانہ نگار بھی ہیں مورخ بھی۔ غرض کہ علم و ادب کی تمام شاخوں کے ماہرین ہیں۔ ان سب کا متفقہ خیال یہ ہے کہ ہماری غلامی۔ مجبوری اور پستی کا ایک بڑا سبب ہمارا وہ "ادبی خزانہ" ہے جو ہمارے گذشتہ ادبا اور شعرا کی جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ مگر جو اپنی کم مائیگی کے لحاظ سے کسی طرح بھی اس قابل نہیں کہ اسے دنیا کی بین الاقوامی ادبی عظمت میں اضافہ کرنیوالا سمجھا جاسکے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو وہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ ترقی یافتہ اقوام عالم کے علمی و ادبی جواہر پاروں کے ساتھ رکھا جا سکے۔ یہ احساس اپنے اندر پشیمانی اور خجالت کا کتنا سامان رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو دنیا کی بین الاقوامی ادبی انجمنوں سے متعلق ہونیکا موقعہ ملتا رہتا ہے یا جو ترقی یافتہ اقوام عالم کی لٹریری سوسائٹیوں میں شریک ہونیکا فخر حاصل کرتے رہتے ہیں۔

یہ کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے اس پست احساس کو اپنی جگہ قائم رہنے دیا ہے۔ ہمارے جدید شعرا اور ادبا کی بے پناہ سرگرمیاں اس صحیح انقلابی جد و جہد کا پتہ دے رہی ہیں جو وہ ملک کی فضائے ادب کو بہتر بنانے کیلئے کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے گذشتہ لٹریچر میں ہمیں سب سے زیادہ "تاریخ نویسی" کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں مورخوں کا فقدان بھی رہا اور جو مورخ گذرے انھوں نے فن کی صحیح معنوں میں خدمت نہیں کی۔ ہمیں مسرت ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی مورخ بھی گذشتہ اصول تاریخ نویسی کو خیرباد کہہ کر جدید ترقی یافتہ انداز اختیار کرتے جا رہے ہیں اگرچہ ان کی تصانیف کو ابھی حقیقی اصولوں کا آئینہ نہیں کہا جا سکتا مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی داغ بیل ڈال رہے ہیں جو کسی قریبی زمانہ میں ہماری تاریخ نویسی کو بلند سے بلند مرتبہ بخشے گی۔

ہمارے پاس حال ہی میں محمد مرزا دہلوی صاحب کی چند تاریخی کتابیں آئی ہیں جن میں سے ایک "اتاترک" ہے

آج یورپ کی سیاست میں ترکی کو جو رتبہ حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ترکی کی موجودہ اہمیت اور عظمت نے حال ہی میں جو عجیب و غریب کروٹ لی ہے اس نے روس۔ جرمنی۔ برطانیہ۔ فرانس اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کی نگاہ میں اسے ممتاز بنا دیا ہے۔ اس ترقی کا راز ترکوں کی موجودہ وسیع سرگرمیوں اور انقلاب انگیز جد و جہد میں ہے ترک اب ۱۹۱۸ء کے ترک نہیں ہیں جو اپنی بقا کو برقرار بھی نہ رکھ سکتے تھے۔ بلکہ وہ اب اور کئی ملکوں کی حفاظت کا بار بھی اٹھا رہے ہیں اور لاکھوں انسان ان کے سایہ میں اپنی بقا اور خوشحالی کو محفوظ و مامون سمجھتے ہیں

ترکی کا ایک پست اور ناقابل التفات مقام سے اٹھ کر ترقی و عظمت کی موجودہ جگہ تک آنا زیادہ تر مصطفیٰ کمال اور ان کے رفقا کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مصطفیٰ کمال بلا شبہ دنیا کی عظیم الشان

ہستیوں میں سے تھے ۔ " اتا ترک " میں ان کے سوانح حیات کافی تفصیل کیساتھ موجود ہیں ۔ اس تاریخ کی صحت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ تقریباً ہمیں انگریزی تاریخی کتب سے واقعات کی تصدیق کی گئی ہے ۔ ترتیب واقعات میں بھی کافی غور سے کام لیا گیا ہے ۔ انداز بیان بھی دلکش ہے ۔ ایک مرتبہ کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا جائے تو ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔

اس کتاب سے صرف کمال پاشا کی زندگی کے حالات ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کے زمانہ میں ترکی کے مختلف سیاسی ادوار ۔ متفرق سیاسی جماعتیں ۔ ان کا عروج وزوال ۔ خلافت کی آخری سسکیاں عوام کے صحیح رجحانات ان سب کا ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے ۔ غرضکہ یہ کتاب ترکی کی پچاس سالہ مختصر تاریخ ہے ۔ یہاں ایک بات ضرور عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مورخ نے اتا ترک اور انور پاشا نے ذہنی اور سیاسی اختلافات کو جس طرح ظاہر کیا ہے وہ مرزا صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کیلئے تو ممکن ہے کافی دل خوش کن ہو گا مگر انور پاشا کی حقیقی عظمت اور ان کی مخلصانہ جد وجہد پر اعتماد کرنیوالوں کو اس سے یقیناً صدمہ پہونچے گا ۔ گو انور پاشا سے عقیدت رکھنے والے اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ وہ کمال کے مقابلہ میں کافی جدت پسند تھے ۔ مرزا صاحب یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک جدید انداز میں اردو ادب کو اتا ترک کی تاریخ حیات سے روشناس کرایا ۔ ہمیں امید ہے کہ ملک مرزا صاحب کی اس " تاریخی کارنامے " کی قدر کرے گا ۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ

حصہ اول و دوئم و سوئم و چہارم — از محمد مرزا دہلوی

دائرہ ادبیہ دریا گنج دہلی

یہ دائرہ ادبیہ دہلی کی شائع کی ہوئی اور محمد مرزا دہلوی کی تصنیف کردہ چار تاریخی کتابیں ہیں جو تاریخ نویسی کے جدید اصولوں پر مرتب کی گئی ہیں ۔ ان کتابوں میں دنیا کے بڑے لیڈروں کی سوانح حیات مختصر مگر موثر انداز میں تحریر کئے گئے ہیں ۔

حصہ اول میں ہندوستان کے چار بڑے سیاسی لیڈروں ۔ مہاتما گاندھی ۔ مولانا محمد علی مرحوم ۔ سی ، آر ، داس آنجہانی اور مسٹر محمد علی جناح کے حالات زندگی ہیں ۔

حصہ دوئم میں چین کے مارشل چیانگ کائی شک اور ایران کے تاجدار رضا شاہ پہلوی کے سوانح حیات ہیں ۔

حصہ سوئم میں عراق کے سیاسی رہنما امیر فیصل بن حسین اور عرب کے بادشاہ ابن مسعود کے واقعات زندگی ہیں اور حصہ چہارم میں مصر کے قومی رہنما سعد پاشا زاغلول اور مراکش کے جلیل القدر رہبر محمد بن عبدالکریم کے مختصر حالات ہیں ۔

جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے محمد مرزا صاحب کی یہ کوشش بہت قابل داد ہے کہ انھوں نے مختصر طور پر ہر متعلق زندگی کے تمام نمایاں واقعات تحریر کر دئے ہیں ۔ ہندوستان میں قومی رہنماؤں کے سیاسی کارناموں اور ان کے غیر سیاسی حالات زندگی پر اور بھی کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن اس سلسلہ سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ بہت سے قومی رہبروں کے حالات اردو میں ایک جگہ مرتب ہو جائیں گے ۔ اور دوسرے یہ فائدہ ہے کہ اپنے ملکی رہنماؤں کے علاوہ ہمیں دیگر ممالک کے بڑے بڑے انسانوں کے مختصر حالات زندگی بھی ایک سلسلہ میں مرتب مل سکتے ہیں ۔ ان میں سے بعض رہنما ایسے بھی ہیں جن کے متعلق اردو زبان میں ابھی تک کوئی کتاب موجود نہیں تھی ۔

محمد مرزا صاحب نے حصہ اول کے دیباچہ میں لکھا ہے ۔

" یہ اس سلسلہ کا پہلا حصہ ہے جس میں اختصار کے ساتھ ہندوستان کے مسلم سیاسی رہنماؤں کے حالات زندگی جمع کئے گئے ہیں ۔ لیکن ان کی سیرت ۔ انکی خصوصیت ان کے سیاسی مسلک ان کی تعلیمات اور ان کے سیاسی کارناموں پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ کامل غیر جانبدارانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے "

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مورخ کے لئے غیر جانبداری سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ مورخ اپنے رشحات قلم سے ملکی سیاست اور قومی حالات پر بہت کافی اثر ڈال سکتا ہے ۔ اس کا اندازہ ان لوگوں کو خوب اچھی طرح ہے جنھوں نے ہندوستانی بچوں کی درسی تاریخی کہانیوں کا مطالعہ غور سے کیا ہے ۔

ایشیا

ہندوستان میں فرقہ وارانہ اختلافات کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ طالبعلمی کے زمانہ سے ہی عالمگیر کے مظالم اور شیواجی کی ستم کاریوں کو انتہائی متعصبانہ انداز میں ذہن نشین کرایا گیا ہے اور جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصادم کرنیکی کوشش کی گئی ہے مؤرخ چاہے تو ملک کی فضا کو انتہائی مسموم کر کے آپس کے اختلافات کو بڑھا دے اور چاہے تو بدترین حالات میں دماغوں پر بہترین اثرات مرتب کردے۔ ہمارے خیال میں مؤرخ کو اپنی رائے ظاہر ہی نہ کرنی چاہیئے اسے تو صرف واقعات اور حالات پیش کرنے چاہئیں۔ اور زیادہ سے زیادہ ان حالات پر اس زمانہ میں جس طرح خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے اسے ظاہر کردے۔

ہمیں یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس اصول کے ماتحت "عہد حاضر کے بڑے لوگ" میں ایک بڑی خامی یہ پائی جاتی ہے کہ مرزا صاحب نے اس سلسلہ میں جگہ جگہ قطعی جانبداری اور اصول تاریخ نویسی کے خلاف اپنی ذاتی رائے سے ناظرین کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصیت کیساتھ مہاتما گاندھی کے حالات زندگی لکھتے وقت انھوں نے گاندھی جی کی ملکی اور قومی حیثیتوں سے تقریباً انکار کرتے ہوئے انھیں صرف ہندوؤں کا مذہبی رہنما بنا کر پیش کیا ہے حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی تنگ دلی ہے اور اس کی اہمیت سیاسی مدبروں کے نزدیک "جانبدارانہ پروپگنڈے" سے زیادہ نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرزا صاحب نے کانگریس کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والا حقیقی معنوں میں مؤرخ ہونے کے بجائے "مسلم لیگ کا پرجوش حامی" ہے۔ مسٹر محمد علی جناح کی زندگی کے حالات کو بھی اسی طرح پیش کیا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤرخ مسٹر جناح کی ہر جا و بیجا بات پر صاد کرنے کیلئے قلم اٹھا رہا ہے۔

بہرحال جہاں تک واقعات اور حالات زندگی کے ضبط تحریر میں لانے کا تعلق ہے۔ یہ تمام سلسلہ ایک مفید ذخیرہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ مرزا صاحب آئندہ تصنیفات میں اپنی ذاتی رجحانات سے زیادہ صحیح اصول تاریخ نویسی کا خیال رکھیں گے۔

گلبانگِ آزادی

تغیّر اور تبدیلی کی روح نے سب سے بڑا انعام موجودہ نسل کو ایک "شعورِ دماغی" کی صورت میں دیا ہے۔ بین الاقوامی سیاسی کشمکش اور اقتصادی نظریوں کے پر ... نے ہندوستانی ادب پر گہرا اثر ڈالا ہے، اور اب ہر شخص سوچنے لگا ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیوں کہا جا رہا ہے؟!

خاص کر اردو شاعری چند ہی برس میں تغیّر اور تبدیلی کی روح سے اس درجہ متاثر ہو گئی ہے کہ جو شاعر نئے شعور اور جدید احساس کی ترجمانی نہیں کرتا اسکو سماج میں ترقی پسند اور مفکر نہیں کہا جاتا۔ یہ ماحول کے اثرات کی وہ جادوگری ہے جس کا مقابلہ قدامت پسند نہیں کر سکتے۔ یہ جدت و تخلیق کا ایک طوفان ہے جو اپنی پوری طاقت کیساتھ کیف و کم کے امتیاز کے بغیر تیزی کیساتھ چلا آ رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب سیلاب آتا ہے تو اسکی گود میں چیزیں ترتیب اور خوبصورتی کے ساتھ نہیں ہوتیں؛ سیلاب کا پہلا کام تخریب ہے لیکن طوفان کے بعد کا ٹھہراؤ ایک خوبصورتی اور تنظیم پیدا کرتا ہے اور دریا، جنگل، پہاڑ سب پر ایک نیا جوبن اپنی پوری نکھار کے ساتھ چھا جاتا ہے۔

175

اسی طرح اردو شاعری میں ماحول کے نئے اثرات کی بنیادوں پر جو نئے تصورات پیدا ہوئے ہیں؛ ان میں ثبات اور حسن کی تکمیل نہیں پائی جاتی، مگر آغاز کی جوانی، جوش اور البڑپن ضرور پایا جاتا ہے؛

"گلبانگِ آزادی" جو تقریباً ۴۵ رباعیات آزادی کا خوبصورت مجموعہ ہے اسکی بہترین مثال ہے؛ یہ ہمارے دوست اور یوپی کے پختہ مشق شاعر نہالؔ سیوہاروی کی تصنیف ہے۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ نہالؔ صاحب اُسی راہ کے مسافر تھے، جس کا نہ کوئی اور ہے نہ چھور، منزل ہے نہ مقصد، لیکن اس پر چلنے والے اپنے خیالوں میں وہ طنطنہ رکھتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی زبان ہی نہیں کھول سکتا؛ یہ شاعری کا وہ دقیانوسی اسکول ہے جو حسن و عشق کے جذبات تک میں وقار اور نزاکت، دلنوازی اور تڑپ نہ پیدا کر سکا یہ اسکول دراصل مٹے ہوئے جاگیردارانہ سماج کی پیداوار تھا اور اب زمانہ اس قدر آگے نکل چکا ہے کہ سماج میں اس کی کوئی جگہ نہیں؛

نہالؔ صاحب نے ابتدائی درس و تدریس ایک ایسے ہی استاد سے

حاصل بھی کی، لیکن ماحول اور وقت کے مطالبہ کی کارفرمائی ہے کہ چند ہی سال میں نہالؔ نے اپنے مزاج کے دھارے کا رُخ پلٹ کر اپنی کشتی کو عین طوفان میں ڈال دیا اور ماہر غوطہ زن کی طرح اُس صدف کو دریا کی تہ سے اٹھا لایا جو اس کا گوہر مقصود تھا، جو ہمارا گوہر مقصود تھا اور جو تغیر و تبدیلی کا گوہر مقصود تھا۔

نہالؔ کی شاعری کی یہ تبدیلی اور ارتقا یقیناً اُن کی فکری اہمیت شاعرانہ خلاقی، اور دماغی قابلیت کی دلیل ہے؛ یہ تو ان کی ۵۴ رباعیاں ہیں، جن میں انھوں نے اپنی شاعری اور فکر کا کمال دکھایا ہے۔ لیکن جس شخص نے ان کی نظمیں سُنی ہیں وہ آسانی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ نہالؔ کی اکملیت ان رباعیات سے ظاہر نہیں ہوتی نظموں سے ظاہر ہوتی ہے۔

تاہم یہ اس لحاظ سے قابلِ داد ہیں کہ ایک ہی موضوع پر قافیہ کی تبدیلی کیساتھ انھیں مختلف پہلوؤں سے پر "نفسِ آزادی" کی شاعرانہ تعبیر کی گئی ہے۔ مقدمہ نہایت قابلیت اور ادبی انداز میں لکھا گیا ہے؛ پروفیسر سعید احمد صاحب ایم اے اکبرآبادی نے جنکا علمی و ادبی تبحر مسلّم ہے۔ اختصار کے ساتھ شعر و ادب میں تغیر و تبدیلی کی داستان دہرائی ہے، اور نہالؔ صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ جانبدارانہ قصیدہ خوانی پر مبنی نہیں کیا جا سکتا؛

ان رباعیات میں سے اکثر آیشیا میں شائع ہو چکی ہیں۔ چند آپ بھی سنئے:۔

ہر موج کے لب پہ صبح و شامِ آزادی   بہتے ہوئے دریا کا خرامِ آزادی
زنہار اے بندۂ آزاد نہ بھول   فطرت کا ہے اوّلیں پیامِ آزادی

یہ رباعی صفحہ سات پر ہے ترتیب کے لحاظ سے اس کو سب سے پہلے صفحہ پر ہونا چاہیئے تھا۔ اکثر رباعیات کی نوعیت ناتراشیدہ ہیرے کی سی ہے جو ہیرا تو ہوتا ہے لیکن نور سے محروم؛ بات یہ ہے کہ تخیلاتی اور شعوری شاعری میں ایک بڑی حدِ فاصل ہے۔ مسائل میں شعر و منطق کو ساتھ بٹھانا پڑتا ہے۔ اور تخیل میں منطق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان رباعیوں سے آزادی کی عظمت تو ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن آزادی مستقل ایک اجتماعی اور سماجی مسئلہ ہے۔ جس پر گفتگو کرتے وقت اس کے جزئیات پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ اور چار مصرعوں میں شاعرانہ بندشوں کے ساتھ کیونکر منطقی بحث ہو سکتی ہے۔ تاہم ایک قادر الکلام اور مفکر شاعر کا کام ہے کہ وہ اس پُلِ صراط کو بھی طے کرے: اکثر جگہ نہالؔ صاحب اپنی اس کوشش میں کامل طور پر کامیاب ہوتے ہیں؛ مثلاً

ہے غیرتِ انساں کی دلیل آزادی   اقبالِ جہاں کی ہے کفیل آزادی
اس شعلۂ آتش سے ہراساں کیوں ہو   بن جائے گی گلزارِ خلیل آزادی

آپ نے دیکھا کہ صرف ایک اعتقادی اور تاریخی اشارہ سے آزادی کی تمام جزئیات پر روشنی پڑ گئی۔ کسی فلسفہ و منطق کی ضرورت نہیں ہوئی ناتراشیدہ ہیرا اپنے ہر پہل سے نور برسانے لگا؛

اپنی اپنی جگہ رُباعیاں سب بہتر ہیں۔ لیکن تمام رباعیات کی یہ نوعیت نہیں ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ ردیف کی قید نے اس مجبوری میں اضافہ کر دیا ہے؛ ایک اور بہتر رباعی سنئے۔ اس میں بھی تاریخ کے ایک عظیم الشان مسئلے پر روشنی پڑتی ہے اور ذہنِ انسانی خود بخود اس مفہوم و مقصد کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو شاعر کا اصلِ مقصد ہے؛ ؎

سرمایۂ عیشِ کائنات آزادی   ہر غم سے وسیلۂ نجات آزادی
یہ راز سکندر کو بھی معلوم نہ تھا   ہے خم کدۂ آبِ حیات آزادی

انعام کنِ جملہ نعم آزادی   دل جس پہ فدا ہو وہ رقم آزادی
بہتر ہے ہزار سال جینے سے کہیں   اے مردِ خجستہ ایک دم آزادی

یہ آزادی کی ایک سادہ عظمت ہے۔ اور شاعر نے سادگی اور زور کے ساتھ اسکو نظم کر کے جذبات آفرینی کا فرض نہایت کامیابی سے ادا کیا ہے۔

مندرجۂ ذیل رباعی میں سہواً ایک غلطی رہ گئی ہے، میں نہالؔ صاحب سے عرض کروں گا کہ نئے اڈیشن میں اسکو نکال دیں۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کا کلام اس قسم کی غلطیوں سے پاک ہوتا ہے ؎

کیا جانئے کیا سنا گئی آزادی   اک محشر[1] نوا اٹھا گئی آزادی

---

[1] محشر، حشر کا اسم ظرف ہے، حشر اٹھانا، قیامت اٹھانا تو لکھا جاتا ہے محشر اٹھانا نہیں لکھا جاتا؛

ساغر

بیدار ہوئے خواب سے صدیوں کے غلام   صدیوں کیلئے جگا گئی آزادی

جن رباعیات میں شاعرانہ شیرینی اور مستی، لچک اور لوچ پایا جاتا ہے ان میں سے کیوں نہ آپ بھی ایک سنیں ؎

سرمخزنِ احساس تمام آزادی   ہے بادۂ زندگی کا جام آزادی
بے آب بقا ہے جنکی میکۂ حیات   ان مردہ دلوں پہ ہے حرام آزادی

رباعی کا دوسرا مصرع ایک ماحول پیدا کر دیتا ہے، اس رباعی میں شاعر اپنا فرض پوری طرح ادا کر رہا ہے ؛ بہرحال میں "ندوۃ المصنفین" کے اربابِ حل وعقد کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایک طبعزاد اور جذباتِ عالیہ سے لبریز مختصر مگر جامع، کم حجم مگر وسیع المعنیٰ کتاب شائع کی جو دیکھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے۔ قیمت آٹھ آنے مجلّد ناشر مکتبہ "برہان" قرول باغ دہلی۔

سہارا

از شفیق بانو صاحبہ شفق مدیرِ خاتونِ مشرق، دہلی۔
ناشر۔ عبداللہ فاروقی نگراں رسالۂ خاتونِ مشرق۔
ملنے کا پتہ۔ شفیق بانو۔ شفق بتوسط ڈاکٹر اشفاق حسین۔ نجیب آباد قیمت ۸ء

مختصر افسانوں کا یہ چھوٹا سا مجموعہ محترمہ شفیق بانو صاحبہ شفق کے لطیف محسوسات اور مشاہدات کا ایک ناتمام پرتو ہے۔ جس کا انتساب ہی میں افسانویت اور شعریت کی روح مسکرا رہی ہے۔ صفحۂ دو بجائے خود ایک کہانی ہے۔ اور جو بھی افسانہ نگار یا شاعر چاہے اپنی افسانویت اور شاعری کو اُس ایک سطر پہ مبنی کر سکتا ہے۔

" منسوب۔ اس خلش سے جو دل میں پنہاں رہی "

اس سے تو آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شفیق بانو اپنے شاعرانہ اور ادبی ذوق میں کسقدر معیاری مرتبہ رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے افسانے بھی دراصل اسی ایک لفظِ "خلش" کی تفسیر ہیں۔

یہ ۲۱ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جنکے عنوانات یہ ہیں:۔

سہارا، ملاپ، چمپا کا زرد پھول۔ زخمی شکاری۔ خاموش التجائیں، جوانی۔ کبھی نہیں۔ سوکن کا پیار۔ زندگی کا قانون۔ شاعر کو دیوتا کیوں سمجھا خواب۔ پاگل۔ دو راستے۔ پیغامِ موت۔ غریب کی حسرت ہی حسرت۔ باغی لڑکی۔ دل کے مندر میں پہلی روشنی۔ مزدورنی کا بچہ۔ ماتا کی آخری جھلک۔ نہیں پہلے تم۔ بیکس کی نعش۔

سب سے پہلے حق شناسی کے عنوان سے مسٹر آصف علی بار ایٹ لاء کا دیباچہ ہے۔ جس کے پڑھنے کے بعد یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسکی کیا ضرورت تھی ؛ دیباچہ کتاب کا ایک قسم کا تعارف ہوتا ہے۔ نفسِ مضمون کے متعلق یا مصنف کی ذات کے متعلق ؛ لیکن آصف علی صاحب نے سوا دو صفحے صرف اپنے ذوقِ نمود پر صرف کر دیئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ بتاتے کتاب کیا ہے اور مصنف کون انھوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادبی دنیا اور اس کے تمام افراد اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، انکی جد وجہد کا کوئی معیار نہیں ہے، اور ملک میں نقد و نظر کی کوئی کسوٹی موجود نہیں جہاں انھوں نے شفیق بانو صاحبہ کی افسانہ نگاری کے متعلق کچھ لکھا ہے وہ صرف ان کی زبان کی سلاست اور نثر سے تعلق رکھتا ہے۔

حالانکہ شفیق بانو صاحبہ نثر نگاری سے زیادہ اہم فریضہ کی دعویدار ہیں، یعنی وہ بحیثیت افسانہ نگار کے پیش ہو رہی ہیں ؛

مجھے یہ کہنے میں بالکل باک نہیں کہ یہاں دیباچہ نگار کا فرض ہو جاتا تھا کہ افسانہ اور افسانہ نگار کے وائف کے متعلق بحث کرے۔ لیکن مسٹر آصف علی کو شفیق بانو صاحبہ کی افسانہ نگاری کے اقرار و انکار دونوں کی جرأت نہیں ہوئی۔ اور ٹالم ٹول ہی میں دیباچہ ختم کر دیا۔

کوئی شک نہیں، کہ سہارا کی افسانہ نگار ایک دماغ نقد نگاہ رکھتی ہے۔ انکی زبان ستھری، صاف سادہ اور نازک ہے لیکن زندگی کے عمیق مشاہدہ کی جرأت اور ہمت اسمیں ابھی نہیں ہے۔ اور انکی افسانہ نگاری (Realism) واقعیت نگاری سے کوسوں دور ہے۔

سب سے پہلے افسانے "سہارا" میں نجو اور نفیسہ دو کردار ہیں۔ نفیسہ ایک نوجوان بھکارن ہے؛ اور نجو ایک نوجوان موٹر کلینر۔ نفیسہ نجو سے بھیک مانگتی ہے نجو بھیک ہی نہیں دیتا بلکہ اسکو عمر بھر کیلئے حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ۔

آ میری نفیسہ آ میرے دل کے سونے مندر میں مدت سے اندھیرا اٹھا ہے تم اسے روشن کر دو، میرا گھر ویران ہے تم اسے بسا دو، میں بے سہارا ہوں مجھے سہارا دو !

یہ کہنے سے قبل نفیسہ کا کیریکٹر ایک انتہائی اکھڑ اور معصوم دوشیزہ کا دکھایا گیا ہے۔ لیکن اتنا سنتے ہی وہ وربدر پھرنے والی کنواری بھکارن رومانی انداز میں

جواب دیتی ہے :

اگر تمہیں سہارا مجھ سے مل سکتا ہے تو آؤ، آؤ مجھ جیسی بے سہارا سے تم بھی
سہارا لے لو، میں تمہیں اپنے کمزور ہاتھوں سے سہارا دیتی رہوں گی ۔
تمہارے سارے کام کرونگی ۔ ایک بات مگر سمجھ لو، میں سوسائٹی کی ذلیل
کی ہوئی ہستی ہوں ۔ کسی باغ کا شگفتہ پھول نہیں "۔

سہارا کی افسانہ نگار زندگی کی واقعیت کو رومان کے پرنیان و حریر میں لپیٹ
دینا چاہتی ہے لیکن زندگی کے تلخ حقائق کے پیکر میں لباس کی نزاکت کو برداشت کرنیکی
تاب نہیں ۔ سوال ہوتا ہے کہ نجو محض اس بھکارن کو بھیک دیکر راہ سے کیوں نہیں گذر گیا ۔ !؟
کیوں افسانہ نگار نے محض راہ میں ایک بسیط مکالمے کے بعد ایک دوسرے کو ملا دیا ؛ !؟ اور
اسکے لئے اعلیٰ ترین نفاست زبان اور شاعرانہ تخییل کو استعمال کیا ! ؟
محض اسلئے کہ افسانے جس طرح بنتے ہیں انکو اسیطرح ظاہر کرنیکی جراءت افسانہ نگار میں
نہیں ہے ۔ وہ تخییل میں تیرنے کی عادی ہیں اور زندگی کی واقعیت سے خوف کھاتی ہیں ؛
مگر افسانہ نگار کو خوف کھانیکی ضرورت نہیں ؛ نئے ادب کے زاویۂ نگاہ سے اس افسانے کی بعج
محض یہ ہے کہ " نجو کو راہ میں بھکارن کی جوانی اور حسن نے متاثر کیا ؛ وہ اُسے بھیک یا آرام کا لالچ دیکر
اپنے گھر لے گیا ! اسکا کوئی نہ تھا اسلئے بغیر ذات پات اور کسی خیال کے نفسیاتی مجبوری کی بنا پر اُس نے
نفیسہ کو اپنے ساتھ رکھ لیا یا اپنی بیوی بنا لیا ؛ یہ غلط ہے کہ انسانی ہمدردی کے اعلیٰ تخیل کی بنا پر
نجو نے نفیسہ کو قبول کیا ؛ کیونکہ نجو کو شفیق صاحبہ موٹر کلینر کہہ چکی ہیں اسلئے اسکا ایک ماحول اور
اُس ماحول کی سیرت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے ۔ موٹر کلینر کا اخلاق سوسائٹی میں اتنا بلند نہیں دیکھا گیا ہے
کہ وہ پیغمبروں کی سی باتیں کرے ۔

شفیق بانو صاحبہ کے افسانوں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کردار نگاری
کی بڑی کمی ہے ؛ شاعری اور رومانس کی زیادتی نے انکو جامد حسن کی بُت ہوی بنا دیا ہے ۔ انکے الفاظ
تاثیر میں ڈوبے ہوئے نشہ میں بہکے ہوئے ۔ اور سادگی اور بے ساختگی کا آئینہ سہی ۔ مگر خدا جانے وہ حقیقت
سے بحث کیوں نہیں کرتیں !؟

اسی مجموعہ میں انکا ایک مختصر افسانہ "شاعر کو دیوتا کیوں سمجھا" ۔ !؟ ہے، جو نہایت خوب ہے،
اور ہر وہ شاعر اسکے موقع اور محل کو خوب سمجھ سکتا ہے جو کسی لڑکیوں کی کالج میں شاعر کی حیثیت سے
گیا ہو ۔ یہ بھی بہت مختصر کہانی ہے ؛ ایک لڑکی ایک شاعر کا کلام سنکر شدید طور پر متاثر ہو جاتی ہے
دو سال کے بعد کہیں پھر مشاعرہ ہوتا ہے ؛ موہنی اس مشاعرہ میں جاتی ہے ۔ اور ترنگ سے ملتی ہے جب
ملتی ہے تو اُسے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکی نگاہ میں شعر اور شاعر کی سی پاکیزگی اور بلندی نہیں ۔ یکایک
اسکا دل ٹوٹ جاتا ہے اور ترنگ سے نفرت ہو جاتی ہے شفیق صاحبہ یہاں لکھتی ہیں کہ :-

دل میں دو خیال پیدا ہوئے تھے ایک نے تو انسان کو دیوتا بنا دیا اور
دوسرے نے دیوتا کو زمین پر پٹخ دیا ۔

سارے افسانے کی زبان بیحد دلکش اور بیساختہ، نکھری اور ستھری زبان ہے لیکن کوئی نفسیاتی
پس منظر نہیں ۔ اور نفسیاتی وجوہ و اسباب کی بنا پر حالات سرزد نہیں ہوتے ؛ معلوم ہوتا ہے
کہ افسانہ نگار انسان کی زندگی دو قسم کی چاہتی ہیں ایک پردہ کے پیچھے جیسی کہ زندگی ہوتی ہے،
ایک افسانے میں ، جیسی کہ وہ چاہتی ہیں ؛
حالانکہ زندگی کو ایک ہی شکل دی جاسکتی ہے ۔ ہمیں اس افسانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موہنی
ترنگ سے اور اسکی شاعری سے محبت کرنے لگی ۔ محبت کیا چاہتی ہے ؛ ارتباط ! قربت ! !
اتحاد ! ! ! " موہنی نے ترنگ سے ملنے اور اسکو دوبارہ سننے کی آرزو کی ، تو گویا
اُس نے اپنی محبت کی ۔ ۔ ۔ ۔ تکمیل کی ؛ ترنگ نے اُسکو حریص نگاہوں سے دیکھا یعنی ترنگ نے
بھی بہ نوع دیگر قربت چاہی ؛ حرص اور محبت میں آخر کیا فرق ہے ۔
یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شفیق صاحبہ کالج میں ہونیوالے مشاعرہ کا نہایت کامیاب منظر کھینچ
چکی ہیں ؛ اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ترنگ کی غزل نے سبکو بیخود کر دیا ۔ اب یہاں دو باتیں
پیدا ہوتی ہیں ۔

(۱) کبھی لڑکیوں کی کالج میں ایسا شخص بہ حیثیت شاعر مدعو نہیں کیا جاسکتا
جو مہذب اور بلند و پاکیزہ اخلاق نہ ہو ؛

(۲) اور کبھی اس شخص کی شاعری عورتوں کو متاثر نہیں کر سکتی جو
شخصی طور پر کیریکٹر میں تاثیر نہ رکھتا ہو ؛

تو فرض یہی کرنا پڑیگا کہ ترنگ میں یہ دونوں خصوصیتیں ضرور تھیں جبھی وہ کالج میں
بلایا گیا ؛ اسکے بعد حریص نگاہیں ، کیا معنی ! ؟
موہنی کو اگر وہ ایک تخییل پرست لڑکی دکھا دیتیں تو زیادہ بہتر ہوتا ؛ یا پھر وہ ماڈرن گرل کے
کیریکٹر کو واضح طور پر لکھتیں ؛ کہ بیچارہ ترنگ نئے کلچر اور تہذیب سے ناواقف شاعر تھا اسلئے چالاک سی موہنی
کیساتھ بات نہ کرسکا اور مارا گیا ؛ لیکن وہ کوئی نفسیاتی بنیاد قائم نہیں کرتیں اور افسانہ کو پورا کر دیتی ہیں ۔
میں نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ " سہارا " بہت بہتر مجموعہ ہے لیکن شفیق بانو صاحبہ اس سے بہتر مجموعہ
لکھنے کی قدرتی اہلیت رکھتی ہیں اور اپنی اس اہلیت کا انہیں صحیح اندازہ کرکے صرف ایک راہ اختیار کرنی چاہئے
یا رومانی افسانہ نگاری جسکا اب کوئی مستقبل نہیں یا کردار نگاری اور واقعیت نگاری کیطرف رجوع ہونا چاہئے ۔
وہ بہت آسانی سے افسانہ نگاروں میں اپنی ممتاز جگہ حاصل کر سکتی ہیں اگر وہ مختلف اخلاقی، معاشی
اور واقعیاتی عناصر کو افسانے میں یکجا جمع کرنے سے گریز کرنے لگیں ؛ زندگی انکے پیش نظر
ہونی چاہئے ۔ موہنی کو کیوں ترنگ سے نفرت ہو گئی ! ؟ ●

ہیں اسکی اشاعت پر ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔ اس مجموعہ کے کئی افسانے اتنے دلنواز ہیں کہ روح میں تڑپ پیدا ہو جاتی ہے اور بعض میں تخیل پرستی کی ایسی آگ ہے کہ سارا کاروبار جیتا اسی سے روشن معلوم ہوتا ہے ؛

اشارے

رنجیدہ فروگذاشتیں فروگذاشت، لطیفہ ہو اور انجانے طور پر، تو مزیدار ہوتی ہے۔ مگر بعض فروگذاشتیں ایسی ہو جاتی ہیں، جن سے فرد کی ناقدر شناسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ اکتوبر نمبر میں شاستری صاحب کا مضمون "ہندو مسلمانوں کے علمی اور تاریخی تعلقات" ناقص طور پر شائع ہو گیا اور صفحہ کی ایک کاپی چھپنے سے رہ گئی۔ اب اس نمبر میں اس مضمون کو از سرِ نو شائع کیا جا رہا ہے۔ صفحہ ۱۳ پر "برطانوی سلطنت کا مداخلتِ مرکز" میں "مداخلت" غلط لکھا اور چھپا، لفظ اصل میں "مداخلتی" ہے۔ تیرا گناہ یہ، صفحہ ۹ پر اولین سطور میں "محض اسلئے کہ وہ زندگی کو مسطح روپ میں تسلیم کریں" کی جگہ "مسطح اور مادتی" چھپ گیا۔ اس مضمون میں اور بھی کئی جگہ سخت قسم کی کتابت کی غلطیاں رہ گئیں جنکا مجھے سخت افسوس ہے۔

کمال، و تمام تو نہیں، لیکن ان فروگذاشتوں کے ہیرو جو صاحب ہیں، وہ اپنے خیال میں خود قدرت کی شاہکار فروگذاشت ہیں، افسوس یہ ہے کہ وہ اب ادارۂ ادبی مرکز میں نہیں، ورنہ ان کا نام آپ کو ضرور بتایا جاتا۔ ان حضرت نے ایشیا کے پروف دیکھتے ہوئے ہمارے محترم دوست پنڈت گوپی ناتھ تنہا ایڈووکیٹ میرٹھ کو شاعری کا جوڑ بلا مدد۔ وہ یادگار واقعہ ہے۔ پنڈت گوپی ناتھ تنہا میرٹھ کی قومی شخصیتوں اور ذہنی و دماغی بزرگوں میں سے چوٹی کی شخصیت ہیں۔ شاعر نواز ہیں، آرٹ اور شعر و ادب کے دیوانے ہیں، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے شاعر نہیں۔ مگر "ہندو شعراء و ادبا" کی فہرست میں اُن کے نام کے آگے شاعر لکھا ہوا دیکھا گیا۔ یہ "فاضل مرتب" کی بالکل نئی تحقیق ہے۔ کون مرتب ــــ !؟ یعنی اصولی طور پر خود نیاز مند اور واقعی طور پر پہلے اسسٹنٹ اڈیٹر صاحب ــــ !!

برطانیہ عظمیٰ میں تحریکِ مزدور کا مسلسل حصہ جناب "ف" نے اس نمبر کیلئے عطا فرمایا۔ اب ادبی مرکز نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ کتاب پہلے تمام و کمال ایشیا ہی میں شائع ہونی چاہیئے۔

اس ماہ میں "بادۂ مشرق" کا ہندی اڈیشن "رس ساگر" شائع کر دیا جائے گا۔ . . . . انگریزی اڈیشن بھی چند ماہ میں شائع ہو جائیگا۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد دوسری کتابوں کی اشاعت زیرِ غور ہے۔

یہ ہے دنیا ــــ !؟ اکتوبر نمبر میں مختصر کہانیوں کا ایک سلسلہ "یہ ہے دنیا ــــ !؟" شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلے کی دونوں کہانیاں ملک میں بیحد پسند کی گئیں۔ خاص کر "خبطی" کو اختراعِ فائقہ کی حیثیت دی گئی۔ لیکن "خبطی" ہی فریدی کا شاہکار نہیں۔ ان کے افسانے جب کتابی شکل میں شائع ہوں گے اسوقت ناظرین کو یہ اندازہ ہوگا کہ وہ ترقی پسند ادب کے بنیادی ستونوں میں سے کتنے مستحکم اور عظیم الشان ستون ہیں۔ یہ ہے دنیا کے سلسلے میں کوئی اچھی کہانی وصول نہیں ہوئی، اسلئے اس ذیل میں کوئی چیز شائع نہیں کیجا رہی ہے۔

نیا راگ شاعری آج کل جتنی سستی اور وافر ہے ــــ اس کا اندازہ دفتر میں روزانہ آنیوالی نظموں اور غزلوں سے ہوتا ہے۔ لیکن ایشیا سستی اور وافر شاعری کا آرگن نہیں۔ اس وقت تک ایشیا کے حصۂ نظم میں کچھ نرمی ضرور برتی جاتی رہی، لیکن اب گنجائش نہیں ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں میں اچھی اور طبع زاد و دل دوز اور دلنواز نظم و غزل کے لئے کسی خصوصیت کی قید روا نہیں رکھتا؛ مگر نظم کے حصے کے لئے

اپنے مطبوعات بھیجنے والوں کو چاہیے کہ وہ خود بھی محتسب اور نقاد بنیں۔ مجھے ناز ہے ناز ہی نہیں فخر ہے کہ موجودہ نمبر میں حصۂ نظم بھی اتنا بلند ہے کہ ہندوستان کا کوئی رسالہ کوئی سالنامہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب ہر نمبر اتنا ہی بلند حصۂ نظم پیش کیا کریگا۔

ماہانہ "ایشیا" ایشیا کو ماہانہ کرنیکا خیال اپنی جگہ کمزور نہیں ہوا مگر معاف کیجئیگا، آپ کی طرف سے کوئی ایسی ہمت افزا تائیدی صدا بلند نہیں ہوئی جو میرے عزم خارجی کو قوت بخشتی۔ جیسی کی ایسی شاندار نمائش کے بعد میرے اندر چھپے ہوئے شاعر کی تو ہنسیں چھوٹ جانی چاہئیں۔ لیکن میں مایوس نہیں۔ موجودہ ایشیا بھی میں کسی کے سہارے پر شائع نہیں کرتا۔ اور ایشیا کو ماہانہ بھی اپنے بل بوتے ہی پر بنایا جائیگا ؎

ہر قدم پر اپنے دم کا آسرا رکھتا ہوں میں

ہاں یہ حقیقت ضرور ہے کہ یہ ساری جد و جہد ہے آپ ہی کے لئے یہ دوسری بات ہے، کہ آپ اسے اپنے لئے نہ سمجھیں۔ بہرحال ہر لمحہ میرے پیش نظر ان بنیادی انتظامات کی تکمیل ہے، جن کی نیو پر ایشیا کو ماہانہ کیا جا سکتا ہے۔

خیر مقدم کیا یہ انتہائی خوش قسمتی نہیں کہ "بزم ایشیا" میں ایک ایسی شخصیت کا اضافہ ہوا ہے جو مشرقی تہذیب و تمدن، ہندوستانی روایات اور دلی کی مٹی ہوئی زندگی کا ایک بولتا ہوا نمونہ ہے" ——— !؟

آیئے، میں آپ سے خواجہ شفیع دہلوی کا تعارف کراؤں۔ یہ ایشیا کے لئے نئے سہی، مگر آپ کے لئے نئے نہیں ہیں۔ "دلی کا سنبھالا" "مغلوں کا جزر و مد" اگر آپ نے دیکھا ہے تو آپ خواجہ صاحب کو خوب پہچانتے ہوں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نہ صرف ان کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ ان کے اسلوب کا زخمی بھی ہوں۔ زخم اتنا گہرا ہے اور لذت اس درجہ ابدی، کہ جراحت کا سامان عام کر رہا ہوں۔ چاہتا یہ ہوں کہ دنیا شکار ہو جائے، فیاض ہوں، تنگدل نہیں۔ "ہم" اور "وہ" دونوں اس کا ثبوت ہیں۔

"ہم اور وہ" ——— خواجہ صاحب کے اسلوب کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں جس دلنوازی سے واقعات اور مسائل کو گہری اور لطیف طنز کے ساتھ لکھا گیا ہے وہ طرز خواجہ صاحب کو اعلیٰ ترین نقاد کا مرتبہ عطا کرتی ہے۔

ان کا ایک اور چھوٹا سا مضمون "رنڈی" اسی نمبر میں ہے وہ بھی کم نغز نواز نہیں۔

تصحیح اور تبدیلی صفحہ ۱۵۱ پر "من کی بانسری" میں ۶ اور ۷ شعر کو اس طرح پڑھئے ؎

۶۔ چلا جا رہا ہے وفا کا مسافر — تمنا جدھر بھی لئے جا رہی ہے
۷۔ نہ موجیں نہ طوفاں نہ مانجھی نہ ساحل — مگر من کی نیّا بہی جا رہی ہے

صفحہ ۱۵۶ پر ۳ شعر کو از راہ کرم یوں پڑھئے ؎

۳۔ دہر میں جس عقل کی بیداریوں کی دھوم ہے — اسکو تو صرف ایک نور ہی سلا سکتی ہے

اور صفحہ ۱۵۷ پر ۹ اور ۱۳ شعر کو اس طرح پڑھئے۔

نگاہِ شوق کا یہ ذوقِ گلچیں ایسے تو بہ — بہے آنکھوں میں اور تیرے گلے کا ہار ہو
مسافر کیلئے ہے ننگ احساسِ تن آسانی — ابھی راہِ منزل اور بھی دشوار ہو جا
غلام بادہ و ساغر نہیں کچھ فطرتِ ساغر — جو ساقی دیکھ لے تو بن پئے سرشار ہو جا

ساغر

SAGHAR
IN ENGLISH

"Saghar's entire attitude and approach towards life is of youth, richly endowed with a passion for the history, romance, hope and freedom of his country. He is in every fibre of him Indian and his art is both drawn from and dedicated to his motherland."

SAROJINI NAIDU

The Urdu knowing world is already familiar with the message of this young and buoyant poet of the East.

It is a message of indepeneence and national pride.

The Hindi Edition of Saghar's poems is already in the market and eagerly sought by lovers of poetry and literature.

It is now translated into English for the benefit of English knowing world.

Price per copy Rs. 4 - 12 only. To those who order in advance it will be given for Rs. 3 only.

BOOK YOUR COPIES NOW TO AVOID DISAPPOINTMENT.

Manager, Adbi Markaz,
MEERUT.
(India.)

Vol. 4 MARCH 1940. No. 13

THE ASIA

The Hindustani Quarterly Journal

of

The Adabi Markaz Meerut (India)

Edited by

S. Y. K. SAGHAR NIZAMI.

Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.


ایشیا

اُردو دنیا کی طرف سے ہندی سنسار کیلئے بہترین تحفہ

رس ساگر

بادۂ مشرق کا نیا روپ

ہندوستانی ادب میں یہ پہلی مکمل کوشش ہے جس کی بنیاد میں لسانی اتحاد، قومی ملاپ اور ہندوستان کی ایک لنگوا فرینکا وضع کرنے کے خیال کی طرف پورے وثوق کے ساتھ قدم اٹھایا گیا ہے یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ساغر کے مجموعہ کلام "بادۂ مشرق" کی منتخب نظمیں اور نیا کلام ناگری حروف میں ایک مرتب مجموعہ کی شکل میں چھاپا گیا ہے اور حواشی میں ان تمام الفاظ کے معنی آسان زبان میں دیئے گئے ہیں جن کو ہندی دنیا بالوجوہ آسانی سے نہیں سمجھتی۔

کتاب کے لئے خاص طور پر پیلا اینٹک پیپر مل سے بنوایا گیا ہے اور چھپائی ہندوستان ٹائمز پریس دہلی میں ہوئی ہے "رس ساگر" مجموعی طور پر نہایت حسین اور اعلیٰ سامانوں کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور اُردو دنیا کی طرف سے ہندی سنسار کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ آپ اپنے ہندی جاننے والے دوستوں کو نہایت فخر و مسرت کے ساتھ اس تحفہ کی نذر کر سکتے ہیں

منیجر ادبی مرکز میرٹھ (یو۔ پی)

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی ادبی ماہوار رسالہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ بہار

زیر سرپرستی ڈاکٹر سید محمود

ایڈیٹر

ساغر

اسسٹنٹ ایڈیٹر

م-ک-م

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپے (ہندوستان سے) قیمت فی نمبر ۸ر آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپے (بیرونی ملکوں سے) ایجنسیوں کو ۲۰ فی صدی کمیشن

(جملہ حقوق محفوظ)

فہرست مضامین ایشیا اگست سنہ ۱۹۴۲ء

ایشیا

جلد ۶ | اگست سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر ۱

طوفان میں سفر

شکستہ نبض نا خدا ہے خوفِ طوفاں سے تو تُو
پردۂ ہر موج میں سو نا خدا رکھتا ہوں میں ——— !

——— ہولناک جنگ نے یورپ کو جہنم بنا رکھا ہے، تباہی اور بربادی کا خوفناک طوفان اُٹھ رہا ہے، مجبور و بے کس انسانیت ہے اور خون و آتش! بھوک اور فاقہ، خانماں بربادی کا منحوس راج ہے اور نازک و حسین انسانیت کساد بازاری کے جھکڑ ہیں ——— اور افلاس زدہ آدم کی اولاد! یہی نہیں، اپنے ہوں یا بیگانے، آزادی کی اُمنگیں کسی کو گوارا نہیں، زندگی کے راستے ہیں مگر کانٹوں کے بجائے فلسفوں سے اَٹے ہوئے، سفر کے لئے راہ موجود ہے مگر پتھروں کے بجائے اصول پرستیوں سے پٹی ہوئی -!؟

راجا اور پرجا ہیں مگر دونوں لفظوں کے کھلاڑی، شیخ و برہمن کی کمی نہیں مگر دونوں بازیگر، ہندو ہوں کہ مسلمان دونوں کے دل ہیں چور ——— !

ادھر پاکستان کا سنائی آتش فشاں، ادھر آریہ ورت کے خیال کا نام نہاد جوالا مُکھی، یہ بھی ناری وہ بھی، اور ہر خاکی تخلیق سے عاری!؟

اک طرف اُردو زبان کی حفاظت اور اشاعت کا . . . . . ایسا شور، گویا اُردو کو واقعی فنا کر دیا جائیگا۔ دوسری طرف سنسکرت آمیز ہندی کے رواج کا وہ ڈھنڈورہ گویا ہر ہندوستانی زبردستی پنڈت بنا دیا جا سکیگا!؟ ہر وہ بازی گر جو مذہب پر قربان ہونے کا شعبدہ دکھا سکے، دھرم اور مذہب کا محافظ! ہر وہ سادہ لوح جو انسانیت اور نیکی کو فرضی حدوں سے آزاد کرائے ملحد اور ناستک، ہر وہ ہندو جو مسلمان کے ساتھ صحیح ... ہے ہندو کش، ہر وہ مسلمان جو ہندو کو بھائی خیال کرے، ایمان فروش!؟ کامیابی کے لئے فرقہ پرستی اسم اعظم، اور فرقہ پرستی کے سلسلے میں دل آزاری عین قوم پرستی!!

قدم قدم پہ فرشتوں کے لکھے پر قید و بند کا انتظار! نظر نظر میں زنجیر، نفس نفس میں نغمۂ سلاسل ——— !؟!

سادگی اور سادہ دلی گناہ، پریم اور محبت پاپ، بھائی چارہ اور ہمدردی جرم، تلاش پر ڈھٹائی کے ساتھ اعتقاد، اپنے پر قبیح ہونے پر برافختہ کو ہنس ہنس کر زعم، الامان والحفیظ!!

یہ ہے وہ ہمت شکن طوفانی پس منظر مگر ٹھیک اُس لمحہ میں جو مطلع عرقابی کا نقیب ہے میں اپنی شکستہ کشتی کو موجوں کے سپرد کرتا ہوں ؎

زبان دی ہے سرمست موجوں کو میں نے
کہ طوفان میں بھی مسکراتا رہوں گا

اپنی طوفان شکار کشتی، سیلاب کی نذر کرنے کا ارادہ کوئی نیا ارادہ نہ تھا، ۱۹۲۳ء میں جب نجوم "ایشیا" سہ ماہی شائع ہوا، اسی وقت سے میں منتظر تھا مگر معلوم ہوا کہ آگے بڑھنے کیلئے سکون کی فضا پیدا ہونا محال ہے، سفر مقصد ... تو

راہ کی دشواریوں کا خیال کرنا، بہادر مسافر کی شان نہیں۔

پیچیدہ گھاٹیوں سے گذرا، کانٹوں میں دامن اُلجھا اور کبھی بچ کر بہر حال ایک مرکز پر میں نے سانس لی، سامنے موجیں مارتا ہوا سمندر تھا یہاں ساتھی کی ضرورت تھی، ایسے ساتھی کی جو طوفان سے کھیلنے کا عادی ہو۔ ڈوبنا اور اُبھرنا، مدّوجزر، کشتی و دریا، سکون اور طوفان کی حیثیت جس کی نگاہوں میں بقدر یک نفس بھی نہو ۔

——— مُڑ کر دیکھا، میرا رفیق ہنس رہا تھا، معتمد کامل اور محب رفیق، دل نے کہا اب کیا دیر ہے ——— ؟

اعتماد کمال اور محبت کی رفاقت میں طوفان کیا، آدمی کو جہنم میں بھی کود پڑنا چاہئے۔

اب کسی انتظام کی ضرورت نہ تھی، جو نہ تھا وہ ہوگیا، جو ہوگیا، وہ اٹل ہے، جو کچھ ہوگا وہ سچے ارادوں کے مطابق ہوگا، ضرور ہوگا۔

ماہنامہ ایشیا کا یہ پہلا نمبر ہے، جس کے معیار میں رتی بھر فرق نہیں ہوا، تاہم دل جو چاہتا ہے وہ حُسن اور تکمیل ابھی اس میں پیدا نہیں ہوئی ——، پھر بھی طوفان میں جو کچھ ہوسکتا ہے اس کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بناؤ کچھ کم بھی نہیں ۔

گو یہ سفر کسی کے بھروسے پر نہیں کیا گیا مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس طوفان میں کون کون ساتھ دیتا ہے ——— میں ڈوب کر بھی انسان کی پیدائشی تشنگی سے انکار نہیں کرسکتا، ہاتھ چپّو پر ہیں اور نگاہیں یارانِ ساحل پر ! ؟

کوئی دعویٰ نہیں، مگر میں نے جوانی اور اس کی سرشاریوں، زندگی اور اس کی طلبگاریوں کی بازی ادب کی بساط پر لگادی ہے، شکست و فتح، کامیابی اور ناکامی کے خیال سے آزاد ہو کر میں نے پانسہ پھینکا ہے، نتیجہ کا انتظار اچھے قسم کے شاطر کب کرتے ہیں، میں صرف کھیلنا چاہتا ہوں، ہار پر سینہ کوب ہونا اور فتح پر اُچھلنا میرا مذہب نہیں ۔

اس وقت تک ایشیا کی بقا کی ضامن میری زندگی رہی، وہ زندگی جو مجاہدۂ حیات کی مشتاق ہے، متحرک، گھمبیر، نچہ کش زندگی، چھین جھپٹ پر خوش ہونیوالی نقصان و فنا کو لازم جاننے والی زندگی، غم جس کی گردِ راہ اور مسرت جس کی خاکِ پا ہے، "جو تنہا" ہے، حسّاس ہے، دردمند ہے، غم ناک ہے، سوز بدل اور

دوستوں کی ماتمی ہے، اک آبگینہ ہے نازک ترین، اک ناسور ہے رستا ہوا، مگر ولولہ اور حوصلہ رکھتی ہے اور الحمدللہ جس کو مقابلے کی جرأت اور ابچہ ڈھونڈھ نکالنے کی مہارت حاصل ہے ۔

کبھی تم نے سمندر میں قائم چٹان کو دیکھا ہے —— ! ؟

اسی طرح اٹل زندگی، ہر مصیبت کے لئے سینہ سپر، طوفان سے کھیلنے والی سیلاب افگن، گرداب آشنا، اَمَر اور اٹل !

کبھی تم نے طوفان کے تھپیڑوں کے خوفناک حملوں کو دیکھا ہے —— ؟

اسی طرح رواں دواں، پُرشور، بپھری ہوئی زندگی، میری یہ زندگی اکیلی میرے اُن کاموں کی ذمّہ دار ہے، جو میری ذات سے شروع ہو کر آپ کی ملک بن گئے اور جن کو آپ نے قبول کرلیا ۔

اُن کاموں کی نوعیت شروع ہی سے ایسی نہیں رہی جس کو خدانخواستہ روایتی کہا جاسکے۔ ایشیا نے زندگی، تبدیلی اور تعمیر، اک نئی دُنیا کی تعمیر کے بُنیادی سامانوں کو جمع کرنا چاہا، ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی طرح کامیاب نہ ہوسکا ہو لیکن اس کے مقاصد صرف ماضی کی چھان بین اعداد وشمار کا اعادہ، مومن و غالب اور میر و سودا کی ہڈیوں کو کھود نا اور ان کو سجا کر رکھ دینا ہرگز نہیں ہے ۔

یہ ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ لیکن ایشیا مشرق ...... کی رگوں میں تازہ اور گرم خون پیدا کرنا چاہتا ہے۔ انسان کی ذہنی خود مختاریت قائم کرنا چاہتا ہے اور مُلکی آزادی سے پہلے ذہنی آزادی پیدا کرنا اس کا اولین مقصد ہے ۔

وہ مشرقیوں خاصکر مسلمان اور ہندوؤں میں ایک تازہ دم اور جوان قوم کی سی شکتی، اک آہنی خود اعتمادی اور ہندوستانیوں کو کیرکٹر رکھنے والی قوم دیکھنا چاہتا ہے ۔

وہ چاہتا ہے، ان غلاموں کو اپنی طاقت پر اعتبار ہو۔ وہ چاہتا ہے ان کرشن اور رام کے پجاریوں کو اپنے نفس کا عرفان ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ خالدؓ و عمرؓ کی اولاد مغالطوں اور جہل مرکّب کی نیند سے بیدار ہو جائے۔ اک نئی دُنیا بنائے اور وہ چاہتا ہے کہ زندگی کے جسم میں انفعال کا ایک ذرہ بھی باقی نہ رہے ایک پُرنشاط اور شاندار عملی کیفیت سے تینتیس کروڑ غلاموں کی آبادی جھوم جھوم اُٹھے ۔

یہ اور بات ہے کہ ہو نہ سکے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ لوگ سرکار اور حضور کہنا چھوڑ دیں - غلامی کے خون کا آخری فاسد قطرہ بھی انسانی جسم سے نچوڑ لیا جائے - اک باعظمت انفرادیت قائم ہو - جو ہمیں تاریخ میں اشرف اور اعظم کا لقب دلوا سکے ؎

اور اگر اس چاہنے کی راہ میں ایشیا پر آسمان بھی ٹوٹ پڑیں تو وہ اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لے گا - اس کا عزم اہرامِ مصری کی طرح اٹل ہے -

---

یہ عزم جس قدر جدوجہد چاہتا ہے اس جدوجہد اور بھاگ دوڑ سے میں نے کوئی تکلف نہیں کیا - لیکن اب وہ پہلی سی کیفیت کہاں! ؟ کوئی بڑی بات کہنا تو در کنار لوگ تازگی اور محض ہمت کے اعلان سے ڈرتے ہیں، بم کا کیا ذکر، محض قہقہوں کی صدائیں دل ہلا دیتی ہیں - ہر طرف ایک المناکی اور انفعالیت کا دور دورہ ہے ؎ خاصکر مسلمانوں (کیونکہ ہندو قوم کا مجھے زیادہ تجربہ و مشاہدہ نہیں ہے) کی خواہش ہے کہ ان کی موجودہ زندگی میں رتی بھر تبدیلی نہ کی جائے -

بریلی میں ایک مخصوص مسلمان نے مجھ سے کہا: "آپ کو پالیٹکس سے کیا تعلق؟ ——— ! ؟ آپ ترنم کے ساتھ غزل سنائیے" اس فقرہ سے آپ اُس ہمت شکن طرزِ عمل کا اندازہ کر سکتے ہیں جس سے کارکن مزاجوں کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے - امراء ہم سے مستقل ذہنی غلامی اور نگوں ساری چاہتے ہیں عام ہندوستانیوں میں اُن لوگوں کی کھپت ہے جو قوموں کو اچھی طرح لڑا سکیں ؎

یعنی کام کرنے کا میدان بدقسمتی سے خود ہی محدود ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے اندازہ ہے کہ تمام اُردو داں طبقوں اور ایشیا کے مابین جو مشترک چیز ہے وہ اس کا خالص ادب ہے - اور محض اسی کی بنیادوں پر وہ اپنی دُنیا بنانے میں کامیاب ہوا ہے ؎

آپ جانتے ہیں میں ایک متوکل مسافر ہوں - اور ہلکا پھلکا سامانِ سفر رکھتا ہوں - صرف اسقدر کہ جی سکوں اور ایشیا کو زندہ رکھ سکوں ؎

چنانچہ ۸ سال سے نقصانات کے باوجود میں اس کو شائع کرتا رہا - اب ایشیا نے جو قدم اُٹھایا ہے وہ طاقت چاہتا ہے، زادِ سفر چاہتا ہے اور آپ کی ہمدردی چاہتا ہے -

مجھ سے جو کچھ چاہتا ہے وہ میں جانتا ہوں ——— جوانی کی بھی کبھی گھڑیاں، افسردگی کی خاک پرستی کی آخری تڑپ، دردِ تہِ جام اسے آپ کو گوارا کر کے یہ متاع بھی اس کی نذر کرتا ہوں ؎

میں سمجھتا تھا کہ ماہانہ کرنے کے بعد مجھے ملک بھر کا دورہ کرنا پڑے گا اور زیادہ سے زیادہ توسیع کر کے اس کی بنیادوں کو اور بھی محکم کر دینا ہوگا - ایک مدت آپ نے مجھے کسوٹی پر کسا، اب آپ کی پرکھ کا وقت آ گیا ہے اگر دوستوں، عزیزوں، عوام اور خواص کو میری ذات اور میرے کاموں کے ساتھ دلچسپی ہے تو وقت آ گیا ہے کہ وہ اس دلچسپی کا ثبوت دیں - میں ہر جگہ آؤں گا ہر مقام پر پہنچوں گا - ایک ایک دروازہ پر صدا دوں گا - ایک ایک دل کی کنڈی کھٹکھٹاؤں گا محض اس لئے کہ میں اس پاکیزہ اور اہم مقصد میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہوں جو مجموعی طور پر تمام ہندو مسلمانوں کا قومی مقصد ہے جو شخص اس مقصد میں میری امداد کریگا وہی میرا سچا دوست ہوگا اور وہی ادب کا سچا پجاری -

میں یہ دورہ ۱۸ اگست سنہ ۱۹۴۰ء سے شروع کر دوں گا سب سے پہلی منزل بدایوں ہوگی اس کے بعد شاہ جہاں پور، بریلی، مراد آباد اور رامپور قیام کرنے کے بعد مسوری جاؤں گا، جہاں آخر اگست تک مصروف رہونگا ؎

چند دن بریلی اور بدایوں میں

تمام اُردو پڑھنے والی دُنیا سے ایشیا کے ۵۰ ہزار خریدار مہیا کرنے کی اسکیم کو بریلی اور بدایوں سے شروع کیا گیا - کامل ۷ سال کے بعد میں نے یہ تجربہ دوبارہ کیا تھا - سنہ ۲۵ء ۱۹۲۴ء میں شوق تھا اور شرمیلاپن - اب مقصد کے ساتھ جنون تھا اور بے باکی ؎ بے باکی اور جنون کی دُنیا میں سوائے کامیابی کے اور کسی کا گزر نہیں ہو سکتا -

نئی تحقیقات

بریلی اور بدایوں میں عجیب عجیب مشاہدات ہوئے - قدم قدم پر طرح طرح کے لہجے نت نئے سوال و جواب ، کہیں مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں، کہیں نگاہِ ترش کوئی بکسر خیر مقدم تھا کوئی سرتاپا گریز، لیکن مجھے ماننا پڑتا ہے: ملک کو میری اُلٹی سیدھی خدمات کا اعتراف ہے اور ہندو مسلمان دونوں میری ...

عزت نہیں مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

جہاں تک ہندو بھائیوں کا تعلق ہے، مسلمانوں سے فرصت ہی نہیں مل سکی مگر جس قدر حلقوں میں مجھے یاد کیا گیا، کوئی ایک شخص ایسا نہیں جس نے میری جدوجہد سے اتفاق نہ کیا ہو۔ نہ وہاں کج بحثی تھی، نہ گریز کی کوشش، نہ اعتراضات تھے، نہ اتہامات ـــــ مگر مسلمانوں نے جن کے جسم کا میں ایک لازوال حصہ ہوں، لافانی جزو ہوں "اپنی آزادئ افکار" کا پورا پورا ثبوت دیا۔ کسی نے شدید مصروفیت کا بہانہ کیا، کسی نے اُردو زبان سے عدم دلچسپی کا، کسی نے لٹریچر کو مد فاضل کہا، کوئی صبح و شام کا پروگرام بیان کرنے لگا۔ کسی کو کورٹ کی مصروفیتیں نکلیں۔ کسی نے پالیسی پر بحث کی، کسی نے ذاتی عقیدہ پر، کہیں کانگریس مسلم لیگ کی بحث ہوئی، کہیں سوشلزم اور کمیونزم کی! ؟ لیکن اس کے باوجود زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمانوں نے ہی ایشیا کو خریدا، اور مجموعی طور پر ان دو چھوٹے شہروں کے نتیجہ کو کامیابی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کے اندر اہلیتیں تو سب موجود ہیں مگر غلط لیڈرشپ نے اس کو تن آسانی، نفرت اور گپ بازی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔

ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ اغیار اُردو زبان کے دشمن ہیں!؟ یہ مشاہدات تو کچھ اور ہی ثابت کرتے ہیں۔ میں نے تو یہ محسوس کیا کہ اپنے ہاتھ اپنے ہی گلے پر ہیں۔

کسی زبان کے ادب کو فرقہ پرستی طبقاتی پالیٹکس اور اسی قسم کی نزاعی باتوں سے کوئی تعلق نہیں، غالب کا دیوان اور اقبال کی بانگ درا انگریز، ہندو، مسلمان سب کے لئے ایک مشترک دولت ہے۔ سب مل جل کر اُس سے لطف اندوز اور متمتع ہوتے ہیں۔

یہی نوعیت ایک اصول پرست آئیڈل اور اعلیٰ درجہ کے آرگن کی ہے۔ ایشیا اُردو زبان کا رسالہ ہے لیکن اُس میں شائع ہونے والے مضامین کسی ایک قوم کے نقطۂ نگاہ سے نہیں لکھے جاتے بلکہ وہ ایک اصولی زاویۂ نگاہ کے ماتحت تحریر کئے جاتے ہیں، مسلمان، ہندو اور انگریزوں کو اُسے ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔

لیکن بالکل نئی تحقیق ہے کہ لوک ادبی رسائل کو نام نہاد روزنامہ وحدت اور پرتاپ کی حیثیت میں دیکھنا چاہتے ہیں!؟

اک اور نئی تحقیق ہے کہ لوگ ادب کو آئیڈل ازم سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ ادبی رسالے کیلئے "وار کمیٹی آرگن" ہونا بھی ضروری ہے!؟

ایشیا کی مشترک حیثیت ادبی حیثیت ہے، یہ کبھی فنا نہیں کی جا سکتی۔ یہ باقی رہے گی اور ہر اُس شخص کو زندگی اور مسرت کا نیا پیغام پہنچائے گی جو اُردو زبان کو پڑھتا اور سمجھتا ہے۔!؟

یہ مشاہدات ہیں! اندیشے سہی، مگر میں مایوس نہیں، اندیشہ صرف یہ ہے کہیں اُردو زبان سے عدم دلچسپی کچھ اور نہ بڑھ جائے ـــ !؟

اگر ایسا ہوا تو اس تہذیب و تمدن کا خدا حافظ ہے جو ہندو مسلمانوں نے صدیوں کی کوششوں کے بعد پیدا کیا ہے ـــ ؟!

یہ کلمات نیک نہیں ہیں، جو ادب اور زبان کے سلسلے میں مسلمان اپنے گھروں پر بیٹھ کر کہتے ہیں، یہ اُن حویلیوں کی رسوائی ہے جن کے اندر وہ مسند نشیں ہو کر یہ الفاظ کہتے ہیں، یہ اُن لباسوں کی توہین ہے جن کو زیب تن کر کے وہ اُردو زبان سے بے تعلقی اور غیر دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں، یہ تمدن، کلچر، تہذیب، اور علم و ادب تمام روایات کی فنا اور زوال پذیر ہونے کا اقرار کرنا ہے۔ لیکن بہرحال ـــــــ میں پُر امید انسان ہوں، مجھ سے مایوسی اور ناکامی کے خیال کا کوئی رشتہ نہیں، میں اعتراف کرتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہوا وہ توقع سے زیادہ ہوا۔ بریلی بدایوں کے عوام و خواص نے میرے سفر کو کافی کامیاب بنایا۔ اس سلسلے میں بڑا جرم ہو گا اگر میں اپنے بریلی اور بدایوں کے میزبانوں

چودھری تعریف سنگھ ڈپٹی کلکٹر اور ڈاکٹر عبدالغنی اقبال انچارج مینٹل ہاسپٹل، مسٹر علی مقصود بی۔ اے ایڈوکیٹ، مسٹر شوکما ڈھنڈا ایڈوکیٹ کا شکریہ ادا نہ کروں گا جن کی محبت نے مجھے ان کا قیدی بنا لیا۔

بریلی میں مسٹر محمد صدیق ڈی۔ ایس۔ پی کے

خان صاحب معین خاں اور اکرام حسین بی۔ اے بریلوی

مسٹر تیج بہادر سنہا بی۔ اے۔

اور بدایوں میں رائے صاحب امیر چند جوہری ایڈوکیٹ و چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ اور علی مقصود ایڈوکیٹ نے کُھلے طور پر اس ادبی

مقصد میں کامیاب کیا، جس کے لئے میں کمربستہ ہو کر نکلا ہوں۔

رسم کہتی ہے کہ مزید شکریہ ادا کروں، لیکن میرا خیال ہے، دوستی سے زیادہ ان لوگوں کو ادب کی ترقی کا پاس تھا، اب فرد کا سوال نہیں، اُردو ادب ہندوستانی قوم کی فلاح اور ترقی کے لئے ان لوگوں نے میری امداد کی، اصل مقصد میں کامیاب ہونا میری اور ان حضرات کی اصلی مسرت ہے۔

"ہم تم" اور "نذرِ غالب"

یہ دو نظمیں ہیں اور دونوں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے مختلف تاریخوں میں براڈکاسٹ ہوئیں۔ ایک جنوری کے ایشیا میں شائع ہوئی اور آل انڈیا ریڈیو کا حوالہ نہ دیا جا سکا۔ دوسری اس نمبر میں آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہے۔ حوالہ نہ دینے کا مجھے افسوس ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اسسٹنٹ اڈیٹر خیال رکھیں گے۔

مسلسل مضامین

ایشیا کے مسلسل مضامین میں "برطانیۂ عظمیٰ میں تحریک مزدور"

(۲) "جنگ کے جراثیم" دو مضمون اس نمبر میں نہیں جا سکے ہیں۔ جناب "ف" اور شانتی جی کچھ ایسی نئی مصروفیتوں میں ہیں کہ پُرانے خادموں کو دل سے بُھلا بیٹھے ہیں۔ بہرحال میں ایک کوشش ضرور کروں گا تاکہ یہ سلسلے جاری رہ سکیں۔

آسٹریلیا میں ہندوستانی مصوری

حال ہی میں مسٹر جان ڈی وینیٹ وائس چیرمین انڈیا سوسائٹی لندن کے مشورے سے جنوبی آسٹریلیا کی نیشنل گیلری کے لئے ہندوستانی مصوری اور ڈرائنگ کی ۲۸ تصویریں حاصل کی گئی ہیں۔

برٹش میوزیم کے محکمہ کتب مشرقی کے نائب مہتمم مسٹر وِکنسن نے ان تصویروں کے متعلق حسب ذیل بیان دیا ہے۔

"ہندوستان کی قدیم مصوری کو گزشتہ چند سالوں سے ہی یورپ کی وہ توجہ حاصل ہوئی ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ موجودہ صدی میں خاص طور پر اس مصوری کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اسکے متعلق بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں اور خرید و فروخت کے مقامات پر ان کی جو بڑی بڑی قیمتیں (مغلیہ مصوری کی تصویروں کے بعض البم تو سو پونڈ بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت ہوئے ہیں) دی گئی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن مصوری کے قدرداں اس مصوری کے متعلق کیسے بلند خیالات رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں مصوری کا فن بہت قدیم ہے اور بدھ مت والے دیواروں پر جو تصویریں بناتے تھے جنکے نقوش اب بھی اجنتا اور باغ میں پائے جاتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی ہی میں یہ فن اس قدر مکمل ہو چکا تھا کہ ایشیا کے قدیم فنون کی صفِ اوّل میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے ایک ہزار سال بعد تک اس فن میں کوئی ایسی ترقی نہیں ہوئی جس کا ان قدیم شاہکاروں سے مقابلہ کیا جا سکتا۔ کہیں کہیں عوام کی مصوری کے دو چار دلچسپ نمونے ضرور سامنے آئے مگر اس سلسلہ میں کوئی کارنمایاں انجام نہیں پایا۔ قدیم مصوری اب ایک گم شدہ فن کی حیثیت سے رہ گئی تھی۔

عہدِ مغلیہ کے مصوروں کے ابتدائی کارنامے درحقیقت ایرانی مصوری کا پرتو تھے۔ ہمایوں پہلا بادشاہ تھا جس نے اس فن کے ماہر ایران سے بُلائے تھے۔ اس کے جانشیں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی ذاتی توجہات سے کتابوں پر نقاشی کا قدیم فن درجہ کمال تک پہنچ گیا۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس فن کو نظر انداز کیا گیا۔ اور چونکہ اسے شاہی سرپرستی میسر نہ آسکی اس لئے یہ فن رفتہ رفتہ تنزل پذیر ہونا شروع ہو گیا مگر اس سے فن معدوم نہیں ہوا۔ مصور صوبجاتی درباروں میں جانے لگے اور اس طرح اُن کے فن کی عزت افزائی جو بعض صورتوں میں بہت دلچسپ ہوتی تھی مقامی ہو گئی۔ اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد کی بہت سی تصویریں نہایت قیمتی ہیں۔

مغل مصوری ایران اور ہندوستان کی مخلوط پیداوار ہے یعنی

دونوں ملکوں کے فنون مصوّری کا مشترک مظاہرہ ہے۔ مغلیہ عہد کے ابتدائی مصوّروں کو ماڈل بنانا ایران نے سکھایا اور پھر ان خاکوں میں جو رنگ آمیزی کی گئی اس میں ہندوستان کے مذہبی آرٹ کو بڑا دخل ہے ہندوستان کے مذہبی آرٹ نے درباری مصوّروں پر اپنا اثر بھی ڈالا اور خود بھی اُن سے متاثر ہوا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ کی مصوّری پر ایک تیسرا اثر بھی ہوا اور وہ یوروپین مصوّری کا تھا۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانوں میں جن عیسائیوں کو زیادہ باریابی حاصل تھی انہوں نے ہندوستان میں مغربی مصوّری کو متعارف کیا۔ وہاں کی مذہبی رعایا مصوّری کے ذریعہ سے اپنے اعتقادات کو جس طرح ظاہر کرتی تھی اس سے روشناس کرایا۔ فضا۔ مقام۔ روشنی کے اثرات۔ پس منظر ان تمام باتوں کے متعلق یورپ والوں کے جو احساسات تھے ان سے ہندوستان کے مصوّروں کو آگاہ کیا اور ان اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی مصوّری پر ایران کا جو اثر تھا وہ کم ہو گیا اور ہندوستانی اور ایرانی مصوّری میں نمایاں فرق ہو گیا اس کے علاوہ ہندوستانی مصوّری کا کچھ حصہ ایسا بھی تھا جس پر بیرونی فنون کا زیادہ اثر نہیں تھا بلکہ وہ ایشیا کی قدیم مصوّری کی خصوصیات کے حامل تھے۔

مغلیہ خاندان کے زمانہ میں جو مصوّری ہوئی ہے اس کو درحقیقت "درباری تاریخ" اور "فن تصویر کشی" سے زیادہ تعلق ہے تصویریں بنانے کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ شاہانِ مغلیہ شہزادگان اور مختلف النسل رؤساء و امراء کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ جانوروں کی تصویریں بنانے میں ہاتھیوں کی تصویریں خصوصیت سے ملتی ہیں اور ان میں زندگی اور حرکت کے تمام آثار نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔

اگر سچ پوچھا جائے تو ہندوستانی مصوّری زیادہ تر مذہبی مصوّروں کا کارنامہ ہے خصوصاً راجپوتی مصوّری جس میں ہندوؤں کی قومی یادگاریں ہیں یا مہاراج کرشن کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں مغل مصوّری کے اثرات بہت پائے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ذرا مختلف کیفیت کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے نقوش میں ایک ایسا امتیاز رکھتے ہیں جو صرف انہیں کا حصہ کہا جا سکتا ہے۔

تصاویر کا یہ مجموعہ جسے ہندوستانی مصوّری کا مکمل مظاہرہ نہیں کہا جا سکتا اپنے اندر ایک تنوع ضرور رکھتا ہے اور اپنے زمانہ کی مختلف مصوّری کے شاہکار رکھتا ہے۔ اس بات کا تھوڑا سا افسوس ہے کہ ان میں سے زیادہ قدیم زمانہ کی جو تصویریں ہیں وہ کہیں کہیں سے خراب ہو گئی ہیں مگر وہ اپنی خصوصیات کو صاف طور پر ظاہر کرتی ہیں۔ یہ مجموعہ تصویروں کے لحاظ سے تو قیمتی ہے ہی مگر اس لحاظ سے بھی قیمتی ہے کہ اس میں قدیم کے ساتھ ساتھ کچھ جدید مصوّری کے شاہکار بھی پائے جاتے ہیں۔

موت کا شاہکار

کس دل سے میاں شبیر احمد، انکی بیگم، محترمہ بیگم شاہنواز اور ان کے خاندان عزیزوں اور دوستوں سے اصغر شبیر کی مرگِ ناگہاں پر تعزیت کی جائے ——— !؟

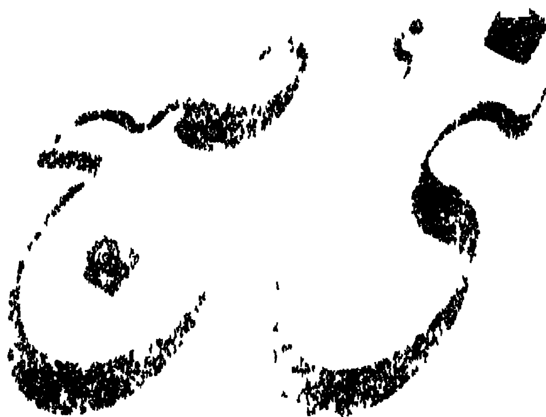
الفاظ میں جان نہیں، قلم میں طاقت ——— میں جب اس وقت کو یاد کرتا ہوں جس وقت شبیر نے اپنی آٹوگراف بک پر مسکرا کر شعر لکھنے کی فرمائش کی تھی میرے ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ قلم گر جاتا ہے۔ آہ کیا وہی شبیر مر گیا جسکے تبسم میں تازہ کلیوں کا سارس تھا جس کے ہونٹوں میں ارجن کی کمان تھی جسکی آنکھیں ہیرے کی طرح روشن تھیں، جس کی بھویں اٹھتی ہوئی جوانی کا پاکیزہ پرچم، تعین، وقار، اور ذہانت کا نشان، جمال اور سعادت کی نمود، انسانیت اور اخلاق کا مجسمہ۔

کون اندازہ کر سکتا ہے اُس ہوک کا ——— جو اسکی ماں کا کلیجہ بٹھائے دیتی ہو گی۔ کون معلوم کر سکتا ہے اس کسک کو جو میاں شبیر احمد کے دل میں رہ رہ کر اُٹھتی ہو گی۔

۱۲ سال کا جوانِ رعنا، خاندانِ ہمایوں کی مجسم بشارت، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، دل کی ٹھنڈک، وہ سراج عظیم جس سے متعلقین کی روحوں کے ایوان اور جھونپڑے سب جگمگا رہے تھے۔ آکسفورڈ کی پہاڑی کی گود میں بہنے والی ندی کی موج! تم نے بنات البحر کیلئے تو جوان ہندوستان کا سب سے بہتر جوان چھین کر ترقی کے سینہ کا ہیرہ توڑ لیا ——— !؟

آہ! وہ گھڑی کتنی منحوس تھی جب مشرق کی روشنی مغرب کی ایک چھوٹی سی ندی میں ایسی ڈوبی کہ پھر نہ اُبھری!؟ ——— ہمدردی ——— دُعائیں ——— جوارِ رحمت ——— صبر ——— تسکین ——— ہر لفظ دُنیا سازی کا پُر فریب پرتو۔ جو دل پہ بیت گئی اُس کا کوئی علاج نہیں، جو ہو گیا وہ دیوانہ بنانے کیلئے بہت زیادہ ہے۔ اصغر شبیر وہ اس تصویر کدۂ آدم کا ایسا شاہکار تھا کہ ظالم موت بھی اُسے دیر تک دیکھا کی ہو گی۔

ساغر



ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

موجودہ جنگ میں بحری بیڑے کا کام

حامد علی صاحب کا یہ مضمون جنگ کے زمانے میں معلومات کے نقطۂ نگاہ سے مفید اور ضروری ہے۔ لیکن آپ کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس مضمون کے سلسلے میں جس برطانوی مصنف (Admiral Sir H. Richmond) کی تصنیف سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے وہ وطنی مفاد کا قدرتی طور پر پاسدار ہوگا۔ کس نے سمندروں میں کیا طوفان بچا رکھا ہے، اسکی گہرائی کو نہ حامد علی صاحب جانتے ہیں نہ میں اور نہ آپ اسلئے کسی عیب و ثواب کے متعلق ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ ایک سچے مقالہ نگار کو ہمیشہ محتاط اور حق پرست ہونا چاہیئے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے میں جانتا ہوں کہ آپ حقائق تک پہونچنے کے عادی ہیں، اور اہلِ دماغ ناظرین کو صرف مضمون کی معلوماتی روح ہی سے زیادہ تعلق ہوتا بھی ہے۔ سو مجھے یقین ہے کہ اس مضمون سے بھی آپ اسی طرح نتیجہ نکالیں گے۔ جس طرح آپ مضامین سے نتیجہ نکالنے کے عادی ہیں۔

ساغر

ہر دور اور زمانے میں مختلف آلاتِ جنگ و جدل حملہ اور بچاؤ کرنے کیلئے کام میں لائے گئے ہیں۔ پہلے پہل یہ بہت سادہ اور معمولی تھے۔ پتھر کے زمانے میں (Stone Age) انسان پتھروں کے تراشے ہوئے ہتھیاروں سے لڑتا تھا۔ زمانے کی ترقی کیساتھ ساتھ یہ بھی بدلے۔ پتھر کے بعد ہتھیار لوہے فولاد، تانبے پیتل وغیرہ کے بنائے جانے لگے۔ بارود کی معلومات اور استعمال کے بعد تیغ و تبر کا زمانہ بیت چکا تھا۔ دست بدست جنگ کا دور ختم ہوا اور پرانے زمانہ کی قلعہ بندیاں حرفِ مہمل ہو کر رہ گئیں۔ سائنس نے ترقی کی۔ آبادی کی زیادتی اور نو آبادیات کی ضرورت نے محاذِ جنگ بدل دیا۔ اہلِ یورپ جغرافیائی معلومات کرنے نکلے۔ نو آبادیات قائم کرنیکے خواہاں تھے۔ تاکہ ان سے اجناس خام حاصل کی جاسکیں۔ خود ساختہ اشیاء وہاں برآمد کی جاسکیں اور ضرورت سے زیادہ آبادی کو بھی وہاں بھیجا جاسکے۔ نو آبادیات قائم کرنے کیلئے بڑی فوج قلعہ بندیاں وغیرہ چنداں نہیں تھیں۔ نو آبادیات کیلئے بحری قوت نہایت ضروری تھی۔ اور جس ملک کو یہ قدرت حاصل تھی اس نے سمندر پر اپنا سکہ جمایا اور نئی دریافت کی ہوئی زمین کے حصّوں پر اپنے ملک و ملت اور فرمانروا کے نام کا پرچم لہرایا۔ تاریخ یورپ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پاپائے روم کے ۱۴۹۳ء کے حکم کے مطابق اسوقت تک معلوم کی ہوئی دنیا کو ہسپانیہ اور پرتگال میں اس طرح تقسیم کیا گیا۔ کہ ہسپانیہ کو نصف شمالی کرۂ ارض دیا گیا۔ اور پرتگال کو نصف جنوبی۔

جب تک تمام یورپ پر پاپائے روم کا اقتدار قائم رہا۔ دوسری حکومتوں کے لئے یہ نئی دنیا ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ مگر جب تجدید مسیحیت (Reformation) نے پاپائے روم کے اثر پر ضرب کاری لگائی تو یورپ کی (Protestant) حکومتیں پاپائے روم کے ۱۴۹۳ء والے فرمان کی حکم کھلا نافرمانی کرنے لگیں۔ اور ہسپانیہ اور پرتگال سے برسرِ پیکار ہونے لگیں۔ ہالینڈ والوں نے اقتدار حاصل کرکے روئے زمین پر اپنی نو آبادیات قائم کیں۔ فرانس اور انگلستان بھی بعد میں نو آبادیات کی اس تگ و دو میں شریک ہوئے۔ ۱۵۸۸ء میں ہسپانوی بحری بیڑے (Spanish Armada) کی شکست کے بعد انگلستان کا اقتدار بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے ہالینڈ اور بعد میں فرانس سے جھڑپ ہوئی۔ مگر سب کو منہ کی کھانی پڑی۔ انگلستان کی قوت کا انحصار بھی بحری قوت پر ہے۔ (Napoleon) نپولین جیسے فاتح اعظم کو بھی اسی وجہ سے شکست کھانی پڑی کہ اس کی بحری طاقت انگلستان والوں

ؔ اس مضمون کی تیاری میں (Admiral Sir H. Richmond) کی تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ماہنامہ ایشیا

کی نسبت بہت کم تھی۔ گذشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ اور اس کے شرکا رجنگ کی فتح کا سبب بھی یہی تھا۔ کہ انگلستان سمندروں کی ملکہ تھی۔ اور اب بھی ہے۔ جرمنی کی بحری طاقت ابھی ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی۔ جنگ Jutland نے ثابت کر دیا تھا کہ جرمنی انگلستان کے جنگی بیڑے کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ جب جرمنی کو سمندر سے بھگا دیا گیا اور اس کی بحری آمد و رفت کو بالکل ختم کر دیا اور اس طریقہ پر کامیاب ناکہ بندی کر دی گئی۔ تو جرمنی اس کی تاب نہ لا کر ہار گیا۔ گذشتہ جنگ عظیم سے اب تک بحری طاقت میں جو تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں اور بحری بیڑے موجودہ جنگ میں کیا کیا فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ ہمیں یہ ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

موجودہ بحری جنگ کے مسئلے کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے جنگ کے فوری اور دفاعی مقاصد دوسرے وہ ذریعے اور وسیلے جن کی بدولت ان مقاصد کو حاصل کرنا ہے۔ تیسرے وہ فرائض اور پابندیاں جو بین الاقوامی معاہدوں کی وجہ سے ان ذرائع اور وسائل کو عمل میں لانے پر عائد ہوتی ہیں۔

جنگ میں بحری قوت کا مقصد وحید بحری قبضہ حاصل کرنا ہے۔ بحری قبضہ کے معنی سمندر کو تجارت اور فوج کی نقل و حرکت کیلئے بالکل محفوظ بنانا اور دشمن کو اس کے استعمال سے محروم کر دینا ہے۔ بحری قبضہ حاصل کرنے کیلئے بحری طاقت کے تمام عناصر کا اپنے اپنے فرائض کو انجام دینا نہایت ضروری ہے۔ بحری بیڑے کے جہاز جو حملہ کرنے یا مدافعت کے کام میں لائے جا سکتے ہیں ان کا یکجا ہو کر مخصوص علاقوں میں پہرہ دینا۔ پہرہ دیتے وقت اس امر کا خیال رکھنا کہ جو مقام بیڑے نے پہرہ دینے کیلئے مقرر کیا ہے ہر طرح سے ان کے لئے محفوظ اور دشمن کے تباہ کرنے کیلئے نہایت کارگر ثابت ہو۔ اس سلسلے میں ایک ایسا تجارتی بیڑہ نہایت ضروری ہے جو ملک کی تمام ضروریات کو کماحقہ پورا کرنے کے علاوہ اس فوج کی جو جنگ کے مختلف محاذوں پر لڑ رہی ہے۔ ضروریات کا بھی خیال رکھ سکے۔

اس قسم کے تجارتی بیڑے کیلئے ایک ایسی عظیم الشان فیکٹری کی ضرورت ہے جو تباہ شدہ جہازوں کی جگہ نہایت سرعت کے ساتھ نئے جہاز بنا سکے اور جہازوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت بھی ایک معین وقت میں جلدی سے کر سکے۔

بحری بیڑا دو کام انجام دے سکتا ہے۔ ایک تنہا اور دوسرا فوج کے ساتھ ملکر۔ تنہا یہ صرف دشمن کی بحری رسد کا سلسلہ منقطع کر سکتا ہے۔ اور سمندر پر اس کی نقل و حرکت بند کر سکتا ہے۔ چنانچہ برطانیہ نے بحیرۂ شمالی میں سرنگوں اور گشتی جہازوں کو تعینات کر کے سمندر کو جرمنی کیلئے تنگ کر دیا ہے۔ بری فوج کے ساتھ ملکر یہ دشمن کے ممالک پر حملہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ جرمنی کے ناروے پر حملہ کے بعد کے واقعات اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ فریقین نے اپنی اپنی بحری قوت سے کس حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔ دشمن کی بحری تجارت اور سلسلہ نقل و حمل کو منقطع کرنے کے لئے دو طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ پہلا ناکہ بندی (Blockade) اور دوسرا جنگی مال و متاع (ممنوعات جنگ Contra band goods) پر قبضہ کرنا خواہ یہ مال غیر جانبدار ممالک کے جہازوں ہی میں کیوں نہ اپنی منزل مقصود تک جا رہے ہوں۔ یہ دو طریقے عام تھے۔ مگر جب دشمن کی سرگرمیاں حد سے تجاوز کر گئیں اور اس کی بربریت کی کوئی انتہا نہ رہی تو برطانیۂ عظمیٰ نے ۲۷ نومبر ۱۹۳۹ء کو (Order in Council) کے ذریعہ جرمنی کی ان وحشیانہ حرکات کے بدلے میں جو جرمنی آبدوز کشتیوں نے ۱۹۳۶ء کے بحری معاہدے (Submarine Convention) کو ٹھکرا کر اور ۱۹۰۷ء کے معاہدہ ہیگ (Hague Treaty) کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سرانجام دیں۔ بجائیں تو یہ انتقامی اقدام کیا کہ دشمن کے مال کی برآمد فوراً بند کر دی۔ یہ حق دنیا میں ہر زمانہ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ دشمن کا مال و متاع ہاتھ لگنے پر اپنا ہوتا ہے۔ اور ہر ملک نے اس رسم کو نیک کہتے ہوئے دشمن کے مال پر قبضہ کیا ہے۔ برطانیۂ عظمیٰ نے جنگی بیڑے سے دو کام لئے ہیں۔ اول اس کا جنگی بیڑہ دشمن کی افواج کو اتحادیوں کے ملک یا سلطنت کے کسی حصہ پر نہ اترنے دے۔ دوسرے ان کی تجارت کے راستے بند نہ ہونے دے۔ ان پر کاربند ہونے کے اصول ہمیشہ سے ایک رہے ہیں۔ مگر طریقے وقت کی ضروریات اور سائنس کی نئی معلومات و ایجادات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ دخانی جہازوں کے استعمال سے ان کے علاوہ فائدے ہیں جو بالکل ظاہر ہیں۔ چند پابندیاں بھی عائد ہو گئی ہیں۔

دخانی جہازوں کے استعمال سے پیشتر صرف ہوا ہی جہازوں کیلئے ایندھن کا کام دیتی تھی۔ اور جہاز ہوا کی مخالفت اور موافقت کے

رحم وکرم پر ہوتا تھا۔ دخانی جہاز کیلئے کوئلہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک کوئلہ نہ ہو۔ جہاز نہیں چل سکتا۔ اسلئے جہاز کی سمندر میں رہنے کی اہلیت کوئلہ کی مقدار پر مبنی ہے۔ آبدوز کشتیوں اور سرنگوں نے بحری بیڑے کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ساحل کے قریب حفاظت سے رہے جہاں اسکو کوئلہ وغیرہ افراط سے مل سکے۔ مگر ہر وقت حرکت میں آنے کیلئے مستعد رہے۔ اور اپنی گشتی جہازوں کی مدد سے دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رہے۔ آبدوز کشتیوں کے حملے سے ساحل اور بندرگاہوں کو "چوب روک" بند سطح سے نیچے سرنگوں کا جال بچھا کر توپیں لگا کر محفوظ کرتے ہیں ہوائی جہازوں کے جنگی مقاصد کیلئے استعمال نے ایک نئی الجھن پیدا کر دی ہے۔ اور مندرجہ بالا مدافعتی اقدام ہوائی حملوں کے خلاف بیکار ہو گئے اس لئے دوسری تدابیر پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ فضائی حملہ کے خلاف غباروں (Balloon Barrage) جنگی ہوائی جہازوں کا دشمن کے ہوائی جہازوں سے مقابلے کیلئے ہر وقت مستعد رہنا۔ اور طیارہ شکن توپوں کا استعمال عمل میں لانا ہے۔ مقناطیسی سرنگوں کا استعمال اب اتنا خطرناک نہیں رہا جتنا جنگ کے شروع میں معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی وثوق کیساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بہتی ہوئی سرنگیں جن کے بچھانے کے ۲۴ گھنٹے بعد پتہ چلانا مشکل ہے کیونکہ وہ سمندر کی لہروں کیساتھ بہتی رہتی ہیں۔ برطانیہ کیلئے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں گی۔ یا پورس کے ہاتھیوں کی طرح جرمنی ہی کے جہازوں کو غرق کریں گی۔

جنگ و جدل میں بحری تجارت پر پوری طرح قبضہ قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ آج کل تین طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ بحری گشت بحری قافلہ (Convoy) اور دشمن کو ان ذرائع سے محروم کرنا جن سے وہ اپنی رسد اور خوردنی اشیاء حاصل کرتا ہے۔

بحری گشت کے معنی ان علاقوں میں جہاں دشمن کے بار بار حملوں کا امکان ہو جنگی جہاز یا طیاروں کا قیام کرنا ہے۔ اس بحری گشت نے مقابل بندرگاہوں اور تنگ آبنائے وغیرہ میں تمام گذشتہ جنگوں میں تجارت پر حملہ کرنے والے جہازوں نے وہ خواہ بڑے مسلح تجارتی جہاز ہوں خواہ آبدوز کشتیاں دشمن کی تجارت کو تباہ کرنے کی سخت کوشش کی ہے۔ ایسے تجارتی جہازوں کی حفاظت کیلئے ایسے جنگی قسم کے جہازوں کا پہرا دینا جو دشمن کے حملہ آور جہازوں کی زندگی تلخ کر دیں عام طور پر مروج ہے۔ اور آج کل آبدوز کشتیاں اور ہوائی جہاز حملہ کرنے اور مدافعت کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ گذشتہ جنگ اور موجودہ جنگ کا تجربہ بتاتا ہے کہ بہترے ہوائی جہاز اگر ان کو آبدوز کشتی نظر آجائے تو اس کے غرق کرنے میں بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں

بحری قافلہ کا مقصد تجارت کی حفاظت ہے۔ تجارتی جہاز جنگی جہازوں اور طیاروں کی نگرانی میں اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ جنگی جہاز تجارتی جہازوں کے آگے پیچھے ٹیڑھی ترچھی لائن میں چلتے رہتے ہیں۔ تاکہ ضرورت کے وقت ہر جہاز کی مدد کو پہونچ سکیں۔

ہوائی جہاز اوپر سے آبدوز کشتیوں کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں جیسے ہی ایک دفعہ آبدوز دکھائی دے جاتی ہے۔ تو ہوائی جہاز اُسے اپنی نظر سے اوجھل ہونے نہیں دیتے۔ اور "سمندری گولوں" کی مدد سے غرق کر دیتے ہیں۔ قافلے کے جہازوں کا رنگ بالکل وہی ہوتا ہے۔ جو آفتاب کی کرنیں پڑنے کے بعد سمندر کے پانی کا ہوتا ہے۔ بحری قافلہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ تجارتی جہاز اپنے تمام سفر میں حفاظت سے جاتے ہیں۔ لیکن "ہر جا گل است خار است" بحری قافلہ کے کچھ نقائص بھی ہیں۔ تجارت کے لین دین میں بہت دیر لگتی ہے۔ اور زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایک ایسے قافلے کی جو پوری طرح مسلح نہ ہو دشمن کے اپنے سے زیادہ طاقتور بیڑے سے مٹ بھیڑ ہو جائے تو ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

انگلستان اور فرانس جرمنی کے خلاف، قانون پسند ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے معاہدہ واشنگٹن (Treaty of Washington 1922) اور معاہدہ لوزین (Treaty of Lausanne 1930) کی پابندیوں کا خیال رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ عظمیٰ اپنے آپ دشمن کی بعض بحری رکاوٹ کا جواب دینے کے ناقابل ہو گیا۔ کیونکہ وہ معاہدہ کے ماتحت کافی تعداد میں ایسے تیز رفتار (Cruisers) نہیں بنا سکا۔ جو دشمن کے مسلح (Cruisers) کا جواب دے سکیں۔ معاہدہ واشنگٹن کا منظور شدہ دس ہزار ٹن کا جہاز جس میں ۸ لمبی نال والی توپ رکھنے کی اجازت تھی۔ ۱۱ نال والے مسلح جہاز (Deutschland) کے مقابلے میں ناکارہ ثابت ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ... بحری ... کیا ہے

جہازوں کی رسد کو بند کرتا ہے۔ ایسے جہاز سامان رسد اپنے ملک یا اپنی نوآبادیات،
غیر جانب دار ممالک یا دشمن کے اُن جہازوں سے جن کو وہ نشانہ بناتے ہیں
حاصل کرتے ہیں۔ جرمنی کو اپنی نوآبادیات کی ضرورت کسی اقتصادی بنا پر
نہیں بلکہ جنگ کے موقع پر سامان رسد حاصل کرنے کیلئے نہایت ضروری ہے۔
کیونکہ گذشتہ جنگ میں جرمنی یہ سامان اپنی نوآبادیات سے حاصل کرسکتا
تھا۔ مگر اس جنگ میں صرف وہ جہاز جو جرمنی کے قریب ہیں وہ تو جرمنی سے سامان
حاصل کرسکتے ہیں۔ جو دور ہیں وہ غیر جانبدار ممالک سے حاصل کرسکتے ہیں۔ جرمنی
اپنے جہازوں میں سامانِ رسد ان جہازوں اور آبدوز کشتیوں کو بھیجتا ہے
جو دور دراز کے سمندروں میں گشت لگا رہے ہوں۔ شمالی سمندر میں اتحادیوں
کی ناکہ بندی کرنے والے بیڑے کا کام ایسے جہازوں کو پکڑنا ہے۔ لیکن بعض جہاز
جو پیچدار اور بعید الفہم راستہ اختیار کرتے ہیں وہ بچ کر نکل آتے ہیں۔ کیونکہ
ناکہ بندی کے راستے ناقابل عبور نہیں دوسرا طریقہ غیر جانب دار ملکوں سے سامان
رسد حاصل کرنا ہے۔

گذشتہ جنگ میں "ایمڈن" (Emden) اور دوسرے
جرمنی جہازوں نے اپنا سامانِ جنگ و رسد غیر جانب دار ملکوں کی بندرگاہوں
سے حاصل کیا تھا۔ اور آج کل بھی ان جرمنی جہازوں نے جو جنوبی سمندروں میں
پناہ گزیں ہیں۔ غیر جانب دار ملکوں سے اپنا سامانِ رسد حاصل کر رہے ہیں۔
بین الاقوامی قوانین کے ماتحت یہ بالکل درست ہے کہ غیر جانبدار ملک ان جہازوں
کو جو تجارتی ہوں پناہ دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ بین الاقوامی قانون کے منافی
ہے کہ غیر جانب دار ممالک کی بندرگاہیں۔ لڑنے والی حکومتوں کے مقامات
جنگ بن جائیں۔ چنانچہ ان غیر جانبدار ملکوں کو یہ لازم ہے کہ وہ ممکن طور پر
مسلح جہازوں یا ان جہازوں کو جو مسلح جہازوں تک سامانِ رسد لے جائیں
اپنی بندرگاہ میں نہ گھسنے دیں۔ اور ان کو کسی قسم کا سامانِ رسد ہرگز نہ دیں۔ انکی
کسی طرح بھی مدد نہ کریں۔ سامانِ رسد لیجانے کے متعلق "معاہدہ ہیگ"
کی تیرھویں دفعہ کے ۱۸ - آرٹیکل کی رو سے غیر جانب دار لڑنے والی حکومتوں کو
جنگی جہازوں کو سامانِ رسد دینے یا ان کو اپنے اسلحہ جات کے بڑھانے کی مخالفت
کرتا ہے۔ خواہ یہ رسد ساحل سے آئے خواہ سامان لیجانے والے جہازوں
کے ذریعہ سے۔

اگر لڑنے والے ملک کا بیڑا غیر جانبدار ممالک کی سمندری حد کے باہر
گشت لگا رہا ہو تو اس غیر جانبدار ملک پر واجب ہے کہ وہ اپنے ملک کے جہازوں
کو روکے کہ وہ اس بیڑے تک کوئلہ، اسلحہ جات گولے بارود اور سامان خوراک
وغیرہ نہ لیجائیں۔ ورنہ وہ لڑنے والے ملکوں کے جنگی بیڑے کو بحری جنگ کیلئے
اپنے ذرائع استعمال کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔

مندرجۂ بالا تین طریقوں کے علاوہ ایک اور طریقہ بھی ہے۔ جو
نہایت کارگر اور عام ہے۔ یعنی تجارتی جہازوں کو مسلح کرنا۔ یہ رسم بہت
دیرینہ اور سہل العمل ہے۔ اور اس پر کسی ملک اور قوم کو کوئی اعتراض نہیں
ہو سکتا۔

بسا اوقات جرمنی بغیر اطلاع دئے ہوئے تجارتی جہاز ڈبو دیتا ہے۔
اس کی وجہ جرمنی یہ بیان کرتا ہے۔ کہ جرمنی آبدوز کشتیاں اس قدر کمزور ہیں کہ
وہ اپنے آپ کو سمندر کی سطح پر ظاہر کرنے کا خطرہ برداشت نہیں کرسکتیں۔
کیونکہ ایک دفعہ سطح پر آنے کے بعد آبدوز کشتی کو آسانی سے قابو میں لا یا
جاسکتا ہے۔ ۱۹۳۶ء کے "معاہدۂ بحری" نے غرق کرنے والی آبدوز کشتی
کیلئے سطحی بحری جہاز والی شرائط منظور کیں۔ جہازوں کے ڈبونے
کی اجازت تو دیدی مگر اس کے ساتھ یہ شرط لگادی کہ مسافر اور ملاحوں
کو جہاز غرق کرنے سے پہلے امن و حفاظت کی جگہ چھوڑ دیا جائے اور صاف
طور سے یہ واضح کر دیا کہ ایک کھلی ہوئی کشتی طوفانی سمندر میں یا ساحل سے
بہت دور امن و امان کی جگہ قرار نہیں دی جاسکتی۔ باوجود ان معاہدوں
کے موجودہ جنگ میں بہت سے انگریزی اور دوسرے ملکوں کے جہازوں کو
بغیر کسی اطلاع کے ساحل سے بہت دور اور طوفانی سمندر میں غرق کر دیا۔
(Arlington Court) کا ڈبویا جانا بہت سی مثالوں میں سے
ایک ہے۔ جو بہت خراب موسمی حالات میں ساحل سے ۹۰ میل دور بغیر
کسی اطلاع کے سمندر کی تہ میں پہونچا دیا گیا۔ جہاز کے ملاحوں نے چار دن
کھلی کشتی میں پہاڑی اور طوفانی سمندروں میں گذارے۔ کڑکڑاتا ہوا
جاڑا پڑ رہا تھا۔ بہت سے ملاح پالے کی وجہ سے مرگئے اور بہت سوں کا پتہ
ابھی تک نہیں چلا۔ جرمنی نے گزشتہ جنگ میں بربریت کا انتہائی ثبوت
ہسپتالی جہازوں (Hospital Ships) کو ڈبونے سے دیا تھا۔
دنیا کی ہر متمدن قوم ہسپتالی جہازوں کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ لیکن
جرمنی نے باوجود اس کے کہ وہ جہاز بالکل نمایاں نظر آتے تھے۔ ۱۴ جہاز

غرق کردیے تھے۔ اور اپنی طرف سے یہ صفائی پیش کی۔ کہ جہاز معاہدۂ ہیگ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فوجی خدمات انجام دے رہے تھے۔

گزشتہ جنگ میں بحری سرنگیں پہلی مرتبہ استعمال میں آئیں۔ ۱۹۰۷ء میں ہیگ کانفرنس میں یہ کوشش کی گئی تھی۔ کہ سرنگیں اس طرح بچھائی جائیں کہ غیر جانبدار ممالک کی تجارت پر اس کا اثر نہ پڑے۔ اس کانفرنس میں برطانیہ کے نمائندے نے یہ کوشش کی تھی کہ (Unanchored contact Mines) اور ایسی سرنگیں جب وہ اپنے (Mooring) سے علیحدہ ہو جانے پر بھی ضرر رساں رہیں۔ استعمال نہ کی جائیں۔ لیکن یہ تجویز جرمنی کے نمائندے کی کوشش کی وجہ سے منظور نہ ہو سکی منظور شدہ معاہدہ کی دو آرٹیکل یہ ہیں۔

پہلا (Automatic Contact mine) کو دشمن کے ساحل اور بندرگاہ کے قریب صرف اس کی تجارت کو نقصان پہنچانے اور بند کرنے کی غرض سے نہ بچھایا جائے۔" دوسرا جب (Anchored mines) استعمال کی جائیں تو ہر ممکن طریقے سے یہ اطمینان کر لیا جائے کہ اس سے غیر جانبدار ممالک کی تجارت کو نقصان نہیں پہنچے گا۔" اور دستخط کنندگان نے اس بات کو بھی منظور کیا تھا۔ کہ ہر ممکن کوشش اس امر کی جائے کہ یہ سرنگیں ایک مقررہ وقت کے اندر بیکار ہو جائیں۔ اور موقع ملتے پر یہ مالکانِ جہاز کو بذریعہ نوٹس مطلع کریں کہ فلاں فلاں علاقے خطرناک ہیں۔

چنانچہ گذشتہ جنگ میں برطانیہ نے غیر جانبداروں کو تمام اطلاعات بہم پہنچائیں۔ اور ان راستوں کے نقشے بھی فراہم کئے جن پر بلا خوف و خطر سفر کر سکتے تھے۔ لیکن جرمنی نے اس قسم کی کوئی اطلاع غیر جانبداروں کو نہیں دی اور اس جنگ میں بہت سے غیر جانبداروں کے جہاز ڈبو دیئے۔

سرنگوں کو بیکار کرنے کیلئے مختلف طریقے عمل میں لائے گئے ہیں سرنگیں ہٹانے والے جہاز بڑی تعداد میں سرنگیں ہٹانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ چھوٹے بحری اور ہوائی جہازوں کے دشمن کی سرنگیں بچھانے والے جہازوں کو تباہ کرنے کیلئے گشت پر مقرر کرنا۔ یہ طریقے چھوٹے سمندروں میں سرنگیں دور کرنے اور (Moored mines) کے لئے کارگر ہیں جن کے (Mooring) جہازوں میں الجھ سکتے ہیں اور یہ عمل مقناطیسی سرنگوں کیلئے جو سمندر کی تہ میں پڑی رہتی ہیں کارگر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب اس کا بھی توڑ دریافت کر لیا گیا ہے۔ بہتی ہوئی سرنگیں جو معاہدہ ہیگ کی دفعہ کے خلاف ہے مشکل سے قابو میں آتی ہیں۔ یہ سمندر میں ہر جگہ بچھائی جا سکتی ہیں۔ رات کو بالکل نہیں دکھائی دیتیں اور دن کو بھی مشکل سے نظر آتی ہیں۔ سمندر کی لہروں کیساتھ بہتی رہتی ہیں۔

بچھانے کے ۲۴ گھنٹے بعد ان کا پتہ لگانا ناممکن ہے ابھی تک وثوق کیساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سرنگیں بچھانے کے ایک معین وقت کے اندر بیکار ہو جاتی ہیں یا نہیں۔

جرمنی نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ ماہی گیر جہازوں کا ڈبونا اور ان کے ملاحوں کو جب ان کا جہاز ڈوب رہا ہو گولیوں کا نشانہ بنانا۔ ان مرنے والوں کو یہ بتانا کہ وہ برطانوی جنگی بیڑے کے امدادی حصے پر فتح حاصل کر رہے ہیں۔ یہ محض ایک دھوکا ہے کیونکہ کسی کو یہ شبہ تک بھی نہیں ہو سکتا کہ جہاز مچھلی پکڑنے کے علاوہ سرنگیں ہٹا رہے ہیں۔ اگر جرمنی مچھلی پکڑنے والے تمام بیڑے کو شمالی سمندر سے ہٹا دے تب بھی جرمنی کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا برطانیہ کے صرف تھوڑے سے تجربے کار ملاح کام میں آئیں گے۔ مگر ملاحوں کے فرقے کا جذبۂ انتقام جرمنی کے خلاف بھڑک اٹھے گا اور وہ برطانیہ کیلئے ہر قربانی اور ایثار کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیں گے۔

آئندہ کسی اور مضمون میں بحری بیڑے کے مختلف عناصر جہازوں آبدوز کشتیوں اور سرنگوں کی قسمیں ان کی مشینری اور عمل کے متعلق کچھ بتایا جائے گا۔

ایم حامد علی

ایم۔ اے

"سترہویں صدی کا ایک گجراتی طنز گو شاعر"

یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے باطنی شعرا کی طرح، ہندوستان میں بھی میرابائی، کبیر، چیتنیہ، تکارام اور دیگر "بھگتی" شعراء تھے۔ مذہبی خیالات و رجحانات صدیوں سے ہندوستانی ادب پر چھائے رہے۔ پندرہویں صدی کا گجراتی شاعر نرسنہا مہتا جس کے مذہبی گیتوں اور بھجنوں کی عظمت کا تمام ہندوستان اعتراف کرتا ہے۔ یہ مہاتما گاندھی اور اس کی آشرم بھجن والی، کی کد و کاوش کا نتیجہ ہے۔ سترہویں صدی کے ابتدائی دور کا سب سے اولوالعزم شاعر بھٹ پرمانند مانا جاتا ہے۔

اس دور کی شاعری دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت کے مذہبی اداروں کے خلاف ایک شاعر بھی صدائے احتجاج بلند کرنے والا نہیں تھا۔ برخلاف اس کے انگلستان میں اسکی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ جب مذہب کا ادب پر کافی دخل ہو گیا تو چاسر اور لانگ لینڈ جیسی انقلاب پسند ہستیوں سے نہ رہا گیا۔ چنانچہ چاسر نے "کینٹربری کی کہانیوں کے افتتاحیہ میں" اور لانگ لینڈ نے (Long land) اپنی بھوریت لینڈ سنبانی شاعری میں اس کا اظہار کیا۔ نرسنہا مہتا کی شاعری میں کسی قدر "اچھوت ادھار" کی روح پائی جاتی ہے۔ "ایک مقتدر آدمی کا جنازہ" یہ ظاہر کرتا ہے کہ مہتا کے طنز نگار قلم میں بھی وہ زور اور اثر تھا جس کے لئے سوئفٹ (Swift) انگلستان میں حیاتِ ابدی پا چکا ہے اور اسی لئے نرسنہا مہتا کے اندازِ طنز کو (Swiftean Irony) کہا جاتا ہے۔ پرمانند کی نرسنہا مہتا کی طنزیات زندگی کی شیئت پسندانہ تصویروں اور اس کا معتقد دنیا کے رسومات سے ناگزیر تصادم کی لطیف جھلکیوں سے رنگا ہوا ہے۔ اور پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ:

سخت نکیلے کانٹوں کا ایک گچھا نگل گیا ہوں میں

لیکن زمانہ کی بے راہ روی اور رسمی شاعری کے خلاف باغیانہ آواز بلند کرنے والوں میں اکھا کا کوئی دوسرا ثانی نہیں —— وہ اس رنگ میں سترہویں صدی کا واحد شاعر ہے۔ جو نکتہ رس لوگوں کی نظروں میں دقیق فلسفیانہ نظموں (آکھا گیتا) کا مصنف ہونے کی حیثیت سے گھر کئے ہوئے ہے اور دنیا اسکو ایک بیباک طنز گو اور "آکھا کے تازیانے" کا مصنف خیال کر کے قدر و منزلت کرتی ہے۔ آکھا، میرابائی اور نرسنہا مہتا کے برخلاف ایک تلمیع تھا اور اُسے مذہبی موضوعات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی تمام زندگی اُس "گیان" حاصل کرنے میں صرف ہوئی جس کا ویدوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اُس کی بیشتر شاعری ویدانتی بحر میں لکھی گئی ہے۔

مذہبی اداروں، خانقاہوں، مہنتوں اور سادھوؤں کی آکھا کی نظروں میں کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور ان سے انتہائی روکھا پن برتتا تھا۔ اسلئے اپنی نفرت کا اظہار قطعی غیر مبہم پیرایہ میں کیا ہے اسکی طنزیات اسکی کھلی ہوئی شہادت ہیں۔

"گوکل ناتھ کو اپنا گرو، بنا کر مجھے احساس ہے کہ میں ایک
پرانے بچار کا حلقہ بگوش ہو گیا کہ جس نے ایک شخص سے
اس کی دولت چھین لی لیکن مذہب کو ہاتھ نہیں لگایا
کیا بھلائی کر سکتا ہے، ایسا گرو۔"؟

اس کے ردِ عمل کیلئے وہ وشنو اس کا پجاری، ایک بہت بڑے رئیس موروثی سجادہ نشین، سے ملا۔ وہ عبادت کی غرض سے گیا تھا۔ لیکن وہاں کا برتاؤ دیکھ کر اُسے سخت صدمہ ہوا۔ اور واپس آ کر اس نے وہاں کی تہذیب کا مضحکہ اڑانا شروع کیا۔

"پجاری نے میری طرف دیکھا، لیکن کوئی پرواہ نہ کی۔
اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا اور آکھا کو پہچان لیا۔ لیکن
چونکہ آکھا اب وہ موٹی اسامی نہ تھا جو پہلے تھا اسلئے
وہ وہاں سے نکالدیا گیا جہاں پہلے اُسے خوش آمدید کہا
گیا تھا اور دعوت دی گئی تھی یہاں تک کہ دربان نے

اُس سے صاف کہہ دیا " آنکھا تو ایک رئیس سیٹھ تھا۔ تم وہ
کیسے ہو سکتے ہو؟"
بیشتر شہروں میں، جہاں وہ گیان حاصل کرنے کی غرض سے گیا، اُسے
بے حقیقت، خود نما اور جاہل سادھوؤں اور سنیاسیوں سے دوچار ہونا پڑا
جو " دولت کے اندھے اور عورت کے بھوکے تھے"۔ بیشتر ایسے تھے جو اپنے آپ
کو گرو کہلواتے تھے۔ لیکن پھر بھی لاعلمی اور نکبت کی گہرائیوں میں پڑے غوطے
کھا رہے تھے۔

" وہ اپنے آپ کو گرو سمجھتا ہے،
لیکن ایک شخص اپنی گردن میں ایک بھاری پتھر باندھ کر
کیسے تیر سکتا ہے؟
اور ایسا گرو، دوسروں کو کس طرح بچا سکتا ہے!"

اُس کے خیال میں مذہبی رسومات، فرقہ پرستی اور مذہبی ادارے
" گیان" حاصل کرنے میں معاون و مدد ہونے کے برخلاف مزاحم کار ثابت ہوتے
ہیں۔ یہ اُس کے نزدیک آہنی بیڑیاں ہیں جو انسان کے پاؤں " گیان" اور
" بھگتی" کی طرف اُٹھنے سے روکتی ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ گیان حاصل کرے
لیکن یہ بڑھ کر اُس کا پیر پکڑ لیتی ہیں اور بہت جلد اُسے گمراہ کر کے تاریکی اور
ادبار کی خوفناک پستیوں میں ڈال دیتی ہیں۔

" کسی زمانہ میں ایک بیوقوف ہر پتھر کو خدا سمجھ کر سجدہ
کرتا تھا۔ اس کے کان کتھا سنتے سنتے بہرے ہو گئے،
لیکن پھر بھی اُسے گیان کا عارفانہ نور نہ مل سکا!"

اُس کا عقیدہ تھا کہ جھوٹے خداؤں اور فرضی دیوتاؤں کو سجدہ کرنے
اور پوجنے سے نجات نہیں ملتی۔ اگر انسان کو واقعی خدا کی تلاش اور " گیان"
کی خواہش ہے تو خدا کو پہچاننے سے پہلے اُسے اپنی عظمتوں سے آگاہ ہونا چاہئے۔
اپنی خودی کو بلند کرنا چاہئے۔ اپنی ہستی کو سمجھنا چاہئے یہاں آنکھا اقبال کے فلسفہ
" خودی" کا ہم نوا نظر آتا ہے۔

" صد ہا برس گذر گئے، تلک لگاتے ہوئے، تسبیح گھس کے
خستہ حال ہو گئی۔ پیر یاتراؤں کو جاتے جاتے تھک گئے،
لیکن ایشور پھر بھی قریب نہیں!

اُس کی شاعری اُس کے ذاتی احساسات اور واردات کا عکس ہے

۲ دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شاعر اپنی شاعری کے موضوعات عوام کی زندگی سے حاصل کر کے عوام ہی کو اس کا

" تلاش حق " کی مسلسل کاہش و کاوش نے اُسے زندگی کی تلخ کامیوں سے روشناس
کرایا اور یہی وجہ ہے کہ وہ طنز گوئی کی طرف مائل ہوا۔ پیدائش اور پیشہ کے
لحاظ سے ایک سنار ہوتے ہوئے وہ دنیا کے مکر و فریب کا مقابلہ نہ کر سکا اور کمسنی
ہی میں سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گیا۔ بہن کی موت کا زخم ہنوز بدستور
تھا۔ لہذا سادھو اور رشی لوگوں کی آغوش میں پناہ گزیں ہوا جن میں سے
بیشتر بے حقیقت، لاف زن، جاہل، بدکار، حریص اور طامع ثابت ہوئے۔
اس طرح کے مسلسل تجربوں نے اُسے اس جھوٹی دنیا سے اٹھا کر حقیقت اور سچائی
کی دنیا میں لا کھڑا کیا اور بہت جلد وہ اس جھوٹی دنیا کی زبوں حالی اور مکاری کو
حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

ایک عورت نے جس کو وہ اپنی بہن سے بھی زیادہ سمجھتا تھا، اس پر
جھوٹ اور لاف و گذاف کا شبہ ظاہر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسی وجہ سے
جیل کی ہمت شکن تکلیفوں سے روشناس ہوا۔ اور یہی وہ آخری مصیبت
تھی جس نے اُسے طنز گوئی پر مجبور کر دیا۔ اب اُس کے دل سے شعلے اٹھتے تھے
جو سماج اور سوسائٹی کو فنا کر دینا چاہتے تھے۔ لفظوں سے آگ برستی تھی
جو عیاشی، دغا، فریب، بدکاری اور مکاری کے تار و پود کو جلا کر شاد دینے
کی طاقت رکھتے تھے۔ اُس نے اپنے آتشیں راگوں میں، سینے دل کی گرمی بھر دی اور
اپنی آتش نوائی سے سینکڑوں کی آنکھیں کھول دیں۔ - - - - انہیں
بیدھا راستہ دکھا کر انسان بنا دیا۔

آنکھا کی طنزیہ شاعری [illegible]
پُر زور اور سادہ ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کا [illegible]
احساسات اور زندگی کے انقلابات [illegible] کو وہ [illegible] پر چلے
خاص شاعرانہ انداز میں عوام تک پہونچاتا ہے۔ عوام کو [illegible] طلبات سے
آگاہ کر دینا ——— بس یہی اس کا مسلک ہے [illegible] کی شاعری۔
لیکن پھر بھی کہیں کہیں اس کے کلام میں پراگندگی کا اغلاق اور ابہام آجاتا
ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری میں وہ ان دقیق مسائل کو [illegible] چاہتا ہے
جن میں خود بالیدگی اور پختگی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس کی طنزیات
کی مقبولیت سے اُس کی حقیقی شاعری اور فنی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ
وجہ ہے کہ اُس کے اکثر شعر زبان زد خاص و عام ہی نہیں بلکہ دیہاتیوں
کے لبوں پر بھی نغمۂ الہام بنکر مسکراتے ہیں۔ اور اس مقبولیت اور شہرت کو م

سبق دے تو ضرور دنیا اسکی طرف کھنچ آئیگی۔ اُسکے حیات افروز نغمہ پر لبیک کہے گی اور اُسکے رفعت آشنا قدموں کیساتھ بام ترقی کی طرف مائل پرواز ہوگی۔ ا۔ ح پروانہ بریلوی

رُوس کا نظامِ تعلیم

(انقلاب کے بعد)

جنگِ عظیم یا جنگِ شہنشاہیت ، جیسا کہ روس کے متحدہ عوامی حکومت میں موسوم ہے ، نے روس کی معاشرتی زندگی اور اقتصادی حالت میں سخت انتشار پیدا کر دیا ۔ انقلاب اول سے بہت پہلے بیچارے ننگے اور بھوکے کسان اپنی قسمت کی سزا بھگت رہے تھے ۔ انقلاب خانہ جنگی کی شکل میں تمام ملک میں رونما ہوا اور رفتہ رفتہ اس قحط سالی کی وجہ سے جس نے ۱۹۲۱-۲۲ء کو گھیر لیا تھا خود بخود ختم ہو گیا ۔ انقلاب کے چار یا پانچ سال بعد تک انقلابیوں میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنی ملکی ، تعلیمی اور سیاسی حالت کو سدھار سکیں ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انھوں نے ان مسائل کی طرف خصوصاً تعلیم کی طرف توجہ ہی نہ دی سب سے پہلا کام جو انھوں نے برسرِ اقتدار ہوتے ہی کیا وہ یہ تھا کہ تعلیم سارے ملک میں مفت دی جانے لگی ۔ ذات ، پات یا اسی قسم کی دوسری فضولیات کا اس سلسلے میں قطعی خیال نہ کیا جاتا تھا ۔ تعلیم کا حاصل کرنا ہر شخص کیلئے ضروری قرار دیا گیا ۔ تمام کلب اور مذہبی تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں ۔ نیز مذہبی تعلیم کو کسی صورت سے حاصل کرنا ممنوع قرار پایا ۔ یکجائی تعلیم کا نفاذ عمل میں لایا گیا ۔

لینن کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ طبقۂ اشتمالی کیلئے دو چیزیں اشد اولین میں سے ہیں ——— اعلیٰ درجہ کی نسل اور بہترین تہذیب و تمدن ——— انھیں دو باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر اُس نے اپنا عملی نظام شروع کیا ۔

ملکی بہتری کیلئے تعلیم ہی سب سے بڑا ذریعہ سوچا گیا ۔ کیونکہ کسی ملک کی بہتری کا دارومدار اس کے باشندوں کے زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ ہونے پر ہے ۔ بہرحال اساتذہ کی اکثریت نے انقلابی حکومت کے زیرِ تحت کام کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور جن لوگوں نے کام کرنا شروع کیا اُنھوں نے حکومت کے خلاف طلباء میں تبلیغ کرنی شروع کی ۔ مدرسوں کی حالت بالکل تباہ کن ہو گئی ۔ اب اُن کا کام لے دے کر یہ رہ گیا تھا کہ اپنی پرانی عمارتوں کی مرمت کریں یا نئی عمارتوں کی تعمیر میں دن رات سرگرداں رہیں ۔ مدرسوں کے خانہ و سامان تقریباً ناپید تھے ۔ تمام مدرسوں میں ہر اُس چیز کی کمی محسوس کی جا رہی تھی ۔ جو مدرسوں کیلئے ضروری ہیں ۔ مثلاً کتابیں ، کاپیاں ، کاغذ ، پنسل ، قلم دوات ، روشنائی ، چاک ، جھاڑن وغیرہ ۔

اور سب سے دقت طلب بات تو یہ تھی کہ ایسے کارخانے بھی نہ تھے جو ان تمام چیزوں کو کافی تعداد میں سارے ملک کیلئے مہیا کر سکیں ۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اول اول تعلیمی دور کچھ اُمید افزا نہ تھا لیکن ان تمام مشکلات کا حل ایک شخص شیولجن (Shu lgin) نامی نے تجویز کیا ۔ وہ اِس تعلیمی نظام سے سخت برہم تھا ۔ اُس نے ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ "تم بچوں کو تعلیم کیوں دیتے ہو ؟ کیا شاہراہ انھیں تعلیم نہیں دیتی ؟ جماعتیں انھیں تعلیم نہیں دیتیں ؟ کارخانے انھیں تعلیم نہیں دیتے ؟ پھر بتاؤ کہ مدرسوں کی آخر کیا ضرورت ہے ؟" لیکن شیولجن کے اس نظریہ کا اُمید افزا خیر مقدم نہیں کیا گیا ۔ خصوصاً جو لوگ پرانے نظامِ تعلیم کو پسند کرتے تھے انھوں نے اس نئے نظریہ کو انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھا اور اسے قطعاً ناپسند کیا ۔ اسی دوران میں ایک تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ گھر بچوں کیلئے ایک ناقص اور نقصان دہ چیز ہے ۔ اسلئے تمام ملک میں دارالصبیان قائم کئے گئے اور تمام بچوں کو اپنے گھروں سے نکال کر ان جدید اداروں میں بھیج دیا گیا ۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اس قسم کی تحریکیں ملک کیلئے کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتیں ، اس لئے ختم کر دی جائیں آخر کچھ عرصہ کے بعد اس قسم کی تمام تحریکوں کو

ختم کر دیا گیا۔ اور اُن تمام بچوّں کو جو ان جدید اداروں میں داخل تھے ان کے والدین
کے پاس واپس بھیج دیا گیا۔

شروع کے یہ ایام جس طرح کہ زندگی کی دوسری باتوں کیلئے بہت آرام دہ
تھے اُسی طرح تعلیم کیلئے بھی بہت آرام دہ تھے۔ تعلیمی تجربات اب حوصلہ افزائی کی حد
سے آگے بڑھ چکے تھے اور اسی وجہ سے تعلیم کو اب ضروری قرار دیا گیا تھا۔ جو شخص
نئے تعلیمی تجربات کے مسائل پیش کرتا تھا اس کی بے حد حوصلہ افزائی کی جاتی تھی
اور اُسے اپنی جماعت کا بہت ہی وفادار رکن سمجھا جاتا تھا اور جو شخص نئے تعلیمی
اصولوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اُس سے انتہائی سوءظن برتا جاتا تھا۔ غرض
تعلیمی دوران میں روس ہر قسم کی تعلیمی سرگرمیوں کا "مکہ" نظر آتا تھا۔ بچوّں کی آزادی
سے ملکی آزادی و ترقی اور حکومت خود اختیاری ہر شخص کا تکیہ کلام ہو رہا تھا۔ اس چیز
سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بجائے صرف سوچ بچار کرنے کے لوگوں میں عملی تجربات
حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہی نہیں بلکہ "تعلیم اور سیاست" کے روابط ظاہر ہو گئے
اور ان سے یہ بھی عیاں ہو گیا تھا کہ اب تک صرف چند اشتمالی اساتذہ پیدا کئے
جا سکے ہیں۔ ان کے علاوہ جو غیر اشتمالی اساتذہ تھے۔ اُن سے حکومت کو بجائے
کچھ فائدہ کے برابر نقصان ہی نقصان ہوتا رہتا تھا۔ ان سب حالتوں کو دیکھ کر
یہ طے پایا کہ ابھی بچوں کو صرف اشتمالی اصولوں کی تعلیم دی جائے۔ لیکن اس کے
لئے سب سے بڑی دقت یہ درپیش تھی کہ آخر اس کا کیسے جائزہ لیا جا سکے گا۔ اُن کو
اس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے یا نہیں کیونکہ اسوقت تک حکومت کے پاس کوئی اشتمالی
ناظر تعلیم نہ تھا۔ آخر چند ماہرانِ تعلیم کی رائے کے بموجب یہ طے پایا کہ بچوّں اور
طالب علموں کو خود انھیں کی ذمہ داری پر جامعہ اور مدرسوں میں چھوڑ دیا جائے کہ
وہ اپنی جامعہ اور مدرسوں کو اشتمالی اصول پر چلائیں۔ ماہرانِ تعلیم کی اس رائے
پر کافی عرصہ تک عمل کیا گیا۔ اور اس کا کچھ اُمید بخش نتیجہ ظاہر ہوا۔ ہر جماعت کے
طلبا اور بچے متحدہ طور پر نیا نصاب تعلیم اور نظام الاوقات مرتب کرتے تھے۔
جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ہر چیز میں متحدہ دلچسپی لیتے تھے۔ اساتذہ کو بچوّں یا طلبا
کی معمولی شکایت پر برطرف کر دیا جاتا تھا۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں کے ماہرانِ تعلیم
یقیناً بچوّں کو اس قدر تعلیمی آزادی دینے پر سخت معترض ہوں گے۔ اُن کا اعتراض
بجا، مگر انھیں یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ اشتمالی تعلیم کے ایامِ اولیں میں جبکہ اشتمالی
اساتذہ بہت مشکل سے بچوّں کی تعلیم کیلئے ملتے تھے۔ حکومت اور ماہرانِ تعلیم کے
ناہنسا کہ ابتدا

پاس سوائے اس کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ طریقہ عمل روس میں
ہمارے ملک کے ماہرانِ تعلیم کچھ بھی کہیں تمام تجربوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔
اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بچوّں کو مکمل تعلیمی آزادی حاصل تھی۔ بلکہ اس کی کئی
وجوہات ہیں۔ مثلاً ایسے اساتذہ بہت مشکل سے ملتے تھے جو آزادانہ اور اشتمالی
اصول پر تعلیمی کام کر سکیں۔ وہ بچوّں کی نفسیات سے بہت کم واقف تھے۔ بلکہ
یہ کہنا چاہیئے کہ صرف وہی لوگ بچے کی نفسیات سے واقف تھے جو نئے طور پر تعلیمی
تجربات رکھتے تھے۔ جن تجربات اور چھان بین نے انقلاب سے پہلے عملی جامہ پہنا
تھا وہ کسی حد تک اچھے تو تھے مگر نہایت ہی معمولی پیمانہ پر اور اُن کا اثر بھی کسی
حد تک ضرور تھا مگر نہایت ہی کم۔

صرف چند ایسی ہستیاں تھیں جو یہ سمجھ سکتی تھیں کہ بچوّں کو کس قدر آزادی
کی ضرورت تھی اور کتنی پابندیاں اُن پر عائد کرنی چاہیئے کہ وہ ان تجربات اور
چھان بین کو سمجھ سکیں۔ پھر ایک اور بات ہے کہ اس قدر کم عرصہ میں اسی سخت سوچ
بچار کا موقع ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جلد بازی کی وجہ سے تعلیمی ابتری کا جو
دور دورہ تمام اطرافِ ملک میں جاری تھا۔ اب آہستہ آہستہ نابید ہو رہا تھا۔ اور پھر
یہ بھی بات ہے کہ اب ماہرانِ تعلیم اس نتیجہ پر پہونچے کہ اشتمالی اصولوں کیساتھ تمام
دنیا کے تعلیمی اصولوں میں سے صرف مندرجہ ذیل طریقِ تعلیم چل سکیں گے۔ 19

(۱) ڈالٹن کا نظامِ تعلیم (Dalton plan)

(ب) اختراعی طریقہ (Project Method)

بالآخر ماہرانِ تعلیم نے اس کا عملی تجربہ کیا اور انہیں مفید پایا۔ ان پر عملی تجربہ
کرنے میں یہ بھی آسانی تھی کہ چند اشتمالی اساتذہ ان طریقوں سے واقف تھے اور
بقول اُن کے کہ یہ طریقِ تعلیم تمام دنیا کے تعلیمی اصولوں سے آسان ہیں۔ اور ان پر
عمل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن ان سب کے علاوہ جو بڑی بات ان طریقِ تعلیم کے
پسند کرنے میں تھی وہ یہ تھی کہ اساتذہ اور ماہرانِ تعلیم کو کچھ دنوں کیلئے آئے دن
کے تعلیمی تجربوں سے نجات مل گئی۔ اختراعی طریقِ تعلیم کا نفاذ اس کی اصلی شکل
میں ہوا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد چند ایسی مشکلات درپیش ہوئیں جس سے اشتمالی
ماہرانِ تعلیم کو محسوس کرایا کہ اس طریقِ تعلیم میں بھی کچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ آخر
کچھ دن کے سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ اس کو نفسیاتی طریقِ تعلیم (Complex
Method) کی شکل میں پیش کیا جائے اور اس جدید طریقِ تعلیم کو ۸ سال کی عمر
سے لیکر ۱۲ سال کی عمر تک کے بچوں کیلئے ہونا چاہیئے۔

بالآخر اس جدید طریق تعلیم کا نفاذ اسی شکل میں ہوگیا جس کیلئے ماہرانِ تعلیم نے سفارش کی تھی اور (Dalton plan) کا نفاذ ۱۲ سال سے زیادہ عمر والے طالبعلموں کیلئے ہوا لیکن اس طریقہ میں بھی کچھ عرصہ کے بعد چند تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ جیسا کہ ہیلن پارکھورسٹ (Helen Parkhurst) ذاتی غور و فکر کے ذریعہ اور اُن تجربات کی بنا پر جنھیں امریکہ میں عملی جامہ پہنایا گیا تھا۔ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "یہ طریق تعلیم ایک اشتراکی ملک کیلئے بالکل انفرادی حیثیت رکھتا ہے" اس جدید طریقے پر انفرادی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ منظم جماعتوں کے ذریعہ ۴ سال سے ۶ سال تک کی عمر کے بچّوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ اسکولوں کی یہ زندگی اشتمالی تعلیمی دور کی ایک زرّیں یادگار ہوتی تھی۔ اس زندگی کی امتیازی خصوصیتوں کو دیکھتے ہوئے اگر ہر اُس تعلیم گاہ کو جہاں یہ تعلیم ہوتی تھی دارالتجربہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ دراصل ہر ایسی درسگاہ دارالتجربہ ہی تھی۔ ہر ایسے دارالتجربہ کے اراکین کا انتخاب کس طرح عمل میں لایا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ انتخاب کے وقت اسکا خیال رکھا جاتا تھا کہ بچے یا تو ایک ہی استعداد کے ہوں یا ان میں چند صلاحیتیں مشترک ہوں لیکن دارالتجربہ میں انھیں داخل ہی کچھ اس طریقہ سے کیا جاتا تھا کہ اُن میں خود بھی ان اصولی نظریات کی چھان بین میں دلچسپی لینے کا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ طریق تعلیم بھی اس وقت تک کام دے سکا جب تک کہ نئی نسل تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ بہر حال ان تمام تجربات سے یہ تو ضرور فائدہ ہوا کہ اب اساتذہ بھی اشتمالی اصولوں کے ماتحت تعلیم دینے کے طریقوں سے واقف ہو گئے تھے۔ اور ان میں زندگی پائی جاتی تھی۔

دارالتجربہ کا طریقہ جامعہ میں بھی جاری کیا گیا۔ جہاں آئے دن طلباء کی شکایتوں کی وجہ سے تقریباً تمام اساتذہ نکالے جا چکے تھے۔ اب جامعہ میں ایسی جماعتیں بھی قائم کی گئیں جہاں جامعہ کے طلباء اپنے اساتذہ کی نگرانی میں تحقیقاتی کام کرسکیں۔ ایسی جماعتوں میں طلباء کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس یا تیس ہوتی تھی۔ یہ جماعتیں مختلف حصوں میں منقسم تھیں۔ جس طرح کہ ہمارے یہاں کی تعلیم گاہوں میں جماعتیں منقسم ہوتی ہیں۔ اپنی جماعتوں کے زیادہ تر کام یہی کرتی تھیں۔ جماعت کے سب سے زیادہ استعداد رکھنے والے سے یہ امید رکھی جاتی تھی کہ وہ کمزور طلباء کی مشکلات حل کرے گا۔ یہ مختلف جماعتیں جو کام انجام دیتی تھیں اس کی تحریری روئدادیں سرداروں کو پیش کر دیتی تھیں۔ پھر ہر سردار اپنی جماعت کے متعلق روئدادوں کو پڑھ کر اپنے نگراں سے تبادلۂ خیالات کرتا تھا مگر ان سب باتوں کے باوجود بہت کم ایسے اساتذہ تھے جو ان طریقوں کو اصلی حالت میں یا کمی و بیشی کیساتھ عمل میں لاسکیں۔ وہ اپنے دماغ سے ان کے دماغوں پر یہ خیال مسلط کرتا تھا کہ ہر نئے طریقے پر عمل کرنے سے انسان خود استاد ہو جاتا ہے" ــــــ حالانکہ کسی نئے طریقہ پر عمل کرنے کیلئے استاد کو اپنے دماغ کو اسی طرف مائل کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت کم ایسے اساتذہ تھے جو بخوشی ان طریقوں پر عمل کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی نئے اصول کے ماتحت پر دل لگا کر کام نہ کرے تو اس کا نتیجہ خراب ہی رہیگا۔ یہی حال اس ابتدائی تعلیمی دور میں روس کا ہوا۔

اس تمام زمانہ میں تعلیم کے طریقے معلوم کرنے اور علمی تحقیقات کرنیکا اور چھان بین کا کام محکمہ علم التحقیق (Research Department) ادارہ علم التعلیم (Institutes of Pedagogy) اور مستقر التحقیق (Research Stations) کے تحت ہوتا تھا۔ ان اداروں کے نتائج کے مطابق تعلیمی سرگرمیوں میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی تھیں پنج سالہ نظام تعلیم ۱۹۲۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ یہ نظام صرف صنعتی اور اقتصادی ہی نہیں تھا بلکہ اسمیں تمدن کی بہتری کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ اقتصادیات اور صنعت کیساتھ تمدن کی ترقی بھی ضروری تھی سب سے زیادہ ضرورت اُن کام کرنیوالوں کی تھی جو کارخانوں اور مزروعہ آراضیات میں کام کرسکیں۔ روسی ماہرین کو اس سلسلہ میں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ تعلیم نے ملک کی اس ضرورت کو بھی جلد ہی پورا کر دیا۔ اب کثیر الفنون مدارس (Polytechnisation) کی سخت ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ بالغوں کی تعلیم کیلئے شہری اور دیہی مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ابتدائی تعلیم دینے والے تعلیمی ادارے قائم کئے گئے اور ان کی تعداد میں جلد اضافہ بھی کر دیا گیا۔ اسی دوران میں ننھے بچّوں کی تعلیم کو بھی ضروری قرار دے دیا گیا۔ عورتیں صنعت و حرفت پر قابض ہوئیں۔ مدارس اطفال اور شیرخوار بچوں کی پرورش گاہوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ موجودہ محکمہ تعلیم نے ان سب سے زیادہ نمایاں کام کیا۔ مانٹسوری (Montessori) فاروبیل (Froebel) جو کام نہ کرسکے وہ اس محکمہ تعلیم کے ذریعہ سے ہوا۔ اسی محکمہ تعلیم کا یہ ارادہ بھی تھا کہ اشتمالی سیاست کو اس سے کافی فائدہ پہونچا لیکن یہ سب تقریباً میکمیلن پرورش گاہ،

(Macmillan Nursery School) اور کثیر الفنون مدارس کے کام سے مطابقت کرتا تھا۔

پنج سالہ نظام ۱۹۳۲ء میں تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ تہذیبی اور صنعتی حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسوقت تک کی تمام چیزیں اطمینان بخش تھیں لیکن جس وقت تمام تعلیمی جزئیات سامنے آئے اور نظریہ تعلیم پر غور و خوض کیا جانے لگا تو یہ پتہ چلا کہ اس سلسلہ میں اسوقت تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے ابھی کافی کام کرنا باقی ہے۔ صنعتی کامیابی سے یہ تو ہوا کہ وہ اشیا جو اسوقت نہیں ملتی تھیں ملنے لگیں لیکن اس میں بھی ابھی ترقی و بہتری کی ضرورت تھی اور وہ وقت اب آگیا تھا کہ مدرسے اپنی تمام ضروریات کی اشیاء یکے بعد دیگرے طلب کرنے لگے تھے اس کا سبب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مدرسوں کی تعداد، ضروریات کی اشیا، تعلیمی سرگرمیوں (ان میں بہت سی چیزیں اب تک عملی تجربہ کی حد تک نہ پہونچیں تھیں،) میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشتمالی اساتذہ کی تعداد کافی ہوگئی تھی اور انکی تعلیمی کوششوں سے نئے تربیت یافتہ اشتمالی اساتذہ کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اور یہ لوگ بھی روسی حکومت کے خیر خواہوں میں سے تھے۔ یہ دیکھ کر حکومت نے اب اس اصول کو ختم کردیا تھا کہ طلبا اساتذہ کے نگراں ہوں۔ بلکہ اب معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اب نوجوانوں کی کافی تعداد اشتمالیت کو سمجھنے لگی تھی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ماہرانِ تعلیم نے اب یہ طے کیا کہ ماسکی نقطہ نگاہ (Focal points) کے اصولوں میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں۔ آخر ۱۹۳۱ء میں تعلیمی اصولوں میں تبدیلیاں کرنے اور نئے طریقِ تعلیم کے چھان بین کیلئے اختراعی طریقۂ تعلیم کو ختم کردیا گیا۔ اور اسے تمام ماہرینِ تعلیم نے مکمل طور پر ناکام تسلیم کرلیا۔ بہت سے ماہرینِ تعلیم نے جنہیں خصوصیت کیساتھ کروپاسکیا (Krupskaya) اور لینن کی بیوی بھی شامل ہیں۔ اس چیز کو صاف طور پر مانا ہے کہ جس قدر بھی اس سلسلے میں ناکامیاں ہوئیں اسی قدر اساتذہ میں صحیح تعلیمی تربیت اور تجربات حاصل کرنے کا جوش پیدا ہوا۔ لیکن اس کے برعکس نائب کمشنر تعلیمات (Vice Commissioner of Education) ایپائسٹین (Epstein) اپنے ایک بیان میں لکھتا ہے "میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ یہ طریقہ تعلیم ایک متوسط طبقہ کے لئے مناسب ہو مگر ایک ایسے ملک کیلئے جس کے پیشِ نظر اشتمالیت کے عظیم الشان قصر کی تعمیر ہو۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں میں یہ مانتا ہوں کہ اس طریقہ سے بچوں کو بہت سی سطحی باتوں کا تو ضرور پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کا بہت سا وقت بیکار قسم کی سیر و تفریح میں بھی ضائع ہوتا ہے۔ بچے اپنے شہر کی ریل گاڑیوں اور صنعت کے نام سے تو ضرور واقف ہوجاتے ہیں اور ان کے متعلق کچھ باتیں بھی کرسکتے ہیں۔ مگر مجھے بتاؤ کہ کیا وہ ایک جز بھی صحیح طور پر لکھ سکتے ہیں اور کیا وہ ایک سوال بھی صحیح طور پر حل کرسکتے ہیں؟ یقین مانو کہ ہمارے اس طریق سے بچوں کی حساب دانی اور لکھائی پڑھائی بالکل سادہ ورق کی مانند ہے"۔ ۱۹۳۳ء میں دو سال بعد شاٹکی (Shatsky) جس کے اختراعی طریقہ پر مدارس جاری تھے، سے تبادلہ خیالات کیا گیا۔ اُس نے اس طریقہ کی حمایت کی اور اُن لوگوں کو بتایا جو اُس سے تبادلہ خیالات کرتے تھے کہ یہ طریقہ تعلیم اُس کے مدرسوں میں نہایت کامیاب رہا، ہاں! ساتھ ہی اُس نے یہ بھی ان لوگوں کو بتایا کہ یہ طریقہ تعلیم صرف ذاتی مدارس میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ چاہیں کہ اسے حکومت جمہوریہ روسیہ کے عام اشتمالی مدارس میں کامیاب بنائیں تو این خیال است و محال است و جنون کے مصداق ہوگا۔ کیونکہ عوامی مدارس میں ہر قسم اور ہر ذہنیت کے بچوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے یہ طریقہ ایسے مدارس میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ڈالٹن کا نظامِ تعلیم اس اختراعی طریقۂ تعلیم سے کچھ دن زیادہ چلا ——— ۱۹۳۲ء میں اس کو بھی ختم کردیا گیا۔ اس کے ختم کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسے ممالک اشتراکیہ جمہوریہ روسیہ کیلئے مناسب نہ سمجھا گیا۔

دو[1] فرمانوں کے ذریعہ مسئلہ تعلیم کو کچھ عرصہ کیلئے پھر طے کیا گیا۔ اوّل ۲۵ اگست ۳۲ء میں مجلس مرکزیہ کے حکم سے جس کا تعلق ابتدائی و ثانوی تعلیمات سے تھا اور دوسرا اُسی سال کے ماہ ستمبر میں مجلس انتظامیہ مرکزیہ کے حکم سے جس کا تعلق اعلیٰ تعلیمات سے تھا۔ ان دو فرمانوں نے جمہوریہ اشتراکیہ کے آئے دن کی تعلیمی تجرباتی تبدیلیوں کو ختم کردیا۔ انہی احکامات کے ذریعہ تعلیمی دارالتجربوں کے طریقے بھی ختم کردیئے گئے اور انفرادی طریقِ تعلیم جاری کیا گیا۔ مدرسوں میں نہایت عمدہ طریقہ سے تیار ہو کر اسباق کا دیا جانا اساسی طریقہ پر رائج ہوا۔ اسکے علاوہ کارخانوں، عجائب خانوں کی تعلیمی سیر و تفریح بھی جاری رکھی گئی۔

دارالتجربات میں کام کرنے کے انفرادی طریقے رائج ہوئے۔ کتابی تعلیم بھی ختم نہ کی گئی۔ جامعہ میں نصابات پہلے سے جاری ہوئے۔ اُن کے انتظامات

---

[1] جنوری ۱۹۳۲ء کا جریدہ روس و برطانیہ۔ مرمیعزا سیت۔

کمل طور پر یا تو مدرسوں سے متعلق کئے گئے یا ناظرِ جامعہ کے سپرد کئے گئے بحکومت خود اختیاری کے کام خصوصاً جن کا تعلق طلبا سے ہوتا تھا محدود کر دیے گئے۔

(اس کے باوجود موجودہ حالت میں اب بھی دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ ان کا تعلق اس سے ہے)، اب اس کے برعکس تھا یعنی معیاری اور مہذب نظریات کے پیشِ نظر مسئلہ تعلیم کو ملک کی فلاح و بہبود کیلئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ پیمانہ پر اسکا حاصل کرنا ہر انسان کیلئے ضروری ہو گیا تھا۔ اور ہر شخص کی یہ رائے تھی کہ ان اعلیٰ مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر تعلیم کا حاصل کرنا ایک اشتمالی حکومت کیلئے ضروری چیز ہے۔

مروجہ درسیات وغیرہ میں بعد کے فرمانوں کے ذریعہ کچھ اور تبدیلیاں اور اصلاحات عمل میں آئیں۔ نئی نئی چیزوں کا تعارف طلبا اور اساتذہ سے کرایا گیا جنہیں خصوصیت کیساتھ میعادی امتحانات اور ان کی روئداد کا طریقہ عالمِ وجود میں آیا سب سے زیادہ اور ضروری تبدیلی جو اِن فرمانوں کے ذریعہ ہوئی وہ یہ تھی کہ اب بجائے ہفت سالہ مدارس کے دہم سالہ مدارس قائم کئے جائیں گے۔ اور اس طریقہ میں تبدیلی اس وقت ہو گی جب نیا پنج سالہ پروگرام عالمِ وجود میں آئے گا۔

۱۹۳۲ء میں دو فرمان وزیرِ اعظم مالوٹوو (Mololov)، اور اشتمالی جماعت کے معتمد اسٹالین (Stalin)، کے دستخطوں سے جاری ہوئے۔ فرمانِ دوم کے ذریعہ تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم رائج کی گئی۔ ان دونوں میں سے وہ باتیں جن سے بچے کو اس کی زندگی میں کبھی بھی سابقہ نہیں پڑتا نکال دی گئیں۔ استعمام (Generalisations)، اور اصولی مسائل (Theorising)، حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی تعلیم بالکل اسی طور پر دی جاتی ہے جیسے کہ آج ہمارے ملک کے مدارس میں دی جاتی ہے آج روسی مدارس کی حالت اُن کے ۱۹۲۱-۲۲ء کے مدارس سے بالکل مختلف ہے اُن کی حالت اپنی ملک کی اقتصادی اور سماجی حالت کے دوش بدوش دن رات بہتر ہو رہی ہے اور ملک کی اقتصادی اور سماجی حالت کی بہتری ان کی تعلیمی ترقی کا باعث ہے۔ اس لئے یقیناً باشندگانِ اشتمالیہ روسیہ کا یہ دعویٰ کہ ہمارے ملک کی بہتری کا آلہ صرف تعلیم ہے۔ بلا چوں و چرا صحیح ماننا پڑتا ہے۔ کاش! ہم سمجھ سکتے کہ ہماری بہتری کا بھی یہی ذریعہ ہے۔ خیر بعض روسی تعلیمی حلقوں میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جب طریقہ تعلیم کے متعلق ہمارے تجربے اپنی اصلی شکل میں دیگر ممالکِ عالم میں بھی جاری ہوں گے۔ روس میں اب تک جو تعلیمی تبدیلیاں ہو چکی ہیں یا ابھی ہونیوالی ہیں اُن کی حقیقت انقلاباتِ زندگی سے زیادہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ روس کے موجودہ دور کا سنگِ بنیاد اُسی کو سمجھنا چاہیئے۔ جو اُس کے شہنشاہی دور میں رکھا گیا۔ اور اسوقت جو طریقہ رائج ہے اُسے اسی سنگِ بنیاد پر ایک عالیشان قصر کی تعمیر سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ عالیشان قصر اسوقت تک نہیں ڈھایا جائے گا جب تک کہ ملک کو کسی دوسرے بہتر سیاسی انقلاب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ خیر چھوڑیئے ان قصوں کو اب آیئے یہ دیکھیں کہ اشتمالی تعلیم کے اصول کیا ہیں ——— ؟

خونِ موجِ مے رگِ شعلۂ رنگ فنائی سے!
چھلکی جاتی رہی بیاتی دستِ ساقی میں ڈھالا کی

فکرِ ناتمام

سعدی جعفری

جرمنی اور فرانس کا انقلاب ۱۸۴۸ء

(دوسری قسط)

(سلسلہ کیلئے ملاحظہ کیجئے ایشیا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء)

شہنشاہیت پرست (جو ناجائز ذریعوں سے اپنے لئے اور زیادہ دولت فراہم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ملک کے کارخانوں کو کچھ اس طرح کام میں لا رہے تھے کہ اس سے عام بےچینی بہت بڑھ گئی تھی۔ یہاں تک کہ صنعت سے متعلق بورژوا طبقہ بھی کافی حد تک امرار کے خلاف ہو گیا تھا۔ ان کی مخالفت آئینی تھی۔ وہ شہنشاہیت کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ رائے دہندگی کے طریقوں میں اصلاح کے خواہاں تھے۔ ۱۸۴۷-۴۸ء کے اقتصادی جمود نے بڑی حد تک معاملات کو یکجا کر دیا۔ اس جمود سے فرانسیسی اقتصادیات کا نظام بگڑ گیا۔ اگر ان دو سالوں میں فرانس کی تجارتی آمد اور پیرس کی پیداوار کا مقابلہ کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

	فرانس میں درآمد	پیرس میں صنعتی پیداوار
۱۸۴۷	۱۲۹۰ ملین فرنک	۱۴۶۳ ملین فرنگ
۱۸۴۸	۷۰۸ "	۶۷۷ "

صنعت کے اس زبردست تنزل کیساتھ ساتھ بیکاروں کی تعداد میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ تقریباً ۱۸۶۰۰۰ مزدور کام سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ طبقاتی کشمکش کافی بڑھ گئی تھی۔ رائے دہندگی کی اصلاح کیلئے جو جدوجہد ایک کشمکش کی صورت میں جاری ہوئی تھی۔ بڑھ کر انقلاب کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ۲۴ فروری ۱۸۴۸ء کو لوئس فلپ فرانس سے فرار ہو چکا تھا۔ شہنشاہیت پرستی کا خاتمہ ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

فروری ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی صحیح نوعیت اور پرولتاریوں کی کارروائیاں

اگر صحیح حالات کا جائزہ لیا جائے تو فروری ۱۸۴۸ء کا انقلاب بورژوا جمہوری انقلابات کی زنجیر کی ایک ضروری کڑی تھا۔ ملک میں بورژوا طبقہ کی تبدیلی ہیئت اور شہنشاہیت کی جگہ جمہوریت کا قیام۔ بورژوں کے زیادہ افراد میں سیاسی اقتدار کو وسیع کرنا اور یورپ میں جہاں جہاں نیم جاگیردارانہ شہنشاہتیں موجود تھیں اور بورژوا انقلابی تحریکیں ترقی پا رہی تھیں۔ وہاں بورژوا تبدیلی ہیئت کو زیادہ جوش میں لانا اس کا مقصد تھا۔

مگر فروری ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی تکمیل پرولتاریوں کے ہاتھوں سے ہوئی کیونکہ بورژوا افراد کی تمام جدوجہد پارلیمنٹری مخالفت تک محدود رہی جولائی ۱۸۳۰ء کے انقلاب میں بھی فیصلہ کن کام مزدوروں نے ہی کیا۔ حالانکہ وہ اس سے بھی واقف نہ تھے کہ کامیابی سے فائدہ کیسے اٹھانا چاہیئے اور جمہوریت کو کامیابی کیساتھ قائم کیسے کرنا چاہیئے۔ اس انقلاب کے بعد اٹھارہ سال تک پرولتاریوں کی تعداد بڑھتی رہی ان کی ذہنی قوتیں ترقی کرتی رہیں اور انھوں نے کامیابی سے صحیح فائدہ اٹھانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اگر عارضی حکومت نے مختلف بہانے کیے اور سیاسی حکومت کو قائم کرنیکا ارادہ ظاہر کر کے کوئی فیصلہ کن کام نہ کر سکی اور ملتوی ہو گئی۔ لیکن پیرس کے پرولتاریوں نے اب تک ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اور انھوں نے زبردستی جمہوریت کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن وہ صرف سیاسی تبدیلی پر ہی قانع رہنا نہیں چاہتے

تھے۔ وہ مزدوری کی شرائط میں ایک بنیادی سوشلسٹ تبدیلی کے خواہشمند تھے۔ اس زمانہ میں سب سے پہلی مرتبہ فرانس کے پرولتاریوں نے اپنے مطالبات خود پیش کئے۔ یہ مطالبے "مزدوروں کی تنظیم"، "کام کرنے کے حقوق کا اعلان" وغیرہ پر مشتمل تھے اور ان مطالبات کو اثر انداز بنانے کیلئے مزدوروں کی ایک منسٹری کے قیام کا بھی مطالبہ تھا۔ پرولتاریوں نے عارضی حکومت (جن میں بورژوؤں کی اکثریت تھی) پر زور ڈالا کہ وہ ممبرانِ حکومت میں چھوٹے بورژوا جمہوریتوں کے نمائندوں کو بھی شامل کریں۔ ان نمائندوں میں لیڈرو رولن Ledru - Rollin، فلوکن لوئس بلنک Flocon Louis Blank، جس نے مزدوروں کی تنظیم کے ذریعہ سماج میں پُرامن تبدیلی ہیئت کی تجویز مرتب کی تھی اور کارکن البرٹ (Albert) کے نام تھے۔ پرولتاریوں نے جب اسلحہ کی قوت سے جمہوریت کو حاصل کیا تو نئے نظام پر اپنی جماعت کی مہر لگا دی اور سوشلسٹ جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح جدید انقلابات کی عام خصوصیت ظاہر ہونے لگی۔ وہ خصوصیت جس کا اس معاملہ میں اس تمام کارروائی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کو موجودہ سامان کی موجودگی میں فوری طور پر قابل عمل سمجھا جاتا تھا۔ (Marx The Eighteenth Brumaire of Louis Bonaparte p. 30)

ایک ایسے ملک میں جہاں صنعتی سرمایہ داری کو ابھی تک نمایاں پوزیشن حاصل نہیں ہوئی تھی جہاں بڑے پیمانہ کی صنعت کافی تنزل پذیر ہو چکی تھی۔ سوشلزم کی کامیابی تقریباً ناممکن تھی اور سرمایہ داری کا آگے بڑھنا ضروری تھا۔ لیکن پرولتاریوں نے جو اپنی قوت کا اظہار کر چکے تھے اور جو شہنشاہیت کو ختم کرنے اور انقلاب کو جاری رکھنے کے خواہشمند تھے۔ اپنی تجاویز کو حکومت کے سامنے پیش کر دیا۔ اگرچہ کام کرنے کے حق کا مطالبہ۔ اٹوپین (Utopian) تھا اور وہ صرف پیداوار پر قابو پانے ہی سے حاصل ہو سکتا تھا لیکن پرولتاریوں کی کارروائیاں بورژوؤں سے حاصل کئے ہوئے بعض فائدوں کو تباہ کرنے والی تھیں۔ پرولتاریوں کے آزاد عمل نے ایک ہی ضرب سے ملک کی مختلف قوتوں کے درمیانی رشتوں میں کافی [illegible] کر دی۔ فروری سے پیشتر اقتصادی آمریت کے خلاف ایک [illegible] باوجودیکہ مختلف جماعتوں میں متضاد باتیں بھی پائی جاتی تھیں [illegible] کے بعد پرولتاریوں نے بورژوؤں کو اپنا

مخالف بنا لیا۔ انقلابی تحریک سے انھیں الگ کر دیا اور انھیں "سرخ جمہوریت" (Red Republic) کا دشمن بنا دیا۔

اگر تاریخ پر غور کیا جائے تو ۱۸۴۸ء کے تجربات بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انھیں تجربات سے سب سے پہلی مرتبہ بورژوؤں کی وہ تمام کارروائیاں صاف طور پر سمجھ میں آئیں جو انھوں نے جمہوری انقلاب کے سلسلہ میں کیں اور پرولتاریوں کی ترقی اور آزاد طاقت کا اظہار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۴۸ء کے فرانسیسی انقلاب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب ایک مرتبہ پرولتاری آزادی کے ساتھ آگے بڑھے تو چھوٹے چھوٹے بورژوؤں نے کیا کیا عملی کارروائیاں کیں۔ پرولتاریوں کیلئے صرف یہ کام رہ گیا تھا کہ وہ اپنے مطالبوں کو پیش کر دیں اور چھوٹے چھوٹے بورژوا (حالانکہ انقلاب سے اُن کے بھی بہت سے فوری مطالبوں کا پورا ہونا متعلق تھا) انقلاب کی مخالفت کرنیوالوں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

فروری کا مہینہ گذرتے ہی جب پارلیسی (Parisian) مزدوروں کا پہلا مظاہرہ ہوا تو فرانس کے بورژوؤں اور متوسط طبقہ والوں نے صرف ایک جماعت کو اپنا دشمن پایا اور وہ پرولتاری تھے۔ اسی وجہ سے ان کی تمام جدوجہد یہ ہو گئی کہ شہری اور دیہی علاقوں کے چھوٹے چھوٹے بورژوؤں پر فتح حاصل کر کے انھیں بورژوؤں کے لوئس بلنک اور اس کے خیالات کے متحدہ محاذ میں لے آیا جائے۔

پرولتاری اس سے قطعی ناواقف تھا کہ اُسے جو پوزیشن حاصل ہو گئی ہے اس کو فوراً کام میں کیسے لایا جائے۔ مستقل انقلابی اجزاء دبلنکی کی رہنمائی میں کم پائے جاتے تھے۔ لوگوں کی زیادہ تعداد لوئس بلنک پر اعتماد رکھتی تھی۔ لوئس بلنک دوسرے چھوٹے بورژوا ٹوپی سوشلسٹوں کی طرح یہ یقین رکھتا تھا کہ سوشلزم تک پہونچنا پُرامن ذرائع اور تقریباً تمام جماعتوں کے اتحاد سے بھی ممکن ہے۔

بلنک لکھتا ہے — ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے چاہے وہ کسی پوزیشن مرتبہ اور ماحول کا ہو جو نئے سماجی نظام سے بیگانگی اختیار کرے گا۔ اور یہ انقلاب بہت آسانی کیساتھ پُرامن ذرائع سے ہو سکتا ہے۔" ان خیالات کے ماتحت لوئس بلنک نے پیرس کے مزدوروں کے گرم مزاجوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی اور انھیں ترغیب دی کہ وہ عارضی گورنمنٹ پر

اعتماد رکھیں۔ اس نے یہ بھی ترغیب دی کہ وہ عارضی گورنمنٹ کمیشن (یعنی لکسمبرگ کمیشن Luxembourg Commission) جس کا یہ نام اس وجہ سے رکھا گیا تھا کہ اس کے جلسے لکسمبرگ پیلس میں ہوتے تھے، کے تقرر پر رضامندی کا اظہار کریں۔ یہ کمیشن سوشل مطالبوں کا نقشہ تیار کرنے کیلئے مقرر کیا گیا تھا اور اس میں مزدوروں اور دیگر کارکنوں کے نمائندے کو مساوی حقوق کیساتھ شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ جب کہ بلنکی انقلابی انجمنوں سے متاثر مزدوران پیرس نے حکومت پر بے اعتمادی کا اظہار کیا اور عارضی گورنمنٹ کی اصلاح کرانے اور نیشنل اسمبلی کے انتخاب کو ملتوی کرانے (کیونکہ مزدوروں کو یہ اچھی طرح یقین ہوگیا تھا کہ دئیے ہوئے تھوڑے سے وقت میں وہ مختلف صوبوں میں سرخ جمہوریت، کا پروپگنڈا کامیابی کیساتھ نہ کرسکیں گے) کا مطالبہ کرنے کیلئے ایک مظاہرہ کا انتظام کررہے تھے۔ اسی وقت لوئس بلنک اس مظاہرہ کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کررہا تھا۔ اس سلسلے میں بلنک نے اس عزت و اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا جو مزدوروں کو اس کی ذات سے اسوقت تھا جب وہ ۱۷ مارچ کو دو لاکھ انسانوں پر مشتمل بڑے مظاہرے کو ایک ایسے مظاہرے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جس میں گورنمنٹ کے چھوٹے چھوٹے بورژوا ممبروں (مثلاً لیڈر رو رولن Leaders ... Ranks) پر اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ گورنمنٹ نے التوا کے مطالبہ کو منظور کرلیا اور یہ اعلان ہوگیا کہ انتخاب دو ہفتے بعد عمل میں آئیں گے۔ مزدوروں کے نمائندوں نے لکسمبرگ کمیشن (جس کا صدر لوئی بلنک تھا) میں وقت ضائع کیا اور بورژوں نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرلیا۔ لینن (Lenin) ۱۸۴۸ء کے تجربات کو یاد دلا رہا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں اس نے مزدوروں کو آگاہ کیا کہ وہ "لوئی بلنک کے معاملہ" جس کو مینشویکس (Mensheviks) اور دوسرے انقلابی تیار کررہے تھے، کا اعادہ کبھی نہ کریں۔

اسی زمانہ میں عارضی حکومت کی پالیسی پرولتاریوں کے خلاف متحدہ محاذ کو قوت پہنچا رہی تھی۔ حالانکہ جولائی میں شہنشاہیت کے ماتحت کافی خسارہ ہوا تھا مگر پھر بھی حکومت بڑے بڑے سرمایہ داروں پر ٹیکس کرنے کی جرات نہیں کرتی تھی۔ جاگیردارانہ دستاویزات کے سلسلے میں سود قبل از تاریخ مقررہ بھی لے لیا جاتا تھا لیکن اس کے برخلاف سیونگ بینکوں کو سو فرانکوں سے زیادہ رقم ادا کرنے کی اجازت نہیں تھی اور سب سے بدتر بات یہ تھی کہ ایسے بنکوں پر ۴۵ فیصدی اضافہ کردیا تھا جن کا بار براہ راست کسانوں پر پڑتا تھا۔ اس طرح کسان کو مجبوراً ہوکر جمہوریت (جس کے خاص ہمدرد پیرس کے انقلابی تھے) کا مخالف ہونا پڑا۔

مارچ ۱۸۴۸ء کے شروع میں حکومت کے دایاں بازو کی تجویز پر بیکاروں کے لئے قومی کارخانے کھولے گئے۔ ان کارخانوں میں پیداوار کے کام کی بجائے بیکار کام زیادہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ عارضی حکومت سے بیکاروں کا ایک تعلق ضرور ہوگیا تھا مگر انھیں کارخانوں کے ذریعہ حکومت کا مقصد پبلک میں سوشل کارروائیوں کو غیر مفید ثابت کرنا تھا۔ چونکہ بیکاری بڑھ رہی تھی۔ اس لئے مئی کے شروع ہی میں نیشنل کارخانوں میں ایک لاکھ آدمی کام کررہے تھے جو امیدوں کے قطعی خلاف انقلاب کے بالکل مخالف نہ تھے۔ اسی وجہ سے حکومت کے دائیں بازو والوں نے انقلاب کی مخالفت میں ایجی ٹیشن جاری رکھنے کیلئے ان نیشنل کارخانوں کو مخصوص کررکھا تھا۔

ایک لاکھ بیکار آدمی فرانس کے خرچ پر رہتے تھے۔ یہ سب اُن سوشلسٹوں کی کارگذاری کا نتیجہ تھا جو ملکیت کو ختم کرکے ہر چیز کو تقسیم کردینا چاہتے تھے۔ لہٰذا بیکاروں کو غذا فراہم کرنے کیلئے (اس کا بھی امکان تھا کہ ان میں ایک لاکھ انسانوں کا اور اضافہ ہوجائے) گورنمنٹ کو ٹیکسوں میں اضافہ کرنا پڑا۔ مشہور و معروف گیت "ان سب کا خاتمہ، اور جائداد کی تقسیم کی مخالفت کرو۔ سرخ جمہوریت کی مخالفت کرو" پرولتاریوں کے خلاف متحدہ محاذ کو قوت پہنچانے کیلئے بنائے گئے تھے۔ ان حالات میں جب نیشنل اسمبلی کے انتخابات (۲۳ اپریل) ہوئے تو اس میں انقلاب کی مخالفت میں بہت ترقی ہوئی۔ پیرس کے مزدوروں نے مظاہرے کی تنظیم کی اور یہ مطالبہ کیا کہ نیشنل اسمبلی کو آزادی پولینڈ کی حمایت کا بیڑا اٹھانا چاہئے اور یورپ میں انقلابی تحریک کو تقویت پہنچانی چاہئے۔ ۱۵ مئی کو یہ لوگ اسمبلی ہال میں ایک دم گھس گئے اور جلسہ کو درہم برہم کردینا چاہا۔ انقلاب کے مخالفوں نے اب ارادہ کرلیا کہ وہ پیرس کے پرولتاریہ کو کچل دینگے۔ دارالسلطنت میں فوجیں جمع کرلی گئیں اور ان کے استعمال کرنے کیلئے ایک بہترین موقعہ بھی ڈھونڈ لیا گیا۔

۲۱ جون کو حکومت نے نیشنل کارخانوں کو بند کردینے کا فیصلہ کیا اٹھارہ سال اور پچیس سال کی درمیانی عمر والے غیر شادی شدہ لوگوں

۳۵

کو فوج میں بھرتی کرلیا گیا اور باقی لوگوں کو صوبوں میں واپس کردیا گیا۔ ایک لاکھ انسانوں کو روٹی سے محروم کرنے کی کوشش کا جواب پیرس کے مزدوروں نے مسلح بغاوت سے دیا۔ ۲۳ رجون سے ۲۶ رجون تک یعنی چار روز تک وہ بارکوں پر حملے کرتے رہے اور اس بری طرح لڑے کہ رجعت پسندوں کے ایک لیڈر تھیرس (Thiers) نے تو یہاں تک تجویز کیا کہ پیرس کو عارضی طور پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ لیکن بالآخر فوج اور نیشنل گارڈ نے جو جنرل کیوگنگ کے زیر کمان تھے بغاوت کو بہت خوفناک کشت و خون کے بعد فرو کر دیا۔

جون کے جنگ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس جنگ میں سب سے پہلی مرتبہ پرولتاری بورژوا لوگوں کی تمام جماعتوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ پیرس کے باغی صاف طور پر سوشلسٹ مقاصد رکھتے تھے۔

انھوں نے ایک اپیل میں یہ بھی لکھا تھا "پبلک کی مدافعت سے ہم جاگیروں کی حفاظت بھی کر رہے ہیں" حکومت کی تشکیل کیلئے انھوں نے جو تجویز پیش کی اس میں بورژوا جمہوری لوگوں کے نام اور بلنکی بلنک اور اسکے ساتھ لوئس نپولین کے نام بھی پیش کئے۔ اس وقت باغیوں کے چند گروہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ نیشنل کارخانوں کو جاری رکھا جائے۔ کام کرنے کے حق اور انجمن کی آزادی کے متعلق ایک فیصلہ کا اعلان کیا جائے اور نیشنل اسمبلی کو ختم کر دیا جائے۔ گرفتار شدگان اور عدالت میں حاضر ہونیوالوں کی فہرست کو دیکھا جائے تو باغیوں میں سے تین چوتھائی سے زیادہ مزدور تھے اور تعلیم یافتہ اور طالبعلموں کی تعداد بہت کم تھی قدرتی طور پر بغاوت شروع ہوگئی۔ عوام نے خود بارکیں بنائیں۔ اس وقت کوئی ایسا مرکز نہ تھا جہاں سے رہنمائی کی جاسکے مختلف صفوں سے بہت سے لیڈر سامنے آگئے ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو پچھلی تحریکوں میں حصہ لے چکے تھے۔ مثلاً بلنکی کے پیرو۔ مزدور۔ اشتراکی۔ جمہوری۔ جاکوبی Jacobins، وغیرہ۔

صرف جون کی بغاوت ہی ۱۸۴۸ء کے واقعات میں سب سے زیادہ نمایاں واقعہ نہیں تھا بلکہ ۱۸۴۸ء کے بعد پرولتاریوں کی جس قدر بھی کشمکش ظہور میں آئیں ان میں وہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی دلچسپ ہے کہ پیرس کی تحریک سے پہلے صنعتی صوبجاتی مرکزوں کی بہت سی بغاوتیں ظہور میں آچکی تھیں۔ یہ بغاوتیں عام بدحالی۔ شرحوں کی کمی اور فروری کی بغاوت میں کام کرنیکا وقت دس گھنٹے روزانہ جو مقرر ہوا تھا اس میں کام لینے والے اضافہ کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں سب واقعات کا نتیجہ تھیں۔ جون کی بغاوت عوام کی رضامندانہ تحریک تھی جس میں چھوٹے بورژوا لوگوں سے چھوٹے ہوئے اور خود اپنی طاقت پر اعتماد کرنے والے پرولتاری سرمایہ دارانہ سماج کی متحدہ قوتوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

بوناپارٹزم جون کے بعد بورژوا جمہوریتوں نے اپنی ڈکٹیٹری قائم کر لی لیکن جب ۱۰ ردسمبر ۱۸۴۸ء کو شہنشاہ اول کے بھانجے لوئس بوناپارٹ کو صدر جمہوریت کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تو یہ ڈکٹیٹری ختم ہوگئی۔ جون کی بغاوت میں کام کرنے والے باغیوں کے قاتل کیونک ر Cavaignac کو پانچ لاکھ ایک ووٹ جبکہ بوناپارٹ کو اسکے مقابلہ میں پانچ لاکھ، پانچ ووٹ ملے۔ دسمبر کے انتخاب کی خصوصیت کا اظہار سب سے پہلے مارکس نے کیا تھا۔ اس انتخاب میں چھوٹے چھوٹے کسانوں کی پیرس کے ان کام کرنیوالوں کے خلاف جدوجہد ظاہر ہوئی۔ جس کے متعلق یہ اندیشہ ہوگیا تھا کہ وہ زمینوں پر قبضہ کرلیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس سے اس پرانی بے اطمینانی کا بھی اظہار ہوا جو مالی جمہوریت کیخلاف عرصہ سے چلی آرہی تھی۔ اول نپولین نے کسانوں میں بہت ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس کی فتوحات نے بغاوت کے زمانے میں حاصل کی ہوئی زمینوں کو ان کے پاس رہنے دی۔ یہی بات نپولین کے بھانجے کو بھی حاصل ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے قابض بوناپارٹیوں کو کسانوں کی برادری میں سے سمجھتے تھے۔ دسمبر کے انتخاب نے چھوٹے زمینداروں اور بڑے بورژوا لوگوں کے درمیانی فرق کو زیادہ واضح کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بوناپارٹ کی فتح نے اس فوج کے ایک حصہ کے جذبات کو بھی ظاہر کیا جو خاص طور پر اونچے درجہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اور جسے جون کی بغاوت میں اقتدار حاصل ہوا تھا۔ اسی زمانے میں روس کے ایک سپاہی نے سینٹ پٹرسبرگ کو اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔

"فوج ایک تبدیلی کی خواہشمند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک فیصلہ کن وزن رکھتی ہے۔ کیونکہ فوج کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا وہ کسانوں کی طاقت کو پسند نہیں کرتی ہے۔ لیکن اگر کوئی قابل انسان مل جائے تو بھی فوج اپنی تمام طاقت سماج کے ایک مضبوط نظام کو دوبارہ قائم کرنے

دُکھ سُکھ

ایشیا

دوسرا باب

فسانے و ڈرامے

ماہ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

میرے ارادے

کائنات کی ہر چیز مسکرا رہی تھی۔ تمام فضا اپنی پوری دلفریبیوں کیساتھ نگاہوں سے گذر کر دل میں گھر کئے ہوئے تھی۔ چپے چپے میں جاذبیت اور ذرے ذرے میں دلکشی کے ساماں مہیا نظر آ رہے تھے۔ دل کی لطیف گہرائیوں میں سے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"یہ تمام منظر کتنا حسین ہے" اس آواز کیساتھ ہی۔ دل کی دنیا میں تخیلات کا ایک طوفان اور تصورات کا محشر برپا ہو گیا۔ ہاں۔ یہ میرا پہلا ارادہ تھا۔ بہت معصوم۔ بہت بلند۔ بہت دلفریب مگر بہت مشکل۔ میں نے تہیہ کیا کہ صناعِ ازل کے شاہکار کو صفحۂ قرطاس پر کھینچوں۔ اور پھر ان مٹ جانے والے نقوش سے سامانِ تسکین فراہم کروں۔ میرے ذہن و دماغ کی ساری توجہات فنِ مصوری سیکھنے کیطرف مبذول ہو گئیں۔ موقلم کو جنبش دی گئی۔ رنگ آمیزی کی گئی۔ دیکھنے والوں نے کہا سبحان اللہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہر خط اصل کا مظہر اور ہر رنگ اپنا خود منظر ہے!؟

اس کے باوجود میری روح مضطرب تھی۔ میرے کمالِ مصوری میں رنگ تھے۔ مناظر تھے۔ دلفریبی تھی۔ نقل حدِ اصل تک پہنچ چکی تھی۔ تصور حقیقت ہو چکا تھا۔ میری زندگی کا یہ پہلو صرف مناظرِ قدرت کی لطف اندوزی تک محدود تھا۔ میری نگاہوں میں سبزہ تھا۔ پھول تھے۔ درخت تھے۔ شفق کی ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ تارے تھے۔ چاند تھا۔ تاباں سورج تھا۔ بارش کے بعد قوسِ قزح کی ہفت رنگی تھی۔ یہ تھا میرا گرد و پیش جس نے مجھے بظاہر مسحور کر رکھا تھا۔ مگر سب کچھ بے جان، مگر سب کچھ تازگی سے محروم،

اب نگاہوں نے یکایک ایک اور منظر دیکھا۔ درد انگیز۔ روح فرسا وحشت ناک۔ کڑکتی سردی پڑ رہی تھی۔ تند و تیز ہوا خون کو رگوں میں منجمد کر رہی تھی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ خدا کی ایک کثیر مخلوق، مفلوک الحال انسانوں کی بستی اس وسیع سڑک کے کنارے جس پر ہر وقت تانگے اور امیروں کی موٹر کاریں دوڑتی رہتی تھیں۔ پٹری پر پڑی آسمان سے غافل تھی۔ سنگین زمین ان کا بچھونا تھی اور ستاروں بھرا آسمان ان کے مکان کی چھت۔

مفلسوں کی یہ آبادی پڑی سو رہی تھی۔ میں سوئے ہوئے اس افلاس اور بھوک کے شہر سے گذر رہی تھی۔ یکایک ایک گوشہ سے رونے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ ایک بچہ کو نمونیہ ہوا اور مر گیا۔ مفلسی اور سردی کے پہلے کارنامے نے میرا دل ہلا دیا۔ اس حادثہ نے میری توجہ کو مناظرِ قدرت اور مصوری سے ہٹا کر انسانوں کی ہمدردی اور اقتصادی حالت کے مطالعہ کیطرف مرکوز کر دیا۔ ایک درخت تھا۔ سڑک کے بالکل قریب جس کے سائے میں ایک بہت بوڑھی بھکارن نے اپنا ڈیرہ ڈال رکھا تھا وہ بالکل اپاہج تھی۔ چلنے پھرنے کے ناقابل۔ آتے جاتے والے لوگ شاید اس کو پیسے دو پیسے دیدیتے ہوں گے۔ جس سے وہ اپنا پیٹ بھر لیتی ہو گی۔ سردی ہو کہ گرمی۔ بارش ہو یا دھوپ اس کی یہ نشست مستقل اور نہ بدلنے والی تھی۔ بیشمار پیوندوں والی ایک بوسیدہ چادر تھی۔ جو تنہا اسکو سردی سے بچاتی ایک روز صبح سویرے ایک نوجوان تیزی کیساتھ اپنی موٹر کار بھگائے چلا آ رہا تھا۔ سامنے سے یکایک تانگہ آ گیا۔ تانگہ کو بچانے کیلئے اس نے موٹر کو ذرا بائیں طرف ہٹایا۔ موٹر پورے زور سے چل رہی تھی۔ وہ اسی زور میں سڑک چھوڑ کر پٹری کے اوپر چڑھ گئی جو صرف پیدل چلنے والوں کیلئے وقف تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس درخت کے نیچے پہنچ گئی۔ جہاں وہ بڑھیا اپنی المناک اور تباہ زندگی کے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ اور پھر میری آنکھوں نے صرف یہ دیکھا کہ موٹر پوری برق رفتاری کیساتھ گذر چکی تھی اور اڑتی ہوئی گرد کی آغوش میں بڑھیا کا سر چکنا چور ہو گیا۔ سڑک پر خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ دم توڑ چکی تھی۔

اس سانحہ نے میری دنیائے تخیل میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا دل میں سوالات پیدا ہوئے۔ یہ کیوں ہے؟ سوسائٹی کا یہ کیا نظام ہے؟ انسانوں کے ایک طبقہ کیلئے محل ہیں۔ عالیشان مکانات ہیں۔ موٹریں۔ تانگے۔ ہاتھی ہیں۔ گھوڑے ہیں غرض کہ زندگی کو بہترین طور پر گذارنے کی ہر صورت میسر ہے۔ دوسری طرف انسانیت کا ایک انبوہ ہے۔ جس کے پاس رہنے کیلئے مکان نہیں نہ پہننے کیلئے کپڑے اور نہ کھانے کیلئے روٹی۔ اس تہذیب و تمدن کے دور میں ان کا معیار

زندگی ان باربرداری کے حیوانوں سے بلند نہیں۔ جو انسانوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ جب چاہیں ان پر بوجھ لادیں۔ جب چاہیں ان کا گوشت کھا کر ان کو قیدِ زیست سے آزاد کردیں۔ آخر یہ کیوں؟ دولت کی یہ غیر مساوی تقسیم کیوں ہے؟ ان سوالات نے میرا سکون برباد کردیا۔ میرے شب و روز انہیں سوالات کے حل کرنے کی فکر میں گذرنے لگے۔ اور آخر کار میں نے ارادہ کیا۔ کہ تمدن و معاشرت کے اس گھناؤنے قعرِ عظیم کو برباد کردینا چاہیئے۔ اس انسانیت سوز نظام کو مٹانے کیلئے مجھے اپنی زندگی وقف کردینا چاہیئے۔ پورے غور و خوض کے بعد میں نے اپنا تمام وقت اور سرمایہ خدمتِ حق کیلئے وقف کردیا۔ اس تمام غیر مساوی تقسیم دولت کا راز ایک ہی حقیقت میں پنہاں تھا۔ اور وہ حقیقت تھی سرمایہ دارانہ نظام جب تک اس نظام میں بنیادی اور موثر تبدیلی نہیں ہوگی۔ افلاس و فاقہ میں کوئی کمی نہیں آئیگی۔

لہذا میں نے مختلف ممالک کے نظاموں کا مطالعہ کیا۔ مختلف اقوام کی گذشتہ تاریخ پر نظر دوڑائی۔ معلوم ہوا کہ جب تک عوام الناس میں سیاسی بیداری اور اپنے حقوق کو تسلیم کرانیکا احساس پیدا نہ ہوگا۔ اس بے زبان طبقۂ انسانی کا برسرِ اقتدار جماعت اسی طرح ناجائز استعمال کرتی رہیگی۔ میں نے اپنا دماغ۔ وقت اور قلیل ذرائع اس احساس کو جگانے کیلئے وقف کردئے۔ قلم سے اور زبان سے لوگوں کو بتایا کہ وہ قعرِ ذلت سے نکلیں۔ حکومت کو توجہ دلائی کہ وہ رعایا کے راحت و آرام کے اسباب مہیا کرے بہت دوڑ دھوپ کی۔ ایک عرصہ جلاوطنی میں گذرا دشت نوردی کی پیروں کو آبلوں کا خیر مقدم کرنے کیلئے تیار کیا۔ قیدخانوں میں شب و روز گذارے۔ کانوں نے مشین گنوں اور بندوقوں کی آوازیں سنیں۔ محبانِ وطن کو موت سے کھیلتے دیکھا لیکن اس نظام استبدادیت کی مضبوط زنجیریں مضبوط تر ہوتی گئیں۔ قوم فروشوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ خود غرض میدان میں تیزی سے آنے لگے۔

حقوق مانگنے والے شہری غدار کہلانے لگے۔ اور دشمنانِ ملک و ملت رہنمایانِ قوم سمجھے جانے لگے۔ یہ نظارا میرے لئے بڑا ہمت شکن تھا اور روح فرسا! سکون طلب دل اور بھی زیادہ مضطرب تھا۔ احباب نے کہا: تم پاگل ہو۔ تمہارا دماغ خراب ہوگیا۔ زمانہ ہمیشہ اسی طرح چلا آیا ہے۔ مفلسوں کے نام پر انقلاب برپا کیا گیا۔ پھر جب قوت و اختیار کا زمانہ آیا۔ وہی غریبوں کی چھینے والی جماعت ان کا خون چوسنے کیلئے تیار ہوگئی۔

مخلص راہنما تختۂ دار پر لٹکا دیے گئے۔ جاں نثار کارکن گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے۔ اور لوٹ کھسوٹ کیلئے پھر راستہ صاف اور محفوظ کرلیا گیا۔ میں نے جو غور کیا تو حقیقت کی روشنی میں بالکل یہی نقشہ دیکھا۔ یہ نقشہ دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ امیدوں پر اوس پڑگئی۔ آرزوئیں یاس و بیم میں تبدیل ہوگئیں پریشانی میں اضافہ ہوا۔ تلاش سکون میں نکلے تھے۔ مگر اضطراب و بے چینی خریدلی۔ دل اکتا گیا۔ تنگ آکر دل نے فیصلہ کیا کہ اس کمینی اور ذلیل دنیا پر لعنت بھیج۔

تو مصلح قوم نہیں۔ ہادی نہیں۔ پیمبر نہیں۔ تجھے کیوں غم ہے؟ سکون کی صرف ایک ہی راہ نظر آئی۔ یہ کہ اپنے پیٹ بھرنے کیلئے دیانت دارانہ مشقت کی جائے۔ مادی دنیا سے تمام امیدیں اور اپنے علائق قطع کرلئے جائیں۔ جبیں کو بارگاہِ ربوبیت میں جھکانے کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت نکالا جائے کیونکہ یہی ابدی سکون و راحت کا سرچشمہ ہے۔ اس راہ پر چل کر مجھے محسوس ہوا کہ ایک عجیب فرحت بخش سکون و راحت کی بارش میرے قلب و روح پر ہو رہی ہے۔ جس سے میری زندگی کا ہر لمحہ فردوس بداماں ہوگیا ہے۔ بیشک یہ میرا بہت عجیب خواب ہے۔ مگر موجودہ زمانے کی شکست خوردگی کی حقیقت اس خواب میں پائی جاتی ہے۔

(مس) تسنیم حفیظ

ڈپٹی

پہلے میں آپ کو ڈپٹی کے معنی بتادوں - یہ لفظ ایک ایجاد بندہ " اصطلاح ہے - اور اس سے مراد وہ "نسل" جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہماری قوم میں پیدا ہوئی - اور پچھلے اسی سال میں ہماری قومی زندگی پر چھاگئی - یعنی انگریزی حکومت کے ہندوستانی نوکر جن کے مزاج میں پنشن پانے کے بعد بھی اپنے "حاکم" ہونیکا احساس غالب رہتا ہے!

اب چونکہ قومی جدوجہد کے طفیل میں یہ "نسل" غائب ہوتی نظر آتی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کا ایک رکارڈ باقی رہ جائے - لیکن میں آپ کو شروع ہی میں بتادینا چاہتا ہوں کہ اس "قوم ڈپٹی" سے میں بہت بدعقیدہ ہوں اس رکارڈ میں اگر آپ کو قومی عزووقار کی حزینہ جھلکتی دکھائی دے تو میں آپ کو جھٹلاؤں گا بھی نہیں -

میں "ایں قدر وآں قدر" کم وبیش درجن بھر ڈپٹیوں سے واقف ہوں، عادتاً دیر آشنا ہونے کے باوجود ہوں - لیکن آپ مزاناً بھی چاہیں اور شہر میں وبا آجائے تو آپ کر بھی کیا سکتے ہیں! میرے تعارف کو اس پر سے قیاس کریجئے -

آپ اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ ہم نے قومی طور پر سرکاری نوکری کو سب سے بڑی عزت شمار کرکے "ڈپٹی" کے لقب میں وہ اعزاز پیدا کردیا کہ اب ٹیکا لگانے والے اسسٹینٹ سپرنٹنڈنٹ ویکسی نیشن اپنے آپ کو "ڈپٹی صاحب" ہی لکھواتے ہیں - ہاں، تو جب کبھی میں اس "نسل" کے آدمی سے ملتا ہوں تو ہمیشہ یہ اثر لیکے اٹھتا ہوں کہ ایسے دقیانوسی لوگ "حاکمی" کا کام کس طرح چلا سکے! پھوہڑے دماغ قانونی نزاکتوں کی قدر کیسے کرسکتے ہیں جن ذہنوں پر مکڑی نے جالے پردے ہوں - جن کے اندر روشنی نہ پہنچتی ہو - ہوا کا گذر نہ ہو - وہ دماغ حکومت کا کام کس طرح چلا سکتے ہیں! لیکن دیکھ یہ رہا ہوں کہ تیس سال کی طویل مدت نیک نامی سے بسر کرکے لوگ پنشن پارہے ہیں!

میری اس الجھن کو میرے بعض دوستوں نے یہ بتاکر دور کرنا چاہا کہ ضلوں کا سارا انتظام ایسے بندھے ٹکے قاعدے قانون کے تحت انجام پاتا ہے کہ چند مہینے کے اندر ہر کسے کہ باشد فیصلہ دینے کے قابل ہوجاتا اور مشین کی طرح ترقی پاتے پاتے نیک نامی سے پنشن حاصل کرلیتا ہے - لیکن اس سے میری تسلی نہ ہوئی - میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ انگریز چھٹا ہوا زیرک مانا گیا ہے - یہ جو اس نے پچپن سال کی قید لگائی ہے - سوچ سمجھ کر ہی لگائی ہوگی! پنشن پانے تک یہ لوگ ضرور فہم و فراست سے کام لے سکتے ہوں! لیکن جب دماغ کھوکھلے ہونے لگتے ہیں تو مادرِ مشفقہ حکومت نان نفقے کی فکر کرکے گھر میں بٹھادیتی ہے!

مگر اس خیال نے ایک دوسری قومی خزینہ پیش کردی - دنیا کی قوموں میں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ پختہ سال ہوکر ہی لوگ پختہ عقل ہوتے ہیں - اور اپنی قوم و ملک کی یادگار خدمت کرتے ہیں - ہر پانچویں برس ایک بوڑھا انگریز چالیس کروڑ جانوں کا مختار بناکر بھیجدیا جاتا ہے! خیر ڈپٹی آفتاب علی کی مدت ملازمت کا پتا کر میری اس کرید کا نتیجہ ہے -

ہمارے خواجہ حسن نظامی کو شکایت ہے کہ گورنمنٹ کے بعض محکموں میں دہلی والوں کی حق تلفی ہورہی ہے - مگر خدا کا شکر ہے کہ مجھے اپنے شہر کے متعلق حکومت سے یہ شکایت نہیں اور یہ احسان ہے ڈپٹی آفتاب علی کے خاندان کا ان لوگوں کی پامردی اور فنکاری کی بدولت میرے شہر والوں کی حق تلفی ہونا ممکن ہی نہ رہا - اب غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آفتاب علی کا خاندان ڈپٹیوں کا خاندان ہے -

قیاس چاہتا ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے اور گھر والوں نے آفتاب علی نام رکھا تو اسے ایک نہایت خوبصورت نام سمجھا ہوگا - پھر آپ کو یا مجھے کیا حق ہے کہ اسکو غیر حسین اور امتیاز سے عاری نام سمجھیں؟ اور اتنا تو مجبوراً ماننا پڑے گا کہ اس نام کو اپنے مسمیٰ سے مناسبت ضرور ہے! مگر آپ کو اس حقیقت کا علم کیا؟ سنئے - آفتاب علی کے اندر حصول مقصد کی سرگرمی تھی اور ان کی مطلب برآری کی امید ہمیشہ روشن رہتی تھی!

نمونہ ہوا۔ کالج میں آفتاب علی کی ماسٹر پروفیسر ہمیشہ خوش رہے کہ
وہ اس کے دیے ہوئے سبق اور لکچر بڑے غور سے سنتا اور یاد رکھتا تھا معلوم
ہوتا ہے کہ ہماری پچھلی نسل کے پڑھانے والے بھی کچھ یونہی ہوتے تھے۔ یا شاید یہ
... تک علم النفس اس قدر مدون و مکمل نہ ہوا تھا؛ ورنہ سمجھا
جاتا کہ ایسا جس شخص میں "شخصیت" مفقود ہوتی ہے۔ اسکی خصوصیت
صرف "فرمانبرداری" ہو جاتی ہے! اور چونکہ آفتاب علی کی ذات
میں شخصیت نام کی کوئی چیز نہ تھی، اسلئے وہ بچپن سے رٹنے اور پروفیسروں کے
فقرے لفظ بلفظ یاد رکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور جب نوکری مل گئی تو ان کی توقع
ساری اس امر پر مرکوز ہونے لگیں کہ اپنے افسر مجاز کی پسند و ناپسند کو سمجھ کر اس کی
مرضی اور حکم کے خلاف کوئی بات نہ ہونے پائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پوری ملازمت
کے دوران میں آفتاب علی چند ہی موقعوں پر کسی اضطراری حرکت کے مرتکب ہوئے
ہوں گے۔ مجھے تو ایسے ایک ہی واقعے کا علم ہے جو مسٹر بین صاحب کلکٹر
... اس کا ذکر اپنے موقعے پر آئیگا۔

آفتاب علی نے بی اے پاس کر لیا تو عمدہ چال چلن اور قابلیت کے
سرٹیفکٹوں کا ایک دو ورقہ چھپوا لیا گیا۔ یہ ایک حدیث تھی اور ہر درخواست کیساتھ
نتھی کیا جانے لگا۔ میں آپ کو تعلیم یافتہ فرض کر کے باور کئے لیتا ہوں کہ آپ ان
سرٹیفکٹوں کے مضمون سے واقف ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونے کے معنی ہی کیا ہوئے
مگر آپ نے نوکری نہیں ڈھونڈی، درخواستیں نہیں بھیجیں، اور سرٹیفکٹ
بھی نہیں کئے! لیکن پڑھے لکھے ہونے کے باوجود آپ یہ نہ جانتے ہوں گے کہ
ان سرٹیفکٹوں میں کچھ نہیں لکھا ہوتا ہے! بایں ہمہ آفتاب علی کے سرٹیفکٹوں
میں ایک ایسا بھی تھا جس میں کچھ لکھا بھی تھا۔ یہ بوڑھے پروفیسر جان بل کا سرٹیفکٹ
تھا۔ جس کے اندر یہ فقرہ بھی تھا کہ "میری خواہش تھی کہ وہ (آفتاب علی) اپنے
اندر شخصی رجحانات پیدا کرتے!"

اب میں آپ ہی سے سوال کرتا ہوں کہ کیا یہ فقرہ ایک سرٹیفکٹ کی
عبارت بن سکتا ہے؟ سرٹیفکٹ کی ایجاد تو اس اصول پر ہوئی تھی کہ اس کے اندر
کوئی بات بیان نہ ہونے پائے۔ مگر ایک پروفیسر اور پھر بوڑھا! نیم چڑھا کریلا ہونا
ہی تھا ——— لکھ گیا ایک بے تکا فقرہ!
یہ سننے کے بعد میرے ساتھ آپ بھی بوڑھے پروفیسر کی قابلیت پر
شک کرنے لگے ہوں گے؛ لیکن میری آپ کی دونوں کی ذہانت بیکار گئی! سنئے

آفتاب علی اور ان کے گھر والوں نے اس فقرے کو ایک بے مثال سفارش
سمجھا۔ اور اس کی یہ تعبیر کی کہ آفتاب علی کام کرنے میں اپنی ذات کو بھلا دیتا ہے،
اسمیں انتہا درجے کا ایثار و فرمانبرداری ہے۔
اگر آفتاب علی کے خاندان کے متعلق چند اشارے نہ کئے جائیں تو آپ
آفتاب علی کے کردار کا پوری طرح اندازہ نہ کر سکیں گے۔
ان کا خاندان کوئی چھوٹا موٹا کنبہ نہ تھا۔ قبیلے کے نصف بہتر کو چھوڑ
کر اور مستقبل کے "ڈپٹیوں" کا شمار نہ کر کے بھی دو درجن "ڈپٹی" تھے! ضلع
کے سارے دفتروں میں ——— مویشی خانے کی کلرکی سے لیکر ڈپٹی کلکٹری تک
——— ایک نہ ایک "آفتاب علی" موجود تھا! اس خاندان میں "خاں صاحب"،
بھی تھے اور جو "خاں صاحب" نہ ہو سکے تھے "حاجی صاحب" بن گئے تھے
اس برتھی کمی کے کماندار یعنی سردار قبیلہ منشی مختار علی تھے۔ منشی
صاحب بہت پرانے میونسپل کمشنر تھے اور برابر بنے چلے آ رہے تھے۔ وہ
شہر والے جو باہر بھیتر نکلے بیٹھے ہیں، منشی مختار علی صاحب کی فٹن جو لارڈ
کلائیو کے وقت سے ادھر کی نہ تھی۔ صبح سے لیکر دوپہر تک شہر کے مختلف حصوں
میں بار بار دیکھی جا سکتی تھی۔ اتوار کے روز فوجداری اور دیوانی کے حکام اعلیٰ
کی کوٹھیوں سے لیکر منصرم کے مکان اور قرق امین کے چبوترے پر بھی منشی
صاحب سے ملاقات ہو سکتی تھی۔
منشی مختار علی کی خصوصیات یقیناً بہت ہوں گی۔ مگر مجھے صرف
دو معلوم ہیں۔ ایک تو ان کا وہ اب گرا اب گرا گھوڑا اور دوسری ان کی
بے پھندنے اور بے بونڈی کی ترکی ٹوپی! گھوڑے کی خصوصیت یہ تھی کہ
ہر وقت گر پڑنے کا ارادہ رکھنے کے باوجود کبھی نہ گرا، اور ٹوپی کی خصوصیت
یہ تھی کہ اسلامی ہونے کے باوجود شدھی ہو گئی تھی! مگر یہ جداگانہ انتخاب سے
پہلے کا واقعہ ہے۔ اگر کہیں منشی صاحب اپنی ترکی ٹوپی پہنے آج موجود ہوتے
تو قیامت کا سامنا ہو۔ ہندو فوراً اعتراض کریں گے کہ تشہیر کی نیت سے ہماری
مذہبی چیز شوبنڈی کی نقل بنا کے سر پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اس کے
جواب میں لازمی طور سے مسلمان کہیں گے کہ ترکی ٹوپی پہننا ہمارا اسلامی فرض
ہے، اور اس کی وضع پر اعتراض کرنا ہمارے اسلامی کلچر کو مٹانے کی کوشش ہے
اس پر ناممکن ہے کہ معاملہ چپکی بیٹھی رہے۔ وہ ایک آل انڈیا مسئلہ گرہ کر دیگی
یا اس اعتراض اور اعتراض کے نتیجے میں ایک فرسٹ کلاس بلوہ ہو رہا ہوگا۔

اور اس بلوے کے نتیجے میں جناح صاحب پکارنا شروع کر دینگے کہ اقلیت پر مظالم ہو رہے ہیں ——— ہماری ترکی ٹوپی کو ہر وقت پر وضع اختیار کر لینے کا حق حاصل ہے! مگر چونکہ اس پر اعتراض ہوتا ہے اسلئے ہمارا ایک "پاکستانی" وطن ہوگا۔ اور تمام صوبوں کی اسلامی اقلیتیں ہماری "سوڈیٹن لینڈ" ہونگی۔ اس پر ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوگا۔
اور بالآخر شاید اس کی نوبت آجائے کہ پاکستان اور ہندوستان کیساتھ لا مذہبستان کو تسلیم کرنا ضروری ہو جائے۔ شاید ایک زنانستان بھی!
اس کے بعد یقیناً اور بہت سے "استان" ضروری قرار پا جائینگے یہاں تک کہ ہر گھر کے مختلف افراد جدا گانہ آزاد صوبے بنائیں گے اور اس کی گھر کی ایک فیڈریشن "سورن اسٹیٹ" کا درجہ رکھیگی! اس کے بعد سوں وار کا زمانہ آجائیگا ——— اور پھر قیامت!

خیر تھا تو یہ جملہ معترضہ، لیکن آپ اسے بالکل غیر متعلق بات بھی نہیں کہہ سکتے: ہمارا مقصد منشی صاحب کی رواداری کی اسپرٹ اور بے تعصبی کو اجاگر کرنا بھی تھا۔

منشی صاحب کے پاس اسوقت کے رواج کے مطابق، ایک جزدان تھا۔ اس جزدان میں خاندانی سرٹیفکٹ اور سندیں رکھی رہتی تھیں۔ وقتاً فوقتاً جب جزدان کھلتا تو اہلِ قبیلہ خاندانی عظمت کا قصیدہ دوہراتے، بزرگوں کی سر بلندی اور عظمت کے قصے یاد کئے جاتے، اور اس بستے کو احترام و عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا۔ کیونکہ وہ ایک بے بہا خاندانی سرمایہ تھا!

اس بستے کے اندر ایک اسم اعظم ایسا تھا جو اپنی ہوا سے سلطنت برطانیہ کے طلسم کرم کو کھولدیتا تھا۔ ایک کرنیل کی چٹھی تھی جس پر اُس نے اپنے خون سے دستخط کرکے اس خاندان کی وفا شعاری کی تصدیق کی تھی۔ اسکے ساتھ ایک دوسری باضابطہ سند تھی جو اس خوشنودی کا اظہار کرتی تھی کہ منشی صاحب کے والد نے کرنیل صاحب کو قاتلوں کے ہاتھ سے چھڑایا اور ڈیڑھ سو باغیوں کی سراغ رسی کرکے انھیں کیفر کردار کو پہنچانے میں گورنمنٹ کی قابل تعریف مدد کی۔

خاندان کا ہر فرد اس کو موقعہ بموقعہ دوہراتا جسے سُن کر لوگوں پر اس خاندان کی عظمت اور بڑائی کا اثر گہرا ہو جاتا اور ڈیڑھ سو بیگناہوں کے پھانسی پا جانے کا کسی کو احساس و خیال بھی نہ ہوتا۔

مختصر یہ کہ منشی صاحب کے خاندان کی عظمت اس "قوم پروری" اور "اظہار اخوت" کے صدقے میں تھی۔ منشی صاحب بے شک عزت دار آدمی تھے! وہ حقیقت میں قرن اول کے مسلمانوں کی زندہ مثال تھے! ان کا سارا کنبہ ہی نہیں بلکہ دور و نزدیک کے رشتہ دار بھی سرکاری نوکریاں پا چکے یعنی "ڈپٹی" بن چکے تھے۔ اور آفتاب علی بھی لفٹنٹ گورنر کے حکم سے براہ راست ڈپٹی کلکٹر بنا دیئے گئے تھے۔

اس کو ایک حسن اتفاق سمجھئے کہ جہاں آفتاب علی کی پہلی تعیناتی ہوئی وہاں کا کلکٹر پنشن کے دن گننے کی حد میں داخل ہو چکا تھا، اور اٹھائیس سال کی مدت میں اس کی طبیعت پر ہندوستانی آب و ہوا کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ اسلئے چلتے چلاتے وہ کسی کی برائی لینا نہ چاہتا تھا۔ اور ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اس میونسپلٹی کا سرکاری چیرمین رہ چکا تھا جس کے ایک نامزد ممبر منشی مختار علی تھے۔ اور منشی صاحب چوبیس گھنٹے میں جتنی بار "خداوند"، "ولی نعمت" اور "غریب پرور" کہنے کے عادی تھے اتنی سانسیں نہ لیتے تھے۔ اور جب منشی صاحب کے قماش کا آدمی ان لفظوں کو بولتا ہے تو ان کے معنی بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔ یعنی سرکار والا مدار نے جو ارشاد فرمایا وہی انسب و اولیٰ ہے! اور بھلا اس خانہ زاد کو مجال دم زدن ہو سکتی ہے! وغیرہ۔

اس کے جانے کے بعد جو دوسرا کلکٹر آیا اُسے کتوں کا بڑا شوق تھا۔ ڈپٹی آفتاب علی رات بھر میں کتوں کے ایسے شیدائی بن گئے کہ اگر آپ اُن کے شوق و شغف کو دیکھتے تو آنکھ بند کرکے تناسخ کے قائل ہو جاتے۔ ڈپٹی صاحب کچہری سے اُٹھتے، سیدھے صاحب کی کوٹھی پر پہنچتے، سلام بجالاتے کتوں کی تندرستی کی تعریف کرتے، مہتر سے ان کے کھانے کے متعلق سوال کرتے اور اجابت کے متعلق بھی کبھی کبھی معائنہ کر لیتے۔ پھر چند باتیں دیگر معلوم ہو جاتے کہ خوشنودی مزاج کا بیمہ کرالیا اور تنخواہ حلال ہو گئی۔

آج کا رنگ تو دوسرا ہے، لیکن کچھ دن پہلے تک ڈالی افسروں کا حق قرار پا گئی تھی۔ اگر کسی نے ڈالی پیش نہ کی تو ایک افسر اس بات کو اپنی ارادی توہین سمجھ سکتا تھا کہ وہ بے حقیقت خیال کیا گیا۔ بڑا دن آیا تو ڈپٹی صاحب نے بھی ڈالی لگائی اور کیک مٹھائی، میوے پھل پھلاری کے علاوہ ایک چوٹی دار خوان کتے کے بسکٹوں کی سجایا اور دوسرے میں کتوں کے نہلانے کا صابن رکھا۔ یہ ایک ایسا تحفہ تھا کہ صاحب کلکٹر خوش ہوئے بغیر

رہ ہی نہ سکتے تھے۔

"ویل، ڈپٹی صاحب آپ اتنا تکلیف کیوں کیا۔ —— یہ تو سچ ہے! آپ کو ہمارا کتا لوگ سے ریل لو ہے —— تھینک یو ویری مچ!"

ڈپٹی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگے۔

"غریب پرور، خانہ زاد کا بھانجا بمبئی گیا تھا۔ وہ جانتا ہے کہ غلام کو حضور کے کتوں سے بہت لو ہے۔ وہ یہ چیزیں لیتا آیا۔ حضور کے کتے بڑے وفادار ہیں —— اور آقائے نعمت وفاداری تو کتے اور انسان بھی کا جوہر ہے۔"

"آپ سچ بولتا ہے، ڈپٹی صاحب۔ لائلٹی از اے گریٹ تھینگ!"

صاحب بہادر چھٹی پر ولایت جانے لگے۔ ڈپٹی صاحب کی "سگ پرستی" (قوم پرستی کے وزن پر) کے معاوضے میں ان کو اپنے کتوں کا ولی بنا گئے۔ آفتاب علی نے کتوں کی خیریت کا تار دیا جو صاحب کو اس وقت ملا جب وہ جہاز پر سوار ہونیوالے تھے۔ صاحب کلکٹر نے شکریے کی چٹھی بھیجی تو وہ آفتاب علی کی عالی مرتبتی کا سب سے بڑا پروانہ ثابت ہوئی۔ چٹھی پڑھ کر پھولے نہ سمائے، خوشی خوشی گھر پہنچے، اور "مائی ڈیر" کے القاب کی اہمیت گھر کی عورتوں کے ذہن نشین کرنے میں پورے ڈھائی گھنٹہ صرف کر دیئے۔ دوسرے دن محلے بھر میں ہلڑ تھا کہ ڈپٹی صاحب کو صاحب کلکٹر نے "میرے پیارے" لکھا ہے۔ بعض بوڑھے اس پر چونکتا ہوئے اور ڈپٹی صاحب سے بدگماں بھی مگر وہ تھے ہی اگلے وقتوں کے لوگ!

"ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" ایک ایسی حقیقت ہے جس کے دائرے سے یہ انگریز حکام بھی خارج نہیں۔ ہر صاحب بہادر کسی نہ کسی خبط میں مبتلا اور کسی نہ کسی دھن کا دھنی ہوتا ہے۔ چنانچہ آفتاب علی کو جتنے حکام سے پالا پڑا، تقریباً سب ہی میں تھوڑی بہت سنک تھی۔ ایک صاحب بہادر کو ہندوستانی گیت جمع کرنیکا شوق تھا۔ ان کیلئے ڈپٹی صاحب بڑے بوڑھوں سے ڈھولا اور رسیا لکھتے پھرتے تھے۔ دوسرے کو پرانے ریکارڈ کی چھان بین کا خبط تھا۔ اس کے لئے ڈپٹی صاحب محافظ خانے کی گرد سے اٹے رہتے تھے۔ ایک اور آیا تو اسے پرانی کتابیں جمع کرنیکا خبط نکلا ——

آفتاب علی نے گھر کی دو چار کتابیں لیجا کر پیش کر دیں اور اپنے اسلاف کی علم دوستی کی عزت بڑھائی۔ اور پھر خطابوں اور آنریری مجسٹریٹی کے پاگلوں سے بڑی بڑی رشوتیں لیکر کتابیں نذر کرا کے بامراد کرایا۔

آفتاب علی تبدیل ہو کر ایک ضلع میں پہنچے تو اس کلکٹر کو شکار کی کھالیں جمع کر کے ولایت بھیجنے کی دھن تھی۔ اب جب دیکھو ڈپٹی صاحب موچیوں کے دروازے پر بیٹھے ہیں۔

لیکن ایک آدھ ایسا حاکم بھی ملا جسے اس قسم کا کوئی خبط نہ تھا۔ جس میں آفتاب علی کی عقل و فراست اس کے کام آسکتی، تو ڈپٹی صاحب نے اس کے گھوڑوں کے اصطبل اور مرغی خانے کی صفائی کو اپنا فرض منصبی بنا لیا۔

مختصر یہ کہ ڈپٹی صاحب انگریز حکام کو شیشے میں اتار لینے کے فن میں مشاق ہو گئے تھے۔ لیکن جب کسی نئے حاکم سے سابقہ پڑتا تو ڈپٹی صاحب کو تھوڑی سی دقت ضرور پڑتی تھی۔ اور آپ جانئے تبادلہ ہونے اور موت کے آجانیکا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ اس لئے وہ وقت بہت سخت ہوتا تھا جب ڈپٹی صاحب ایک انگریز کی کمزوری کا پتا چلا ہی پاتے ہوں کہ اس کے تبادلے کا حکم آجاتے! ہونا بھی چاہیے کہ جب آپ پتا مار کر ایک حاکم کے مزاج داں بنے ہوں۔ عین اسی وقت ایک دوسرے کو سمجھنے کی الف بے تے شروع کر دینا پڑے۔ یہ صورت، اگرچہ نہایت ہمت شکن ہوتی تھی، مگر بل بے آفتاب علی کہ کبھی ہمت نہ ہارے، اور واہ رے آفتاب علی کی قسمت کہ کبھی ناکام نہ رہے!

مگر جب مسٹر بین صاحب سے واسطہ پڑا تو ڈپٹی صاحب کے بھی حوصلے پست ہو گئے۔ مسٹر بین نہایت کھرے مزاج کا انگریز تھا۔ منصبی کاموں میں اسکے لئے ہر کام اہم اور دلچسپ تھا۔ ابکاری کا کام اتنا ہی ضروری تھا جتنا پنچایت کے سسٹم کو زندہ کرنا۔ امداد باہمی کے حساب کی دیکھ بھال اتنی ہی اہم تھی جتنی ہندو مسلم فسادات کی روک تھام۔ اس کے اندر یہ بات نہ تھی کہ کسی ایک کام سے دلچسپی ہو اور باقی نظر انداز ہو جائیں۔ وہ صحیح الفکر آدمی تھا اور قوم شناس بھی۔ باتونی اور خوشامدی انسانوں سے طبعاً نفرت کرتا تھا۔ وہ ہندوستانی جو اتوار کے دن کلکٹر، کمشنر کے سلام کو اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا جمعہ کی نماز کو، اس قابل تو ہوتے نہیں کہ ملکر کوئی سنجیدہ گفتگو کر سکیں۔ مگر چونکہ کچھ نہ کچھ بات کرنا پڑتی ہے۔ اسلئے وہ اپنے ہی بھائیوں کی غیبت ہو سکتی ہے یا پھر کسی چھوٹے موٹے اہلکار کو احسان مند بنانے کے لئے ان کی تعریف۔ مسٹر بین ایسے لوگوں کو ڈانٹ جھڑک دیتا تھا غرض وہ ایک ایسا حاکم تھا کہ خوشامدی اسکے ہاتھوں

بہت کم مراد پاتا تھا۔ اور ایسا تو کوئی ہندوستانی اس سے مطلب براری نہ کر سکتا جو "شکوہ کی" وفاداری کا سند یافتہ ہو!

ہم اگر فی بین کو بھی "خبطی وارد" کے زمرے میں رکھنا چاہتے ہیں تو وہ انگریز پرست ہندوستانیوں سے نفرت کرنا اس کا خبط تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جو شخص اپنے ساتھ سچا نہیں، وہی اپنے ملک وقوم سے غداری کر سکتا ہے اور جو اپنے ملک وقوم کا غدار ہو سکتا ہے وہ دنیا میں کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اس ذیل میں وہ برطانیہ کی غدار نواز پالیسی سے بھی بیزار تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ عام بافندے کسی نہ کسی وقت جاگیں گے۔ اسوقت یہ غدار گورنمنٹ کے ہرگز کام نہ آسکیں گے۔

ڈپٹی صاحب، فی بین کی عادت و مزاج کو دیکھ لینے کے بعد بھی اپنی کوششوں سے باز نہ آئے۔ اور سرکاری و غیر سرکاری حیلے بہانے کوٹھی کے چکر کاٹ ہی لیا کرتے تھے۔ صاحب نے پہلے تو نرمی و اخلاق سے، پھر بیرخی دکھا کر اور آخر میں دھتکار کر روکنا چاہا مگر غیرت آفتاب علی کے مسلک میں اسی طرح معدوم تھی جس طرح افلاطون کی ریپبلک میں شاعری مفقود ہے۔

کلکٹر فی بین ڈپٹی صاحب سے بدگمان تو ہو ہی گیا تھا، اس نے ان کے دفتر کا معائنہ کیا۔

آپ آفتاب علی کے متعلق جو رائے قائم کر چکے ہیں اس کے بعد یہ بتانا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ جس کا نوکری کرنیکا ڈھب آفتاب علی کا سا ہو، وہ آدمی اپنے کام پر کیا خاک حاوی ہو سکتا ہے! یہ بات بھی ظاہر ہے کہ آپ کا جو رویہ اپنے افسر کیساتھ ہوگا وہی آپ کے ماتحتوں کا آپکے ساتھ ہوگا۔ آفتاب علی کے ماتحت سرکاری کام کی پرواہ کم کرتے تھے اور ڈپٹی صاحب کو خوش کرنیکی زیادہ۔ اس سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ فی بین صاحب کے معائنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا تھا

کلکٹر صاحب نے معائنہ ختم کر کے ڈپٹی صاحب سے کہا۔

"مسٹر آفتاب علی، آپ ایک ینگ فراڈ (young fraud) ہے، کمو خشامد کے سوا کچھ کام نہیں جانتا! ہم اپنا رپورٹ میں آپ کا پروموشن روکنے کا سفارش کریگا!"

ڈپٹی صاحب نے اسے اپنی بدقسمتی سے تعبیر کیا کہ ان کے منجھے ہوئے داؤں اس انگریز پر نہ چل سکے اور ٹھیک اس وقت جب وہ "خانصاحبی" کی فکر میں تھے اور پنشن کا زمانہ بھی قریب آرہا تھا ایک اُلو انگریز پلے پڑ گیا! جیسے ہی صاحب کے منہ سے یہ لفظ نکلے، ڈپٹی صاحب کی اسلامی ٹوپی اس کے بوٹوں میں پڑی تھی اور وہ گھٹنے ٹیکے اسلامی ڈاڑھی کو آنسوؤں سے تر کرتے ہوئے گڑگڑا رہے تھے۔

"خداوند مر جاؤں گا، میرا آخری وقت ہے، چھوٹے چھوٹے بال دا لوگ ہیں، میری ڈاڑھی کا عزت حضور کے ہاتھ ہے! حضور مائی باپ ہیں۔ خدا حضور کو لاٹ کرے!"

فی بین کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا، مگر چونکہ سنجیدہ آدمی تھا ضبط کیا اور کہنے لگا۔

"مسٹر آفتاب علی آپ کو شرم آنا چاہیئے! آپ پرانا ڈپٹی کلکٹر ہے! آپکو سیلف رسپیکٹ ہونا چاہیئے! آپ کھانڈانی جنٹلمین ہے! آپ کو مین لی نیس (common sense) دکھانا چاہیئے! کام ٹھیک ہوگا تو دوسرے معائنے کا رپورٹ آف کورس اچھا ہوگا!"

اس دلشکن جواب کو سن کر آفتاب علی کو چچا مرحوم بہت یاد آئے کہ وہ آج ہوتے تو فی بین کا نعرہ ہی بند ہو جاتے۔ اُسدن سے آفتاب علی انگریزوں کی پوری قوم کو طوطا چشم یقین کرنے لگے تھے۔ اس واقعے کا ذکر انھوں نے گھر میں بھی کسی سے نہیں کیا۔ پنکھا قلی نے اگر نہ دیکھ لیا ہوتا تو ہم بھی آپ کو یہ قصہ نہ سنا سکتے۔

کلکٹر صاحب نے آفتاب علی کے کام کی سخت نگرانی شروع کر دی تو ڈپٹی صاحب نے بیماری کی چھٹی لیکر دو سال گذار دیئے۔ اور پھر بھی فی بین کا تبادلہ نہ ہوا تو فرلو کیساتھ پنشن کی درخواست دیدی۔

آجکل وہ اپنے چچا مرحوم کی گدی سنبھالے ہوئے ہیں اور ریسٹ مطالعے کا دلچسپ موضوع ہیں!

ل۔ احمد (اکبرآبادی)

ناول نویس

مرزا قلندر بیگ رحمانی آئینہ کے سامنے کھڑے ڈاڑھی میں کنگھی کر رہے تھے۔ اسمیں ذرا دیر ہو گئی۔ وہیں بیگم نے آڑے ہاتھوں لیا۔ "اے ہے ابھی تک ختم ہی نہ ہوا نگوڑا سنگھار۔ بس پڑ چکی پوری۔ روپیہ کمانا تھا کانوالا نہیر کر اٹھایا اور دھر لیا۔ آخر پرائی ملازمت ہے۔ وہ نہ پوچھیں گے۔ کیوں حضرت اتنی دیر کہاں رہے؟ پھر کیا کہو گے؟

تمہارا کیا ہے کہدو گے۔ گھر میں بیار تھیں۔ ہیضہ ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کون بتائے کہ حضرت کنگھی پٹی میں معروف تھے۔ میں کہتی ہوں تم ڈاڑھی منڈا ہی کیوں نہیں ڈالتے کہ روز روز کے جھنجھٹ سے نجات مل جائے اور پھر یہ تو آج کل کا فیشن بھی ہے"

مرزا قلندر بیگ نے بیوی کی طرف دیکھا اور مسکرا دئے۔ بولے: "تم تو ناحق بگڑ رہی ہو بیگم۔ ابھی تو نو ۹ بھی نہیں بجے۔ ہم تو ہر روز ٹھیک وقت پر دفتر پہونچ جاتے ہیں۔"

بیگم بولیں: "آج روپے مزدور مانگتا۔ سُن لیا نا! خالی ہاتھ آئے تو میں کنڈی نہیں کھولنے کی۔ پڑے باہر سر پٹکتے رہنا۔ آخر تمہیں روپے مانگنے میں شرم ہی کس بات کی ہے۔ خیرات تھوڑا ہی مانگ رہے ہو۔ تم نے مہینہ بھر لہو پانی ایک نہیں کیا۔ اُن سے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ دیکھئے ہارون صاحب۔ ناول تو لکھتا ہوں میں اور وہ چھپتا ہے آپکے نام سے۔ شہرت آپ کی ہوتی ہے اور مجھے کوئی جانتا بھی نہیں کہ کس کھیت کا بتھوا ہے۔ پھر آپ کم از کم اتنا تو کیا کیجئے کہ میری تنخواہ وقت پر دیدیا کیجئے۔"

مرزا بولے: "اجی تم دیکھو تو ہم آج کیسی کھری کھری سُناتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو روپیہ لیکر ہی آئیں گے۔"

بیگم لمحہ بھر تک خاموش رہیں پھر آہ بھر کر بولیں: "وہ تو خدا بخشے ابا میاں کو دو تین جھونپڑے چھوڑ گئے ہیں جن کے کرائے پر بھلی بُری گذر رہی ہے ورنہ تمہارے ہاتھوں اللہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔"

مرزا نے کچھ جواب نہ دیا۔ چپکے چپکے کپڑے بدلا کئے۔ اور پھر جلد جلد قدم اٹھا گھر سے نکل گئے۔ شہر کے دروازے کے باہر پہنچ کر سواریوں کیساتھ تانگے میں بیٹھ گئے۔ اور گھر سے دور ایک غیر مقام پر اُتر پڑے۔ ذرا دیر اِدھر اُدھر سرگشت کی اور پھر راہ چلتوں کی نظر بچا ایک تکئے میں جا گھسے۔ وہاں ایک پرانی چٹائی پر شطرنج کی بساط بچھی تھی۔ اور اردگرد چار پانچ کھلاڑی بیٹھے چالیں سوچنے میں منہمک تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا۔ جیسے ہی ان لوگوں نے مرزا قلندر بیگ کی صورت دیکھی بھانت بھانت کی آوازوں سے ان کی آؤ بھگت شروع کی۔

"آیئے مرزا صاحب قبلہ مزاج اقدس"

"کیوں بے پٹھے اب نکلا ہے گھر سے۔ یہاں تو راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں ہی پتھرا گئیں۔"

"اجی مرزا صاحب بیگم صاحب کا مزاج تو بخیر ہے؟"

"کیوں مرزا سنبری گھومیں"

مرزا صاحب نے آخری بات کو قابل التفات سمجھا۔ فوراً بول اُٹھے "بھئی کمال کرتے ہو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔"

اتنے میں ان کی نظر شطرنج کے مہروں پر پڑی۔ اب بھلا ان سے کہاں رہا جائے۔ "ہیں ہیں کیا کرتا ہے بے منوے کے بچے۔ وزیر کو بڑھایا تو مات ہو جائے گی۔ فیل کو چل یوں"

اگر کہیں اسوقت بیگم انھیں دیکھ لیں تو مزہ ہی آجائے۔ وہ بیچاری تو یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ اسوقت تک ان کے مصیبت کے مارے میاں نے جانے کتنے صفحے تصنیف کر لئے ہوں گے۔ اور یہ ہیں کہ اپنے جاننے پہچاننے والوں سے دور۔ ایک گمنام تکئے میں اپنے دوستوں کیساتھ مزے مزے سے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ اور خرافات بک رہے ہیں۔ کیا پُر لطف سماں بندھا ہے۔ پاس ہی سنبری گھومتی جا رہی ہے۔ اس کی کٹ کھٹ کانوں کو کیا بھلی معلوم

ہو رہی ہے۔ ایک طرف درخت میں تیتر کا پنجرا لٹکا ہے۔ تیتر کا رہ رہ کے نئے نئے ڈھنگ سے "سبحان تیری قدرت" کی رٹ لگانا۔ دل کو یاد الٰہی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر مرزا صاحب کا شطرنج کھیلنا۔ ہر دفعہ کی چال چلنے میں ایسی دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ دیکھنے والوں کے منہ سے بے اختیار واہ نکل جاتی ہے یہاں تک کہ تکیے کا کتا "شیرو" بھی ان کے کھیل کو دلچسپی سے دیکھتا معلوم ہوتا ہے۔

مرزا قلندر بیگ رحمانی شاعر بھی تھے اور ناول نویس بھی۔ مگر انھیں لکھنے پڑھنے سے سخت نفرت تھی۔ بھلا یہ سن اور پہروں کاغذ پر کیلے رہنا۔ اور لکھتے چلے جانا۔ دوبارہ سہ بارہ نقل کرنا۔ لاحول ولا قوۃ وہ سے اپنی شان کے شایاں نہ سمجھتے تھے۔ اور اس کام سے انھیں کبھی خوشی نہ ہوتی تھی۔

الغرض مرزا قلندر بیگ رحمانی ہر روز دس سے چار بجے تک اپنی تکیے میں رہتے۔ اور شطرنج گنجفہ وغیرہ کھیلا کرتے۔ چونکہ بیوی کی مختصر سی جائداد کی آمدنی ضروریات کیلئے ناکافی تھی۔ یہ اس میں اس طریق سے اضافہ کرتے تھے۔ کہ انھوں نے اپنے شہر کے مشہور اور خوش حال ناول نویسوں۔ ادیبوں اور شاعروں کی ایک فہرست بنا رکھی تھی۔ اور ان سے باقاعدہ مالی امداد لیا کرتے تھے۔ حقیقت میں ان کی کائنات ادب ان کے گدایانہ خطوط تک ہی محدود تھی۔ وہ اس فن کے استاد کامل تھے۔ اپنے خطوں میں ایسے ایسے چبھتے دار فقرے۔ ایسی ایسی تشبیہیں اور استعارے اور وہ وہ محاورے استعمال کرتے۔ کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی۔ اور اپنی بے مائگی اور خستہ حالی کو ایسے موثر اور انداز میں بیان کرتے۔ کہ پتھر سے پتھر دل بھی موم ہو جاتا ہے اور سب شاعر اور ادیب اپنے اس کم نصیب بھائی کی امداد پر آمادہ ہو جاتے۔ جب یہ مصنف پرانے ہو جاتے تو مرزا نئے نئے شکار تلاش کرتے اور گداگری کا یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔

ادھر گھر میں انھوں نے بیگم صاحب سے کہہ رکھا تھا۔ کہ ملک میں جتنے بھی ناول نویس اور شاعر ہیں۔ خود تو کچھ کرتے دھرتے نہیں۔ البتہ دوسروں سے اجرت پر لکھوا لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیتے ہیں۔ بیگم اس بات پر تعجب کیا کرتیں کہ ان کے لائق شوہر خود شہرت حاصل کرنے کیلئے اپنے نام سے کوئی چیز کیوں نہیں لکھتے۔

ایسے موقع پر مرزا متین صورت بنا کر کہا کرتے "الحمد اللہ کہ ادنیٰ درجے کے مصنفوں کی طرح ہمیں شہرت کی مطلق پروا نہیں ہے۔ ہمارا دل غنی ہے اور ہم اسی حال میں مست ہیں۔ شہرت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مصیبت نہیں۔"

غرض مرزا قلندر بیگ تھری زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں ایک ادیب بے بدل اور شاعر نکتہ سنج۔ تکیے میں قمار باز۔ اور ادیبوں اور شاعروں کے در پر بھکاری۔

ظہر کے وقت مرزا صاحب نے تکیے کے متولی سے قلم دوات مانگی اور ذیل کی عرضداشت لکھی!

"بلبلِ داستان سرائے گلشن معانی۔ رنگِ انوری و خاقانی۔ ادیب العصر فطرت نگار مخدومی جناب مولانا الیاس ہارون دام اقبالہ'

یہ بندۂ عاصی۔ ذرۂ بے مقدار۔ خاکسار۔ آب و گل بنیاد بے انتہا نادم ہے کہ بار بار جناب کے درِ دولت پر حاضر ہونا اور جناب کیلئے باعثِ زحمت ثابت ہوتا ہے اے کاش آپ میری بے مائگی اور غربت کا اندازہ کر سکتے۔ جو مجھے بار بار آپ کے کاشانۂ رحمت اور سرچشمۂ فیض سے مستفید ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ کی ذاتِ گرامی ہم ایسے بے مایہ اور نادار مگر خدمتِ زبان کا شوق اور درد رکھنے والے ادیبوں کیلئے ایسی ہی ہے جیسا ابرِ کرم فصل کیلئے۔ اخباروں میں آپ کی نسبت کی خبر پڑھ کر دل نے گوارا نہ کیا کہ میں اپنے محسن کو اس ساعتِ سعید پر مبارک باد دینے سے باز رہوں لیکن افسوس ہے کہ میں بجز اس سہرے کے جو میں شادی کے روز پیش کروں گا اور کوئی تحفہ اس موقع پر پیش نہیں کر سکتا۔ آہ استدادِ زمانہ اور گردشِ لیل و نہار نے اس درجہ پیش کر رکھا ہے۔ کہ مجھے اور میرے اہل و عیال کو۔۔۔ دو وقت پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اب ہمیں صرف موت کا سہارا ہے کہ یہ آئے تو ہمیں چین نصیب ہو۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس ۔ دعاگو

دستخط کیے۔ پتہ لکھا اور خط کو تہ کر کے لفافے میں بند کیا۔ اس کے بعد مشہور ناول نویس الیاس ہارون کے عالیشان بنگلے پر جا دھمکے۔ کوٹ سے گرد جھاڑی پگڑی کو درست کیا۔ اور نوکر کو بلا کر پروا تھا۔ دیسے میں کیا "لو میاں یہ خط صاحب کو دیدو۔ میں مخل ہونا نہیں چاہتا۔ باہر ہی جواب کا انتظار کرتا ہوں"۔

نوکر تو خط لے کر اندر گیا۔ اور مرزا صاحب خیالی پلاؤ پکانے شروع کئے۔ دیکھیں آج کیا ملتا ہے۔ بیس نہ سہی پندرہ تو مل ہی رہیں گے۔ کیا عجب مہربان ہو کر پچاس ہی دیدے۔

خادم خالی ہاتھ لوٹ آیا "سرکار نے کہلا بھیجا ہے کہ اگر آپ نے اپنی منحوس صورت دکھائی تو پولیس کے حوالے کر دوں گا"

"گداگری کرتے ہو"

نہیں صاحب بھلا دل لگی کا کیا موقع! جو انھوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کر دیا:

نہایت شکستہ دل کیساتھ وہاں سے لوٹ آئے۔ بیگم کو سُنانے کیلئے ایک قصہ تراشا اور کسی قدر مطمئن ہوگئے۔ اپنی ناکامی کا الزام ناول نویس کی بخیلی اور کم ظرفی پر نہیں دھرا۔ بلکہ اُسے اپنی عرضی کی ناموزونیت پر محمول کیا۔ کہ صحیح طریق پر استدعا نہیں کی گئی۔ بجز بہ کار کھلاڑی تھے۔ جانتے تھے اگر تیر نشانہ پر نہ بیٹھے تو اسمیں شکاری کا کیا قصور!

اب سُنئے! ادھر الیاس ہارون اپنی منسوبہ جمیلہ طلعت کی دلدہی میں معروف تھے۔ جو اپنے بھائی کے ہمراہ اپنے ہونیوالے شوہر کے دارالمطالعہ کا معائنہ کرنے آگئی تھی۔ اُس نے بھائی کو تو ایک آرام کُرسی پر بٹھایا اور خود کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ الماری سے کتابیں نکال نکال کر فرش پر ڈھیر کر دیں۔ پھر سودات کو تہ و بالا کرنے لگی۔ زیر تصنیف ناول کے اس فقرے پر رائے زنی کی جو اچانک اس کے وہاں آجانے سے ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ ایک حسین الھڑ امیرزادی تھی۔ جس سے ہر شخص نہایت ملائمت اور شفقت سے پیش آتا تھا۔ جب وہ کاغذات کی دیکھ بھال میں معروف تھی۔ تو اتفاق سے مرزا قلندر بیگ رحمانی کا نوشتہ اس کے ہاتھ آگیا۔ کھول کر پڑھنے لگی۔ پڑھ چکی۔ تو ٹھنڈا سانس لیکر بولی؟

ہے ہے بچارا مصیبت مارا۔

تم نے اُسے کیا دیا؟

" مگر ——"

" تم نے اُسے کچھ دیا بھی؟

" سنو تو —— "

نہیں میں کچھ نہیں سنوں گی۔ چلو ابھی اٹھکر اس کے ہاں چلیں۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ پچیس تم دو پچیس میں۔ بس ابھی اٹھ بیٹھو۔ آہ کیا معلوم بےچارے نے، اسوقت تک خودکشی ہی کرلی ہو۔ اٹھو بھی۔ نہیں تو مارے ہول کے رات بھر مجھے نیند نہیں آنے کی"

تھوڑی دیر میں دونوں موٹر میں بیٹھ کر مرزا قلندر بیگ کے لکھے ہوئے پتے کے مطابق اُن کے گھر پر پہنچ گئے۔ الیاس ہارون نے کاغذ کے ایک پُرزے پر اپنا نام لکھ کر ایک چھوٹی لڑکی کے ہاتھ جو باہر کھیل رہی تھی اوپر بھجوایا۔ تھوڑی دیر میں لڑکی نے آکر بیان کیا کہ مرزا صاحب خود تو گھر پر نہیں ہیں۔ لیکن بیگم صاحب کہتی ہیں۔ کہ آپ اوپر تشریف لے آئیے"

جس وقت دونوں اوپر مردانے میں پہنچ گئے۔ تو مرزا قلندر بیگ کی بیوی پردے کے پیچھے یوں گویا ہوئیں۔

" اچھا آپ ہی ہیں مولانا الیاس ہارون صاحب۔ شکر ہے۔ خدا نے میری ایک آرزو پوری تو کردی۔ میں ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتی تھی کہ الٰہی ان لوگوں سے جو میرے شوہر کا خون چوس چوس کر بڑے ناول نویس بنے پھرتے ہیں۔ کبھی منہ در منہ باتیں کرنا ——

" بیگم صاحب...."

" بس چپ رہیئے۔ میری بات سُنئے۔ مجھے اس میں کچھ اعتراض نہیں کہ میرا شوہر آپ کو ناول لکھ کر دیتا ہے جنھیں آپ اپنے نام سے چھاپ لیتے ہیں کیونکہ یہ تو آج کل کے ناول نویسوں کا دستور ہے۔

" بیگم ——"

" رونا تو اس بات کا ہے کہ آپ مہینوں اُس غریب کی مزدوری بھی دبا رکھتے ہیں۔ اور پھر اللہ رے آپکے جھوٹے وعدے۔

آج نگوڑا بنک بند ہے۔ کل ڈاکخانے میں تعطیل۔ پرسوں منی آرڈر نہیں آیا۔ اترسوں چک بک گم ہوگئی۔ آخر میں پوچھتی ہوں۔ آپ لوگ اپنا کاروبار بھی چلاتے ہیں کہ نہیں۔ ہائے خدا اسی طرح ہماری ضرورتوں کا بھی خیال کر لیا کرو۔ اور پھر مجھے تم سے ایک شکایت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ تم اُسے شام کے سات سات، آٹھ آٹھ بجے تک ٹھیرائے رکھتے ہو۔ آخر یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا —— لو وہ مرزا صاحب بھی آگئے۔

مرزا قلندر بیگ رحمانی کے چہرے پر انتہا درجے کی وحشت برس رہی تھی۔ عجب گو مگو کا عالم تھا۔ صاف صاف کہدیں تو یہ ڈر۔ کہ بیگم سُن پائیں گی تو جیتا نہ چھوڑیں گی۔ اور کہے بغیر چارہ نہیں۔ آخر انھوں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کرکے ہاتھ سے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ بڑی بی کا دماغ چل گیا ہے۔ اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگے!

" الیاس ہارون نے چلا کر کہا۔ تم ایک ہی چھٹے ہوئے بدمعاش ہو۔ میں تم سے سمجھوں گا"

جب موٹر گھر کو لوٹ رہی تھی تو الیاس ہارون نے کہا۔

" جمیلہ میں قسمیہ کہتا ہوں ——"

غلام عباس

قانون!؟

سلطانیہ قاضیہ

وہ کوڑے پر بیٹھی کھیل رہی تھی۔ سگرٹ کی پنّی پالینا اور اس سے کھیلنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا ـــــ وہ کھیلتی رہی دن چڑھا۔ مگر اس کا کھیل کچھ پھیکا پڑنے لگا۔ حالانکہ آج اس کو دو تین سگرٹ کی خالی ڈبیوں میں سے چاندی مل گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کا دل اچاٹ سا ہوتا جا رہا تھا!!

وہ وہاں سے اٹھی۔ اُسے پیٹ میں ہلکا ہلکا سا درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسکی عادی تھی۔ بغیر دھیان دیئے وہ پائی ہوئی چیزیں سمیٹ کر ایک طرف کو روانہ ہوگئی! ـــــ اور شہر کے کنارے تویلے کے پاس ایک چھوٹی سی کٹیا میں داخل ہوگئی اُس کٹیا میں جسے کٹیا کہنا بھی ظلم ہے۔ اس نے ٹوٹے ہوئے گھڑے میں سے پانی پیا۔ جو کٹیا کی ساری کائنات تھا۔ اور پھر اُس نے اپنی "چاندی" اس ٹوٹے ہوئے چولھے کے اندر رکھ دی۔ جس میں آگ برسوں سے نہیں جلی تھی اور نہ جلنے کی امید تھی۔

سورج سر پر آگیا۔ دوپہر ہوگئی۔ وہ بیتاب ہوکر ادھر اُدھر پھرنے لگی۔ نہ معلوم اس نے کتنے چکر اس پھونس کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے باہر لگائے۔ جنہیں کبھی دروازہ لگا ہوگا۔ یا لگانے کا خیال ہوگا۔ وہ سڑک پر گھوم گھوم کر واپس آگئی۔ تم کب آؤ گے بابا ـــــ ؟" .... انسان کی بہت سی آرزوؤں اور امیدوں کی طرح اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔

سورج بھی ڈھلنا شروع ہوگیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ چولھے میں سے جمع کی ہوئی چیزیں۔ مثلاً پنی۔ سگرٹوں کے ڈبے۔ رنگ برنگ کے چیتھڑے۔ ٹین کے چمکدار ڈھکنے ـــــ! یہ اس کی جمع کردہ پونجی تھی۔ اس نے سب کو نکالا دیکھا۔ وہ چونکی! ـــــ باہر کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی۔ وہ بھاگی۔ باہر آئی ـــ کچھ بھی نہ تھا!! ـــ ایک خوانچے والا پاس سے گذر گیا۔ اس کی پیٹ کی آگ اور بڑھ گئی ـــــ وہ اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پیسے تھوڑی ہی تھے۔ جو خوانچے والا پوچھتا "بی بی کیا چاہیئے!"

وہ واپس آئی۔ انتظار بڑھ گیا۔ اُس نے ایک ایک چیز چولھے میں دوبارہ سجا کر رکھ دی۔ مگر باپو کا پتہ نہ تھا! ـــــ سورج بھی معلوم ہوتا تھا کہ تھک کر سونے کو جا رہا ہے۔ وہ بھی وہاں زمین پر اپنی جمع کی ہوئی محبوب چیزوں کے پاس لیٹ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے! وہ کچھ سوچنے لگی۔ وہ ہی خوانچہ جو اس نے ابھی دیکھا تھا۔ باپو آئے گا۔ وہ ہی خوانچہ لائیگا! مٹھائی!! اور وہ گول گول لال لال کیا اس کا نام ہوتا ہے؟ ـــــ ؟ اُس کے علم نے جواب دیدیا! البتہ تصور کی آنکھیں وہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ جو پیٹ بھروں نے صرف اپنے لئے رکھا ہے:

"باپو ـــــ باپو" وہ رونے لگی۔ سوگئی یا غافل پڑی تھی۔ کون جانا؟ ـــــ

"باپو۔ باپو ـــــ روٹی ـــــ روٹی باپو" ـــــ وہ پھر رونے لگی دنیا بھی اُسے دیکھ کر غم سے کالی ہو چکی تھی۔ وہ روتے روتے تھک کر غافل ہوگئی اور سوگئی نہ معلوم کتنی دفعہ اٹھی۔ باپو کو پکارا۔ روئی اور پھر شفقت کی گود میں گر گئی۔

"کیوں رے بدمعاش" یہ ہے تیرا گھر؟ اور یہ کون ......

"منی ... منی!! اس نے آنکھیں کھولیں۔

"باپو تم آگئے؟ باپو۔ روٹی باپو .... روٹی لائے؟"

وہ کوشش کر کے اٹھی۔ جوش میں آکر اپنے باپ سے پٹ گئی جو سپاہیوں کی گرفت

میں کھڑا تھا۔

"منی!!"

"بابو! — روٹی دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔۔۔۔۔۔ تم کہہ کر گئے تھے کہ مٹھائی لاؤ گے۔ لاؤ مٹھائی۔۔۔۔۔۔۔۔ !؟"

سپاہیوں کی خونخوار نگاہوں نے اسکو اسکی رنگین دنیا کے اظہار کا موقع بھی نہ دیا۔ وہ اپنے باپ سے لپٹ گئی۔

"تلاشی لو، بے ایمان کی۔۔ نہ معلوم کیا کیا چرا رکھا ہوگا؟"

دو سپاہی بڑھے۔ وہاں انھوں نے فدوی کی کارگذاری دکھانے کے لئے ٹوٹے ہوئے دو تین مٹی کے برتنوں کو اور بھی توڑ ڈالا — چولہے میں سے پتا جھکا!! وہ بڑھے۔ گویا کسی ڈاکے کا سراغ لگانے جا رہے ہیں۔ ایک جھکا کر دیکھے اسمیں کیا ہے ۔۔۔۔۔۔ — مگر یہ سب کچھ وہ بھی تو دیکھ رہی تھی! باپ کی گود میں سے مچل کر اتری۔

"اس کو مت چھو بابو جی! — بابو جی! — اسمیں میری چاندی" ہے۔ بابو جی۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس نے چولہے کو اپنی سوکھی اور چھوٹی چھوٹی باہوں میں لیلیا۔ وہ اس پر لپٹ گئی۔

"ہٹ پرے"۔ ایک سپاہی نے ڈانٹ کر کہا۔ دوسرے سپاہی بھی اپنے قانون کے حامی ساتھی کی مدد کو بڑھے۔ "ہٹاؤ پرے"۔۔۔۔۔۔ دیکھو اسمیں کیا ہے"۔۔۔۔۔ یہ کوئی کسی ڈپٹی صاحب کی بیٹی تھوڑے ہی تھی۔ جس کے نخرے سپاہی اٹھاتے!

"اجی سرکار! اسمیں بچی نے اپنا کھیل کا گوڈر بھر رکھا ہے۔ بھلا ایک فقیر کے پاس ہو ہی کیا سکتا ہے؟"

وہ کہتا رہا۔ ایک سپاہی نے اس کمزور، فاقہ زدہ لڑکی کو اٹھا کر پھینک دیا!! باپ کی التجا اور اس کی چیخوں کے کمزور ہنگامے میں وہ چیزیں نکلیں جن کو لوگوں نے بیکار سمجھ کر اپنے گھروں سے پھینکدیا تھا!

"اسمیں تو کوئی خاص چیز نہیں نکلی!"

"ابے بتا، تو چوری کا مال کہاں رکھتا ہے؟"

"حضور میں نے آج سے پہلے چوری۔۔۔۔۔۔۔۔ کوڑے کی سختی نے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔

"اسکو تھانے لے چلو"

"میری منی، حضور اسکو بھی لیچلو۔ نہیں تو یہ مرجائے گی۔ اس کو بھی میرے ساتھ جیل میں بند کر دینا۔"

"پاگل تو نے چوری کیا ہے یا اس نے؟ ۔۔۔۔۔۔۔ قانون بے گناہوں کو قید نہیں کرتا!"

سپاہی اسکو تھانے کی طرف لیچلے۔ وہ دور تک اس کے رونے اور چیخنے کی آواز سنتا رہا۔ جو رفتہ رفتہ غائب ہوگئی۔

وہ پڑی رہی نہ معلوم کب تک — اس کے دماغ میں وہ الفاظ گونج رہے تھے۔ چوری! اور جیل "۔ باپنے چوری کی وہ جیل گیا — باپنے چوری کی! وہ جیل گیا — جیل"

بازار بھرا ہوا تھا۔ کنان بائی چیخا۔ ارے پکڑنا، پکڑنا یہ دن دھاڑے چوری —"

دو تین بہادر نان بائی کی مدد کو دوڑے۔ تندرست نوجوان نے جھٹ چور کو پکڑ لیا۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ جلدی جلدی روٹی کھانے لگی۔ مگر یہ روٹی پرائی ہوئی تھی۔ اس نئے قانونی نقطہ نگاہ سے اسکو نہیں کھانا چاہیئے۔ جبھی تو ایک نوجوان نے اس کا وہ ہاتھ جسمیں روٹی تھی مضبوطی سے پکڑا کہ وہ چوری کی روٹی نہ کھا سکے۔

"تجھے شرم نہیں آتی روٹی چرا کر کھاتی ہے!؟"

وہ حیران سب کا منہ دیکھ رہی تھی۔ چاروں طرف بھیڑ جمع ہوگئی۔

"ارے کیا ہوا؟"

"اتنی سی لڑکی نے چوری کی! — یہ خراب تربیت کا نتیجہ ہے" ماسٹر صاحب نے چھڑی گھماتے ہوئے کہا۔

"اتنی بڑی لڑکی اور ننگی؟۔ اف توبہ، ذرا شرم و لحاظ نہیں رہا — ہمارے حضور کو کس قدر ستر پوشی کا خیال تھا! — اور یہ — لاحول ولا قوۃ!!" مولوی صاحب نے نفریں اس پر جماتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوڑو بھی۔ بچی ہے۔ بھوکی ہوگی!" کوئی بولا۔

"بس صاحب۔ میں ایسے ہی لوگوں نے تو سب کو خراب کر دیا۔ اگر آج اس لڑکی کو تنبیہ نہ کی گئی، تو بس یہ سمجھ لو کہ چوری کی عادت پڑ گئی۔

"صاحب کیا معلوم پہلے کیا کیا ہو۔۔۔۔۔۔"

"نہیں چھوڑنا نہیں چاہیئے۔"
امن و امان قائم رکھنے والی پولیس بھی آگئی۔
"کیا ہے کیا ہے؟"
سب نے امن کے دعوے داروں کو حال سنایا۔ کیا کیا جائے۔ سب سوچ رہے تھے۔
وہ بولی "جیل بھیجدو" "کیا یہ جملہ بھی کوئی بم کا گولہ تھا۔؟"
"ذرا اس لڑکی کا ڈھیٹ پنا تو دیکھو!"
"ذرا سی لڑکی گز بھر کی زبان"
"حضرت۔ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ نہ معلوم کتنے گھاٹ کا پانی پی آئی ہوگی!"
"یہ تو ہم کو بھی چلا کر رکھدے" مولوی صاحب بولے
"میں تو پہلے ہی کہتا ہوں کہ اسکو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ رعایت کر کر کے تو اسکو اتنا نڈر بنا دیا ہے۔"
"بھیجدو جیل۔ جیل جائیں گی اپنی نانی کے گھر تھوڑے ہی!؟"

"اتنی چھوٹی لڑکی جیل میں قید نہیں کی جا سکتی" تھانیدار صاحب نے رحم کرتے ہوئے فرمایا۔ "اور پھر جرم بھی پہلا ——"
"حضور، پتہ تو آج ہی چلا ہے۔ مگر نہ معلوم کتنی ......"
اندر سے نوکر نے آکر تھانیدار صاحب کو کھانے کیلئے بلایا۔ تھانیدار صاحب ایک حقیر لڑکی کیلئے اپنی بھوک کو نہیں روک سکتے تھے۔ وہ حویلی میں کھانا کھانے چلے گئے۔ جسمیں رشوت کا گھی پڑنا لازمی عنصر ہے۔ جاتے ہوئے وہ سپاہیوں سے کہہ گئے۔ "پانچ بیت مار کر چھوڑ دو"
کیسے ——— !؟ یہ تو وہ ہی جانے !!!
وہ زمین پر مُردوں کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ قانون انصاف کرتا ہے! اسکو اس کے کئے کی سزا ملی تھی!!
"چل یہاں سے کبھی اور سہی!!"
"مجھے جیل بابا کے پاس کب بھجواؤگے ——— جیل!"
نہیں قانون ناانصافی نہیں کرتا! بچی کو جیل نہیں بھیجا جا سکتا۔ مگر اسکو ٹھوکریں کھانے کیلئے سڑکوں پر چھوڑ دیتا ہے! —

۴۱

ایک نہایت ضروری اعلان

ماہنامۂ ایشیا کے انتظامات کے سلسلہ میں اپریل۔ مئی۔ جون سنہ ۱۹۴۰ء نمبر (سہ ماہی) شائع نہیں کیا گیا۔ اسلئے جن اصحاب کا زرِ خریداری مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں ختم اور اپریل سنہ ۱۹۴۰ء میں شروع ہوتا ہے انکا سالِ خریداری

جولائی سنہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہوکر ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء میں ختم ہوگا

اور جن کا سالِ خریداری جنوری سنہ ۱۹۴۰ء یعنی آخری سہ ماہی نمبر سے شروع ہوتا ہے ان کی میعادِ خریداری

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہوکر جون سنہ ۱۹۴۱ء میں ختم ہوگی

یعنی ان دونوں میعادوں میں تین ماہ بڑھا دیئے گئے ہیں، اور سال ۱۲ ماہ کے بجائے ۱۵ مہینوں کا محسوب کیا گیا ہے۔ خریدار حضرات اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آئندہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

مینیجر

یہ ہے دنیا!؟

افراد

۱۔ ولایت :۔ —— بھٹہ کا چوکیدار۔ عمر چالیس سے زائد معلوم ہوتی ہے۔ دو ایک دانت گر چکے ہیں۔

۲۔ ارشاد :۔ —— بھٹہ کا مالک

۳۔ شاہد :۔ —— ارشاد کا لڑکا

۴۔ بیگم :۔ —— ولایت کی نو عمر بیوی

۵۔ عظمت :۔ —— بھٹہ کا مستری۔ نوجوان، تندرست اور خوبصورت

—— زمانہ یہی" ——

پہلا منظر

(بارہ بجے کا عمل۔ شاہد باہر کے کمرے میں بیٹھا ہوا پڑھ رہا ہے۔ دو چار کتابیں بستر پر بے ترتیبی سے کھلی پڑی ہیں، خود میز پر بیٹھا ہوا ہے۔)

شاہد : —— شیکسپیر...... ملٹن ...... اقتصادیات...

... تھک گیا میں تو۔

کیا دنیا میں اسی کی ضرورت ہے؟ یہی سب کچھ ہے؟

(کتابیں بند کر دیتا ہے۔ پھر کچھ سوچکر برابر رکھی ہوئی الماری میں سے ایک کتاب نکالتا ہے)

شاہد : —— (کھولتے ہوئے)، ہنری اسمنڈ!

(خاموشی سے پڑھتا ہے)

شاہد : —— (غصہ میں) کتاب ہے کہ شیطان کی آنت! کیسے ختم ہوگی؟ یونیورسٹی کے اجارے داروں نے تو ہمارے دماغوں کو کچھوے کی پیٹھ کی طرح مضبوط سمجھ لیا ہے۔

خدا بھلا کرے اُنکا! پھر لطف یہ کہ "پاس" کرنے کی ذمہ داری بھی کل ہمارے سر۔ کیا کیا جائے، ہمارا ہی قصور ہے!

(کتاب بند کر کے رکھتا ہے۔ اندر سے آواز آتی ہے)

آواز —— شاہد۔ شاہد

شاہد —— جی

آواز —— کھانا کھالو

شاہد —— آیا

آواز —— "آیا، آیا" خاک پڑے تمہاری اس آیا پہ۔ دس بجے سے پکارتے پکارتے یہ وقت ہوگیا۔ مگر صاحبزادے صاحب ہیں کہ سر جھکائے کتابوں پر اڑے ہوئے ہیں۔ نہ کھانے کی فکر، نہ کپڑے کی پرواہ۔ ایسا بھی کیا پڑھنا کہ گال پچک کر ہڈیاں اُبھر آئیں (پردے کے پاس آکر) آؤ، اندر آؤ بیٹا!

شاہد —— آتا ہوں، اماں!

(اٹھتا ہے۔ اُٹھنا چاہتا ہے کہ ولایت آتا ہے)

ولایت —— سرکار سلام

شاہد —— سلام

آواز —— شاہد میں تمہاری چچا کے ہاں جا رہی ہوں۔ بہن سے کھانا نکلوا کر کھا لینا۔

شاہد —— بہت اچھا

(کسی کے لوٹنے کی آواز)

شاہد ——— (ہنس کر) کہو ولایت میاں، تمہاری ننھی بیگم کا کیا حال ہے؟

ولایت ——— سرکار، تنگ کر دیا ہے۔ ادھر اُدھر آزاد پھرتی ہے۔ کچھ کہتا ہوں تو آنکھیں دکھاتی ہے۔

شاہد ——— شادی کر ہی کیوں لی؟

ولایت ——— سوچا تھا، (رُک کر) آرام سے گا بگر۔

شاہد ——— اُس کا بھی خیال کیا؟

ولایت ——— اُس کا کیا خیال؟

شاہد ——— جوان ہے!

ولایت ——— میں بھی تو کوئی ایسا بوڑھا نہیں سرکار!

شاہد ——— ہاں، دنیا میں ..... -،

(ارشاد، باہر سے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ شاہد خاموش ہو کر اندر چلا جاتا ہے)

ولایت:- سلام سرکار

ارشاد:- سلام

ارشاد:- (ولایت کو دیکھ کر) کیا ہے؟

ولایت:- بازار جا رہا ہوں۔

ارشاد:- کیوں؟

ولایت:- سودا لینے سرکار۔

ارشاد:- تو جاؤ

ولایت:- ابھی، "بیٹو" نے بتایا نہیں۔

(ارشاد، شاہد کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

ارشاد:- سینکائی شروع ہو گئی؟

ولایت:- نہیں سرکار۔

ارشاد:- کیوں؟

ولایت:- مستری کہاں آیا ہے؟

ارشاد:- کب تک آئے گا؟

ولایت:- کل تک۔

ارشاد:- بھٹے پر کون ہے؟

ولایت:- بابو جی۔

ارشاد:- چمنی کھڑی کرادی؟

ولایت:- جی۔

ارشاد:- پتھر ہو رہی ہے؟

ولایت:- جی۔

ارشاد:- کتنے پھڑ چل رہے ہیں؟

ولایت:- چار۔ ایک پھڑ پر دو سانچے کم کر دیئے ہیں۔

ارشاد:- کیوں؟

ولایت:- اینٹ کافی تیار ہو گئی ہے۔

ارشاد:- ہوں۔ (رُک کر) بھرائی شروع ہو گئی؟

ولایت:- جی۔

ارشاد:- کتنے گدھے کام کر رہے ہیں؟

ولایت:- دس

ارشاد:- کمرے بھر دئے؟

ولایت:- جی۔

ارشاد:- اور گولائی؟

ولایت:- شام تک بھر جائے گی۔

ارشاد:- کل پھنکائی لگ جانا چاہیئے۔

ولایت:- کل ضرور لگ جائے گی۔

ارشاد:- ٹھیکرا در شالی بھی بھرا دی۔

ولایت:- جی سرکار۔

ارشاد:- اور سب ٹھیک ہے۔

ولایت:- جی، بالکل

(ارشاد جیب میں سے روپیہ نکال کر ولایت کو دیتا ہے)

ارشاد:- (روپیہ دیکر) آدھ سیر گوشت۔ ایک آنے کے ٹماٹر۔ دو پیسے کے آلو۔ دو آنے کے پان اور چار پیسے کی سفید الائچیاں لیتے آنا۔ گوشت اچھا اور تازہ لانا۔ ٹماٹر دیکھ کر لینا، کل کی طرح سڑے سڑائے نہ اٹھا لانا۔ سودا ذرا دیکھ کر لایا کرو۔ جاؤ۔ سودا اور پیسے "بیٹو" کو واپس کر جانا۔

(ارشاد اندر چلا جاتا ہے)

ولایت:۔ (دہراتا ہے) آدھ سیر گوشت۔ ایک آنے کے ٹماٹر دو پیسے کے آلو۔ دو آنے کے پان اور چار پیسے کی سفید الائچیاں۔

(ولایت جاتا ہے۔ پردہ)

دوسرا منظر

(بھٹہ۔ بھنکائی لگ چکی ہے چمنیوں میں سے دھواں نکل نکل کر تمام فضا کو مکدر کر رہا ہے۔ ہر طرف کچی اینٹوں کے چٹے لگے ہوتے ہیں۔ دو بھیڑ چیل رہے ہیں۔ اور بچے سانچوں سے نکلی ہوئی کچی اینٹیں لے لے کر دھوپ میں قاعدے سے لگا رہے ہیں۔ سامنے چھپر کی بارگوں میں سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ولایت بارگ میں سے بیڑی پیتا ہوا نکلتا ہے اور دفتر کی طرف جاتا ہے)

ولایت:۔ اری کہاں گئی؟

بیگم:۔ کاٹنے کے کان کھائے ہیں۔

ولایت:۔ اری ہم کان کھا رہے ہیں

بیگم:۔ (کوٹھری سے باہر آکر، آنکھیں دکھاتے ہوئے) اکڑتے کس بل پر ہو؟

ولایت:۔ تم تو ناراض ہوگئیں۔ ذرا سنو تو سہی۔

بیگم:۔ سنوں کیا خاک!

ولایت:۔ تو ناراض ہولینا۔ میں جاتا ہوں۔

بیگم:۔ مرو بھی کہیں۔

ولایت:۔ مر جاؤں گا تو معلوم ہوگا!

بیگم:۔ کیا معلوم ہوگا؟

ولایت:۔ کچھ نہیں۔

(جاتا ہے)

ولایت:۔ (باہر آکر پکار کے) عظمت ابے او عظمت!

عظمت:۔ کیا ہے؟

ولایت:۔ میں مالک کے گھر جا رہا ہوں۔ ذرا بھٹے کا خیال رکھنا۔ بابو جی آج نہیں آئیں گے۔

عظمت:۔ (بھٹے سے اتر کر قریب آکر) کیوں؟

ولایت:۔ کسی کام سے کچہری گئے ہیں

عظمت:۔ اچھا۔

(ولایت جاتا ہے۔ عظمت بھی بھٹے کا رخ کرتا ہے۔ بیگم باہر نکلتی ہے ولایت کو دیکھتی ہے)

بیگم:۔ دور نکل گیا (پکارتی ہے) عظمت عظمت!

عظمت:۔ (مڑ کر دیکھتے ہوئے) کیا ہے؟

بیگم:۔ ذرا دو لکڑی کے ٹکڑے دیجاؤ۔

عظمت:۔ اچھا۔

(بیگم اپنی کوٹھری میں چلی جاتی ہے)

بیگم:۔ (تھوڑی دیر بعد) آیا نہیں۔

عظمت:۔ (دروازے سے) لکڑی لو۔

بیگم:۔ اندر چلے آؤ۔

عظمت:۔ (ہنسکر) کیوں؟

بیگم:۔ ہاں رہنے دو۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ کہیں مہندی نہ چھٹ جائے

عظمت:۔ مہندی ابھی لگی ہی کہاں ہے!

بیگم:۔ تو لگ جائے گی۔

عظمت (اندر آکر) دو سال تو ہوگئے۔ اس طرح

بیگم:۔ بڑی جلدی ہے؟

عظمت:۔ ہاں۔ دنیا میں ـــ

بیگم:۔ رہنے دو۔ میں سمجھ گئی۔ بیٹھ جاؤ۔

عظمت:۔ کیا بیٹھوں؟ ـــ ایسے!

بیگم:۔ پھر کیسے بیٹھنا چاہتے ہو؟

عظمت:۔ بے خوف ہوکر!

بیگم:۔ تم نہیں بیٹھ سکتے۔

عظمت:۔ کیوں؟

بیگم:۔ تم مرد نہیں!

عظمت:۔ (غصہ میں) کیسے؟

بیگم:۔ تم پوچھ رہے ہو، یہ! یاد کرو!!

عظمت :- سمجھ گیا۔
بیگم :- تو پھر کرڈالو۔
عظمت :- مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے ؟
بیگم :- بڑی آسانی سے ۔
عظمت :- تمہیں افسوس تو نہیں ہوگا ؟
بیگم :- بالکل نہیں !
عظمت :- یہ کیسے مان لیا جائے ؟
بیگم :- دنیا کے ماں باپ ، روپیہ کیلئے اپنی جوان لڑکی کا بیاہ ایک بوڑھے سے کردیتے ہیں ۔ انھیں افسوس ہوتا ہے ؟ ہرگز نہیں ! تو کیا ایک جوان عورت ، اپنی زندگی ، اور جوانی کی خوشیوں کے لئے اپنے بوڑھے مرد کو مرنے نہیں دیکھ سکتی ؟ (بھوکی شیرنی کی طرح)
——— ! دنیا میں انسان نفع چاہتا ہے ۔ میرے ماں باپ نے اپنے نفع کیلئے میری شادی کردی ۔ اس ایک مٹی کے پتلے کے ساتھ ، جو زندگی کی گرم ہوا کھاتے کھاتے جھلس کر خشک ہوگیا ہے ! سوکھ چکا ہے ! جس سے مجھے کوئی نفع نہیں ۔ دنیا میں کھالینا اور کپڑا پہن لینا ہی سب کچھ نہیں — میں نفع -- - نیں خوشی ..... زندگی میں نفع اور خوشی چاہتی ہوں ! — پورا نفع ! — پوری خوشی !!
عظمت :- میں تیار ہوں !
بیگم :- (خوش ہوکر ، اچھا تو میں تمہیں ایسی ترکیب بتاتی ہوں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ! سنو ....
(عظمت کے کان میں کچھ کہتی ہے)
عظمت :- (خوش ہوکر) ہوں ۔ ٹھیک ہے !
بیگم :- تو سب ٹھیک کرلو۔
عظمت :- بے فکر رہو ۔
(جاتا ہے)
بیگم :- (سوچ کر ، عورتیں ایسا نہیں کرتیں ۔ پاگل — بیوقوف ہیں وہ ! مجھے ایسا کرنا ہے ۔ میں ضرور ایسا کروں گی ۔ مجھے دنیا میں -- - دنیا میں زندہ رہ کر ، دنیا والوں کی آنکھیں کھولنا ہیں !
(چولھا روشن کرتی ہے ۔ پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(رات کے دس بجے ہیں ۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے ۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے ۔ دور سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آرہی ہیں ۔ ولایت اور بیگم اپنی کوٹھری میں بند لحاف میں سمٹے سمٹائے پڑے ہیں ۔ مٹی کا دیا تاریک کوٹھری کو روشن کر رہا ہے ۔ بیگم اٹھتی ہے ۔)
بیگم :- کیا سوگئے ؟
ولایت :- کیا ہے ؟
بیگم :- مجھے سردی لگ رہی ہے ۔
ولایت :- تو میں کیا کروں ؟
بیگم :- ذرا آگ جلادو ۔
ولایت :- کیوں ؟
بیگم :- چائے بناؤں گی ۔
ولایت :- چولہے میں آگ بھی چھوڑی تھی ؟
بیگم :- ہاں دبا تو دی تھی
(اٹھ کر چولہے کے پاس جاتا ہے ۔ آگ کریدکرید کر دیکھتا ہے)
ولایت :- اس میں تو کچھ بھی نہیں ۔ دیا سلائی ہے ؟
بیگم :- دیا سلائی تو نہیں ہے ۔
ولایت :- پھر آگ کیسے جلے ؟
بیگم :- دیا سلائی لے آؤ
ولایت :- اسوقت
بیگم :- کیا ہوا ! عظمت سے لے آؤ اس کے پاس ہوگی ۔
ولایت :- اچھا ذرا اپنی چادر دیدو ۔
بیگم :- لو ۔
ولایت :- آج تو بڑی مہربانی ہوئی
بیگم :- میں تو جان ----
ولایت :- (خوش ہوکر) بس زیادہ خوشامد نہ کرو ۔ یہ کافی ہے ، میں جاتا ہوں ۔
(جاتا ہے)

بیگم:- جاؤ، دور نکل جانے پر، واپس نہ آنا!

(ولایت دفتر سے نکل کر بھٹہ کے اوپر آتا ہے۔ عظمت اپنی جھونپڑی میں سے پکارتا ہے)

عظمت:- کون؟

ولایت:- میں ہوں عظمت!

عظمت:- ولایت۔

ولایت:- ہاں۔

عظمت:- ذرا سامنے والی مہری میں کوئلہ ڈال دینا۔ میں جا ہی رہا تھا۔ تم اچھے آگئے۔

ولایت:- اچھا۔

(ولایت "موہری" کے پاس جاتا ہے۔ ڈھلیا سے کوئلہ لیکر آگے بڑھتے ہی دھڑام سے "موہری" میں گرتا ہے)

ولایت:- (گرتے ہوئے، بڑے زور سے) بچاؤ، بچاؤ۔ میں جلا!

(رات کی خاموشی میں آواز کی گونج کیساتھ "موہری" سے شعلے بلند ہو کر غائب ہو جاتے ہیں۔ گیدڑوں کی آوازیں خاموش فضا کا سینہ چیرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ بیگم دفتر سے نکل کر بھٹے کے اوپر آتی ہے، عظمت باہر آتا ہے)

عظمت:- تم آگئیں

بیگم:- ہاں۔ کام ہوگیا؟

عظمت:- (ٹھنڈی سانس بھر کے) ہاں۔

بیگم:- افسوس ہے؟

عظمت:- نہیں دنیا میں اور ہوتا ہی کیا ہے!

(دونوں چپ چاپ جھونپڑی میں چلے جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

ا۔ ح۔ پروانہ بریلوی

وداعِ آخر

مترجمہ:۔ محمد جمیل احمد۔ بی۔اے، بریلوی

اسٹیفان زویگ کا یہ مشہور و معروف ادبی کارنامہ جس کی پہلی قسط ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے ایشیا میں مسلسل شائع کیا جائے گا۔ کارکنانِ ادبی مرکز کا یہ بھی ارادہ ہے کہ ایشیا میں شائع ہوچکنے کے بعد اس لازوال سرمایۂ ادب کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائیگا۔

(ایڈیٹر)

(وداعِ آخر جرمنی کے ایک زبردست ناول نگار اسٹیفان زویگ (Stefan Zweig) کے ایک افسانوی شاہکار کا ترجمہ ہے جو ایک غیر معروف خاتون کا اپنے محبوب کے نام مکتوب ہے۔ مکتوب جو زندگی کے آخری لمحات میں لکھا گیا ہے۔ جب اس کا اکلوتا بچہ، اس کی زندگی کا آخری تنہا سہارا، تنہا امید، اس کے سامنے مردہ پڑا ہے۔ یہ ایک کارنامہ ہے افسانوی نثر کا، ادبی حسن تخلیق کا، تحلیل نفسیاتی کا۔ جذبات کے استغفار کا، ایک جاں سوز، غم نصیب، نامراد جذبۂ عشق میں ——— ہاں اسی لافانی، پرشوکت، ابدی جذبۂ امید میں، یہ ایک مثال ہوا اس امر کی کہ عشق انسان کو کیا بنا دیتا ہے۔ نیک یا بد؟ اشرف یا ارذل؟ اعلیٰ یا ادنیٰ؟ فرشتہ یا شیطان؟ شاید دونوں اور ان دونوں سے بھی کچھ برتر اور بلند تر، ہاں شاید عشق انسان کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے، اس افسانہ کی ہیروئن ——— وہ فنا ہونیوالی، نہ محو کی جاسکنے والی غیر معروف اجنبی خاتون ——— اپنی انانیت، اپنی زندگی، اپنی ہستی ——— اور شاید اپنی روح بھی ——— اپنا سب کچھ ایک حیات سوز جذبہ میں گم کرچکی ہے۔ کھوچکی ہے۔ اسکی ہستی سرود محبت ہے اور مکتوب ——— اپنے محبوب کے نام، شراب کی طرح بے فکر و سرشار، رفیق کی طرح عشرت اندوز و نشاط آور، خمار بادہ کی طرح چھاجانیوالے وفا ناآشنا محبوب کے نام یہ مکتوب" یہ پہلا و آخری مکتوب اس ہلاک کا پہلا و آخری جانسوز نغمہ ہے۔ رگ و ریشہ میں پیوست ہوجانیوالا، رگ۔ ریشہ پر چھا جانیوالا نغمہ مایوس، غمگیں، محزوں۔ محبت کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں۔ اور محبت کے بعد وہ پروا نہیں کرتی کرکیا ہے، ملحد، مرتد، کافر؟ آوارہ، بے عصمت، زن شوفروش؟ محبت کے بعد وہ پروا نہیں کرتی کرکیا ہے: اخلاق۔ عزت نفس۔ مذہب، وہ کسی کی بھی معتقد نہیں ہے، وہ کسی سے بھی واقف نہیں ہے، ہر چیز، ہر جذبہ، ہر احساس عشق میں فنا ہوچکا ہے، جذب ہوچکا ہے، وہ جذبات، ہاں حرن گشتہ جذبات کا ایک مایوس مجسمہ ہے، احساس و شاعری کی ایک حسین مگر المناک ہیکل ہے، دکھے ہوئے قلب و جگر کی پکار ہے۔ شکست دل کی آواز ہے؛ عشق اس کی زندگی کا آغاز و انجام ہے؛ وہ خود عشق ہے، انسانی جامہ میں عشق محض!۔ بدبخت، بدنصیب، غمگین، ناشاد ——— اور شاید، شاید اسی لئے لایموت، لافانی، لازوال۔)

جمیل

وداعِ آخر

مشہور ناول نگار ر[1] حیثیت ایک مختصر تعطیل میں پہاڑ گیا ہوا تھا۔ علی الصبح وہ آتشا پہونچکر اس نے اسٹیشن سے ایک اخبار خریدا اور جب اس کی نظر تاریخ پر پڑی تو

---

[1] اصل کتاب میں ہیرو کا نام (R.) ہے۔ میں نے اسکا رحیق کردیا ہے اور اس نام میں کردار سے مناسبت بھی مدنظر ہے۔ ج۔

اسکو یاد آیا کہ یہ اس کی سالگرہ کا دن ہے۔

"اکتالیسویں ______" بجلی کی طرح یہ خیال اس کے دماغ میں آیا۔ مگر اس بات پر نہ اس کو کوئی خوشی ہوئی نہ غم۔ اس نے ایک گاڑی والے کو بلایا اور اسمیں سوار ہو کر گھر کو روانہ ہو گیا۔ اس کے ملازم نے اسکو بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں چند ملاقاتی آئے تھے اور کئی اشخاص نے ٹیلیفون بھی کئے تھے۔ علاوہ ازیں خطوط کا ایک پلندہ بھی اس کے انتظار میں پڑا تھا۔ اس نے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی، اور دو چار خطوط چن لئے۔ بھیجنے والوں سے اسے دلچسپی تھی۔ کھولے مگر ایک بھاری لفافہ جو ایک غیر معروف رسم الخط میں لکھا ہے اسوقت بغیر کھولے ہوئے الگ رکھ دیا۔ آرام کرسی پر بیٹھ کر اس نے صبح کی چار پی، اخبار دیکھا۔ کچھ سرسری پڑھا اور پھر بقیہ خط کی طرف متوجہ ہوا۔

اس پر بہ نسبت خط کے مسودہ کا زیادہ گمان ہوتا تھا جو نسوانی رسم الخط میں تیزی سے لکھے ہوئے چند درجن صفحات پر مشتمل تھا۔ اس نے غیر اختیاری طور پر لفافہ پر پھر نظر ڈالی۔ کہ شاید اس کے جاننے والے کا کوئی خط یا پرچہ اس میں شامل ہو جو اس کی نظر سے محو ہو گیا ہو، مگر اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی، نہ دستخط تھے اور نہ لفافہ پر نہ خط میں کہیں بھیجنے والے کا پتہ۔ "عجیب بات" اسے خیال ہوا۔ جب اس نے خط پڑھنا شروع کیا۔ شروع میں یہ الفاظ تحریر تھے "آپ کو جنھوں نے مجھے کبھی نہیں پہچانا" وہ پریشان سا ہوا۔ کیا خط اس کو لکھا گیا تھا یا کسی فرضی ہستی کو؟ ان باتوں سے اس کو خط میں ایک دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس نے پڑھنا شروع کیا۔

"میرا لڑکا کل مر گیا۔ اس کمزور و نحیف زندگی کیلئے میں تین دن اور تین رات موت سے جنگ آزما رہی ہوں۔ متواتر چالیس گھنٹوں تک جبکہ اس کا جلتا ہوا کمزور جسم انفلوئنزا کے بخار سے دہک رہا تھا میں اس کے بستر کے قریب بیٹھی رہی۔ میں دن اور رات، رات اور دن اسکے سر پر ٹھنڈے پھاہے رکھتی رہی میں نے اس کے چھوٹے کانپتے ہوئے ہاتھ پکڑ لئے تھے۔ تیسری شام کو میری طاقت نے جواب دیا۔ میری لاعلمی میں میری آنکھیں مچ گئیں۔ اور میں اسٹول پر تین چار گھنٹے سوئی ہوں گی۔ اس درمیان میں موت اسکو مجھ سے چھین کر لیگئی۔ میرا پیارا بچہ اپنی تنگ چارپائی پر وہ لیٹا ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ مرا تھا، صرف اس کی آنکھیں بند ہو گئی ہیں، سنجیدہ گہری آنکھیں۔ اور اس کے ہاتھ اس کے سینے پر رکھے ہیں۔ چار شمعیں جل رہی ہیں۔ بستر کے ہر کنارے پر ایک۔ میں دیکھ نہیں سکتی۔ میں ہل نہیں سکتی۔ چونکہ جب ان شمعوں کی لو ہلتی ہے اس کے چہرے اور بند ہونٹوں پر سائے ایک دوسرے کے تعقب میں تیزی سے دوڑتے ہیں، معلوم ہوتا ہے اس کے اعضا متحرک ہیں اور مجھے دھوکا ہونے لگتا ہے کہ اس سب کے بعد بھی وہ مرا نہیں ہے۔ وہ جاگ اٹھے گا اور اپنی صاف آواز میں کوئی طفلانہ محبت آمیز بات کہے گا۔ مگر میں جانتی ہوں کہ وہ مر چکا ہے۔ میں اسے پھر نہیں دیکھوں گا، ایک دفعہ پھر امید پیدا کرنے کیلئے ایک دفعہ پھر مایوس ہو جانے کے لئے۔ میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں میرا بچہ کل مر گیا۔ اور اب دنیا میں میرے صرف آپ ہی ایک باقی رہ گئے ہیں۔ آپ جو بغیر کسی خیال کے آدمیوں اور چیزوں سے کھیل کر عشرت میں اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔

میں نے ایک پانچویں شمع جلائی ہے اور میز پر بیٹھی ہوئی آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میں تنہا اپنے مردہ بچے کے پاس کسی دوسرے سے اپنے دل کا حال کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور اس منحوس ساعت میں یہ آپکے سوا اور کس سے کہہ سکتی ہوں۔ آپ جو میرے لئے سب کچھ رہے ہیں اور ہیں۔ شاید میں آپ پر اپنا مطلب اچھی طرح واضح نہ کر سکوں، میرے سر میں بہت گرانی ہے۔ میری کنپٹیاں دکھ رہی ہیں، میرے اعضا میں درد ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں بھی بخار میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ انفلوئنزا اس حصہ میں پھیلا ہوا ہے اور غالباً مجھے شروع ہو گیا ہے۔ مجھے غم نہیں ہوگا اگر اس طرح زندگی گذارنے کی بجائے میں اس طریقہ سے اپنے بچے سے جا کر مل سکوں۔ کبھی کبھی میری آنکھوں کے سامنے بالکل تاریکی چھا جاتی ہے اور شاید میں اس خط کو ختم کرنے کے قابل نہ رہ سکوں۔ مگر میں اپنی تمام طاقت کے ساتھ یہ کوشش کروں گی کہ اسوقت اور صرف اس وقت اپنا حال بیان کر سکوں میرے محبوب آپ سے، جو مجھے نہیں جانتے۔

نہ صرف آپ سے مخاطب ہونا چاہتی ہوں تاکہ آپ کو پہلی دفعہ سب کچھ بتا سکوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ میری پوری زندگی سے واقف ہو جائیں۔ میری زندگی سے جو ہمیشہ آپ کی رہی اور جس کی بابت آپ کچھ نہیں جانتے۔ مگر آپ پر میرا راز اسوقت ظاہر ہوگا جب میں مر چکی ہوں گی، جب اس دنیا میں وہ ہستی نہ ہوگی جسے آپ کو جواب دینا ہے، آپ اسے صرف جان سکیں گے وہ اس صورت میں کہ وہ شے جو میرے اعضا کو حرارت اور برودت سے ہلا رہی ہے واقعی میری موت ثابت ہو، اگر مجھے زندہ رہنا پڑا تو میں یہ مکتوب پھاڑ کر پھینک دونگی اور خاموش رہوں گی۔ جیسے کہ میں ہمیشہ خاموش رہی ہوں۔ اگر کبھی یہ خط آپکے

ہاتھ میں پہونچے تو آپ سمجھ لیں کہ ایک مردہ عورت آپکو اپنا فسانۂ حیات سنا رہی ہے، اس حیات کا فسانہ جو شروع سے ہوش کے آخری لمحہ تک صرف آپکی تھی۔ آپ کو میرے الفاظ سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ ایک مری ہوئی عورت کچھ نہیں چاہتی۔ تلطف، نہ تراحم، نہ تسلی، میری صرف آپ سے ایک التجا ہے کہ آپ اس بیان کا ایک ایک لفظ سچا تسلیم کرلیں جس کا اکتشاف درد دل کے ہاتھوں میں آپسے کر رہی ہوں میرے لفظوں کا یقین کیجئے کیونکہ اب میں آپسے اور کچھ نہیں چاہتی۔ ایک ماں اپنے اکلوتے بچے کے جنازے پر بیٹھ کر جھوٹ نہیں بولے گی۔

میں آپ کو اپنی پوری روئداد حیات سنانا چاہتی ہوں، وہ روئداد حیات جو در اصل اس دن سے پہلے جب میں نے آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا شروع ہی نہیں ہوتی، اس دن سے پیشتر کا تصور ایک پریشان اور دھندلا سا تصور ہے۔ ایک ایسے کمرے کی سی یاد جو خاک و دھول سے اٹا ہوا اور جہاں کی چیزوں اور لوگوں پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہو، ———— ایک ایسی جگہ جس سے میرے دل کو کوئی تعلق نہیں۔ جب آپ میری زندگی میں آئے میں تیرہ برس کی تھی۔ اور میں اس عمارت میں رہتی تھی جس میں آج آپ رہتے ہیں۔ اسی عمارت میں جسمیں آپ اسوقت یہ خط پڑھ رہے ہیں جو میری زندگی کا آخری سانس ہے۔ میں اسی منزل میں رہتی تھی۔ چونکہ میرے گھر کا دروازہ آپکے گھر کے سامنے تھا۔ آپ ہم لوگوں کو یقیناً بھول چکے ہوں گے۔ آپ عرصے سے اکاؤنٹنٹ کی مغموم بیوہ اور چھوٹی کمزور لڑکی کو فراموش کر چکے ہوں گے۔ ہم لوگ ہمیشہ سے الگ خاموش زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم پر تکلف شرافت کا نمونہ بن گئے تھے۔ شاید ہی آپنے کبھی ہمارا نام سنا ہو۔ چونکہ مکان کے سامنے کے دروازہ پر کوئی پلیٹ نہ تھی اور نہ کوئی ہم سے ملنے کو آتا تھا اسکے علاوہ اس بات کو بہت عرصہ گذر چکا ہے۔ تقریباً پندرہ، سولہ برس ناممکن ہے کہ آپ کو باتیں یاد ہوں۔ مگر مجھے ہر ہر بات کس قدر صاف یاد ہے وہ دن، وہ ساعت جب میں نے پہلی مرتبہ آپ کو دیکھا مجھے اس طرح یاد ہے گویا یہ سب کچھ ابھی ہوا ہے، اس کے خلاف ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ خصوصاً جب مجھے اس بات کا احساس ہو کہ دنیا میرے لئے اسوقت سے شروع ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے اور مجھے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دینے دیجئے۔ تھوڑی دیر، آپ ان حالات کو سننے سے نہ تھکیں۔ چونکہ میں زندگی بھر آپ کو محبت کرنے سے نہیں تھکی ہوں۔

آپکے آنے سے پیشتر جو لوگ آپکے حصۂ مکان میں رہتے تھے وہ قابل نفرت لوگ تھے۔ وہ ہر وقت روتے رہتے تھے۔ اگرچہ وہ خود درجہ غریب تھے مگر وہ ہم سے ہماری غربت کی وجہ سے نفرت کرتے تھے۔ چونکہ ہم ان سے علیحدہ رہتے تھے۔ وہ شخص شراب پیتا تھا اور اپنی بیوی کو مارتا تھا۔ اکثر رات کو ہم لوگ کرسیوں کے گرنے اور رکابیوں کے ٹوٹنے کی آواز سے جاگ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ جب اسنے اپنی بیوی کو اتنا مارا کہ خون بہنے لگا اور وہ سر کے کھلے ہوئے پریشان بالوں کے ساتھ بھاگ کر باہر آئی اور اس کا شوہر شراب کے نشہ میں اسکو برا بھلا کہتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا تو تمام لوگ زینہ کے آس پاس جمع ہوگئے اور پولیس کو بلانے کی دھمکی دی میری والدہ ان لوگوں سے کچھ تعلق نہ رکھتی تھی۔ اس نے مجھے ان بچوں کیساتھ کھیلنے سے منع کیا تھا اور وہ بچے ہمیشہ مجھے برا بھلا کہتے جب میں ان کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیتی۔ جب وہ سڑک پر ملتے تو مجھے گالیاں دیتے اور ایک دفعہ انھوں نے برف کی ایک گیند بنا کر میرے کھینچ کر ماری جو اتنی سخت تھی کہ میرے ماتھے کی کھال پھٹ گئی۔ گھر میں ہر شخص ان سے متنفر تھا اور ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا جب کسی خاص وجہ سے ان لوگوں کو وہ مکان چھوڑنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ وہ شخص چوری میں پکڑا گیا تھا۔ کچھ عرصہ تک مکان کے خاص دروازہ پر کرایہ کیلئے خالی ہے" کا نوٹس لگا رہا پھر وہ اتار لیا گیا۔ اور منتظم نے ہمیں بتایا کہ مکان ایک مصنف نے جو غیر شادی شدہ ہے کرایہ پر لیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ امید ہے۔ وہ دوسروں کے لئے باعث تکلیف نہ ہوگا۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے آپکا نام سنا۔ چند دنوں کے بعد کمرے اچھی طرح سے صاف کئے گئے اور رنگ کرنیوالے اور سجانیوالے آئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے بہت شور مچایا مگر میری ماں خوش تھی کیونکہ اس نے کہا کہ اب برابر والے گھر میں شور نہیں مچا کرے گا۔ نقل و حرکت کے اس دوران میں میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ آرائش اور سامان کی ترتیب کا کام آپکے ملازم کی نگرانی میں پورا ہوا۔ جس کے چھوٹے سفید بال تھے۔ برتاؤ نہایت سنجیدہ تھا اور جو ظاہرا عمدہ گھرانوں میں ملازم رہ چکا تھا۔ وہ نہایت قاعدہ سے ہر چیز کو ترتیب دے رہا تھا اور اس نے ہم کو بہت متاثر کیا۔ شہر کے نواح میں واقع شدہ ہمارے مکانوں میں ایسے اعلیٰ نجی ملازم کی موجودگی ایک غیر معمولی بات تھی۔ علاوہ ازیں وہ بہت زیادہ شائستہ تھا اور دوسرے ملازموں سے ملکر اپنا وقت بیکار نہیں گذارتا تھا۔ وہ شروع ہی سے میری والدہ کیساتھ ادب سے پیش آیا اور وہ ہمیشہ چھوٹے بچوں تک کیساتھ مہربانی سے پیش آتا تھا۔ وہ جب کبھی آپ کا نام لیتا تو اس طرح کہ معلوم ہوتا کہ اس کے جذبات آپ کے متعلق ایسے ہیں گویا آپ اس کے

خاندان سے مرتی ہیں۔ میں اس بنا پر مسٹر جان سے محبت کرنے لگی۔ حالانکہ ساتھ ہی ساتھ میں اس سے رشک بھی کرتی تھی۔ چونکہ اس کو میری بہ نسبت یہ حق حاصل تھا کہ وہ ہر وقت آپ کو دیکھے اور آپ کی خدمت کرے۔ آپ جانتے ہیں میں آپ کو یہ معمولی معمولی باتیں کیوں بتا رہی ہوں؟ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ کس طرح شروع ہی سے آپ کی شخصیت کا مجھ پر اس قدر اثر چھا گیا جب کہ میں محض ایک چھوٹی شرمیلی لڑکی تھی اس سے پہلے کہ میں نے آپ کو واقعی دیکھا۔ میرے تصور میں آپ کے چہرے کے چاروں طرف ایک نورانی حلقہ تھا۔ آپ دولت، حیرت و اسرار کے ماحول میں چھپے ہوئے تھے۔ لوگ جن کی زندگیاں تنگ ہوتی ہیں، کسی نئی تبدیلی کے خواہشمند ہوتے ہیں اور نواح شہر کے اس مکان میں ہم آپ کا بیقراری سے انتظار کر رہے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میرا شوق انتظار نقطۂ حرارت تک پہنچ گیا تھا۔ سہ پہر کو اسکول سے واپس آکر میں نے فرنیچر کی گاڑی کو آپ کے دروازے پر کھڑا پایا تمام وزنی چیزیں اوپر پہنچا دی گئی تھیں۔ اور فرنیچر اٹھانیو الے اب چھوٹی چھوٹی چیزیں پہنچا رہے تھے میں دروازہ پر کھڑی ہوئی دیکھتی رہی، اور دل ہی دل میں تعریف کرتی رہی۔ چونکہ ہر وہ چیز جس کا آپ سے تعلق تھا کچھ ان چیزوں سے مختلف تھی جن کی میں عادی تھی۔ انہیں پتھر کے تراشیدہ ہندوستانی مجسمے تھے، املی کے تراشیدہ بت تھے اور بہت ہی چمکدار رنگین تصویریں تھیں۔ سب سے آخر میں کتابیں آئیں۔ عمدہ کتابیں اور میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ دروازہ کے قریب ان کا ڈھیر لگا یا گیا۔ ملازم وہاں مستعدی سے کھڑا ہوا کتابوں کی گرد جھاڑ رہا ہے۔ میں حریص نگاہوں سے کتابوں کی ڈھیر کو دیکھ رہی تھی جو برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ آپ کے ملازم نے مجھے وہاں سے نہیں ہٹایا۔ مگر اس نے میری حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔ اس لئے میں ان کتابوں کے چھونے سے جھجک رہی تھی۔ حالانکہ میں ان کی نرم چرمی جلد پر ہاتھ پھیرنے کی خواہشمند تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے کچھ کتابوں کے نام دیکھے۔ ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی اور فرانسیسی زبان میں تھیں۔ اور کچھ اور دوسری زبانوں میں تھیں جن کا میں ایک لفظ بھی نہیں جانتی تھی۔ میں وہاں گھنٹوں کھڑی دیکھتی رہتی مگر میری ماں نے مجھے آواز دی اور مجھے اندر جانا پڑا۔ اس دن شام کو میں آپ کا خیال کرتی رہی۔ حالانکہ ابھی تک میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ میرے پاس صرف تقریباً ایک درجن سستی کتابیں تھیں۔ جن پر دفتی کی جلد تھی۔ مجھے دنیا میں ہر چیز سے زیادہ ان کی محبت تھی۔ اور میں ان کو اکثر دو دو دفعہ پڑھتی۔ مجھے تعجب تھا کہ آخر وہ کیسا آدمی ہوگا جس کے پاس اسقدر زیادہ کتابیں ہیں جس نے اتنا کچھ پڑھا ہے۔ جو اتنی زبانیں جانتا ہے جو دولتمند اور ساتھ ہی ساتھ اس قدر قابل ہے۔ ان کتابوں کے خیال نے میرے دل میں آپ کی ایک پراسرار اور مافوق الفطرت محبت پیدا کردی۔ میں نے اپنے دماغ میں آپ کا تصور قائم کرنا چاہا۔ آپ ایک بوڑھے آدمی ہوں گے۔ اور ہمارے جغرافیہ کے استاد کی طرح عینک لگاتے ہوں گے اور آپ کے بھی سفید داڑھی ہوگی۔ مگر ان سے بہت زیادہ رحمدل۔ زیادہ نفاست پسند اور زیادہ مہربان ہوں گے۔ نہ معلوم کیوں مجھے یقین تھا کہ آپ خوبصورت ہوں گے۔

چونکہ میرا خیال تھا کہ آپ ایک مسن آدمی ہوں گے۔ اسی رات کو میں نے پہلی مرتبہ آپ کو خواب میں دیکھا۔ دوسرے دن آپ مکان میں اٹھ آئے لیکن باوجود یکہ آپ کی منتظر تھی۔ میں آپ کے چہرے کی جھلک نہ دیکھ سکی اور اس ناکامی نے میری آتش شوق کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ آخر کار تیسرے دن میں نے آپ کو دیکھا۔ مگر میں کس قدر متعجب ہوئی جب میں نے آپ کو اپنے طفلانہ تصور کے قائم کردہ ایک بوڑھے دینی باپ سے بالکل مختلف پایا۔ ایک عینک لگاتے ہوا بوڑھا نیک طینت شخص! ——— یہ تھا وہ آدمی جس کی میں متوقع تھی۔ اور آپ تھے اس شکل و شباہت کیساتھ جیسے کہ آپ اب بھی ہیں۔ چونکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر اشد اور زمانہ کا اثر نہیں ہوتا۔ ہلکے بھورے چار خانے کا ایک خوبصورت سوٹ آپ پہنے ہوئے تھے۔ اور لڑکوں کی سی صورت اور تیزی کیساتھ جو آپ کی تمام حرکات میں نمایاں ہو ایک ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ہیٹ تھا اس لئے میں ایک غیر قابلِ بیان جذبۂ تحیر و ستایش کے ساتھ آپ کا درخشندہ و شگفتہ چہرہ اور نوخیز بال دیکھ سکتی تھی۔ آپ کی خوبصورت دُبلی پتلی خوش وضع شبیہ میرے تصورات کے حق میں ایک صریحی تصادم تھی۔ یہ کس قدر تعجب انگیز بات تھی۔ کہ اس لمحہ اولین میں میں نے وہ بات اچھی طرح پہچان لی تھی جو ہمیشہ میرے اور تمام دوسرے لوگوں کیلئے باعث تعجب رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ کی ہستی میں دو ہستیاں پیوست ہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ ایک پرجوش خوش طبع جوان ہیں جنکا مشغلہ ہنسی مذاق کھیل کود و خطرات ہیں اور ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنے آرٹ میں آپ اعلیٰ قابلیت اور گہرے مطالعہ کے ایک نہایت سنجیدہ شخص ہیں۔ جنہیں ذمہ داری کا ایک شدید احساس موجود ہے میرا ارادی طور پر میں نے دیکھا جیسا کہ ہر اُس شخص نے بھی دیکھا جو آپ کو جانتے تھے کہ آپ دو زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک زندگی سے سب واقف تھے۔ یہ وہ زندگی تھی جو تمام دنیا پر ظاہر تھی، دوسری زندگی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ تھی اور صرف آپ ہی پر اچھی طرح واضح تھی۔ میں نے، تیرہ برس کی ایک لڑکی نے،

جو آپ کی کشش کے سحر میں گھری ہوئی تھی۔ آپ کی ہستی کا یہ راز آپ کی دو زندگیوں کا یہ عمیق اختلاف پہلی ہی نظر میں دریافت کر لیا تھا۔

کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ مجھے ایک بچی کو کس قدر ایک معجزہ ایک غیر قابل عمل مگر جاذب نظر معمّہ معلوم ہوئے ہوں گے۔ آپ وہ شخص تھے جن کی بابت ہر شخص عزت کے کلمات ادا کرتا تھا۔ چونکہ آپ کتابوں کے مصنّف تھے اور چونکہ آپ اس وسیع دنیا میں مشہور تھے۔ یکایک آپ نے اپنے آپ کو ایک پچیس سالہ خوش طبع نوجوان کی صورت میں مجھ پر منکشف کر دیا تھا! مجھے غالباً یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اسوقت سے میری چھوٹی سی محدود دنیا میں صرف آپ ہی میری دلچسپی کا باعث تھے۔ میری زندگی آپ کی حیات کا طواف اس وفاداری کیساتھ کر رہی تھی جو ایک تیرہ برس کی لڑکی کے شایاں ہے۔

میں نے آپ کو دیکھا، آپ کی عادتوں کو دیکھا۔ ان لوگوں کو دیکھا جو مجھ سے ملنے آتے تھے ——— اور ان باتوں نے آپ کی شخصیت میں بجائے میری دلچسپی کو کم کرنے کے اور بڑھا دیا۔ چونکہ آپ کی فطرت کے یہ دونوں پہلو آپکے ملاقاتیوں کے فرق مراتب میں نمایاں تھے۔ ان میں سے کچھ نوجوان تھے۔ کچھ آپکے ہم عمر ساتھی اور کچھ بے احتیاطی سے لباس پہنے ہوئے طالبعلم تھے۔ جن کے ساتھ آپ ہنستے اور رنگ رلیاں کرتے۔ ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں جو موٹروں میں آتیں ایک مرتبہ تھیٹر کا مہتمم ——— وہ بڑا آدمی جس کو اس سے پیشتر میں نے صرف دور ہی سے دیکھا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی لئے ہوئے آپ سے ملنے آیا۔ آپکے ملاقاتیوں میں کچھ لڑکیاں تھیں، نوجوان لڑکیاں جو ہنوز کمرشیل اسکولوں میں تعلیم پا رہی تھیں اور جو شرمیلے انداز سے دروازہ میں داخل ہوتی تھیں۔ آپکے یہاں آنیوالوں میں بہت زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ میں نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا۔ اسوقت بھی نہیں جبکہ ایک صبح جیسے ہی میں اسکول جا رہی تھی میں نے ایک برقع پوش خاتون کو آپکے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔ میں صرف تیرہ برس کی تھی اور اپنے بچپن کے اس زمانہ میں یوں بھی طرح اس امر کو نہیں سمجھ سکی کہ وہ گہرا جذبۂ شوق جس کے ساتھ میں آپکے افعال کا جائزہ لے رہی تھی دراصل محبت تھی!

مگر میں اس دن اور اس ساعت کو بھی اچھی طرح جانتی ہوں جب میں نے جان بوجھ کر ارادی طور پر آپکے حضور میں اپنا ہدیۂ دل پیش کیا۔ میں ایک ہمدرس لڑکی کے ہمراہ ٹہلنے گئی تھی اور ہم دونوں دروازہ پر کھڑے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ ایک موٹر آیا۔ ایک بچپن انداز میں، جو میرے لئے ہمیشہ دلآویز رہا ہے۔ آپ باہر کود کر اور اندر جانے کو ہوئے۔ ایک فوری اندرونی جذبہ کی بنا پر میں نے بڑھ کر آپکے لئے دروازہ کھول دیا اور اس طرح میں آپکے راستہ میں آگئی اور قریب تھا کہ تصادم ہوگیا، آپ نے میری طرف ایک پرتپاک، شفقت آمیز نظر سے دیکھا جو میری ساری ہستی پر چھاتی ہوئی معلوم ہوئی، جو بالکل ایک محبت آمیز تھپکی کے مانند تھی آپ خوش مزاجی سے میری طرف دیکھ کر مسکرائے ——— ہاں خوش مزاجی سے اور نرمی، نہیں بلکہ اعتبار کے ساتھ کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ"

صرف اتنا واقعہ تھا مگر اس لمحہ سے، اس وقت سے جب آپ نے مجھے اس قدر لطف، اسقدر مہربانی سے دیکھا میں آپ کی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ تمام عورتوں کو دیکھنے کا آپ کا یہی طریقہ تھا۔ جن کا آپکے کوئی تعلق ہوتا۔ وہ پرتپاک و دلکش نگاہ تھی۔ جو بیک وقت بغلگیر ہوتی، عریاں کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گویا وہ ایک پیدائشی معنوی کی نگاہ تھی۔ غیر ارادی طور پر آپکے لئے دروازہ کھولتی۔ یہ بات نہیں تھی کہ آپ جان بوجھ کر ان سب عورتوں پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ دوسری صنف سے متعلق آپکے جذبات، آپ کی نظروں کو جب کبھی وہ کسی عورت پر پڑتیں حرارت اور لوچ میں تبدیل کر دیتے۔ تیرہ برس کی عمر میں مجھے اس بات کا کوئی خیال نہ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا میں آگ کے شعلوں میں نہا رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ تلطف و مہربانی میرے لئے تھی۔ صرف میرے لئے۔ اسی ایک لمحہ میں نابالغ لڑکی میں عورت جاگ اٹھی تھی۔ عورت جو ہمیشہ کیلئے صرف آپ ہی کی تھی۔

"وہ کون تھا؟" میری ہمدرس رفیقہ نے مجھ سے سوال کیا۔ پہلے میں جواب نہ دے سکی۔ میرے لئے آپ کا نام ادا کرنا ناممکن تھا۔ وہ میرے لئے دفعتاً ایک متبرک چیز ہوگیا تھا۔ وہ میرا راز تھا۔ میں نے غیر شائستہ طور سے جواب دیا "وہ یوں ہی ایک شخص ہے جو اس مکان میں رہتا ہے۔" "مگر جب اس نے تمہیں دیکھا تو تمہارے چہرے پر شرم سے آتشیں سرخی کیوں دوڑ گئی تھی؟" میری ہمدرس نے ایک متجسس اور راز جو بچے کی بدطینتی کیساتھ سوال کیا، میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا مضحکہ اڑا رہی ہے اور میرے راز کو پا چکی ہے اور اس احساس نے پہلے سے بھی زیادہ میرے چہرے کو سُرخ کر دیا۔ میں دانستہ طور پر اس سے غیر شائستہ برتاؤ کر رہی تھی "بیوقوف، پاگل" میں نے غصہ میں کہا ——— اسوقت میں چاہتی تھی کہ اس کا گلا گھونٹ دوں۔ وہ تمسخر انگیز انداز میں ہنسی یہاں تک کہ غصہ کی لا چاری سے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور میں دروازہ پر اُسے چھوڑ کر زینہ پر دوڑ گئی۔

اسوقت سے مجھے آپ سے محبت ہے، میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ عورتوں سے یہ بات سننے کے عادی ہو چکے ہیں کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ کسی اور عورت نے کبھی آپ سے اسقدر غلامانہ محبت، اسقدر رکھتے کی سی وفاداری، اتنی انسنیت نہیں کی جتنی میں نے کی اور کرتی ہوں۔ ایک بچی کی غیر محسوس محبت کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی، وہ مایوس اور خوشامدانہ ہوتی ہے۔ وہ متحمل اور پر جوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کا مقابلہ بالغ عورت کی ہوسناک محبت جو غیر شعوری طور پر عشرت جسمانی کی طالب ہے نہیں کر سکتی۔ صرف اکیلے بچے ہی ایسے جذبہ کے حامل ہو سکتے ہیں، دوسرے لوگ اوروں کی معیت میں ان جذبات کا بیجا اصراف کر دیتے ہیں۔ رازدارانہ گفتگوؤں میں ان کو منتشر کر دیتے ہیں۔ انھوں نے محبت کی بابت بہت کچھ پڑھا اور سنا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ محبت سب ہی کو ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ ایک کھلونے کی طرح کھیلتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ اتراتے ہیں جیسے کہ بچہ اپنے پہلے سگرٹ کیساتھ۔ مگر میرا کوئی رازدار نہ تھا۔ مجھے نہ کسی نے کچھ سکھایا تھا نہ کچھ آگاہ کیا تھا میں سادہ اور غیر تجربہ کار تھی۔ میں اپنی قسمت سے ملنے کیلئے کود پڑی۔ ہر وہ شے جو مجھ میں متحرک تھی، وہ سب کچھ جو مجھ پر گذر رہا تھا، معلوم ہوتا تھا اس سب کا مرکز شغل آپ ہیں، میرے ذہن میں آپ کے تصورات! میرے والد کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا، میری والدہ سوائے اپنی مصیبتوں کے اور کسی بات کا خیال بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سوائے اپنی مشکلات کے جو اس کو اپنی قلیل پنشن کے ساتھ تمام اخراجات خانہ داری کو پورا کرتے ہیں برداشت کرنا ہوتی تھیں۔ وسلئے اس کے اور ایک بڑھتی ہوئی لڑکی کے جذبات میں بمشکل کوئی قدر مشترک تھا۔ میری ہمدرس لڑکیاں جو نیم آگاہ، نیم آوارہ تھیں میری ہمدرد نہ تھیں۔ چونکہ ان کا نظریہ اسکے متعلق لغو تھا جو میرے نزدیک سب سے اعلی جذبہ ہے، اس کا حاصل یہ تھا کہ وہ جو میرے اندر ابھر رہا تھا اور جو میری عمر کی دوسری لڑکیوں میں منتشر ہو جاتا ہے، ان سب کا مرکز ماسکہ آپ ہی بن گئے تھے، آپ میرے لئے ایسے ہو گئے تھے جیسے ——— کون سی تشبیہ میرے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکتی ہے؟ آپ میرے لئے میری تمام زندگی بن گئے تھے۔ میرے لئے کسی بات میں کوئی مفہوم نہ تھا جب تک کہ وہ آپ سے متعلق نہ ہو، آپ نے میرے لئے ہر شے کو بدل دیا تھا۔ اب تک میں اسکول میں لا پرواہ اور غیر ممتاز تھی۔ اب یکایک میں اول تھی۔ میں بہت دیر تک رات کو یکے بعد دیگرے کتابیں پڑھتی رہتی۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کتابوں کے شائق ہیں۔ میں نے اپنی ماں کی حیرت کے باوجود پیانو کی مشق شدت کیساتھ کرنا شروع کی چونکہ میں نے خیال کیا کہ آپ کو موسیقی سے رغبت ہے۔ میں نے اپنے کپڑوں کو سیا اور درست کیا تاکہ وہ آپ کو دیکھنے میں اچھے معلوم ہوں۔ مجھے اس امر سے سخت تکلیف تھی کہ میری اسکول کی پوشاک میں (جو میری ماں کی ایک بیرونی پوشاک سے کاٹ کر بنائی گئی تھی)، ایک گول چھید ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں اس سوراخ کو نہ دیکھ لیں اور مجھ سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ اس لئے میں اسے اپنے بستہ سے چھپا لیتی تھی جب میں زینہ پر ہوتی تھی تو مجھے خوف تھا کہ کہیں آپ کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔ میں کس قدر بیوقوف تھی آپنے شاید ہی کبھی پھر میری طرف نظر کی ہو۔

تاہم میرے دن آپکے انتظار میں آپکی راہ دیکھنے میں گذر جاتے تھے۔ سامنے کے دروازہ میں ایک روزن تھا اور اسمیں سے آپ کا دروازہ دکھائی دیتا تھا۔ میرے محبوب مجھ پر نہ ہنسئے۔ آج بھی میں ان ساعتوں کے تصور سے منفعل نہیں جو میں نے اس پوشیدہ روزن پر بیٹھ کر صرف کیں۔ کمرہ برف کی طرح سرد تھا۔ اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری والدہ کے شبہات برانگیختہ نہ ہوں مگر سہپر کی طویل ساعتوں میں ان مہینوں اور سالوں کے دوران میں میں وہاں کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھی جھانکتی رہتی ستار کے تار کی طرح جوش سے پر اور تنی ہوئی بیٹھی رہتی اور آپ کے قرب کے ہر لمس سے، اسی تار کی طرح مرتعش ہو جاتی لرز اٹھتی۔ میں ہمیشہ آپکے قریب تھی اور ہمیشہ جوش جذبات سے پر۔ مگر آپ مجھ سے اپنی جیب کی اُس گھڑی کی کمانی سے زیادہ واقف نہ تھے جو ہر وقت آپ کیلئے صحیح وقت دیتی اور آپکے ہر ہر قدم کا ساتھ اپنی غیر مسموع آواز سے دیتی اور جس پر لاکھوں سیکنڈوں میں سے صرف کسی ایک سکنڈ کیلئے آپ کی نظر پڑ جاتی۔ میں آپ کی بابت سب کچھ جانتی تھی، آپ کی عادتیں، آپ کی نکٹائیاں جو آپ پہنتے تھے۔ میں آپکے ہر ہر سوٹ سے واقف تھی۔ جلد ہی میں آپکے مستقل ملاقاتیوں سے واقف ہو گئی۔ ان میں کچھ کو میں پسند کرتی تھی، اور کچھ کو ناپسند، تیرہ برس کی عمر سے سولہ برس تک میری ہر ہر ساعت آپکی تھی۔ کونسی حماقتیں میں نے نہیں کیں؟ میں نے دروازہ کے دستے کو بوسہ دیا چونکہ آپنے اُسے چھوا تھا۔ میں نے سگرٹ کا وہ ٹکڑا اٹھا لیا جو آپنے پھینکدیا تھا اور وہ میرے لئے متبرک ہو گیا۔ چونکہ آپکے لب اس پر لگے تھے، شام کو میں سینکڑوں مرتبہ کسی نہ کسی بہانہ سے بھاگ کر سڑک پر یہ دیکھنے کیلئے جاتی کہ آپکے کون سے کمرے میں روشنی جل رہی ہے تاکہ میں آپکی غیر مرئی موجودگی کا پوری طرح شعور کر سکوں۔ ان ایام کے دوران میں جب آپ گئے ہوئے تھے، جب کبھی میں جان کو آپکا سامان زینہ پر

انتہائی بے کیفی بدمزاجی اور پریشانی کے عالم میں یہ جانتے ہوئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے میں گھومتی پھرتی اور مجھے احتیاط برتنا پڑتی کہ کہیں میری آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں والدہ پر میرا یاس و

انّا کرینینا

تلافی مافات

ٹالسٹائی کا مشہور شاہکار اُردو میں

(بہ سلسلہ ایشیا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء)

(جملہ حقوق محفوظ)

سہ پہر کو تقریباً چار بجے "یون" نے باغ کے دروازہ پر اپنی موٹر کو چھوڑا اور دھڑکتے ہوئے دل کیساتھ وہ راستہ طے کیا جو اسکیٹنگ رنک ( ) کو جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کٹی، وہاں ہو گی کیونکہ اس نے سربسکی خاندان کی گاڑی باہر کھڑی ہوئی دیکھ لی تھی۔

سطح کہر آلود ہونے کے باوجود صاف اور روشن تھا۔ دروازہ کے قریب موٹریں۔ گاڑیاں وغیرہ انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے لکڑی کے مکانوں کے درمیان سے جو صاف ستھرے راستے جا رہے تھے۔ اُن پر بہت سے آدمی خوشنما لباس پہنے ہوئے خوشگوار دھوپ میں اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے پرانے کے پیڑ اور ان کی برف سے ڈھکی ہوئی شاخیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کو کسی کامیابی کی تقریب کے سلسلہ میں سجایا گیا ہے۔ "یون، راستے سے گذرتے وقت اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا۔ ــــ" سکون سے رہو۔۔۔۔۔۔ ایسی کیا گھبراہٹ ہے ۔۔۔ تجھے کیا ہو گیا ہے، پھر اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو مخاطب کیا "خاموش رہو۔ نادان کہیں کے"۔ مگر وہ اپنے آپ کو سکون دینے کی جس قدر کوشش کرتا تھا اتنی ہی گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ گذرتے وقت ایک جاننے والے نے آواز دی مگر اُسے خبر بھی نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہ اس پہاڑی کے قریب پہونچتا جا رہا تھا۔ جہاں لوگ برف پر پھسلنے کا کھیل کھیل رہے تھے۔ مسرت خیز آوازیں جن کیساتھ برف پر چلنے والی گاڑیوں کا شور بھی شامل تھا آ رہی تھیں۔

چند قدم آگے بڑھ کر تمام برف کا میدان سامنے آ گیا۔ بہت سے اسکیٹنگ کرنے والوں میں "یون" نے فوراً "کٹی" کو پہچان لیا۔ کٹی کے موجود ہونیکا احساس ہوتے وقت اس کا دل خوف اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے لبریز تھا۔ وہ میدان کی دوسری طرف کھڑی ہوئی کسی خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے لباس وغیرہ میں کوئی خاص بات نہیں تھی مگر "یون" کو وہ تمام مجمع میں ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کانٹوں میں گلاب کا پھول۔ اس کا پیکرِ لطیف اپنے تمام ماحول کو جگمگا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی تجلی تھی جو تمام فضا میں مسرت کی لہریں دوڑا رہی تھی۔

"کیا میں واقعی برف کی دوسری طرف اس کے پاس جا سکتا ہوں" یون نے سوچا۔ وہ جگہ جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی اس کے لئے ایسی مقدس تھی کہ وہاں تک وہ پہونچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ واپس جانے کیلئے تیار ہو گیا لیکن اس نے کوشش کر کے اپنے اوپر قابو پا لیا اور اپنے آپ کو یہ یقین دلایا کہ وہ بھی اس کی قربت کا ایسا ہی حق رکھتا ہے جیسا کہ اور لوگ۔

وہ برف کے میدان کے دوسری طرف پہونچ گیا۔ نگاہوں کو "کٹی" سے اس طرح بچاتے ہوئے گویا وہ ایک ایسا سورج تھی۔ جس کی دید پیغام حیرت ہوتی پھر بھی اس کی نگاہ "کٹی" پر پڑ ہی گئی اگرچہ حقیقت میں اس نے اُسے نہیں دیکھا۔

اس دن برف کے میدان میں تمام آدمی ایسے تھے جو ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ان میں اسکیٹنگ کے ماہر بھی تھے جو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آئے تھے۔ وہ مبتدی بھی تھے جو کرسیوں کو آگے دھکیل دھکیل کر اسکیٹنگ سیکھ رہے تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے جوان بھی جو اپنی تندرستی کے بہتری کیلئے وہاں آئے تھے

لیون کو وہ سارے تمام خوش قسمت معلوم ہو رہے تھے۔ کیونکہ وہ کٹی کے پاس تھے۔ مگر وہ سب کٹی کی موجودگی سے بے نیاز سے تھے۔ وہ اس کے پاس سے خاموشی کیساتھ گذر جاتے تھے۔ اس سے کوئی بات بھی کہدیتے تھے۔ مگر اس کی ذات پر اُن کی مسرتوں کا انحصار نہیں تھا۔ وہ تو صرف برف کے نظارے اور خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کٹی کا بھائی نکولی شربسکی ایک چھوٹا سا جاکٹ اور چست پاجامہ پہنے ہوئے اسکیٹس (ایکسلیٹنگ کھیلنے کے پہیّے) پہنے ہوئے ایک سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اسکی نظر لیون پر پڑی

"میں کہتا ہوں" اس نے لیون کو آواز دی "کیا تم یہاں بہت دیر سے ہو؟ جلدی سے اسکیٹس (اسکیٹنگ کھیلنے کے پہیّے) پہن لو برف بہت عمدہ ہے۔ تم تو روس میں سب سے بہتر اسکیٹنگ کھیلنے والے ہو"

"میرے پاس میرے اسکیٹس نہیں ہیں" لیون نے جواب دیا۔ اسے تعجب تھا کٹی کے سامنے اس سے اس طرح بے تکلفی کیساتھ باتیں کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔ وہ اگر کٹی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کی صورت اسکے سامنے سے ایک منٹ کو نہیں ہٹی۔ اس نے اپنے اوپر سورج کی شعاعیں محسوس کیں۔ کٹی ایک گوشے سے چکر کاٹ کر آ رہی تھی، وہ بظاہر مطمئن نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ایک نوجوان جو روسی لباس پہنے ہوئے تھا اپنے ہاتھ بے پروائی سے ہلاتا ہوا جلدی سے اس کے پاس سے گذرا۔ اس نے اپنے لبادہ کی جیب سے دونوں ہاتھ نکالے اور انھیں اس انداز میں رکھا گویا وہ راستے میں چلنے والی ہر چیز کا ان سے استقبال کرنیکو تیار ہے۔ جب اس کی نظر لیون پر پڑی تو وہ مسکرائی اور سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے بھائی کے قریب پہونچ گئی اور اس کا بازو تھام لیا۔ لیون کیلئے وہ اسوقت اسکی تصور (کٹی) سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

جب کبھی لیون نے کٹی کا خیال کیا اسکے تصور میں کٹی کا حسین سنہری بال والا سر۔ اسکے ابھرے ہوئے شانے۔ اس کی معصوم دوشیزہ صورت بےحد دلکشی لئے ہوئے سامنے آجاتی تھی۔ لیکن اس کو سب سے زیادہ متاثر کرنیوالی اسکی جادو بھری آنکھیں تھیں اور اُن سے بھی زیادہ اس کا وہ تبسم تھا۔ جو اُسے نہ جانے کس طلسماتی عالم میں پہونچا دیتا تھا اور جو لسے بچپن کے مسرت خیز و نایاب دنوں سے یاد آ رہا تھا۔

"کیا تم یہاں بہت دیر سے ہو" کٹی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا

لیون نے کٹی کا رومال جو اس کی جیب سے آگیا تھا زمین سے اٹھا کر اُسے دیا۔ جس پر کٹی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"میں؟ میں کل آیا تھا.... مطلب یہ ہے کہ آج" اس نے جواب دیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ "میں حاضر ہونیوالا تھا" اس نے مزید کہا۔ لیکن خیال آتے ہی کہ وہ کس مقصد کے ماتحت اس سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا اور اس کے چہرہ پر ایک گہری سُرخی دوڑ گئی "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اسکیٹنگ بھی کر لیتی ہو اور اسقدر عمدہ طریقہ پر"

کٹی نے اُسے قریب سے دیکھا گویا وہ اس کی گھبراہٹ کی وجہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"یہ تمہارا حسن ظن ہے کہ تم ایسا کہہ رہے ہو خصوصاً اس وقت جب کہ میں سُن رہی ہوں کہ تم خود اسکیٹنگ کے ماہر ہو" اس نے دستانے پہنے ہوئے ہاتھوں سے اپنے کوٹ سے جمی ہوئی شبنم صاف کرتے ہوئے کہا

"ہاں میں ایک زمانہ میں اسکیٹنگ کا جنون کی حد تک شائق تھا اور میری دلی خواہش تھی کہ میں اس فن کا ماہر ہو جاؤں"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہر بات جنون کی حد تک کرتے ہو" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "اپنے اسکیٹس (اسکیٹنگ کے پہیّے) پہن لو۔ ہم دونوں کوشش اکٹھے کر کے دیکھیں"

"دونوں اسکیٹنگ کرینگے"! اس نے خیال کیا "کیا یہ ممکن ہے؟"

"ابھی ایک لمحہ میں" اس نے جواب دیا اور جلدی سے وہ پہننے کے لئے اسکیٹس تلاش کرنے لگا۔

"بہت عرصہ کے بعد آپ یہاں نظر آ رہے ہیں" ملازم نے "لیون" کو اسکیٹس پہناتے ہوئے کہا "اس زمانہ میں آپ سے بہتر کوئی اسکیٹنگ نہیں کھیل سکتا۔ ٹھیک ہے نا؟" ملازم نے بند باندھتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جلدی کرو" لیون نے اس خوشی کی لہر کو جو اس کے چہرے پر دوڑ گئی تھی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"زندگی یہی ہے" اس نے خیال کیا "یہی مسرت ہے، دونوں اس نے کہا تھا۔ "ہم دونوں کوشش کر کے دیکھیں"۔ کیا میں اس سے ابھی کہدوں۔ ابھی نہیں۔ میں کس قدر مسرور ہوں بسرور۔ امید کیساتھ .... اور اس کے بعد.... لیکن مجھے اس سے کہدینا چاہیئے۔ یقیناً... یقیناً...

میں کمزوری کا اظہار نہیں کروں گا۔"

"لیون" کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنا کوٹ اُتارا۔ برف کی ناہموار سطح پر چھوٹے سے گھر کے چاروں طرف اس نے ایک چکر کاٹا۔ پھر وہ بغیر کسی کوشش کے برف کی ہموار سطح پر آ گیا اور سیدھا "کٹی" کے پاس جا پہونچا۔

"کٹی" کے تبسم نے اظہار اعتماد کیا۔

"میں تمہارے ساتھ بہت جلد سیکھ جاؤں گی۔" اس نے کہا "مجھے بہر حال تم پر اعتماد ہے"

"تم میری طرف جھکو گی تو مجھے خود اپنے اوپر اعتماد ہو جائیگا۔" اس نے جواب دیا مگر اسے حیرت ہوئی کہ اس نے کیا کہہ دیا اور اس خیال سے اس پر سُرخی دوڑ گئی حقیقتاً جیسے ہی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے "کٹی" کے چہرے سے مہر آمیز رنگ اس طرح اُڑ گیا جیسے سورج بادلوں میں چھپ جائے اور اس کی بجائے اس کی شفاف پیشانی پر درشتی کے آثار پیدا ہو گئے۔

"کیا کوئی بات تمہاری مرضی کیخلاف ہو گئی؟ مگر نہیں مجھے یہ دریافت کرنیکا کوئی حق نہیں ہے" اس نے جلدی سے کہا

"کیوں حق کیوں نہیں ہے مگر کوئی بات میرے خلاف نہیں ہوئی" اسکے سرد مہری سے جواب دیا "کیا تم مس لینن سے ملے ہو؟" اس نے موضوع کو بدلنے کیلئے کہا

"ابھی نہیں!"

"اس کے پاس ضرور جاؤ۔ وہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق ہے"

"لیون" جب بھورے بالوں والی بوڑھی فرینچ گورنس کے پاس جو پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ جانے لگا تو اسے خیال آیا "کیا بات ہو گئی؟ میں نے اس سے یقیناً کوئی سخت بات کہدی ہو گی۔ خدایا میری مدد کر۔"

فرینچ گورنس اس طرح مسکرائی کہ اس کے تمام مصنوعی دانت ظاہر ہو گئے اس نے "لیون" کا ایک پرانے دوست کی طرح استقبال کیا

"تم دیکھتے ہو ہم کتنے بڑے ہو گئے" اس نے "کٹی" پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "اور ہم بوڑھے بھی ہوتے جا رہے ہیں۔ چھوٹی ریچھنی (ریچھ کی مادہ) اب کتنی بڑی ہو گئی ہے" بوڑھی گورنس نے سلسلہ کلام جاری رکھا اس نے یہ کہہ کر وہ زمانہ یاد دلایا جب "لیون" مذاق میں تینوں جوان خواتین (کٹی اور اس کی بہنیں) کو انگریزی کے ایک تخیلی قصہ کی ریچھوں سے تشبیہ دیا کرتا تھا "تمہیں یاد ہے تم انہیں کیا کہا کرتے تھے؟"

لیون اس بات کو بالکل بھول چکا تھا مگر بیست قد بوڑھی گورنس اس مذاق پر پچھلے دس سال سے ہنستی چلی آئی تھی۔

"تم اب اسکیٹنگ کیلئے جا سکتے ہو۔ کیا ہماری کٹی اب خوب اسکیٹنگ نہیں کرتی ہے"

جب لیون پھر "کٹی" کے پاس پہونچا تو "کٹی" کے چہرے سے سختی کے آثار جا چکے تھے۔ اس نے لیون کو پھر اسی بے تکلفی اور نرمی سے دیکھا لیکن اس کی اس مہربانی میں کوئی بات غیر فطری شامل تھی جو لیون کو تکلیف دے رہی تھی۔ ابھی بوڑھی گورنس کے متعلق دو چار فقرے کہہ کر وہ لیون کی زندگی کے متعلق گفتگو کرنے لگی۔

"کیا تم جاڑوں میں گاؤں سے اکتاتے نہیں ہو" اس نے پوچھا "نہیں میں بہت مصروف رہتا ہوں" اس نے "کٹی" کے بیگانہ وار لہجہ سے متاثر ہو کر جواب دیا۔ اس وقت اس کا بالکل آغاز سرما کا سا حال تھا

"کیا تم یہاں زیادہ دنوں قیام کرو گے؟" کٹی نے پوچھا

"مجھے معلوم نہیں" اس نے بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے جواب دیا اس کے لئے یہ خیال کہ پھر اسی طرح دوستانہ گفتگو ہو گی اور وہ بغیر اصل بات کئے چلا جائیگا ناقابل برداشت تھا

"تمہیں کیوں نہیں معلوم"

"میں حقیقتاً کہہ نہیں سکتا۔ یہ تمہارے اوپر منحصر ہے" اس نے خود اپنے الفاظ سے ڈرتے ہوئے کہا

"کٹی" نے یا تو اس کی بات سنی نہیں یا ان سنی کر دی۔ اس کے قدموں کو لغزش سی ہوئی اور وہ جلدی سے "لیون" کے پاس سے مس لینن کے پاس چلی گئی۔ بوڑھی گورنس سے دو ایک باتیں کر کے وہ سیدھی لاج کی طرف چلی گئی جہاں اس نے اپنے اسکیٹس اتار دیئے "الٰہی میں نے کیا کیا۔ خدایا میری مدد کر۔ مجھے بتا کہ میں کیا کروں۔ لیون نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ اور شدید ورزش کی ضرورت محسوس کر کے اس نے برف پر کئی چکر لگا ڈالے۔

اسی وقت ایک نوجوان جو نوجوانوں میں سب سے بہتر اسکیٹنگ کرتا تھا چھوٹے کیفے (Cafe) سے منہ میں سگریٹ دبائے ہوئے نکلا اور اسکیٹس پہنے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ وہ تمام راستے جھومتا ہوا گیا تھا۔ اب

بازووں کی آرام دہ حالت کو بدلے بغیر وہ برف پر دوڑتا چلا گیا۔
"ٹھیک ہے،" لیون نے کہا، اور خود بھی اسی طرح چلنے کی کوشش کرنے لگا۔

اتنے میں نکولی سربسکی نے اسے آواز دی: "دیکھنا کہیں اپنے آپ کو مار نہ ڈالنا۔ اس کھیل کیلئے تمہیں پہلے سے مشق ہونی چاہیئے۔"

لیون اوپر کی طرف ہو کر پیڑھیوں سے کافی دور چلا گیا تاکہ نیچے آنے کیلئے کافی فاصلہ مل جائے۔ وہ پھر تیزی کیساتھ اپنے دونوں بازوؤں کے توازن سے اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا دوڑا۔ آخر میں اس کے پاؤں میں کوئی چیز آ گئی جس سے وہ گرنے کے قریب ہو گیا۔ مگر اس نے بہت کوشش کر کے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور ہنستا ہوا برف پر آگے بڑھ گیا۔

"کیا خوب! وہ کتنا پیارا آدمی ہے۔" کٹی نے خیال کیا وہ اتفاق وقت سے اسی وقت مادموزیل لینن کے ساتھ ایک چھوٹے لاج سے نکلی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے کسی عزیز بھائی کو دیکھ کر مسکراتی۔ اس کے خیالات کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ "کیا یہ میری غلطی ہے کیا میں نے کوئی بڑی بات کی۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں شادی کے معاملہ میں جلد باز واقع ہوئی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس کے ساتھ بھی رہنا چاہتی ہوں وہ کیسا اچھا ہے۔ نہ معلوم وہ کس بات سے متاثر ہو کر ایسا کہہ رہا تھا۔۔۔"

اتنے میں کٹی کی ماں آ گئی۔ جب لیون نے دیکھا کہ کٹی اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہے تو اس نے جلدی سے اپنے اسکیٹس اتارے اور ان کی طرف روانہ ہو گیا
"تمہیں دیکھ کر مسرت ہوئی" شہزادی (کٹی کی ماں) نے کہا
"ہم ہر جمعرات کو میزبانی کرتے ہیں۔"
"کیا میں آج بھی آ سکتا ہوں؟"
"ہمیں تمہارے آنے سے خوشی ہو گی" شہزادی نے بیدلی سے جواب دیا۔
کٹی کو اپنی ماں کی بے اعتنائی سے سخت تکلیف پہونچی اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس سلوک کی تلافی کر دے۔

"خدا حافظ" کٹی نے لیون سے ایک شیریں مسکراہٹ کیساتھ کہا۔
اسی وقت اسٹیپن ارکیڈی وچ سر پر ایک طرف کو جھکا ہوا ہیٹ لگائے ہوئے بہت مسرور باغ میں داخل ہوا۔ اپنی ساس کو دیکھتے ہی اس کے چہرہ پر ایک قسم کی افسردگی آ گئی۔ اس کی ساس نے اس سے "ڈولی" کی صحت کے متعلق جو کچھ پوچھا۔ اس نے سب کا جواب دیا۔ اور لیون کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"اچھا! تو کیا ہمیں چلنا چاہیئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم یہاں آ گئے۔" اس نے ایک مخصوص انداز سے لیون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔
"اچھا آؤ" لیون نے مسرور ہو کر کہا اسے "خدا حافظ" یاد آیا اور ساتھ ہی وہ تبسم جو ہونٹوں پر ان الفاظ کیساتھ آتا تھا۔
"انگلش ہوٹل چلو گے یا ہرمیٹج؟"
"جہاں کہیں چلو۔"
"تو پھر ہم انگلش ہوٹل چلیں گے۔" اسٹیفن ارکیڈی وچ نے کہا۔ اس نے انگلش ہوٹل کو اس لئے پسند کیا کہ اس ہوٹل کا اسے روپیہ دینا تھا اور وہ اس پر اپنا احسان کرنا چاہتا تھا۔ "کیا تمہارے ساتھ گاڑی ہے؟ یہ اچھا ہوا کیونکہ میں نے اپنی گاڑی بھیجدی ہے۔"
انھوں نے راستہ میں ایک دوسرے سے کوئی گفتگو نہ کی۔ لیون برابر کٹی کا خیال کرتا رہا اور اس کے رویہ کی تبدیلی پر غور کرتا رہا۔ پہلے اس نے یہ یقین کیا کہ معاملہ امید افزا ہے۔ اور دوسرے لمحہ اسے ناکامی کے تصور نے گھیر لیا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ کٹی کی مسکراہٹ کے بعد سے وہ اپنے آپ کو بالکل دوسرا انسان خیال کر رہا تھا۔
اسٹیفن آرکیڈی وچ اس درمیان میں برابر کھانوں کی فہرست تیار کرتا رہا۔
"کیا تم ٹربی مچھلی کھانا پسند کرو گے؟" اس نے لیون سے اشارنٹ میں داخل ہوتے وقت پوچھا
"کیا؟" لیون نے کہا "ٹربی مچھلی؟ ہاں میں اسے بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔"

(باقی)

ہم اور وہ

(مسلسل)

خواجہ محمد شفیع دہلوی

بڑے میاں دل میں تو بہت سٹ گئے پر اظہارِ ندامت سے گریزپا معلوم ہوتے تھے۔ سکوت اعترافِ جرم کے مترادف اور کچھ کہنے کو منہ نہ پڑتا تھا۔

آنکھوں میں تجسس تھا۔ دماغ میں کاوش لیکن بات کچھ ایسی بگڑی تھی کہ بنائے نہ بنتی تھی۔ تاہم یہ سال خوردہ و باراں دیدہ اس دور کی پیداوار تھے جبکہ تاویلِ حسنِ بیان، اور دروغ گوئی معراج تھی۔ حقیقت پہ پردہ ڈالنا فنِ لطیف تصور کیا جاتا، اور سخن سازی کمالِ سخن

یہ بزرگوار ٹھنڈے پیٹوں آسانی سے قابو میں آنیوالے تھے نہیں دل میں چور تھا آنکھ نہ ملا سکے نوجوان پر دزدیدہ نگاہ ڈالی اور کہا

پڑھے لکھے ہزار ہو بابا! ٭ ابھی ناکردہ کار ہو بابا

میاں صاحبزادہ ادب کو اخلاقی معیار میں تولنا۔ بادرا بگز بیہودن ہے نقدِ سخن کی میزان اور ہوتی ہے۔

ادب میں اخلاقیات کی آمیزش شراب میں نمک گھولنا ہے۔ تم بچہ ہو دیوانہ ہوئے ہو۔ جواہرات کے صندوقچہ میں گندم تلاش کرتے ہو۔ مشک کی ڈبیا میں ہینگ کے طلبگار ہو۔ ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ عقل سے کام لو۔ سماعِ واعظ بجا نغمۂ رباب بجا۔ تم کہاں آئے ہو اور کیا تلاش کر رہے ہو؟ درخرابات میرِ کہ ہشیار بجاست۔ یہ بزم ادب ہے محفلِ وعظ نہیں۔ یہاں ذکرِ حور و قصور نہیں قصور معاف یہاں حور و قصور ہے۔ یہاں سلسبیلِ لبِ گل رنگ اہلِ بزم کو سُرخرو کرتی ہے۔ یہاں وعدۂ سلسبیل نہیں۔ اس محفل میں دردمنداں شیرازۂ حیات منقطع کرتے ہیں۔ احتیاط سے رکھے ہوئے موتیوں کے بیان نہیں ہوتے۔ یہاں شباب میخانہ بدوش پھرتا ہے جو سال خوردہ واعظِ کرم خوردہ کو مبارک۔

یہ خمخانۂ شعر و سخن ہے۔ خمکدۂ کلام و بیان

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ ٭ یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

اس عالم میں قادر البیان پیرِ فلک کا سینہ چاک کر خونِ شفق نکال لیتے ہیں کہکشاں سے جوئے شیر لاتے ہیں۔ بلند پرواز آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں۔ زہرہ اور مشتری کو زینتِ محفلِ رندانہ بناتے ہیں۔

یہاں کج البیان شمع کی مانند روتے ہیں۔ رلاتے ہیں۔ پروانہ کی طرح جلتے ہیں جلاتے ہیں سینہ فگارانِ چمن کی مانند زخمِ دل دکھاتے سینہ کو چمن بناتے ہنستے ہنساتے گذر جاتے ہیں۔

یہ محفلِ شعر و سخن ہے۔ یہاں وعظ و نصیحت پند و تلقین کی گنجائش نہیں۔ دیر میں خدا پرست کی تلاش اور کعبہ میں کافر ڈھونڈنا سعیِ لاحاصل ہے اور تلاشِ ناپیدا۔ فکرِ معقول بفرما۔

نوجوان نے بڑے میاں کی طرف تبسم نگاہ ڈالی اور کہا۔ گستاخی معاف اگر جنابکے صاحبزادہ شراب لائیں اور فرمائیں اس کے رنگ و بو کی طرف توجہ فرمائیے۔ اس کی بوتل کو دیکھئے۔ اس فن پر غور کیجئے جس نے پانی میں آگ بند کی ہے۔ اور اگر جنابکے فرزند ارجمند ایک بازاری عورت لے آئیں اور فرمائیں کہ اس کو انسانی حسن کے معیار سے جانچئے۔ اس کے بدن کو دیکھئے۔ ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہے۔ آواز کا ترنم۔ نگاہوں کی شوخی۔ اداؤں کی بے ساختگی دیکھئے اور اگر جناب کے خاندان کے چشم و چراغ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ساری جمع پونجی کے بدلے کوئی بہترین مرقع خرید فرمالیں اور فرمائیں کہ اس کی رنگ آمیزی کو دیکھئے۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ پر غور فرمائیے۔ معلوم ہوتا ہے منہ سے بولنے کو ہے۔ چوکٹے سے باہر قدم رکھنے کو ہے۔ ان ماہر فن انگلیوں کا خیال کیجئے۔ جنھوں نے بے جان رنگوں میں جان ڈالدی۔ ایک کاغذ کے پرزہ میں روح پھونکدی۔

تو سینہ پہ ہاتھ رکھ کر ایمان سے فرمائیے کہ جناب والا کے اسوقت کیا جذبات ہوں گے۔ کیا آپ بیٹے کی ان حرکات کو مناسب تصور کریں گے۔ کیا

جناب صاحبزادہ کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ کیا حضور اپنے چشم و چراغ کی چرب زبانی پر آمنّا و صدقنا فرمائیں گے۔ یا سر پکڑ کر بیٹھیں گے اور اپنی بیتیا آنیوالوں کو سنائیں گے۔ تاکہ ان کے کان ہوں اور اپنی اولاد کی احتیاط کریں۔

پھر ذرا یہ تصور فرمایئے کہ صاحبزادہ کی ان غلط کاریوں کا اثر آپکے پوتوں اور پڑپوتوں نے قبول کیا۔ آپ کی نسل ہمیشہ ہمیشہ کو برباد ہوگئی۔ جن کے آپ کو آسرا تھا۔ وہ نونہال اجڑ گئے۔ آپکے امید پر بادِ خزاں چل گئی۔ آپکے نام لیوا اور پانی دیوا شرابی ہوگئے۔ بوالہوس ہوگئے۔ مرقع پرست ہوگئے۔ اب فرمایئے کہ اس بربادی کو دیکھتے ہوئے آپ کیا کہیں گے۔ آپ اس لڑکے پر ناز کریں گے یا اس دن پر افسوس جب وہ ناخلف پیدا ہوا تھا۔

یہ ایک خاندان کا برباد ہونا تھا۔ ایک چھوٹے سے گھرانے کی تباہی تھی جس کا نقشہ آپکے سامنے پیش کیا گیا۔ تصور کیجیئے اس قوم کا جس پر یہ بپتا پڑی ہو خیال کیجئے ان بدنصیب آنیوالی نسلوں کا جو بڑوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے دنیا کے میلہ میں پابجولاں لائی گئی ہوں۔

آپ کا لڑکا خاندانی گھر فروخت کردیتا ہے اور پھر آپ کا پوتا اس ہی گھر میں غلاموں کی طرح کام کرتا ہے۔ جہاں اسکے بزرگ رہتے بستے اور نوکروں پر حکم چلاتے تھے۔ خیال کیجیئے اس بدنصیب پوتے کے جذبات کا جب کہ اُس کو اس مدوجزر کا احساس ہوگیا ہو۔

اب کہیئے کیسی لگی۔ اس تصور سے آنکھیں کیوں ڈبڈبا آئیں۔ اس خیال سے دل میں ایک ہوک سی کیوں اٹھی۔ یہ اپنے گھر کا ذکر تھا ..... ہم میں اور آپ میں صرف فرق اتنا ہے کہ آپ قوم کے گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتے تھے اور ہم اس راز کو جانتے ہیں کہ جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت۔ آپ کو قوم پرستی اور جماعت کا تخیل چھو نہ گیا تھا اور ہم کچھ کھو کر سیکھتے ہیں۔ آپ اس وقت پیدا ہوئے تھے جبکہ دنیا آپکے قدموں میں تھی۔ اور ہم نے اسوقت آنکھ کھولی جب زمانہ ہم سے آنکھیں پھیر چکا تھا۔ روزگار ہو سیر پیکار رہتا۔ ہم کو ایک دوسرے کا سہارا مدد کا رہتا۔ بادِ مخالف چل رہی تھی۔ ساحل دور تھا اور کشتی ڈوبنے کو۔ مصیبت مصیبت زدوں میں اکثر یکانگت پیدا کر دیتی ہے۔ ہم سب ایک کشتی میں تھے اس کا ڈوبنا ہم سب کا غرق آب ہونا تھا۔ ہم میں متفقہ نقصان اور فائدہ کا احساس پیدا ہوا اور ساتھ کے ساتھ یکجہتی۔

آپ عیش و عشرت میں پیدا ہوئے۔ آرام و راحت میں پلے پروان چڑھے حکومت آپکے ہاتھ میں تھی دولت آپ کے قدموں میں۔ مصیبت سے بیگانہ تلخ کامی سے ناآشنا۔ لاڈلی اولاد تھے۔ ناز ناز یبا کے عادی۔ بڑوں کا ترکہ دھڑی دھڑی لٹا رہے تھے۔ مزے اڑا رہے تھے۔ شراب عیش میں مست آنکھیں بند کئے تباہی کے گڑھے کی طرف غزلخواں چلے جا رہے تھے۔

اور ہم اسوقت پیدا ہوئے جب کہ جناب کی عیش پرستوں کی بدولت گھر میں سوائے رنج و آلام کے اور کچھ نہ بچا تھا۔

اگر غور سے دیکھیئے تو کسی زمانہ کے اُدبا اور شعرا کو مطعون کرنا بھی حق بجانب نہیں۔ ہر دور کا ادب اس زمانہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی جس جگہ رہتی ہے وہیں کے گرد و نواح سے شہد اخذ کرتی ہے۔ دریا جن گھاٹیوں۔ پہاڑوں اور وادیوں میں سے ہو کر آتا ہے وہاں کے سنگ ریزے رنگ اور نشانات ساتھ لاتا ہے۔ یہی کیفیت ایک ادیب کی ہے۔ جس ماحول میں پیدا ہوتا اور زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے اثرات قبول کرتا اور اپنے ہر ہر لفظ میں اس دور کی معاشرت طبیعت اور ذہنیت کی مکمل تصویریں چھوڑ جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب اردو ادب پیدا ہوا تو ہماری اخلاقی۔ معاشرتی اور سیاسی حالت کیا تھی۔ ہمارے شاعروں کا گرد و پیش کیا تھا اور ہمارے سماج کی کیا کیفیت تھی۔

سلطنت مغلیہ کا زوال شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات سنہ۱۷۰۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ بہادر شاہ شاہِ اورنگ زیب کا سال خوردہ ہمت شکستہ لڑکا زیبِ اورنگ ہوا۔ شاید یہ سلسلۂ تیموری کا بے بہا دُر ثابت ہوتا لیکن حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ نوبت بہ پنج روزہ گذار پنج سالہ حکومت کے بعد جہانِ گذراں سے گذر گیا۔

اب نام کا جہاں دار شاہ مالکِ تاج و تخت ہوا۔ جہاں گیری تو درکنار نام کی لاج بھی نہ رکھ سکا۔ ایک سال کے اندر قتل کیا گیا اور جہاں دار دار البقا کو سدھارا۔

اس کے بعد فرخ سیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ چھ سال بعد قتل کیا گیا۔ اسی ایک سال کے اندر دو اور وارث تخت نشیں ہوئے اور تہِ خاک پہنچا دئے گئے۔

اب دور محمد شاہی شروع ہوتا ہے۔ آج رنگ ہے۔ رنگیلے پیا زیبِ اورنگ یہ رنگ ڈھنگ حکومت کے نہیں۔ تانت باجی راگ پایا۔ نادر شاہ درّانی عذاب ناگہانی کی طرح آیا۔ دلی میں قتل عام ہوا۔ نظام الملک پیر نود سالہ خوردہ سال

چھوکرے کی طرح آنسو بہاتا نادر شاہ کے روبرو آیا اور دست بستہ عرض کی۔

کسے نہ ماند کہ دیگر تیغِ ناز کشی + مگر کہ زندہ کنی رہ باز کشی

اس کے بعد آنیوالے شاہان شطرنج کی حکومت۔ حکومت شاہِ عالم از دہلی تا پالم سے بیش نہ رہی جس کا اختتام ۱۸۵۷ء میں ہوگیا۔

اس دور میں راجہ پرجا۔ شاہ رعایا۔ سب رنگِ تعیش میں رنگے تھے۔ امرا شیرِ قالیں تھے۔ شعراان شیروں کے مدح سرا۔ وزیرے چنیں شہر یارے چناں۔

افسرانِ فوج خیمے سے پالکیوں میں چڑھ کر رَن سر کرنے جاتے تھے۔ امرا تخت و تاج کے دشمن۔ جذبۂ وفا شعاری مفقود ہو چکا تھا۔ غداری اور ریاکاری کی گرم بازاری تھی۔ ظاہری منہ دیکھے کی محبت رہ گئی تھی۔ صداقت رخت سفر باندھ چکی تھی۔ تصنع اور بناوٹ کا دور دورہ تھا۔ شاعری بھی اسی رنگ کی آئینہ دار حقیقت سے دور تصنع سے معمور۔

یہ کیفیت تھی سیاست اور حکومت کی مذہب نے بھی اس سرزمین میں نئے گل کھلائے۔ روحِ اسلام ختم ہو چکی تھی جسدِ اسلام رہ گیا تھا۔ جذبۂ مسلمانی مفقود شرح مسلماں موجود۔ اور اس نے بھی کچھ ایسا روپ بدلا تھا کہ پہچاننا مشکل ہوتا جاتا تھا حقیقت تصنع سے بدل رہی تھی۔ صفائی رنگ آمیزی سے۔ عرب کا استوار کھجور کا درخت اس سرزمین کے اثر سے گلاب کی خاردار جھاڑی بنتا جاتا تھا۔

رسم و رواج اصل مذہب پر چھا گئے تھے۔ لباس نے جسم کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا

فلسفۂ یوگ کی جنم بھوم میں تصوف کی بیل پھول پھلی پروان چڑھی۔ اسلام جیسا سیدھا سادھا مذہب گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔

یہ رنگ عالمگیر تھا۔ جب مذہب اس کے چھینٹوں سے نہ بچ سکا تو ادب کیا دامن بچا کر جا سکتا تھا۔

وہ سیاست تھی یہ مذہب اب معاشرت اور معیشت کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ خیال کن ز گلستانِ من بہارِ مرا۔

ہمارے شعرا کے دل و دماغ پر غلامی کے خول چڑھے تھے۔ پیٹ بری بلا ہے۔ یہ امیر غریب عالم جاہل سب کے ساتھ لگا ہے۔ اس دوزخ کو بھرنا ہی پڑتا ہے۔ اس دور کے شعرا کسی نہ کسی صاحب ثروت کے دست نگر ہوتے اور اپنے ممدوح کی وعطا پر گذر کرتے۔ آقا کی مرضی کے مطابق اپنی طبیعت کے خلاف پابندیوں کے تحت شعر کہتے تھے۔

دولتِ دنیا ئے دوں سفلہ پرور جاہل نواز ہے۔ اکثر امرا اسی زمرہ میں سے تھے۔ اور شعرا کو ان کی سلے پڑا لا پنا پڑتا۔ کسی آدمی سے آپ ایک خاص عرصہ میں خواہ باغ لگوالیں خواہ جھاڑو دلوالیں۔ یہی کیفیت دماغی کام کی ہے۔ ایک ادیب سے ایک فرصت میں خواہ بے معنی ژٹل قافیہ کہلوالیں خواہ پر مغز بامعنی دریائے معنی حاصل کرلیں۔

اس حقیقت کی بہترین مثال ہم کو انشاء اللہ خاں انشا میں ملتی ہے۔ نواب نے ایک مصرع کہدیا ان کو غزل پوری کرنی پڑی۔ ملاحظہ ہو۔

پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیسی کی ٹوپی۔ یاں وقتِ سلام از سے ہے اجیس کی ٹوپی

ممدوح ان داتا کو غصہ آگیا۔ مردِ میدانِ سخن کو اوڑھنی اوڑھنی پڑی۔ انشاء اللہ خاں حکیم شمیم ست نفے مرد معقول ناک پر انگلی دھرے فرمارہے ہیں۔

میں ترے صدقہ نہ رکھ اے مری پیاری روزہ

بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

تخت نشیں ممدوح۔ لونڈی بچہ کمینہ خصال چھپر کھٹ پر بیٹھا پھولوں کا گجرا اچھال رہا ہے اور انشاء اللہ خاں کھڑے فرمارہے ہیں ؎

لگا چھپر کھٹ میں چار پہیے اچھالا تو نے جو لے کے گجرا

تو موجِ دریائے چاندنی میں وہ ایسا جاتا ہے جیسے بجرا

یہی انشاء اللہ خاں جب معتوب ہوئے ہیں تو کہتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

ب ان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں

نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

پہلے دور میں دولت انشاء کے قدموں میں تھی لیکن آخر عمر میں ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ دوسرے دور میں یہ شیر نیستانِ سخن خارا نشین تھا یعنی طائر... نشیں اس کا شکار۔ یہ شاہ سخن راکھ کے ڈھیر پہ بیٹھا نقد سخن لٹا رہا تھا۔ آنیوالی نسلوں کے لئے جواہر ریزہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔

سچ یہ ہے کہ اس عہد میں سیمرغ خاکروبوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اور ان سے کوڑا سمٹوایا جا رہا تھا۔

قصیدہ گوئی کا زور تھا۔ شاعروں نے گداگری اختیار کرلی کلام فقیر کی صدا بن گیا اور شاعر کی بیاض کشکول گدائی۔ جو شمع بزم جہاں منور کرنے پیدا کی گئی تھی۔

دھوں سے تنور گرم کیا جانے لگا۔
جس طاقت کا کام سوتوں کو جگانا تھا وہ خود کلیم گدائی اوڑھ کر سو گئی۔ جو
ہما بجلِ شاہی تھا شہباز آز کا شکار ہوا۔
اندھیر تھا شمع ادب پر فانوس شکم ڈھکا تھا۔ غذائے روح نانِ شبینہ کے
لئے دریوزہ گر۔
قصیدہ نانِ جویں کیلئے کہا جاتا اور غزل خراجِ تحسین کیلئے۔ غزل کی خصوصیت
ہے کہ ایک شعر دوسرے شعر سے معنی میں مختلف ہوتا ہے۔ تصوف۔ معاملہ بندی۔
رندانہ روی۔ وصل و فراق۔ ادا بندی۔ اخلاقیات غرضکہ ہر قسم کے تخیلات کا اٹل
بے جوڑ مجموعہ پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔ خیالات میں تسلسل کا نہ ہونا کلام کو اثر سے بیگانہ
کر دیتا ہے۔ چندے لطفِ محفل رہتا ہے اور بس۔
معنی میں اس درجہ آزادی لیکن بحر ردیف اور قافیہ کی سخت پابندی لازم
حقیقت یہ ہے کہ ہم حقیقت اور معنی سے دور جا پڑے تھے۔ لیکن فروعات
اور ظاہری پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ رنگ ہمہ گیر تھا۔ صرف شاعری
سے مخصوص نہیں۔
یہ سمجھنا کہ ہندوستان میں امن و عافیت کی کمی ہمارے ادب کو پستی کی طرف
لیجا رہی تھی حقیقت پر پردہ ڈالنا ہوگا۔ جب کہ عرب زمانۂ جاہلیت کا ادب تیار کر رہا
تھا۔ حنظلہ وفا اور خودداری کا پیغام پہنچا رہا تھا۔ جرأت اور بہادری
کا سبق دے رہا تھا۔ اسوقت صحرائے عرب میں امن و امان نام کو نہ تھا۔
حقیقت یہ تھا کہ پُرخطر زندگی اندیشہ ناک معیشت جوہرِ انسانی کو سطح پر لاتی
ہے اور متمدن مامون زندگی۔ فراوانیٔ عیش و نشاط کا باعث ہوتی اور خیالات کو
ابتذال کی طرف لیجاتی ہے۔ برخلاف اس کے خطرہ اندیشہ اور مصائب انسانی ہمدردی
اخوت اور یگانگت کے جذبہ کو ابھارتے اکساتے اور منظرِ عام پر لاتے ہیں۔
داغ کی رندانہ روی۔ عاشقانہ گوئی اور رنگ تغزل ملاحظہ ہو اور ساتھ کے
ساتھ اسی شاعر کا شہر آشوب دیکھیے۔ زمین آسمان کا فرق ہے ایک طرف درد اور ہمدردی
کی تصویر نظر آ رہی ہے دوسری طرف پستی اپنا رنگ جما رہی ہیں۔ وہی شاعر ہے وہی
داغ۔ ایک طرف محفلِ عیش سے مینا بدوش نکلا ہے چھینٹے اڑاتا مست بناتا چلا جا رہا ہے
دوسری طرف بربادیٔ جہاں آباد سے دل میں کسک سی پیدا ہو گئی ہے۔ شہر آجڑ ہیں

دماغ ہے۔ مصائب روزگار دیکھ کر پھوٹ پڑا یہ نکلا سینہ کی سیاہیاں دھوتا
خس و خاشاک بہاتا چلا جا رہا ہے۔
اس کے علاوہ صاحب کمال ہر حال میں اپنا کمال دکھا جاتے اور منوا جاتے
ہیں۔ اور جن میں جوہرِ ذاتی کی کمی ہوتی ہے۔ وہ متمدن زمانہ کی امداد کا سہارا
ڈھونڈتے ہیں۔
جس طرح سچا ہیرا تہِ خاک بھی چمک دے جاتا ہے اور امیٹیشن خوشنما کیس خوبصورت
جڑائی اور بجلی کی روشنی کا محتاج رہتا ہے اور اس فضا کے باہر اسکی روشنی ماند پڑ جاتی
ہے۔ حقیقت کملا جاتی ہے۔ اسی طرح مصنوعی ادیب متمدن زمانہ کے دست نگر
ہوتے ہیں جبکہ محض جوہرِ ذاتی برسرِ مقابلہ نہیں آتا بلکہ تمدن کے دوسرے آلۂ کار
بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً دولت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ غدر سے پہلے جو واہ واہ
شہزادوں کے لچر پوچ اور بے معنی اشعار پر ہوتی تھی بڑے سے بڑے شاعر اس
تحسین و آفریں سے محروم نظر آتے تھے۔ آج بھی آپ کے ہاں ایک مثل اس حقیقت
کو واضح کر رہی ہے۔ کلام الملوک ملوک الکلام
اس قسم کے مصنوعی جواہر متمدن زمانہ میں امن و امان کے زیرِ سایہ دولت
و ثروت کے پرتو میں اپنی جھوٹی چمک دمک دکھا تاریخ ادب میں جگہ پا لیتے ہیں۔
لیکن جب وہ فضا ختم ہو جاتی ہے۔ زمانہ رنگ بدلتا اور ان جواہرات کو تنقید
کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو یہ مصنوعی سنگ ریزہ شیشہ کے ٹکڑے سارے تاریخ
کی قدر و قیمت گھٹا دیتے اور اس تو اہلِ نظر کی نظروں سے گرا دیتے ہیں۔
یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ مالکِ تاج و نگیں
اپنے رنگ میں تھے۔ اہلِ دربار کے رگ و پے میں نمک حرامی اور غداری سرایت
کر گئی تھی۔ امرائے مردافگنِ عیش و نشاط کا شکار۔ شاعر بھی اسی محفلِ رنگ و
بو میں تھے۔ خم کے خم لنڈھاتے جام پر جام چڑھاتے۔ رونقِ بزمِ رندانہ تھے۔
اپنے سماج کا نقشہ کھینچ گئے اور آنیوالی نسلوں کیلئے مسموم فضا چھوڑ مرے۔
بڑے میاں سر جھکائے بیٹھے تھے کہ نوجوان نے ایک اور ورق الٹا

نیا راگ

ایشیا

تتمہ ابواب

نظم و غزل

ماد[illegible]ت ۱۹۳۰ء

مطربہ

مطربہ! جب ساز پر زخمہ لگا دیتی ہے تو
بام و در پر دوڑتا ہے اک کیفِ بے خودی
مستیاں پھرتی ہیں اتراتی ہوا کے دوش پر
مضطرب ہوتے ہیں منظر رقص کرنے کیلئے
جھومتی ہے محفلِ انجم، بساطِ چرخ پر
موجزن ہوتا ہے ہر ذرہ میں دریائے نشاط
گھاٹیوں میں ولولے گرتے ہیں سُریلے آبشار
کروٹیں لیتی ہے دلمیں اک بہشتِ رنگ و بو
کیا کہوں میں زمزمے تیری ہیں کتنے پُر اثر؟
یہ گماں ہوتا ہے رہ رہ کر بہا جاتا ہوں میں
کھلنے لگتے ہیں یکایک مجھ پہ اسرارِ حیات
راگنی کی آنچ چھو لیتی ہے میری روح کو
ختم کر چکتی ہے لیکن جب سرودِ سرمدی

کل فضا میں سیلِ موسیقی بہا دیتی ہے تو
خرمنِ ادراک پر بجلی گرا دیتی ہے تو
بربطِ عشرت کا وہ نغمہ سنا دیتی ہے تو
خواب سے ہر ایک ذرہ کو جگا دیتی ہے تو
وجد ساماں، ماہِ تاباں کو بنا دیتی ہے تو
صفحۂ ہستی سے نقشِ غم مٹا دیتی ہے تو
گلشنِ احساس میں کلیاں کھلا دیتی ہے تو
کل جہاں کو اسقدر رنگیں بنا دیتی ہے تو
زہرہ و پروین کو نظروں سے گرا دیتی ہے تو!
زمزموں کی زد میں ہر شے کو بہا دیتی ہے تو
جو حجاباتِ نظر ہیں سب ہٹا دیتی ہے تو
ولولے سوئے ہوئے، دلمیں جگا دیتی ہے تو
دیکھ کر اسوقت مجھ کو مسکرا دیتی ہے تو

جذب کر دیتی ہے مجھ میں اُن بہاروں کا اثر
قلب میں جن سے نئے غنچے کھلا دیتی ہے تو

حسن یحیٰی عندلیب۔ ایم اے

تم مجھے بھول جاؤ گے !

چاہ بہت جتاؤ گے   دیدہ و دل پہ چھاؤ گے !
سر کی قسم بھی کھاؤ گے   پہلے تو یوں لبھاؤ گے !
آنکھ نہ پھر ملاؤ گے !
تم مجھے بھول جاؤ گے !

جور پہ جور اٹھاؤں گی   چوٹ پہ چوٹ کھاؤں گی !
اُف نہ زباں پہ لاؤں گی   شانِ وفا دکھاؤں گی !
دیکھوں گی جو دکھاؤ گے !
تم مجھے بھول جاؤ گے !

میں نے یہ مانا بیتی بھی   رات برہ کی دکھ بھری !
ٹھنڈی ہوائیں صبح کی   آنکھ اگر جھپک گئی !
سپنے میں بھی نہ آؤ گے !
تم مجھے بھول جاؤ گے !

فصلِ بہار آئے گی   غم کا پیام لائے گی !
زخمِ جگر کھلائے گی   دل کو جنوں سکھائے گی !
ہوش مرے اڑاؤ گے !
تم مجھے بھول جاؤ گے !

کوکیں گی کوئلیں اُدھر   یا پی پپیہا بھی اُدھر !
"پی کہاں" چیخ چیخ کر   توڑے گا دل میں نیشتر !
خون مجھے رُلاؤ گے !
تم مجھے بھول جاؤ گے !

اوس کی ننھی بوندیاں   مے کی بھری کٹوریاں !
چاندنی رات کا سماں   دِل پہ گرینگی بجلیاں !
تم نہ لگی بجھاؤ گے !
تم مجھے بھول جاؤ گے !

چاند چکور، اور چھور   مورنی پاس ایک مور !
میری دکھے گی پور پور   دھڑکے گا دل بھی زور زور !
تم نہ درس دکھاؤ گے !
تم مجھے بھول جاؤ گے !

جب مری روحِ بے دیار   ہوگی عدم میں بیقرار
ڈھونڈھیگی تمکو بار بار   ٹھوکریں کھائیگی ہزار
پھر بھی ترس نہ کھاؤ گے !!!
تم مجھے بھول جاؤ گے !!!

"سروش عسکری طباطبائی"

رقص

اے مری ہم رقص مجھکو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گھر کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈھ لے مجھ کو نشاں پالے مرا
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے!
اے مری ہم رقص مجھکو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص گھر میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے!
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے
ایک خونی بھیڑیے سے کم نہیں
اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لمحہ لمحہ اور بھی تیرے قریب!
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھسے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!
عہد پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں
اسلئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

م۔ ن۔ راشد، ایم اے

زمینِ وطن

زمینِ وطن ! اے زمینِ وطن !
ازل میں جہاں سب سے پہلے حیات
لئے اپنے آغوش میں کائنات
جلاتی ہوئی شمعِ ذات وصفات
حجابِ عدم سے ہوئی جلوہ زن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن
جہاں بسترِ برف سے مستِ خواب
اٹھا آنکھ ملتا ہوا آفتاب
لٹاتی ہوئی جلوۂ بے نقاب
جہاں آئی پہلی سنہری کرن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن
جہاں پہلے تخلیقِ انساں ہوئی
تری رحمت اُس کی نگہباں ہوئی
خرد اس کی گہوارہ جُنباں ہوئی
بشر نے تمدن کے سیکھے چلن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن
جہاں ابنِ آدم پلا گود یوں
جہاں نسلِ انساں چلی گھٹنیوں
جہاں چشمِ حیرت کے کیا، اور کیوں؟
لبِ طفل تک آئے بن کر سخن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن
جہاں خیر و شر میں ہوا امتیاز
بنی زیست مجموعۂ سوز و ساز
کھلا رازِ ایماں سے ہستی کا راز
تراشے گئے ایزد و اہرمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن
وہ انساں کا بڑھتا ہوا اعتقاد
بنے دیوتا آتش و آب و باد
پرستش پہ دارو مدارِ مراد
وہ ویدوں کے میٹھے سریلے بھجن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن
جہاں اک کنول پر بہ صد دلبری
اُٹھی چشمۂ شیر سے لکشمی
قدمِ شو کے شانوں پہ دھرتی ہوئی
اُتر آئی گنگا جہاں خندہ زن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

جہاں تیرے جلوے ہویدا ہوئے
جہاں اہلِ دل آن پہ شیدا ہوئے
جہاں گوتم اور کرشن پیدا ہوئے
جہانِ سازِ فطرت ہوا نغمہ زن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

گئے چھوڑ کر اپنے اپنے نشاں
ہوئے باری باری جہاں کامراں
جہاں آکے اترا ہر اک کارواں
مغل۔ آریہ۔ ترک۔ تاتار۔ ہَن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

لئے غیر ملکوں نے تجھ سے سبق
تری داستاں کے اڑائے ورق
ترے خوشہ چیں از شفق تا شفق
عرب۔ مصر۔ یونان۔ چین اور ختن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

شبستانِ ایران کا سامان و ساز
ترقیِ بازارِ وینس کا راز
وہ خود اہلِ روما کو تھا جن پہ ناز
ترے دستکار اور ترے اہلِ فن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

کہاں ہیں ترے سورما صف شکن؟
ترے اہلِ دانش! ترے اہلِ فن؟
کہاں ہے ترا اقتدارِ کہن؟
ترے رام لچھمن۔ بھرت شترگن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

کسے آج آئے گا اس کا یقین
اشوک اور بھارت کی اے سرزمیں
ترے در پہ گھستی تھی دنیا جبیں
کبھی تو ہی تھی سجدہ گاہِ زمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشکِ خلدِ بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں
کہ جیسے سنواری گئی ہو دلہن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

نہیں کوئی تیرے لئے پُرخروش
تری راہ میں عازم و سخت کوش
نہ نادر کا جذبہ نہ غزنی کا جوش
نہ وہ بندۂ زر نہ وہ بت شکن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

کوئی اب تری سمت آتا نہیں
تجھے کوئی اپنا بناتا نہیں
نظر تیری جانب اٹھاتا نہیں
کہ جیسے کوئی لاش ہو بے کفن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن
مٹا کر تری گرم بازاریاں

بنیں اہلِ یورپ کی زرداریاں
تری خوں کی سینچی ہوئی کیاریاں
یہ مغرب کے سب لہلہاتے چمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

نہیں کون آلودۂ خون و خاک ؟
ہوا ہو نہ جو اس فضا میں ہلاک ؟
جسے کہہ سکیں ہم غلامی سے پاک ؟
نہ گنگ ہمالہ نہ آبِ جمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

ترے دورِ ماضی کے آئینہ دار
تری شانِ اسلاف کی یادگار
کہیں کچھ کھنڈر ہیں کہیں کچھ مزار
نہ وہ اہلِ محفل نہ وہ انجمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

یہ دہلی کے نقش و نگارِ خموش
یہ چتوڑ کی خاکِ لالہ فروش
یہ کیلاش کی چوٹیاں برف پوش
تجھے ڈھونڈتی ہے عروجِ کہن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

یہ معصوم بچے ترے شیر خوار
امیدیں لئے شوق سے ہم کنار
گلے ان کے ہوں اور غلامی کے ہار
اور آئے نہ تیری جبیں پر شکن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

یہ دوشیزگانِ وطن سبز خام
رہیں یوں کنیزیں - جنیں یوں غلام
تری تیغِ غیرت نہ ہو بے نیام
ہوا ہے سفید آہ خونِ وطن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

تجھے صولتِ اکبری کی قسم
تجھے عصمتِ پدمنی کی قسم
تجھے خاکِ پانی پتی کی قسم
پھر اک بار دکھلا جلالِ کہن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

بدلنے کو ہے موسمِ روزگار
ہواؤں میں ہے ایک کیفِ خمار
تری سمت پھر آ رہی ہے بہار
لئے پھر گل و لالہ و نسترن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

پھر آنے کو ہیں سوتے گلشن اسیر
برسنے کو ہے پھر گھٹاؤں سے نیر
چٹانوں میں ہے مضطرب جوئے شیر
کہاں ہے کہاں تیشۂ کوہکن !
زمینِ وطن اے زمینِ وطن ،

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے
مساواتِ انساں کا پھر نام لے
روایاتِ ماضی سے پھر کام لے
وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمیں وطن اے زمینِ وطن !

آنند نرائن ملا ایم اے

نذرِ غالب

(جو ساغرؔ نے ۱۶ فروری کو ۹ بجکر ۵ منٹ پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براڈ کاسٹ کی)

بنامِ غالبؔ سدرہ نشیں پلا ساقی — کہ تشنہ لب ہے بہت روحِ ارتقا ساقی
ملیح دوش پہ مستی کی جھاگلیں لے کر — وہ آیا دیکھ گھٹاؤں کا قافلہ ساقی

"بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے"

نگاہِ کم یہ مگر روحِ ساغرِ جم ہے
کہیں نہ فاش ہوں اسرارِ میکدہ ساقی

(۲)

کہاں کا بربط و مضراب اور کہاں کا رباب — نظر سے آج تو لے کارِ زمزمہ ساقی
بکھیر غالبِ آشفتہ سر کی یاد میں زلف — کہ مدتوں سے تخیل ہے نارسا ساقی

"زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے"

زباں نے وجد کیا عشرتِ بیاں کیلئے
لبوں نے بحرِ ترنم بہا دیا ساقی

(۳)

ابد کی نیند سے حافظؔ کو آج کر بیدار — عدم کے خواب سے خیامؔ کو جگا ساقی
سرورِ میکشِ[1] المانوی نہیں کامل — ہے جس پہ مُہرا آسودہ اسے پلا ساقی
مئے عجم سے یہ رندِ عرب ہے کیوں محروم — ابو نواس کے مرقد پہ بھی بہا ساقی
اور اس کے بعد جو کچھ بچ رہے تو انکو بھی — کھڑے ہیں دیر سے روح الامیں سا ساقی

"یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے!
کہ غیرِ جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں"

تصورات کی چشم و نظر میں خاک نہیں
تمام عالمِ امکاں ہے گلکدہ ساقی

(۴)

جو کفر وجد میں آئے تو مست ہو ایماں — نشانہ آج نہ جائے کوئی خطا ساقی

"خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں"

[1] گوئٹے

تری نظر میں گہر ہے، گہر میں خاک نہیں
ترے وجود سے روشن ہے میکدہ ساقی

جو تو نے جامِ نظر میں چھپا کے رکھا ہے
وہ ایک جرعۂ باقی مجھے پلا ساقی

ترے کرم کے میں صدقے مری طلب کو بھی دیکھ
تجھی کو مانگتا ہوں تجھ سے برملا ساقی

لرز رہی ہے ہر اک موجِ بادہ ساغر میں
چھلک کے جام یہ مستی میں کیا کہا ساقی

"نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ"

نیامِ خطِ پیالہ سے اٹھ کے خنجر کھینچ
یہ دل، یہ سر ہے، یہ جان اب ہے دیر کیا ساقی

صدائے پردۂ الہام گونج اٹھی جسکی
ترے نثار وہی نغمہ گنگنا ساقی

نہ دیکھ بزم میں جھک جھک کے دُردِ غالب کو
ہر ایک بوند ہے اسکی فلک نما ساقی

اسد کے نام پہ کیا حل کیا یہ ساغر میں
گلاب و بادہ ہے یا شعر و فلسفہ ساقی

"گرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے"

یہ میکدہ تری ہستی کا عکسِ رنگیں ہے
ہر ایک ذرہ ہے مستی کا آئینا ساقی

زبانِ غالبِ اعظم کو دے نویدِ حیات
بعید تجھ سے نہیں کچھ یہ معجزہ ساقی

مزہ تو جب ہے کہ ذوقِ ظفر بھی مست ہو آج
کمالِ جادوئے ساقی گری دکھا ساقی

"علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں"

تعینات پہ رندوں کو اعتقاد نہیں
جہاں سے قیدِ زمان و مکاں اٹھا ساقی

"ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کیلئے"

نگینہ چاہیے اس خاتمِ جہاں کے لیے
فلک سے کوئی ستارہ ہی توڑ لا ساقی

ساغر نظامی

کوق

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

۱۵ اگست ۱۹۴۰ء

کسوٹی

بیداری ایک انقلاب عظیم ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں انقلاب۔ جن لوگوں کے دلوں میں، ایک مرتبہ بیداری کی موجیں دوڑ جاتی ہیں وہ پھر وہ ماضی کے کسی ایسے طریقے کار کو قائم نہیں رہنے دینا چاہتے جس سے قدامت اور کہنگی کا اظہار ہوتا ہے اور جو زمانہ کی رفتار ترقی کا ساتھ نہ دے سکے۔

غلام ہندوستان کے رہنے والوں کو بھی جب سے اپنی پستی و ذلت کا احساس ہوا بیداری کا ایک طوفان ان کے دلوں میں کروٹیں لے رہا ہے۔ وہ اپنی کارگاہِ عمل کے ہر گوشہ کو پستی سے اٹھا کر بلندی پر پہونچا دینا چاہتے ہیں وہ زندگی کے تمام شعبوں میں ایک بڑی تبدیلی کے خواہشمند ہیں۔ وہ گذشتہ زمانے کے اس تمام فرسودہ نظامِ عمل کو جس نے انھیں مفلوج بنانے میں مدد کی ایک جدید ترقی یافتہ سانچے میں ڈھالنے کے آرزومند ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا تمدن۔ ان کی تہذیب۔ ان کی معاشرت۔ ان کا علم و ادب سب نیا ہو۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی طرح جدید اصولوں کا حامل ہو اور کسی طرح وہ اپنی زندگیوں کو ایسی راہ پر ڈالیں جو کہ ان کی موجودہ ذلیل۔ پست اور محکوم حالت سے انھیں نکال کر بلند و رفیع منزل تک لے جا سکے۔ چنانچہ ہمارے خیالات بھی بدل رہے ہیں ہمارا عمل بھی۔ ہم زندگی کے متعلق غور و فکر کرنے کے طریقوں کو بھی بدل رہے ہیں۔ ہمارا رہنے سہنے کا طریقہ۔ ہمارا لباس۔ ہمارا آپس کا سلوک ہماری گفتگو سب پر ہمارے احساسات کا اثر پڑ رہا ہے۔ ہماری پچاس سال پہلے کی زندگی کا اگر آج کی زندگی سے مقابلہ کیا جائے تو ایک نمایاں فرق نظر آئے گا۔

ہمارے موجودہ تنزل کے اسباب میں سب سے زیادہ قابل توجہ سبب ہمارا طریقۂ تعلیم ہے۔ یہی نہیں کہ ہماری درسی کتب ہمارے ملک کے مختلف رہنے والوں میں نفاق و افتراق کے احساسات پیدا کرتی ہیں۔ انھیں محکومی و غلامی پر اکتفا کرنے کی ترغیب دلاتی ہیں۔ ان کے دلوں سے زندگی کی تڑپ احساس غیرت اور جذبات قومی کو فنا کرتی ہیں۔ بلکہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کی ابتدا تک ٹھیک نہیں ہے۔ چھوٹے بچوں کو ایسے غلط طریقوں پر تعلیم دی جاتی ہے کہ وقت بھی زیادہ صرف ہو جاتا ہے۔ اور حاصل بھی کم ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے طریقوں کو تبدیل کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ الفاظ بغیر ذہن نشین کرائے ہوئے رٹوا دیے جائیں۔ ایسے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں جن سے بچے "آواز" اور نظر (تصاویر وغیرہ کو دیکھ کر) سے الفاظ کی صورتوں اور حروف ملانے کے اصولوں کو سمجھ لیں۔

اس سلسلہ میں ہندوستان کی قابل فخر درسگاہ جامعہ ملیہ دہلی بہت نمایاں حصہ لے رہی ہے۔ اس نے کافی غور و خوض کے بعد ابتدائی تعلیم کیلئے کتابیں تیار کی ہیں اور بچوں کو تعلیم دینے کے طریقے بھی بتائے ہیں۔ جس سے یہ اصول معلوم ہو گئے کہ موجودہ زمانے میں بچوں کو کیسے پڑھایا جائے اور بچے کیسے پڑھیں۔ تاکہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بہتر تعلیم حاصل ہو سکے۔ ذیل میں ہم ابتدائی تعلیم کی ان تمام کتابوں کے نام درج کرتے ہیں جو ہمارے پاس تبصرہ کے لئے آئی ہیں۔

۱۔ **بچوں کا قاعدہ** یہ بچوں کا ابتدائی قاعدہ ہے۔ جس کے ذریعہ سے بچہ حروف سے آگاہ اور حروف کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کے طریقوں سے آشنا ہوتا ہے۔

۲۔ **حرفہ کا قاعدہ** اس قاعدہ میں بنیادی حرفہ کی مدد سے زبان سیکھنے کے طریقے درج ہیں۔ اس کے علاوہ کہانی کا طریقہ اور طریق الصوت کے ذریعے بھی بتائے گئے ہیں۔

۳۔ **نئی کتاب** اس کتاب میں تصویروں اور آوازوں کے ذریعہ تعلیم دینے کے طریقے درج ہیں۔

۴۔ **ہندوستانی کی پہلی کتاب** بچوں کو ان کی وطنی زبان سکھانے کے ابتدائی طریقے۔ اس کتاب میں درج ہیں۔ اسکو پڑھنے کے بعد بچہ بڑے جملے آسانی سے بنا سکتا ہے۔

رہنماے قاعدہ — اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ . . . . بچوں کو کہانی کے طریقے، اور "طریق الصوت" کے اصولوں پر کس طرح تعلیم دی جائے۔ کہانی کیسے سنی جائے اور کیسے سنائی جائے۔ مختلف کھیلوں کے ذریعہ کیسے تعلیم دی جائے وغیرہ۔

بالغ مبتدیوں کی تعلیم کا مسئلہ . . . . بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک میں بالغ جاہلوں کی بہت کثرت ہے۔ چنانچہ جامعہ نے بالغ مبتدیوں کی تعلیم کیلئے بھی ایک پورا سیٹ تیار کیا ہے جس کی حسب ذیل کتابیں ہمارے سامنے ہیں۔

اُردو سکھانے کا آسان طریقہ — اس کتاب کے ذریعہ بالغ مبتدیوں کو ابتدائی تعلیم دینے حروف کی آواز سے پہچاننے ان کو ملانے۔ الفاظ اور جملے بنانے کے طریقے معلوم ہو سکتے ہیں۔

قاعدہ
اُردو پڑھنے کا قاعدہ — یہ دونوں کتابیں بالغ مبتدیوں کی ابتدائی تعلیم کیلئے ہیں اور ان کے سلسلہ کا نام "سلسلۂ تعلیم و ترقی" رکھا گیا ہے۔

۱۔ **نماز** — مسلمان بالغ مبتدیوں کو نماز پڑھنے کا پورا طریقہ بتایا گیا ہے۔

۲۔ **حکایتیں**
۳۔ " — ان دونوں کتابوں میں مختصر کہانیاں ہیں جو ابتدائی تعلیم پانے والوں کے لئے نہایت دلچسپ ہیں۔

۴۔ **حبیبِ خدا** — پیغامبر اسلام سرور کائنات صلعم کی مقدس زندگی کے مختصر حالات آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب الیاس احمد مجتبیٰ صاحب کی تصنیف ہے۔

۵۔ **نظمیں** — محمد شفیع صاحب نیر کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے۔

۶۔ **میونسپلٹی** — شیخ فضل الرحمٰن قدوائی فجی ایم اے (علیگ) کی تصنیف ہے۔ جس میں میونسپلٹی کے اصول اور مختصر حالات درج ہیں۔

۷۔ **صدیق اکبرؓ** — پیغامبر اسلام صلعم کے عزیز دوست حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مختصر حالات زندگی آسان زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔

۸۔ **خط وکتابت** — ابتدائی تعلیم پانے والوں کو خط لکھنے کے طریقوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ سب عزیزوں کو بھی خط لکھنے کے طریقے درج نہیں ہیں دو چار خط اور ہونے ضروری تھے۔

۹۔ **ضلع کا انتظام** — ہر ضلع میں سرکاری انتظام کیا ہے۔ مختصر طور پر اس کتاب میں درج ہے۔ یہ کتاب شیخ فضل الرحمٰن قدوائی فجی کی تصنیف ہے۔

۱۰۔ **قومی گیت** — اس چھوٹی سی کتاب میں ایسی چھوٹی چھوٹی نظمیں درج ہیں۔ جو فرقہ وارانہ نفاق کے . . . . . جذبات سے بلند ہو کر قومی احساسات کی ترجمانی میں لکھی گئی ہیں۔

۱۱۔ **غزلیں** — اس کتاب میں ابتدائی تعلیم پانے والوں کے لئے چند غزلیں درج ہیں۔ بہتر ہوتا کہ اس میں موجودہ اساتذہ کی ایک ایک مختصر غزل درج کی جاتی۔ موجودہ شعرا میں سے صرف ایک یا دو شعرا کی غزلیں درج ہیں اور وہ بھی مرتب کے ذاتی رجحان کا پتہ دیتی ہیں

۱۲۔ **ہمارا ہندوستان** — ہمارے ملک کے مختصر جغرافیائی اور تاریخی حالات

۱۳۔ **امامی بھی پڑھنے لگے** — یہ ایک مختصر دلچسپ کہانی ہے۔ جو ابتدائی تعلیم کا شوق بھی دلاتی ہے۔

۱۴۔ **عمر فاروقؓ** — پیغامبر اسلام صلعم کے ایک اور عزیز ترین دوست حضرت عمر فاروقؓ کے مختصر حالات زندگی۔ یہ کتاب بھی الیاس احمد مجتبیٰ صاحب ایم۔ اے علیگ کی تصنیف ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ بالغ مبتدیوں کو ابتدائی تعلیم دینے کے لئے صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب بی ٹی پرنسپل میڈیکل کالج لکھنؤ و سابق وزیر تعلیم بھوپال نے چند کتب تصنیف فرمائی ہیں جنھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ ان میں سے تین کتابیں "اُردو کا قاعدہ" حصہ دوم و حصہ سوم ہمارے پیش نظر ہیں۔ یہ تینوں کتابیں نہایت مفید اور بالغ مبتدیوں

کی تعلیم دینے کے لئے بہترین ہیں۔
ان سب کتابوں کے ملنے کا پتہ - مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ
قرول باغ نئی دہلی۔

فہم قرآن

از محمد سعید احمد ایم اے۔ (فاضل دیوبند)۔
قیمت مجلد ۔ غیر مجلد
ندوۃ المصنفین - قرول باغ - نئی دہلی

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی کتب یا الہامی کتابیں عام طور پر تمام عالم انسانیت کیلئے ہدایات کا خزانہ لاتی ہیں۔ مگر یہ کہنا کسی طرح بھی صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا کہ ان کتابوں کی تمام عبارتوں کو ہر شخص (خواہ وہ کتنا ہی کم پڑھا لکھا ہو) آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ عام لوگ دنیا کے بہترین فلسفیوں، حکیموں اور ادیبوں کے کلام کو بغیر تشریحات کے نہیں سمجھتے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ آسمانی کتابوں کو بغیر کسی "اصول تشریح" یا "طریقہ تفسیر" کے سمجھ لیں گے۔ یہ معاملہ عوام کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ اکثر خواص بھی اس راہ میں ڈگمگاتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی کتابوں کی بعض عبارتوں کے مفہوم مختلف لوگوں کے خیال میں مختلف ہیں۔ یہ اختلاف بعض جگہ اسقدر شدید ہو گیا ہے کہ اسی بنیاد پر ایک ایک مذہب کے کئی کئی فرقے ہو گئے ہیں اور ہر فرقے کے رہنما اپنے "ذاتی علم" اور "خود آگاہی" پر کامل یقین رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانہ بہت "ہنگامہ خیز" اور "آزاد" زمانہ ہے خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں "مذاہب" کے لئے شدید مرحلہ پیدا ہو گیا ہے۔ انسانوں کے غور و فکر کرنے کے طریقے بدل گئے ہیں۔ انھوں نے حیات انسانی پر سوچنے کے چند ٹھوس اور عملی اصول وضع کر لئے ہیں اور وہ اب مذہب کو بھی اپنی بنائی ہوئی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ علمبردارانِ مذاہب نے زمانہ کی اس تبدیلی اور انسانی خیالات کے انقلاب کو محسوس کر کے یہ طریقہ اختیار کرنا شروع کر دیا ہے کہ ہر موقع کے لحاظ سے اپنی مذہبی کتاب کی عبارتوں کا مفہوم توڑ مروڑ کر بتاتے ہیں جو عام انسانوں یا معترضین کے خیالات سے مطابق ہو جاتا ہے۔

انہیں باتوں کا خیال کر کے محمد سعید احمد ایم۔ اے (فاضل دیوبند) نے "فہم قرآن" تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے قرآن کے سمجھنے کے طریقے تحریر فرمائے ہیں۔

مولوی قطب الدین صاحب دہلوی مہاجر مکی نے اپنی کتاب "جامع التفاسیر" میں لکھا ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر اور ترجمے کے لئے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ تینوں باتیں نہ ہونگی تو تفسیر کے سلسلے میں رسم تمسیخ کی ضرورت ہو گی۔

۱- جن اصحاب کرام کے سامنے تنزیل ہوئی ہو اور جو گواہانِ وحی ہوں ان کی تفسیرات سے جدا کوئی تشریح اخذ نہ کی جائے۔
۲- عربی الفاظ کے مروجہ معنی لئے جائیں۔
۳- سیاق عبارت کے خلاف تعبیر الفاظ نہ کی جائے۔

سعید صاحب نے بھی نقد کیا انہیں اصولوں کو بہت عام فہم الفاظ اور دلچسپ پیرایہ بیان میں ظاہر فرمایا ہے۔ مختلف دلائل سے آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ محض زبان داں ہونے کی وجہ سے کوئی شخص مفسر یا مترجم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تفسیر و ترجمہ کا کام کرنے کے لئے ذوق سخن سنجی۔ واقعات و حالات عرب سے واقفیت اور وہاں کے رہنے والوں کی معاشرت، تمدن اور عربی زبان کے قواعد و ضوابط سب پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ کہیں کہیں اس طرز سے بھی لطیف اشارہ کر دیا ہے کہ مفسر اور مترجم کو علم روح و اذواق روحانی کا بھی حامل ہونا چاہئے۔

ہمیں ایک جگہ سعید صاحب سے تھوڑا سا اختلاف بھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: -
"قرآن پاک کی کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس پر مطلقاً عمل کرنا ناجائز ہو"
اور آیۃ جہاد کی مثال دیکر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ
"کسی ایک حکم کو دوسرے حکم کے اعتبار سے منسوخ زمانہ یعنی ہنگامی طور پر منسوخ کہہ سکتے ہیں جس طرح طبیب ایک نسخہ کو ملتوی کر کے دوسرا نسخہ لکھتا ہے"
آگے چل کر سعید صاحب نے یہ مسئلہ بالکل ہی صاف کر دیا ہے: -

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی آیۃ کو کسی آیۃ کیلئے ناسخ کہنے سے مراد یہ ہے کہ منسوخ آیۃ کا حکم بالکل زائل ہوچکا اور اب اس پر عمل کرنا قطعی طور پر ممنوع قرار دیدیا گیا ہے تو جیسا ابھی عرض کیا گیا اس معنی کے اعتبار سے کوئی آیۃ منسوخ نہیں ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ تنسیخ کی وجوہ یہ بھی ہیں جو مؤلف نے بیان کی ہیں کہ واقعات پیش آمدہ کی وجہ سے احکامات تبدیل فرمائے گئے ہیں مگر تمام منسوخ آیات کے متعلق یہ نتیجہ صحیح نہیں معلوم ہوتا طبیب کی مثال بھی یہاں صادق نہیں آتی ہے۔ طبیب کی تجویز اکثر حاکمانہ نہیں ہوتی ۔ وہ مرض کی اصل وجہ تلاش کرنے میں سرگرداں رہتا ہے ۔ اکثر اوقات اُسے پہلا نسخہ اپنی تشخیص کی تائید حاصل کرنے کے لئے بھی دینا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ عموماً ہر نسخہ سے مرض کا علاج نہیں ہوتا ۔ تجویز الٰہی اس سے قطعی جُداگانہ ہے ۔ اسے مرض کو معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس کے نسخہ میں جو کچھ تحریر ہوتا ہے وہ اس مرض کا قطعی علاج ہوتا ہے جس کے لئے وہ نسخہ تجویز ہوتا ہے ۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے چند آیات قرآنی بھی موجود ہیں ۔

دوسرے پارہ کی تیسری آیت مبارک کا جزو ——— فول وجهك شطر المسجد الحرام ——— اس آیۃ سے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا منسوخ ہوگیا ۔ تو کیا مؤلف کے اصول کے مطابق وقتِ ضرورت بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا جائز ہوسکتا ہے ۔!؟

چوتھے پارہ کے تیرھویں رکوع کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت بدکاری میں مبتلا ہوجائے اور چار مردوں کی گواہیاں بھی ہوجائیں تو اس عورت کو عمر بھر کے لئے محبوس کردینا چاہئے ۔ یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ مقرر کردے ——— جب سورۂ نور میں حدِ زنا ظاہر فرمادی گئی تو اب محبوس کرنے کا سوال ہی نہیں رہا ۔ ورنہ حدود شرعیہ کا التوا لازم آتا ہے اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ آیۃ مذکور کا حکم بھی بحال قائم ہے ۔

اٹھائیسویں پارہ کے دوسرے رکوع کی چھٹی آیۃ میں منافقین کے بیکار سوالات سے بچانے کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ جب نبی کریم سے باتیں کرنا چاہو تو کچھ نذر پیش کیا کرو ——— پھر یہی حکم اسی رکوع کی آخری آیۃ سے منسوخ فرمادیا گیا ۔ اگر دونوں مسلسل آیتوں کا حکم بدستور جاری مانا جائے تو ضدین پر عمل ہونا دشوار ہے ۔

مؤلف نے اپنے خیال کی پختگی کی وجہ سے ——— ما ننسخ من آیته .... (آیۃ قرآن پاک) ——— کی ضمائر میں بھی تاویل کرکے ادیان سابقہ کی تنسیخ مراد لینا چاہی ہے ۔ مگر کلام پاک خود بھی اپنے ارشادات کی تشریح فرمادیتا ہے چنانچہ ——— واذا بدلنا آیته مکان آیته .... (آیۃ قرآن پاک) ——— میں خود تفسیر فرمادی گئی ہے ۔ کہ جب ہم کوئی آیۃ بدلتے ہیں تو اسے رسول آپ کو منکرین مفتری کہنے لگتے ہیں ——— "انما انت مفتر" نے ثابت کردیا کہ قرآن پاک کی آیات کی تبدیلی مراد ہے اور لفظ تبدیل خود ظاہر کرتا ہے کہ تبدیل شدہ حکم ناقابلِ عمل ہوگیا ۔

بہرحال قرآن پاک کے مطالعہ سے پہلے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے اور جو لوگ تفسیر قرآنی اور تشریح کلام ربانی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں ۔

حیات آزاد

از عظمت اللہ ملیح آبادی

قیمت ۸ر ۔ مکتبۂ برہان ۔ قرول باغ ۔ نئی دہلی

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت مولٰنا ابوالکلام آزاد صدر آل انڈیا کانگریس کے سوانح حیات مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں ۔ مولٰنا کی زندگی اپنے مختصر مگر نادر حالات کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اسے ہزار مرتبہ اور ہزار طریقوں سے بیان کیا جائے ۔ مولٰنا کے بلند اخلاق اور پاکیزہ سیرت کا سکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بیٹھا ہوا ہے ۔ مولٰنا ہندوستان میں صرف مسلمانوں کے واحد رہنمائے اعظم نہیں ہیں بلکہ وہ ہندوستان کی ہر قوم اور ہر ملت کی رہنمائی بحیثیت صدر آل انڈیا کانگریس فرما رہے ہیں ۔ آپ کی صلح جو مخلص وہمدرد فطرت کا چرچا آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہے ۔ اس لئے عظمت اللہ صاحب نے مولٰنا کی سوانح حیات مرتب فرماکر یقیناً ایک بہتر کام انجام دیا ہے ۔ کسی زمانے میں خود مولٰنا ممدوح نے بھی اپنے حالات زندگی اپنے قلم سے مرتب کرنے شروع کئے تھے مگر وہ آپ کی بیحد مشغولیت کی وجہ سے نامکمل رہ گئے ۔ کاش وہ مکمل ہوسکتے ۔ کیونکہ

اب تک اُن کے حالاتِ زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے وہ اس کا نصف حصّہ بھی نہیں معلوم ہوتا جو مولانا کی زندگی اپنے مختلف ادوار میں ظاہر کر چکی ہے۔ "حیاتِ آزاد" اپنے اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ کتاب ہے اور ہر سیاسی ذوق رکھنے والے کے پاس اس کا ہونا ضروری ہے۔

خیال آفریں دماغ

از عرش تیموری - قیمت ۶ ر
حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر۔ دہلی

موجودہ زمانہ تمام عالمِ انسانی کے لئے انتہائی کرب اور بے چینی کا زمانہ ہے۔ دُنیا کا کوئی ملک بھی اس عالمگیر المناکی سے محفوظ نہیں ہے۔ مصائب کی نوعیت جگہ جگہ مختلف ہے۔ کہیں اقتصادی حالات خراب ہیں کہیں سیاسی۔ کہیں اندرونی واقعات کی بناء پر ملک ایک انقلاب سے گذر رہا ہے کہیں بیرونی طاقتوں کے ہولناک حملوں کی وجہ سے۔ ایک عجیب قسم کا انتشار ہے جو تمام دُنیا کے انسانوں کی زندگیوں کو مجروح کئے دے رہا ہے۔ بعض ممالک کے انسانوں پر بالکل جانکنی کا سا عالم طاری ہے۔ ان کے اقتصادی حالات بھی خراب ہیں سیاسی بھی۔ اندرونی اختلافات کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے بیرونی طاقتوں کے سیاسی دباؤ کا بھی۔ زندگی ہر طرف سے مختلف قسم کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ بدترین حالات سامنے آ رہے ہیں۔ مظلوموں اور بیچاروں کی دردناک فریادیں۔ بیکسی و لاچاری کے اندوہناک واقعات۔ بیکاری و محکومی کے غمگین نظارے سب ایک محسوس کرنے والے دل کو زخمی کرتے ہوئے گذرتے چلے جاتے ہیں مگر دماغ باوجود انتہائی کوشش کے ان تمام آلام کا صحیح علاج تلاش کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

یہی نقشہ ہمارے ہندوستان کا ہے۔ یہاں آئے دن کے روح فرسا واقعات نے انسانی زندگی کو نہ صرف ارزاں بلکہ غیر اہم بنا دیا ہے۔ تمام ملک مختلف "مداریوں" کی تماشا گاہ بنا ہوا ہے۔ ایسے مداریوں کی جن کے "ہنر کمیل" کا مقصد اپنے فن کا مظاہرہ کرنا اور اس مظاہرے سے ذاتی منفعت حاصل کرنا ہے اور کچھ نہیں۔

یہاں پستی بھی ہے بیچارگی بھی۔ سیاسی انتشار بھی ہے۔ غیر سیاسی اضطرار بھی۔ فلاکت بھی ہے ہلاکت بھی۔ بیکاری بھی ہے جمود بھی۔ انتشارِ خیال بھی ہے انحطاطِ عمل بھی۔ زندگیوں سے بیزاری بھی ہے۔ موت کا خوف بھی۔ یہاں کے رہنے والوں کی قوتِ ارادی۔ قوتِ فیصلہ۔ قوتِ عمل سب مفلوج بھی ہیں" غلام بھی۔ دماغوں اور دلوں میں امنگ احساسِ ترقی اور ذوقِ عظمت کی بجائے سمتدروں کا سا مدّوجزر ہے اور وہ بھی لاحاصل!

عرش تیموری صاحب کی مختصر تصنیف "خیال آفریں دماغ" انہیں ہولناک تصویروں کا ایک بہت مختصر مگر جامع مرقع ہے۔ یہ ایک تجزیاتی و تحلیلی تمثیل ہے۔ اس تمثیل کا چھوٹا سا پلاٹ ہے۔ تنویر ہمارے ملک کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ شاعر ادیب اور مفکر مگر بیکار۔ مفلس اور پریشان حال۔ وہ گرد و پیش کے حالات کو دیکھتا ہے۔ محسوس بھی کرتا ہے۔ اُن کو بہتر بنانے کی تدابیر بھی سوچنا چاہتا ہے مگر مجبور ہے بے بس ہے۔ یہاں تک مجبور ہے کہ ماحول کے بدترین حالات کو سنوارنا تو درکنار خود جس کمرے میں رہتا ہے اس کا کرایہ تک ادا نہیں کرسکتا۔ اس کا دماغ اپنے اور ماحول کے مختلف اندوہناک حالات کے تصوّرات میں مصروف رہتا ہے مگر اس طرح کہ وہ ایک مصیبت کا علاج بھی نہیں کرسکتا وہ اگر کچھ کرسکتا ہے تو صرف اتنا کہ پاگلوں کی طرح دیکھے۔ دیوانوں کی طرح محسوس کرے اور مجبوروں کی طرح گذر جائے تو اسی طرح اور انہیں حالات میں سوچ رہا ہے۔ پریشان خیالات کا ایک سلسلہ اس کے تقریبًا ماؤف دماغ سے گذر رہا ہے یہ سلسلہ گذرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی روح دنیوی مصائب و آلام سے قطعی آزاد ہو جاتی ہے۔ اسی وقت مالک مکان احسن خوش و خرم اس کے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور یہ دردناک منظر دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ یہ ہے کل پلاٹ!

عرش تیموری صاحب نے تنویر کی دماغی حالت کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اس کے غمگین حالاتِ زندگی اور مضطرب احساسات پر جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ حالات کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ بھی ہے اور غور و فکر کی ایک دعوت بھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرش صاحب نے جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے وہ اس مختصر پلاٹ سے بھی پورا ہو جاتا ہے

مگر ہماری رائے میں اگر پلاٹ اس قدر مختصر نہ ہوتا تو تمثیل میں زیادہ دلکشی پیدا ہو جاتی ۔

لکھائی چھپائی خاصی ہے ۔ اور قیمت بھی کتاب کی اہمیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہے ۔

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام

قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۔

ملنے کا پتہ :- ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی ۔

اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ درج ہیں : ـــ

"جس میں مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہر آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے مقابلہ میں اسلام کے پُرسکون اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔"

اس کے ساتھ ہی دیباچہ میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں ۔

"ساتھ ہی یہ بھی دکھلایا گیا ہے کہ امت اسلامیہ اور امت نصرانیہ میں باہمی نسبت اور کاروباری توازن کیا ہے اور ان دونوں میں سے حقیقی ترقی کس نے کی ۔"

"اسی ذیل میں اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ نصرانی تمدن کا حقیقی تقابل صرف اسلامی تمدن سے ہے اور یہ کہ آج کی تمدنی فکریات اور سائنٹفک ایجادات کو اسلام کے اخلاقی نظام سے کیا نسبت ہے ۔"

اس کے آگے ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے :ـــ

"ان مباحث کو سامنے رکھ کر اس کتاب کو فلسفۂ ذہنیت اقوام کے عنوان سے تعبیر کیا جائے تو بے محل نہیں ۔"

یہ اور اس قسم کے اور جملوں کو پڑھ کر ہر انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جو اہلِ قلم مذکورہ بالا خصوصیات رکھنے والی کتاب لکھ رہا ہے اس کو مغربی تہذیب و تمدن کی ہنگامہ خیزیوں ۔ امت نصرانیہ کا پورا نظامِ عمل جس سے ان کی کاروباری حقیقت بھی سامنے آجائے ۔ یورپ کی موجودہ ترقی اور اس کے اسباب ۔ حقیقی ترقی کا صحیح مفہوم اور مناسب استعمال موجودہ ترقی یافتہ دنیا کی تمدنی فکریات اور وہ تمام سائنٹفک ایجادات جن کے ذریعہ آج نظامِ انسانی کو کہیں سے کہیں پہنچایا جا رہا ہے اور اسکے ساتھ ہی دنیا کی مختلف طاقتوں کا وہ نظام جس نے انہیں اپنے کمالات کا شدید ترین مظاہرہ کرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے ۔ ان سب سے بذات خود مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہئے ۔ ان تمام واقفیتوں اور آگاہیوں کیلئے دنیا کے تمام جدید ترقی یافتہ علم و ادب پر عبور درکار ہے ۔ سوشلزم کیسے وجود میں آیا اس کا نظامِ عمل انسانی زندگی کی کون کون سی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے گذشتہ تھوڑے سے عرصہ میں سوشلزم میں کیا کیا تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئی ہیں نازی ازم اور فیسزم نے کاروبارِ حیات کی ترتیب و تنظیم کے لئے کیا اصول قائم کئے ہیں ۔ وہ کن کن اصولوں پر دنیا کو بامِ ترقی تک پہنچانا چاہتے ہیں اُن کے سائنٹفک رجحانات کا گذشتہ زمانہ میں زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی پذیر ہونا کن اسباب کی بنا پر ہے ۔ ان کی سائنٹفک ترقی سے دُنیا کی سیاست ۔ معاشرتِ تمدن کس کس طرح متاثر ہو رہے ہیں ۔ سیاست میں پارلیمنٹری جمہوریت کا اب کیا درجہ ہے اور وہ کہاں تک کامیاب ہے ۔ وغیرہ ۔ یہ سب باتیں مصنف کے حافظے میں محفوظ ہونا چاہئیں ۔

اس کتاب کے مصنف الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہیں جن کی مذہبی عظمت اسلام اور اس کے تمام متعلقات کے متعلق علم و وقوف مسلّم ہے ۔ وہ ایک ایسے دارالعلوم کے مہتمم ہیں جو اسلامی تعلیم کی تدریس میں ایک خاص شہرت کا مالک ہے ۔ مگر یہ بات کہ مولانا مغربی طاقتور قوموں کے مختلف رجحانات ۔ عملی سرگرمیوں اور ان کے وجود و اسباب کے متعلق کامل علم رکھتے ہیں اس وقت تک درجۂ یقین تک نہیں پہنچ سکتی جبتک کہ ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ مولانا نے کن ذرائع سے وہ واقفیتیں اور آگاہیاں حاصل کی ہیں ۔

بہرکیف ہمیں بغیر کسی بدگمانی کے مولانا کی تصنیف کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے ممکن ہے آپ نے اپنی فکریات کو کچھ اس انداز سے ظاہر فرمایا ہو کہ ہر بات سمجھ میں آجائے کسی کی تشریح کی ضرورت نہ رہے ۔

اس کتاب کے نصف سے زیادہ حصہ میں اسلامی اصول اسلامی روایات اسلامی تمدن و معاشرت اور اسلامی ہدایات و احکامات اور نصرانی ہدایات و احکامات کے تطابق کا ذکر فرمایا گیا ہے ۔ یہ تطابق بڑی حد تک قرآن پاک اور انجیل کے بتائے ہوئے اصولوں سے کیا گیا ہے ۔ اور اس میں دونوں مذاہب کی تعلیمات اور ان کے متعلقات سے بحث کی گئی ہے ۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا

ہے کہ مولانا کا مطالعہ اسلامیات کے متعلق ہی کافی وسیع اور قابلِ قدر نہیں ہے بلکہ وہ انجیل   کی تعلیمات سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ مولانا نے ان آسمانی کتابوں سے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ عسائیوں کی ترقیاں مسلمانوں کے اصولوں کو اختیار کر لینے سے ہوئی ہیں اور اصولِ ایجاد کو بھی شرعی اور الٰہی ثابت کیا ہے۔ مولانا کی اس کاوش میں آسمانی کتب کے مطالعہ کی زیادہ امداد شامل ہے اور دُنیا کے موجودہ حالات اور ان کے اسباب سے ان ابواب میں زیادہ بحث نہیں کی گئی ہے۔ ہاں ایک جگہ مولانا نے ایک ایسے موضوع پر جس کے متعلق ابھی تک علماء اور فقہا کا متفقہ طور پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے کچھ اس طرح اظہار فرمایا ہے کہ ان کی حیثیت بجائے ایک متبحّر عالم کے ایک سرشار عقیدت صوفی کی سی ہوگئی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق بالتفصیل ذکر کرتے ہوئے مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ خود پیغمبرِ اسلام صلعم کی ذاتِ اقدس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکوین و تولید میں والد کی حیثیت سے دخل تھا اس کے جو دلائل مولانا نے پیش کئے ہیں ان کو مختصر طور پر یوں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ قرآن پاک میں اس واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جب مریم علیہا السلام اپنے گھر والوں سے علیحدہ ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب تھا غسل کے لئے گئیں اور انہوں نے اُن لوگوں کے سامنے سے پردا ڈال لیا تو خداوند کریم نے اُن کے پاس اپنے فرشتہ جبرئیل کو بھیجا اور وہ اُن کے سامنے پورے آدمی کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ مریم علیہا السلام نے کہا کہ میں تجھ سے اپنے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھے خدا کا خوف ہے تو یہاں سے چلا جائیگا مگر جبرئیل نے ان سے کہا کہ میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ پھر اس صورت نے جو مریم کے سامنے جلوہ افروز تھی اُن کے گریبان میں پھونک ماری جو بمنزلہ القاءِ نطفہ کے تھی جس سے وہ حاملہ ہوگئیں۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک میں جہاں اُس صورت پاک کا ذکر فرمایا ہے جو مریم کے سامنے تھی وہاں الفاظ بَشَرًا سَوِيًّا فرمائے گئے ہیں اور بشر سوی عربی میں اس انسان کو کہتے ہیں، جو انتہائی خوبصورت ہو یعنی ہر ممکن حسنِ صورت اس میں موجود ہو۔

۲۔ کائنات میں پیغامبرِ اسلام صلعم سے زیادہ حسین صورت کبھی ظہور میں نہ آئی اور نہ آئے۔

۳۔ جس شریعت نے تخلیق عیسوی کے واقعہ کا اظہار فرمایا ہے اسی نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس شبیہ مبارک کا قرآن پاک میں ذکر ہے وہ خود حضرت پیغمبرِ اسلام صلعم کی تھی اور اس طرح آپ کی شبیہ مقدس کو مریمؑ کے لئے بمنزلہ زوج قرار دیا۔

۴۔ حضرت پیغمبرِ اسلامؐ نے خود بھی ایک تبہ یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں حضرت مریم بنت عمران کو میری زوجہ بنایا ہے۔

۵۔ حضرت شیخ عبدالغنی نابلسی نے انجیل کی اُس آیت کی کہ "شروع باپ کے نام سے اور بیٹے کے اور روح القدس کے" یہ تفسیر فرمائی ہے کہ باپ سے مراد ہے اس روح کی طرف جو اللہ کی سب سے پہلی مخلوق ہے جیسا کہ احادیث میں خبر دی گئی اور اسی کا نام کہیں عقل کہیں قلم اور کہیں حقیقت محمدؐ یہ ہے اور روح القدس سے بھی اسی روح کی طرف اشارہ ہے لیکن بلحاظ اس کے ظہور کے بشر سوی کی صورت میں اور بیٹے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ اس روح کے پھونک مارنے سے ان کی پیدائش ہوئی [illegible]

ان تمام واقعات و دلائل پر نظر ڈالنے کے بعد مسلمانوں اور خصوصاً صوفیائے اسلام کو کافی مسرت ہوگی کہ مولانا نے ایک ایسی تحقیق فرمائی ہے جو ابھی تک فیصلہ طلب تھی اور جس سے حقیقت [illegible] ایک پر تو ہی نہیں بلکہ سبب تخلیق قرار دیا جاسکتا ہے [illegible] کیسی عجیب و غریب بحث کا سلسلہ شروع [illegible] کہ دوسری قوموں کے سامنے اگر اس واقعہ کو [illegible] تو ان لوگوں کے ذہن میں جو تصوف [illegible] اس واقعہ کی کیا حقیقت ہوگی۔ یعنی پیغمبرِ اسلام ایک وقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد بھی ہیں اور اس کے متعدد سال کے بعد حضرت عبداللہ کے بیٹے بھی۔

بہرحال   فیصلہ کرنے سے بہتر یہ تھا کہ اس معاملہ کو اسی صورت میں چھوڑ دیا جاتا جس صورت میں کہ قرآن پاک میں موجود ہے اور جس میں کسی قسم کی غلط فہمی یا تشکیک کی گنجایش باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔

اس کتاب کے آخری حصوں میں یورپ کی اخلاقی حالات کی خرابی دکھائی گئی

ہے جو بڑی حد تک درست ہے مگر جو خرابیاں مثلاً زناکاری۔ بے حیائی بے حجابی بد اخلاقی مولانا نے مغربی ممالک میں ظاہر فرمائی ہیں ان کے متعلق ہم تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسیحی تعلیمات کا نتیجہ ہیں، مسلمانوں میں بھی ہزاروں اس قسم کی خرابیاں عام ہیں مگر ان کو اسلامی تعلیم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ان خرابیوں کے متعلق بھی ہمیں صحیح طور پر یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ حالات دُنیا میں کب اور کیوں پیدا ہوتے ہیں اور ان کو کم کرنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان کا مذاہب سے کیا تعلق ہوتا ہے۔

انسان نے جس وقت سے زندگی اور اس کے لوازمات کے متعلق سوچنا شروع کیا ہے وہ بزعم خود بُرائیوں کو دور کرنے اور نیکیوں کو ترقی دینے کے لئے مختلف اصولوں کا پیرو رہا ہے۔ زندگی کی جد و جہد جبتک جاری ہے یہی ہوتا رہیگا۔ اختلاف خیال تو ذہن انسانی کی ترقی کی دلیل ہے اسی لئے تو آجتک دُنیا کے تمام انسان اجتماعی حیثیت سے اپنے اعتقادات اور اصولوں کے متعلق کوئی ایک مستقل فیصلہ نہ کر سکے اور نہ غالباً کبھی کر سکیں گے۔

ہم تمام کتاب اس اشتیاق میں پڑھتے چلے گئے کہ مولانا نے یورپ کی جدید سائنٹفک ترقی کے متعلق کن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اور اُن سے کس قسم کا نتیجہ نکالنے کی کوشش فرمائی ہے مگر جن ابواب کو دیکھنے کی زیادہ تمنا تھی اُن میں ہمارے لئے سوائے حیرت کے اور کوئی سامان تسکین نہیں ہے۔

وہی لباس اور فیشن پر تبصرہ۔ وہی ڈاڑھی اور مونچھ کا ذکر۔ وہی بنک کے سود کا قضیہ۔ وہی بے حیائی و بے غیرتی کے افسانے۔ وہی عورتوں کی بے پردگی اور اُن کے بالوں کے کٹنے پر طعن و تشنیع اور ان تمام اذکار کے ساتھ ان کو روکنے کیلئے علماء کی احسن جد و جہد اور مستحسن مساعی کا تذکرہ! انتہا یہ ہے کہ سائنس کی جدید تحقیقات و معلومات کا ذکر بھی اس طرح کیا گیا ہے۔

"تمدن جدید کی یہ نئی نئی اختراعات۔ گیس و برق کی کرشمہ سازیاں اور اسٹیم و پٹرول کے مواليد آیا فی الحقیقت یہ وہی تسخیر کائنات ہے جو منشاء قرآنی اور اس کا ایک مستقل موضوع بحث یعنی عین منشاء خداوندی ہے؟"

اور اس کا جواب بھی سُن لیجئے:۔

"اور بھی کچھ نہیں تو جہاں اللہ کے رسول نے تمام مشروع اخلاق و اعمال کے عملی نمونے قائم فرمائے تھے وہیں اگر صاحب اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم کم از کم ایک انجن یا ایک دُخانی جہاز یا ایک سینا کی مشینری جس سے مصور تبلیغ ہو سکتی یا ٹیلیفون جس سے دینی احکام جلد سے جلد دور تک پھیلائے جا سکتے یا سب کچھ چھوڑ کر صرف لاؤڈ اسپیکر اور ریڈیو جس کے ذریعہ اس رسول عالمین کے خطبات ہی کم از کم سارا عالم بیک وقت سُن سکتا اپنے دست مبارک سے ایجاد فرما کر امت کے لئے ایک نمونۂ عمل قائم فرما دیتے تو کم از کم تنگ دل علمائے حجت تو قائم ہو سکتی ...... لیکن وہاں تو صحابہ اور اُن کے لئے اس فکر میں لگ گئے کہ اس دور کی دو عظیم الشان متمدن سلطنتوں فارس و روم کے تمدنی تکلفات مٹا کر انہیں بھی اپنے ہی جیسا بدوی بنالیں"

کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ مولانا یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو سائنس کی ایجادات سے اجتناب رکھنا چاہئے چنانچہ مسلمانوں کے تنزل کے اسباب یہ ظاہر کئے گئے ہیں۔

"ہمارا اسراف بیجا۔ ہماری نا اتفاقی۔ ہماری بد معاملگی۔ ہماری بے انصافی ہمارا ظلم و جور۔ ہماری بے حمیتی۔ ہماری بے فکری و بے غیرتی اور ہماری جاہلیت فی الحقیقت ہماری غلامی کا سبب بنی ہوئی ہے جس نے قوت و شوکت کو ہم سے جدا کیا اور اسی قوت کو یورپ نے اُچک کر ان پر فتح پالی"

اب آپ غور کیجئے کہ مولانا نے جو خرابیاں مسلمانان ہند میں ظاہر کی ہیں کیا یہ اور اس سے کہیں زیادہ خرابیاں مغربی ممالک کے رہنے والوں میں نہیں پائی جاتی ہیں خود مولانا نے ہی مغربی ممالک کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی کوئی ایسی اخلاقی خرابی نہیں ہے جو مغرب والوں میں نہ پائی جاتی ہو پھر بھی وہ ساری دُنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ موجودہ زمانہ میں اسلامی ممالک یا مسلمانان ہند اگر سائنس اور اس کی ایجادات سے بے تعلقی کا اظہار کریں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا حشر کیا ہوگا۔ آج ترکی اور ایران وغیرہ نے جو ترقی (جس کو مولانا کے نقطۂ خیال سے بہت قابل مذمت قرار دیا جانا چاہئے) کی ہے اگر وہ اسے ترک کر دیں اور سائنس کی جن ایجادات سے وہ مسلسل فائدہ اُٹھا رہے ہیں اُن کو خیرباد کر دیں تو اُن کی بقا کی تدابیر غالباً مولانا ہی بتا سکیں گے۔!؟

اگر ان خیالات کے ماتحت جن کا اظہار مولانا نے فرمایا ہے اور جن کے متعلق (بقول مولانا) اسلام اور متبعین اسلام نے کسی عملی پروگرام کا اظہار نہیں فرمایا ہے) یہی بہتر سمجھا جائے کہ انہیں شیطانی آلات سمجھ کر معطل کر دیا جائے تو پھر ہمارا نظام زندگی کیا ہو جائیگا اسپر غور کرنے کی ضرورت ہے

ریل - تار - ریڈیو - بجلی - موٹر - ہوائی جہاز وغیرہ آجکل انسانی ضرورتوں کو کس طرح پورا کر رہے ہیں اس کا تصور کیجئے اور پھر غور فرمائیے کہ اگر ترقی کرنیوالے پیچھے ہٹ بیٹھیں تو کہاں پہنچ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام ترقیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ قیامت تک ایجاد ہونے والی چیزوں کی ایک فہرست قرآن پاک میں درج ہوتی اور سب کے متعلق جواز کا حکم ہوتا۔ اس سلسلہ میں بہت سی کتب موجود ہیں (جو خود مولانا کی نظر سے بھی گزری ہونگی) جن میں موجودہ ترقیوں کے متعلق قرآن پاک کے ارشادات عالیہ بتائے گئے ہیں۔

رہا اسوۂ حسنہ تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جب لڑائی تلوار کی تھی تو تلوار اٹھانے کا حکم تھا۔ اب اگر مخالف بموں اور زہریلی گیسوں کا استعمال کرتا ہے تو اس کا جواب بھی انہیں چیزوں سے دیا جائیگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اوپر سے جب گولیاں اور بم برسیں تو مسلمان نیچے اونٹوں کی قطاریں کھڑی کر کے تلوار کا فن دکھائیں۔ آجکل تو اپنی بقا اور مدافعت کے لئے بھی سائنس کی ایجادات قطعی ضروری ہیں اور پھر مسلمان ان سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں جبکہ قرآن پاک میں اُن کو استعمال کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ انسانی ترقی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مولانا نے اس کتاب کو بہت محنت سے مرتب فرمایا ہے۔ اسلامی اور مسیحی تعلیمات کی مطابقت ان کا اختلاف ان کے مختلف اصول اور پیرووں کے اعمال سے ان کی جانچ پرتال کرنے میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس قسم کی کتابوں کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ ان سے اسلامی علم و عمل کی تلقین بھی ہوتی ہے اور موجودہ پستی و ذلت سے نکلنے کے لئے دل میں تڑپ پیدا ہوتی ہے کتابت طباعت عمدہ ہے۔ کاغذ بھی نفیس ہے قیمت غالباً درج ہونے سے رہ گئی ہے۔

چمنستان

مدیر۔ آغا سرخوش قزلباش

نائب مدیر۔ گوردھن داس ایم۔ اے۔

چندہ سالانہ عام — فی پرچہ ۳ ؎

قصر شاعر۔ نکلسن روڈ۔ دہلی

موجودہ زمانہ کی پُرآشوبی کا اثر حیات کے ہر شعبہ پر پڑ رہا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بھی بڑھ رہی ہیں مزدوروں کی اجرتیں بھی۔ کارگاہِ عمل میں جس قدر ہلچل مچی ہوئی ہے باعمل ہستیاں اسی قدر فکرمند نظر آتی ہیں۔ آمدنیاں محدود ہوتی جا رہی ہیں اور اخراجات کا سیلاب ہے کہ کسی حد پر رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ اس کساد بازاری کے زمانہ میں کسی ادبی رسالہ کا اجراء کرنا بقول ایک مفکر ادیب کے "خودکشی کا ارادہ کرنا" ہے اور بقول ایک شاعر "جوئے شیر لانے" سے کم نہیں ہے مگر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسانی عظمت و قوت کے جوہر بھی حقیقت میں اُسی وقت کھلتے ہیں جب انسانوں کے لئے دائرۂ حیات تنگ ہونے لگتا ہے۔ کسی طوفانی سمندر کی مہیب و خوفناک موجوں کے درمیان سے اپنی کشتی کو لیجانے والا جس طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے مقابلہ میں پرسکون سطح آب پر کشتی کھینے والے کو نصف قوت کا بھی استعمال نہیں کرنا پڑتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ بادِ صرصر کے تُند جھونکے جب دم گھوٹنے لگتے ہیں تو سانس لینے کی طاقت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے اُن اربابِ ادب کی ہمتیں یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں جو موجودہ زمانہ کی سختی کو خوب اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے بھی ادبی خدمت کو جاری رکھنے کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔

آغا سرخوش قزلباش جو آغا شاعر قزلباش مرحوم (آہ انہیں مرحوم لکھتے ہوئے دل کو کیسی تکلیف ہوئی ہے) کے صاحبزادے ہیں ہندوستان کی ادبی دُنیا میں "چمنستان" کی دو اشاعتیں پیش کر چکے ہیں۔ دوسری اشاعت پیش نظر ہے۔ ترتیب سے خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے مشہور و معروف ادیب و شعراء کے فکر پارے اس پرچہ کو زینت دے رہے ہیں۔ آغا شاعر قزلباش مرحوم کی ہستی ہماری ادبی دُنیا میں کافی معروف تھی اُن کے احباب کا سلسلہ بھی کافی وسیع تھا۔ اس لئے کیا تعجب ہے اگر چمنستان کی "بہار افزائی" کے لئے چاروں طرف سے ہمت افزا صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

مسٹر گوردھن داس ایم۔ اے اس رسالہ کے نائب مدیر ہیں۔ اس سے اتحاد قومی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اگر "چمنستان" کے "مالیوں" نے ہمت۔ استقلال اور مسلسل جد و جہد سے کام لیا تو یہ رسالہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے جلد ترقی کر جائیگا۔ لکھائی چھپائی اور ضخامت کے متعلق ہم کچھ لکھنا چاہتے تھے مگر سالانہ چندہ نے خاموش کر دیا۔ ظاہر ہے کہ عام سالانہ میں "چمنستان" موجودہ صورت میں بھی غنیمت ہے۔

مفرح یاقوتی محمد شاہی

جواہرات گرانمایہ، ورق طلا، ونقرہ، مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ طب کیمیادی کا اعجاز نما کرشمہ، بوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی بےضرر شہنشاہی مفرح

ناظرین محترم از راہ لطف وکرم اس اعلان کو حرف بحرف شرف ملاحظہ مرحمت فرمادیں

یاقوتی محمد شاہی۔ معروف ومشہور مغل شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمالی دوا جس کا نسخہ قطعی رازمیں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل ہمارے خاندان علی لیہ انصاریہ میں (جو عہد سلطنت مغلیہ میں علاوہ منصب طبابت شہنشاہی کے عہدۂ جلیلہ ملکی ہفت ہزاری تک پر مفتخر رہ چکا ہے) چلا آرہا ہے۔ یہ نسخہ صرف والیان ملک رؤسا، و امرا کے لئے مخصوص طور پر بنایا جاتا رہا۔ اگر اس کو ہر اعتبار سے علاوہ قطعی بے ضرر ہونے کے سرتاج وشہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار مشاہدات کی بے لاگ کسوٹی پر ہرگز بیجا نہ ہوگا، یوں تو یاقوتی اور مفرحات سے طب یونانی کی قرابادینیں پٹی پڑی ہیں اور بعض تجارتی دواخانے مفرحات میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کرکے بدنام کنندہ نکونامے چند کے مصداق ہورہے ہیں مگر یہ شہنشاہ پسند مفرح یاقوتی جس کو ایک جماعت اطباء وکملا وفضلاء عصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا۔ اسکے اجزا ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گرانمایہ کا مجموعہ ہیں اس کو مجدد طب علامہ لقمان الملک حکیم نابینا صاحب نے اپنے جدید طب کیمیائی کے طریقہ سے اب اس درجہ مکمل فرمادیا ہے کہ یہ مفرح بغایت معتدل ہوگئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں کرتی۔ ورق طلاء ونقرہ۔ مروارید ناسفتہ لعل بدخشانی یاقوت رمانی۔ یاقوت اصفر وکبود۔ زمرد تابناک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول اور بےحد لطیف بناکر اس میں شامل کیا جاتا ہے اسی وجہ سے قلب دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو حد درجہ تقویت پہنچاتی ہے۔ اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو بہمہ صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے ہیں کہ تقویت ہو اور باہ بھی بڑھے جسم وروح واعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو اور ان تمام امور کے ساتھ بلا احتمال ضرر ممسک و مفرح بھی ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اس درجہ تفریح اور ایسی ہیجان وفرحت کمال کا حال پیدا کرتی ہے کہ بائد وشائد تفریح اور امساک کے ساتھ نشاط بھی ہے اور دافع احتلام وسرعت انزال وجریان بھی ہے اور غلط تناسلی کو گاڑھا تولید کرتی ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کیلئے عجیب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب وغریب صفت ہے کہ یہ مثل جوہر الجواہر یا جواہر مہرہ کے پرانی سے پرانی عادت منشیات کو ترک کرادیتی ہے اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شراب نوشوں نے شراب ترک کردی افیونیوں نے افیون کو ترک کردیا دوسرے منشیات کے استعمال کرنے والوں نے اس یاقوتی کو حرز جان بنایا۔

یہ مفرح یاقوتی جسم کی تمام ارواح کو کمال درجہ تقویت بخشتی ہلکا سا سرور ونشاط پیدا کرتی عمدہ اغذیہ کو جزء بدن بناتی دافع سرعت جریان واحتلام مغلظ ممسک منشط از حد ہے۔ وہ لوگ جو گرم مقویات کھاکر پریشان ہوتے ہیں اور نہ جن کو سرد دوا موافق آتی ہو نہ گرم ان کے لئے یہ مفرح یاقوتی واقعی آب حیات سے کم نہیں ہے بلاکسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کے بہترین مقوی ہے۔ بہرحال یہ یاقوتی ہر اعتبار سے بہمہ صفت موصوف ہے۔ مگر صرف ایک صفت اس میں نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ حد درجہ بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اور روح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی ایک شاہی دوا ہے۔ جو حضرات نمونتاً بھی اس کی چند خوراکیں نوش جان فرمالیتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے اسکے والہ وشیفتہ ہوجاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گویا روح ادویہ ہے اس لئے اس کی مقدار خوراک صد درجہ قلیل ہے جو چاہے اس کا تجزیہ یعنی عمل انالائز کرکے بہت اچھی طرح جانچ سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مضر ادویہ ہر قسم کی سمیات مکلسات کشتہ جات سے قطعی پاک ہے صرف جواہرات کی بے پایاں اثر شفا بخشی از روئے طب کیمیائی اس میں بروئے کار لائی گئی ہے اور صرف ادویات نباتی کے جوہر وخلاصہ اس میں آمیز ہیں۔

مقدار خوراک دو رتی سے آٹھ رتی تک ہے آٹھ رتی سے زیادہ شائد ہی کوئی قوی آدمی برداشت کرسکے۔ بدرقہ: کچا دودھ ۱ تولہ۔ گرم پانی۔ ۱ تولہ قدرے شیرینی ملاکر۔

قیمت۔ فی شیشی جس میں چھ ماشہ یہ شہنشاہی یاقوتی ہے (صہ) پانچ روپیہ۔ نمونہ کی ایک شیشی جس میں چار خوراک دوا ہے (عہ) ایک روپیہ۔

المعلن

آپ سب کا خادم عبد الغنی انصاری منیجر انصاری دواخانہ نبیرہ علامہ لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی واقع شاہ گنج حیدرآباد دکن

ایشیا

اگست سنہ ۱۹۴۳ء

۸۲

SAGHAR

IN ENGLISH

Saghar's entire attitude and approach towards life is of youth, richly endowed with a passion for the history, romance, hope and freedom of his country. He is in every fibre of him Indian and his art is both drawn from and dedicated to his motherland."

SAROJINI NAIDU.

The Urdu knowing world is already familiar with the message of this young and buoyant poet of the East.

It is a message of indepeneence and national pride.

The Hindi Edition of Saghar's poems is already in the market and eagerly sought by lovers of poetry and literature.

It is now translated into English for the benefit of English knowing world.

Price per copy Rs. 4 - 12 only. To those who order in advance it will be given for Rs. 3 only

BOOK YOUR COPIES NOW TO AVOID DISAPPOINTMENT.

Manager, Adbi Markaz,
MEERUT.
(India.)

Registered No. A

Vol. 4 AUGUST 1940. No. 14.

THE ASIA

The Hindustani ~~Quarterly~~ Monthly Journal

of

The Adabi Markaz Meerut (India)

Edited by

S. Y. K. SAGHAR NIZAMI.

Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.